وطن عزیز پر مر مٹنے والوں کی جاں گداز داستان

واجدہ وینا اور وطن

حکایت کا مشہور و معروف سلسلہ، پہلی بار کتابی صورت میں

حصّہ اوّل



عنایت اللہ

پیش لفظ!

وہ لوگ بڑے خوش نصیب ہیں جن کی رگوں میں حبِ پاکستان لہو کے ساتھ رواں دواں ہے۔ کتنے مقدس ہیں وہ لوگ جو اس پاک سرزمین کے لئے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر دیتے ہیں۔ کتنے عظیم ہیں وہ لوگ جو اس کی بقاء کے لئے سینہ سپر ہیں۔ ایسے لوگ تو قوم وملت کا سرمایہ ہوتے ہیں۔ اس سرمائے کی حفاظت کرنا ہمارا فرضِ اولین ہے۔

اور کس قدر گھناؤنے ہیں وہ لوگ جو اپنے نفس کی خواہشات کے تابع ہو کر' زر کے غلام ہو کر اور زن کے مرید ہو کر اپنی زندگیوں کو خوشحال بنانے کے لئے اس پاک سرزمین کا سودا کرتے ہیں۔ اس کے ماتھے پر لہو کا ٹیکہ لگاتے ہیں۔ اس کی مانگ بھرنے کے بجائے اجاڑنے پر ہمہ وقت کمربستہ رہتے ہیں۔ یہ نہیں جانتے کہ یہ زر' زن اور زمین تو عارضی پناہ گاہیں ہیں۔ بھلا یہ تینوں چیزیں بھی کسی کی ہوئی ہیں۔ آگ اور پانی کا ملاپ بھی کبھی ہوا ہے۔ جہاں پانی ہو گا وہاں آگ کی سلامتی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔

پھر بھلا کیوں لوگ اس آگ کے تعاقب میں ہیں جو پروانوں کی طرح جلا کر بھسم کر دیتی ہے۔ ظاہر و باطن کو فنا کر دیتی ہے۔ محض چند رنگین کاغذی ٹکڑوں کی خاطر ہم اتنے گر جاتے ہیں۔ کہ برے اور بھلے کی تمیز ہی نہیں رہتی۔ آنکھوں کے آگے خواہشات کی پٹی چڑھ جاتی ہے۔ جس سے دنیا کی حقیقت پوشیدہ ہو جاتی ہے۔ کب تک آخر کب تک ہم اس حقیقت سے چشم پوشی کرتے رہیں گے۔ ایک دن تو یہ پٹی اتر کر رہے گی اور وہ دن کتنا خوفناک ہو گا۔ کتنا اذیت ناک ہو گا۔ اس دن سے ہم کیونکر آنکھیں ملائیں گے۔

یہ پاک سرزمین جس کے حصول کے لئے ہمارے پرکھوں نے جان' مال اور عصمتوں کا نذرانہ پیش کیا۔ کیا یہ قربانیاں رائیگاں جائیں گی۔ ہمارے بزرگوں کا وہ لہو کیا ہوا۔ کیا اس کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ کیا ان کی کوئی وقعت نہ تھی۔ کیا ان کے لہو کی قیمت ہم اس طرح چکائیں گے۔ کیا ان کی قربانیوں کو بھی روند ڈالیں گے۔ کیا ان کی محبتوں کو

یوں بھلا ڈالیں گے۔

یہ لمحہ فکریہ ہے۔ ایک طرف تو اپنے ہی اس ملک کے درپے ہیں اور دوسری طرف مکار بنیا اسے نیست و نابود کرنے پر تلا ہوا ہے۔ اس ملک کے سپوت ہی اسے کھوکھلا کرنے میں مصروف ہیں۔ جب اپنے ہی گھر کے دشمن ہو جائیں تو اس گھر کی بنیادیں کس طرح قائم رہ سکتی ہیں۔ اس کا اتحاد کیسے برقرار رہ سکتا ہے۔ آخر ہماری سوچ کس طرف جا رہی ہے۔ ہمارے نظریات کیا تھے اور کیا ہو گئے۔ وقت کا دھارا پلٹتا رہتا ہے۔ میزان کے دونوں پلڑے کبھی یکساں نہیں رہتے۔ ایک پلڑا جھکتا ہے تو دوسرا اٹھتا ہے۔ توازن برقرار رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ توازن ہی کا نام زندگی ہے۔ یہ اونچ نیچ یہ اٹھک بیٹھک زندگی کی علامت تو ہے۔ مگر حاصل زندگی نہیں۔ ہم خواہشات کے گرداب میں پھنس چکے ہیں۔ ہمیں اس گرداب سے نکلنا ہے۔ ایک نئی تعمیری سوچ لے کر۔ اپنے ملک کو درخشندہ کرنے کی خواہش لے کر۔ ایک عزم صمیم لے کر جذبہ تعمیر لے کر پھر کہیں جا کر ہم میں محمد بن قاسم پیدا ہوں گے۔ پھر کہیں طارق بن زیاد کی شکل دکھائی دے گی۔ انہیں صورتوں میں کچھ تو میجر عزیز بھٹی ہوں گے، کچھ راشد منہاس اور کچھ کیپٹن کرنل شیر خان اور حوالدار لالک جان ہوں گے۔ جو اپنے لہو کا نذرانہ دے کر اس وطن کی سالمیت کے چراغ کو روشن رکھیں گے۔ واجدہ، وینا اور وطن بھی ایسے ہی لوگوں کی کہانی ہے۔ جنہوں نے اپنے وطن کی مانگ بھرنے کے لئے تن من دھن کی بازی لگا دی۔ جن کے لئے وطن ہی سب کچھ تھا۔ جن کا ایمان ہی پاک دھرتی تھی۔ جو اس دھرتی کے دشمنوں کے لئے سیسہ پلائی دیوار ثابت ہوئے۔ جنہوں نے اپنے لہو سے اس چراغ کو روشن رکھا۔

ہماری نئی نسل ان قربانیوں سے ابھی آشنا نہیں ہوئی جو ہمارے بزرگوں نے اس ملک کے لئے دیں۔ ان قربانیوں کی یاد ہی ہماری زندگی ہے۔

آیئے عہد کریں کہ ان قربانیوں کو فروغ دیں گے۔ اس ملک کی سالمیت کے لئے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ اسے اپنی ماں کی طرح مقدس خیال کریں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس عہد پر کاربند رکھے۔

میجر عثمان کی ڈرائیونگ اُس شام دیکھنے والی تھی۔ گنجان ٹریفک میں اُس کی سوزوکی کار کسی گاڑی کو دائیں طرف سے، کسی کو بائیں طرف سے اوورٹیک کرتی اُڑی جا رہی تھی۔ ایک چوک کی بتی سرخ ہوئی۔ دوسری طرف کی ٹریفک چل پڑی۔ میجر عثمان نے جیسے سگنل لائٹ دیکھی ہی نہ ہو۔ اس نے رفتار کم نہ کی۔ اپنے سامنے رکی ہوئی دو گاڑیوں کے بائیں سے گاڑی نکال کر لے گیا۔ چوک کے آگے کھڑا ٹریفک کانسٹیبل اسے رکنے کا اشارہ دے کر اس کے راستے میں آ گیا لیکن اچھل کر پھر فٹ پاتھ پر جا پہنچا کیونکہ میجر عثمان کی سوزوکی کی رفتار ذرا سی بھی کم نہیں ہوئی تھی۔ گاڑی ٹریفک کانسٹیبل کے قریب سے زناٹے سے گزر گئی۔

یہ سفید سوزوکی اُسی رفتار پر چھاؤنی کے پل پر چڑھی، اُتری، فورٹریس سٹیڈیم کی طرف مڑی اور چھوٹے سے ایک ریستوران کے سامنے اس طرح رکی کہ بریکوں کی چیخیں دُور دُور تک سنائی دیں۔ میجر عثمان گاڑی سے نکلا۔ دروازہ لاک کیا اور جب ریستوران کی طرف چلا تو ایک نسوانی آواز نے اسے روک لیا۔

"اتنی دیر؟" —— اسے مانوس آواز سنائی دی —— "پندرہ منٹ سے...."

"او سویٹ!" —— میجر عثمان نے اُس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا —— "آج آفس میں پھنس گیا تھا۔ کور کمانڈر بڑے ہی غلط وقت پر آن دھمکا اور اس نے ڈیڑھ گھنٹہ میرے بریگیڈ کمانڈر کے ساتھ لگا دیا۔ وہ گیا تو بریگیڈ کمانڈر نے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کے آفیسرز کو بلا کر احکام دینے شروع کر دیئے"۔

"کوئی خاص بات تھی؟" —— اُس لڑکی نے پوچھا جس نے عثمان کا بڑھا ہُوا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا —— "کوئی ایمرجنسی؟"

"کچھ بھی نہیں" —— عثمان نے بے پرواہی سے جواب دیا —— "روٹین.... آؤ"

—— وہ لڑکی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے ریستوران کے دروازے کی طرف چل پڑا —— "گھر پہنچا تو نہ بیوی کی طرف توجہ دی نہ بچوں کی طرف۔ وردی اتاری' یہ کپڑے پہنے اور وہ بولی چائے رکھ دی ہے۔ واسی میری ٹانگ سے لپٹ گیا۔ بائی گاڈ' نہ بچے کی طرف دھیان گیا نہ بچے کی ماں کی طرف جس نے کپڑے بدلنے کے دوران چائے تیار کر لی تھی۔ بچے سے ٹانگ چھڑائی اور اس کی ماں سے کہا کہ برٹش آرمی کا ایک ڈیلیگیشن آیا ہُوا ہے۔ مجھے فوراً آفیسرز میس پہنچنا ہے اور ڈنر کے انتظامات دیکھنے ہیں"۔

وہ دونوں ریستوران کے اندر جا کر ایک کونے کی ٹیبل پر بیٹھ گئے تھے۔ ریستوران کا ایک ہی کمرہ تھا جو ڈائننگ ہال کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ میزیں عام ہوٹلوں کی نسبت دُور دُور تھیں اور ہر میز کے اوپر مدھم روشنی تھی جس میں میز پر بیٹھنے والے ایک دوسرے کو اور میز پر رکھی ہوئی کھانے پینے کی اشیاء کو ہی دیکھ سکتے تھے۔ اس کمرے کی تمام میزوں پر کھانے والے موجود ہوتے تو بھی یوں لگتا تھا جیسے یہاں کوئی ایک انسان بھی موجود نہ ہو۔ ہر ایک کے ہونٹ ہلتے نظر آتے تھے لیکن کسی کی آواز نہیں سنائی دیتی تھی۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ اس ریستوران میں ڈسپلن اور آداب و اخلاق کے پابند لوگ آتے تھے بلکہ یہاں وہ لوگ آتے تھے جن کا ڈسپلن اور آداب و اخلاق کے ساتھ دُور پار کا بھی تعلق نہیں ہوتا تھا۔

یہ سب نوجوان ہوتے تھے.... نوجوان جوڑے.... اپنے کلچر سے بیزار' امریکہ کے مادر پدر آزاد کلچر کے شیدائی نوجوان' رشوت خور افسروں' بڑے زمینداروں' جاگیرداروں' سمگلروں کے بیٹے تھے اور بیٹیاں بھی۔ یہ نوجوان لڑکیاں اور لڑکے اپنے آپ کو پاکستان کے عوام سے برتر اور اعلیٰ نسل کا سمجھتے تھے لیکن یہ نئی تہذیب کے

گندے انڈے تھے جو عشق و محبت کی پینگیں بڑھانے کے لئے اس ریستوران میں جایا کرتے تھے۔

یہ ایک ہی نہیں' پاکستان کے بڑے شہروں مین ایسی بے شمار ریستورانیں کھل گئی تھیں جن کے اندر نیم تاریکی کی حد تک روشنی کم رکھی جاتی تھی تاکہ جوڑوں کو ہر قسم کی حرکت کرنے کی آزادی ہو۔ اس قسم کی ریستورانوں میں امیر ماں باپ کے بیٹے اپنی گرل فرینڈز کو کھلانے پلانے کے لئے لے جاتے ہیں۔

ایسی ریستورانیں کھچا کھچ بھری ہوئی ہوں تو بھی خاموش اور خالی لگتی ہیں حالانکہ وہاں بیٹھے ہوئے لوگ مسلسل بولتے ہیں۔ وہ ذرا اونچی آواز میں اس لئے نہیں بولتے کہ وہ جو باتیں کر رہے ہوتے ہیں وہ سرگوشیوں میں ہی کی جاتی ہیں۔ اس کے ساتھ انگریزی ہَلا گُلا گانے بھی دھیمی آواز میں سنائی دیتے تھے۔ یہ کیسٹ ریستورانوں والے چلائے رکھتے تھے۔ اس سے یہ فائدہ ہوتا تھا کہ ایک میز پر بیٹھے ہوئے جوڑے کی سرگوشیاں ساتھ والی میز تک بھی نہیں پہنچتی تھیں۔

اسلامی مملکت میں ایسی باتیں کی جا سکتی ہیں لیکن سرگوشیوں میں!
اسلامی مملکت میں نازیبا حرکتیں کی جا سکتی ہیں لیکن مدھم روشنی میں!

یہ ریستورانیں اور کیبنوں والے جدید ہوٹل اسلامی مملکت میں نئی تہذیب کا عشق و محبت کرنے والوں کو گوشہ تنہائی مہیا کرتے ہیں اور دولت سمیٹ رہے ہیں۔

ان ریستورانوں کے نام بھی رومانی قسم کے تھے۔ میجر عثمان لڑکی کو ساتھ لے کر جس ریستوران میں جا بیٹھا تھا' اس کا نام "لورز کارنر" (محبّت کرنے والوں کا گوشہ) تھا۔

"میں تو اداس ہو گئی تھی کہ تم نہیں آؤ گے" —— لڑکی نے عثمان سے کہا۔

"ایسا ہو نہیں سکتا" —— عثمان نے کہا —— "میں نے تمہاری سالگرہ پر تمہیں ڈنر دینے کا وعدہ کیا تھا۔ ڈِنر کے بعد تحفہ تم خود پسند کر لینا.... تم نہیں جانتیں میں کس طرح یہاں پہنچا ہوں۔ چوکوں پر ٹریفک سگنلز کی بھی پرواہ نہیں کی۔ مجھے کور کمانڈر پر غصہ آ رہا تھا جو ڈو کمانڈر کو ساتھ لئے بے وقت آن دھمکا تھا.... بریگیڈ میجر ہونا بھی ایک لعنت ہے.... لو مینو کارڈ اور خود ہی آرڈر دو"۔

لڑکی مینو کارڈ دیکھنے لگی۔

○

میجر عثمان علی خان ایک ریٹائرڈ کرنل کا بیٹا تھا۔ اس خاندان کے کسی آدمی کو نوکری کرنے کی تو ضرورت ہی نہیں تھی۔ بہت بڑا جاگیردار خاندان تھا۔ کرنل کے باپ دادا کو انگریزوں نے تاجِ برطانیہ کی وفاداری اور پہلی جنگ عظیم میں بہادری کے کارناموں کے صلے میں نہری علاقے میں بے شمار مربعے زمین عطا کی تھی۔ کچھ زمین اپنی بھی تھی۔ فوجی سروس اس خاندان کی روایت بن گئی تھی۔ میجر عثمان کا باپ بھی فوج میں تنخواہ کے لئے نہیں بلکہ کرنیل اور جرنیل بننے کے لئے گیا تھا۔ اس کی فوجی زندگی لیفٹیننٹ کے عہدے سے شروع ہوئی تھی۔ وہ چونکہ جاگیر کی آمدنی کی وجہ سے شہزادہ قسم کا فوجی افسر تھا اس لئے کرنیلی سے آگے ترقی نہ پا سکا اور پنشن کے لئے سروس پوری ہو گئی۔

اس نے اپنے بیٹے عثمان کو بھی مل ملا کر اور خاندان کی فوجی خدمات کا ریکارڈ دکھا کر کمیشن کے لئے سلیکٹ کرا لیا اور ٹریننگ کے بعد عثمان سیکنڈ لیفٹیننٹ بن کر ایک انفنٹری رجمنٹ میں چلا گیا۔ وہ قومی جذبے کے زیرِ اثر فوج میں نہیں گیا تھا۔ اسے صرف افسر بننا تھا۔ باپ نے اسے کبھی نہیں کہا تھا کہ بیٹا! ملک کی سرحد ماں اور بہن کی مانگ جیسی مقدس ہوتی ہے۔ وہ کہا کرتا تھا' میرا بیٹا پہلے بٹالین کمانڈر' پھر بریگیڈ کمانڈر اور پھر ڈویژن کمانڈر بنے گا۔

عثمان گھر کا شہزادہ تھا۔ چار بہنوں میں ایک ہی بھائی تھا۔ نازوں پلا تھا۔ ہر فرمائش منوانا اس کی فطرت بن گئی تھی۔ اس کی ماں اسے فوج میں نہیں جانے دے رہی تھی۔ کہتی تھی لڑائی لگ گئی تو میرا کوہ نور ہیرے جیسا بیٹا مورچوں کی مٹی میں مٹی ہو جائے گا۔

"تمہارا بیٹا کسی لڑائی میں نہیں جائے گا" ـــــ عثمان کے باپ نے اس کی ماں کو یقین دلایا تھا ـــــ "کبھی انڈیا کے ساتھ لڑائی ہو گئی تو میں بیٹے کو مورچوں میں نہیں جانے دوں گا۔ جی ایچ کیو میں میرا اتنا رسوخ چلتا ہے۔ میں بیٹے کو اس کی بٹالین سے نکلوا کر رجمنٹل سینٹر میں بھجوا دوں گا جہاں یہ عیش موج کرے گا"۔

عثمان رجمنٹ میں جا کر بھی شہزادہ ہی رہا۔ پوری تنخواہ ہضم کر کے تنخواہ جتنی رقم ہر مہینے ماں باپ سے لے لیا کرتا تھا۔ باپ نے بھی اسے اتنی فضول خرچی اور عیاشی سے کبھی نہیں روکا تھا۔ اس کی دلچسپی لڑکیوں میں تھی۔ جیب پیسوں سے بھری ہوئی ہو تو اس ہابی میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ اس کی کلاس کی لڑکیاں جسے معاشرے کی اپر کلاس کہا جاتا ہے' آسانی سے دستیاب تھیں۔ ان لڑکیوں کے تو جیسے چہروں پر لکھا تھا

ـــــ "صلائے عام ہے یارانِ...."

اس کی شادی ہو گئی اور جس لڑکی کے ساتھ شادی ہوئی اسے وہ پہلے سے جانتا تھا۔ اس کی ذات اور برادری کی لڑکی تھی۔ رنگ کچھ زیادہ سفید تو نہیں تھا لیکن چہرے کے خدوخال اور نقش و نگار میں جاذبیت اور جسم کی متوازن ساخت میں کشش تھی۔ قد کاٹھ تو اور زیادہ اچھا لگتا تھا۔ وہ گریجوئیٹ تھی اور نام اس کا واجدہ نسرین تھا۔ سمارٹ' ذہین اور خوش طبع لڑکی تھی۔

شادی کی پہلی رات تک عثمان کی زندگی میں تین چار لڑکیاں باری باری آ چکی تھیں۔ وہ خوبصورت تھیں یا نہیں' ان میں خوبی یہ تھی کہ وہ آسانی سے عثمان کی زندگی میں بلکہ اس کے جال میں آ گئی تھیں۔ عثمان جیسے شکاری اور ماں باپ کے اکلوتے شہزادے عموماً" ضد کیا کرتے ہیں کہ وہ اپنی پسند کی شادی کریں گے لیکن عثمان نے ایسی ضد نہ کی۔ ماں اور بہنوں نے واجدہ نسرین کے انتخاب سے پہلے عثمان سے کہا تھا کہ وہ خود فیصلہ کرے۔ عثمان نے اپنے مخصوص زندہ دل انداز میں اپنا فیصلہ واجدہ کے حق میں دیا تھا۔

پہلی رات عثمان کی وارفتگی بتا رہی تھی کہ واجدہ اس کے دل میں اُتر گئی ہے۔ پہلی رات ہی اس نے واجدہ نسرین کو پیار سے وینا کہنا شروع کر دیا تھا اور اگلی صبح جو اس کی ازدواجی زندگی کی پہلی صبح تھی' اپنے گھر کے تمام افراد سے کہہ دیا تھا کہ آج سے واجدہ کو وینا کہا جائے گا۔ عثمان کی بہنوں نے یہ نِک نیم بہت پسند کیا تھا۔

ہنی مون کے لئے وہ وینا کو اسلام آباد لے گیا اور ایک فائیو سٹار ہوٹل میں قیام کیا تھا' پھر اسے مری برفباری دکھانے کے لئے لے گیا اور نہ جانے کہاں کہاں لئے پھرتا رہا تھا۔ وہ تو وینا کا ہی ہو کے رہ گیا تھا۔ سلامیوں کی کئی ہزار کی رقم اس کی جیب میں اور وینا کے پرس میں تھی۔ ہنی مون سے واپس آ کر عثمان وینا کو دوسری تیسری شام ہوٹل میں لے جا کر کھانا کھلاتا تھا۔

ایک مہینہ گزر گیا۔

"اب ہمیں اپنی ازدواجی زندگی کے متعلق سنجیدہ ہو جانا چاہئے" ـــــ وینا نے عثمان سے کہا تھا ـــــ "بہت عیش کر لی"۔

"کیا جلدی ہے تمہیں سنجیدہ ہونے کی؟" ـــــ عثمان نے کہا ـــــ "ساری عمر پڑی

ہے.... ابھی تو میں تمہیں اپنے خاص دوستوں کے ہاں لے جاؤں گا"۔

○

اور ایک شام وہ وینا کو اپنے خاص دوستوں کی محفل میں لے گیا۔ یہ محفل تین کنال کی ایک کوٹھی میں بپا کی گئی تھی۔ وہاں نوجوان تھے اور تین چار جواں سال تھے۔ یہ دس بارہ تھے اور ساتھ آٹھ نوجوان لڑکیاں تھیں۔ امپورٹڈ پرفیومز سے کمرہ مہک رہا تھا۔ لڑکیوں کے بال کٹے ہوئے تھے اور انہوں نے جو کپڑے پہن رکھے تھے' ان میں وہ نیم عریاں لگتی تھیں۔ نیم عریانی کو ہی وہ حُسن کا راز سمجھتی تھیں۔ ان کا اندازِ کلام مصنوعی' ناز و انداز میں تصنع اور دیگر حرکات پر مغربیت غالب تھی۔ انہوں نے بھنوئیں پنسل سے بنائی ہوئی تھیں۔ ان کے میک اپ قوس قزح کے رنگوں جیسے تھے۔ ان کی زبان انگریزی تھی۔ کوئی اکی دکی لڑکی کسی مجبوری کے تحت چند الفاظ یا ایک آدھ جملہ اردو کا بولتی تھی۔

نوجوان اور جواں سال لڑکوں کی حالت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ ان میں سے بھی بعض نے بھنوئیں پنسلوں سے بنائی ہوئی تھیں اور ہلکا ہلکا پاؤڈر بھی لگا رکھا تھا۔ ان کے بولنے کے انداز ایسے اور حرکتیں جیسے ان میں سے ہر ایک یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہو کہ وہ امریکہ یا یورپ کے کسی ملک کی پیداوار ہے اور ہپی بن کر پاکستان میں آ گیا ہے اور وہ سب سے زیادہ ہپّی ہے۔

کیسٹ پلیئر پر انگریزی گانوں کا جسے پاپ میوزک کہتے ہیں' کیسٹ لگا ہُوا تھا۔ اس کی آواز ہلکی تھی۔ جونہی عثمان اور وینا کمرے میں داخل ہوئے' کسی نے کیسٹ پلیئر کی آواز اونچی کر دی اور کسی نے بلند آواز سے انگریزی میں اعلان کیا کہ کیپٹن عثمان اپنی سویٹ وائف کے ساتھ آ گیا ہے۔

کمرہ چیخوں سے گونجنے لگا اور سب نے عثمان اور وینا پر ہلّہ بول دیا۔ لڑکیوں نے تو وینا سے ہاتھ ملانا ہی تھا' لڑکے بھی اس سے ہاتھ ملا رہے تھے اور وینا سُکڑی سمٹی جا رہی تھی۔ دو تین لڑکوں نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کے ہلایا۔

"او سویٹ!" —— ایک نے کہا۔

"او' وَٹ اے بیوٹی!" —— دوسرے نے کہا۔

"ونڈر فل!" —— تیسرے نے کہا —— "یُو آر لکی عثمان!"

وینا کا تو وہاں دم گھُٹنے لگا تھا۔ وہ عثمان کی پناہ میں چھُپ جانا چاہتی تھی لیکن عثمان اسے نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ اس طوفان بدتمیزی اور بدتہذیبی میں گم ہو گیا تھا جسے پاکستانی معاشرے کا یہ بالائی طبقہ جدید تہذیب کہتا تھا۔

یہ پاکستان کے اونچے طبقے کا نیچ پن تھا۔

عثمان اس محفل کی دو لڑکیوں کے ساتھ مگن ہو گیا تھا.... کچھ انگریزی میں کچھ اردو میں.... وینا سے اس نے توجہ ہی ہٹا لی تھی۔ وینا کو نئی تہذیب کی گِدھیں نوچ رہی تھیں۔ اگر وہ اَن پڑھی ہوتی یا مڈل کلاس کی پردہ نشین لڑکی ہوتی تو اس محفل سے بھاگ جاتی۔ وہ اپر کلاس فیملی کی لڑکی تھی۔ بڑے اچھے کالج میں پڑھی تھی اور کالج کی تقریبوں اور سرگرمیوں کی حد تک سوشل تھی۔ اس میں گھُٹن اور جھجھک نہیں تھی۔ وہ خوش طبع اور زندہ مزاج تھی لیکن اس نے اپنے اردگرد ایک حصار کھینچا ہُوا تھا۔ یہ شرافت اور وقار کا دائرہ تھا جس سے وہ کبھی باہر نہیں نکلی تھی۔

اس نے اس سوسائٹی کی جسے ڈسکو یا پاپ سوسائٹی کہا جاتا تھا' بہت باتیں سنی تھیں اور اس سوسائٹی کے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو دیکھا بھی تھا بلکہ دیکھتی رہتی تھی۔ اس کے کالج میں ایسی کئی لڑکیاں پڑھتی تھیں جو اس ہپی کلچر کی دلدادہ تھیں۔ ان کی ہر حرکت پر ہپی ازم غالب تھا۔ وہ سگریٹ بھی پیتی تھیں۔ وینا ان لڑکیوں کی نقلیں اتارا کرتی اور ان کے ساتھ کبھی گپ شپ بھی لگا لیا کرتی اور انہیں نفرت کی نگاہوں سے دیکھا کرتی تھی۔

اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کا خاوند اسی سوسائٹی اور اسی بے حیا کلچر کا شیدائی ملے گا۔ شادی ہوئی تو خاوند اسے اسی سوسائٹی میں لے گیا جسے وہ کسی کلچر کی غلاظت کہا کرتی تھی۔ اس نے بناوٹی مسکراہٹوں سے یہ ظاہر کرنے کی بہت کوشش کی کہ وہ اس دعوت میں آ کر بہت خوش ہوئی ہے لیکن جوں جوں اس دعوت میں ہنگامہ بڑھتا گیا' وینا کی مسکراہٹ کا پھیکا پن نمایاں ہوتا چلا گیا۔

یہ ہنگامہ شور شرابے تک ہی محدود نہیں تھا' کھانے کے بعد جب ناچ شروع ہو گیا تو وینا کو چکر آنے لگے۔ یہ اگر باقاعدہ ناچ ہوتا تو کوئی بات بھی تھی' یہ تو پاگلوں جیسی اچھل کود تھی۔ ناچتے ناچتے بلکہ اچھلتے کودتے لڑکے لڑکیاں ایک دوسرے سے بغلگیر ہو جاتی تھیں۔ وینا عثمان کو ڈھونڈ رہی تھی لیکن وہ اسے نظر آتے ہوئے بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ایک دو لڑکوں نے وینا کو بھی بازوؤں سے پکڑ کر گھسیٹا لیکن اس نے ایسی مسکراہٹ سے ٹال دیا جس میں بناوٹ

اور نفرت تھی۔ وہ الگ بیٹھ گئی۔

آدھی رات ہونے کو آئی تھی جب یہ محفل برخاست ہوئی۔ وینا کو فی الواقع چکر آنے لگے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ دیکھ نہ سکی کہ ان نوجوانوں میں بعض جھومنے اور لڑکھڑانے لگے تھے۔ یہ نشے کا اثر تھا جو وہ سگریٹوں میں پیتے رہے تھے۔ وینا کے سر کے چکرانے کی ایک وجہ یہ بدبُو بھی تھی جس سے یہ کمرہ بھر گیا تھا۔ باہر آ کر وینا کو جب ٹھنڈی ہوا لگی تو اس نے کچھ سکون محسوس کیا۔ اسے پتہ نہیں چل رہا تھا کہ اس کی یہ ذہنی حالت غصے کی وجہ سے ہے' نفرت کی وجہ سے ہے یا یہ اضطراب تھا۔ یہ جو کچھ بھی تھا' وہ اپنے آپ میں نہیں تھی۔

"کہو' لطف آیا؟" ـــــ عثمان نے گاڑی سٹارٹ کرتے ہوئے وینا سے پوچھا۔

وینا نے عثمان کی طرف دیکھا اور چپ رہی جیسے اُسے کوئی جواب سوجھ نہیں رہا تھا یا وہ جواب دینا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے عثمان سے منہ پھیر لیا۔

"کیوں وینا!" ـــــ عثمان نے پوچھا ـــــ "تم تو چپ ہی ہو گئی ہو۔ کوئی خاص بات۔ میرا خیال ہے تم نے اس محفل میں اجنبیت محسوس کی ہو گی"۔

"گھر چلیں عثمان صاحب!" ـــــ وینا نے اکتاہٹ کے لہجے میں کہا ـــــ "پلیز' جلدی گھر چلیں"۔



گھر پہنچ کر وینا نے اتنی تیزی سے اپنے کپڑے اتارے جیسے عروسی کے اس لباس سے بھی اسے نفرت ہو گئی ہو۔ وہ کپڑے اتار نہیں رہی تھی بلکہ اپنے جسم سے انہیں نوچ رہی تھی۔ یہ کپڑے تو اس نے بڑے شوق سے پہنے تھے۔ عثمان کے ساتھ شادی کر کے اسے روحانی مسرّت حاصل ہوئی تھی حالانکہ اس نے اپنے دل میں اس خواہش کو کبھی نہیں آنے دیا تھا کہ اس کی شادی عثمان کے ساتھ ہی ہو۔ ہاں ایک خواہش اس کے دل میں اکثر دھڑکتی تھی کہ وہ کسی فوجی افسر کی بیوی بنے۔ عثمان کو اس نے اسی لئے اپنی روح کی گہرائیوں میں اتار لیا تھا کہ وہ پاک فوج کا افسر تھا' اور وہ خوبرو اور امیر ماں باپ کا بیٹا تو تھا ہی' لیکن اس رات اُسے بہت دکھ ہُوا کہ عثمان کا اصل روپ کچھ اور ہے اور آگے چل کر وہ اس کے ساتھ روپ بہروپ کا کھیل کھیلے گا۔

"معلوم ہوتا ہے تمہیں آج کا فنکشن اچھا نہیں لگا" ـــــ عثمان نے کہا ـــــ "تمہیں سوشل ہونا پڑے گا وینا! تم ایک کیپٹن کی بیوی ہو"۔

"اس فنکشن میں اچھا لگنے والی کون سی بات تھی؟" ـــــ وینا نے کہا۔ وہ کپڑے بدل چکی تھی اور اب وہ عثمان کا سامنا کرنے کے لئے پوری طرح تیار تھی۔ اس نے کہا ـــــ "اور جہاں تک آپ کے کیپٹن ہونے کا تعلق ہے وہ میری ایک دلی خواہش تھی جو اللہ نے پوری کر دی لیکن عثمان صاحب میری خواہش کپتانی کے عہدے سے یا افسری سے شادی کرنے کی نہیں تھی' میں کسی فوجی کے ساتھ شادی کرنا چاہتی تھی۔ فوجی سے میری مراد وطن کا وہ سرفروش ہے جو اپنے ملک کی آن پر اپنا سر کٹوا دیتا ہے"۔

"او نو وینا!" ـــــ عثمان نے کہا ـــــ "تمہارے منہ سے یہ باتیں مجھے عجیب لگی ہیں۔ ایسی باتیں پاکستان کے مڈل کلاس کے لوگ کیا کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے تم یہ بھی کہو گی کہ میں چاہتی ہوں کہ تم محمد بن قاسم بنو اور تم طارق بن زیاد بنو"۔

"یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتی کہ آپ محمد بن قاسم یا طارق بن زیادہ بنیں گے" ـــــ وینا نے کہا ـــــ "لیکن میں یہ بھی نہیں چاہتی کہ آپ اس سوسائٹی کے سانچے میں ڈھل جائیں جس میں آپ کہتے ہیں کہ بہت مزہ آتا ہے"۔

"تو کیا تمہیں یہ سوسائٹی اچھی نہیں لگی؟" ـــــ عثمان نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

"آپ پوچھتے ہیں اچھی نہیں لگی!" ـــــ وینا نے کہا ـــــ "مجھے اس سوسائٹی سے نفرت ہے عثمان صاحب! میں آئندہ آپ کے ان دوستوں سے ملنا پسند نہیں کروں گی"۔

"او شٹ اپ وینا!" ـــــ عثمان نے دوستانہ بے تکلفی کے لہجے میں کہا ـــــ "تم جیسی پُرکشش اور ہائی کلاس فیملی کی لڑکی کے منہ سے ایسی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔ کچھ تعجب نہیں کہ کل تم یہ بھی کہو کہ میں بھی تمہیں اچھا نہیں لگتا"۔

"میرے منہ سے آپ ایسی بات مرتے دم تک نہیں سنیں گے" ـــــ وینا نے کہا ـــــ "میں نے آپ کو روح کی گہرائیوں سے قبول کیا ہے۔ آپ کی شخصیت کا دوسرا پہلو یعنی آپ کا فوجی ہونا مجھے اور زیادہ اچھا لگا ہے۔ اس طرح میرے ذہن میں آپ کا ایک ایسا امیج بن گیا ہے جسے ذرا سی بھی ٹھیس پہنچی تو میرا دل ٹوٹ جائے گا"۔

"میری بات غور سے سنو وینا!" ـــــ عثمان نے سنجیدگی سے کہا ـــــ "میں یہ بات پہلی اور آخری بار کہہ رہا ہوں۔ مجھے اُس قسم کا فوجی نہ سمجھنا جیسا تم نے اپنے ذہن میں امیج بنایا ہُوا ہے۔ میں سمجھتا ہوں اور بڑی اچھی طرح سمجھتا ہوں تم کیا کہنا چاہتی ہو۔ میں کم عقل نہیں اور میں اسی معاشرے کا فرد ہوں۔ میں جانتا ہوں عام لوگ کیا باتیں کرتے ہیں۔ تم مجھے مجاہد سمجھ

رہی ہو۔ وقت آیا تو معلوم نہیں میں کیا کروں گا۔ اتنا ضرور ہے کہ میں محاذ سے بھاگ نہیں جاؤں گا لیکن میں تمہیں صاف الفاظ میں بتا دیتا ہوں کہ میں فوج میں کسی قومی یا ملکی جذبے سے بھرتی نہیں ہوا نہ میں نے کبھی ایسا نعرہ لگایا ہے کہ میں اپنے وطن کی آن پر جان قربان کر دوں گا۔ یہ تاریخی ناولوں کے مکالمے ہیں جو میں نے نہ بولے ہیں نہ بولوں گا"۔

"آپ کی یہ باتیں سن کر میرے دل کو تکلیف سی ہو رہی ہے" ـــــ وینا نے کہا۔

"ہو گی!" ـــــ عثمان نے کہا ـــــ "میری خاطر تھوڑی سی تکلیف برداشت کر لو۔ میں چاہتا ہوں کہ جو کچھ ہوں وہ تمہیں ایک ہی بار بتا دوں۔ میں تمہیں کسی غلط فہمی میں نہیں رکھنا چاہتا.... یہ تو تمہیں معلوم ہو گا ہی کہ ملٹری سروس ہمارے خاندان کی روایت ہے۔ میں یہ کہنے سے بھی نہیں جھجکوں گا کہ ہمارے گھر میں اب بھی انگریزوں کی تعریفیں ہوتی ہیں۔ میں اپنی مرضی سے فوج میں نہیں گیا' یہ میرے ابو کی خواہش تھی بلکہ حکم تھا جو میں ٹال نہیں سکتا تھا"۔

"آپ ٹال سکتے تھے" ـــــ وینا نے کہا ـــــ "مجھے بتایا گیا تھا کہ آپ ماں باپ کے اکلوتے بیٹے ہیں اور آپ اپنی ہر بات منوا لیتے ہیں۔ اگر آپ یہی ضد لے بیٹھتے کہ فوج میں نہیں جانا تو آپ کے والدین آپ کو فوج میں نہ بھیجتے"۔

"تم نے جو سنا ٹھیک سنا تھا" ـــــ عثمان نے کہا ـــــ "لیکن میں نے کچھ اور بھی سوچ لیا تھا۔ تم میری عقلمندی کی تعریف کرو کہ میں نے کتنی دُور کی سوچی تھی۔ سوچی یہ تھی کہ ابو سے میں نے کچھ وصول بھی کرنا تھا۔ تم نہیں جانتی کہ ان کا دماغ فوجی ہے اور وہ سختی کرنا بھی جانتے ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ میں اپنی تنخواہ میں سے یہ عیش و عشرت کر سکتا ہوں؟ میں جتنی تنخواہ فوج سے لیتا ہوں' اس سے ڈیڑھ گنا زیادہ وظیفہ ابو یا امی سے بٹور لیتا ہوں"۔

"پھر یوں کہیں کہ آپ بگڑے ہوئے شہزادے ہیں" ـــــ وینا نے مسکراتے ہوئے کہا ـــــ "اور میں یہ بھی کہہ سکتی ہوں کہ آپ کو آگے جانا پڑا تو آپ توپ کے گولے کا دھماکہ بھی برداشت نہیں کر سکیں گے"۔

"آگے جانے کی نوبت ہی نہیں آئے گی" ـــــ عثمان نے کہا ـــــ "ابو نے میرے ساتھ وعدہ کر رکھا ہے کہ لڑائی کی صورت میں وہ مجھے سینٹر میں ہی رکوا لیں گے یا ان کے اثر و رسوخ سے مجھے چھاؤنی کی ہی کسی ڈیوٹی پر لگا دیا جائے گا"۔

وینا کا سر جھک گیا اور اُس نے کچھ بھی نہ کہا۔

"کیوں وینا!" ـــــ عثمان نے وینا کی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر اس کا سر اوپر کرتے ہوئے کہا ـــــ "کیا سوچ رہی ہو؟.... یہ ایسا مسئلہ نہیں جس کے متعلق اتنا زیادہ سنجیدہ ہو گئی ہو!"

"ایک بات بتائیں عثمان صاحب!" ـــــ وینا نے پوچھا ـــــ "کیا فوج میں تمام افسر یا زیادہ سے زیادہ افسر آپ جیسے شہزادے ہی ہیں؟"

"نہیں" ـــــ عثمان نے جواب دیا ـــــ "شہزادے بھی ہیں اور وہ مجاہد بھی ہیں جن کا امیج تم نے اپنے ذہن میں بٹھا رکھا ہے۔ وہ لڑنے مرنے کے لئے بھرتی ہوئے ہیں۔ وہ سب مڈل کلاس فیملیوں کے سر پھرے نوجوان ہیں۔ ان کی موجودگی میں اگر چند ایک افسر شہزادے بنے رہے تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ہم 'پلے بوائے' پڑھتے ہیں اور ہم پلے بوائے سوسائٹی کے لوگ ہیں۔ ہم عیش کرنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں اور عیش و عشرت کرتے ہی دنیا سے اُٹھ جائیں گے۔ ہمیں مرنے کی کوئی جلدی نہیں۔ اس ملک کو دشمن سے بچانے کے لئے بہت سے لوگ موجود ہیں"۔

"ایک بات پر مجھے بہت افسوس ہوتا ہے" ـــــ وینا نے کہا ـــــ "وہ یہ کہ آپ مڈل کلاس کی بات اس طرح کرتے ہیں جیسے ملک کی چوکیداری اسی کلاس کی ذمہ داری ہے لیکن یہی وہ کلاس ہے اور اس کے نیچے کے غریب لوگ ہیں جو انسانی حقوق سے محروم ہیں۔ میں ان لوگوں کو مظلوم کہا کرتی ہوں لیکن ملک پر جب بھی مصیبت کا وقت آیا تو یہی فریب خوردہ مخلوق ملک کے کام آئی"۔

"تم کیسی دقیانوسی باتیں کرتی ہو وینا" ـــــ عثمان نے کہا ـــــ "تم مڈل کلاس کی لڑکی تو نہیں۔ میں حیران ہوں کہ تم ایسی باتیں کر رہی ہو۔ تم اپنی کلاس کے وقار کا خیال رکھو۔ اس ملک کی لیڈرشپ ہمارا حق اور ہمارا ورثہ ہے۔ میری برادری میں اس وقت بھی چار ایم این اے ہیں اور دو منسٹر رہ چکے ہیں۔ تمہارا خاندان بھی سوشل سٹیٹس میں کچھ کم نہیں"۔

"لیکن عثمان صاحب!" ـــــ وینا نے کہا ـــــ "میں یہ نہیں بھول سکتی کہ میں مسلمان گھرانے کی لڑکی ہوں۔ میں اپر کلاس کی لڑکی تو ہوں لیکن جب خیال آتا ہے کہ میں اسلام کی پیروکار ہوں تو میری نظریں اپر سے لوئر کلاس میں گر جاتی ہیں"۔

عثمان نے منہ پھیر لیا۔ اس کے چہرے پر اکتاہٹ کا تاثر نمایاں ہو گیا تھا اور اس تاثر میں ایسی جھلک بھی تھی جیسے وہ اس موضوع پر وینا کے ساتھ مزید بات نہ کرنا چاہتا ہو۔

کچھ ایسا ہی تاثر وینا کے چہرے پر بھی تھا بلکہ عثمان کی نسبت کچھ زیادہ ہی تھا۔ اس تاثر میں مایوسی کی جھلک بھی تھی۔

دونوں ایک ہی بیڈ پر لیٹ گئے۔ ان کے جسموں کے درمیان تو کوئی فاصلہ نہیں تھا لیکن دل ایک ندی کے دو کناروں کی مانند ہو گئے تھے جن کے ملنے کا امکان ہی نہیں ہوتا۔ ان کے خیالوں میں، سوچوں میں اور ذہنیتوں میں اتنا زیادہ فرق تھا جیسے دو مختلف راستے مختلف منزلوں کو جا رہے ہوں۔



پانچ سال گزر گئے۔ ان پانچ سالوں میں عثمان فوج میں میجر اور گھر میں دو بچوں کا باپ بن چکا تھا۔ بڑا بچہ تین سال کا اور چھوٹا ابھی چند مہینوں کا تھا لیکن عثمان کی زندگی اُس ڈگر پر چلی گئی تھی جہاں باپ اپنے آپ کو غیر شادی شدہ سمجھنے لگتا ہے۔ گھر کی دہلیز سے باہر قدم رکھتے ہی وہ بھول جاتا ہے کہ وہ کسی بیوی کا خاوند یا بچوں کا باپ ہے۔ عثمان اس مقام سے بہت دُور نکل گیا تھا اور وہ چھوٹے سے ایک جدید ریستوران میں ایک لڑکی کے ساتھ بیٹھا تھا اور اسے بڑے فخر اور مسرت سے سنا رہا تھا کہ وہ اپنی بیوی کی چائے ٹھکرا کر اور اپنی ٹانگ سے لپٹے ہوئے بچے کو ٹانگ سے نوچ کر اس کے پاس پہنچ گیا ہے۔

"تمہیں شادی کرنی بھی نہیں چاہئے تھی!" ـــ اس لڑکی نے عثمان سے کہا ـــ "تمہاری قدر مجھ سے زیادہ اور کوئی لڑکی نہیں کر سکتی"۔

اس لڑکی کا نام لبنیٰ سعید تھا اور عثمان اسے لُوسی کہتا تھا۔

"بیوی بچے میرے اور تمہارے درمیان حائل نہیں ہو سکتے" ـــ میجر عثمان نے نشیلے سے لہجے میں کہا ـــ "ایسا کبھی نہیں سنو گی کہ میں نے بیوی کے کہنے پر تمہیں کہیں انتظار میں رکھا ہو اور تم تک نہ پہنچا ہوں.... ہٹاؤ ان باتوں کو لُوسی، یہ بتاؤ کہ تمہارے ممی اور ڈیڈی نے کوئی فیصلہ کیا ہے یا نہیں۔ میں تو اب بیتاب ہو گیا ہوں"۔

"اتنی بیتابی کی تو کوئی ضرورت نہیں" ـــ لُوسی نے کہا ـــ "وہ تو جب ہو کہ میں تمہیں نہ مل سکوں۔ تم نے جب کہا، جہاں کہا میں وہاں تم سے پہلے پہنچ گئی۔ یہ تو تم جانتے ہو کہ میرا منگیتر ایک چٹان بن کر ہمارے راستے میں کھڑا ہو گیا ہے۔ تم میرے

والدین کی مجبوری کو بھی جانتے ہو.... وہی برادری کی پابندیاں"۔

"کس قدر دقیانوسی لفظ ہے یہ، برادری" ـــ میجر عثمان نے میز پر زور سے ہاتھ مار کر کہا ـــ "ہمارے بوڑھوں نے ہمیں بھی اپنی قدیم اور زنگ آلود زنجیروں میں باندھ رکھا ہے۔ زمانہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے۔ ہم نوجوان زمانے کے ساتھ کتنے ایڈوانس ہو گئے ہیں لیکن ہم نئی روشنی اور جدید کلچر کے باوجود صدیوں پرانی زنجیروں میں بندھے ہوئے ہیں۔ میرے ساتھ بھی یہی ٹریجیڈی ہوئی ہے۔ وینا جتنی خوبصورت اور جتنی زندہ دل ہے اتنی ہی دقیانوس اور قدیم خیالات کی ہے۔ میں تو اسے صرف بچے پیدا کرنے کے لئے استعمال کر رہا ہوں۔ ایسی پتھر ہے کہ میری بات سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتی"۔

"وہ تمہاری بات سمجھنا ہی نہیں چاہتی" ـــ لُوسی نے طنزیہ لہجے میں کہا ـــ "تم نے پہلے کبھی بتایا تھا کہ وہ اس دور میں بھی جہاد اور قومی جذبے وغیرہ کی باتیں کرتی ہے... مجھے تم پر ترس آتا ہے۔ کہاں پھنس گئے!"

"تم اپنے منگیتر کو راستے سے ہٹاؤ" ـــ میجر عثمان نے کہا ـــ "اگر ہٹتا نظر نہیں آتا تو مجھے بتاؤ"۔

"ڈیڈی بھی یہی کہتے ہیں" ـــ لُوسی نے کہا ـــ "میں تمہیں پہلے بھی بتا چکی ہوں کہ ڈیڈی تمہیں بہت چاہتے ہیں اور وہ سوچتے رہتے ہیں کہ یہ منگنی کسی بہانے توڑی جائے۔ تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ منگیتر میری جان کا عذاب بنا ہوا ہے"۔

"تم کہو تو میں اسے سرے سے غائب ہی کر دوں؟" ـــ میجر عثمان نے کہا۔

"اغوا کرانا چاہتے ہو یا قتل؟"

"میں دونوں کام کر سکتا ہوں" ـــ عثمان نے جواب دیا ـــ "لیکن تم مجھے کچھ کرنے نہیں دیتیں"۔

"میں تمہیں یہ کام تو کبھی بھی نہ کرنے دوں گی" ـــ لوسی نے کہا ـــ "تم پکڑے گئے تو میری دنیا اندھیر ہو جائے گی"۔



لبنیٰ سعید جو میجر عثمان کی لُوسی تھی، منگنی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی۔ تقریباً ایک سال پہلے ان دونوں کی ملاقات کسی سوشل فنکشن میں ہوئی تھی۔ لوسی پر عثمان ایک

طلسم کی طرح طاری ہو گیا تھا اور عثمان نے لوسی کو اپنی روح کی گہرائیوں میں اتار لیا تھا۔

پہلی ملاقات میں ہی دونوں ایک دوسرے میں تحلیل ہو گئے تھے' اور اسی رات سے عثمان کے دل سے وینا نکلنی شروع ہو گئی تھی۔ ان چند مہینوں میں ہی عثمان وینا سے اکتانے لگا تھا۔ اُس نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ اب لوسی اس کی بیوی بنے گی لیکن دو چار ملاقاتوں کے بعد لوسی نے عثمان پر یہ بم پھینکا کہ اس کی منگنی ہو چکی ہے اور اس کا منگیتر چونکہ آزاد خیال ہے اس لئے وہ اس سے ملتا ہے' اسے ہوٹلوں میں لے جاتا ہے اور اس کا انداز مغربی معاشرے کی طرح کورٹ شپ والا ہے۔

لُوسی اس کا ساتھ دینے پر مجبور تھی۔ مجبوری اس وقت پیدا ہوئی تھی جب لُوسی نے عثمان کو دل میں بٹھا لیا تھا ورنہ اس سے پہلے وہ منگیتر کو ہر لحاظ سے پسند کرتی' اس کا انتظار کرتی' دن رات میں ایک دو مرتبہ فون پر اس کے ساتھ بات کرتی اور ہنسی خوشی اس کے ساتھ جایا کرتی تھی۔ اب عثمان کو وہ بتاتی تھی کہ یہ منگیتر اسے ذرا سا بھی اچھا نہیں لگتا اور اس سے وہ آزاد ہونا چاہتی ہے لیکن منگنی توڑنا ناممکن نظر آتا ہے۔

لوسی کے بیان کے مطابق یہ منگنی برادری کی پابندیوں کے تحت ہوئی تھی۔ اسے توڑنے کے لئے برادری کے بڑوں کی رضامندی لازمی تھی لیکن وجہ اتنی ٹھوس ہونی چاہئے تھی کہ برادری کے بڑے محسوس کریں کہ یہ منگنی ٹوٹ ہی جانی چاہئے۔ ایسی کوئی وجہ موجود نہیں تھی۔ لوسی کی یہ بات سننے کے لئے کوئی بھی تیار نہیں تھا کہ وہ اب منگیتر کی بجائے کسی اور کو چاہتی ہے۔

لوسی منگنی ٹوٹ نہ سکنے کی ایک وجہ یہ بھی بتاتی تھی کہ اس کا منگیتر بڑے مضبوط خاندان کا ہے۔ اگر منگنی توڑنے کا نام بھی لیا گیا تو وہ لوسی کو اغوا کر لے گا۔

لوسی نے عثمان کو بتایا تھا کہ اس کا منگیتر اس کے خاندان پر کچھ ایسے ناگوار طریقے سے سوار ہو گیا ہے کہ اس کے والدین بھی اب اس منگیتر کو اچھا نہیں سمجھتے۔ لوسی نے اپنے والدین کے ساتھ میجر عثمان کا ذکر کیا تھا اور انہوں نے لوسی کو اجازت دے دی تھی کہ وہ عثمان کو گھر لے آئے۔

ایک شام لوسی عثمان کو اپنے گھر لے گئی اور اپنے والدین سے ملوایا۔ عثمان خوبرو جوان تھا اور وہ زبان کا جادو بھی چلا سکتا تھا۔ اس نے لوسی کے والدین کو متاثر کر لیا۔ تیسری چوتھی ملاقات میں لوسی کے باپ نے بے ساختہ کہہ دیا کہ وہ لوسی کے منگیتر کو پسند

نہیں کرتا اور لوسی کی شادی عثمان کے ساتھ کرنے کو تیار ہے لیکن منگیتر کو راستے سے ہٹائے بغیر اس کی خواہش پوری نہیں ہو سکتی۔

اس کے بعد عثمان نے لوسی کے گھر جانا شروع کر دیا تھا۔ لوسی اسے اپنے ساتھ الگ کمرے میں بٹھاتی تھی اور اپنے ہاتھوں اسے مشروب پلاتی اور خاطر تواضع کرتی تھی۔ میجر عثمان جب اس کے ہاتھ سے کوکا کولا یا اس قسم کا کوئی اور مشروب پیتا تو کچھ دیر بعد وہ ایک سرور سا محسوس کرنے لگتا تھا۔ اس دوران لوسی سراپا رومان بنی رہتی تھی۔ ایسے میں لوسی عثمان کو اس سے کہیں زیادہ خوبصورت اور پُرکشش نظر آتی تھی جتنی وہ تھی۔ عثمان پر جو نشے اور سرور کی سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی اسے وہ لوسی کے حسن و عشق کا خمار سمجھتا تھا۔

لوسی اتنی حسین تھی یا نہیں' اس کے ناز و انداز ایسے تھے جو عثمان کو مسحور کر لیتے تھے۔ یہ تو قدرتی بات ہے کہ جو انسان دل میں سما جائے اس کی بُری بات بھی اچھی لگتی ہے۔ لُوسی کے مقابلے میں اسے جب وینا کا خیال آتا تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے اس کے حلق میں ایک چھپکلی اٹک گئی ہے جسے نہ وہ نگل سکتا ہے نہ اُگل سکتا ہے۔ وینا اسے ذرا سی بھی اچھی نہیں لگتی تھی۔ عثمان جس شام لوسی کے گھر جاتا اور وہ اسے الگ کمرے میں بٹھا کر مشروب وغیرہ پلاتی تھی اس شام گھر آ کر وہ وینا کو دیکھتا تو وہ اسے اور زیادہ بری لگتی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ اونگھنے لگتا اور وقت سے بہت پہلے وہ گہری نیند سو جاتا تھا۔

لوسی کے گھر میں ہی عثمان کی ملاقات لوسی کے منگیتر کے ساتھ ہوئی تھی۔ منگیتر اسے اتنے تپاک اور پیار سے ملا تھا جیسے وہ پہلے سے ہی ایک دوسرے کو بڑی اچھی طرح جانتے ہوں اور ایک عرصے بعد ان کی ملاقات ہوئی ہو۔ منگیتر نے یہ پوچھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی کہ یہ کون اجنبی ہے جو میرے ہونے والے سسرال کے گھر میں اس بے تکلفی سے آتا ہے۔ منگیتر کو دیکھ کر عثمان کے دل میں رقابت کی جو آگ بھڑکی تھی وہ منگیتر کے بے ساختہ اچھے سلوک اور زندہ دلی سے بجھ گئی لیکن اسے جب خیال آتا تھا کہ یہ اس کی محبوبہ کو ہمیشہ کے لئے لے جائے گا تو رقابت کی چنگاری پھر جل اٹھتی تھی۔

○

میجر عثمان کے گھر کی فضا میں بڑا تکلیف دہ تکدر اور کھچاؤ پیدا ہو چکا تھا۔ باپ نے

اسے الگ کوٹھی لے کر دے رکھی تھی جس میں عثمان اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ وینا نے کئی مہینے پہلے ہی محسوس کر لیا تھا کہ عثمان نے کہیں اور دل لگا لیا ہے اور گھر سے اس کا دل اکھڑ گیا ہے۔ شروع شروع میں تو عثمان اسے ہنس کر ٹالتا رہا اور اسے اپنی محبت کا یقین دلاتا رہا لیکن عثمان نے اپنی جذباتی دنیا میں جو الاؤ جلا لیا تھا اس کے دھوئیں کو چھپا نہیں سکتا تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ وینا تو اس کے پیچھے ہی پڑ گئی ہے تو اس نے وینا کو ڈانٹنا شروع کر دیا اور ایک روز پہلی بار ان کے درمیان لڑائی جھگڑے تک نوبت پہنچی اور پھر تُوتُو مَیں مَیں آئے دن کا معمول بن گئی۔

وینا نے عثمان کے والدین کے ساتھ ذکر کیا تو عثمان کی ماں نے اسے کہا کہ عثمان کو غلط نہ سمجھو وہ زندہ مزاج اور ہنسنے کھیلنے والا لڑکا ہے لیکن بدکار نہیں۔ عثمان کے باپ کا ردِّعمل بھی کچھ ایسا ہی تھا البتہ باپ نے عثمان کو بلا کر کچھ کھینچا تانی کر دی لیکن اس کا اثر اُلٹا ہُوا۔ اس نے گھر آ کر وینا کو خوب ڈانٹا کہ اسے وہ بدنام کر رہی ہے۔

وینا چار دیواری کی دنیا میں قید رہنے والی بیوی نہیں تھی۔ وہ باہر گھومنا پھرنا جانتی تھی۔ کوئی اجنبی ہو یا جان پہچان والا' اس کے ساتھ کھل کر بات کرنے کا شعور اور صلاحیت رکھتی تھی اور وہ مجبور ہو کر بیٹھ جانے والی عورت نہیں تھی۔ عثمان کے دو دوست تھے جو عثمان کے گھر آتے رہتے تھے۔ کئی بار انہوں نے وہیں کھانا کھایا تھا اور وینا ان کے ساتھ بے تکلف ہو گئی تھی۔ دو تین مہینوں سے وینا نے عثمان کے ان دوستوں سے کہنا شروع کر دیا تھا کہ عثمان باہر کسی عورت کے چکر میں الجھ گیا ہے اور گھر سے بالکل لاپرواہ ہو گیا ہے۔

"ہفتے میں ایک دو مرتبہ وہ نشے کی سی حالت میں گھر آتا ہے" —— وینا نے عثمان کے دوستوں کو ایک روز بتایا —— "اس پر غنودگی طاری ہوتی ہے۔ کھانا بھی نہیں کھاتا۔ میری طرف اور بچوں کی طرف بھی دھیان نہیں دیتا اور سو جاتا ہے"۔

وینا نے انہیں کچھ اور باتیں بھی بتائیں جن سے عثمان کے بدلے ہوئے رویّے کا صاف پتہ چلتا تھا۔ یہ دونوں جن میں سے ایک میجر اور ایک کیپٹن تھا' عثمان کے بڑے گہرے' بے تکلف اور ہمراز دوست تھے۔ انہوں نے وینا کی باتیں سنیں تو افسوس اور غصے کا اظہار کرنے لگے اور انہوں نے وینا سے کہا کہ وہ دیکھیں گے کہ عثمان جاتا کہاں ہے۔

○

عثمان کے دونوں دوستوں نے اگلے ہی روز سے عثمان کا تعاقب شروع کر دیا۔

تھے تو یہ دونوں بھی فوجی ہی اور میجر عثمان کی طرح ہی فوجی افسر لگتے تھے لیکن یہ وردی اور ڈیل ڈول کے لحاظ سے تھے۔ وردی کے اندر بلکہ ان کے جسموں کی کھالوں کے اندر جھانک کے دیکھنے سے ہی پتہ چل سکتا تھا کہ یہ کتنے مختلف ہیں۔ عثمان کے یہ دونوں دوست عثمان سے کچھ زیادہ ہی زندہ دل اور ہنس مکھ تھے لیکن ذہنیّت اور کردار کے لحاظ سے ان میں اور عثمان میں سیاہ اور سفید یا زمین اور آسمان جیسا فرق تھا۔

یہ دونوں کھاتے پیتے اور معاشرے میں اچھا مقام رکھنے والے خاندانوں کے بیٹے تھے اور وہ عثمان کے گہرے دوست بن گئے تھے۔ ان کی دوستی اتنی گہری ہو گئی تھی کہ ایک دوسرے کے دُکھ سُکھ میں برابر کے شریک ہوتے تھے اور ان کی دوستی ان کے گھروں تک پہنچ گئی تھی۔ یہ ایک دوسرے کی ماؤں بہنوں کو اپنی سگی مائیں بہنیں سمجھتے تھے' اور ایک دوسرے کے گھروں کے رازوں سے بھی واقف تھے۔ وینا تو ان دونوں کو اپنے سگے بھائی سمجھتی تھی۔ ان دونوں میں سے اگر کوئی اکیلا وینا کے پاس بیٹھ جاتا تو عثمان کو کبھی اعتراض نہیں ہُوا تھا۔

اب وینا نے انہیں بتایا کہ عثمان گھر سے لاتعلق ہو گیا ہے تو ان دونوں نے یوں محسوس کیا جیسے ان کی اپنی بہن کسی مشکل میں گرفتار ہو گئی ہو۔ اس کے ساتھ ہی یہ مسئلہ بھی انہیں پریشان کرنے لگا کہ ان کا عزیز دوست کسی جال میں پھنس گیا ہے اور انہیں معلوم بھی نہیں۔ البتہ یہ معلوم تھا کہ عثمان عیش موج کرنے والا آدمی ہے اور ان سے الگ ہٹ کر اس کی کوئی خفیہ پرائیویٹ زندگی بھی ہے۔ انہوں نے اس سے کئی بار پوچھا بھی تھا لیکن عثمان نے ہنس کر ٹال دیا تھا۔ اب وینا نے انہیں عثمان کے بدلتے ہوئے رویّے کے متعلق بتایا تو انہیں یقین ہو گیا کہ ان کا یہ دوست کسی اور ہی راستے پر جا رہا ہے۔

"عثمان سے براہِ راست بات نہ کر لی جائے؟" —— عثمان کے ایک دوست کیپٹن آصف نے اس کے دوسرے دوست میجر سمیع سے کہا۔

"نہیں" —— میجر سمیع نے کہا —— "پوچھنے سے وہ کبھی نہیں بتائے گا۔ اگر اس نے اپنی پرائیویٹ زندگی کو راز میں نہ رکھنا ہوتا تو وہ ہمیں کبھی کا بتا چکا ہوتا کہ کسی لڑکی

کے ساتھ اس کا دوستانہ چل رہا ہے"۔

"ایک بات بتاؤ" ــــ کیپٹن آصف نے پوچھا ــــ "وینا بھابی نے جو باتیں کی ہیں' کیا تم نے انہیں سچ مان لیا ہے؟"

"ہاں یار!" ــــ میجر سمیع نے کہا ــــ "میں نے بھابی کی ہر بات کو سچ سمجھا ہے۔ تم نے نوٹ نہیں کیا جو میں کچھ عرصے سے کر رہا ہوں۔ عثمان کا کوئی الگ تھلگ اور خفیہ شغل ہے جو وہ ہم سے چھپاتا ہے۔ یہ تو تم جانتے ہو کہ وہ ڈسکو اور پاپ میوزک کا شوقین ہے اور اس کے دو تین سویلین دوستوں کو میں جانتا ہوں جو اسی قماش کے لگتے ہیں.... ہمیں جاسوسی کرنی پڑے گی"۔

○

ایک دو روز بعد شام کو عثمان کے یہ دونوں دوست عثمان کو اطلاع دیئے بغیر اس کے گھر کو جا رہے تھے۔ ان کی گاڑی ابھی عثمان کی کوٹھی سے دور ہی تھی کہ عثمان کی گاڑی کوٹھی سے نکلی اور دوسری طرف چلی گئی۔ انہوں نے اچھی طرح دیکھ لیا کہ گاڑی میں عثمان اکیلا تھا۔ کچھ فاصلہ رکھ کر انہوں نے اپنی گاڑی عثمان کے تعاقب میں ڈال دی۔ ایک تو وقت رات کا تھا اور ٹریفک بھی خاصی تھی اس لئے عثمان کو پتہ نہیں چل سکتا تھا کہ اس کے پیچھے اس کے دوستوں کی گاڑی آ رہی ہے۔

میجر سمیع گاڑی چلا رہا تھا۔ وہ صرف فوجی ہی نہیں تھا' اس نے کمانڈو ٹریننگ بھی لی تھی اور اب وہ ایک انفنٹری بٹالین میں تھا۔ اس کا تعاقب مکمل طور پر کامیاب تھا۔ عثمان کی گاڑی دو تین چوکوں سے گزرتی' موڑ کاٹتی ایک کوٹھی میں داخل ہو گئی۔ میجر سمیع نے اپنی گاڑی دُور ہی روک لی پھر چند منٹ بعد اس نے گاڑی چلائی اور آہستہ آہستہ اس کوٹھی کے سامنے سے گزرا۔ کوٹھی کے گیٹ پر کوٹھی کے نمبر کے علاوہ نام کی جو پلیٹ لگی ہوئی تھی اُس پر صرف ایم اے خان لکھا ہوا تھا۔

میجر سمیع نے کوٹھی سے تقریباً" ایک فرلانگ دور جا کر گاڑی سائیڈ پر کر کے پارک کر دی اور دونوں سوچنے لگے کہ یہ کیسے معلوم کیا جائے کہ یہ ایم اے خان کون ہے اور اس کا عثمان کے ساتھ کیا تعلق ہے۔

"ہو سکتا ہے ان کا کوئی رشتہ دار ہی ہو" ــــ کیپٹن آصف نے کہا۔

"رشتہ داری تو ان کی بڑی لمبی چوڑی ہے" ــــ میجر سمیع نے کہا ــــ "لیکن یہاں

مجھے کچھ شک ہوتا ہے"۔

دونوں گاڑی سے نکل آئے اور گاڑی کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔

"شک تو ہو سکتا ہے" ــــ کیپٹن آصف نے کہا ــــ "شک یہی ہوتا ہے کہ عثمان کا کسی لڑکی کے ساتھ دوستانہ ہو گیا ہے لیکن میں سوچتا یہ ہوں کہ لڑکیاں تو باہر ملا کرتی ہیں۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ہمارا یار لڑکی سے ملنے اس کے گھر آیا ہو"۔

"تم ابھی بچے ہو آصف!" ــــ میجر سمیع نے کہا ــــ "تمہاری نظروں میں ابھی گہرائی اور دُور بینی پیدا نہیں ہوئی۔ یہ پیدا کرنے کی کوشش کرو۔ تم نے ابھی اپنی سوسائٹی کو بھی اچھی طرح سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ ہماری اس اپر کلاس میں ایسی بے غیرتی پیدا ہو گئی ہے کہ اپنی بیٹی کے ذریعے امیر کبیر آدمیوں کی جیبیں خالی کرتے ہیں"۔

"یہ تو طوائفوں کے ہاں ہوتا ہے" ــــ کیپٹن آصف نے کہا ــــ "میں نے یہ بات سنی تو ہے لیکن ماننے کو جی نہیں چاہتا"۔

"ماننے کو اس لئے جی نہیں چاہتا کہ تم شریف اور باعزت خاندان کے بیٹے ہو" ــــ میجر سمیع نے کہا ــــ "کیا تم نے مڈل کلاس اور اس سے بھی نیچے کی سوسائٹی کو غور سے نہیں دیکھا؟ ان لوگوں میں بھی ایسے والدین پائے جاتے ہیں جو کسی کھاتے پیتے خوشحال گھرانے کے نوجوان کو اپنی خوبصورت بیٹی کے رشتے کا لالچ دے کر پھانس لیتے ہیں اور اسے چیونٹیوں کی طرح کھانا شروع کر دیتے ہیں"۔

"یہ تو ٹھیک ہے" ــــ کیپٹن آصف نے کہا ــــ "ایسے گھرانے تو میں بھی جانتا ہوں۔ وہ مڈل کلاس کے لوگ ہیں۔ انہوں نے ایک امیر کبیر ٹھیکیدار کے بیٹے کو اپنی بیٹی کا رشتہ دے دیا پھر شادی بھی کر دی۔ لڑکی کی ماں بڑی ہی چالاک عورت ہے۔ اس کی دو بیٹیاں اور بھی ہیں۔ خدا نے ان سب کو حسن سے نوازا ہے اور زبان کا جادُو چلانا انہوں نے خود سیکھ لیا ہے۔ شادی کے بعد انہوں نے اپنے داماد پر ایسا طلسم طاری کیا کہ لڑکے کے باپ کی آدھی آمدنی لڑکے کے سسرال جانے لگی اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے"۔

"اپر کلاس میں تو یہ دھندہ کھلے عام چلتا ہے" ــــ میجر سمیع نے کہا ــــ "مجھے یہ کہتے ہوئے شرم آتی ہے کہ ہم دونوں بھی اسی کلاس کے افراد ہیں۔ فرق یہ ہے کہ اس کلاس میں اس دھندے پر سوشل کلچر کا لیبل لگا دیا گیا ہے۔ یہ لوگ اپنی بیٹی کو اس لائن پر

ڈال کر فخر سے کہتے ہیں کہ ہماری بیٹی سوشل ہے۔ میں تمہیں شادی شدہ عورتیں دکھا سکتا ہوں جنہوں نے امیر کبیر آدمیوں کے ساتھ یاری لگا رکھی ہے اور ان کی آمدنی پر ہاتھ صاف کر رہی ہیں۔ عثمان کو تم جانتے ہو۔ اسے ہم بلاوجہ تو شہزادہ نہیں کہتے۔ ماں باپ نے اسے پیسے دے دے کر اور زیادہ بگاڑ رکھا ہے۔ مجھے شک ہے کہ اسے کسی ایسے خاندان نے گھیر لیا ہے جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں"۔

"خدا ہم لوگوں پر رحم کرے" ـــ کیپٹن آصف نے آہ بھر کر کہا ـــ "ہمارا ملک امریکہ بنتا جا رہا ہے۔ ہر کوئی دولت کے پیچھے دوڑ رہا ہے۔ اپنی عزت اور غیرت کو بھی نیلام گھر میں رکھ دیا ہے۔ فیملی پلاننگ کے محکمے نے ایسے خاندانوں کی لڑکیوں کے لئے کوئی خطرہ رہنے ہی نہیں دیا۔ برتھ کنٹرول کا سامان کھلے عام ملتا ہے...."

"ٹھہرو" ـــ کیپٹن آصف نے چونک کر کہا ـــ "وہ عثمان کی گاڑی نکلی"۔

عثمان کی گاڑی ادھر ہی آ رہی تھی۔ میجر سمیع سڑک کے ساتھ ہو گیا۔ عثمان کی گاڑی آئی تو میجر سمیع ذرا اور آگے ہو گیا۔ عثمان نے اسے دیکھ لیا اور اس نے گاڑی روک لی۔ اس کی گاڑی پندرہ بیس گز آگے جا رکی تھی۔ وہ اتر کر میجر سمیع کی طرف دوڑا آیا۔ اس کے بازو میجر سمیع کے ساتھ بغلگیر ہونے کے لئے پھیلے ہوئے تھے۔ میجر سمیع نے بھی اپنے بازو پھیلا دیئے۔ دونوں دوست اس طرح ملے جیسے ایک مدت بعد ملے ہوں۔ کیپٹن آصف بھی دوڑا گیا اور ایسی ہی بے تکلفی اور پیار سے عثمان ملا۔

"ہیلو سر!" ـــ عثمان نے سمیع سے پوچھا ـــ "آپ یہاں کیسے کھڑے ہیں سر؟"

"کیوں سر، سر کئے جا رہے ہو یار!" ـــ سمیع نے کہا ـــ "ہم تو ایسے ہی گھومنے پھرنے نکلے تھے۔ تم کہاں جا رہے ہو؟"

"ایک میٹنگ پر جا رہا ہوں" ـــ عثمان نے برا سا منہ بنا کر کہا ـــ "ان رشتہ داروں نے تو ناک میں دم کر رکھا ہے.... اوہ ڈیم اِٹ.... یہ باسٹرڈ کزن ہے۔ حکم ملا ہے کہ اسے ماڈل ٹاؤن ڈراپ کر دینا۔ اس پک اینڈ ڈراپ نے تو میری جان کھا لی ہے۔ جی چاہتا ہے گاڑی بیچ ڈالوں"۔

"یہ ایم اے خان تمہارے کوئی رشتہ دار ہیں؟"

"ٹو فار ریلیشن" ـــ عثمان نے کہا ـــ "دُور پار کی رشتہ داری ہے اور ان کی میرے فادر کی بڑی گہری دوستی ہے جو مجھے کبھی کبھی بڑی مہنگی پڑتی ہے"۔

"چلو پھر ہم بھی تمہارے پیچھے پیچھے آتے ہیں" ـــ کیپٹن آصف نے کہا ـــ "اسے ڈراپ کرو اور پھر کہیں چل کر ٹائم پاس کرتے ہیں"۔

"نہ یار!" ـــ عثمان نے کہا ـــ "یہ لوگ ابھی مجھے چھوڑیں گے نہیں"۔

میجر سمیع باتیں کرتے کرتے آہستہ آہستہ عثمان کی گاڑی کی طرف چل پڑا۔ عثمان نے اس کا بازو پکڑ لیا کہ وہ اس کی گاڑی کی طرف نہ جائے لیکن آصف بھی اس کی گاڑی کی طرف چل پڑا۔ عثمان دونوں کو ظاہری طور پر روک نہیں سکتا تھا۔ اس نے کوئی بات شروع کر دی لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کے یہ دوست اس وقت دوست کم اور جاسوس زیادہ تھے۔ وہ نہ رکے۔ میجر سمیع نے اپنا بازو میجر عثمان کی کمر میں ڈال لیا اور کوئی بات شروع کر کے آہستہ آہستہ اسے بھی اس کی گاڑی کی طرف لے جانے لگا۔

"تم یہیں ٹھہرو یار!" ـــ عثمان نے تیزی سے کہا ـــ "میں ذرا جلدی میں ہوں....اوکے.... بائی بائی!"

میجر سمیع نے اس کی بائی بائی کی طرف توجہ ہی نہ دی اور اسے بازو کے گھیرے میں لئے ہوئے چلتا گیا اور اس کی گاڑی تک پہنچ گیا۔

گاڑی کی اگلی سیٹ پر لوسی بیٹھی تھی۔ اس نے جب دیکھا کہ یہ سب اس کی طرف آ رہے ہیں تو اس نے یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ وہ سوشل ہے اور سوسائٹی کے آداب جانتی ہے، گاڑی سے نکل آئی۔

"یہ میری کزن ناہید ہیں" ـــ میجر عثمان نے اپنے دوستوں سے تعارف کرواتے ہوئے کہا ـــ "اور ناہید! یہ میرے دوست میجر سمیع اور کیپٹن آصف ہیں"۔

سلام و دعا، ہیلو، ہاؤ ڈو یو ڈو کا تبادلہ ہوا۔ عثمان نے کسی گھبراہٹ کا مظاہرہ کئے بغیر سمیع اور آصف سے ہاتھ ملایا، لوسی کو گاڑی میں بیٹھنے کو کہا۔ خود بھی گاڑی میں بیٹھا اور گاڑی چلی گئی۔

"اس لڑکی کو میں نے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے" ـــ سمیع نے آصف سے کہا ـــ "اور مجھے یہ بھی یاد ہے کہ دو تین آدمیوں نے اس لڑکی کے متعلق ایسے ریمارکس دیئے تھے جن سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ یہ کوئی شریف لڑکی نہیں۔ میں یہ یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ عثمان کی کزن نہیں"۔

"یہ تو وینا بھابی بتا دے گی" ـــ آصف نے کہا ـــ "اس سے پوچھ لیں گے کہ

فلاں کوٹھی میں ان کا ایم اے خان نام کا کوئی رشتہ دار رہتا ہے"۔

"یہ ٹھیک کہا تم نے" —— میجر سمیع نے کہا —— "وینا بھابی سے ہی پوچھ لیں گے۔ پہلے یہ تو دیکھ لیں ماڈل ٹاؤن جا رہا ہے یا کہیں اور"۔

سمیع اور آصف یہ باتیں اپنی گاڑی میں بیٹھے کر رہے تھے اور ان کی گاڑی کچھ فاصلہ رکھ کر عثمان کی گاڑی کے پیچھے جا رہی تھی۔ انہوں نے دیکھا کہ ماڈل ٹاؤن کی طرف مڑنے کی بجائے عثمان کی گاڑی دوسری طرف مڑ گئی تھی۔ میجر سمیع نے فاصلہ ذرا اور زیادہ کر دیا۔ دونوں کی نظر عثمان کی گاڑی پر تھی۔ جاتے جاتے عثمان کی گاڑی فورٹریس سٹیڈیم کے اندر مڑ گئی اور اسی ریستوران کے سامنے جا رکی جہاں وہ اکثر جایا کرتے تھے۔

میجر سمیع اور کیپٹن آصف گاڑی اسی ریستوران سے دور پارک کر کے باہر کھلے لان میں جا بیٹھے اور عثمان کے نکلنے کا انتظار کرنے لگے۔

عثمان اور لوسی ایک گھنٹے سے کچھ زیادہ وقت بعد ریستوران سے نکلے، گاڑی میں بیٹھے اور چلے گئے۔ سمیع اور آصف نے اپنی گاڑی میں ان کا تعاقب کیا۔ عثمان کی گاڑی پھر ایم اے خان کی کوٹھی میں داخل ہو گئی۔ میجر سمیع اپنی گاڑی آگے لے گیا اور ایک جگہ روک کر دونوں گاڑی میں بیٹھے بیٹھے پیچھے دیکھنے لگے۔ عثمان کی گاڑی کوٹھی سے نکلی اور دوسری طرف چلی گئی۔ اس کے دونوں دوستوں نے دیکھا کہ عثمان گاڑی میں اکیلا تھا۔ اب تو کوئی شک ہی نہ رہا۔

○

اگلے روز میجر سمیع نے عثمان کے گھر فون کیا۔ اس وقت عثمان اپنے آفس میں تھا۔ وینا نے فون سنا۔ سمیع نے وینا سے پوچھا کہ فلاں جگہ فلاں نمبر کی کوٹھی میں رہنے والا ایم اے خان آپ کا کیا لگتا ہے۔

"نہیں بھائی جان!" —— وینا نے کہا —— "ہمارے رشتہ داروں میں کوئی ایم اے خان نہیں اور جو جگہ آپ بتا رہے ہیں اُس طرف تو ہماری رشتہ داری یا برادری کا کوئی آدمی نہیں رہتا..... کیوں بھائی جان! آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

سمیع ابھی اسے بتانا تو نہیں چاہتا تھا لیکن وینا نے اتنی ضد کی کہ سمیع کو بتانا پڑا۔

"عثمان کو ہم نے اس کوٹھی میں جاتے دیکھا ہے" —— میجر سمیع نے وینا کو بتایا —— "آپ کا شک ٹھیک ہے لیکن میری ایک بات مان لیں۔ آپ عثمان سے باز پُرس نہ کرنا،

انجان بنی رہنا تاکہ اسے یہ پتہ نہ چل سکے کہ اس کا راز کھل گیا ہے، پھر وہ محتاط ہو جائے گا اور ہم اسے پکڑ نہیں سکیں گے۔ آپ یہ کام ہم پر چھوڑیں..... یہ بتائیں کہ گزشتہ رات عثمان نے کھانا گھر کھایا تھا؟"

"نہیں بھائی جان!" —— وینا نے جواب دیا —— "کہتے تھے پیٹ بڑا سخت خراب ہے اس لئے آج کچھ بھی نہیں کھاؤں گا پھر وہ باہر نکل گئے تھے"۔

"بھابی جان!" —— میجر سمیع نے کہا —— "میں آپ کو بڑی سختی سے ایک بار پھر کہتا ہوں یہ عثمان پر آپ ظاہر ہی نہ ہونے دیں کہ آپ کو اس پر کچھ شک ہے۔ اس کی بے رخی اور وہ تمام رویّہ جو آپ کو ناگوار گزرتا ہے وہ خندہ پیشانی سے برداشت کرتی رہیں"۔

وینا نے وعدہ کیا کہ وہ اس سلسلے میں سمیع کے ساتھ پورا پورا تعاون کرے گی۔



میجر سمیع اور کیپٹن آصف نے اگلے چودہ پندرہ دنوں میں دو تین مرتبہ اسی طرح میجر عثمان کا تعاقب کیا۔ ایک بار اسے ایم اے خان کی کوٹھی میں داخل ہوتے اور لوسی کو ساتھ لئے ایک ہوٹل میں جاتے دیکھا۔ ایک بار عثمان کوٹھی میں داخل ہُوا۔ سمیع اور آصف ایک گھنٹہ باہر کھڑے رہے۔ عثمان نہ نکلا اور پھر ایک بار عثمان لڑکی کو ساتھ لئے کہیں اور چلا گیا۔ ٹریفک کے رش کی وجہ سے اس کے یہ دونوں دوست اس کا تعاقب نہ کر سکے۔

ایک روز میجر سمیع اس علاقے میں اپنے کسی کام سے گیا۔ چھُٹی کا دن تھا۔ سمیع نے جہاں اپنی گاڑی پارک کی وہاں سے ایم اے خان کی کوٹھی سامنے نظر آ رہی تھی۔ وہ ویسے ہی ٹہلتا ٹہلتا اس کوٹھی کے گیٹ کے سامنے سے گزرا پھر اگلے گیٹ کے سامنے سے گزرا اور واپس آ گیا۔ گیٹ کے سامنے رک کر اس نے اندر دیکھا پھر آہستہ آہستہ آگے کو چلا پھر رُکا اور پیچھے کو مڑا۔ ساتھ والی کوٹھی کے گیٹ پر ایک معزز صورت ضعیف العمر آدمی کھڑا تھا۔ وہ کوئی باوقار شخصیت لگتا تھا۔ وہ سمیع کو دیکھ رہا تھا۔ سمیع بھی خوبرو اور خوش پوش جوان تھا۔ وہ جب ایک بار پھر ایم اے خان کی کوٹھی کے گیٹ کی طرف دیکھنے لگا تو اسے آواز سنائی دی۔

"کیوں بیٹا!" —— یہ اُس معزز بوڑھے کی آواز تھی۔

سمیع نے ادھر دیکھا۔ بوڑھا اس سے مخاطب تھا۔

"کسی کا گھر تلاش کر رہے ہو؟"

"ہاں انکل!" — سمیع نے بوکھلا کر جواب دیا جیسے وہ پکڑا گیا ہو — "یہ کوٹھی دیکھ رہا ہوں۔ معلوم نہیں یہ کون ایم اے خان صاحب ہیں.... آپ تو انہیں جانتے ہوں گے۔ یہ کون لوگ ہیں؟"

"پہلے یہ بتاؤ" — اس بزرگ نے پوچھا — "کیا یہ لوگ تمہارے رشتہ دار ہیں؟"

"نہیں انکل!" — سمیع نے اُکھڑی اُکھڑی سی آواز میں جواب دیا — "میں انہیں زیادہ نہیں جانتا"۔

بوڑھے نے سمیع کے ساتھ کچھ اور باتیں بھی کیں۔ سمیع نے بھی باتیں کیں۔ بوڑھے نے سمیع کے لب و لہجے سے کچھ محسوس کیا اور اس کے بوڑھے ہونٹوں پر تبسم سا آگیا۔ یہ بزرگ عمر کے اُس مقام تک پہنچ گیا تھا جہاں موقع بے موقع تجسس پیدا ہو جاتا ہے اور زبان بے قابو ہو کر کچھ نہ کچھ بولنے لگتی ہے۔ اس عمر میں انسان بے خوف اور نڈر ہو جاتا ہے۔ اس بزرگ نے سمیع کا انداز دیکھ کر ایسی ہی بے خوفی اور جرأت کا مظاہرہ کیا۔

"ایک بات بتاؤ بیٹا!" — بوڑھے نے کہا — "اگر تم ان لوگوں کو نہیں جانتے تو یہاں کیوں آئے ہو؟.... معاف رکھنا' میں تمہارے ذاتی معاملات میں دخل دے رہا ہوں لیکن کچھ سوچ اور کچھ سمجھ کر.... اس کوٹھی میں تم جیسے نوجوان اور جوان آدمی آتے ہی رہتے ہیں اور میرا خیال ہے وہ سب ان کے رشتہ دار نہیں ہوتے۔ معلوم ہوتا ہے تم بھی انہی جوانوں میں سے ہو"۔

"انکل!"

"مجھے انکل نہ کہو تو کتنا اچھا لگے" — بوڑھے نے بڑے پیارے لہجے میں کہا — "ہم اُس دَور کے آدمی ہیں جب انکل کا لفظ انگریزی میں پڑھا تھا تو یہ مجھ جیسے نالائق طالب علموں کو بہت برا لگا تھا کیونکہ ہمیں اس کے سپیلنگ (ہجے) یاد نہیں رہتے تھے۔ میں انکل کو ہمیشہ یو این سی اے ایل لکھا کرتا اور ماسٹر سے ایک دو تھپڑ کھایا کرتا تھا۔ ویسے ہی انکل کا لفظ سن کر گورے بادشاہ یاد آجاتے ہیں یا ذہن میں انکل سام آجاتا ہے۔ یہ

دونوں چیزیں مجھے بہت بُری لگتی ہیں"۔

ضعیف العمری کے اثرات کے تحت اس بزرگ کی زبان بے قابو ہو گئی تھی۔ سمیع خاصا ذہین فوجی افسر تھا۔ اس نے ہنس کر بوڑھے کی زبان کی باگیں کھینچ لیں۔

"بابا جان کہہ لوں؟" — سمیع نے اس بزرگ سے پوچھا — "یا جو آپ کو اچھا لگے"۔

"ہاں یہ بات!" — بوڑھے نے کہا — "بابا جان کتنا پیارا لفظ ہے.... اب بات کرو"۔

"دراصل بابا جان!" — سمیع نے کہا — "بات یہ ہے کہ میں جاننا چاہتا ہوں کہ یہ ایم اے خان کون ہیں۔ اگر یہ آپ کے کوئی عزیز یا دوست ہیں تو پھر میں بات نہیں کروں گا"۔

"اندر آجاؤ!" — بوڑھے نے سمیع سے کہا اور اسے اندر لے گیا اور لان میں رکھی ہوئی کرسیوں پر دونوں جا بیٹھے۔ بوڑھے نے کہا — "یہ میرے کچھ نہیں لگتے.... کیا تم سی آئی ڈی کے آدمی ہو یا ملٹری انٹیلی جنس کے؟ تمہاری ڈیل ڈول بتاتی ہے کہ تم پولیس کے آدمی ہو یا فوج کے"۔

"نہ بابا جان نہ!" — میجر سمیع نے جواب دیا — "میں فوج کا آدمی نہیں نہ پولیس کے ساتھ میرا کچھ تعلق ہے۔ میں آپ کے ساتھ صاف بات کر دوں۔ میرا ایک دوست اس کوٹھی میں آتا ہے اور یہاں سے ایک لڑکی کو گاڑی میں بٹھا کر چلا جاتا ہے۔ وہ شادی شدہ ہے اور اس لڑکی کے ساتھ اس نے تعلقات پیدا کر رکھے ہیں"۔

"اور تم جاننا چاہتے ہو کہ یہ کون لوگ ہیں" — بوڑھے نے سمیع کی بات مکمل کرتے ہوئے کہا — "اس کوٹھی میں آدمی آتے ہی رہتے ہیں۔ ان میں عورتیں بھی ہوتی ہیں اور مرد بھی۔ آمدورفت کا یہ سلسلہ رات کو کچھ زیادہ ہو جاتا ہے۔ تمہاری طرح میں بھی جاننا چاہتا ہوں کہ یہ کون لوگ ہیں۔ میں پرانے وقتوں کا آدمی ہوں جب لوگ ایک دوسرے کو اس لئے جاننے کی کوشش کرتے تھے کہ آپس کا پیار بڑھے اور ہو سکتا ہے اس اجنبی کو کسی چیز کی ضرورت ہو مگر آج وہ زمانہ آگیا ہے کہ ایک گھر میں میت پڑی ہے اور ساتھ والے گھروں سے فلمی گانوں اور انگریزی میوزک کی آوازیں اٹھ رہی ہیں۔ دیکھ لو ان کی اور ہماری کوٹھی کی دیوار سانجھی ہے لیکن ہم ایک دوسرے کو جانتے اور

پہچانتے ہی نہیں.... کیا تم اپنے دوست کے متعلق اس لئے پریشان ہو کہ وہ اس کوٹھی میں آتا ہے؟"

"ہاں بابا جان"۔

"یہ کوئی مشکوک قسم کے لوگ ہیں" — بزرگ نے کہا — "بہت بُرا لگتا ہے کہ کسی شہادت اور ثبوت کے بغیر کسی کے خلاف کوئی بات کی جائے لیکن اس کوٹھی کی سرگرمیاں کچھ ایسی پرُاسرار سی ہیں کہ میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ جو کوئی بھی ہیں' شریف لوگ نہیں۔ یہ عصمت فروش ہو سکتے ہیں۔ آج کل عصمت فروشی بھی نئے کلچر کا حصہ بن گئی ہے۔ رنڈیوں کے بازار کی طرح اب عصمتوں کے سودے نہیں ہوتے البتہ لین دین کسی اور طریقے سے ہوتا ہے اور یہ لوگ اپنے آپ کو اونچی اور مہذب سوسائٹی کے افراد کہلاتے ہیں.... مجھے یہ سمگلر بھی نظر آتے ہیں لیکن سمگلروں کی حرکتیں ذرا مختلف ہوتی ہیں۔ دیکھو بیٹا! میں نے یہ بال دھوپ میں بیٹھ کر سفید نہیں کئے۔ میں خاندانی لحاظ سے زمیندار ہوں۔ اللہ کے فضل و کرم سے خاصی زیادہ زرخیز اراضی کا مالک ہوں۔ اس کے علاوہ میں انگریزوں کے وقتوں کا ریٹائرڈ صوبیدار میجر ہوں۔ جنگ عظیم کے زمانے میں مَیں انٹیلی جنس میں بھی رہ چکا ہوں۔ فوجی سے مراد یہ نہیں کہ میں ان پڑھ تھا جیساکہ انگریزوں کے زمانے میں فوجی ہُوا کرتے تھے۔ میں کچھ پڑھا لکھا بھی ہوں۔ مجھے یہ لوگ مشکوک لگتے ہیں"۔

"میں یہی جاننا چاہتا تھا" — میجر سمیع نے چونک کر کہا — "بابا جان! اگر آپ میری مدد کریں تو یہ بہت بڑی نیکی ہوگی.... میں اب آپ کو اپنے متعلق سچّی بات بتا سکتا ہوں۔ میں پاک آرمی میں انفنٹری میں ہوں اور میں میجر ہوں"۔

"اوہ بسم اللہ!" — بوڑھے نے اشتیاق سے سمیع کا ایک ہاتھ پکڑ کر چوما اور بولا — "پھر تو تم میرے سگے بیٹے ہو"۔

"ضروری نہیں کہ یہ لوگ سمگلر یا جاسوس ہی ہوں" — میجر سمیع نے کہا — "ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہمارا یہ دوست اس کوٹھی کی ایک لڑکی کے جال میں آگیا ہے۔ اس کا سب سے پہلا برا اثر تو اس کے اپنے ہی گھر پر پڑا ہے۔ وہ اس طرح کہ اس کی توجہ اپنی بیوی اور بچوں سے ہٹ گئی ہے۔ توجہ بھی ایسی ہٹی ہے کہ ان سے اُکتایا اُکتایا سا لگتا ہے جیسے ایک بیوی اور دو بچوں کا بوجھ سزا کے طور پر اس پر ڈال دیا گیا ہو۔ میرا یہ دوست

بیوی بچوں سے دُور ہی دُور رہتا چلا جا رہا ہے بلکہ یوں کہئے کہ وہ گُم ہو گیا ہے"۔

"میں سمجھتا ہوں" — بزرگ نے کہا — "میں اس کوٹھی کی لڑکیوں کو دیکھتا رہتا ہوں۔ دو تین لڑکیاں ہیں۔ ان کے حسن و جمال اور ناز و انداز میں وہ جادو صاف نظر آتا ہے جو بیٹوں کو ماؤں بہنوں کے لئے اور خاوندوں کو بیویوں کے لئے اور باپوں کو بچوں کے لئے گُم اور لاپتہ کر سکتا ہے"۔

"اور بابا جان!" — میجر سمیع نے کہا — "دوسرا نقصان مالی ہے۔ ہمارا یہ دوست بڑے امیر باپ کا بیٹا ہے۔ اپنی تنخواہ تو اُڑا ہی دیتا ہے' ماں باپ سے بھی اچھی خاصی رقم لے کر کھا پی جاتا ہے"۔

"کھا پی نہیں جاتا" — بوڑھے نے کہا — "کھلا پلا دیتا ہے۔ میں نے ایسے بے شمار جوان دیکھے ہیں۔ ان سے کھانے پینے والے انہیں شہزادے کہتے ہیں اور اتنی ہوا دیئے رکھتے ہیں کہ وہ غباروں کی طرح فضاؤں میں اُڑتے رہتے ہیں"۔

"آپ نے ٹھیک فرمایا بابا جان!" — میجر سمیع نے کہا — "میرے دوست کی بیوی یوں ہے جیسے میری سگی بہن ہو۔ نقصان صرف یہ نہیں کہ میرا دوست اپنی اتنی اچھی ازدواجی زندگی کو تباہ کر رہا ہے' اس کے ساتھ دوسرا نقصان مالی ہو رہا ہے۔ اس شخص کے بچّوں کا مستقبل تباہ ہو رہا ہے.... اگر آپ انٹیلی جنس میں رہے ہیں تو آپ میری مدد کر سکتے ہیں۔ میں اپنا مقصد ذرا اور واضح کر دوں۔ میں یہ نہیں جاننا چاہتا کہ یہ لوگ کون ہیں اور کیا کرتے ہیں' میں اس کوٹھی سے اپنے دوست کو رہا کرانا چاہتا ہوں"۔

"کیا تم نے اس کے ساتھ براہ راست بات نہیں کی؟" — بزرگ نے پوچھا۔

"ابھی نہیں" — میجر سمیع نے جواب دیا — "میں نے اور میرے کیپٹن دوست نے اس سے اشاروں اشاروں میں پوچھا ہے وہ صاف جھوٹ بول جاتا ہے"۔

"اُس کے لئے جھوٹ بولنا ضروری ہو گیا ہے" — بوڑھے نے کہا — "جس شخص کی پرائیویٹ زندگی اُس بیہودہ راستے پر چل پڑے وہ تو خُدا کے حضور بھی جھوٹ بولتا ہے اور خوش ہوتا ہے کہ اس نے خدا کو بھی بڑی کامیابی سے دھوکہ دے دیا ہے.... تم کہتے ہو کہ یہ لوگ مشکوک ہیں یا نہیں' اور تمہیں ان سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں تمہیں یہ بتاتا ہوں کہ مجھے ان لوگوں کے ساتھ یہی ایک دلچسپی ہے کہ یہ مجھے مشکوک نظر آتے ہیں اور یہ جاسوس بھی ہو سکتے ہیں۔ بہرحال میں اب انہیں اسی شک میں دیکھوں گا

اور کوشش کروں گا کہ ان کی اصلیت کا پتہ چل جائے"۔

میجر سمیع اس بزرگ سے اتنا زیادہ متاثر ہُوا کہ اس کا وہاں سے اٹھنے کو جی ہی نہیں چاہتا تھا۔ یہ معزز بوڑھا چہرے مہرے سے بات کرنے کے انداز سے' اور اس کی باتوں میں جو عقل و دانش تھی' اس سے بھی اپنے آپ میں ایسی طاقت رکھتا تھا جو دوسروں پر اثر انداز ہوتی تھی۔ یہ بوڑھا تھا ہی دانشمند۔ اس نے سمیع کے ساتھ بہت باتیں کی تھیں اور اس نے یہ بھی کہا تھا کہ اس نے کتابیں نہیں پڑھیں' انسانوں کو زیادہ پڑھا ہے۔ اس نے انسانوں کو چہروں سے نہیں بلکہ ان کے ضمیر کو بے پردہ کر کے پہچانا تھا۔ یہ وہ علم تھا جو سکہ بند عالموں کے پاس بھی نہیں ہوتا۔

میجر سمیع کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ اس کے دو بیٹے ہیں جو کوئی پرائیویٹ کاروبار کرتے ہیں۔ بوڑھے کی بیوی فوت ہو چکی تھی۔ اس نے میجر سمیع سے کہا کہ اس کا اپنا شغل یہی رہ گیا ہے کہ گیٹ پر کھڑا سڑک سے گزرتے لوگوں کو دیکھتا رہتا ہے۔

"شک کی نظروں سے؟" ––– میجر سمیع نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"ہاں!" ––– بوڑھے نے بے ساختگی سے کہا ––– "آج جو بات تم نے مذاق کے لہجے میں کہی ہے وہ میری عمر میں پہنچ کر تم بڑی سنجیدگی سے کہا کرو گے" ––– بوڑھے نے سمیع کی طرف جھک کر رازدارانہ لہجے میں کہا ––– "دیکھ بیٹا! اجنبی کو اور ہر اُس انسان کو جسے تو پُوری طرح نہیں جانتا' شک و شبے کی نظر سے دیکھ بلکہ جنہیں تُو جانتا ہے انہیں بھی اُس وقت تک شک کی نگاہوں سے دیکھ جب تک اس کی اصلیت تیرے آگے کھل کر نہیں آ جاتی۔ آج کا زمانہ روپ بہروپ کا زمانہ ہے' انسان باہر سے کچھ اور اندر سے کچھ اور ہوتے ہیں۔ اپنے دوست ہی کی مثال اپنے سامنے رکھو۔ ان لوگوں نے اس پر یہ ظاہر کیا ہو گا کہ وہ بڑے ہی شریف اور باعزت لوگ ہیں لیکن نظر یہی آتا ہے کہ یہ لوگ کسی اور چکر کے لوگ ہیں۔ انٹیلی جنس اور پولیس کا بنیادی اصول یہی ہوتا ہے کہ ہر کسی کو شبے کی نگاہ سے دیکھو.... میں نے تجھے اس کوٹھی کے سامنے سے گزرتے دیکھا' تمہاری رفتار کم ہوئی' پھر تم واپس آئے تو میں سمجھ گیا کہ یہ لڑکا کچھ ڈھونڈ رہا ہے لیکن تم نہ سمجھ سکے کہ تجھے کوئی شک کی نگاہوں سے دیکھ رہا ہے"۔

میجر سمیع جب وہاں سے لوٹا تو اس کا ذہن خاصا صاف ہو چکا تھا اور اسے ایک ایسا جذباتی سہارا مل گیا تھا جس نے اس میں اخلاقی جرأت پیدا کر دی تھی۔

اگلی ہی شام میجر سمیع نے میجر عثمان کو بریگیڈ ہیڈ کوارٹر میں فون کیا اور کہا کہ آج شام کہیں باہر گذارنی چاہیے۔

"آ جاؤ" ––– میجر عثمان نے کہا ––– "بتاؤ کون سے ہوٹل میں چلو گے؟"

"تمہارے دماغ میں ہوٹل کے سوا کچھ اور رہا ہی نہیں" ––– میجر سمیع نے کہا ––– "رات کھانا کھا کر.... ساڑھے آٹھ' نو کے درمیان لارنس گارڈن کے مال روڈ والے گیٹ پر آ جانا"۔

رات نو بجے میجر عثمان' میجر سمیع اور کیپٹن آصف لارنس گارڈن میں پتھر کے ایک بنچ پر بیٹھے ہوئے تھے۔

"آج ہم تم سے ایک خاص بات کرنا چاہتے ہیں عثمان!" ––– میجر سمیع نے کہا ––– "اگر ہمیں اپنا عزیز دوست سمجھتے ہو تو ہم بات کریں گے اور اگر تم ہمیں اتنی اہمیت نہیں دیتے تو بتا دو۔ تمہارے ذاتی معاملات میں دخل دینے کا ہمیں کوئی حق نہیں"۔

"نان سینس!" ––– عثمان نے بے تکلفی سے کہا ––– "یہ کیا فضول باتیں شروع کر دی ہیں۔ کہو کیا کہنا ہے۔ میرے ذاتی معاملات صرف میرے نہیں' یہ تمہارے بھی ہیں ...کم آن سپیک اَپ"۔

"وہ ایم اے خان کون ہے؟" ––– سمیع نے پوچھا۔

"کس ایم اے خان کی بات کر رہے ہو؟" ––– عثمان نے انجان سا بن کر پوچھا۔

"جس کی کوٹھی میں تم جاتے ہو" ––– سمیع نے کہا۔

"اور وہاں سے ایک لڑکی کو گاڑی میں بٹھا کر باہر نکل جاتے ہو" ––– کیپٹن آصف نے کہا۔

"اوہ' ڈیش اٹ!" ––– عثمان نے بڑے خوشگوار لہجے میں کہا ––– "یار' میں اپنی اس بیوی سے تنگ آ گیا ہوں۔ میں سمجھ گیا ہوں کہ اس نے تم دونوں کو اسی وہم میں مبتلا کر دیا جس میں وہ خود مبتلا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تم ایک دو مرتبہ شام کو میری غیر حاضری میں میرے گھر گئے تھے۔ وائف نے مجھے بتایا تھا.... بڑی وہمی لڑکی ہے۔ مجھے صرف اس ایک سوال سے پریشان کئے رکھتی ہے کہ تم شام کو کسی عورت کے پیچھے نکل جاتے ہو وہ عورت کون ہے"۔

"لیکن ہم دونوں اس وہم کو یقین میں بدل چکے ہیں" ــــ میجر سمیع نے کہا۔
"ہم نے جو چیز اپنی آنکھوں دیکھ لی ہے' اسے ہم وہم کس طرح کہہ سکتے ہیں؟"
"کیا دیکھا ہے تم نے؟" ــــ عثمان نے پوچھا۔

سمیع اور آصف نے جو دیکھا تھا وہ عثمان کو سنا دیا۔ اسے یہ نہ بتایا کہ انہوں نے اس کا تعاقب کیا تھا بلکہ یہ کہا کہ وہ اتفاق سے اُدھر سے گزر رہے تھے۔

"بات کچھ بھی نہیں یار!" ــــ عثمان نے کہا ــــ "اس لڑکی کا منگیتر میرا دوست ہے۔ بڑا دلچسپ آدمی ہے۔ میں اسے ملنے جایا کرتا ہوں"۔

"یہ کون لوگ ہیں!" ــــ میجر سمیع نے پوچھا ــــ "کیا یہ یہیں کے رہنے والے ہیں؟ کرتے کیا ہیں؟"

"بڑی ڈیسنٹ فیملی ہے یار!" ــــ عثمان نے بتایا ــــ "ان کے بڑے لمبے چوڑے کاروبار ہیں"۔

عثمان کے ان دونوں دوستوں نے اس کے ساتھ بہت باتیں کیں' بہت سوال پوچھے لیکن عثمان جھوٹ بولتا چلا گیا۔ انہوں نے اسے یہ بھی یاد دلایا کہ ایک رات ان دونوں نے اسے اس لڑکی کے ساتھ دیکھا تھا اور اس نے ان کے ساتھ لڑکی کا تعارف بھی کرایا تھا۔

"دیکھو عثمان!" ــــ سمیع نے کہا ــــ "ہم تمہارے دوست ہیں۔ تم نے خود کہا ہے کہ تمہارے ذاتی معاملات ہمارے معاملات ہیں تو ہمیں دوستی کا حق ادا کرنے دو"۔

"یہ وہم دل سے نکال دو کہ وینا بھابی نے ہمیں تمہارے رویّے کے متعلق کچھ بتایا ہے۔ ہم نے یہ ضرور محسوس کیا ہے کہ بھابی کچھ پریشان ہے" ــــ کیپٹن آصف نے کہا ــــ "میں تو بھابی سے پوچھنے لگا تھا کہ وہ اتنی گھبرائی گھبرائی اور اتنی نروس کیوں ہیں لیکن میں پوچھتے پوچھتے رہ گیا۔ پھر جب ہم نے تمہیں کسی اور ہی راستے پر جاتے دیکھ لیا تو ہم سمجھ گئے کہ ہماری بھابی کی پریشانی کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے معلوم ہے کہ تم کہیں اور رومان لڑا رہے ہو"۔

"اگر بھابی کو ابھی معلوم نہیں ہُوا تو چند دنوں تک معلوم ہو جائے گا" ــــ سمیع نے کہا ــــ "ہم تمہیں صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس چکر سے نکل آؤ۔ یہ بھی تو معلوم نہیں کہ یہ کون لوگ ہیں۔ اتنی خوبصورت ازدواجی زندگی کو تباہ نہ کرو"۔

عثمان نے دوستوں کی بات سننے کی بجائے اپنی بیوی کے نقائص بیان کرنے شروع کر دیئے۔ ان نے سب سے بڑا جو نقص بیان کیا وہ یہ تھا کہ وہ گھریلو عورت بن گئی ہے اور سوشل نہیں ہوئی۔

"کیا تم یہ چاہتے ہو کہ تمہاری بیوی بھی اسی سوسائٹی میں گھومے پھرے اور غیر مردوں کے ساتھ فری ہو جائے" ــــ میجر سمیع نے کہا ــــ "کیا تم اس سوسائٹی کو نہیں جانتے؟"

"جانتا کیوں نہیں!" ــــ کیپٹن آصف نے کہا ــــ "یہ خود اسی سوسائٹی کا آدمی ہے' اور یہ جانتا ہے کہ اس سوسائٹی میں نوجوان بیویوں' بہنوں اور سالیوں کے تبادلے کس طرح کئے جاتے ہیں"۔

میجر سمیع نے بھی عثمان کو بڑی تیکھی اور چُبھتی ہوئی باتیں کہہ ڈالیں۔ کیپٹن آصف نے تو اور زیادہ تلخ باتیں کہیں لیکن عثمان اس قدر پتھر ہو چکا تھا کہ وہ ہنس ہنس کر دونوں دوستوں کو ٹالتا رہا۔

"اب میں تمہیں ایک نازک سی بات کہنے لگا ہوں" ــــ میجر سمیع نے کہا ــــ "وینا بھابی نے ہمیں اس معاملے میں اور تو کچھ نہیں بتایا صرف یہ بتایا ہے کہ تم جب گھر جاتے ہو تو اکثر ہوتا یوں ہے کہ تم غنودگی کی حالت میں ہوتے ہو اور بڑی جلدی سو جاتے ہو"۔

"ہاں یار!" ــــ میجر عثمان نے کہا ــــ "وہ ٹھیک کہتی ہے۔ معلوم نہیں کیا بات ہے کہ مجھے بڑی جلدی نیند آ جاتی ہے"۔

"اب ہماری بات ذرا خلوص نیت سے سننے کی کوشش کرو" ــــ سمیع نے کہا ــــ "تم نہیں جانتے کہ تمہیں اتنی جلدی نیند کیوں آ جاتی ہے۔ یہ بتاؤ تمہاری یہ حالت ایم اے خان کی کوٹھی میں جانے سے پہلے بھی ہوا کرتی تھی؟.... میرا خیال ہے اس سے پہلے ایسا نہیں ہوتا تھا"۔

"لگتا کچھ ایسا ہی ہے" ــــ عثمان نے دبی دبی سی آواز میں کہا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ فیصلہ نہ کر سکا ہو کہ یہ اعتراف کرے یا نہ کرے۔

"دیکھ عثمان بھائی!" ــــ سمیع نے کہا ــــ "تم مانو نہ مانو' خود غور کرو کہ جس رات تم ایم اے خان کے ہاں جاتے ہو اور اُس لڑکی کے ہاتھ سے کچھ کھاتے پیتے ہو تو اُس

رات تمہیں گھر آتے ہی نیند آ جاتی ہے اور تم عجیب سا سرور محسوس کرتے ہو"۔

"نہ یار!" —— عثمان نے کہا اور چپ ہو گیا۔ پھر کچھ سوچنے لگا اور بولا —— "کبھی تو ... نہیں نہیں.... ایسا تو نہیں ہوتا" —— اس کے بولنے کا انداز صاف مشکوک لگ رہا تھا۔ اچانک بیدار ہو گیا —— "بات صاف کرو یار! تم کہنا کیا چاہتے ہو"۔

"ہم بڑے ہی خطرناک شک کے پیشِ نظریات کر رہے ہیں" —— سمیع نے کہا —— "تم جن کے ہاں جاتے ہو وہ مشکوک لوگ ہیں۔ میں تمہیں صاف الفاظ میں بتاتا ہوں کہ جس لڑکی کے جال میں تم آئے ہوئے ہو' اسے تمہارے ساتھ کوئی جذباتی لگاؤ نہیں۔ اسے اس عیاشی سے دلچسپی ہے جو تم اسے کراتے ہو یا اس کا مقصد کچھ اور ہے اور تم اسے عشق و محبت سمجھ رہے ہو۔ تم بریگیڈ میجر ہو۔ تم میں کوئی قابلیت دیکھ کر ہی بریگیڈ میجر بنایا گیا ہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ انٹیلی جنس والے، مشتبہ لوگوں اور ملزموں سے اقبال جرم کرانے اور ان کے ساتھیوں کی نشاندہی کرانے کے لئے انہیں ٹارچر نہیں کرتے بلکہ ان کے کھانے میں ٹرانکولائزر ملا دیتے ہیں۔ یہ طریقہ امریکہ کی سی آئی اے نے دریافت کیا ہے جو ہمارے ملک تک بھی پہنچ گیا ہے"۔

"آئی نو دیٹ.... بس بس!" —— عثمان نے کہا —— "مجھے معلوم ہے"۔

"سب سے زیادہ خطرناک چیز جو انٹیلی جنس والے تفتیش میں استعمال کرتے ہیں وہ ایل ایس ڈی ہے" —— میجر سمیع نے کہا —— "یہ جس کے اندر چلی جاتی ہے وہ بڑا پیارا سرور محسوس کرنے لگتا ہے۔ ذہنی طور پر وہ سو جاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ بیدار ہے۔ اس کیفیت میں اس کے سامنے جو بھی بات کرو وہ اسے قبول کرتا چلا جاتا ہے۔ یہ برین واشنگ کا بہترین طریقہ ہے جسے امریکہ کی سی آئی اے نے بڑی کامیابی سے آزمایا ہے"۔

"کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ اس کوٹھی میں میری اس طریقے سے برین واشنگ ہو رہی ہے؟" —— میجر عثمان نے پوچھا۔

"ہاں" —— سمیع نے کہا —— "ہم یہی کہنا چاہتے ہیں اور یہی ہمارا شک ہے"۔

"اوہ' سٹوپڈ!" —— عثمان نے بے رُخی سے کہا —— "دِس از آل نان سینس!"

"اللہ نہ کرے کہ تمہارے ساتھ یہ کچھ ہو رہا ہو" —— کیپٹن آصف نے کہا —— "لیکن ہم تمہیں خبردار کرتے ہیں کہ ٹرانکولائزر کے ذریعے جو برین واشنگ کی جاتی ہے اس کا ایک اثر یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ اس آدمی یا عورت کو اپنا مخلص دوست اور غمخوار

سمجھنے لگتا ہے جو اسے یہ نشہ دیتا ہے' حالانکہ اسے معلوم نہیں ہوتا کہ اسے نشہ پلایا جا رہا ہے"۔

"سوچ عثمان!" —— میجر سمیع نے کہا —— "بی سیریس.... یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ اس عمر میں شادی شدہ ہوتے ہوئے بھی کسی لڑکی کے ساتھ ناجائز تعلقات پیدا کر لینا کوئی ایسی بات نہیں لیکن اپنا دماغ' اپنی حسیں اور اپنی ازدواجی زندگی کی مسرتیں اس لڑکی کے حوالے کر دینا بڑا ہی خطرناک فعل ہے جس کی سزا بیوی کی نسبت بچوں کو زیادہ ملتی ہے"۔

عثمان ایسے مقام پر پہنچ چکا تھا جہاں مخلصانہ باتیں بہت بُری لگا کرتی ہیں اور ہر وہ انسان بُرا لگتا ہے جو اس خطرے سے نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ اپنے دوستوں کی اتنی زیادہ باتیں سن کر بھی عثمان پر کچھ اثر نہ ہُوا بلکہ اس کا انداز کچھ طنزیہ سا تھا جیسے ان دوستوں کو پسماندہ سمجھ رہا ہو۔

یہ دوست کسی نتیجے پر پہنچے بغیر جب وہاں سے اٹھے تو رات کے بارہ بج رہے تھے۔

میجر عثمان جب گھر پہنچا تو وینا کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے عثمان سے رسمی طور پر بھی نہ پوچھا کہ وہ اتنی دیر کہاں رہا ہے اور کیا وہ ٹھیک تو ہے۔ وہ جانتی تھی کہ عثمان نے اپنا دل گھر سے ہٹا کر کہیں اور لگا لیا ہے۔

"تم نے مجھے میرے دوستوں میں ذلیل کرنا شروع کر دیا ہے" —— عثمان نے وینا سے کہا —— "میں یہ ذلت برداشت نہیں کروں گا"۔

"کون سے دوستوں کی بات کر رہے ہیں آپ؟"

"میں زیادہ بکواس نہیں سنوں گا" —— عثمان نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"اور زیادہ بکواس سننے کی عادت مجھ میں بھی نہیں عثمان صاحب!" —— وینا نے دو ٹوک لہجے میں کہا —— "آپ نے لڑائی جھگڑے کو روزمرّہ کی روٹین بنا لیا ہے لیکن میں اس روٹین کو کسی فیصلے پر پہنچا دوں گی"۔

وینا کا لہجہ انداز کچھ ایسا دو ٹوک تھا کہ عثمان پہلی بار دبک سا گیا۔ شاید اس لئے کہ اس کے ضمیر پر جرم کا بوجھ تھا۔

"میری یہ بات غور سے سن لیں" —— وینا نے کہا —— "میں اتنی گھٹیا اور اوچھی نہیں کہ آپ کے دوستوں کے سامنے اپنے گھر کی عزت اور وقار سے پردے اٹھاتی

پھروں"۔

عثمان نے رسمی طور پر لڑائی جھگڑا کیا لیکن اس رات اُس کی باتوں میں وہ جان نہیں تھی جو ہُوا کرتی تھی۔ وینا پریشان تو تھی لیکن اس نے عثمان کی اس بک بک جھک جھک کو اہمیت دینا اور اس کا اثر قبول کرنا چھوڑ دیا تھا۔

"میری ایک بات مان لو وینا!" —— عثمان نے نرم سے لہجے میں کہا —— "بات کچھ بھی نہیں۔ تم ایک وہم میں مبتلا ہو۔ یہ وہم صرف اس صورت میں ختم ہو سکتا ہے کہ تم بھی میرے ساتھ چلا کرو پھر تمہیں پتہ چلے گا کہ میں تمہارے ساتھ بے وفائی کر رہا ہوں یا نہیں۔ میرے ساتھ سوسائٹی میں گھومو پھرو' اٹھو بیٹھو۔ گھر میں بند رہ رہ کر تم نے اپنے ذہن کی وسعت کو محدود کر لیا ہے"۔

"تمہاری سوسائٹی میں؟" —— وینا نے طنزیہ سے لہجے میں پوچھا —— "اس سوسائٹی میں جس میں تم مجھے شادی کے فوراً بعد لے گئے تھے؟"

"نہیں" —— عثمان نے مفاہمت کے لہجے میں کہا —— "وہ سوسائٹی تو میں کبھی کی چھوڑ چکا ہوں۔ خدا کی قسم میں تمہیں بڑے اچھے گھرانوں میں لے جاؤں گا۔ اپر کلاس کے لوگ ہیں"۔

"میں ہر حال میں' ہر رنگ میں آپ کا ساتھ دوں گی" —— وینا نے کہا —— "اللہ نہ کرے کبھی مجھے آپ کے ساتھ فاقہ کشی کرنی پڑی تو بخدا بخوشی کروں گی لیکن اس سوسائٹی میں نہیں جاؤں گی جہاں جا کر انسان گم ہو جاتے ہیں.... میں گم ہو جاؤں گی عثمان صاحب!"

"وہ کیسے؟"

"جیسے آپ ہو گئے ہیں" —— وینا نے کہا —— "میرے لئے اور بچوں کے لئے آپ لاپتہ ہو گئے ہیں"۔

"میں نے جو کہا ہے اس پر غور کرو"۔

"سوچوں گی"۔

○

میجر عثمان کے دوستوں کو توقع تھی کہ وہ عثمان کو اس راستے سے ہٹا لیں گے۔ کچھ ایسی ہی توقع وینا کو تھی۔ اسے خیال تھا کہ وہ عثمان سے بے رُخی سے پیش آئے گی تو

عثمان اس کے آگے ہتھیار ڈال دے گا لیکن یہ سب لوگ خوش فہمیوں میں مبتلا تھے۔

عثمان اس مقام تک پہنچ گیا تھا بلکہ پہنچا دیا گیا تھا جہاں وہ اپنے اور پرائے' دوست اور دشمن کے فرق کو بھول گیا تھا۔ دوستوں نے اسے نادم کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ نادم ہونے کی بجائے فخر محسوس کر رہا تھا کہ اس کے دوست اس سے حسد کرتے ہیں کہ یہ شخص ان کی سوسائٹی میں اتنا مقبول ہو گیا ہے اور اتنی خوبصورت لڑکی اس پر فدا ہے۔

وینا نے کوشش تو کی تھی کہ اپنے والدین اور بھائیوں کو نہ بتائے کہ عثمان نے کیا رنگ اور کیا رویّہ اختیار کر لیا ہے لیکن وہ جس پریشانی اور جذباتی خلفشار میں مبتلا رہتی تھی وہ اس کے چہرے پر صاف نظر آتی تھی۔ ماں نے اس سے پوچھا تو اس نے مصنوعی سی مسکراہٹ سے ٹال دیا تھا لیکن وہ زیادہ عرصہ اپنی پریشانی کو چھپا نہ سکی۔ اس نے ماں کو اصل احوال سنایا اور سناتے سناتے اس کے آنسو نکل آئے۔ ماں نے اس کے باپ کو بتایا پھر وینا کے دونوں بھائیوں کو پتہ چلا۔ اس کے بھائی ایک تو اچھے عہدوں پر لگے ہوئے تھے دوسرے وہ خوددار اور لٹھ باز قسم کے آدمی بھی تھے۔ انہوں نے کہا کہ وہ عثمان کے ساتھ براہِ راست بات کریں گے۔ وہ باز نہ آیا تو کوئی اور کارروائی کریں گے لیکن وینا نے انہیں روک دیا۔

"آپ بھی خاموش رہیں" —— وینا نے بھائیوں سے کہا —— "وہ خود سر اور فضول قسم کا دلیر آدمی ہے۔ بات بنے گی نہیں بگڑ جائے گی"۔

"یہ سوچ لو" —— بڑے بھائی نے وینا سے کہا —— "ہم زیادہ دیر یہ سلسلہ برداشت نہیں کر سکیں گے"۔

یہ چند مہینے پہلے بہن کی اپنے بھائیوں' باپ اور ماں سے باتیں ہوئی تھیں۔ اس کے بعد بھائی اس کے گھر آ کر اس سے پوچھتے رہے کہ عثمان کا رویّہ کیسا ہے۔ وینا انہیں اس طرح بتاتی رہی جیسے یہ معاملہ اتنا سنگین نہیں اور وہ خود سنبھال لے گی۔ اب میجر سمیع اور کیپٹن آصف نے یہ مہم اپنے ہاتھ میں لے لی تھی اور وہ وینا کو اپنی رپورٹ دے رہے تھے۔ انہی دنوں وہ اپنے گھر گئی تو بھائیوں نے اس سے پوچھا کہ اب عثمان کا کیا حال ہے۔ بڑے بھائی نے یہ بھی کہا کہ وہ اپنی ڈگر سے ہٹا نہیں تو اسے ہٹانے کا بندوبست کیا جائے۔

"نہیں بھائی جان!" —— وینا نے کہا —— "اب تو معاملہ کچھ ایسا رنگ اختیار کر گیا ہے کہ میں آپ کو آگے نہیں ہونے دوں گی۔ عثمان کے دو دوست ہیں۔ ایک میجر ہے

اور دوسرا کیپٹن۔ میرے ساتھ وہ ایسے ہی ہیں جیسے آپ دونوں میرے بھائی ہیں۔ انہوں نے وہ کوٹھی بھی دیکھ لی ہے جہاں عثمان جاتا ہے اور ایک لڑکی کو گاڑی میں بٹھا کر کبھی کسی ہوٹل میں اور کبھی کہیں اور لے جاتا ہے۔ عثمان کے دونوں دوستوں نے معلوم کر لیا ہے کہ اس کوٹھی میں رہنے والے مشکوک سے لوگ ہیں۔ سمگلر بھی ہو سکتے ہیں لیکن زیادہ شک یہ ہوتا ہے کہ یہ جاسوسوں کا کوئی گروہ ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ سمگلر بھی نہ ہوں اور جاسوس بھی نہ ہوں اور وہ انہی بے غیرت لوگوں میں سے ہوں جو اپنی بہو بیٹیوں پر سوشل کا لیبل لگا کر عثمان جیسے امیر کبیر شہزادوں کو پھانس لیتے ہیں اور عیش و عشرت کرتے ہیں۔ ہماری سوسائٹی میں ایسے لوگوں کی کوئی کمی نہیں۔ بظاہر معزز اور باوقار لگتے ہیں لیکن عصمت فروشی کو وہ کلچر کا نام دے کر موج میلہ کرتے ہیں"۔

"پھر ان دوستوں سے مجھے ملواؤ" ——— وینا کے بڑے بھائی نے کہا ——— "میں بھی ان کے ساتھ شامل ہو جاتا ہوں"۔

"میں ان دونوں سے بات کر کے آپ کو بتاؤں گی" ——— وینا نے کہا ——— "وہ آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گے اور آپ کو خود ہی بتا دیں گے کہ آپ کا ان کے مشن میں شامل ہونا مناسب ہے یا نہیں، یقین جانیں بھائی جان بڑے ہی مخلص آدمی ہیں"۔



عثمان نے لُوسی کے منگیتر کے ساتھ بھی دوستانہ گانٹھ لیا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی چند ایک ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔ عثمان حیران ہوتا تھا کہ لُوسی کا یہ منگیتر پرکشش آدمی ہے اور اس کی زبان میں ایسی مٹھاس ہے جو دکھی دلوں کو بھی سہلا لیتی ہے اور اُس کی طبیعت اتنی خوشگوار ہے کہ کوئی اُس کے پاس روتا ہوا آئے تو ہنستا ہوا جائے۔ عثمان سوچتا تھا کہ لُوسی اسے کیوں پسند نہیں کرتی۔ یہ سوچ کر عثمان کا اپنا سینہ فخر سے پھیل جاتا تھا کہ وہ اتنا زیادہ خوبرو ہے کہ لوسی جیسی حسین لڑکی نے اس کے مقابلے میں اس خوبرو اور خوشگوار منگیتر کو دل سے اتار دیا ہے اور لوسی کے ماں باپ جیسے امیر اور ایڈوانس لوگوں نے اسے سر آنکھوں پر بٹھایا ہے۔

عثمان اسے اکیلے بھی ملتا رہا تھا اور اس وقت بھی جب لُوسی منگیتر کے ساتھ ہوتی تھی۔ عثمان کبھی کبھی اپنے آپ میں حیران ہوتا تھا کہ لُوسی کے منگیتر کو اچھی طرح معلوم ہے کہ لُوسی اس سے ملتی جلتی ہے اور اُس کے ساتھ لُوسی کی دلچسپی بھی ہے، پھر بھی منگیتر

بُرا نہیں مانتا اور اس نے کبھی ایسا اشارہ بھی نہیں کیا کہ وہ لُوسی اور عثمان کا میل جول پسند نہیں کرتا۔

ایک روز لُوسی نے عثمان کو بتایا کہ اس کے منگیتر کے ساتھ ایک ٹریجڈی ہو گئی ہے۔ منگیتر کا جوان بھائی ایک بس میں لاری اڈے پر مارا گیا تھا۔ یہ بسوں کی ٹکر نہیں تھی بلکہ ایک بس میں ایک بم پھٹا تھا جس میں ابھی تھوڑے سے مسافر بیٹھے تھے۔ ان میں سے دو تو وہیں ہلاک ہو گئے اور باقی سب بُری طرح زخمی ہوئے۔ ہلاک ہونے والوں میں ایک جوان آدمی لوسی کے منگیتر کا سگا بھائی تھا اور منگیتر گھر چلا گیا تھا۔ وہ اس شہر کا رہنے والا نہیں تھا۔

"یہ کل والی خبر تو نہیں؟" ——— عثمان نے کہا ——— "کل اخباروں میں چھپی تھی"۔

"وہی خبر ہے" ——— لوسی نے کہا۔

"یہ ہماری حکومت کی کمزوری ہے" ——— عثمان نے کہا ——— "حکومت جو بھی آتی ہے وہ اپنے اقتدار کا تحفظ کرتی ہے اور وہ اس کام میں اس قدر محو ہو جاتی ہے کہ پورے کا پورا ملک اور ساری کی ساری قوم کے تحفظ اور دفاع کا اسے خیال ہی نہیں رہتا"۔

"تمہارا کیا خیال ہے!" ——— لوسی نے پوچھا ——— "یہ دھماکے کون کرتا ہے؟"

"انڈیا!" ——— عثمان نے جواب دیا ——— "یہ اپنے اندر کی سیاسی تخریب کاری بھی ہو سکتی ہے۔ اپوزیشن والے حکومت کے لئے مسئلے پیدا کرنے کی خاطر اس قسم کے دھماکے بھی کیا کرتے ہیں تاکہ ملک میں خوف و ہراس اور بدامنی کی صورتِ حال پیدا ہو جائے لیکن زیادہ تر دھماکے انڈیا کروا رہا ہے اور اس کا مقصد بھی یہی ہے"۔

"نہیں عثمان!" ——— لوسی نے کہا ——— "انڈیا کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں۔ انڈیا کو کیا پڑی ہے کہ وہ اس طرح چھوٹے موٹے دھماکے کراتا پھرے۔ انڈیا کو اس لئے بدنام کیا جاتا ہے کہ ہماری حکومت کے پاس اس تخریب کاری کا کوئی علاج نہیں اور نہ حکومت کوئی علاج کرنا چاہتی ہے۔ اس کا سہل طریقہ یہ ہے کہ جہاں کہیں تخریب کاری کی کوئی واردات ہو جائے وہ انڈیا کے کھاتے میں ڈال دے"۔

"مجھے تمہاری یہ بات اچھی نہیں لگتی لُوسی!" ——— عثمان نے ہنستے مسکراتے کہا ——— "میں نے تمہیں اکثر انڈیا کی حمایت کرتے ہی دیکھا ہے"۔

"او شٹ اپ!" ——— لوسی نے کہا ——— "آئی ٹاک فیکٹس..... میں پاکستانی ہوں۔

حقیقت کا سامنا کرو، بہرحال میرے منگیتر کو بہت بری چوٹ پڑی ہے"۔

○

چار پانچ دنوں بعد لوسی کا منگیتر واپس آیا اور سیدھا لوسی کے گھر گیا۔ لوسی اور اس کے خاندان کے ہر فرد نے اسے اپنے درمیان بٹھالیا اور ایسے انداز سے اظہارِ افسوس کرنے لگے جیسے مرنے والا بھائی ان سب کا سگا بھائی تھا۔ سب نے نوٹ کیا کہ منگیتر کی آنکھیں خشک تھیں جیسے اسے بھائی کے مرنے کا کوئی افسوس نہ ہو، البتہ اس کے چہرے کے تاثر اُڑے اُڑے سے تھے اور ان سے اندرونی بے چینی صاف ظاہر ہو رہی تھی۔

"میں ایک ضروری بات کرنے آیا ہوں" —— منگیتر نے لوسی کے باپ سے کہا —— "صرف آپ سے!"

باپ کے اشارے پر باقی سب اٹھ کر چلے گئے۔

"کہو صغیر!" —— لوسی کے باپ نے کہا —— "کوئی خاص بات؟ پیسوں کی ضرورت ہے؟"

"نہیں محترم" —— صغیر نے جواب دیا —— "مجھے کچھ نہیں چاہئے۔ صرف یہ کہنے آیا ہوں کہ میں آپ کا ساتھ چھوڑ رہا ہوں.... ہمیشہ کے لئے!"

"کیوں؟" —— لوسی کے باپ نے پوچھا —— "یہ فیصلہ کیوں کیا؟.... اگر ہم تمہیں نہ چھوڑنا چاہیں تو کیا کرو گے؟"

"میں نے اپنا فیصلہ سنا دیا ہے" —— صغیر نے کہا —— "میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کا راز کسی قیمت پر فاش نہیں ہو گا۔ آپ کے ساتھ جو وقت گزرا ہے بہت اچھا گزرا ہے اور آپ نے میرے ساتھ جو مہربانیاں کی ہیں وہ میں ساری عمر نہیں بھول سکوں گا۔ مجھے صرف ایک افسوس ہے کہ میں آپ کا ایک کام پورا نہیں کر سکا لیکن یہ کام لوسی کرے گی"۔

"کون سا کام؟"

"آپ نے مجھے یہ کام سونپا تھا کہ میجر عثمان کو آپ کی جھولی میں ڈالنا ہے۔ میں یہ کام کر رہا تھا لیکن یہ حادثہ ہو گیا اور میرا دل اس کام سے اکھڑ گیا لیکن مجھے پوری اُمید ہے کہ لوسی یہ کام آسانی سے کر لے گی۔ وہ بالکل ٹھیک چل رہی ہے۔ عثمان خاصا کمزور آدمی ہے، ہمارے راستے پر آجائے گا"۔

"دیکھو صغیر!" —— لوسی کے باپ نے کہا —— "تم نے بھائی کی موت کا بہت زیادہ صدمہ لیا ہے۔ یہ وقتی اثر ہے۔ اس صدمے کو برداشت کرو اور اتنا اچھا کیریئر تباہ نہ کرو جو تمہیں دولت بھی دے رہا ہے اور ہر طرح کا عیش و آرام بھی"۔

"اس صدمے نے میرا دماغ روشن کر دیا ہے" —— صغیر نے کہا —— "میری آنکھیں کھل گئی ہیں۔ آپ نے ایسے دو دھماکے کروائے تھے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ میں نے کس دلیری سے یہ دونوں بم کہاں کہاں رکھے تھے۔ ایک میں چھ آدمی ہلاک اور تیرہ زخمی ہوئے تھے اور دوسرے میں سات آدمی ہلاک اور زخمیوں کی تعداد خاصی زیادہ تھی"۔

"اور اس کا معاوضہ دیکھو ہم نے تمہیں کتنا زیادہ دیا تھا" —— لوسی کے باپ نے کہا —— "اگر تمہیں یہ کام پسند نہیں تو ہم تمہیں کسی اور کام پر لگا دیتے ہیں۔ ابھی تو ہم نے تمہیں انڈیا بھیجنا ہے۔ خدا کی قسم وہاں جتنے دن رہو گے اپنے آپ کو راجہ اِندر سمجھو گے۔ اس کے ساتھ ہی وہاں تمہاری کچھ اور ٹریننگ ہو جائے گی"۔

"میں معافی چاہتا ہوں جناب" —— صغیر نے کہا —— "لمبی چوڑی باتوں کو چھوڑیں۔ میں مختصر سی بات کر کے آپ کو بتا دیتا ہوں کہ اس کام سے میرا دل کیوں اُچاٹ ہو گیا ہے۔ میں نے دھماکے کئے تھے اور جب خود ہی وہاں جا کر تباہی کا منظر دیکھا تو اپنی کامیابی پر میں بے حد خوش ہُوا تھا۔ اگلے روز اخبار دیکھے۔ پہلے صفحے صرف میری کامیابی کی تصویروں اور خبروں سے بھرے ہوئے تھے۔ میں فاتحانہ انداز سے پاکستان کی اس مخلوق میں گھوم پھر رہا تھا جس پر ان دھماکوں نے خوف و ہراس طاری کر رکھا تھا لیکن جناب جب ایسے ہی ایک دھماکے نے بس کے ساتھ میرے چھوٹے بھائی کے جسم کے بھی پرخچے اُڑا دیئے تو مجھے یوں لگا جیسے خدا نے مجھے کہا ہو کہ یہ ہے تیری سزا جو اس دنیا میں تجھے ملی ہے باقی اگلے جہان میں ملے گی.... مجھے اس بھائی سے بہت پیار تھا۔ میں نے ماں کو بیہوش ہوتے دیکھا۔ اپنے بوڑھے باپ کو اپنے کپڑے پھاڑتے دیکھا۔ اپنی بہنوں کو اپنے بال نوچتے دیکھا۔ سب کہہ رہے تھے کہ یہ دھماکے انڈیا کے تخریب کار کرتے ہیں۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرے بھائی کی میّت پر یہ سب عورتیں اور تمام آدمی میری طرف انگلیاں کر کر کے کہہ رہے ہوں کہ یہ ہے انڈیا کا تخریب کار جس نے اپنے بھائی کو بھی نہیں بخشا"۔

"لیکن یہ دھماکہ تم نے تو نہیں کیا" —— لُوسی کے باپ نے کہا۔

"میں جانتا ہوں آپ نے یہ دھماکہ کس سے کروایا ہے" —— صغیر نے کہا —— "وہ میرا ہی ساتھی ہے۔ اپنا انعام لے چکا ہے لیکن جناب میں یہ کہہ رہا ہوں کہ انڈیا سے ملے ہوئے معاوضے پر میں نے دو دھماکوں میں جن پاکستانیوں کو ہلاک کیا ہے وہ بھی ماؤں کے بیٹے تھے۔ وہ مائیں بھی پاگل ہو گئی ہوں گی۔ ان کی بہنیں بھی اپنے بال نوچتی ہوں گی اور ان کے باپ بھی پاگلوں کی طرح اپنے کپڑے پھاڑتے ہوں گے اور معلوم نہیں کتنے بچے یتیم ہو گئے ہوں گے۔ ان سب کا قاتل میں ہوں۔ میں کرائے کا قاتل ہوں۔ میں اب باقی عمر گناہوں کی معافی مانگتے گزاروں گا خواہ میں درویش اور ملنگ ہی بن جاؤں"۔

"ہوش میں آؤ صغیر!" —— لوسی کے باپ نے کہا —— "اس صدمے کی حالت میں نہ سوچو۔ تم دیکھو گے کہ کچھ دنوں بعد جب اس صدمے کا اثر ذرا کم ہو جائے گا تو تم صحیح فیصلہ کر سکو گے"۔

"صدمہ گزر گیا یا اس کا اثر کم ہو گیا تو میرا فیصلہ غلط ہو گا" —— صغیر نے کہا —— "میں پھر انڈیا کا ہی آدمی رہوں گا۔ میں آپ کے ساتھ نہیں رہنا چاہتا اور میں قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کا راز فاش نہیں کروں گا۔ عثمان کو پتہ ہی نہیں چلنے دوں گا کہ آپ لوسی کے باپ نہیں اور جو آپ کی بیوی بنی ہوئی ہے وہ لوسی کی ماں نہیں نہ میں لوسی کا منگیتر ہوں اور اس کوٹھی میں جو لوگ رہتے ہیں ان کا آپس میں کوئی خونی رشتہ نہیں اور یہ سب ایک گروہ کے آدمی ہیں اور یہ گروہ انڈیا کا ہے"۔

"سوچ لو صغیر!" —— اس شخص نے کہا جو لوسی کا باپ بنا ہُوا تھا —— "کل تک سوچ لو"۔

صغیر اس کمرے سے نکلا تو لوسی نے اسے روک لیا لیکن وہ نہ رکا۔ لُوسی کو اس کے فرضی باپ نے بتایا کہ صغیر کیا فیصلہ سنا گیا ہے۔

"یہ تو بڑا خطرناک فیصلہ ہے" —— لوسی نے کہا۔

"کوئی بات نہیں" —— اس شخص نے کہا —— "بندوبست کر لیں گے"۔

○

صغیر نے اپنی پردہ پوشی کے لئے چھوٹا سا ایک دفتر بنا رکھا تھا جس پر لگے بورڈ سے پتہ چلتا تھا کہ یہ ایک پراپرٹی ڈیلر کا دفتر ہے۔ صغیر نے نہ کبھی کوئی پراپرٹی کسی کو خرید کر

دی تھی نہ یہ اُس کا کام تھا۔ یہ محض ایک پردہ پوشی تھی۔ اس دفتر کے ساتھ ہی رہائش کا بندوبست تھا۔

شام کا وقت تھا۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ صغیر ابھی ابھی اپنے گھر آ کر بیٹھا ہی تھا۔ اس کا بھائی فوت ہو گیا تھا اور اسے واپس اپنے شہر جانا تھا۔ گاڑی اس کے پاس تھی۔ اس کا ارادہ کچھ دیر بعد چلے جانے کا تھا۔ دروازے کی گھنٹی بجی۔ صغیر باہر نکلا۔ دو آدمی کھڑے تھے جو اس کے لئے اجنبی تھے۔ قریب ہی ایک کار کھڑی تھی جس کے سٹیئرنگ پر ایک آدمی بیٹھا تھا اور ایک آدمی پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہُوا تھا۔

"آپ پراپرٹی ڈیلر ہیں" —— ایک آدمی نے کہا —— "ہمیں ایک کوٹھی چاہئے"۔

"آپ ذرا گاڑی تک آ جائیں" —— دوسرا آدمی بولا —— "اصل صاحب ذرا چلنے سے معذور ہیں۔ گاڑی میں ہی ان کی درخواست سن لیں"۔

صغیر ان کے ساتھ گاڑی تک گیا۔ گاڑی کا پچھلا دروازہ کھلا۔ پیچھے سے دونوں آدمیوں نے اسے بڑی زور سے دھکیلا اور اس کا سر دبا کر نیچے کیا۔ گاڑی میں پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے آدمی نے اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر اندر کو کھینچا۔ اس کے ساتھ ہی اُس کی ناک پر رومال رکھا پھر صغیر کو کوئی ہوش نہ رہی۔ وہ لاش کی طرح گاڑی کے اندر پڑا تھا۔ دونوں آدمی پیچھے بیٹھ گئے اور گاڑی چلی گئی۔

وہ جب ہوش میں آیا تو ایک کمرے میں پلنگ پر پڑا ہُوا تھا۔ دو آدمی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ اُن میں ایک وہی شخص تھا جو لوسی کا باپ بنا ہوا تھا۔

"ہوش ٹھکانے آئے صغیر!" —— اُس شخص نے کہا —— "اب کہو کیا فیصلہ ہے تمہارا!"

"میں اپنے فیصلے سے نہیں ہٹوں گا" —— صغیر نے کہا۔

"ہٹ جاؤ گے" —— لُوسی کے فرضی باپ نے کہا اور دوسرے آدمی کو حکم کے لہجے میں کہا —— "اسے اُس کمرے میں پہنچا دو"۔

صغیر کو "اُسی" کمرے میں پہنچا دیا گیا جو لُوسی کے فرضی باپ نے بتایا تھا۔

لُوسی کا فرضی باپ انڈیا کے اس جاسوسی گروپ کا لیڈر تھا۔ اس کا نام مہندر آہوجا تھا۔ اس نے اپنی کوٹھی کے باہر اسی نام کے مطابق "ایم اے خان" کی تختی لگا رکھی تھی۔ اس کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ تھی لیکن لگتا چالیس سال سے کم عمر کا تھا۔ وہ انڈیا کی انٹیلی جنس کا غیر معمولی طور پر ذہین اور منجھا ہُوا آدمی تھا۔ وہ امریکہ کی سی آئی اے کا ایجنٹ ہُوا کرتا تھا۔ اس نے زیادہ تر تجربہ سی آئی اے میں ہی حاصل کیا تھا۔ سی آئی اے نے اسے کروڑ پتی بنا دیا تھا لیکن ایک ایسا واقعہ ہو گیا جس سے اس نے سی آئی اے سے علیٰحدگی اختیار کر لی۔

علیٰحدگی کی وجہ یہ تھی کہ شروع شروع میں تو اس سے سی آئی اے معمولی معمولی سے کام لیتی رہی جو زیادہ تر مخبری تک ہی محدود تھے۔ آگے چل کر اسے ایک ایسا کام بتایا گیا جو اس کے ملک کے خلاف جاتا تھا۔ وہ کٹر ہندو تھا اس لئے اپنے ملک کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کے لئے اس کا دل آمادہ نہ ہو سکا۔ وہ برہمن تھا اور اس کا عقیدہ تھا کہ انڈیا برہمنوں کا دیس ہے جسے انڈونیشیا سے لے کر دجلہ اور فرات تک وسعت دے کر مہابھارت بناتا تھا۔ پاکستان اور افغانستان کو تو مہابھارت میں شامل کرنا ہی تھا' مہندر انڈیا میں کسی مسلمان کا وجود تک برداشت نہیں کرتا تھا۔

سی آئی اے نے اسے جو کام بتایا تھا وہ ایک تو اس کے ملک کے لئے نقصان دہ تھا اور دوسرا نقصان اس کے ملک کی حکومت کو پہنچنا تھا جو خالصتاً" برہمن حکومت تھی۔ امریکی سی آئی اے نے اسے صرف اس کام کے لئے لاکھوں روپیہ پیش کیا تھا لیکن اس نے نہ

صرف یہ کہ اتنی کثیر رقم لینے سے انکار کر دیا بلکہ سی آئی اے سے علیٰحدگی اختیار کر کے اپنے ملک کے وزیراعظم کو جا بتایا کہ سی آئی اے یہاں کیا کر رہی ہے۔ وزیراعظم نے اپنی انٹیلی جنس کے چیف کو بلایا اور اسے امریکہ کی خفیہ سرگرمیوں سے آگاہ کیا۔ انڈین انٹیلی جنس نے مہندر کی اطلاع پر اور دیگر تفصیلات پر جو مہندر نے بتائی تھیں' پیش بندی کر لی اور انعام کے طور پر یا مہندر کا جذبہ دیکھ کر اور ساتھ ہی اس کا تجربہ دیکھ کر اسے انٹیلی جنس میں شامل کر لیا۔

مہندر جب اپنے ملک کی انٹیلی جنس میں آیا تو اس کے جوہر بڑی تیزی سے کھلنے لگے۔ ان کی بدولت اسے اپنی انٹیلی جنس میں بڑی جلدی ذمہ دار پوسٹ مل گئی۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ میں اپنی زندگی میں مہابھارت کا خواب عملی تعبیر کی شکل میں دیکھنا چاہتا ہوں اور اس کام کے لئے میں راتوں کو سووؤں گا بھی نہیں۔ یہ الفاظ تو تکیۂ کلام کی طرح اس کی زبان پر رہتے تھے کہ میں مہابھارت میں کسی مسلمان ملک کو کیسے برداشت کروں گا جبکہ میں کسی ایک مسلمان کی صورت بھی دیکھنا گوارہ نہیں کرتا۔

یہ اس کی ٹریننگ نہیں بلکہ اس کی فطرت تھی۔ اس نے مسلمانوں کی طرح لاکھوں روپیہ قبول کر کے اپنے ملک کے خلاف غداری نہیں کی تھی بلکہ اتنی زیادہ دولت جو اسے پیش کی گئی تھی اور آئندہ جو ملنے والی تھی' ٹھکرا دی تھی۔ اب یہ مہندر پاکستان کے دل میں ایم اے خان بن کر اُترا ہُوا تھا اور پاکستان میں اس نے اپنے جو ایجنٹ پیدا کر کے پھیلا دیئے تھے ان میں اکثریت پاکستانی مسلمانوں کی تھی۔

صغیر ان ہی پاکستانیوں میں سے تھا لیکن بھائی کی موت نے اس کا دماغ روشن کر دیا تھا۔ انڈیا کے ایجنٹوں کے رکھے ہوئے بم کے دھماکے نے صغیر کے دل و دماغ سے سیاہ پردے اٹھا دیئے لیکن مہندر اتنا کچا آدمی نہیں تھا کہ اسے اس کی خواہش کے مطابق چھوڑ دیتا۔ مہندر نے صغیر کو اُس کمرے میں پہنچا دیا تھا جو تھا تو زمین پر ہی لیکن ایسے تھا جیسے زمین کی سات تہوں کے نیچے ہو۔ وہاں سے اس کی چیخ و پکار کوئی نہیں سن سکتا تھا۔

○

تین چار دن بعد کی ایک رات میجر عثمان اپنے گھر میں داخل ہُوا۔ دروازہ وینا نے کھولا تھا۔ وینا نے اس سے یہ پوچھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی کہ رات ساڑھے بارہ بجے تک وہ کہاں رہا ہے۔ اسے معلوم تھا وہ کہاں تھا۔ وینا اور عثمان اب ایک دوسرے

کے ساتھ کم ہی بولتے چالتے تھے۔ کوئی ضروری بات ہوتی تو وہ انتہائی مختصر الفاظ میں کر لیتے تھے۔ ان دونوں میں میاں بیوی والی بے تکلفی ختم ہو چکی تھی۔ میجر عثمان گھر آتا اور باہر نکل جاتا تھا پھر رات گئے واپس آتا اور سو جاتا تھا۔ وینا نے عثمان کے دوستوں، میجر سمیع اور کیپٹن آصف سے کہا تھا کہ عثمان کا انداز ایسا ہو گیا ہے جیسے یہ اس کا گھر نہیں بلکہ ہوٹل ہے جہاں وہ کسی مجبوری کے تحت رہائش پذیر ہے۔ اس گھر، کسی فرد، بیوی یا بچے کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں تھا نہ ان میں کوئی رسمی سی دلچسپی تھی۔ کئی کئی دن وہ گھر میں کھانا بھی نہیں کھاتا تھا۔

اُس رات عثمان حسب معمول رات ساڑھے بارہ بجے گھر آیا تو وینا نے رسمی طور پر پوچھا کہ کھانا کھائیں گے؟

”تم کیا سمجھتی ہو میں اس وقت تک بھوکا ہی پھر رہا ہوں؟“ —— عثمان نے بے رخی اور طنز کے لہجے میں کہا۔

”بہرحال میرا پوچھنا فرض ہے“ —— وینا نے کہا۔

”تم جو فرض ادا کر رہی ہو وہ میں جانتا ہوں“ —— عثمان نے کہا۔

”کیا جانتے ہیں آپ؟“ —— وینا نے اکتائے ہوئے سے لہجے میں پوچھا۔

”یہ کہ تم نے مجھے ہر جگہ رسوا اور بدنام کرنے کی باقاعدہ مہم چلا رکھی ہے“ —— عثمان نے غصیلی آواز میں کہا۔

”آپ اس وقت اپنے ہوش و حواس میں نہیں“ —— وینا نے بڑے آرام سے کہا —— ”سو جائیں“۔

”میں ہوش میں ہوں“ —— عثمان نے گرجتی ہوئی آواز میں کہا —— ”اب یہ دعا کیا کرو کہ میں ہوش میں نہ رہوں“۔

”آہستہ بولیں“ —— وینا نے کہا تو نرم سے لہجے میں لیکن اس لہجے میں طنز نمایاں تھی —— ”بچے ڈر کر جاگ اٹھیں گے“۔

”مجھ پر حکم چلانے کی کوشش نہ کرو“ —— عثمان نے اور زیادہ بلند آواز میں کہا۔

وینا نے بہت کوشش کی کہ بات آگے نہ بڑھے۔ وہ جانتی تھی کہ عثمان سمجھ بُوجھ کی حد سے نکل گیا ہے۔ اس پر اب کوئی دلیل اثر انداز نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ تو ایسے ہی تھا جیسے آسمان کی طرف منہ کر کے تھوکو تو تھوک اپنے ہی منہ پر آ پڑتا ہے لیکن عثمان بات کو بگاڑتا چلا گیا اور خود ہی بات سے بات نکال کر جھگڑے کو طول دیتا رہا۔

”خدا کے لئے چپ ہو جاؤ“ —— وینا نے ہاتھ جوڑ کر کہا —— ”آپ اپنے آپ میں نہیں۔ آپ کی زبان لڑکھڑا رہی ہے۔ کپڑے بدلیں اور سو جائیں“۔

”اب یہ مشہور کر دو“ —— عثمان نے کہا —— ”یہ بھی مشہور کر دو کہ میرا خاوند ہیروئن کا نشئی ہو گیا ہے.... میں اس گھر پر لعنت بھیجتا ہوں۔ باہر سے اچھا بھلا آتا ہوں۔ گھر میں داخل ہوتے ہی مجھ پر ڈیپریشن طاری ہو جاتی ہے۔ میں تمہاری صورت سے بیزار ہو گیا ہوں“۔

وِینا نے صبر اور برداشت کی قوت پیدا کر لی تھی لیکن انسان پتھر تو نہیں ہوتا کہ وہ سنتا ہی چلا جائے۔ وہ آخر بیوی تھی اور اس آدمی کے بچوں کی ماں تھی جو اب اس سے بیگانہ ہی نہیں ہوا بلکہ اس کا دشمن ہو گیا تھا۔ اس کے آنسو نکل آئے۔

عثمان کی آواز میں ایسا لرزہ تھا جیسے وہ نشے میں ہو۔ وہ تھا ہی نشے میں۔ نشے میں غصہ شامل ہُوا تو آواز میں اور زیادہ لرزہ پیدا ہو گیا۔ اس نے واہی تباہی بکنی شروع کر دی۔ وینا نے اپنے ہونٹ سی لئے اور عثمان واہی تباہی بکتا سو گیا۔

وہ تو گھر میں داخل ہُوا تو سویا ہُوا ہی تھا۔ اسے نیم خفتہ یا نیم بیدار بھی کہہ سکتے ہیں۔ وہ لُوسی سے مل کر آیا تھا۔ ان کی یہ ملاقات ”ایم اے خان“ کی کوٹھی میں ہوئی تھی۔ وہ دونوں الگ کمرے میں بیٹھے رہے تھے جس کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ انہوں نے کھانا اسی کمرے میں کھایا تھا۔ کھانا نوکر نہیں لایا تھا بلکہ لوسی خود جا کر کھانے کی ٹرے اٹھا کر لائی تھی۔ کھانے کے ساتھ کوکا کولا اور سیون اپ کی بوتلیں بھی تھیں جو لُوسی دو گلاسوں میں ڈال کر لائی تھی۔ کھانے کے تھوڑی ہی دیر بعد عثمان نے خمار سا محسوس کرنا شروع کر دیا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ لُوسی نے کوکا کولا کا جو گلاس اس کے آگے رکھا تھا اس میں ٹرانکولائزر گولیاں ملا رکھی تھیں۔ یہ خمار ان گولیوں کا تھا جسے وہ لوسی کی محبت کا خمار سمجھ رہا تھا۔ اس نشے کی کیفیت میں اس کی ساری دنیا لوسی کے دلکش وجود میں سمٹ آئی تھی۔

میجر عثمان کو میجر سمیع اور کیپٹن آصف نے بتایا تھا کہ یہ لڑکی اسے دھوکے میں ٹرانکولائزر پلا رہی ہے لیکن لُوسی کو اس نے اپنے آپ پر، اپنی عقل و ہوش پر اور اپنے خواب و خیال پر اس قدر غالب کر رکھا تھا کہ وہ تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا تھا کہ لوسی

اسے کسی قسم کا دھوکہ بھی دے سکتی ہے۔

لُوسی سرتاپا ایک طلسماتی دھوکہ تھی۔ وہ انٹیلی جنس کی تربیت یافتہ لڑکی تھی، جسے اپنے جال میں لیتی تھی وہ یقین کی حد تک محسوس کرتا تھا کہ لوسی اس پر مرمٹی ہے اور اس کے بغیر ایک پل بھی زندہ نہیں رہ سکتی۔ یہ اس کی ایکٹنگ اور ناز و انداز کا کمال تھا۔ اپنے آنسو نکال لینا، بلک بلک کر ایسا رونا کہ دیکھنے والا تڑپ اٹھے، اس کے خصوصی کمالات میں شامل تھا۔ اس کے پاس مسکراہٹوں کی کئی قسمیں تھیں جن میں ایک مسکراہٹ ایسی تھی کہ زاہد بھی زہد و تقویٰ کو الگ رکھ دیں۔

اس کا سب سے بڑا کمال تو یہ تھا کہ وہ اپنے شکار کو کھلونا بلکہ چابی والا کھلونا بنا لیتی تھی مگر خود اس کے ہاتھ میں کھلونا نہیں بنتی تھی۔ وہ اپنے شکار کو مشینی انسان جسے روبوٹ کہتے ہیں، بنا لیتی تھی۔ مرد عورت سے کیا چاہتا ہے؟ — حیوانی جذبات کی تسکین — لُوسی مرد کے فطری مطالبے کو خوب سمجھتی تھی۔ وہ اپنے شکار کے ان جذبات کو بھڑکا دیتی اور خود اس کے لئے ایک سراب بن جاتی تھی پھر اس کا شکار پیاسے صحرانورد کی طرح اس کے پیچھے پیچھے چل پڑتا تھا اور سراب یہ دو ہاتھ دُور نظر آتا مگر دو ہاتھ کا فاصلہ طے ہونے میں ہی نہیں آتا تھا۔

اونچے درجے کی پیشہ ور عصمت فروش عورت میں جو کشش ہوتی ہے وہ اس کی خوبصورتی کی اتنی نہیں ہوتی جتنی اس کی ایکٹنگ میں ہوتی ہے۔ ہر عصمت فروش عورت میں کشش یہ ہوتی ہے کہ لذّت اور ذہنی فرار مہیا کرتی ہے۔ وہ اپنے گاہک سے یہ نہیں کہتی کہ آٹا ختم ہو گیا ہے، دو بچوں کی فیسیں جانی ہیں، گھر میں مہمان آرہے ہیں اور طوائف گھریلو مسائل اور جھگڑے پیش نہیں کرتی بلکہ اپنے گاہک کو ان بکھیڑوں سے دُور بھگا کر پناہ دیتی ہے۔ وہ اپنے گاہک کو الفاظ میں اتنا اونچا چڑھا دیتی ہے کہ گاہک گلفام بن کر فضا میں اُڑنے لگتا ہے۔

لذت، فرار اور احساسِ برتری کے احساس کا وہ پورا سامان لُوسی کے پاس موجود تھا جو ایک عصمت فروش عورت کے پاس ہوتا ہے۔ فرق صرف یہ تھا کہ لُوسی ایک حسین خواب بنی رہتی تھی اور اس خواب کی تعبیر کبھی کبھار بنتی تھی۔ ایک نشہ تو اس کا اپنا تھا جو وہ اپنے شکار پر طاری کر دیتی تھی، دوسرا نشہ ٹرانکولائزر گولیوں کا ہوتا تھا جو اس کے اپنے حسن و جوانی کے نشے میں سرور کی طلسماتی کیفیت پیدا کر دیتا تھا۔

پھر میجر عثمان جب اس کے گھر سے نکلنے لگا تھا تو اس نے رک کر لوسی سے کہا تھا کہ گھر جانے کو ذرا سا بھی جی نہیں چاہتا۔

"کچھ دن اور صبر کر لو" — لوسی نے اسے دروازے سے اندر کر کے اور اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر اور اپنے ریشم جیسے بال اس کے گالوں سے لگا کر کہا تھا — "صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے"۔

"وہ کب آرہا ہے؟" — عثمان نے صغیر کے متعلق پوچھا۔

"آ گیا تو کیا!" — لُوسی نے ایسے پیارے انداز سے کہا جیسے بچے کو بہلایا جاتا ہے — "میں اس سے جان چھُڑا لوں گی"۔

"نہ ہی آئے تو اچھا ہے" — عثمان نے کہا تھا اور ایک بار پھر لوسی کو اپنے ساتھ لگا کر اور بادلِ نخواستہ اسے چھوڑ کر وہاں سے چلا آیا تھا۔ وہ جب گھر میں داخل ہُوا تو نشے کی اس کیفیت میں وینا کو دیکھا تو اسے یوں لگا جیسے قید خانے سے اسے رہائی مل گئی تھی اور اسے زبردستی پھر اسی قید خانے میں ڈال دیا گیا ہے۔ وینا کو اس نے یوں دیکھا جیسے قیدی جیل کے داروغے کو دیکھا کرتے ہیں۔

عثمان جیسے خاوندوں کی بیویاں جن میں اکثر غیر معمولی طور پر خوبصورت ہوتی ہیں، گھر بیٹھی سوچتی اور روتی رہتی ہیں کہ ان میں کیا کمی رہ گئی ہے کہ خاوند ان سے بیزار ہو کر باہر کی عورتوں سے دل بہلا رہے ہیں۔ گھریلو عورت نہیں سمجھتی کہ وہ ایک حقیقت ہے جو حسین تو ہے لیکن اس میں ازدواجی مسائل کی تلخیاں بھی ہیں۔ اس کے برعکس فاحشہ اور عصمت فروش عورت کے پاس ایسی حقیقت ہوتی ہے جس میں کوئی تلخی اور کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ فاحشہ عورت اس کے بچے پیدا نہیں کرتی۔ حقائق سے بھاگے ہوئے خاوند بچوں کی پیدائش کو مسائل اور مصائب کی پیدائش سمجھتے ہیں جیسے بچہ اپنے ساتھ اپنے مسائل لے کر ہی اس گھر میں پیدا ہُوا ہو۔

میجر عثمان اُن خاوندوں میں سے تھا جو اس حقیقت کو قبول کرتے ہی نہیں کہ بچے اور ان کے مسائل ہی زندگی کی اصل مسرّت کے حامل ہوتے ہیں۔

○

لُوسی کے جعلی منگیتر صغیر کو ایک خاص کمرے میں پہنچا دیا گیا تھا۔ دو آدمیوں نے اسے فرش پر پیٹھ کے بل گرا دیا اور اس کے بازو پیچھے کو لمبے کر کے اس کے ہاتھ اُلٹے کر

دیئے تھے۔ ایک کرسی کا ایک پایہ اس کے ایک ہاتھ پر اور دوسرا دوسرے ہاتھ پر رکھ دیا گیا اور کرسی پر ایک بھاری بھرکم آدمی بیٹھ گیا۔ صغیر کے ہاتھوں کی ہڈیاں ٹوٹنے لگیں اور وہ ذبح ہوتے بکرے کی طرح تڑپنے لگا۔ ایک آدمی نے اس کی ٹانگیں پھیلا کر پاؤں ٹیڑھے کر کے فرش کے ساتھ لگا دیئے اور اپنا ایک پاؤں اس کے ایک ٹخنے پر اور دوسرا دوسرے ٹخنے پر رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ صغیر کا پسینہ نکل آیا لیکن اس کے منہ سے کوئی آواز، چیخ یا فریاد نہ نکلی۔

"ہڈیاں توڑ دو" —— صغیر نے کربناک آواز میں کہا —— "پاؤں کی طرف سے میرے جسم کو کاٹنا شروع کر دو، میری زبان سے یہ الفاظ نہیں سنو گے کہ میں تمہارا ساتھ نہیں چھوڑوں گا"۔

"تمہاری زبان سے اپنے آپ یہ الفاظ نکلیں گے جو تم ابھی نہیں کہنا چاہتے" —— مہندر نے کہا —— "ابھی تو تمہاری خاطر تواضع شروع ہوئی ہے .... آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا"۔

کمرے میں مہندر کے جو آدمی موجود تھے وہ زوردار قہقہہ لگا کر ہنسے۔

"تم مسلمان ہو" —— مہندر نے صغیر کے پیٹ پر اپنا پاؤں رکھ کر اور اپنے جسم کا وزن ڈال کر کہا —— "اور مسلمان کی یہ شان ہے کہ وہ چند ٹکوں پر اپنا ایمان ہم جیسوں کے حوالے کر دیا کرتا ہے۔ میں جانتا ہوں تم کتنے کچھ مردِ مومن ہو"۔

"اللہ نے مجھے صراطِ مستقیم دکھا دیا ہے" —— صغیر نے اتنی بلند آواز سے کہا جیسے اس نے پُرجوش نعرہ لگایا ہو۔

اس نے "پاکستان زندہ باد" کا پُرجوش نعرہ لگا دیا۔

اتنی زور سے بولنے اور نعرہ لگانے کا مطلب صرف یہ تھا کہ وہ درد کی شدت کو دبا رہا تھا۔ بعض قاتل دیکھے گئے ہیں کہ پھانسی کے تختے کی طرف یا علی اور اللہ اکبر کے نعرے لگاتے جاتے ہیں۔ انہیں علی اور اللہ کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں ہوتی، وہ دراصل اُس خوف کو لاشعوری طور پر دبا رہے ہوتے ہیں جو ان کے دلوں اور اعصاب کو اپنی گرفت میں لئے ہوتے ہوتا ہے۔ وہ موت کے خوف کو دبانے کے لئے نعرے لگاتے ہیں اور یہی کیفیت صغیر پر طاری تھی۔

"تم اب یہاں سے زندہ نہیں نکل سکو گے" —— مہندر نے صغیر سے کہا —— "میں

تمہیں ایک موقع اور دینا چاہتا ہوں اور وہ اس لئے کہ تم نے انڈیا کی جو خدمت کی ہے وہ قابلِ قدر ہے۔ ہم یہ نہیں کہلوانا چاہتے کہ ہم نے اتنی زیادہ خدمت کرنے والے آدمی کو کچھ نہیں دیا"۔

"میں جواب دے چکا ہوں" —— صغیر نے کہا —— "اس جواب سے نہیں ہٹوں گا"۔

"صرف تم ہی نہیں مرو گے" —— مہندر نے کہا —— "تم اُس بھیانک انجام کو تصور میں بھی نہیں لا سکتے جس تک ہم تمہارے خاندان کو پہنچائیں گے۔ تمہارا ایک بھائی مر چکا ہے۔ تمہاری ایک بہن جوان ہے جس کی ابھی شادی نہیں ہوئی اور تمہاری بیوی بھی جوان ہے۔ ہم تمہیں انڈیا لے جا کر ماریں گے لیکن اس سے پہلے تمہیں انڈیا کے ایک چکلے میں تمہاری بہن اور تمہاری بیوی کو بیٹھا ہوا دکھائیں گے"۔

"بکواس بند کر ہندو کُتے!" —— صغیر نے درد سے کراہتی ہوئی آواز میں کہا —— "اب میری اور تیری ٹکر نہیں بلکہ اسے اب اللہ اور اپنے بھگوان کی ٹکر سمجھ پھر دیکھنا کون سچا ہے"۔

مہندر نے اس کے پیٹ سے اپنا پاؤں اٹھا لیا۔ وہ اس طرح ہنس رہا تھا جیسے کوئی نوعمر لڑکا بلّی یا کُتے کے ساتھ کھیل رہا ہو۔ صغیر کے پاؤں پر جو آدمی کھڑا تھا، اُسے مہندر نے کہا کہ وہ اُتر جائے اور صغیر کے پاؤں رسّی سے کس کر باندھ دے۔ کرسی پر جو آدمی بیٹھا تھا اسے مہندر نے کہا کہ وہ بیٹھا رہے اور مہندر خود صغیر سے یہ کہہ کر کہ وہ سوچ کر جواب دے، کمرے سے نکل گیا۔

یہ کمرہ کسی جنگل میں نہیں تھا، کہیں پہاڑیوں کے اندر غیر آباد علاقے میں نہیں تھا، یہ پولیس کا، اینٹی سی آئی اے کا یا آئی ایس آئی کا ٹارچر سیل نہیں تھا بلکہ یہ کمرہ کوٹھیوں کے گنجان آباد علاقے میں ایک خوبصورت کوٹھی میں تھا جس کے اردگرد لوگ آباد تھے، ٹریفک رواں دواں تھی اور اس مہذب بستی میں زندگی کی گہما گہمی تھی۔ کسی نے کبھی یہ دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی تھی کہ اس کوٹھی میں کون رہتا ہے اور یہاں کیا ہوتا ہے۔ پھر کیسے پتہ چلتا کہ اس کوٹھی کے ایک کمرے میں اسی ملک کے ایک آدمی کو دشمن ملک کے آدمی ایذا رسانی سے قتل کر رہے ہیں۔

یہ آدمی صغیر کو نہیں، بلکہ پاکستان کو فرش پر لٹا کر اور ہاتھوں پر کرسی رکھ کر اس پر

بیٹھ گئے تھے۔ اُس دن کے اخباروں میں بھی برسرِاقتدار اور حزبِ اختلاف کی لڑائیوں، الزام اور بہتان تراشیاں اور ایک دوسرے کو ذلیل و رسوا کرنے کی خبریں نمایاں طور پر چھپی تھیں۔ اس روز بھی پاکستان کے وزیر تقریریں کر رہے تھے اور یوں بازو لہرا رہے تھے جیسے وہ پاکستان کو دنیا کا سب سے زیادہ خوشحال اور طاقتور ملک بنا رہے ہوں۔

اُس روز بھی لوگ گھروں میں بیٹھے ڈاکوؤں کے ہاتھوں لٹ رہے تھے اور پولیس اس کوشش میں تھی کہ کسی ایک بھی واردات کی رپورٹ درج نہ کرے۔

اس روز بھی پاکستانی وی سی آر سے بھارتی فلمیں دیکھ رہے تھے اور ہماری نوجوان نسل سوچ رہی تھی کہ ہندو کتنی پیاری قوم ہے، کتنی پیاری فلمیں بناتی اور پاکستان بھیجتی ہے۔

اُس روز بھی پاکستان میں سیاسی دھینگامشتی اور قومی انتشار کے مظاہرے ہو رہے تھے۔

اور صغیر کے ہاتھوں میں کرسی کے پائے اُترتے جا رہے تھے۔ ابھی تک اس کے منہ سے ہلکی سی سی کی آواز بھی نہیں نکلی تھی۔

○

میجر عثمان اپنی ڈیوٹی پر بریگیڈ ہیڈ کوارٹر چلا گیا تھا۔ گھر کے فون کی گھنٹی بجی۔ وینا نے ریسیور اٹھایا۔ میجر سمیع بول رہا تھا۔

"کوئی تازہ خبر بھابی!" ــــ میجر سمیع نے پوچھا۔

"نہیں بھائی جان!" ــــ وینا نے جواب دیا ــــ "وہی پرانی خبر ہے جو ہر روز بلکہ ہر رات تازہ ہوتی ہے۔ میں تو اب تنگ آ گئی ہوں بھائی جان! ایک دن بھی اس گھر میں ٹھہرنے کو جی نہیں چاہتا۔ عثمان کا رویّہ تو ایسا ہو گیا ہے جیسے اس نے اپنی زندگی کا مشن بنا لیا ہے کہ مجھے اپنے گھر میں ٹھہرنے نہ دے"۔

"میں پھر وہی بات کہوں گا بھابی!" ــــ میجر سمیع نے کہا ــــ "صبر اور اپنے اوپر جبر کریں۔ مجھے امید ہے سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہ صورتِ حال آپ کے جذبات کو کیسی بے دردی سے مجروح کر رہی ہے لیکن میں سوچتا ہوں کہ آپ اپنی ازدواجی زندگی کو اس موڑ پر آ کر کیوں ختم کر دیں۔ میں اور کیپٹن آصف عہد کر چکے ہیں کہ عثمان کو واپس لائیں گے"۔

"صبر اور برداشت تو مجھ میں بہت ہے بھائی جان!" ــــ وینا نے کہا ــــ "لیکن عثمان مجھ سے بڑا ہی سخت امتحان لے رہا ہے۔ اس نے ابھی تک ایسی بات کہی تو نہیں لیکن اس کا انداز اور رویّہ ایسا ہے جیسے وہ بڑی اونچی آواز میں مجھے کہہ رہا ہو کہ تم یہاں سے نکلو، میں اسے یہاں لاؤں گا۔ میں اس لئے اس گھر میں رُکی ہوئی نہیں کہ میرا اور میرے بچوں کا مستقبل تاریک ہو جائے گا بلکہ اس لئے کہ آپ نے بتایا تھا کہ عثمان جس لڑکی کے قبضے میں آیا ہُوا ہے وہ لڑکی شاید انڈیا کے جاسوسوں کے گروہ کی ہے۔ میں ہر وقت سوچتی رہتی ہوں کہ میں اس لڑکی تک کس طرح پہنچوں اور کس طرح اسے سڑکوں پر گھسیٹوں"۔

"یہ کام ہم نے اپنے ہاتھوں میں لے رکھا ہے" ــــ میجر سمیع نے کہا ــــ "بھابی! آپ اس جھنجٹ میں نہ پڑیں۔ خوار ہونے کے سوا آپ کچھ نہیں کر سکیں گی"۔

"میں کچھ نہ کچھ تو ضرور کروں گی بھائی جان!" ــــ وینا نے کہا ــــ "پہلے میں رویا کرتی تھی، دن بھر غصہ چڑھا کر اپنا خون پیتی اور کڑھتی رہتی تھی مگر اب میرا دل مضبوط ہو گیا ہے، شاید اس لئے کہ میں نے اپنے آپ کو یقین دلا لیا ہے کہ میں ایک جنگ لڑ رہی ہوں اور مجھے یہ جنگ جیتنی ہے.... اچھا ہُوا آپ نے فون کر دیا۔ آپ نہ کرتے تو میں آج آپ کو فون کرتی۔ آج شام آپ میرے بھائیوں سے ملنے کے لئے آ سکتے ہیں؟.... میں نے آج عثمان کو بتا دیا تھا کہ میں تین چار بجے اپنے گھر جاؤں گی اور رات کو دس بجے تک واپس آ جاؤں گی۔ گھر میں نوکر ہے۔ وہ عثمان کو کھانا وانا دے دے گا۔ میرے بھائی کئی بار کہہ چکے ہیں کہ وہ آپ سے اور آصف بھائی سے ملنا چاہتے ہیں"۔

"آ جائیں گے بھابی!" ــــ میجر سمیع نے کہا ــــ "کہاں آئیں؟.... ایڈریس بتا دیں"۔

وینا نے اسے اپنے والدین کی کوٹھی کا نمبر راستہ اور محلِ وقوع سمجھا دیا۔

"آپ کیپٹن آصف بھائی کو ساتھ لے کر چار بجے وہاں آ جائیں" ــــ وینا نے کہا۔

○

میجر سمیع اور کیپٹن آصف شام چار بجے پہنچ گئے۔ وینا اپنے دونوں بھائیوں کے ساتھ ان کے استقبال کے لئے باہر آ گئی۔ اس کے بھائی بڑے تپاک اور پیار سے سمیع اور آصف سے ملے اور انہیں ڈرائنگ روم میں لے گئے۔ دو چار رسمی باتوں کے بعد عثمان کا

موضوع چل پڑا۔ وینا نے بتایا کہ عثمان رات کو صرف سونے کے لئے گھر آتا ہے اور اس کا رویّہ ایسا ہوتا ہے جیسے وہ مجبوراً اس گھر میں آتا ہے۔

"اسے تو اپنے بچوں کے ساتھ بھی دلچسپی نہیں رہی" ــــ وینا نے کہا ــــ "اب تو صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ مجھ سے اور بچوں سے نفرت کرتا ہے لیکن میں برداشت کر رہی ہوں"۔

"میجر سمیع صاحب!" ــــ وینا کے بڑے بھائی اختر نے کہا ــــ "وینا برداشت کرتی رہے، ہمارے لئے عثمان کا یہ رویّہ ناقابلِ برداشت ہو گیا ہے۔ صاف پتہ چلتا ہے وہ ہمیں کچھ بھی نہیں سمجھتا اور جیسے ہم اس کا دیا کھاتے ہیں اور اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ اب ہم اسے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ہم اس کا جینا حرام کر سکتے ہیں"۔

"اختر صاحب!" ــــ میجر سمیع نے کہا ــــ "میں اور کیپٹن آصف اس معاملے کو کسی اور نگاہ سے دیکھ رہے ہیں۔ مجھے ایم اے خان کی کوٹھی میں رہنے والے لوگ جاسوس یا سمگلر لگتے ہیں۔ یہ بات تو میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں، اب اسے کنفرم سمجھیں"۔

"یہ کنفرمیشن کہاں سے ملی ہے؟" ــــ وینا کے چھوٹے بھائی امجد نے پوچھا۔

"ہم دونوں ساتھ والی کوٹھی میں گئے تھے" ــــ میجر سمیع نے کہا ــــ "وہاں ایک پرانا ریٹائرڈ صوبیدار میجر رہتا ہے۔ اس کے ساتھ میری یہ ملاقات دوسری تھی۔ پہلی ملاقات میں جو محض اتفاقیہ تھی، اس صوبیدار میجر نے شک کا اظہار کیا تھا اور اس نے کہا تھا کہ وہ معلوم کرنے کی کوشش کرے گا۔ دوسری ملاقات میں اس نے بتایا ہے کہ یہ لوگ مشکوک ہیں اور یہاں کوئی بہت بڑا جرم ہو رہا ہے لیکن ابھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ لوگ انڈیا کے جاسوس ہیں یا مہذب قسم کی عصمت فروشی کرتے ہیں"۔

"وہ جو کچھ بھی کرتے ہیں میجر صاحب!" ــــ اختر نے کہا ــــ "میں نے ایک طریقہ سوچا ہے۔ اس لڑکی کو اغوا کر لیا جائے اور ایک جگہ بند کر کے معلوم کیا جائے کہ یہ کون ہے اور کرتی کیا ہے"۔

"پھر آپ اس لڑکی کا کیا بنائیں گے؟" ــــ کیپٹن آصف نے پوچھا۔

"اگر آپ مجھ سے متفق ہوں تو پھر سوچیں گے کہ اس لڑکی کا ہم کیا بنائیں گے" ــــ اختر نے کہا ــــ "ضرورت محسوس ہوئی تو ہم اس لڑکی کو بالکل ہی غائب کر دیں

گے"۔

ان کے درمیان اغوا کی سکیم پر بحث مباحثہ ہوتا رہا اور چاروں متفق ہو گئے۔ میجر سمیع نے پوچھا کہ لڑکیت کو رکھا کہاں جائے گا۔ وینا کے دونوں بھائیوں نے کہا کہ ان کے پاس بڑی اچھی ایک جگہ ہے۔

یہ لوگ اچھی خاصی جائداد والے تھے۔ شہر کے قریبی مضافات میں ان کا کچا سا ایک مکان بھی تھا جو آبادی سے کچھ الگ تھلگ تھا۔ کسی وقت ان کی وہاں کچھ زمین تھی جہاں انہوں نے سبزیوں کا باغ بنا رکھا تھا اور سبزیاں منڈی میں جاتی تھیں۔ پھر انہوں نے وہاں فصل اگانی شروع کر دی اور چھوٹا سا یہ کچا مکان جو باغ کی دیکھ بھال کرنے والوں کے لئے بنایا تھا خالی پڑا تھا۔

ان چاروں نے اغوا کا طریقہ طے کر لیا۔ ضروری نہیں تھا کہ یہ طریقہ کامیاب ہو جاتا لیکن کوشش کرنی تھی۔

"یہ سوچ لیں اختر صاحب!" ــــ میجر سمیع نے کہا ــــ "ہم دونوں ہر حال میں آپ کا ساتھ دیں گے لیکن طریقہ کچھ کچا سا لگتا ہے۔ اتفاق کی بات ہے کہ ہم کامیاب ہو جائیں"۔

"آپ ڈر تو نہیں رہے میجر صاحب؟" ــــ وینا کے چھوٹے بھائی نے پوچھا۔

"میں کمانڈو ہوں" ــــ میجر سمیع نے کہا ــــ "اگر میں ڈرپوک ہوتا تو کمانڈو ٹریننگ کے لئے جانے سے انکار کر دیتا.... اگر آپ کو یہ شک ہے کہ میں ڈر رہا ہوں تو میں اب کچھ بھی نہیں کہوں گا اور جو ڈیوٹی آپ نے مجھے سونپی ہے وہ پوری کر کے دکھاؤں گا"۔



اگلی شام سٹیڈیم کے قریب میجر سمیع کی گاڑی کھڑی تھی۔ کیپٹن آصف اس کے ساتھ تھا۔ میجر سمیع نے گاڑی ایسی جگہ کھڑی کی تھی جہاں سے وہ اس چھوٹی سی ریسٹورنٹ "لورز اِن" کو دیکھ سکتے تھے لیکن وہ وہاں سے کسی کو نظر نہیں آ سکتے تھے۔ عثمان لوسی کے ساتھ اس ریسٹورنٹ کے اندر تھا۔ میجر سمیع نے انہیں اس ریسٹورنٹ میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔

میجر سمیع اور آصف انتظار کرتے رہے۔ وہیں قریب ہی ایک اور کار کھڑی تھی جس

میں وینا کے دونوں بھائی' اختر اور امجد' بیٹھے ہوئے تھے۔

کوئی ڈیڑھ گھنٹے بعد عثمان اور لوسی ریسٹورنٹ سے باہر آئے۔ اب سمیع اور آصف کی ڈیوٹی تھی کہ عثمان اور لوسی کے پاس جانا تھا اور اغوا کی سکیم کی پہلی کارروائی کرنی تھی لیکن عثمان اور لوسی بڑی تیزی سے گاڑی میں بیٹھے اور اسی تیزی سے گاڑی سمیت غائب ہو گئے۔ سمیع اور آصف کو ان تک پہنچنے کی مہلت ہی نہ ملی۔

اگلی شام انہوں نے پھر میجر عثمان کا تعاقب کیا۔ اُس شام وہ ایم اے خان کی کوٹھی کے اندر چلا گیا۔ سمیع اور آصف کوٹھی سے تھوڑی ہی دُور گاڑی کھڑی کر کے گاڑی میں ہی انتظار کرتے رہے۔ کچھ دور اختر اور امجد اپنی کار میں بیٹھے ہوئے تھے۔

انہیں معلوم نہیں تھا کہ عثمان اور لوسی کوٹھی میں ہی رہیں گے یا کہیں باہر جائیں گے۔ وہ اپنی اپنی جگہ انتظار کرتے رہے۔ یہ انتظار بڑا ہی صبر آزما تھا۔ انہیں پریشانی یہ تھی کہ ایسا نہ ہو عثمان کوٹھی میں ہی وقت گذار کر اکیلا نکلے اور لوسی باہر نہ آئے۔ اس صورت میں وہ اپنی سکیم میں کامیاب نہیں ہو سکتے تھے۔

تقریباً" ایک گھنٹہ گزرا ہو گا کہ عثمان کی گاڑی کوٹھی سے نکلی۔ سمیع اور آصف نے دیکھا کہ لُوسی بھی اس کے ساتھ اگلی سیٹ پر موجود تھی۔ وقت رات کے گیارہ بجے کے لگ بھگ تھا۔ خوش قسمتی سے عثمان نے گاڑی اُس طرف موڑی جدھر میجر سمیع اور کیپٹن آصف گاڑی روک کر باہر کھڑے تھے۔

عثمان کی گاڑی قریب آئی تو میجر سمیع نے آگے ہو کر اسے روک لیا۔ میجر عثمان کو تو ذرا سا بھی شک نہ تھا کہ اس کے ساتھ کیا ڈرامہ کھیلا جانے والا ہے۔ اس نے گاڑی سڑک کی سائیڈ پر کر کے روک لی اور اپنے دوستوں کو دیکھ کر بڑی تیزی سے باہر نکلا۔

"تمہارے انتظار میں کھڑے ہیں یار!" ___ میجر سمیع نے ایسے لہجے میں کہا جیسے وہ بہت پریشان ہو۔ اس کی آواز میں ذرا سا بھی جوش و خروش نہیں تھا۔

"کیا بات ہے یار؟" ___ میجر عثمان نے چونک کر پوچھا ___ "یو لُک سو ڈیپریسڈ وٹ از رانگ!"

"کیا بتاؤں بھائی!" ___ میجر سمیع نے کہا۔

"کم آن سپیک اپ یار!" ___ میجر عثمان نے کہا۔

"ذرا ادھر آ جاؤ" ___ میجر سمیع نے میجر عثمان کو بازو سے پکڑا اور جدھر عثمان کی

گاڑی کھڑی تھی اس کی اُلٹی طرف لے گیا۔ کہنے لگا ___ "ذرا دور آ کر بات سنو' اب تو صرف بریگیڈ ہیڈ کوارٹر میری مدد کر سکتا ہے۔ یہ کام تم کروا سکتے ہو"۔

میجر سمیع نے ایک قصہ گھڑ رکھا تھا جو اس نے عثمان کو سنانا شروع کر دیا۔ اس نے اپنی ایک مشکل بیان کی اور کہا کہ اس کی مدد نہ کی گئی تو اس کا کورٹ مارشل ہو جائے گا۔

میجر عثمان کو میجر سمیع نے بڑے ہی پُر اسرار طریقے سے اپنی بات میں اُلجھا لیا اور آہستہ آہستہ اس کی کار سے خاصا دُور لے گیا۔

اختر اور امجد نے گاڑی سٹارٹ کی اور اُس طرف چلے گئے جہاں لوسی اکیلی عثمان کی گاڑی میں بیٹھی تھی۔ پھر انہوں نے گاڑی عثمان کی گاڑی کے قریب جا روکی۔ اختر گاڑی سے نکلا اور عثمان کی گاڑی کے اُس طرف ہو گیا جس طرف لُوسی بیٹھی تھی۔

"ایکس کیوزمی مس" ___ اختر نے بڑے ہی مہذب لہجے میں کہا ___ "میرے ساتھ ایک صاحب لِفٹ لے کر بیٹھ گئے ہیں۔ یہ ایک پرائیویٹ کلینک کا ایڈریس معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے تو سمجھ نہیں آتی اور میں انہیں مایوس بھی نہیں کرنا چاہتا لیکن کچھ پتہ بھی نہیں چل رہا کہ یہ کون سا کلینک پوچھ رہے ہیں۔ اگر آپ خود ہی ان سے پوچھیں تو شاید آپ کچھ مدد کر سکیں"۔

کسی جوان لڑکی کو اُس کی گاڑی سے نکالنے کے لئے اتنی سی بات کافی نہیں تھی جو اختر نے کی تھی لیکن لُوسی عام لڑکیوں سے بہت مختلف تھی اور ویسے بھی تیز طرار تھی۔ وہ گاڑی سے نکل آئی۔ اختر نے ایک بار پھر اُس سے معذرت کی کہ وہ اُسے زحمت دے رہا ہے۔ لڑکی کو یہ تاثر ملا کہ یہ کوئی شریف اور مہذب آدمی ہے۔ وہ اختر کی گاڑی کے قریب جا پہنچی۔ امجد جو اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا گاڑی سے نکل آیا۔ اس نے پچھلے دروازے کا لاک کھول رکھا تھا۔

میجر عثمان میجر سمیع کی بات سن رہا تھا اور اُسے تسلی دے رہا تھا۔ اس نے اپنی گاڑی کی طرف دیکھا۔

"وہ کون ہیں!" ___ اس نے کہا ___ "کیا کر رہے ہیں"۔

اتنی دور سے اختر اور امجد کو پہچاننا مشکل تھا۔

"کوئی نہیں یار!" ___ میجر سمیع نے کہا ___ "تمہاری فرینڈ کے کوئی جاننے والے

ہوں گے"۔

کیپٹن آصف نے بھی کوئی بات کہہ کر عثمان کی توجہ اس کی گاڑی کی طرف سے ہٹا لی۔

لوسی جب اختر کی گاڑی کے قریب پہنچی تو امجد نے آہستہ سے پچھلا دروازہ کھولا پھر دونوں بھائیوں نے بڑے آرام سے لوسی کو اندر پھینک دیا۔ امجد بڑی تیزی سے پچھلی سیٹ پر بیٹھا اور سیٹ پر گری ہوئی لوسی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اختر اتنی دیر میں سٹیئرنگ پر بیٹھ چکا تھا اور گاڑی چل پڑی۔

میجر سمیع اور کیپٹن آصف نے ادھر دیکھا کہ اختر اور امجد جا چکے ہیں تو وہ آہستہ آہستہ واپس ہوئے۔ جب عثمان کی گاڑی تک پہنچے تو لُوسی لاپتہ تھی۔

"کہاں گئی؟" —— میجر عثمان نے گھبرا کر پوچھا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا' پھر بولا —— "گھر نہ چلی گئی ہو لیکن وہ جاتی تو ہمارے قریب سے گزرتی"۔

"اب بھی کچھ سنبھلو عثمان یار!" —— میجر سمیع نے کہا —— "اسے کوئی اور بوائے فرینڈ مل گیا اور اس کے ساتھ چلی گئی"۔

"نو" —— میجر عثمان نے سخت غصیلی آواز میں کہا —— "آئی ڈونٹ بی لیو اِٹ۔ وہ مجھے دھوکہ نہیں دے سکتی"۔

میجر عثمان باؤلا ہُوا جا رہا تھا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی وہ کیا کرے۔

"میں تھانے میں رپورٹ لکھواؤں گا" —— میجر عثمان نے کہا۔

"تمہارا مینٹل بیلنس تو بالکل ہی اُلٹ گیا ہے یار!" —— میجر سمیع نے کہا —— "کیا لکھواؤ گے کہ وہ تمہاری کیا لگتی ہے؟ تم تو یوں باتیں کرتے ہو جیسے وہ اغوا ہو گئی ہو۔ ہم تمہیں اتنے عرصے سے کیا سمجھا رہے ہیں۔ یہ لڑکی اُڑتا پنچھی ہے۔ اپنے اُس فرینڈ کے ساتھ چلی گئی ہو گی جو اسے تم سے زیادہ مال کھلاتا ہو گا"۔

عثمان کا غصہ تو ٹھنڈا نہ ہُوا' البتہ وہ پاگلانہ سی جو حرکتیں کر رہا تھا وہ رک گئیں۔

"ہوش میں آؤ عثمان بھائی!" —— کیپٹن آصف نے کہا —— "ہم اس لڑکی کے متعلق بہت کچھ معلوم کر چکے ہیں۔ سمیع بھائی نے ٹھیک کہا ہے کہ یہ اُڑتا پنچھی ہے اور اس کی دلچسپی جسے تم محبت کہتے ہو' اس عیش موج سے ہے جو تم اسے کرواتے ہو' تمہاری ذات کے ساتھ اسے ذرا سا بھی لگاؤ نہیں"۔

"شٹ اَپ یُو اِیڈیٹ!" —— میجر عثمان نے زمین پر زور سے پاؤں مارتے ہوئے کہا —— "شی لَوز می"۔

"کُول ڈاؤن بوائے' کُول ڈاؤن" —— میجر سمیع نے عثمان کو اپنے ایک بازو کے گھیرے میں لیتے ہوئے بڑے پیار سے کہا —— "چلو آؤ ہمارے ساتھ۔ تمہیں اسی ہوٹل میں کافی پلائیں گے"۔

میجر عثمان کی ذہنی حالت بگڑتی چلی گئی اور بگڑی بھی اس حد تک کہ انگریزی بولتے بولتے اس نے پنجابی میں واہی تباہی بکنی شروع کر دی۔ یہاں تک کہ اپنے ان دونوں دوستوں کو بھی خالص پنجابی میں بُرا بھلا کہہ ڈالا لیکن دوست چونکہ اس ڈرامے کے کردار تھے اس لئے وہ ہنستے مسکراتے رہے اور اسے یہی تاثر دیتے رہے کہ جس پر اس نے اپنے اتنے پیارے گھر کی خوشیاں قربان کر دی ہیں وہ کسی اور کے ساتھ چلی گئی ہے۔ میجر عثمان اس تاثر کو تسلیم نہیں کر رہا تھا لیکن اس کا انداز بتا رہا تھا کہ دل سے اس نے اس صورتِ حال کو قبول کر لیا ہے۔

کچھ دیر بعد عثمان کا غصہ سمٹ سمٹا کر لُوسی پر مرکوز ہو گیا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ تسلیم کر رہا ہے کہ لُوسی اسے جُل دے گئی ہے۔ اب وہ مرد کی فطرت کے ایک مخصوص پہلو کو اجاگر کر رہا تھ۔ یہ رقابت کا پہلو تھا اور یہ اَنا کا مسئلہ تھا۔ کسی مرد کی محبت یا چاہت کسی معمولی سی شکل و صورت کی عورت کے ساتھ ہو جائے اور وہ عورت اس کے ہاتھ سے نکل جائے تو اس مرد کی حالت ایسی ہو جاتی ہے جیسی دنیا کی حسین ترین عورت اس کے ہاتھ سے نکل گئی ہو۔ یہ حالت اب عثمان کی ہو رہی تھی۔

"دیکھو عثمان!" —— میجر سمیع نے اسے سنجیدگی سے کہا —— "ہمارے ساتھ نہیں چلتے تو اپنے گھر جاؤ اور ٹھنڈے دل سے سوچو۔ تم تو اس قسم کی حرکتوں اور باتوں پر اتر آئے ہو جو پنجابی فلموں کے ہیرو سے کرائی جاتی ہیں۔ تم میجر ہو اور تم ہائی کلاس سوسائٹی کے معزز خاندان کے فرد ہو۔ اپنی سطح سے نہ گرو۔ تمہاری فرینڈ کو کسی نے اغوا نہیں کیا اور نہ کوئی ایسی جرأت کر سکتا ہے کہ سب کے سامنے کوئی کسی لڑکی کو زبردستی گاڑی میں ڈال کر لے جائے"۔

کیپٹن آصف نے بھی اسے بڑی سنجیدگی اور بڑے پیار سے سمجھایا۔ کیپٹن آصف کوئی نوجوان آرمی آفیسر نہیں بلکہ سینئر کیپٹن تھا اور میجر ہونے والا تھا۔ وہ آخر عثمان کے

مخلص دوست تھے۔ ان کی باتوں کو اس نے قبول کرنا شروع کر دیا اور ان کے کہنے پر اپنے گھر چلا گیا۔

○

میجر سمیع اور کیپٹن آصف گاڑی میں بیٹھے اور چلے گئے۔ ان کا رخ اختر اور امجد کی کوٹھی کی طرف تھا۔ انہوں نے وینا کے ان دونوں بھائیوں سے مل کر اس ڈرامے کا اگلا پارٹ کھیلنا تھا۔

اختر اور امجد لوسی کو اپنی کوٹھی میں لے گئے۔ چار کنال کی کوٹھی تھی جس کے بے شمار کمرے تھے۔ امجد نے راستے میں لوسی کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی۔ پٹی باندھنے سے پہلے اس نے لوسی کو ریوالور دکھایا اور کہا تھا کہ اس نے اونچی آواز نکالی یا کوئی اور حرکت کی تو اسے گولی مار کر لاش غائب کر دی جائے گی۔ لوسی چپ ہو گئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ پاکستان میں قتل ایک عام سی واردات سمجھا جاتا ہے جہاں سڑکوں پر آدمی قتل ہو جاتا ہے اور قاتل ہوائی فائر کرتے ہوئے لوگوں کے سامنے غائب ہو جاتے ہیں اور پھر کبھی پکڑے نہیں جاتے۔

ان دونوں بھائیوں کی گاڑی اپنی کوٹھی کے پہلو کی طرف جا رکی۔ انہوں نے لوسی کو نکالا اور اس طرف کے دروازے سے اندر چلے گئے جو وہ اندر سے پہلے ہی کھول کر گئے تھے۔ ان کے والدین کوٹھی کے کسی دوسرے کونے کے کمرے میں سوئے ہوئے تھے۔ لوسی کو انہوں نے صوفے پر بٹھا دیا اور آنکھوں پر کپڑا بندھا رہنے دیا۔

"مجھے ایک بات بتا دو" ___ لوسی نے پوچھا ___ "کیا تم مجھے اپنے لئے لائے ہو یا میرے گھر والوں سے تاوان مانگ کر مجھے چھوڑ دو گے؟"

"دونوں باتیں غلط ہیں" ___ اختر نے کہا ___ "تمہارے جسم کے ساتھ ہمیں ذرا سی بھی دلچسپی نہیں"۔

"تمہارے جسم سے ہمیں نفرت ہے" ___ چھوٹا بھائی امجد بولا ___ "یہ ایک ناپاک جسم ہے جسے اس گھر میں زیادہ دیر برداشت نہیں کر سکیں گے"۔

باہر ایک گاڑی کا ہارن دو بار بجا۔ اختر نے امجد کی طرف دیکھا۔ امجد باہر نکل گیا۔ میجر سمیع کی گاڑی گیٹ کے سامنے کھڑی تھی۔ امجد نے گاڑی اندر لانے کا اشارہ کیا اور گاڑی اندر آ گئی۔ میجر سمیع اور کیپٹن آصف اترے اور امجد انہیں کمرے میں لے گیا۔

اب اس کمرے میں چار آدمی ہو گئے۔ چاروں کمرے کے ایک کونے میں جا کھڑے ہوئے۔ اختر کے پوچھنے پر سمیع اور آصف نے بتایا کہ میجر عثمان کا ردِ عمل کیا تھا اور پھر یہ بتایا کہ وہ اپنے گھر چلا گیا ہے۔

"پہلے ٹیلی فون کرواتے ہیں" ___ اختر نے سرگوشی میں میجر سمیع سے کہا۔

"ابھی نہیں" ___ میجر سمیع نے کہا ___ "فون تو کروانا ہی ہے لیکن اس سے کچھ باتیں کر لی جائیں"۔

وینا اپنے گھر آئی تھی اور رات دس بجے کے لگ بھگ واپس چلی گئی تھی۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" ___ میجر سمیع نے لوسی سے پوچھا۔

"للّی سعید!" ___ لڑکی نے جواب دیا ___ "نک نیم لوسی ہے"۔

"تمہارے فادر کون ہیں؟"

"ایم اے خان" ___ لوسی نے جواب دیا۔

"کیا کام کرتے ہیں؟"

"ریٹائرڈ لائف گذار رہے ہیں" ___ لوسی نے جواب دیا ___ "پہلے زمینوں کی دیکھ بھال کرتے تھے اب یہیں رہتے ہیں"۔

"بھائی ہیں؟"

"تین بھائی ہیں" ___ لوسی نے جواب دیا۔

"کیا کرتے ہیں؟"

"آپ لوگوں کا مطلب کیا ہے؟" ___ لوسی نے رندھی ہوئی سی آواز میں پوچھا۔

"ہمارا مطلب وہ نہیں جو تم سمجھ رہی ہو" ___ میجر سمیع نے کہا ___ "ہم تمہارے متعلق کچھ جاننا چاہتے ہیں۔ تم جو کچھ بتاؤ گی اس کی ہم تصدیق کریں گے۔ اگر تمہارا جواب غلط نکلا تو پھر میں بتا نہیں سکتا تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا"۔

"میری ایک بات مانو" ___ لوسی نے کہا ___ "میں تمہارے قبضے میں ہوں اور دیکھو میں کتنی خوبصورت لڑکی ہوں۔ جتنے دن چاہو مجھے اپنے پاس رکھ لو اور اگر تمہیں پیسے چاہئیں تو کسی آدمی کو میرے گھر بھیج دو۔ جتنی رقم مانگو گے تمہیں وہاں سے مل جائے گی"۔

"میں تمہیں پہلے بتا چکا ہوں" ___ اختر نے جھنجلائی ہوئی آواز میں کہا ___ "ہمیں

نہ تمہاری خوبصورتی کے ساتھ کوئی دلچسپی ہے نہ روپے پیسے کے ساتھ"۔

"پھر اور کیا چاہتے ہو تم لوگ؟" —— لوسی نے بڑی پختہ آواز میں پوچھا۔ پھر کہنے لگی —— "میری آنکھیں تو کھول دو"۔

"تمہاری آنکھیں خود بخود کھل جائیں گی" —— میجر سمیع نے کہا —— "میجر عثمان کے ساتھ تمہارے تعلقات کیسے ہیں؟"

"وہ میرا فرینڈ ہے، تم لوگ جانتے ہو فرینڈ سے تعلقات کیسے ہوتے ہیں"۔

"ناجائز" —— اختر بولا —— "پوری بات بتاؤ۔ کیا تم اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہو؟"

"میں نہیں" —— لوسی نے جواب دیا —— "وہ میرے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے"۔

"دیکھ لڑکی!" —— میجر سمیع نے کہا —— "ہم سیدھی سیدھی بات کرتے ہیں۔ تم لوگ مہذب قسم کی عصمت فروشی کر رہے ہو اور تم عثمان کا مال دونوں ہاتھوں سے کھا رہی ہو۔ فوراً مان جاؤ اور عثمان کا ساتھ چھوڑ دو"۔

یہ لڑکی اگر عصمت فروش تھی بھی تو وہ اپنی زبان سے یہ تسلیم نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے یہ ظاہر کرنا شروع کر دیا کہ وہ ایک معزز خاندان کی لڑکی ہے اور اس خاندان میں روشن خیالی اور عورتوں کی آزادی کچھ زیادہ ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ وہ عثمان سے نہیں کھاتی بلکہ اسے کھلاتی پلاتی ہے۔

"چلو ہم مان لیتے ہیں" —— میجر سمیع نے کہا —— "لیکن تم کچھ اور بھی ہو۔ جب تک وہ نہیں بتاؤ گی، ہم تمہیں نہیں چھوڑیں گے"۔

لڑکی اتنی کچی نہیں تھی کہ وہ فوراً ہی بتا دیتی۔ وہ انڈین انٹیلی جنس کی تربیت یافتہ لڑکی تھی۔ پندرہ سولہ سال کی عمر سے اس کی ٹریننگ شروع ہوئی تھی اور نہ جانے کب سے اس میدان میں عملی کام کر رہی تھی۔

میجر سمیع، اختر، کیپٹن آصف اور امجد نے سوال و جواب کے ذریعے پورا زور لگا لیا کہ یہ لڑکی کچھ بتا دے لیکن وہ تو قلعے کی طرح مضبوط تھی۔ اختر اور امجد کا مقصد صرف یہ تھا کہ یہ لڑکی عثمان کے ساتھ تعلقات توڑ لے لیکن میجر سمیع اور کیپٹن آصف کا مقصد اس کے علاوہ کچھ اور بھی تھا۔ یہ دونوں آرمی آفیسر اس لڑکی کی کوٹھی کے پڑوس میں رہنے والے ریٹائرڈ صوبیدار میجر سے دو دفعہ مل چکے تھے۔ اس صوبیدار میجر نے چوری

چھپے اس کوٹھی کی اندر کی دنیا کو دیکھنے کی کوشش کی تھی لیکن اسے اس کے سوا کچھ پتہ نہیں چل سکا تھا کہ یہ لوگ مشکوک ہیں اور یہاں جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ ایک سنگین جرم ہے۔

صوبیدار میجر جہاندیدہ آدمی تھا۔ اس نے میجر سمیع کو پہلی ملاقات میں بتایا تھا کہ وہ انگریزوں کے دور میں ملٹری انٹیلی جنس میں رہ چکا ہے اور اس نے انگریز افسروں کے ساتھ کام کیا ہے۔ اس نے بعد کی ملاقاتوں میں میجر سمیع اور کیپٹن آصف کو بتایا تھا کہ یہ لوگ سمگلر نہیں ہو سکتے کیونکہ یہاں کبھی کوئی ٹرک، پک اپ یا جیپ نہیں آئی۔ یہ تین قسم کی گاڑیاں سمگلروں کے پاس لازمی طور پر ہوتی ہیں۔

صوبیدار میجر نے اُن افراد کو دیکھا تھا جو اس کوٹھی میں آتے جاتے تھے اور اس نے مہندر آہوجا کو بھی دیکھا تھا جو ایم اے خان بنا ہوا تھا۔ ان لوگوں کا بظاہر کوئی کاروبار نہیں تھا۔ صوبیدار میجر نے میجر سمیع اور کیپٹن آصف کو اپنی آخری رائے یہ دی تھی کہ یہ کوٹھی انڈین انٹیلی جنس کا خفیہ اڈہ معلوم ہوتی ہے۔

سیدھی سی بات تھی کہ یہ دونوں آرمی آفیسر پاکستان کے ملٹری انٹیلی جنس (آئی ایس آئی) کو بتا دیتے کہ اس کوٹھی پر چھاپہ ماریں یا نظر رکھیں لیکن نہ بتانے کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ یقین کر لینا چاہتے تھے کہ یہ بھارتی جاسوسوں کا اڈہ ہے اور دوسری وجہ یہ کہ انٹیلی جنس والوں کو یقین بھی ہو جائے کہ فلاں شخص دشمن کا جاسوس ہے یا فلاں گھر دشمن کے جاسوسوں کا اڈہ ہے تو انٹیلی جنس فوراً اس آدمی کو گرفتار نہیں کر لیتی نہ اس گھر پر فوراً چھاپہ مارتی ہے۔ اگر وہ ایسا کریں تو اس گروہ کے جسے رِنگ کہا جاتا ہے، دوسرے ارکان غائب ہو جاتے ہیں۔ ایسے آدمی اور ایسے ٹھکانے پر کچھ عرصہ نظر رکھی جاتی ہے اور نوٹ کیا جاتا ہے کہ یہ آدمی کہاں کہاں جاتا ہے اور کس کس سے ملتا ملاتا ہے اور اس ٹھکانے میں کون کون آتا جاتا ہے۔ یہ ساری معلومات حاصل کر کے کوئی کارروائی کی جاتی ہے۔

میجر سمیع اور کیپٹن آصف کو انٹیلی جنس کا یہ طریقہ معلوم تھا۔ وہ آئی ایس آئی کے لئے زمین ہموار کر کے اطلاع دینا چاہتے تھے۔ اب لڑکی ان کے ہاتھ آ گئی تھی اور انہیں توقع تھی کہ یہ لڑکی اقبال جرم کر لے گی اور وہ آئی ایس آئی سے اگلی کارروائی کرائیں گے لیکن لڑکی نے ایسے انداز اختیار کر لئے کہ وہ موم کی گڑیا کی بجائے ایسا پتھر بن گئی جسے

توڑنا محال نظر آرہا تھا۔

میجر سمیع، اختر، امجد اور کیپٹن آصف کو کمرے کے ایک کونے میں لے گیا۔

"اختر صاحب!" ــــ میجر سمیع نے کہا ــــ "آپ کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ میرے مسئلے سے آپ واقف ہیں۔ مجھے اس کا حل بھی نکالنا ہے"۔

"ایکس کیوز می!" ــــ کیپٹن آصف نے معذرت کرتے ہوئے کہا ــــ "ہمارا یعنی آئی ایس آئی کا مسئلہ حل ہو گیا تو پھر اختر صاحب کا کام تو اور زیادہ پکا ہو جاتا ہے۔ لڑکی آئی ایس آئی کے قبضے میں چلی جائے گی اور عثمان بھیا اسے ڈھونڈتے پھریں گے"۔

"آپ دونوں صاحبان جو مناسب سمجھتے ہیں کریں" ــــ اختر نے کہا ــــ "ہم دونوں بھائی ہر طرح آپ کے ساتھ ہیں" ــــ اس نے میجر سمیع کے کان کے ساتھ منہ لگا کر کہا ــــ "لڑکی کو قتل کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو یہ کام ایسے طریقے سے ہو گا کہ اس کا سراغ بھی نہیں ملے گا"۔

"وہ دیکھ لیں گے اختر صاحب!" ــــ میجر سمیع نے کہا ــــ "آپ ٹیلی فون لے آئیں"۔

امجد ٹیلی فون لانے کے لئے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔



ٹیلی فون آ گیا جو لڑکی کے پاس رکھ دیا گیا۔

"دیکھ لڑکی!" ــــ میجر سمیع نے لوسی سے کہا ــــ "ہم عثمان کا نمبر ملائیں گے اور ریسیور تمہیں دے دیں گے۔ تم نے عثمان سے یہ کہنا ہے کہ میرا ایک پرانا فرینڈ امریکہ سے آ گیا تھا۔ وہ اچانک سڑک پر مل گیا۔ تم اپنے دوستوں کے ساتھ گاڑی سے ذرا دور چلے گئے تھے۔ اس فرینڈ نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ میں اسے ٹال نہیں سکتی تھی اس لئے اس کی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ تم ناراض تو ضرور ہو گے لیکن میں دل کے ہاتھوں مجبور تھی.... تم یہ باتیں عثمان کے ساتھ کرو اور وہ تمہیں جو کچھ کہے اس کا جواب اس طرح دو کہ تمہیں عثمان کی بجائے یہ فرینڈ زیادہ عزیز ہے اور تم اس کی فرینڈ شپ نہیں چھوڑ سکتیں"۔

"میں تمہارا مطلب سمجھ گئی ہوں" ــــ لوسی نے ایسے لہجے میں کہا جس میں ذرا سا بھی ڈر یا خوف نہیں تھا۔ کہنے لگی ــــ "تم لوگ چاہتے ہو کہ میں عثمان کے ساتھ

تعلقات توڑ لوں۔ میں تمہارا یہ کام کر دوں گی۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ آئندہ عثمان سے نہیں ملوں گی۔ اس کے عوض مجھ پر یہ کرم کرو کہ مجھے چھوڑ دو"۔

"چھوڑ دیں گے" ــــ میجر سمیع نے کہا ــــ "تم نے دیکھ لیا ہے کہ ہم نے تمہارے جسم کو سوائے آنکھوں پر پٹی باندھنے کے چھُوا تک نہیں۔ ہم تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کریں گے"۔

"وہ تو میں نے دیکھ لیا ہے" ــــ لوسی نے کہا ــــ "حالانکہ میں نے اپنا آپ پیش بھی کر دیا تھا.... نمبر ملاؤ"۔

میجر سمیع نے عثمان کا نمبر ملایا اور لوسی کے ہاتھ میں ریسیور دے کر کہا کہ رِنگ جا رہی ہے۔ لوسی نے ریسیور لے لیا۔

عثمان گھر پہنچ چکا تھا اور غصے سے باؤلا ہُوا جا رہا تھا۔ گھر میں صرف وینا تھی جس پر غصہ نکال سکتا تھا۔ اس نے روزمرہ کی طرح کوئی وجہ پیدا کر لی اور وینا کے ساتھ ایسا شدید قسم کا لڑائی جھگڑا شروع کر دیا جو اس نے پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔ وہ وینا پر ایسی ایسی الزام تراشیاں کر رہا تھا جیسے وینا زبردستی اس کی بیوی بن گئی تھی اور اسے وینا نے اس کمرے میں قید کر لیا تھا۔

وینا پہلے تو برداشت کرتی رہی آخر وہ بھی پھٹ پڑی اور اس نے عثمان کو کھری کھری سنا ڈالیں۔ عثمان نے اسے طلاق تک کی دھمکی دی جس کا وینا نے یہ جواب دیا کہ طلاق لے کر میں اپنے آپ کو ایک خوش قسمت عورت سمجھوں گی۔

"میری بات سن رہے ہو عثمان!" ــــ وینا نے کہا ــــ "میں تو خود تم سے علیحدگی چاہتی ہوں لیکن میں دیکھ رہی ہوں کہ تم کس انجام کی طرف گھسیٹے ہوئے جا رہے ہو۔ میں تمہیں اس انجام سے بچا رہی ہوں۔ اس سے زیادہ خلوص اور کیا ہو گا۔ آزما کر دیکھ لو، طلاق نہ دو، میں گھر چلی جاتی ہوں۔ ایک دن آئے گا تم پریشان حال میرے پاس آؤ گے اور ہاتھ جوڑ کے کہو گے وینا اپنے گھر چلو.... وہ جو کوئی بھی ہے، اُس نے تمہارے دل اور دماغ پر بدروحوں کی طرح قبضہ کر رکھا ہے۔ اسے تمہاری ذات کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں۔ اسے تمہارے پیسے اور اس عیش و عشرت کے ساتھ دلچسپی ہے جو تم اسے کراتے ہو۔ جس روز اسے تم سے زیادہ عیش کرانے والا آدمی مل گیا وہ تمہارے منہ پر تھوک کر تمہیں پہچاننے سے انکار کر دے گی"۔

غصے سے عثمان کے دانت بجنے لگے۔ اس نے مٹھیاں بھینچ لیں۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ وینا کا گلا گھونٹ دے گا۔ غصے نے اسے اس قدر پاگل کر دیا تھا کہ کوئی بعید نہ تھا کہ وہ وینا کا گلا گھونٹ ہی دیتا لیکن ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور عثمان ٹیلی فون کی طرف لپکا اور ریسیور اٹھایا۔ لوسی بول رہی تھی۔

"کہاں ہو تم؟" —— عثمان نے پوچھا۔

لُوسی نے وہ ساری باتیں عثمان سے کہہ ڈالیں جو میجر سمیع نے اسے کہی تھیں۔ عثمان نے اسے بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ بے وفا سے لے کر بیسوا تک کہا۔ پھر ایک دو گالیاں بھی دے ڈالیں۔ لوسی نے اسے یہ آخری فیصلہ سنا کر کہ وہ آئندہ اسے نہیں ملے گی فون بند کر دیا۔ عثمان نے ریسیور کچھ دیر ہاتھ میں پکڑے رکھا اور پھر اتنی زور سے ریسیور کو فون پر رکھا کہ اس دھماکے سے وینا بدک گئی۔

وِینا سمجھ گئی کہ اس کے بھائیوں اور سمیع اور آصف نے کوئی ڈرامہ کھیلا ہے اور وہ لڑکی ان کے ہاتھ آ گئی ہے۔ وینا کو توقع تھی کہ عثمان اب اس پر اور زیادہ برسے گا لیکن عثمان سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ وینا اسے دیکھتی رہی۔ عثمان کہنیاں گھٹنوں پر اور سر ہاتھوں پر رکھے بیٹھا رہا جیسے اس سے ہتھیار ڈلوا لئے گئے ہوں۔

وِینا اٹھی اور آہستہ آہستہ عثمان کے پاس پہنچی۔ اس کے سر پر ہاتھ رکھا پھر ہاتھ اس کی ٹھوڑی کے نیچے رکھا اور اس کا چہرا اوپر اٹھایا۔

"اٹھو" —— اُس نے رُوٹھے ہوئے بچے کو منانے کے پیارے انداز سے عثمان سے کہا —— "سو جاؤ' مجھے ہمدرد اور ہمراز سمجھو اور اپنی پریشانی مجھے بتاؤ"۔

وِینا نے دیکھا کہ عثمان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وینا نے اسے اٹھایا پھر اس کا سلیپنگ سوٹ الماری سے نکال کر اس کے ہاتھ میں دیا۔ عجیب بات یہ نظر آ رہی تھی کہ عثمان بالکل ہی سرد ہو کر رہ گیا تھا۔ اس نے کپڑے بدلے اور لیٹ گیا اور وِینا اس کے بالوں میں اپنی خوبصورت انگلیوں سے کنگھی کرنے لگی۔

عثمان نے وہ رات کروٹیں بدلتے اور تڑپتے گذاری۔

○

میجر عثمان تو بڑے آرام دہ بستر اور بڑے خوبصورت پلنگ پر تڑپ رہا تھا لیکن لُوسی کچے فرش پر بچھے ہوئے ایک کمبل پر تڑپ رہی تھی۔ یہ اختر اور امجد کی کوٹھی نہیں تھی بلکہ یہ ایک

نیم پکا مکان تھا۔ یہ مکان اُس وقت بنایا گیا تھا جب ان لوگوں کا یہاں سبزیوں کا باغ ہُوا کرتا تھا۔ پھر باغ اُجڑا اور یہ مکان خالی پڑا رہ گیا۔ اس مکان کے اردگرد کچھ کھیتیاں اور کچھ جگہ ویران تھی۔ یہ جگہ اختر کے خاندان کی تھی۔

لُوسی سے عثمان کو فون کروا کے اسے یہ کہا گیا کہ اسے گھر لے جایا جا رہا ہے لیکن گھر لے جانے کی بجائے اس کمرے میں بند کر دیا گیا اور اسے کہا گیا کہ وہ در پردہ جو کچھ ہے وہ بتا دے لیکن وہ کچھ بھی بتانے پر آمادہ نہیں ہو رہی تھی۔ کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا گیا اور اختر نے اپنے گھر کا جواں سال نوکر برآمدے میں بٹھا دیا۔ لُوسی کی آنکھوں سے پٹی اتار کر منہ پر باندھ دی گئی اور اس کے دونوں ہاتھ اور پاؤں رسّیوں سے باندھ دیئے گئے تھے۔ نوکر کو یہ ہدایت دی گئی تھی کہ وہ صبح باہر کے دروازے کو تالا لگا کر سائیکل پر گھر سے یعنی اختر کی کوٹھی سے ناشتہ لائے اور اس طرح دوپہر اور شام کا کھانا بھی لے آیا کرے اور لڑکی کا منہ کھول کر اسے کھانا کھلا دیا کرے۔

اگلے روز نوکر نے لوسی کو اسی طرح ناشتہ کرایا اور کھانا بھی کھلایا۔ لڑکی نے اس سے بارہا پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں اور یہ جگہ کیا ہے اور شہر سے کتنی دُور ہے لیکن نوکر نے اسے کچھ بھی نہ بتایا۔

عثمان اپنے آفس گیا۔ وہ اپنے آپ میں نہیں تھا۔ آفس کا وقت ختم ہُوا تو وہ ایم اے خان کی کوٹھی میں گیا۔ اس نے لوسی پر اچھا خاصا پیسہ تباہ کیا تھا۔ ایم اے خان کو جو دراصل مہندر آہو جا تھا' لوسی کلب اور وہاں کی ایک عورت کو لوسی کی ماں سمجھتا تھا۔ وہ ان سے ملنا چاہتا تھا۔

"آؤ عثمان!" —— مہندر نے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا —— "لُوسی کہاں ہے؟"

"یہی تو میں پوچھنے آیا ہوں" —— عثمان نے کہا —— "رات وہ میرے ساتھ نکلی۔ مجھے دو دوست مل گئے۔ میں ان کی ایک ضروری بات سننے کے لئے گاڑی سے کچھ دور چلا گیا۔ ایک گاڑی میری گاڑی کے قریب آکر رکی۔ میں نے دیکھا کہ ایک آدمی اس گاڑی سے نکلا۔ لوسی اگلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ آدمی لوسی تک گیا اور لوسی گاڑی سے نکلی اور اس کے ساتھ اس کی گاڑی میں بیٹھ گئی اور گاڑی چلی گئی۔ رات تقریباً ایک بجے لوسی کا فون آیا اور اس نے بتایا کہ وہ اپنے ایک پرانے فرینڈ کے ساتھ چلی گئی تھی"۔

میجر عثمان نے مہندر کو وہ ساری باتیں سنائیں جو لوسی نے اسے فون پر کہی تھیں۔

"وہ تو واپس ہی نہیں آئی" —— مہندر نے کہا —— "میں اگر کہوں کہ اسے آپ ہی

لے گئے ہیں تو آپ کیا کہیں گے؟"

"میں کہوں گا کہ آپ جھوٹ بول رہے ہیں" ——— عثمان نے غصیلی آواز میں کہا ——— "اگر آپ اس کی منگنی توڑ کر میرے ساتھ شادی نہیں کرنا چاہتے تو مجھے صاف بتا دیں۔ میں کیسے مان لوں کہ وہ رات کو واپس ہی نہ آئی ہو؟ آپ میرے ساتھ گیم کھیل رہے ہیں"۔

مہندر نے عثمان کا غصہ اور انداز دیکھا تو اسے یقین ہو گیا کہ لوسی کو عثمان نے غائب نہیں کیا۔ مہندر کو بجا طور پر پریشانی ہوئی کہ لڑکی گئی کہاں۔ ایک پریشانی تو اس کی یہ تھی کہ ایک تجربہ کار لڑکی اسے بتائے بغیر کہیں چلی گئی تھی اور دوسری پریشانی یہ کہ پاک آرمی کا ایک آفیسر اس کے ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا۔

"اب بتائیں آپ کیا کہتے ہیں؟" ——— میجر عثمان نے مہندر کو پریشانی کی حالت میں دیکھ کر پوچھا۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں!" ——— مہندر نے کہا ——— "مجھے تو اب تک یہ خیال رہا کہ وہ آپ کے ساتھ ہے لیکن پتہ چلتا ہے کہ وہ کسی اور کے ساتھ چلی گئی یا اغوا ہو گئی ہے"۔

"تو چلئے میرے ساتھ!" ——— میجر عثمان نے کہا ——— "پولیس سٹیشن چلتے ہیں۔ لوسی کا ایک فوٹو ساتھ لے لیں۔ پولیس حلیہ معلوم کرنا چاہے گی"۔

"پولیس کیا کرے گی!" ——— مہندر نے کہا ——— "یہ تو ہمیں خود سراغ لگانا پڑے گا۔ اپنی پولیس کو تو آپ جانتے ہیں۔ رپورٹ لکھ کر پولیس تھانے میں بیٹھی رہے گی، اتنے میں لڑکی کہیں سے کہیں تک جا پہنچے گی" ——— مہندر نے ایک دو سیکنڈ کچھ سوچ کر عثمان سے پوچھا ——— "وہ اس کا منگیتر صغیر تو نہیں تھا جس کے ساتھ چلی گئی ہے؟"

"نہیں" ——— عثمان نے جواب دیا ——— "اسے تو میں اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ دوسری بات یہ ہے کہ صغیر کو تو وہ پسند ہی نہیں کرتی تھی"۔

میجر عثمان مہندر پر زور دے رہا تھا کہ وہ پولیس سٹیشن چلے لیکن مہندر پولیس سٹیشن جانے پر آمادہ نہیں ہو رہا تھا۔ وہ دلیل تو کچھ اور دے رہا تھا لیکن اصل وجہ یہ تھی کہ وہ پولیس سٹیشن جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا حالانکہ اس کے پاس پاکستان کا شناختی کارڈ تھا جس پر اس کا نام محمود علی خان لکھا ہوا تھا تاہم پولیس سٹیشن جانے میں اچھا خاصا خطرہ تھا۔

عثمان ٹلتا نظر نہیں آ رہا تھا لیکن مہندر کے سامنے وہ گھٹنوں کے بل چلنے والا طفل شیر خوار تھا۔ اس نے عثمان کو لگام ڈال لی اور اسے گھر بھیج دیا۔ وہ عورت جو لوسی کی ماں

بنی ہوئی تھی ایسی کائیاں عورت تھی کہ اس نے رونا شروع کر دیا اور اس طرح اپنے آنسو بہائے کہ آنسوؤں سے اس کا منہ دھلنے لگا۔ عثمان تو ان پر شک کر رہا تھا لیکن اس عورت کے آنسو دیکھ کر اس کا دل پسیج گیا۔ کہاں وہ ان پر غصہ جھاڑ رہا تھا اور کہاں یہ حالت کہ اس نے اس عورت کو تسلی دلاسہ دینا شروع کر دیا۔

میجر عثمان جب اس کوٹھی سے نکلا تو اس کے دل میں لوسی کے خلاف غصہ اور لوسی کے "ماں باپ" کی ہمدردی تھی۔ وہ جب اپنی گاڑی میں بیٹھا اور گاڑی چلی تو اسے ایک نسوانی آواز سنائی دی ——— "اسے تمہاری ذات کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں۔ جس روز اسے تم سے زیادہ عیش کرانے والا آدمی مل گیا وہ تمہارے منہ پر تھوک کر تمہیں پہچاننے سے انکار کر دے گی"۔

یہ آواز ایسی حقیقی تھی کہ عثمان نے چونک کر پچھلی سیٹ کی طرف دیکھا مگر سیٹ خالی تھی۔ اسے وینا کے رات کے الفاظ یاد آئے اور اب اسے وینا کی ہی آواز سنائی دی تھی۔ اسے شرمساری سی محسوس ہوئی اور شرمساری اس کے اندر ایک احساس بیدار کرنے لگی کہ اسے پناہ مل سکتی ہے تو اپنے گھر میں ہی ملے گی اور اگر وہ سچے پیار کی تلاش میں ہے تو وہ وینا کے پاس ہے اور اس کے ننھے منے بچوں کی معصوم مسکراہٹوں میں ہے۔

عثمان وینا اور اپنے بچوں کی پیاری سی یاد میں کھو چلا تھا اور اسے کچھ سکون سا محسوس ہونے لگا تھا لیکن اس کے ذہن میں جب لوسی نے انگڑائی لی تو ایک بار پھر غصے کا لاوا پھوٹ پڑا۔

یہ ایک بھیانک کشمکش تھی جس میں عثمان مبتلا ہو گیا تھا۔ اسی کشمکش میں وہ اپنے گھر پہنچا۔ وینا کو اس کا چھوٹا بھائی امجد بتا گیا تھا کہ لوسی کو غائب کر دیا گیا ہے۔ بھائی نے یہ نہیں بتایا تھا کہ لوسی کو کہاں چھپایا گیا ہے۔

عثمان جب گھر میں داخل ہوا تو وینا نے مسکرا کر اور آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا۔ وینا نے تو اس کی طرف دیکھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ عثمان گھر آتا تھا تو وہ دوسرے کمرے میں چلی جایا کرتی تھی۔ چونکہ بیوی تھی اس لئے چائے وائے کا پوچھ لیتی تھی لیکن بے دلی سے۔ اب وینا کا انداز بالکل ہی بدل گیا تھا۔ عثمان کو ذرا سا بھی شک نہ ہوا کہ لوسی کی گمشدگی میں وینا کا بھی ہاتھ ہے۔

اُس شام عثمان باہر گیا ہی نہیں۔ باہر کی دنیا کے ساتھ اس کا رابطہ ٹیلی فون کے ذریعے تھا۔ اس نے ایک ایک گھنٹے کے وقفے سے چار مرتبہ مہندر کو فون کیا اور لوسی کے متعلق پوچھا۔ ہر بار اسے یہی جواب ملا کہ لوسی کا کوئی سراغ نہیں ملا۔

میجر عثمان نے تو چار مرتبہ فون کیا تھا' مہندر پر پریشانی کا یہ عالم طاری تھا کہ وہ اس تھوڑے سے عرصہ میں بیسیوں فون کر چکا تھا۔ جہاں جہاں اس کے آدمی تھے اس نے لوسی کے متعلق پوچھا تھا۔ ہر جگہ سے اسے یہی ایک جواب ملتا رہا کہ لوسی یہاں نہیں آئی۔ اگر اسے اطلاع ملتی کہ لوسی مر گئی ہے یا کہیں گاڑی کے نیچے آ گئی ہے تو مہندر کو صرف یہ افسوس ہوتا کہ کام کی ایک لڑکی ضائع ہو گئی ہے' اسے غم یہ لگا ہُوا تھا کہ وہ پاکستان کی انٹیلی جنس کے ہاتھ نہ چڑھ گئی ہو۔ اس نے وائرلیس کے ذریعے خفیہ الفاظ میں نئی دلی اپنی انٹیلی جنس کو فون کیا اور انہیں بتایا کہ لوسی لاپتہ ہو گئی ہے۔

"اسے ڈھونڈنے کی کوشش کرو" ــــ اسے جواب ملا ــــ "اگر وہ مل جائے اور پتہ چل جائے کہ وہ اپنی مرضی سے کسی کے ساتھ چلی گئی ہے تو اسے کسی طرح واپس انڈیا بھیج دو اور اگر وہ کوئی گڑبڑ کرے تو اسے وہیں ختم کر دو"۔

○

رات کے نو بج رہے تھے جب میجر سمیع اور کیپٹن آصف اس کمرے میں داخل ہوئے جہاں لوسی قید تھی۔ ان کے ساتھ ایک اور تیس بتیس سال عمر کا خوبرو آدمی تھا۔ وہ ملٹری انٹیلی جنس کا میجر امتیاز تھا۔ اختر اور امجد مکان کے باہر کھڑے رہے تھے تاکہ لڑکی کو یہ پتہ نہ چل سکے کہ اسے وینا کے بھائیوں نے اغوا کیا ہے۔

"کیوں لڑکی!" ــــ میجر سمیع نے لوسی سے پوچھا ــــ "ہمارے سوال کا جواب دو گی؟"

"کیا آپ اپنا سوال دہرائیں گے؟" ــــ لوسی نے ایسے لہجے میں پوچھا جیسے اس کے دل پر ذرا سا بھی خوف نہیں بلکہ اس کے دلکش ہونٹوں پر تبسم تھا۔

"اپنی اصلیت بتا دو!" ــــ میجر سمیع نے کہا ــــ "اگر تم لوگ تہذیب اور کلچر کے پردے میں عصمت فروشی کر رہے ہو تو بتا دو۔ سمگلنگ کا چکر ہے تو وہ بتا دو"۔

"یہ لڑکی جاسوس معلوم ہوتی ہے" ــــ میجر امتیاز نے کہا۔

"آپ لوگ اس سے بھی بڑی گالی دے سکتے ہیں" ــــ لوسی نے کہا ــــ "میں آپ کی قید میں ہوں۔ اگر آپ سڑک پر یا کہیں اور مجھے عصمت فروش' سمگلر یا جاسوس کہتے تو خدا کی قسم' میں پتھر مار کر آپ کے یہ اگلے دانت توڑ دیتی..... مجھ سے پوچھتے ہو میں کون ہوں..... یہ مجھے پوچھنا چاہئے کہ تم کون ہو۔ مجھے یہی سمجھ نہیں آ رہی کہ میں تمہیں 'تم' کہوں یا 'آپ'۔ مجھے معلوم ہے تم آخر مجھ سے میرے گھر کا فون نمبر لو گے اور وہاں فون کرو گے

کہ اتنے لاکھ روپیہ فلاں جگہ پہنچا دو اور اپنی لڑکی واپس لے لو۔ کیوں نہیں اپنا مطالبہ ابھی مجھے بتا دیتے۔ میں اپنے گھر کا ایڈریس دے دیتی ہوں۔ وہاں سے آپ کو رقم مل جائے گی"۔

میجر سمیع نے میجر امتیاز کی طرف دیکھا۔

"میرا خیال ہے تم دو تین روز اور ہماری مہمان رہو" ــــ میجر سمیع نے لوسی سے کہا ــــ "تم خود ہی بول پڑو گی کہ تم کیا ہو"۔

"اکبر!" ــــ میجر سمیع نے نوکر کو آواز دی۔ وہ باہر تھا دوڑا آیا۔ میجر سمیع نے اسے کہا ــــ "پہلے کی طرح اسے باندھ دو"۔

سمیع اور امتیاز کمرے سے نکل گئے۔ نوکر نے لوسی کے ہاتھ پاؤں باندھنے شروع کر دیئے۔

"لڑکی مشکوک ہے" ــــ باہر جا کر میجر امتیاز نے کہا ــــ "اسے ابھی یہیں پڑا رہنے دو' لیکن یہ دیکھنا آپ لوگوں کا کام ہے کہ اس مکان کی سیکیورٹی کتنی مضبوط ہے اور آپ لوگ اس لڑکی کو کب تک بے خوف و خطر چھپا کر رکھ سکیں گے..... کیا یہ نوکر قابلِ اعتماد ہے؟"

"لڑکپن سے ہمارے گھر میں ہے" ــــ اختر نے جواب دیا ــــ "مجھے پوری امید ہے یہ دھوکہ نہیں دے گا"۔

○

میجر امتیاز انٹیلی جنس کی طرف سے سرکاری طور پر نہیں آیا تھا۔ وہ کیپٹن آصف کا قریبی رشتہ دار تھا۔ سمیع اور آصف نے اسے کہا تھا کہ وہ اس لڑکی کو آ کر دیکھ لے۔ جب تک یقین نہ ہو جائے کہ یہ لڑکی جاسوسی کے کسی رنگ کی ہے اُس وقت تک آئی ایس آئی کو اطلاع نہ دی جائے۔

یہ تینوں آرمی آفیسر گاڑی میں بیٹھے اور چلے گئے۔ لوسی کے منہ پر کپڑا باندھ کر رکھا جاتا تھا تاکہ اس کی آواز نہ نکل سکے۔ اختر کا ملازم اس کے ہاتھ پاؤں باندھ چکا تو اس کے منہ پر کپڑا باندھنے لگا۔ لوسی نے اس سے اس کا نام پوچھا۔ نوکر نے اپنا نام اکبر بتایا۔

اکبر کی عمر تینتیس چونتیس سال ہو گئی تھی۔ وہ اختر کے گھر کا خاص نوکر تھا۔ صاف ستھرے اور اچھی قسم کے کپڑے پہنتا تھا۔ اس کی شکل و صورت بھی ایسی تھی کہ کسی گھر

کانوکر نہیں لگتا تھا نہ اس کے چہرے اور انداز میں غربت کی جھلک تھی۔ چہرے مہرے کا رنگ بھی ٹھیک ٹھاک تھا۔

"اکبر!" ــــ لوسی نے منت کے لہجے میں اسے کہا ــــ "تھوڑی دیر اور میرا منہ کھلا رہنے دو۔ میں ذرا سی بھی اونچی آواز نہیں نکالوں گی"۔

اکبر نے اس کی بات مان لی اور کپڑا الگ رکھ دیا۔

"تم ان لوگوں کے کیا لگتے ہو؟" ــــ لوسی نے اکبر سے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں" ــــ اکبر نے جواب دیا ــــ "میں تو ان کا نوکر ہوں"۔

"کیوں جھوٹ بولتے ہو" ــــ لوسی نے مسکرا کر کہا ــــ "تم نوکر لگتے ہی نہیں۔ تمہارا چہرہ، تمہارے کپڑے اور تمہارا طور طریقہ نوکروں والا ہے ہی نہیں۔ تم تو کوٹھیوں میں رہنے والے آدمی ہو"۔

"مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے" ــــ اکبر نے کہا ــــ "یہ لوگ جب آئیں تو ان سے پوچھ لینا"۔

"میں نہیں مانتی" ــــ لوسی نے کہا ــــ "تم کسی محکمے میں افسر ہو یا تم بہت بڑے جاگیردار ہو۔ تم تو خوبصورت آدمی ہو۔ اگر تم نوکر ہوتے تو میں تمہارے ساتھ بات بھی نہ کرتی۔ میرا دل چاہتا ہے کہ تمہارے ساتھ باتیں کروں کیونکہ تم میرے خاندان کی برابری کے آدمی ہو..... میرے قریب ہو کر بیٹھو"۔

اکبر نوکر ہی تو تھا۔ ایک خوبصورت اور اونچے درجے کی لڑکی نے اسے افسر، جاگیردار، خوبصورت اور دلکش آدمی کہہ دیا تو اس کے غبارے میں ہوا بھر گئی۔ لوسی کی مسکراہٹ کا جادو الگ چل رہا تھا۔ لوسی نے اسے کہا کہ میرے قریب ہو جاؤ تو وہ اتنا قریب ہو گیا کہ دونوں کے جسموں کے درمیان ہوا کے گزرنے کی بھی جگہ نہ رہی۔

"کیا میں واقعی تمہیں افسر یا امیر آدمی لگتا ہوں؟" ــــ اکبر نے پوچھا۔

"تو کیا میں غلط کہہ رہی ہوں!" ــــ لوسی نے اپنی مسکراہٹ کو اور زیادہ طلسماتی بناتے ہوئے کہا ــــ "اگر تم افسر نہیں ہو اور امیر آدمی بھی نہیں ہو تو بھی تم مجھے بہت ہی اچھے لگتے ہو..... یہ لوگ کون ہیں جو مجھے یہاں لائے ہیں؟"

"یہ نہیں بتاؤں گا" ــــ اکبر نے جواب دیا۔

"چلو نہ بتاؤ" ــــ لوسی نے کہا ــــ "کوئی اور بات کرو۔ میرا دل بہت گھبرا رہا

ہے"۔

اکبر اس کے پہلو کے ساتھ لگ کر بیٹھا ہوا تھا۔ لوسی کھلاڑی لڑکی تھی۔ وہ باتیں کرتے کرتے اپنا سر اکبر کے چہرے کے قریب لے گئی۔ لوسی کے ریشم جیسے بال کھلے اور بکھرے ہوئے تھے۔ یہ بال اکبر کے گالوں سے مس کرنے لگے۔ اکبر نے پرے ہٹنے کی بجائے اپنا چہرہ لوسی کے اور قریب کر لیا۔

"اکبر!" ــــ لوسی نے منت سماجت کے انداز سے کہا ــــ "تھوڑی سی دیر کے لئے ہاتھ بھی کھول دو۔ میں کمزور سی لڑکی ہوں اور تم اتنے تندرست اور توانا مرد ہو۔ میں بھاگ تو نہیں سکتی" ــــ لوسی نے اپنا چہرہ اکبر کی طرف گھمایا تو اس کا منہ اکبر کے منہ کے بالکل قریب ہو گیا، اتنا قریب کہ ان کی سانسیں ٹکرانے لگیں اور وہ دونوں ایک دوسرے کے سانسوں کی تپش محسوس کرنے لگے۔ لوسی نے سرگوشی کی ــــ "ہاتھ کھول دو اکبر!"

اکبر آہستہ آہستہ لوسی کے پیچھے ہو گیا اور اس کے ہاتھ کھولنے لگا۔ رسی کھول کر وہ پھر لوسی کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ لوسی نے اپنی دونوں کلائیاں ہاتھوں سے ملیں پھر بازو انگڑائی لینے کے انداز سے اوپر کو اور کچھ دائیں بائیں پھیلائے، انگڑائی لی اور جس طرف اکبر بیٹھا ہوا تھا، اپنا اس طرف کا بازو اکبر کی گردن میں ڈال دیا اور اس کا گال اپنے گالوں سے لگا دیا۔

"تمہارا بہت بہت شکریہ" ــــ لوسی نے مخمور سی آواز میں کہا ــــ "اب جس وقت تم چاہو گے میرے ہاتھ باندھ دینا"۔

"پاؤں بھی کھول دوں؟" ــــ اکبر نے پوچھا۔

"تم چاہو تو کھول دو" ــــ لوسی نے کہا ــــ "میں تمہیں کہنا نہیں چاہتی تھی کیونکہ تمہاری ذمہ داری میں ہوں۔ میں سوچتی تھی کہ دوسرے آدمی آ گئے تو وہ تم سے ناراض ہوں گے" ــــ لوسی نے پیارے سے لہجے میں اکبر سے پوچھا ــــ "اب جھوٹ نہ بولنا۔ سچ بتاؤ، کیا تم واقعی ان لوگوں کے گھر میں نوکر ہو؟"

"تم مانتیں کیوں نہیں؟" ــــ اکبر نے کہا ــــ "میں سچ کہہ رہا ہوں کہ میں ان کا نوکر ہوں" ــــ یہ کہہ کر اس نے لوسی کے پاؤں بھی کھول دیئے۔

"اتنے خوبصورت اور اتنے پیارے آدمی ہوتے ہوئے تم کسی کے گھر کی نوکری

کیوں کر رہے ہو؟" —— لوسی نے پوچھا —— "کیا تم شادی شدہ ہو؟"

"نہیں" —— اکبر نے جواب دیا —— "میں اپنی شادی کی تو سوچ بھی نہیں سکتا"۔

"تمہاری عمر کیا ہے؟"

"تیس پینتیس کے درمیان ہو گی" —— اکبر نے جواب دیا۔

"نہیں" —— لوسی نے حیران سا ہو کے کہا —— "تمہاری عمر اتنی نہیں ہو سکتی۔ تم تو بیس بائیس سال کے نوجوان لگتے ہو.... گھر میں نوکری کیوں کر رہے ہو اور ابھی تک شادی کیوں نہیں کی؟"

"مجبوری!"

"کیسی مجبوری؟" —— لوسی نے پوچھا۔

"میری دو چھوٹی بہنیں جوان ہو گئی ہیں" —— اکبر نے کہا —— "باپ بچپن میں مر گیا تھا۔ پہلے ان بہنوں کو بیاہوں گا پھر ہمت ہوئی تو خود شادی کروں گا ورنہ اکیلے ہی عمر گزار دوں گا۔ میں نویں جماعت میں پڑھتا تھا جب باپ مر گیا تھا۔ پڑھنا چھوڑ دیا اور کبھی کسی ہوٹل میں اور کبھی کسی گھر میں نوکری کرتا رہا۔ پھر اس گھر میں آ گیا۔ یہ اچھے لوگ ہیں۔ انہوں نے میری بہت قدر کی۔ تنخواہ بھی زیادہ دیتے ہیں۔ کھانا پینا اور کپڑا انہی سے ملتا ہے اور میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ ساری تنخواہ ماں کو دے آتا ہوں۔ وہ بیچاری اس بڑھاپے میں بھی محنت مزدوری کرتی ہے اور میری تنخواہ میری بہنوں کے جہیز بنانے کے لئے رکھتی رہتی ہے"۔

"نہیں" —— لوسی نے کہا —— "ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ تم جیسا عقل اور شکل والا آدمی اپنی زندگی برباد کر رہا ہے.... اس طرح کب تک جہیز بنا لو گے؟"

"اور کوئی ذریعہ بھی تو نہیں" —— اکبر نے کہا —— "ماں نے آدھے آدھے جہیز تو بنا لئے ہیں۔ اکٹھی رقم کہیں سے مل نہیں سکتی"۔

"کتنی رقم مل جائے تو تمہارا کام ہو سکتا ہے؟" —— لُوسی نے پوچھا۔

"بیس پچیس ہزار تو ہو" —— اکبر نے اس طرح کہا جیسے اس نے آہ لی ہو —— "اتنی رقم تو خواب میں بھی نہیں دیکھ سکتا"۔

"تم یہ تو ضرور سوچتے ہو گے کہ تمہاری شادی ہو" —— لُوسی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"غریب آدمی اتنے اچھے خواب کہاں دیکھ سکتا ہے" —— اکبر نے آہ لے کر کہا۔

"اچھا یہ بتاؤ اکبر!" —— لوسی نے مذاق کے رنگ میں پوچھا —— "تمہیں کس قسم کی لڑکی پسند ہے؟"

اکبر ہنس پڑا۔

"مجھ جیسی بیوی کو پسند کرو گے؟" —— لوسی نے اس کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر پوچھا۔

"تم تو بہت خوبصورت ہو" —— اکبر نے کہا۔

"ایک بات بتاؤں اکبر!" —— لُوسی نے کہا —— "مجھ جیسی خوبصورت لڑکیاں تم جیسے خوبصورت آدمیوں کو پسند کرتی ہیں"۔

لُوسی نے اکبر کو اپنے دونوں بازوؤں میں لے لیا۔ اکبر پر خود سپردگی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ لوسی تجربہ کار لڑکی تھی۔ اس نے اکبر پر اپنے حسن کا طلسم طاری کر دیا۔ اسے اندازہ تھا کہ یہ جوان آدمی کس حد تک متاثر ہو چکا ہے۔ اسے وہ پوری طرح ہپناٹائز کر رہی تھی۔ کچھ زیادہ دیر نہ لگی۔ اکبر کبھی اس کے نرم و ملائم بالوں میں اپنی انگلیاں ڈالتا کبھی اسے اپنے ساتھ لگا لیتا۔

لُوسی کو پتہ چل گیا کہ اب یہ شخص مکمل طور پر اپنے قابو سے نکل کر اس کے قابو میں آ گیا ہے۔

"اب بات سنو اکبر!" —— لوسی نے اس سے ذرا الگ ہوتے ہوئے کہا —— "میرے دماغ پر تمہاری دونوں بہنیں سوار ہیں۔ تم کہتے ہو کہ بیس پچیس ہزار روپیہ مل جائے تو ان کی شادی ہو سکتی ہے۔ اگر آج ہی رات تمہیں بیس ہزار روپیہ مل جائے تو اچھا نہیں؟"

"میرے لئے خدا چھت تو نہیں پھاڑ سکتا" —— اکبر نے کہا۔

"اگر خدا چھت پھاڑ دے تو کیا تم یہ رقم قبول کر لو گے؟" —— لُوسی نے پوچھا۔

اکبر جوان آدمی تھا اور اس کی جوانی کو لوسی جیسی خوبصورت لڑکی نے مشتعل کر دیا تھا۔ اس نے لُوسی کو دونوں بازوؤں سے پکڑ کر پھر اپنے ساتھ لگا لیا۔

"ذرا ٹھہرو اکبر!" —— لُوسی نے اس کے بازوؤں سے نکلے بغیر کہا —— "میں تمہیں مایوس نہیں کروں گی۔ تم تو میرے دل کو اتنے اچھے لگتے ہو کہ میں تمہیں اپنے گھر رکھ

لوں گی۔ میری شادی کسی اور کے ساتھ ہو گئی تو میں پھر بھی تمہاری رہوں گی۔ اس محبت کی وجہ سے میں چاہتی ہوں کہ آج ہی رات تمہیں بیس ہزار روپیہ مل جائے تاکہ تم اپنی بہنوں کے غم سے آزاد ہو جاؤ پھر ہم دونوں آزاد ہوں گے"۔

"بیس ہزار ملے گا کہاں سے؟" ___ اکبر نے پوچھا ___ "تم تو یہاں قید میں پڑی ہوئی ہو"۔

"قید سے نکالنا تمہارا کام ہے" ___ لوسی نے اپنا ایک گال اس کے ایک گال کے ساتھ لگا کر کہا ___ "تمہارے پاس سائیکل ہے۔ اس پر مجھے بٹھاؤ اور چلو"۔

"کہاں؟"

"میرے گھر!" ___ لوسی نے کہا اور اپنا گال اس کے گال کے ساتھ اور زیادہ دبایا۔

"میرے مالک مجھے جان سے مار ڈالیں گے" ___ اکبر نے کہا۔

"تم انہیں پھر کبھی ملو گے تو جان سے ماریں گے نا!" ___ لُوسی نے کہا ___ "میں تمہیں اپنے ساتھ رکھوں گی اور میں نے اس شہر میں رہنا ہی نہیں ہے۔ تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔ بیس ہزار نقد دوں گی اور میں خود بھی تمہارے لئے ایک انعام ہوں۔ آج رات میں تمہیں اپنی کوٹھی کے کمرے میں اپنے ساتھ رکھوں گی"۔

اکبر اس کلاس کا ایک جوان آدمی تھا جس میں دو ہی ضروریات کو اہمیت دی جاتی ہے ___ پیٹ کی بھوک اور جنسیت کی بھوک ___ یہی وہ لوگ ہوتے ہیں جو مار دھاڑ اور جنسی لذت سے بھرپور فلمیں دیکھنے جاتے ہیں اور کپڑے پھاڑ پھڑوا کر ٹکٹ لیتے اور فلم دیکھتے ہیں۔ ان ہی لوگوں کے مطالبے پر سینما ہال میں بلیو فلموں کے ٹوٹے دکھائے جاتے ہیں۔

لُوسی ہوشیار لڑکی تھی اور اس کلاس کی نفسیات کو سمجھتی تھی۔ آدمی کسی بھی کلاس کا ہوتا 'لوئر' 'مڈل یا اپر' وہ ہر کلاس کے آدمیوں کی کمزوریوں سے آگاہ تھی۔ یہی لوسی اور اس جیسی لڑکیوں کو ٹریننگ ملتی تھی۔ اس نے اکبر کو بڑی آسانی سے اپنے شیشے میں اتار لیا تھا۔ یہ تو بڑا آسان شکار تھا جو اس لڑکی نے مار لیا۔

رات ساڑھے گیارہ بارہ بجے کے درمیان عمل تھا۔ شہر کی ایک سڑک پر جو دن بھر ٹریفک کے ہجوم تلے کراہتی تھی ایک سائیکل جا رہی تھی۔ گاڑیوں کی ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ سائیکل کے پیچھے کیریئر پر ایک عورت بیٹھی تھی جس نے اپنے اوپر ایک کمبل لے رکھا تھا۔ اِکّا دُکّا گاڑی قریب سے گزرتی تھی اور کوئی گاڑی والا اس سائیکل والے کی طرف دیکھتا ہی نہیں تھا۔ کوئی دیکھتا بھی تو یہی کہتا کہ ایک مزدور پیشہ آدمی اپنی بیوی' بہن یا ماں کو سائیکل پر بٹھائے کہیں جا رہا ہے۔

"کمبل اور آگے کر لو" ___ سائیکل والے نے اپنے پیچھے بیٹھی ہوئی عورت سے کہا ___ "آگے پولیس کی گاڑی کھڑی ہے"۔

عورت نے کمبل کا گھونگھٹ نکال لیا۔ دو تین منٹ بعد سائیکل پولیس کی گاڑی کے قریب پہنچی۔ یہ گشتی پولیس کی گاڑی تھی جو انہوں نے وہاں روک لی تھی۔ سائیکل گاڑی کے پاس سے گزری تو ایک پولیس والے کی آواز سنائی دی۔

"اوئے ٹھہر اوئے!" ___ ایک پولیس والے نے کہا۔

سائیکل رک گئی۔ ایک ہیڈ کانسٹیبل سائیکل کے قریب گیا اور اس نے عورت کے اوپر سے کمبل اتار دیا۔ کمبل کے اندر سے نہایت خوبصورت اور ماڈرن لڑکی برآمد ہوئی۔

"یہ کون ہے اوئے؟" ___ ہیڈ کانسٹیبل نے پوچھا ___ "اور تم کون ہو؟ ادھر آؤ ہمارے ساتھ گاڑی میں بیٹھو"۔

لڑکی کُود کر سائیکل سے اُتری اور اُس نے کمبل الگ پھینک دیا ___ یہ لُوسی تھی اور

سائیکل چلانے والا اکبر تھا۔

''کیوں بیٹھیں تمہاری گاڑی میں؟'' — لُوسی نے بڑے رعب سے پوچھا — ''کیا نام ہے تمہارا؟''

''واہ بھئی واہ'' — ہیڈ کانسٹیبل نے طنزیہ کہا — ''یہ دیکھو بھائیو' چور کوتوال کو ڈانٹ رہا ہے''۔

''بکواس بند کرو'' — لُوسی نے کہا — ''چلو مجھے گاڑی میں بٹھاؤ پھر دیکھنا کیا ہوتا ہے۔ تم میرے جوتے چاٹو گے کہ مجھے چھوڑ دو اور میں نہیں چھوڑوں گی۔ ایس ایس پی اشتیاق ہاشمی کو جانتے ہو؟''

''تم کیا سمجھتی ہو میں اپنے ایس ایس پی کو بھی نہیں جانتا؟'' — ہیڈ کانسٹیبل نے کہا۔

''تو پھر مجھے بھی جان لو گے'' — لُوسی نے کہا — ''میں جانتی ہوں تم اپنی ڈیوٹی پوری کر رہے ہو اس لئے میں تمہیں بتا دیتی ہوں کہ میں اس سائیکل پر کس طرح بیٹھی ہوں۔ تم میرے پاس ٹھہرو اور اپنی گاڑی سیدھی آگے بھیجو۔ آگے ایک بتّی والا چوک آئے گا۔ دائیں طرف گھوم جانا۔ دور آگے جا کر بائیں کو جانا۔ دو تین فرلانگ آگے میدان آ جائے گا....''

''ہمیں اس چکر میں نہ ڈالو'' — ہیڈ کانسٹیبل نے کہا — ''تم اپنی بات بتاؤ''۔

''میں ایک فنکشن سے آ رہی تھی'' — لُوسی نے جواب دیا — ''راستے میں گاڑی پنکچر ہو گئی۔ ڈگی کھول کر دیکھا تو اس میں جیک نہیں تھا۔ وہ ایسی ویران جگہ ہے کہ کوئی گاڑی بھی نظر نہیں آتی تھی جس سے لفٹ لے لیتی۔ وہاں میرا کھڑا رہنا تو ٹھیک نہیں تھا۔ یہ بے چارہ آ رہا تھا۔ اسے کہا کہ میں تمہیں پچاس روپے دوں گی' مجھے گھر پہنچا دو۔ اس نے کہا میں کچھ بھی نہیں لوں گا' اکیلی دکیلی عورت کی مدد کرنا میرا فرض ہے''۔

''پھر یہ کمبل اوپر کیوں لے رکھا تھا؟'' — ہیڈ کانسٹیبل نے پوچھا۔

''سائیکل پر بیٹھے مجھے اچھا نہیں لگتا تھا'' — لُوسی نے کہا — ''اور ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کوئی دیکھ لیتا تو وہ حیران ہوتا کہ یہ غریب سا آدمی اس لڑکی کو کہاں لے جا رہا ہے۔ آج کل کے ایک دو نوجوان موٹر سائیکل یا گاڑی پر جاتا دیکھ لیتے تو تم جانتے ہو وہ میرے ساتھ کیا سلوک کرتے''۔

''ایس ایس پی صاحب تمہارے کیا لگتے ہیں؟'' — ہیڈ کانسٹیبل نے پوچھا۔

''یہ تھانے چل کر بتاؤں گی'' — لُوسی نے کہا — ''اگر ہمت ہے تو مجھے تھانے لے چلو.... وہاں جا کر ایک فائدہ تو یہ ہو گا کہ میں اشتیاق ہاشمی صاحب کو اور اپنے گھر بھی ٹیلی فون پر اطلاع دے سکوں گی۔ دونوں گھروں کی گاڑیاں مجھے لینے کے لئے آ جائیں گی لیکن تمہاری خیر نہیں.... کہو کیا کہتے ہو؟''

''جا بی بی جا!'' — ہیڈ کانسٹیبل نے بے مزہ سے لہجے میں کہا — ''لیکن ٹھہر جا۔ ہم تمہیں اپنی گاڑی میں گھر پہنچا دیتے ہیں''۔

''نہیں نہیں'' — لُوسی نے کہا — ''ڈیوٹی والی گاڑی کو میں ذاتی کام کے لئے استعمال نہیں کروں گی۔ بھائی جان ہاشمی صاحب کو پتہ چلا تو وہ ناراض ہوں گے''۔

لُوسی کی شکل و صورت اور اس کا لباس اور اس کی ڈیل ڈول بتا رہی تھی کہ اپر کلاس کی لڑکی ہے اور یہ ایس ایس پی جیسے بڑے افسر کی قریبی رشتہ دار ہو سکتی ہے۔ باقی کمال لُوسی کی ایکٹنگ کا تھا جو اس نے بڑی خود اعتمادی سے کی تھی۔ اکبر نے ہیڈ کانسٹیبل سے اتنا ہی کہا کہ جناب میں نے تو اپنی طرف سے نیکی کا کام کیا ہے۔

ہیڈ کانسٹیبل ایسا مرعوب ہُوا کہ اس نے بڑے احترام سے اکبر اور لوسی کو رخصت کر دیا۔



آدھی رات کے وقت ''ایم اے خان'' کی کال بیل بجی تو مہندر بڑی شدت سے چونکا۔ وہ گہری نیند سے جاگا تھا۔ اس کوٹھی کی کال بیل تو کسی بھی وقت بج سکتی تھی اور بجتی ہی رہتی تھی لیکن لُوسی کی گمشدگی نے اسے پریشان کر رکھا تھا۔ اسے یہی ایک خطرہ نظر آ رہا تھا کہ لُوسی نے کوئی الٹی سیدھی نشاندہی کر دی تو سارا رنگ پکڑا جائے گا۔ گیٹ کھولنے کی ڈیوٹی ایک نوکر کی تھی۔ وہ دوڑ آ گیا۔ اُس نے دُور سے گیٹ کی روشنی میں لُوسی کو دیکھا تو اور تیز دوڑ پڑا اور جا کر گیٹ کھولا۔

ان الفاظ پر کہ لُوسی آ گئی ہے مہندر اچھل کر پلنگ سے اٹھا اور اپنے کمرے کا دروازہ کھولا۔

''کہاں چلی گئی تھی؟'' — مہندر نے پوچھا۔

لُوسی نے اسے من و عن سنا دیا کہ وہ کس طرح اغوا ہوئی اور اس پر کیا بیتی اور وہ

کس طرح اس قید سے فرار ہوئی ہے۔ اس نے اکبر کو مہندر کے سامنے کیا۔

"ڈیڈی!" — لُوسی نے مہندر سے کہا — "اسے بیس ہزار روپیہ انعام دینا ہے"۔

"ہاں بیٹی!" — مہندر نے کہا — "بیس ہزار تم نے کہا ہے' میں اسے پچیس ہزار روپیہ دوں گا۔ کل بینک سے چیک کیش کروا لینا۔ ابھی اس کے سونے کا بندوبست کرو"۔

ایک نوکر کو بلا کر اکبر کو اس کے حوالے کر دیا گیا۔ نوکر اکبر کو کمرے سے باہر لے گیا اور خود واپس آگیا۔ مہندر نے اسے اشارہ ایسا ہی کیا تھا۔ مہندر نے نوکر کو اپنے پاس بلایا اور اس کے کان میں کچھ کہا۔

"ٹھیک ہے" — نوکر نے کہا — "میں سمجھ گیا۔ سنبھال لوں گا"۔

"خیال رکھنا لُوسی!" — مہندر نے کہا — "اس کی ہوا بھی باہر نہ نکلے ورنہ سب پھنس جائیں گے.... اب سوچنا یہ ہے کہ یہ کون لوگ تھے جو تمہیں اپنے ساتھ لے گئے تھے"۔

"ایک وجہ تو بڑی صاف ہے" — لُوسی نے کہا — "میرا خیال ہے اتنا زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ دو تو میجر عثمان کے بھائی لگتے تھے۔ انہوں نے مجھے کہا تھا کہ میں میجر عثمان کے ساتھ تعلقات توڑ لوں اور انہوں نے مجھ سے میجر عثمان کو ٹیلی فون بھی کروایا تھا اور مجھ سے یہ کہلوایا تھا کہ میں اپنے ایک فرینڈ کے ساتھ جا رہی ہوں اور میں آئندہ اسے یعنی عثمان سے نہیں ملوں گی.... اس سے میرے اغوا کا مقصد صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عثمان کے ساتھ میرے تعلقات توڑنا چاہتے ہیں لیکن وہ تو مجھ سے یہ پوچھ رہے تھے کہ میں کون ہوں اور کیا ہوں۔ انہوں نے تو صاف کہہ دیا تھا کہ تم جاسوس ہو یا سمگلر یا ہائی کلاس سوسائٹی کی عصمت فروش ہو"۔

"صبح ہوتے ہی تمہیں غائب کر دوں گا" — مہندر نے لوسی سے کہا — "تمہارا اب یہاں رہنا ٹھیک نہیں"۔

"کراچی بہتر رہے گا یا اسلام آباد؟" — لُوسی نے پوچھا۔

"کراچی!" — مہندر نے کہا — "اسلام آباد کی نسبت کراچی زیادہ محفوظ ہے۔ ویسے تو پورا سندھ اپنے قبضے میں ہے۔ میں تمہیں پہلی فلائٹ میں ہی کراچی بھیج دوں گا"۔

لُوسی بڑی تکلیف دہ قید سے نکلی تھی اور وہ فرش پر سوتی رہی تھی۔ اُس کا جسم دکھ رہا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں گئی' پلنگ پر گر پڑنے کے انداز سے لیٹی اور لیٹتے ہی اس کی آنکھ لگ گئی۔

○

اکبر کا روز مرّہ کا معمول یہ تھا کہ علی الصبح اس مکان کو جس میں لُوسی قید تھی تالا لگا کر اختر کے گھر چلا جایا کرتا اور لُوسی کے لئے ناشتہ لے جایا کرتا تھا۔ اس صبح سورج بھی نکل آیا اور سورج اوپر بھی آگیا لیکن اکبر گھر نہ پہنچا۔ امجد گاڑی میں بیٹھا اور اُس جگہ گیا جہاں لُوسی قید تھی۔ اس نے گاڑی دور روک لی تھی۔ مکان کے باہر والے دروازے پر اس نے ہاتھ رکھا تو دروازہ کھل گیا۔ اندر جا کے دیکھا تو وہاں اکبر نہیں تھا' لوسی بھی نہیں تھی اور اکبر کی سائیکل بھی نہیں تھی۔ دو رسّیاں جن سے لُوسی کے ہاتھ اور پاؤں باندھے جاتے تھے اور وہ کپڑا جو لُوسی کے منہ سے باندھا جاتا تھا وہ وہیں پڑا تھا۔ امجد کا تو پسینہ نکل آیا۔ باہر والے دروازے سے جو تالا لگایا جاتا تھا وہ بمعہ چابی اندر پڑا تھا۔ امجد نے وہ تالا باہر لگایا اور واپس اپنے گھر پہنچ گیا۔

اختر نے جب سنا کہ لوسی بمعہ اکبر غائب ہے تو وہ پریشان ہو گیا۔ اس نے میجر سمیع کو فون پر بتایا۔

"یہ تو بڑا موٹا شکار ہاتھ سے نکل گیا ہے" — میجر سمیع نے کہا — "یہ تو ہو نہیں سکتا کہ اکبر لُوسی کو اُڑا کر لے گیا ہو۔ اُس نے لُوسی کا کیا بنانا تھا۔ وہ تو غریب آدمی تھا۔ یہی ہوا ہے کہ لُوسی اکبر کو اُڑا کر لے گئی ہے یا اس رِنگ کے آدمیوں کو کسی طرح سراغ مل گیا ہو گا کہ ان کی لڑکی یہاں قید ہے۔ ان آدمیوں نے دیواریں پھاند کر لُوسی کو آزاد کرا لیا اور اکبر کو بھی اپنے ساتھ لے گئے ہوں گے.... کیا اکبر واقعی قابلِ اعتماد تھا؟"

"ہاں میجر سمیع!" — اختر نے کہا — "وہ اتنی جرات نہیں کر سکتا کہ لڑکی کو اُڑا لے گیا ہو۔ بہرحال میں اس کے گاؤں جا کر اس کا پتہ کروں گا"۔

اختر اُسی وقت گاڑی میں بیٹھا اور اکبر کے گاؤں چلا گیا جو شہر سے دو تین میل ہی دور تھا۔ وہاں سے پتہ چلا کہ اکبر گھر نہیں آیا۔

اکبر گاؤں میں کیسے ملتا' وہ اُس وقت ایم اے خان کی کوٹھی کے ایک کمرے میں تھا

اور بڑی ہی گہری نیند سویا ہُوا تھا۔ اس کے سر پر ڈھول بجائے جاتے تو بھی وہ اس نیند سے بیدار نہیں ہو سکتا تھا۔ اسے ناشتے کے ساتھ جو چائے پلائی گئی تھی' اس میں بڑی تیز طاقت والی ٹرانکولائزر گولیاں ملائی گئی تھیں۔ ان گولیوں کا کوئی ذائقہ نہیں تھا۔ اکبر نے ایسا پر تکلّف ناشتہ دیکھا تو ہو گا لیکن کھایا کبھی نہیں تھا۔ وہ چائے کی تین پیالیاں پی گیا تھا۔ کم از کم اڑتالیس گھنٹے کے بعد ہی اس نے بیدار ہونا تھا۔

دوپہر کے کھانے کے وقت اس کی آنکھ نہ کھلی۔ شام کے کھانے کے وقت بھی وہ گہری نیند سویا رہا۔ اگلی صبح اس کی آنکھ کھلی۔ کوٹھی کے نوکر نے دیکھا تو پھر اس کے آگے ناشتہ رکھ دیا اور اُسے پھر وہی چائے پلائی گئی جس میں ذہن کو سلا دینے والی گولیاں ملی ہوئی تھیں۔

ناشتہ کر کے وہ پھر سو گیا۔ سارا دن سویا رہا۔ رات آدھی گزر گئی تھی جب دو نوکروں نے اسے پلنگ سے اٹھایا اور کوٹھی کے پیچھے کھڑی کار کی پچھلی سیٹ پر ڈال دیا۔ اس کی آنکھ نہ کھلی۔ کار کوٹھی سے نکل گئی اور نہر کے کنارے کنارے دور تک چلی گئی۔

یہ تو تیسرے دن کا واقعہ ہے جب اکبر کو اس کوٹھی سے لے گئے تھے' اس سے پہلے رہائی کی پہلی صبح جب اکبر کو پہلا ناشتہ دیا جا رہا تھا' لُوسی مہندر کے پاس بیٹھی ناشتہ کر رہی تھی۔ وہ عورت بھی ان کے ساتھ تھی جو لُوسی کی ماں بنی ہوئی تھی۔

"مجھے ایک مشورہ دیں" ___ لُوسی نے مہندر اور اس عورت سے کہا ___ "عثمان کی بیوی کے بھائی اس سے میرا تعلق توڑنا چاہتے تھے' اس کا انہوں نے جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ میرے لئے بڑا ہی اذیّت ناک تھا۔ میں ان سے اور ان کی بہن سے انتقام لینا چاہتی ہوں"۔

"وہ کیسے؟" ___ مہندر نے پوچھا۔

"وہ اس طرح" ___ لُوسی نے کہا ___ "میں عثمان کو فون پر بتاؤں گی کہ میں نے اسے جو فون کیا تھا وہ مجھ سے ڈرا دھمکا کر کرایا گیا تھا۔ میں قید میں تھی' میری آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ وہ تین یا چار آدمی تھے۔ میں عثمان کو اتنا زیادہ بھڑکاؤں گی کہ وہ اپنی بیوی کے بھائیوں کو گولی مارنے پر تیار ہو جائے گا۔ اگر اس نے اپنی بیوی کو گولی نہ ماری تو اسے طلاق تو ضرور دے دے گا"۔

"ہاں" ___ مہندر نے کہا ___ "یہ کام تو کرنا ہی کرنا ہے۔ ہمارا وہ کیا لگتا ہے یا

ہمارے وہ کیا لگتے ہیں۔ انہیں آپس میں ٹکرا دینا ہر لحاظ سے بہتر رہے گا۔ اگر ہم نے انہیں اس طرح ماؤف نہ کیا تو وہ اس کوٹھی کے چکر لگانے شروع کر دیں گے کہ یہاں ہوتا کیا ہے اور یہ کون لوگ ہیں۔ تم کہتی ہو کہ تم سے یہ لوگ تمہاری اصلیت معلوم کرنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن یہ سن لو لُوسی! تم اب عثمان سے نہیں ملو گی۔ اب اس پر بھی اعتبار نہ کرنا۔ ان مسلمانوں کا کوئی بھروسہ نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ یہ سب ہمارے خلاف ایک ہی محاذ بنا لیں۔ تم عثمان کو اس کے آفس فون کرو اور ساتھ یہ کہو کہ میں کراچی جا رہی ہوں اور تمہیں مل نہیں سکوں گی"۔

لُوسی نے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کا نمبر ملایا اور آپریٹر سے کہا کہ میجر عثمان صاحب سے بات کراؤ۔

"ہیلو.... میجر عثمان بول رہا ہوں"۔

"ہیلو عثمان!" ___ لُوسی نے کہا۔

"کیا اُس حرام زادے فرینڈ سے فرصت مل گئی ہے؟" ___ عثمان نے طنزیہ اور غصیلے لہجے میں کہا ___ "اب مجھے فون کرنے کی کیا ضرورت آ پڑی ہے؟"

"او! ڈیئر" ___ لُوسی نے کہا ___ "بات تو سنو۔ کون سے فرینڈ کی بات کر رہے ہو۔ میں نے تمہیں جو فون کیا تھا وہ ایک قیدی کی حیثیت سے کیا تھا۔ میری آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور ایک ریوالور کی نالی میری کنپٹی کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ مجھے پہلے بتا دیا گیا تھا کہ عثمان کو تم نے یہ الفاظ کہنے ہیں اگر ایک بھی لفظ اِدھر اُدھر ہُوا تو گولی مار دیں گے۔ میں نے اپنی جان کا خطرہ دیکھ کر تمہیں وہی کہا جو انہوں نے بتایا تھا"۔

"کون تھے وہ لوگ؟"

"تم خود سمجھ جاؤ گے" ___ لوسی نے کہا ___ "وہ وقت بھی یاد کرو جب تمہارے دو دوست تمہیں گاڑی سے دور لے گئے تھے۔ میرا خیال ہے وہ تمہیں دانستہ دور لے گئے تھے۔ وہ تو ذرا پرے ہٹ کر بات کر سکتے تھے اور پھر ایسی بھی کون سی راز کی بات تھی کہ تمہیں اتنی دور لے گئے اور ایک گاڑی میرے پاس آ کر رکی۔ اس میں سے ایک آدمی نے نکل کر اور میرے پاس آ کر کہا کہ میری گاڑی میں یہ صاحب بیٹھے ہوئے ایک کلینک کا اتا پتہ معلوم کرنا چاہتے ہیں اور تم انہیں آ کر راستہ سمجھاؤ۔ مجھ سے یہ غلطی ہوئی کہ میں اس کی بات میں آ گئی اور گاڑی سے نکل کر اس کی گاڑی کے قریب چلی گئی۔ جو آدمی

مجھے اپنی گاڑی تک لے گیا تھا اس نے پیچھے سے میری گردن پر ہاتھ رکھ کر مجھے آگے کو جھکا دیا اور دوسرا آدمی جو پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا مجھے بازوؤں سے پکڑ کر اندر کو گھسیٹنے لگا۔ پیچھے سے ایک آدمی دھکیل رہا تھا اور آگے سے دوسرا آدمی کھینچ رہا تھا۔ میں سیٹ پر جا پڑی۔ اس کے ساتھ ہی میرے منہ اور آنکھوں پر کپڑا بندھ گیا....

"وہ شاید کسی کوٹھی کا کمرہ تھا جس میں مجھے لے گئے۔ پھر ایک گاڑی کا ہارن بجا۔ کمرے سے ایک آدمی باہر گیا اور میرا اندازہ یہ ہے کہ دو اور آدمی اندر آئے۔ مجھے ایک خطرہ تو یہ تھا کہ یہ مجھے ایک خوبصورت اور جوان لڑکی کی حیثیت سے یہاں لائے ہیں اور مجھے پریشان کریں گے۔ دوسرا خطرہ یہ تھا کہ یہ میرے گھر کا فون نمبر اور ایڈریس لیں گے اور میرے ڈیڈی کو فون کریں گے کہ اتنے لاکھ روپیہ دو اور اپنی بیٹی کو چھڑوا لو لیکن انہوں نے پہلے ہی کہہ دیا کہ ہمیں تمہاری خوبصورتی اور تمہارے جسم کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں۔ صرف یہ کام کرو کہ عثمان کو یہ فون کرو اور وعدہ کرو کہ آئندہ تم عثمان سے نہیں ملو گی"۔

"اوں!" —— عثمان نے کہا —— "ہاں! میں سمجھ گیا۔ یہ میری بیوی کے بھائی تھے اور کون ہو سکتا ہے۔ تمہارا شک ٹھیک ہے کہ وہ دو آدمی جو مجھے گاڑی سے دور لے گئے تھے وہ میرے دوست ہیں اور دونوں آرمی آفیسر ہیں۔ وہ بھی میرے پیچھے پڑے رہتے تھے کہ میں تمہارے ساتھ تعلق توڑ لوں.... دیکھو' کیسے دھوکہ باز نکلے.... ہاں.... پھر کیا ہوا؟"

پھر یہ ہوا!" —— لوسی نے کہا —— "میں نے تمہیں فون کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ تم میری آواز سے شک میں پڑ جاؤ گے کہ میں گھبرائی ہوئی سی ہوں لیکن تم میرے فون کو صحیح سمجھ بیٹھے۔ فون تو ہو گیا اب مجھ سے پوچھنے لگے کہ اپنی اصلیت بتاؤ۔ وہ مجھ پر شک کر رہے تھے کہ میں جاسوسوں کے کسی گروہ سے تعلق رکھتی ہوں اور میری کوٹھی جاسوسوں کا اڈہ ہے.... دیکھو عثمان! اس سے زیادہ ذلیل الزام اور کیا ہو سکتا ہے۔ میں نے رونا شروع کر دیا لیکن وہ تو بڑے ہی بے رحم ثابت ہوئے۔ میرا خیال ہے یہ باتیں پوچھنے والے تمہارے فوجی دوست تھے....

"میں جاسوس یا کچھ اور ہوتی تو انہیں بتاتی لیکن وہ مانتے ہی نہیں تھے۔ انہوں نے مجھے اس کمرے سے نکالا' باہر لے جا کر گاڑی میں بٹھایا اور گاڑی چل پڑی۔ یہ کمرہ شہر

سے ذرا باہر ہے۔ وہاں انہوں نے مجھے فرش پر بٹھایا۔ اب میرے ہاتھ اور پاؤں رسیوں سے بندھے ہوئے تھے اور آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ مجھے یہ کہہ کر سب چلے گئے کہ اپنی اصلیت بتاؤ گی تو تمہیں چھوڑ دیں گے۔ کمرے میں ایک پہریدار چھوڑ گئے۔ فرش پر ایک کمبل بچھا ہوا تھا۔ میں اس کمبل پر سوئی۔ صرف فرش پر سونا تو میرے لئے ناقابل برداشت تھا لیکن میرے ساتھ جو سلوک ہوا اسے تم بھی برداشت نہیں کر سکو گے" —— لوسی نے عثمان کو بھڑکانے کے لئے جھوٹ بولا —— "میرے ہاتھ اور پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ اس آدمی نے جسے پہرے پر چھوڑ گئے تھے میری آبروریزی شروع کر دی اور اس نے یہ حرکت رات دو دفعہ کی۔ میں رسیوں میں جکڑی ہوئی مزاحمت بھی نہیں کر سکتی تھی"۔

"اوہ!.... ڈیلش اٹ" —— عثمان کے منہ سے سخت غصیلی آواز نکلی —— "آئی ول شوٹ دیم.... یو باسٹرڈز!.... ہاں پھر کیا ہوا؟"

پھر کیا بتاؤں عثمان!" —— لوسی نے اپنی آواز میں رونے کی کیفیت پیدا کر لی اور سسکنے لگی —— "یہی تو میری دولت تھی جو لٹ گئی۔ صبح میرے ہاتھ پاؤں اور آنکھیں کھولی گئیں اور اس پہریدار نے مجھے ناشتہ کروایا۔ مجھے معلوم نہیں کہ یہ ناشتہ کہاں سے آیا تھا۔ اس کے بعد پھر میرے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے گئے اور اس پہریدار نے دن کے وقت پھر رات والی حرکت کی۔ رات آئی تو ایک کی بجائے چار آدمی آ گئے۔ وہ پھر مجھ سے کہنے لگے کہ میں کون ہوں۔ میں بہت روئی۔ ان چاروں نے میری آبروریزی کی۔ ان میں تمہارے سالے صاحبان بھی شامل تھے"۔

لوسی نے عثمان کو بتایا کہ وہ کس طرح وہاں سے فرار ہوئی ہے۔ اس نے وہ چکمہ تفصیل سے سنایا جو اس نے اکبر کو دیا تھا۔

"میں اکبر کو جانتا ہوں" —— عثمان نے کہا —— "وہ ان کا نوکر ہے۔ اسے تو میں جان سے مار ڈالوں گا"۔

"نہیں عثمان!" —— لوسی نے کہا —— "اپنے آپ کو قابو میں رکھو۔ کسی کو قتل کر کے پھانسی چڑھ جاؤ گے پھر میرا کیا بنے گا"۔

"میں آفس سے فارغ ہو کر سیدھا تمہارے پاس آؤں گا" —— عثمان نے کہا۔

"نہیں عثمان!" —— لوسی نے کہا —— "میں کراچی جا رہی ہوں"۔

"کون سی فلائٹ سے؟"

"ابھی تو ہم لوگ اسلام آباد جارہے ہیں" ــــ لُوسی نے جھوٹ بولا ــــ "اپنی گاڑی پر جائیں گے، کل پہلی فلائٹ سے وہاں سے میں سیدھی کراچی چلی جاؤں گی۔ ہفتہ دس دن تک واپس آجاؤں گی۔ آتے ہی تمہیں اطلاع دوں گی لیکن میرے ساتھ جو سلوک ہُوا ہے اس نے میرا ذہن ماؤف کر دیا ہے۔ اب خدا ہی ہے جو مجھے نارمل حالت میں لے آئے۔ میں تو ایسا محسوس کرنے لگی ہوں جیسے میں تمہارے قابل رہی نہیں"۔

"اوہ.... شٹ اپ!" ــــ عثمان نے بڑے پیارے غصے سے کہا ــــ "میں نے تمہارے جسم کے ساتھ محبت نہیں کی۔ ہماری محبت روحانی ہے۔ تم ذرا جلدی آنے کی کوشش کرنا"۔

"میں تمہیں کراچی سے فون کروں گی" ــــ لوسی نے کہا ــــ "اور میں جلدی آنے کی کوشش کروں گی لیکن تم یہ معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ مجھے کس نے اغوا کیا تھا"۔

○

عثمان کے ہاتھ ہی نہیں اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ غصہ اتنا زیادہ کہ اس کا دماغی توازن بھی بگڑا جارہا تھا۔ دفتر کے اردلی نے آکر اسے سیلوٹ کیا۔

"کیا ہے!" ــــ عثمان بم کی طرح پھٹا ــــ "جلدی بولو"۔

اردلی جس کام کے لئے آیا تھا، اس نے بڑی جلدی جلدی بتایا اور اسی تیزی سے عثمان نے اسے چلتا کیا۔ وہ تو اردلی تھا اس لئے خاموشی سے چلا گیا۔ اگر کوئی افسر ہوتا تو عثمان سے ضرور پوچھتا کہ اسے کیا ہو گیا ہے۔ عثمان بھول چکا تھا کہ وہ فوجی افسر ہے اور اس وقت بریگیڈ ہیڈ کوارٹر میں بیٹھا بڑا اہم کام کر رہا ہے لیکن اس کے ذہن میں اہمیت اور اولیت کا معاملہ اُلٹ ہو گیا تھا۔ وہ جسے میدانِ جنگ میں مرنے اور مارنے کی ٹریننگ دی گئی تھی وہ مرنے اور مارنے کے لئے تیار ہو گیا تھا لیکن میدانِ جنگ میں نہیں بلکہ شہر کی سڑکوں پر اور کوٹھیوں میں۔ ایک مشکوک لڑکی نے اس کے جذبات کے بارود میں چنگاری رکھ دی تھی۔ وہ بھول گیا تھا کہ وینا اس کی بیوی اور اس کے بچوں کی ماں ہے، میجر سمیع اور کیپٹن آصف اس کے دوست ہیں۔ ان سب کو اب اس نے دشمن سمجھ لیا تھا۔

اسے یہ سوال پریشان کرنے لگا ــــ "کیا میجر سمیع اور کیپٹن آصف لُوسی کے اغوا میں شامل تھے؟" ــــ وہ تصوّر میں اس منظر کو لایا جب وہ سمیع اور آصف کے ساتھ اپنی گاڑی سے کچھ دور چلا گیا تھا اور اس نے وہاں سے لوسی کو گاڑی سے نکلتا اور دوسری گاڑی تک جاتے دیکھا تھا۔ اُس وقت میجر سمیع اسے اپنی ایک پرابلم بتا رہا تھا۔ عثمان نے اس گاڑی کو جاتے دیکھا تھا جس میں لوسی بیٹھ گئی تھی۔ عثمان سمیع کی پوری بات سنے بغیر اپنی گاڑی کی طرف چل پڑا تھا۔ اس کے ذہن سے نکل ہی گیا تھا کہ سمیع اسے کیا کہہ رہا تھا۔ سمیع اور آصف اس کے پیچھے پیچھے اُس تک پہنچے تھے۔

"وہ تو چلی گئی ہے یار!" ــــ عثمان نے کھسیانا سا ہو کر کہا تھا۔

"بڑی گھٹیا لڑکی ثابت ہوئی" ــــ سمیع نے کہا تھا ــــ "اس نے تمہیں یہ بتانے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کہ وہ کسی اور کے ساتھ جارہی ہے"۔

"میرا خیال ہے یہ اس کا کوئی بھائی وغیرہ ہو گا" ــــ عثمان نے کہا تھا ــــ "اسے وہ یہ تو نہیں کہہ سکتی تھی کہ میں اپنے فرینڈ کے ساتھ کہیں جارہی ہوں۔ یہی وجہ ہو سکتی ہے ورنہ بڑی سولائزڈ لڑکی ہے"۔

"چلو جانے دو" ــــ کیپٹن آصف نے کہا ــــ "وہ تمہاری فرینڈ ہے۔ کل مل جائے گی۔ تم سمیع کی بات سن لو اور کچھ کرو۔ یہ بہت پریشان ہے"۔

عثمان ظاہر تو یہ کر رہا تھا کہ اس نے لُوسی کے اس طرح چلے جانے کو محسوس نہیں کیا لیکن وہ غصے کو دبانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس لڑکی کو وہ اپنی ملکیت سمجھتا تھا اور اس پر اس طرح حکم چلاتا تھا جیسے وہ اس کی زرخرید لونڈی ہو۔ وہ سمجھتا تھا کہ لڑکی اسے دل و جان سے چاہتی ہے۔ اس کی وہ روپے پیسے، تحفوں اور ہوٹلوں میں لنچ اور ڈنر کی صورت میں قیمت ادا کر رہا تھا۔ وہ اس حقیقت کو قبول کرنے کے لئے تیار ہی نہیں تھا کہ اس لڑکی کو انہی عیاشیوں کے ساتھ دلچسپی ہے اور پھر ایک دلچسپی یہ بھی ہے کہ وہ فوجی افسر ہے، بریگیڈ ہیڈ کوارٹر میں ذمہ دار پوسٹ پر لگا ہُوا ہے اس لئے قیمتی راز دے سکتا ہے۔ لڑکی نے ایکٹنگ میں اس پر طلسم طاری کر رکھا تھا۔

دفتر میں بیٹھے بیٹھے وہ لُوسی کے اغوا کے وقت کو یاد کر رہا تھا۔ میجر سمیع اور کیپٹن آصف نے ایسی کوئی بات نہیں کہی تھی کہ تم نے کسی بدتمیز لڑکی کے ساتھ یارانہ لگا رکھا ہے جو تمہیں بتائے بغیر کسی اور کے ساتھ چلی گئی ہے۔ کیپٹن آصف نے بھی کچھ نہیں

کہا تھا۔ آصف نے اتنا ہی کہا تھا کہ سمیع کی پرابلم سنو اور اس کا کچھ کرو۔

عثمان کو خیال آیا کہ یہ دونوں اغوا میں شامل ہوتے تو کچھ اور طرح کی باتیں کرتے۔ ویسے بھی وہ ایسے بُرے کریکٹر کے آدمی نہیں تھے لیکن جب عثمان کو اختر اور امجد کا خیال آیا تو اس کے اندر سے غصہ شعلے کی طرح اٹھا اور جس تحمل سے اس نے سوچنا شروع کیا تھا وہ تحمل جل جل کر راکھ ہو گیا اور اس کا وجود ایک بار پھر کانپنے لگا۔ اس نے اسی غصے میں آپریٹر سے میجر سمیع کا نمبر ملانے کو کہا۔

میجر سمیع فون پر مل گیا۔ عثمان نے اسے اتنا ہی کہا کہ آج تین بجے میں تمہارے پاس آرہا ہوں۔ کیپٹن آصف کو بھی بلا لینا۔

○

تین بجے عثمان میجر سمیع کی یونٹ کے آفس میں پہنچ گیا۔ سمیع اور آصف اس کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ انہوں نے اُسی بے تکلفی اور خوشگوار مُوڈ میں عثمان کا استقبال کیا جس طرح وہ کیا کرتے تھے۔ عثمان نے جواب میں رسمی طور پر بھی ایسی مزاجی خوشگواری کا اظہار نہ کیا۔ اگر سمیع اور آصف اپنے ہاتھ آگے نہ کرتے تو عثمان ان سے ہاتھ بھی نہ ملاتا۔ وہ اس طرح کرسی پر بیٹھ گیا جیسے بڑی لمبی مسافت پیدل طے کر کے آیا ہو۔

"خیریت؟" —— میجر سمیع نے پوچھا —— "کیا بات ہے.... معلوم ہوتا ہے...."

"میرا خیال ہے تمہیں معلوم ہے" —— میجر عثمان نے دبی سی آواز میں کہا —— "مجھ سے کیا پوچھتے ہو!"

"کم آن' سپیک اپ عثمان!" —— میجر سمیع نے چونک کر کہا اور اٹھ کر عثمان کے قریب چلا گیا۔ اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر بولا —— "تم نے یہ عورتوں والا انداز کب سے اختیار کیا ہے! فوراً اس بات پر آجاؤ جس نے تمہیں اتنا زیادہ اپ سیٹ کر رکھا ہے"۔

"میری فرینڈ اغوا ہو گئی تھی" —— عثمان نے کہا —— "اور وہ فرار ہو گئی ہے۔ اس نے مجھے فون پر اپنے اغوا کی روداد تفصیل سے سنائی ہے۔ اُس نے کچھ ایسی باتیں بتائی ہیں جو ماننے کو جی نہیں چاہتا"۔

"وہ باتیں ہمیں بتاؤ" —— کیپٹن آصف نے کہا۔

"اگر ہمارے خلاف کوئی بات ہے تو وہ بھی بتاؤ" —— میجر سمیع نے کہا —— "ہمیں

اپنا نہیں تمہارا غم ہے' میں تو تمہاری صورت دیکھ کر پریشان ہو گیا ہوں"۔

"وہ کہتی ہے کہ اس کے اغوا میں تم دونوں بھی شامل تھے" —— عثمان نے ذرا جھجکتے ہوئے کہا —— "وہ کہتی ہے کہ تم مجھے اُس رات صرف اس لئے میری گاڑی سے دُور لے گئے تھے کہ لُوسی کو اغوا کیا جا سکے۔ پھر اس نے تم دونوں پر یہ الزام لگایا ہے کہ تم نے اور ان دو آدمیوں نے جو اسے گاڑی میں بٹھا کر لے گئے تھے' اس کی آبروریزی کی ہے"۔

"اور تم مان گئے" —— سمیع نے کہا۔

"وہ جھوٹ نہیں بولا کرتی" —— عثمان نے کہا۔

"یہ تم کہتے ہو" —— سمیع نے کہا —— "لیکن میں اپنے اور آصف کے ڈیفنس میں کچھ بھی نہیں کہوں گا۔ صرف یہ کہوں گا کہ اس لڑکی سے ہمیں ملواؤ.... دیکھو عثمان! تمہاری بدنصیبی یہ ہے کہ تم ایک مشکوک کریکٹر کی لڑکی کی باتوں کو سچ مان رہے ہو اور ہم جیسے دوستوں پر شک کر رہے ہو۔ یہ ایک ٹریجڈی ہے جس کا اثر صرف تم پر نہیں بلکہ تمہاری بیوی اور تمہارے بچوں پر بھی ہے' تمہاری ازدواجی زندگی تباہ ہو چکی ہے اور جہاں سے تمہیں روحانی مسرتیں مل سکتی ہیں وہاں کے دروازے تم نے اپنے ہاتھوں بند کر دیئے ہیں"۔

"تم ایک تصوراتی جنت میں چلے گئے ہو" —— کیپٹن آصف نے کہا —— "یہ حسن بن صباح والی جنت ہے۔ تم نے اس جنت کے قصے پڑھے ہیں۔ حسن بن صباح نے ایک بڑے وسیع غار میں یا ایسی ہی کسی بند جگہ پر یہ جنت بنائی تھی جس میں سوائے پتھروں اور غلاظت کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کے اندر اس نے ایسی جڑی بوٹیاں رکھ دی تھیں جن کی بُو اس بند جگہ پر پھیل گئی تھی۔ وہ لوگوں کو اس جگہ میں بند کر دیتا تھا۔ اس بُو کا اثر یہ تھا کہ اس آدمی کے تصوّرات بڑے ہی حسین ہو جاتے تھے۔ ہر آدمی اپنے آپ کو شہزادہ سمجھ لیتا تھا۔ یہاں تک کہ اسے یہ دھوکہ ہوتا تھا کہ اس نے شاہانہ لباس پہن رکھا ہے۔ یہ بدقسمت لوگ کنکریاں اور غلاظت کھاتے تھے لیکن تصوّروں میں انہیں یہ مرغن غذائیں لگتی تھیں۔ انہیں بڑی ہی حسین دلکش اور جوان لڑکیاں ملتی تھیں جن کا حقیقت میں کوئی وجود نہیں ہوتا تھا۔ یہ لوگ اندر ہی مرجاتے اور ان کی لاشیں گھسیٹ کر باہر پھینک دی جاتی تھیں"۔

"تم مجھے یہ قصے کیوں سنا رہے ہو؟" ——— عثمان نے اکتاہٹ کے لہجے میں پوچھا۔

"اس لئے کہ یہ لڑکی تمہیں ایسی ہی ایک جنت میں لے گئی ہے" ——— کیپٹن آصف نے کہا ——— "اس نے تمہیں اس دنیا کا حسین ترین آدمی ثابت کر دیا ہے اور یہ کہ تمہارے بغیر وہ زندہ ہی نہیں رہ سکتی اور سکندرِ اعظم کے بعد تم ہو جو ساری دنیا کو فتح کر سکتے ہو..... ہوش میں آؤ عثمان!"

"یہ باتیں بعد میں ہوں گی آصف!" ——— میجر سمیع نے بڑی سنجیدگی سے کہا ——— "ابھی میں یہی کہوں گا کہ اس لڑکی سے ہماری ملاقات کراؤ"۔

"وہ کہتی ہے کہ وہ فرار ہو کر آئی ہے" ——— کیپٹن آصف نے کہا ——— "میں اسے اغوا کرتا ہوں اور اسے عام سے مکان میں رکھوں گا جس کی کوئی سیکیورٹی نہیں ہو گی۔ وہاں کسی آدمی کا پہرا بھی نہیں ہو گا۔ لڑکی سے کہوں گا کہ فرار ہو جاؤ۔ میں دیکھوں گا وہ کس طرح فرار ہوتی ہے"۔

"نہیں آصف!" ——— میجر سمیع نے کہا ——— "یہ فضول باتیں ہیں۔ میں لڑکی سے ملنا چاہتا ہوں۔ اس نے ہمارے اتنے عزیز دوست کے دل میں ہمارے خلاف ایک غلیظ شبہ ہی نہیں ڈالا بلکہ تاثر ڈال دیا ہے کہ ہم اس کے دشمن ہیں"۔

"وہ کراچی چلی گئی ہے" ——— عثمان نے کہا ——— "اسے آنے دو..... لیکن یہ تو مجھے یقین ہے کہ اس اغوا میں میرے دونوں سالے 'اختر اور امجد' شامل تھے"۔

"وہ اغوا ہوئی ہی نہیں" ——— میجر سمیع نے کہا ——— "وہ تمہارے دل میں تمہاری بیوی اور اپنی بیوی کے بھائیوں کی نفرت اور دشمنی پیدا کر رہی ہے اور تم اپنی بیوی اور سالوں سے انتقام لینے کے موڈ میں آ گئے ہو۔ سیدھی بات ہے میرے بھائی! تم بہت بڑے دھوکے میں آ گئے ہو۔ فوری طور پر تم یہ کرو کہ ٹھنڈے ہو جاؤ اور ٹھنڈے دل سے غور کرو۔ ایسا نہ کر بیٹھنا کہ گھر جا کر بیوی اور پھر اس کے بھائیوں کے گلے پڑ جاؤ۔ کوئی پرابلم ہو تو ہمیں بتاؤ"۔

عثمان کے ان دونوں دوستوں نے ایسی ہی کچھ اور باتیں کر کے عثمان کو ٹھنڈا تو کر لیا لیکن وہ ٹھنڈا ہوتا نظر نہیں آتا تھا۔ وہ اٹھا اور آہستہ آہستہ چلتا باہر نکل گیا۔

○

میجر سمیع اور کیپٹن آصف کو معلوم ہو چکا تھا کہ لڑکی فرار ہو گئی ہے۔ انہیں اختر نے

فون پر بتا دیا تھا اور یہ بھی بتایا تھا کہ اکبر کے گاؤں جا کر بھی دیکھا گیا ہے۔ اکبر گاؤں نہیں گیا۔ میجر سمیع اور کیپٹن آصف اس فرار پر حیران نہ ہوئے۔ انہیں پہلے ہی شک تھا کہ یہ لڑکی کوئی معمولی لڑکی نہیں۔ اب انہوں نے عثمان کا ردِ عمل دیکھا اور یہ سنا کہ لڑکی ان پر آبروریزی کا الزام لگا رہی ہے تو ان کی اس رائے کی بھی تصدیق ہو گئی کہ یہ لڑکی کس قدر خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔

"آصف یار!" ——— میجر سمیع نے کہا ——— "اس لڑکی اور اس کے رنگ کو تو شاید ہم پکڑوا ہی دیں گے لیکن عثمان کی ذہنی حالت دیکھ کر مجھے اس کا غم لگ گیا ہے۔ یہ تو خطرناک حد تک انتقامی کارروائی کر گزرے گا۔ اسے کس طرح اپنے کنٹرول میں لیا جائے!"

"یہ کہتا ہے لڑکی کراچی چلی گئی ہے" ——— آصف نے کہا۔

"یہ تو اچھا ہوا ہے" ——— سمیع نے کہا ——— "اسے جانا ہی تھا' ہم جو اسے کہتے رہے ہیں کہ اپنی اصلیت بتاؤ اس سے وہ انڈر گراؤنڈ ہو گئی ہے۔ میرا خیال ہے اب وہ عثمان سے کبھی نہیں ملے گی"۔

"ان کا نوکر بڑا ہی کچا نکلا" ——— کیپٹن آصف نے کہا ——— "وہ بھی لاپتہ ہو گیا ہے"۔

"نوکر کو تو اچھی خاصی رقم مل گئی ہو گی" ——— میجر سمیع نے کہا ——— "وہ اب واپس نہیں آئے گا"۔

سمیع اور آصف دفتر سے نکلے اور ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے۔

"عثمان ان دوستوں سے رخصت ہو کر اپنے گھر چلا گیا تھا۔ اس پر خاموشی طاری تھی۔ وینا نے دو تین بار پوچھا بھی کہ خیریت تو ہے۔ عثمان نے ہر بار پھیکی سی مسکراہٹ سے ٹال دیا۔ وینا کو معلوم نہ تھا کہ اس خاموشی میں کتنا بڑا طوفان اٹھ رہا ہے۔

رات خیریت سے اور خاموشی سے گزر گئی۔ صبح عثمان وردی پہن کر جانے لگا تو اخبار آ گیا۔ عثمان نے کھڑے کھڑے اخبار کی سرخیاں دیکھیں پھر اندرونی صفحے الٹے اور ایک خبر پر اس کی نظریں ٹھہر گئیں۔

"وینا!" ——— عثمان نے اپنی بیوی کو بلایا ——— "یہ فوٹو پہچانو"۔

وینا اخبار میں ایک خبر کے ساتھ چھپی ہوئی فوٹو کو دیکھنے لگی۔ خبر یہ تھی کہ ایک لاش نہر میں بہتی ہوئی نکالی گئی ہے۔ خبر میں عوام سے کہا گیا تھا کہ اس لاش کو پہچانیں اور یہ

جس کسی کا بھی آدمی ہو وہ فلاں ہسپتال کے مُردہ خانے میں آ کر لاش شناخت کرے اور لے جائے۔ خبر کے ساتھ مرنے والے کے چہرے کی بڑی صاف فوٹو تھی۔

"یہ تو ہمارا نوکر اکبر لگتا ہے" ـــ وینا نے کہا۔

"وہی ہے" ـــ عثمان نے کہا اور اخبار وینا کے ہاتھ میں چھوڑ کر اپنے دفتر کو روانہ ہو گیا۔

"اس کے جانے کے بعد وینا نے اپنے گھر فون کیا اور اختر کے ساتھ بات کی۔

"میں دیکھ چکا ہوں" ـــ اختر نے کہا ـــ "یہ اکبر کی ہی لاش ہے۔ میں ہسپتال جا رہا ہوں لیکن میں یہ نہیں بتاؤں گا کہ یہ ہمارا نوکر تھا۔ اس نے ہمیں دھوکہ دیا ہے۔ ہو سکتا ہے دھوکہ نہ ہی دیا ہو۔ اس لڑکی کے ساتھیوں نے اسے قتل کر دیا ہو لیکن میں اس لاش کو تسلیم نہیں کروں گا.... فون پر کوئی اور بات نہ کرنا"۔

اختر اور امجد ہسپتال چلے گئے اور متعلقہ اہلکاروں کی رہنمائی میں مُردہ خانے میں گئے اور لاش دیکھی۔ وہ ان کے نوکر اکبر کی ہی لاش تھی۔ ان دونوں بھائیوں کو بتانے والا کوئی نہ تھا کہ یہ بد قسمت انسان اپنی بہنوں کی شادی کرنے کے لئے بیس ہزار کے لالچ میں اس لڑکی کے چکمے میں آ گیا تھا۔

بیس ہزار کے لالچ میں مارے جانے والے اکبر کی لاش لاوارث قرار دے دی گئی۔ اس کے نصیب میں کفن نہیں تھا' جنازہ بھی نہیں۔ بیس ہزار کے تصور نے اسے کیا کیا خواب دکھائے ہوں گے۔ تصوروں میں اس نے بہنوں کی ڈولیاں اٹھتی دیکھی ہوں گی مگر بہنیں اس کے انتظار میں دروازے پر کھڑی اس کی راہ دیکھ رہی ہوں گی۔ ان غریب لوگوں نے کہاں اخبار دیکھنا تھا کہ انہیں پتہ چلتا کہ بہنوں کی ڈولیاں اٹھوانے والے کا اپنا جنازہ اُٹھ رہا ہے۔ نہ انہوں نے اخبار دیکھا نہ انہیں کسی نے بتایا کہ ان کے بھائی کی لاش ہسپتال کے مُردہ خانے میں پڑی ہے۔

دو تین دنوں بعد ایک میڈیکل کالج سے ہسپتال والوں کو ڈیمانڈ ملی کہ کالج میں ایک دو لاشوں کی ضرورت ہے۔ میڈیکل سٹوڈنٹس کے لئے کالجوں میں لاشیں رکھی جاتی ہیں اور سٹوڈنٹ ان لاشوں کو چیرتے پھاڑتے ہیں۔

".... اور یہ دیکھو" ـــ ایک میڈیکل کالج کا پروفیسر اکبر کی لاش کا سینہ چیر کر اور دل باہر نکال کر کلاس کو دکھاتے ہوئے کہہ رہا تھا ـــ "یہ ہے دل۔ میں اس دل کی ڈائی

سیکشن کر کے تمہیں اس کے مختلف حصے اور اس کی کارکردگی سمجھاؤں گا"۔

"سر!" ـــ ایک امیر زادے اور نالائق سٹوڈنٹ نے از راہِ مذاق پوچھا ـــ "پہلے ہمیں دل کا وہ خانہ دکھائیں جس میں خواہشات ہوتی ہیں اور پھر ہمیں وہ خانہ دکھائیں جس میں محبت ہوتی ہے"۔

کلاس نے قہقہہ لگایا۔ پروفیسر کے چہرے پر غصے کے آثار نمودار ہوئے۔ اس نے غصیلی نگاہوں سے اُس لڑکے کی طرف دیکھ جس نے یہ سوال پوچھا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ یہ لڑکا کون ہے اور کس کا بیٹا ہے تو اس کے چہرے سے غصے کے تاثرات صاف ہو گئے۔ اُسے خیال آ گیا کہ یہ لڑکا اس خاندان سے تعلق رکھتا ہے جس نے وزیر پیدا کئے ہیں اور سیاسی لیڈری ان کا آبائی پیشہ ہے۔

"دل گوشت کا ایک ٹکڑا ہوتا ہے" ـــ پروفیسر نے کھسیانا سا ہو کر کہا ـــ "اس میں کوئی خواہش نہیں ہوتی۔ خواہشات' محبت اور نفرت ذہن میں ہوتی ہیں اور ذہن دل کی طرح گوشت کا لوتھڑا نہیں ہوتا"۔

امیروں کے گھروں میں نوکری چاکری کرنے والے غریب آدمی کی چیری پھاڑی ہوئی لاش ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرنے والے امیر زادوں کے لئے مذاق کا ذریعہ بنی رہی۔ ایک لڑکے نے اس کا دل اپنے ہاتھ میں لے کر دیکھا اور اپنے سامنے ٹیبل کی دوسری طرف کھڑے لڑکے کی طرف پھینکا۔ اس لڑکے نے ایک اور لڑکے کی طرف پھینکا۔ وہ لڑکا دل ایک اور لڑکے کی طرف اچھالنے لگا تھا کہ پروفیسر نے اس کے ہاتھ سے دل چھین لیا اور لیکچر شروع کر دیا۔

کچھ دنوں تک اکبر کی لاش مختلف کلاسوں کے لڑکوں اور لڑکیوں کے ہاتھوں چیری پھاڑی جاتی رہی اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر غائب ہو گئی۔ اسے لوُسی کے پہرے پر بٹھانے والے اس سے لاتعلق ہو چکے تھے۔ اگر کسی کو اس کا غم تھا تو وہ اس کے ماں باپ اور اس کی بہنیں تھیں اور بہنیں اپنی تمام تر امیدیں اس بھائی سے لگائے ہوئے تھیں کہ وہ انہیں عزت سے گھر سے رخصت کرے گا۔ انہیں بتانے والا کوئی نہ تھا کہ وہ تو خود ہی اس دنیا سے رخصت ہو گیا ہے۔

○

صغیر کو ایک خفیہ کمرے میں ایذا رسانی کے عمل میں ڈالا گیا تھا۔ اُس نے قوتِ

برداشت کا ایسا معجزاتی مظاہرہ کیا تھا کہ اسے اذیتیں دینے والے بھی حیران تھے۔ لُوی کا ہوائی جہاز جب کراچی ایئرپورٹ پر اُترا تھا تو اس وقت صغیر اس خفیہ کمرے میں بے ہوش پڑا تھا۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ وہ ہوش میں آگیا۔ سب سے پہلے اس کے منہ سے جو الفاظ نکلے وہ یہ تھے کہ اللہ میرے ساتھ ہے' اللہ ہی میری مدد کرے گا.....''

چار منٹ بعد ایک آدمی کمرے میں داخل ہُوا۔

''میرے جسم کے ٹکڑے کردو' کافرو!'' — صغیر نے کربناک سی آواز مین کہا۔ ''میں تمہارے راستے پر نہیں چلوں گا''۔

''اٹھو یار!'' — اُس آدمی نے دوستانہ لہجے میں کہا — ''ہوں تو میں بھی ہندو ہی لیکن میرے ہاتھوں تمہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی''۔

اس آدمی کو صغیر پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ اس آدمی نے صاف الفاظ میں صغیر کو بتا دیا کہ وہ ہندو ہے۔

''مجھے آج پتہ چلا ہے کہ انہوں نے تمہیں یہاں رکھا ہُوا ہے'' — ہندو نے کہا — ''مجھے ان لوگوں پر بہت غصہ آیا۔ صاف بات ہے میرے دوست! تم نے ہمارے لئے جو کام کئے ہیں وہ ہمارا اور کوئی ایجنٹ نہیں کرسکا۔ اس لائن کا جتنا تجربہ مجھے ہے' اتنا ان لوگوں کو نہیں جو تمہارا یہ حال کر رہے ہیں۔ ہم دیکھ لیتے ہیں کہ جو آدمی ایک بار انکار کردے وہ دوبارہ ہاتھ نہیں آتا۔ اگر ہاتھ آبھی جائے تو خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ میں یہاں ہوتا تو تمہارے ساتھ ایک معاہدہ کر کے تمہیں عزت سے رخصت کر دیتا۔ یہ بیوقوف لوگ ہیں''۔

اس ہندو نے دروازے میں جاکر کسی کو آواز دی اور کہا کہ ایک گلاس گرم دودھ اور کچھ کھانے کے لئے فوراً'' لاؤ۔ اس نے صغیر کو سہارا دے کر اٹھایا اور کرسی پر بٹھا دیا۔ پھر اس نے کمرے میں رکھی ہوئی ایک تپائی صغیر کے آگے رکھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے دودھ' فرائی انڈے اور ٹوسٹ وغیرہ پہلے ہی تیار رکھے ہوئے تھے۔ یہ سب چیزیں صغیر کے آگے رکھ دی گئیں۔

''لو میرے بھائی!'' — ہندو نے صغیر سے کہا — ''یہ لو ناشتہ کرلو۔ اب تمہیں کوئی نہیں کہے گا کہ ہمارے ساتھ رہو۔ میں تمہارے ساتھ ایک دو باتیں کروں گا پھر تم چلے جانا''۔

صغیر بھوک محسوس کر رہا تھا۔ اس نے بڑی تیزی سے انڈے اور ٹوسٹ کھا لئے اور دودھ کا گلاس پی گیا۔

''بات کیا کرو گے؟'' — صغیر نے اس ہندو سے پوچھا۔

''تم خود عقل والے ہو'' — ہندو نے کہا — ''تمہیں آزاد چھوڑ کر ہمارے لئے جو خطرہ پیدا ہوتا ہے وہ تم سمجھ سکتے ہو۔ اس کی پیش بندی یہی ہو سکتی ہے کہ تمہیں قتل کر کے لاش غائب کر دی جائے جو میں کسی قیمت پر نہیں کرنا چاہتا۔ میں تمہیں پہلے بتا چکا ہوں کہ تم نے ہمارے لئے جو کام کئے ہیں' تمہیں اس کا کچھ صلہ ملنا چاہیے۔ دوسرا شریفانہ طریقہ یہ ہے کہ تم سچے دل سے وعدہ کرو کہ ہمیں دھوکہ نہیں دو گے اور ہماری نشاندہی نہیں کرو گے .... کہو کیا کہتے ہو۔ اگر میری یہ بات نہیں مانو گے تو بھی میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے جسم کو کوئی ہاتھ تک نہیں لگائے گا۔ یہاں جو بھی آئے گا' تمہاری عزت کرے گا''۔

صغیر کے چہرے پر رونق سی آ رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ اس نے ہاتھ لمبا کر کے اس ہندو کے کندھوں پر رکھا اور اسے اپنے قریب کر لیا۔

''تم تو بڑے پیارے آدمی ہو میرے بھائی!'' — صغیر نے ایسے لہجے میں کہا جیسے ابھی ابھی اس کمرے میں آیا ہو اور وہ یہاں کے لوگوں کی نگاہوں میں بڑا ہی قابلِ اعتماد آدمی ہو۔ اس نے عجیب سی بے تکلفی سے کہا — ''میں تم لوگوں کو دھوکہ نہیں دوں گا۔ دراصل بات یہ ہے کہ بھائی کی موت نے میرے دماغ پر بہت بُرا اثر کیا ہے'' — اس نے افسوس کا اظہار کرنے کی بجائے مسکراتے ہوئے کہا — ''مرنا تو ہر کسی نے ہے' ہوسکتا ہے میں پھر تمہارے پاس ہی آجاؤں' میری طرف سے مطمئن رہو''۔

ہندو اٹھ کر دروازے تک گیا اور بڑی زور سے بولا — ''برتن لے جاؤ''۔

تئیس چوبیس برس عمر کی ایک دلنشیں لڑکی کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ بظاہر سیدھی سادی لڑکی تھی' اس کے بال کٹے ہوئے نہیں تھے۔ اس کے سر پر دوپٹہ تھا لیکن اس کے سرخ و سپید رنگ' آنکھوں کی چمک اور انداز سے پتہ چلتا تھا کہ پڑھی لکھی اور اونچے خاندان کی لڑکی ہے لیکن ظاہر یہ ہوتا تھا کہ وہ اس گھر کی نوکرانی ہے۔ وہ کمرے میں آئی تو ہندو جس کا نام سریش کمار تھا' صغیر سے یہ کہہ کر باہر چلا گیا کہ کچھ دیر آرام کر لو' میں ایک گھنٹے تک واپس آجاؤں گا۔

"بڑے اطمینان سے آرام کرو" ۔۔۔ سریش کمار نے کہا ۔۔۔ "میں تمہیں یقین دلا
چکا ہوں صغیر بھائی! تمہیں غصیلی آنکھ سے بھی کوئی نہیں دیکھے گا"۔
"یہاں آئے گا ہی کوئی نہیں" ۔۔۔ لڑکی بولی ۔۔۔ "آپ نے سب کو منع تو کر ہی دیا
ہے"۔
"اور دیکھو منی!" ۔۔۔ سریش نے لڑکی سے کہا ۔۔۔ "تم اس کا خیال رکھنا۔ اسے
میرا بھائی سمجھو"۔
"ہاں ہاں" ۔۔۔ منی نے بڑے پیارے سے انداز سے کہا ۔۔۔ "میں خیال نہیں
رکھوں گی تو اور کون رکھے گا! آپ جائیں"۔

○

صغیر اٹھا۔ اس نے انگڑائی لی جیسے سو کر اٹھا ہو۔ وہ جوان آدمی تھا۔ اس کی نظریں
اس دلکش لڑکی پر لگی ہوئی تھیں۔ لڑکی کو برتن اٹھا کر نکل جانا چاہئے تھا لیکن وہ وہیں
موجود رہی۔ کمرے میں ایک پلنگ پڑا ہوا تھا۔ لڑکی نے پلنگ پوش سیدھا کیا اور صغیر سے
کہا کہ وہ لیٹ جائے۔
"تم کون ہو؟" ۔۔۔ صغیر نے منی سے پوچھا۔
"نوکرانی سمجھ لو" ۔۔۔ منی نے جواب دیا ۔۔۔ "لیکن اس قسم کی نوکرانی نہیں جو
عام گھروں میں ہوتی ہیں۔ میں کچھ پڑھی ہوئی بھی ہوں اور تم جانتے ہو کہ یہ کس قسم
کے لوگ ہیں اور یہاں کیا ہوتا ہے اس لئے مجھے رکھا گیا ہے کہ میں سب کچھ سمجھتی ہوں
.... میں تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ میں مسلمان ہوں۔ اب کوئی غم اور فکر نہ کرنا۔ تمہیں
کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ یہ لوگ تمہاری بہت تعریفیں کرتے ہیں"۔
ناشتے کے بعد صغیر میں ایک تغیر آ گیا تھا۔ وہ جیسے بھول ہی گیا تھا کہ اسے کتنی زیادہ
ایذا رسانی میں سے گزارا گیا ہے۔ اس پر ایسا تاثر طاری ہوتا جا رہا تھا جیسے وہ اس گھر کا
ایک معزز مہمان ہو۔ وہ پلنگ پر لیٹ گیا۔
"تم چلی جاؤ گی؟" ۔۔۔ صغیر نے منی سے پوچھا۔
"ضروری نہیں" ۔۔۔ منی نے جواب دیا ۔۔۔ "کہتے ہو تو تمہارے پاس رک جاتی
ہوں"۔
"میرے پاس بیٹھو گی؟"

"کیوں نہیں!" ۔۔۔ منی نے کہا اور صغیر کے پاس پلنگ پر بیٹھ گئی اور صغیر کا ایک
ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔
صغیر کا جسم دکھ رہا تھا لیکن اسے وہ زیادہ محسوس نہیں کر رہا تھا۔ وہ لیٹے لیٹے اٹھا اور
نیم دراز ہو گیا۔ منی اس کے اور قریب ہو گئی۔ صغیر پر رومانی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس
نے ایک بازو منی کے گرد لپیٹ کر اسے اور زیادہ قریب کر لیا۔
"میں تمہیں سچی بات بتاؤں صغیر!" ۔۔۔ لڑکی نے جذباتی سے انداز سے کہا ۔۔۔
"میں نے تمہیں پہلے بھی دیکھا تھا اور تم مجھے اتنے پیارے لگے کہ تم سے ملنے اور کچھ دیر
تمہارے پاس بیٹھنے کو دل تڑپتا تھا۔ تم اتنے خوش طبع ہو کہ تمہاری باتیں مجھے بہت اچھی
لگتی تھیں۔ تم نے میری طرف کبھی توجہ ہی نہیں دی تھی۔ میں نے اب خود سریش کمار
سے کہا تھا کہ تمہارے کام کاج کے لئے مجھے موقع دے"۔
صغیر نے دروازے کی طرف دیکھا جس کے کواڑ بند تھے لیکن چٹخنی نہیں چڑھی ہوئی
تھی۔
"ابھی نہیں" ۔۔۔ منی نے کہا ۔۔۔ "دروازہ بند نہیں کریں گے۔ میں اسی کوٹھی
میں رہوں گی اور تمہارے پاس زیادہ وقت کے لئے آؤں گی"۔
وہ ایک دوسرے کے اتنا قریب ہو گئے کہ ایک دوسرے کے دل کی دھڑکنیں
محسوس کرنے لگے اور ان کی سانسیں ٹکرانے لگیں لیکن منی نے بات آگے نہ بڑھنے
دی۔ وہ پانی سے بھرا ہوا ایسا پیالہ بن گئی جو ہونٹوں کے ساتھ لگ کر پیچھے ہٹ جاتا ہے۔
صغیر پر رومانی دیوانگی سی طاری ہو گئی۔
"تم کبھی انڈیا گئے ہو؟" ۔۔۔ منی نے پوچھا۔
"نہیں" ۔۔۔ صغیر نے جواب دیا ۔۔۔ "جانے کو دل بڑا کرتا ہے لیکن طبیعت کچھ
اُکھڑی گئی ہے"۔
"لو، یہ بھلا کیا بات ہوئی" ۔۔۔ منی نے اپنا ایک گال اس کے گال کے ساتھ دبا کر
بچوں کی سی شوخی سے کہا ۔۔۔ "تم ایک بار چلو تو سہی۔ ایک تو وہ لوگ جن کے پاس جاؤ
گے، تمہیں شہزادوں کی طرح ہاتھوں پر اٹھائیں گے۔ پاکستانی کی تو وہ بہت ہی عزت
کرتے ہیں اور تم نے ان لوگوں کے لئے جو کام کئے ہیں، اس کا تو تمہیں ایسا صلہ دیں گے
کہ تم وہاں سے آنا ہی نہیں چاہو گے۔ انڈیا بہت خوبصورت ملک ہے۔ تمہیں ایسی ایسی

جگہیں دکھائیں گے جو تم نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی ہوں گی۔ وہاں سے تم ہی نہیں چاہو گے"۔

"تم ساتھ چلو گی؟"

"ہاں ہاں" ——— مُنی نے جواب دیا ——— "میں ساتھ ہوں گی' اور وہاں تمہیں ایک سے ایک بڑھ کر خوبصورت لڑکی ملے گی"۔

اس لڑکی نے انڈیا کی ایسی خوبصورت تصویر پیش کی کہ صغیر بڑے خوبصورت تصوروں میں کھو گیا۔ مُنی نے اپنی رومانی حرکتوں اور جذبات کو مشتعل کر دینے والے انداز سے اس کے تصوروں کو بیداری کے خواب بنا دیا۔

"میں نے سنا ہے تم ان لوگوں سے الگ ہو رہے ہو!" ——— مُنی نے اس کے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا ——— "یہ تمہارا اپنا فیصلہ ہے۔ میں کچھ نہیں کہوں گی لیکن یہ ضرور کہوں گی کہ ایک بار انڈیا کی سیر کر لو۔ انہیں کہہ دو کہ میں تمہارے ساتھ ہی رہنا چاہتا ہوں"۔

صغیر بڑے حسین خوابوں کی دنیا میں کھو گیا۔ منی اسے فضا کی بلندیوں میں اُڑاتی ہوئی لے گئی اور صغیر کی آنکھ لگ گئی۔



صغیر میں یہ تغیر پیدا کیا گیا تھا۔ اس رِنگ کے لیڈر مہندر آہو جا نے لُوسی کے اغوا اور اس کی واپسی کے بعد رِنگ کے چیدہ چیدہ افراد کو ایک جگہ اکٹھا کر کے اس مسئلے پر بحث مباحثہ کیا تھا کہ اب کیا کیا جائے۔ ایک مسئلہ تو ان کے سامنے یہ تھا کہ اس کوٹھی کی نشاندہی ہو گئی ہے' کیا یہ کوٹھی چھوڑ دی جائے یا اسی میں رہائش رکھ کر کوئی اور پردہ ڈالا جائے۔ اس مسئلے کا حل ان سب نے یہ سوچا اور فیصلہ کیا کہ کوٹھی چھوڑنا زیادہ خطرناک ہو گا کیونکہ یہ شک پیدا ہو گا کہ یہاں مشکوک لوگ رہتے تھے اور اب وہ کہیں غائب ہو گئے ہیں۔ اس طرح انہیں تلاش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

دوسرا مسئلہ صغیر کا تھا کہ اس کا کیا کیا جائے۔

"اس کا وہی حل بہتر ہے" ——— ایک نے کہا ——— "اسے بھی اسی طرح غائب کر دو جس طرح ان کے نوکر کو کیا تھا۔ اس کی باتیں آپ نے سنی ہیں۔ کیا کوئی آدمی اتنی اذیت برداشت کر سکتا ہے؟ بے ہوش ہو کر ہوش میں آتا ہے تو اس کی زبان پر وہی انکار ہے

ہے کہ میں تمہارے راستے پر نہیں آؤں گا"۔

"میری رائے کچھ اور ہے" ——— مہندر نے کہا ——— "میں نے اس شخص میں جو خوبیاں دیکھی ہیں وہ اور کسی پاکستانی ایجنٹ میں نہیں دیکھیں۔ یہی ایک خوبی دیکھ لو کہ اس قدر سخت ایذا رسانی شاید گھوڑا بھی برداشت نہ کر سکے لیکن اس شخص کی زبان سے جو الفاظ نکل گئے' انہی پر قائم ہے۔ ہمیں ایسے ہی آدمیوں کی ضرورت ہے۔ ہمارے ساتھ تھا تو اس نے پوری وفاداری سے ہمارا ہر کام کیا۔ اس نے ایسی جگہوں پر بھی بم رکھ دیئے تھے جہاں تک اور کوئی نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس میں عقل اور ذہانت بھی ہے۔ میں چاہتا ہوں ایسے آدمی کو ہم ضائع نہ کریں"۔

"لیکن کس طرح!" ——— ان میں سے کسی نے پوچھا۔

"دوسرا طریقہ استعمال کرو" ——— مہندر نے کہا ——— "برین واشنگ.... کیا تم یہ کام نہیں کر سکتے؟.... برین واشنگ کرو اور اسے سرحد پار لے چلو۔ ٹھیک ہو جائے گا"۔

اس میٹنگ میں فیصلہ کیا گیا کہ صغیر کی برین واشنگ کی جائے۔ یہ کام اس ہندو اور اس لڑکی کے سپرد کیا گیا تھا جنھوں نے اپنے نام سریش کمار اور منی بتائے تھے۔ اُن دونوں نے فوراً" اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ یہ کام ناشتے سے شروع ہوتا تھا۔ دودھ میں وہ نشہ آور دوائی ملائی گئی تھی جو ذہن کو سکون دیتی ہے اور دماغ پر بھی اثر کر کے سوچوں اور خیالوں کا رخ موڑ دیتی ہے۔

برین واشنگ کے کئی طریقے ہوتے ہیں۔ خاصی مدت تک ایذا رسانی کا طریقہ استعمال ہوتا رہا لیکن جدید دَور کی میڈیکل سائنس نے ایسی دوائیاں تیار کر لی ہیں جو دماغ پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ دماغی قوت کا رخ موڑنے کے لئے تجربہ کار آدمی ایسی باتیں کرتے ہیں جو دوائی کے اثرات کے ساتھ مل کر خیالات کو ایک خاص راستے پر ڈال دیتی ہیں۔ یہ دوائیاں کھانے پینے کی اشیاء میں مسلسل دی جاتی ہیں اور متعلقہ آدمی کو ایک طرح باتوں سے ہپناٹائز کیا جاتا رہتا ہے۔

صغیر کو جو دودھ پلایا گیا تھا اس میں ایک خاص دوائی شامل کی گئی تھی۔ اس دوائی کے اثرات کو اور زیادہ بڑھانے کے لئے ایک دلکش لڑکی کو استعمال کیا گیا تھا۔ یہ عمل یہیں پر ختم نہیں ہو گیا تھا۔ ہر کھانے کے ساتھ صغیر کو یہ دوائی دینی تھی۔ باقی کام سریش اور مُنی نے کرنا تھا۔ مُنی اپنے کام کی ماہر تھی۔ وہ طوائف نہیں تھی۔ اسے یہ ٹریننگ حاصل تھی

کہ جس آدمی کو پھانسنا ہو اس کے اتنا قریب ہو جاؤ کہ وہ آدمی دیوانہ ہو جائے۔ پھر اس کے لئے سراب بن جاؤ یعنی متعلقہ آدمی کو تشنہ رکھو۔ مُنی نے صغیر کے ساتھ یہی طریقہ اختیار کیا تھا۔

○

میجر عثمان کی ذہنی اور جذباتی حالت پاگلوں جیسی ہو چکی تھی۔ اس کے لئے ایک مسئلہ تو یہ تھا کہ لُوسی اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ لوسی نے اسے اس خوش فہمی میں مبتلا کر رکھا تھا کہ وہ اس پر دل و جان سے فدا ہے اور جس کے ساتھ اس کی منگنی ہوئی ہے' اسے وہ بالکل ہی پسند نہیں کرتی۔

ایک وجہ اور بھی تھی جو میجر عثمان کو پریشان کر رہی تھی۔ وہ یہ کہ وہ تسلیم کرنے پر اپنے آپ کو آمادہ نہیں کرنا چاہتا تھا کہ اس کے ساتھ دھوکہ ہوا ہے اور لوسی اسے بیوقوف بناتی رہی ہے۔ مسئلہ دراصل یہ تھا کہ لوسی میجر عثمان کے لئے ایک نشہ بن گئی تھی اور عثمان اسی نشے کا عادی ہو گیا تھا اور اس کی حالت نشے سے ٹوٹے ہوئے نشئی جیسی ہو گئی تھی۔ لوسی نے اسے ذہنی فرار اور لذّت پرستی کا عادی بنا دیا تھا۔ یہ ایک قسم کی برین واشنگ تھی جس نے میجر عثمان کو زندگی کے حقیقی راستوں اور حقائق سے متنفر کر دیا تھا۔

انسان کی سب سے بڑی کمزوری خوشامد پسندی ہے۔ ہر انسان اہمیت کا متمنی ہوتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اسے یہ احساس دلوایا جاتا رہے کہ اس دنیا میں تم جیسا ارفع و اعلیٰ کوئی نہیں۔ لُوسی اور اس جیسی عورتوں کو یہی ٹریننگ حاصل ہوتی ہے کہ وہ ایک تھرڈ کلاس آدمی کو بھی فرسٹ کلاس آدمی ثابت کر دیں۔ آدمی اپنے گھر جاتا ہے تو اسے کچھ مسائل کا سامنا ہوتا ہے۔ اگر اس کے بچے ہیں تو بچے اپنے مطالبات پیش کرتے ہیں۔ بیوی ہے تو وہ گھر کے ایک دو مسئلے پیش کرے گی۔ زندگی اسی کو کہتے ہیں لیکن لوسی جیسی عورتیں جسے پھانس لیتی ہیں وہ یہی طریقہ اختیار کرتی ہیں کہ اس آدمی کو خیالوں ہی خیالوں میں اور باتوں ہی باتوں میں شہزادہ بنا دیتی ہیں اور پھر اس سے وہ کام لیتی ہیں جس کی خاطر وہ برین واشنگ کرتی ہیں۔ جس آدمی کی برین واشنگ ہو چکی ہو اسے اپنے بیوی بچے اور گھر کا کوئی فرد اچھا نہیں لگتا۔ وہ اپنے آپ کو بڑی اونچی سطح پر رکھتا ہے جو دراصل نابالی ہوتی ہے اور گھر کے افراد کو وہ حقیر اور فضول افراد سمجھتا ہے۔

عثمان اسی سطح پر پہنچ گیا تھا۔ لُوسی وہاں سے چلی گئی تھی اور عثمان کو بڑے خوبصورت ہوائی قلعے میں اکیلا چھوڑ گئی تھی۔ اس کا ردِ عمل ویسا ہی تھا جیسا ہیروئن کے نشئی کا اس وقت ہوتا ہے جب اس کے پاس ہیروئن نہیں ہوتی۔ وہ غصے سے بھرا رہتا تھا۔ مزاج چڑچڑا ہو گیا تھا۔ وہ گھر میں وینا کے ساتھ لڑنے جھگڑنے کے بہانے تلاش کرتا رہتا تھا۔ مثلاً" وہ دفتر سے گھر پہنچا تو وینا نے کہا —— "آپ آ گئے ہیں" —— عثمان بھڑک کر بولا —— "تو کیا واپس چلا جاؤں؟"

وینا نے گوشت پکایا اور جب کھانا سامنے آیا تو عثمان غصے میں آ گیا اور یہ کہہ کر اُٹھ کھڑا ہُوا کہ یہ کیا پکا کر میرے آگے رکھ دیا ہے۔ میں نے آج سبزی کھانی تھی۔ وینا نے ایک دو روز پہلے کی پکی ہوئی سبزی فریج میں سے نکال کر گرم کی اور اس کے آگے رکھ دی تو عثمان بولا —— "یہ سبزی تو میں ایک مہینے سے فریج میں پڑی دیکھ رہا ہوں"۔

میجر عثمان کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ وہ وینا کے ساتھ کم سے کم بات کرے۔ وینا جانتی تھی کہ عثمان کے اس ابنارمل سلوک کی وجہ کیا ہے مگر وہ برداشت کر رہی تھی۔

○

میجر عثمان ایم اے خان کی کوٹھی میں چلا گیا اور مندر سے ملا جو اس کے لئے اور سارے پاکستان کے لئے ایم اے خان بنا ہُوا تھا۔ اس نے اور اس عورت نے جو ایم اے خان کی بیوی اور لوسی کی ماں کا رول ادا کر رہی تھی' عثمان کا پُرتپاک استقبال کیا اور اس کے ساتھ ہی وہ اداس اور پریشان ہو گئے جیسے ان پر غموں کا بوجھ آ پڑا ہو۔

"لوسی کہاں ہے؟" —— میجر عثمان نے غم زدہ لہجے میں پوچھا۔

"وہ تمہیں بتا کر گئی ہے" —— مندر نے جواب دیا —— "اس نے تمہیں فون کر دیا تھا کہ وہ کراچی جا رہی ہے"۔

"وہاں کا ایڈریس؟" —— میجر عثمان نے پوچھا —— "فون نمبر؟"

"کیا کرو گے ایڈریس اور فون نمبر پوچھ کر؟" —— مندر نے کہا —— "کیا یہ ایک آزاد ملک ہے؟ کیا ہم مسلمان کہلانے کے قابل رہ گئے ہیں؟ مجھے تو اپنی بیٹی کا غم لگا ہُوا ہے کہ خودکشی ہی نہ کر لے۔ اسے اغوا کیا گیا' خراب کیا گیا اور پھر چھوڑ دیا گیا۔ ہمارے ملک میں قانون تو رہا ہی نہیں۔ تم کیسے فوجی افسر ہو کہ ان بدمعاشوں کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے۔ ہمیں تین بار ٹیلی فون پر دھمکی مل چکی ہے کہ ہم نے کوئی کارروائی کی تو اس کا

انجام ہمارے لئے بہت بُرا ہو گا۔ سچی بات ہے عثمان بیٹا! ہم تو ڈر گئے ہیں، کہیں ہماری کوٹھی میں ڈاکہ نہ پڑ جائے۔ لُوسی نے تمہیں بتا دیا ہے کہ یہ بدمعاش کون ہیں"۔

"میں ان بدمعاشوں کو جانتا ہوں" ــــ عثمان نے کہا ــــ "لیکن میں لُوسی سے ملنا چاہوں گا"۔

"وہ تمہیں مل جائے گی" ــــ مہندر نے کہا ــــ "کچھ دن انتظار کر لو"۔

"مجھے ایک بات سمجھا دو" ــــ میجر عثمان نے کہا ــــ "لُوسی نے مجھے فون پر بتایا تھا کہ وہ اسلام آباد جا رہی ہے اور وہاں سے کراچی چلی جائے گی۔ آپ مجھے اس کا ایڈریس یا فون نمبر کیوں نہیں بتاتے؟"

"میرا خیال ہے میجر عثمان!" ــــ مہندر نے کچھ اور ہی طرح کی سنجیدگی سے کہا ــــ "اس حقیقت کو نہ بھولو کہ لوسی کے ساتھ ابھی تمہارا تعلق محض دوست کی حیثیت سے ہے۔ وہ ابھی کسی اور کی منگیتر ہے۔ میں ابھی مناسب نہیں سمجھتا کہ تمہیں اس معاملے میں زیادہ انوالو کروں"۔

"اس کا منگیتر کہاں ہے؟" ــــ میجر عثمان نے پوچھا۔

"تم جانتے ہو اس کا بھائی مر گیا ہے؟" ــــ مہندر نے کہا ــــ "وہ اپنے گھر ہو گا"۔

"کیا آپ اس کے بھائی کے مرنے پر گجرات گئے تھے؟"

"میں گیا تھا" ــــ مہندر نے جھوٹ بولا ــــ "صبح گیا شام کو جنازہ پڑھ کر آگیا تھا"۔

"آپ نے یہ جھوٹ کیوں بولا ہے؟" ــــ میجر عثمان نے پوچھا اور مہندر کا جواب سُنے بغیر کہنے لگا ــــ "جس روز صغیر کا بھائی فوت ہُوا ہے اس روز ڈیڑھ دو بجے آفس سے آتے ہوئے میں نے آپ کو یہاں دیکھا تھا"۔

"تمہیں غلطی لگی ہے" ــــ مہندر نے کہا ــــ "وہ ایک روز پہلے فوت ہُوا تھا"۔

"آپ کہتے ہیں کہ لوسی کے ساتھ میرا ابھی کوئی تعلق نہیں" ــــ میجر عثمان نے ابنارمل سی آواز میں کہا ــــ "اس تھوڑے سے عرصے میں میں آپ کو کم و بیش ڈیڑھ لاکھ روپیہ کِھلا چکا ہوں۔ آپ کے ڈرائنگ روم میں جو قالین بچھا ہُوا ہے وہ میرا بچھایا ہُوا ہے اور یہ میں نے بتیس ہزار روپے میں خریدا تھا۔ اس کے علاوہ لوسی نے خود جو تحفے مجھ سے وصول کئے اور جو اس نے مجھ سے آپ کو دلوائے اور ہوٹلوں میں اس نے میری جو

دولت خرچ کروائی وہ حساب الگ ہے۔ آپ کہتے ہیں لُوسی کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں"۔

"تو کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ تم ہمیں لوسی کی قیمت دیتے رہے ہو؟" ــــ مہندر نے پوچھا۔

"میں سو فیصد یہی کہنا چاہتا ہوں" ــــ میجر عثمان نے کہا۔

"محبت میں انسان جان تک کی قربانی دے دیتا ہے عثمان بیٹا!" ــــ مہندر نے مشفقانہ لہجے میں کہا۔

"میں جان کی قربانی دینے کے لئے بھی تیار ہوں" ــــ عثمان نے کہا ــــ "لیکن میں محسوس کر رہا ہوں کہ کوئی ایسی بات ہے جس پر آپ پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں"۔

"تم سے کوئی پردہ نہیں عثمان!" ــــ مہندر نے کہا ــــ "دراصل ہم لوگوں پر خوف و ہراس سا طاری ہو گیا ہے۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آتی کیا کروں اور کیا کہوں۔ یہ نہ بھولو اس بیٹی کا باپ میں ہوں جس کے ساتھ یہ سلوک ہُوا ہے۔ مجھے جذباتی سہارے کی ضرورت ہے جو تم سے ہی مل سکتا ہے۔ تم میرے پاس آتے رہنا۔ لُوسی تمہیں مل جائے گی"۔

میجر عثمان وہاں سے آگیا۔ اس کی ذہنی حالت نارمل نہیں تھی۔ ایک تو لُوسی اُس کے لئے بہت بڑا اور ٹیڑھا مسئلہ بن گئی تھی اور دوسرا مسئلہ جو اسے پریشان کر رہا تھا وہ یہ تھا کہ وینا کے بھائیوں کے نوکر اکبر کو قتل کس نے کیا۔ عثمان ایم اے خان کی کوٹھی سے نکل کر گاڑی میں بیٹھا تو یہی سوال اسے پریشان کر رہا تھا۔ اب مہندر نے اسے لُوسی کا ایڈریس اور فون نمبر دینے سے ٹال دیا تھا تو اس کے ذہن میں ہلکا سا ایک شک سر اٹھانے لگا تھا۔

وہ اپنے ذہن میں لُوسی کی اس کہانی کو یاد کرنے لگا جو لُوسی نے اسے اپنے فرار کے متعلق سنائی تھی۔ لُوسی نے اسے یہ تو بتا دیا تھا کہ ایک نوکر اس کمرے میں اس پر پہرہ دیتا تھا۔ لوسی نے عثمان کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ اس نے اس نوکر کو کس طرح بے وقوف بنایا اور وہاں سے اس نوکر کی مدد سے فرار ہوئی تھی لیکن عثمان کو بعد میں پتہ چلا کہ نوکر تو قتل ہو گیا ہے۔ لُوسی کو عثمان نے یہ نہیں بتایا تھا کہ اکبر کو قتل کر دیا گیا تھا یا کیا ہُوا تھا۔

عثمان کے ذہن میں ایک سوال اور پیدا ہوا ——— "کیا اپنے نوکر کو وینا کے بھائیوں نے اس غصے میں خود ہی قتل کر دیا ہے کہ اس نے اپنی ڈیوٹی میں کوتاہی کی تھی؟" ——— اسے اس سوال کا جواب مل رہا تھا۔ ایک خیال اسے یہ آیا کہ ہو سکتا ہے نوکر نے مالکوں کے ڈر سے خودکشی کر لی ہو۔



عثمان کی بیوی وینا کی ذہنی حالت ایسی ہو گئی تھی جو اس کے لئے عجیب و غریب تھی اور ناقابلِ برداشت بھی۔ گھروں پر مشکلات آتی ہی رہتی ہیں۔ کبھی گھر کا کوئی فرد بیمار پڑ جاتا ہے۔ کوئی عزیز فوت ہو جاتا ہے۔ مالی دشواریاں پیدا ہو جاتی ہیں اور ایسے ہی کچھ مصائب ہیں جو اچانک آ پڑتے ہیں۔ گھر والے ان مسائل یا مصائب کا مقابلہ کرتے ہیں۔ چونکہ مسئلہ کوئی بھی ہو' وہ واضح ہوتا ہے اس لئے اس کے مطابق حل تلاش کیا جاتا ہے لیکن یہ مسئلہ ایسا تھا جس کا کم از کم وینا کو کوئی حل نظر نہیں آتا تھا۔ اس نے اپنی ماں سے اور بھائیوں سے بھی کہا تھا کہ اس کا خاوند پاگل ہو جاتا' اسے پاگل خانے میں داخل کرا دیتے تو اسے یہ تو پتہ چلتا کہ اس کے خاوند کا دماغ کس وجہ سے ماؤف ہو گیا ہے مگر یہاں صورتِ حال یہ تھی کہ خاوند بظاہر اچھا بھلا تھا لیکن اس کا دماغ اس کے قابو میں نہیں تھا۔ اس کی تو یہ حالت تھی جیسے اس پر کوئی آسیب طاری ہو اور وہ زندگی کے شب و روز اس آسیب کے زیرِ اثر گذار رہا ہو۔

وینا ایک مخلص اور وفاشعار بیوی تھی۔ کوئی اور ہوتی تو عثمان نے جو سلوک وینا کے ساتھ کیا تھا وہ کبھی برداشت نہ کرتی۔ وینا کو جب بھائیوں نے کہا تھا کہ لعنت بھیجو ایسے خاوند پر اور اپنے گھر آ بیٹھو' تم بوڑھی تو نہیں ہو گئیں تو وینا نے کہا تھا کہ یہ مسئلہ میرے لئے ایک چیلنج بن گیا ہے۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ میں اس خاوند کو اکیلا چھوڑ دوں تو یوں لگتا ہے جیسے میں اپنے خاوند سے بے وفائی کر رہی ہوں اور اسے ایک انتہائی خطرناک عورت کے حوالے کر رہی ہوں۔

"خاوند میرا ہے" ——— وینا نے یہ الفاظ کئی بار اپنے عزیزوں سے' میجر سمیع اور کیپٹن آصف سے بھی کہے تھے ——— "میرا دماغ حاضر ہے۔ مجھ پر کسی آسیب کا اثر نہیں۔ میں اپنے خاوند کی نجات کے لئے اپنے جذبات کی اور اپنے بچوں تک کی قربانی دینے کے لئے بھی تیار ہوں"۔

یہ اس کا عزم تھا اور یہ اس کی نیت تھی لیکن حالات اس کے بس سے باہر تھے۔ اس کے بھائیوں نے لُوسی کے اغوا کا جو طریقہ اختیار کیا تھا وہ وینا کو اچھا نہیں لگا تھا لیکن وہ بھائیوں کے کہنے پر چپ رہی تھی۔ اس کے بھائی بے وقار اور بدمعاش قسم کے آدمی نہیں تھے۔ عقل اور ہوش والے لوگ تھے۔ وینا دراصل یہ چاہتی تھی کہ عثمان کے ذہن میں اور کردار میں تبدیلی آئے اور وہ خود محسوس کرے کہ وہ ایک جادوگرنی کے قبضے میں آ گیا تھا۔ وہ خود محسوس کرے اور اس چکر سے نکلے۔

وینا ایک محاذ پر ڈٹ گئی تھی لیکن اس کی بدقسمتی یہ تھی کہ وہ بے تیغ سپاہی تھی۔ تیغ ہوتی بھی تو وہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ وار کس پر کرے۔ رہ رہ کر اس کا دھیان اللہ کی طرف جاتا تھا۔ وہ تھی تو باوقار اور شریف لڑکی لیکن وہ اس کلاس کی لڑکی تھی جس کلاس کو اللہ کی ضرورت کم ہی کبھی محسوس ہُوا کرتی ہے۔ اس کلاس میں نماز روزہ کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ اب وینا پر ایسی آ پڑی کہ اسے کوئی حل' کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا تو اسے یہ احساس ہُوا کہ ایک قوّت موجود ہے جو جسے چاہے عزت دیتی اور جسے چاہے ذلّت دیتی ہے۔ یہ خیال آتے ہی اس نے صوم و صلوٰۃ کی طرف توجہ دی۔ اس نے باقاعدگی سے نمازیں پڑھنی شروع کر دیں۔

اسے کچھ سکون محسوس ہُوا تو راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر اُس نے نفل پڑھنے بھی شروع کر دیئے۔ اس کی آنکھوں میں اس سے پہلے کبھی آنسو نہیں آیا تھا۔ عثمان نے بارہا اسے بڑے سخت الفاظ کہے تھے بلکہ اسے ایک طرح سے لُوسی کے مقابلے میں دھتکار دیا تھا پھر بھی اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں آئے تھے مگر پہلے روز جب اس نے نماز پڑھ کر اللہ کے آگے ہاتھ پھیلائے تو بے اختیار اس کے آنسو بہنے لگے اور پھر اس کی ہچکی بندھ گئی۔ اُس نے روحانی سا سکون محسوس کیا اور اسے صاف طور پر محسوس ہُوا کہ اللہ اس کی سن رہا ہے اور اللہ اس کی مدد کو پہنچے گا۔ اس کے بعد اس نے اللہ کو ہی اپنا رازدار اور مددگار بنا لیا۔

اب اسے پتہ چلا کہ اس کے میکے کے نوکر اکبر کو قتل کر دیا گیا ہے اور لُوسی فرار ہو گئی ہے تو اسے خطرہ محسوس ہونے لگا۔ اسے اپنا خاوند بھی خطرے میں نظر آنے لگا۔ وہ اللہ سے یہی ایک دعا مانگتی تھی کہ اس کا خاوند اسے واپس مل جائے۔ وہ خاوند کو خبردار کرنا چاہتی تھی کہ اس لڑکی سے بچ کے رہے لیکن خاوند اس کے ساتھ نہ بات کرتا تھا نہ اس

کی سنتا تھا۔ پھر بھی وہ اللہ اللہ کئے جا رہی تھی۔

○

شام کے سات بج رہے تھے جب میجر عثمان کے گھر کے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ عثمان کی ذہنی کیفیت یہ ہو گئی تھی کہ فون کی گھنٹی بجتی تو وہ بڑی تیزی سے اس توقع پر ریسیور اٹھاتا کہ لوسی کا فون ہو گا لیکن ہر بار کوئی اور بول رہا ہوتا تھا۔ اب اس نے ریسیور اٹھایا تو میجر امتیاز بول رہا تھا۔

"میجر امتیاز؟" ـــــ عثمان نے پوچھا۔

"ہاں میجر عثمان!" ـــــ میجر امتیاز نے کہا ـــــ "آپ مجھے نہیں جانتے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں ابھی آ جاتا ہوں"۔

"یُو آر ویلکم ڈیئر!" ـــــ میجر عثمان نے کہا ـــــ "میرے لئے کوئی خاص خدمت؟"

"حاضر ہو کر بتاؤں گا" ـــــ میجر امتیاز نے کہا ـــــ "کوئی ذاتی کام نہیں"۔

"آ جائیں" ـــــ میجر عثمان نے کہا ـــــ "میں گھر پر ہی ہوں گا.... کیا آپ جانتے ہیں میں کہاں رہتا ہوں؟"

"جانتا ہوں میجر عثمان!" ـــــ میجر امتیاز نے کہا ـــــ "ابھی حاضر ہُوا"۔

عثمان نے فون تو بند کر دیا لیکن یہ سوچنے بیٹھ گیا کہ یہ میجر امتیاز کون ہے اور اسے میرے گھر کے ایڈریس کا کیسے پتہ چلا ہے۔

میجر امتیاز نے جیپ دور ہی روک لی اور عثمان کے گھر تک پیدل گیا۔ وہ انٹیلی جنس (آئی ایس آئی) کا میجر تھا۔ سرکاری جیپ پر آیا تھا۔ اس نے دروازے کی گھنٹی بجائی تو عثمان نے خود ہی آکر دروازہ کھولا اور اسے ڈرائنگ روم میں لے گیا۔

"چائے یا ٹھنڈا؟" ـــــ میجر عثمان نے پوچھا ـــــ "بے تکلفی سے بتا دیں"۔

"چائے بنوا لیں" ـــــ میجر امتیاز نے کہا۔

میجر عثمان نے نوکر کو آواز دے کر چائے کے لئے کہا اور امتیاز سے پوچھا کہ وہ کس طرح آیا ہے۔

"میرا تعلق ملٹری انٹیلی جنس سے ہے" ـــــ میجر امتیاز نے کہا ـــــ "آپ سے ایک فیملی کے متعلق کچھ پوچھنا ہے"۔

"کون سی فیملی؟" ـــــ میجر عثمان نے پوچھا۔

"آپ وہاں جاتے رہتے ہیں" ـــــ میجر امتیاز نے کہا ـــــ "ایم اے خان کی فیملی ہے یہ"۔

"میجر امتیاز!" ـــــ عثمان نے یک لخت سنجیدہ ہو کر پوچھا ـــــ "آپ کو میجر سمیع اور کیپٹن آصف نے تو نہیں بھیجا؟... بی فرینک پلیز.... میں آپ کو سب کچھ بتاؤں گا"۔

"پہلی بات تو میں آپ کو یہ بتا دیتا ہوں کہ آپ پر نہ کوئی الزام ہے اور نہ کوئی شک" ـــــ میجر امتیاز نے کہا ـــــ "میں پوچھنا تو یہ چاہتا تھا کہ میجر سمیع اور کیپٹن آصف کے ساتھ آپ کی دشمنی تو نہیں، لیکن یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ یہ دونوں آپ کے بڑے گہرے دوست ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے بھی انہی جیسا دوست سمجھیں۔ ملٹری انٹیلی جنس کی حیثیت اور اہمیت کو تو آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔ میں اپنی ڈیوٹی پوری کر رہا ہوں اور اس میں مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے"۔

"میں اس پوری فیملی کو نہیں جانتا" ـــــ میجر عثمان نے کہا ـــــ "ان کی ایک لڑکی کے ساتھ میری فرینڈشپ ہے۔ اس کے فادر ایم اے خان اور اس کی ماں کو جانتا ہوں... امتیاز بھائی! کیا آپ مجھے یہ نہیں بتائیں گے کہ آپ یہ انفارمیشن کیوں لے رہے ہیں؟"

"میجر عثمان!" ـــــ میجر امتیاز نے یک لخت سنجیدہ ہو کر کہا ـــــ "یہ کوئی فیملی نہیں، یہ مشکوک لوگ ہیں۔ میں دراصل آپ کے سوال کا جواب انٹیلی جنس کی لائن سے ہٹ کر دے رہا ہوں۔ مجھے ایسے سوال کا جواب دینا ہی نہیں چاہئے۔ اگر یہ فیملی یا اس کوٹھی میں رہنے والے لوگ مشکوک ہیں تو ان کے پاس جانے والا ہر فرد مشکوک سمجھا جاتا ہے اور یہ شک آپ پر بھی کیا جا سکتا ہے لیکن آپ کے دونوں دوست میرے بھی دوست ہیں اس لئے میں یہ انوسٹی گیشن غلط طریقے سے کر رہا ہوں"۔

"مجھے پہلے ہی شک تھا کہ اس انوسٹی گیشن میں میرے یہ دونوں دوست بھی شامل ہیں" ـــــ میجر عثمان نے کہا ـــــ "یہ دونوں اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ میں اس لڑکی کے ساتھ تعلق توڑ لوں اور اپنے بیوی بچوں کی طرف توجہ دوں"۔

"مجھے آپ کے گھریلو معاملات میں نہیں پڑنا چاہئے" ـــــ میجر امتیاز نے کہا ـــــ "ہم نے ان لوگوں یعنی ایم اے خان کے بارے میں کچھ اور انفارمیشن بھی اکٹھی کر لی ہے... آپ کے موڈ اور انداز سے مجھے شک ہوتا ہے کہ آپ ان لوگوں کو اچھا سمجھتے ہیں۔ ان کے ڈیفنس میں بات کریں گے تو شک آپ پر پختہ ہو گا.... میجر عثمان! اپنے آپ میں

آئیں.... پلیز.... میں جو پوچھتا ہوں وہ بتائیں۔ آپ کو ہمارے آفس میں بلایا جا سکتا تھا لیکن میں آپ کے گھر آ گیا"۔

"کیا آپ کو معلوم ہے کہ میرے ان دوستوں نے کیا کیا ہے؟" ـــــ میجر عثمان نے پوچھا ـــــ "انہوں نے اس لڑکی کو اغوا کیا اور خراب بھی کیا ہے۔ اس جرم میں میری بیوی کے دو بھائی بھی شامل تھے"۔

"میجر عثمان!" ـــــ میجر امتیاز نے کہا ـــــ "مجھے کچھ معلوم ہے یا نہیں‘ میں آپ سے یہ پوچھتا ہوں‘ کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے سسرال کا ایک نوکر قتل ہو چکا ہے؟"

"ہاں" ـــــ میجر عثمان نے جواب دیا ـــــ "مجھے معلوم ہے"۔

"کیا آپ نے یہ بھی سوچا ہے کہ اس نوکر کو قتل کس نے کیا ہے؟" ـــــ میجر امتیاز نے پوچھا۔

"میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا" ـــــ میجر عثمان نے جواب دیا ـــــ "ہو سکتا ہے میری بیوی کے بھائیوں نے اسے قتل کر دیا ہو"۔

"نہیں میجر عثمان!" ـــــ میجر امتیاز نے کہا ـــــ "اور گہرائی میں جا کر سوچو.... کیا اس لڑکی نے آپ کو بتایا نہیں تھا کہ وہ فرار کس طرح ہوئی؟"

"اس نے بتایا تھا" ـــــ میجر عثمان نے جواب دیا ـــــ "اس لڑکی نے اس نوکر کو بیس ہزار روپے کا لالچ دیا تھا"۔

"تو کیا اُسے بیس ہزار روپیہ ادا کر دیا گیا تھا؟" ـــــ میجر امتیاز نے پوچھا۔

"یہ تو میں نہیں بتا سکتا" ـــــ میجر عثمان نے جواب دیا۔

"میں بتا سکتا ہوں" ـــــ میجر امتیاز نے کہا ـــــ "میرے خیال کے مطابق ہُوا یوں ہے کہ ان بیس ہزار روپوں نے ہی اس کی جان لی ہے۔ یہیں سے ان کے خلاف شک پختہ ہوتا ہے کہ یہ عام سی قسم کے لوگ نہیں۔ میں آپ سے یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اس سے زیادہ آپ کچھ جانتے ہیں؟"

"نہیں" ـــــ میجر عثمان نے جواب دیا۔

"آپ کو بہت محتاط ہونا چاہئے میجر عثمان!" ـــــ میجر امتیاز نے کہا ـــــ "آپ آرمی آفیسر ہیں۔ انڈیا کی انٹیلی جنس کی دلچسپی آرمی آفیسرز کے ساتھ ہی ہوتی ہے۔ اگر آپ کا

تعلق اس لڑکی کے ساتھ ہے تو اور زیادہ محتاط ہو جائیں.... بائی دی وے.... یہ لڑکی کہاں ہے؟"

"مجھے لڑکی نے فون پر بتایا تھا کہ وہ اسلام آباد اور پھر کراچی جا رہی ہے"۔

"وہاں کے ایڈریس آپ کو معلوم ہیں؟"

"نہیں" ـــــ میجر عثمان نے جواب دیا۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ میں کیسے مان لوں کہ آپ کو لڑکی کا ایڈریس معلوم نہیں ـــــ میجر امتیاز نے کہا ـــــ "دوسری بات یہ کہ آپ کو کس طرح یقین ہے کہ لڑکی یہاں نہیں ہے؟"

"میں آپ کے اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا" ـــــ میجر عثمان نے کہا اور پھر اکتا کر بولا ـــــ "آپ تو تھانیداروں کی طرح تفتیش کر رہے ہیں۔ میں آپ کو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ان لوگوں کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں"۔

"ضرورت یہ ہے میجر عثمان کہ پاک آرمی کے آفیسر کی حیثیت سے آپ ان لوگوں میں اور زیادہ اُتر جائیں اور یہ دیکھنے کی کوشش کریں کہ یہ اصل میں ہیں کیا" ـــــ میجر امتیاز نے کہا ـــــ "یہ لوگ ہمارے ملک کے دشمن ہیں۔ یہ انڈیا کا ایک رِنگ معلوم ہوتا ہے۔ ہمیں آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔ اس لڑکی کو تلاش کرنے کی کوشش کریں۔ اگر وہ نوکر مارا نہ گیا ہوتا تو کم از کم میں اسے کوئی اہمیت نہ دیتا"۔

"پھر یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ اس آدمی کو کس نے قتل کیا ہے" ـــــ میجر عثمان نے کہا۔

"میں نے تو اپنے چیف تک رپورٹ پہنچا دینی ہے" ـــــ میجر امتیاز نے کہا ـــــ "آگے ان کی مرضی ہے وہ کیا کرتے ہیں"۔

میجر امتیاز اُٹھ کھڑا ہُوا اور دو چار رسمی باتیں کہہ کر چلا گیا۔



اگلی شام میجر سمیع اور کیپٹن آصف میجر عثمان کے گھر بیٹھے ہوئے تھے۔ انہیں عثمان نے بلایا تھا۔ عثمان کی ذہنی حالت صحیح نہیں لگتی تھی۔ صحیح ہونی بھی نہیں چاہئے تھی۔ ایک تو لُوسی اس کے لئے عجیب سا معمہ بن گئی تھی۔ دوسرے میجر امتیاز نے اس کے پاؤں تلے سے زمین نکال دی تھی۔

"مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی یہ سب کیا ہے!" —— میجر عثمان نے سمیع اور آصف سے ایسے لہجے میں کہا جیسے وہ ابھی رو پڑے گا —— "کل آئی ایس آئی کا میجر امتیاز آیا تھا اس نے تو مجھے مشتبہ سمجھ کر انوسٹی گیشن شروع کر دی تھی"۔

"اور تمہیں یہ شک ہے کہ میجر امتیاز کو ہم دونوں نے تمہارے پیچھے ڈالا ہے"۔ —— میجر سمیع نے کہا۔

"ہاں" —— میجر عثمان نے یوں کہا جیسے اس کے منہ سے بے اختیار اقبالِ جرم نکل گیا ہو —— "میرا شک تو یہی ہے اور میں بہت پریشان ہوں"۔

"تمہاری پریشانی بجا ہے" —— میجر سمیع نے کہا —— "تمہیں اس سے زیادہ پریشان ہونا چاہئے۔ پریشانی یہ نہیں کہ لُوسی تمہارے ہاتھ سے نکل گئی ہے بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ تم دو نشوں سے ٹوٹے ہوئے ہو۔ ایک تو لُوسی، تمہارے لئے نشہ بن گئی تھی' اس کے ساتھ وہ تمہیں دھوکے سے خاص قسم کے نشے والی گولیاں چائے کافی وغیرہ میں پلاتی رہتی تھی' اور پھر اس کے ساتھ اس کی وہ عیارانہ باتیں تھیں جن سے وہ تمہیں میجر سے میجر جنرل بنا دیتی تھی اور تم پر ایسا تاثر طاری کر دیتی تھی جیسے تم شاہی خاندان کے شہزادے ہو اور غلط گھر اور غلط ماحول میں پھنسے ہوئے ہو' پھر اس نے اپنی باتوں سے اور باتیں کرنے کے انداز سے اور اپنی مخصوص ایکٹنگ سے تمہیں یہ تاثر بھی دے رکھا تھا کہ ہر حسین عورت تم پر مرتی ہے اور تم اتنے دلکش اور اتنے قیمتی ہو جسے جو بھی عورت اپنے ہاتھ میں لے گی چھوڑنا نہیں چاہے گی۔ یہ ایک ایسا نشہ ہے میرے دوست! جو ہیروئن سے زیادہ خطرناک ہے اور جو جس پر طاری ہو جاتا ہے اسے اپنے چُنگل سے آزاد نہیں ہونے دیتا۔ جب تک تم اس طلسم ہوش ربا کو اپنے ذہن سے صاف نہیں کرتے تمہاری یہ پریشانی رفع نہیں ہو سکتی"۔

"سر!" —— کیپٹن آصف بولا —— "آپ کو ایڈکشن ہو گئی ہے"۔

"پہلے یہ بتاؤ آصف! تم نے مجھے سر کیوں کہا ہے؟" —— میجر عثمان نے پوچھا —— "ہم اپنی پرائیویٹ محفل میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ باہر بے شک سر کہتے رہا کرو"۔

"عثمان بھائی!" —— کیپٹن آصف نے سنجیدہ سے لہجے میں کہا —— "میں دیکھ رہا ہوں کہ تم ہمیں بیگانہ سمجھنے لگے ہو۔ خدا کی قسم، تمہیں سر کہہ کر خود میرے دل کو تکلیف ہوئی ہے.... میں کہہ رہا تھا کہ تم لُوسی کی دوستی کے ایڈکٹ ہو گئے ہو۔

خطرناک لڑکی ایک تو تمہیں نقصان پہنچا رہی ہے اور دوسرا نقصان پاکستان کو پہنچ رہا ہے۔ تمہیں اتنے ہی عزیز ہو جتنا پاکستان"۔

"پاکستان' پاکستان' پاکستان" —— میجر عثمان نے جھنجھلا کر کہا —— "کیا یہ لڑکی پاکستان کو اٹھا کر انڈیا لے جائے گی؟"

"نان سینس!" —— میجر سمیع نے کہا —— "ایک آرمی آفیسر کی زبان سے یہ الفاظ سن کر یوں لگتا ہے جیسے یہ آفیسر نہیں بلکہ بہروپیا ہے یا پنجابی فلموں کا ایکٹر ہے جسے فلم کی شوٹنگ کے لئے تھوڑی سی دیر کے لئے وردی پہنا دی گئی ہے.... اپنی حالت پر غور کرو عثمان! تم جیسا انٹیلی جنٹ آرمی آفیسر کیسی بے معنی باتیں کر رہا ہے۔ کچھ دنوں بعد تمہاری زبان اور زیادہ بازاری بلکہ ہیرا منڈی جیسی ہو جائے گی.... پاکستان کو اٹھا کر انڈیا نہیں لے جایا جا سکتا بلکہ یہ ہو گا کہ انڈین آرمی بڑے آرام سے اٹھ کر پاکستان میں آ بیٹھے گی"۔

"آئی ول شوٹ دی باسٹرڈز" —— میجر عثمان نے کہا —— "انڈین آرمی اتنی جرأت نہیں کر سکتی۔ ہم موجود ہیں' زندہ ہیں اور ہم بیدار ہیں"۔

"نہیں عثمان!" —— میجر سمیع نے کہا —— "تم موجود ہو' زندہ بھی ہو لیکن بیدار نہیں ہو"۔

"لُوسی کی یہی تو کامیابی ہے" —— کیپٹن آصف بولا —— "اُس نے تمہیں سلا دیا ہے اور یقین یہ دلا رکھا ہے کہ تم بیدار ہو۔ تمہاری حالت ان پاگلوں جیسی ہے جو اپنے آپ کو دانشمند اور ساری دنیا کو پاگل سمجھتے ہیں یا تمہاری حالت اُس نشئی جیسی ہے جو جھومتا لڑکھڑاتا چلا جا رہا ہوتا ہو اور سمجھتا ہو کہ اس کے ہوش و حواس قائم ہیں اور اس کے قریب سے گزرنے والے لوگ جھوم اور لڑکھڑا رہے ہیں"۔

"تم نے کہا ہے کہ انڈین آرمی پاکستان میں داخل ہونے کی جرأت نہیں کر سکتی" —— میجر سمیع نے کہا —— "جرأت اس لئے نہیں کر سکتی کہ تم موجود اور زندہ ہو۔ انڈین آرمی بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتی ہے کہ وہ پاکستان میں تم جیسے آرمی آفیسرز اور جوانوں کی موجودگی میں پاکستان میں داخل نہیں ہو سکتی۔ اسی لئے انڈیا یہ ہتھیار استعمال کر رہا ہے اور لُوسی کا شمار انہی ہتھیاروں میں ہوتا ہے۔ جیسا آصف نے کہا ہے کہ تم موجود بھی ہو' زندہ بھی ہو مگر بیدار نہیں ہو۔ ایک کامیابی تو لُوسی نے یہ حاصل کر لی ہے۔ اس کا اگلا

قدم یہ ہو گا کہ وہ تم سے سیکرٹ انفارمیشن لے گی اور اس کے بعد تمہیں باقاعدہ اپنے رِنگ میں شامل کر لے گی"۔

"ایسا کبھی نہیں ہو گا" ـــــ میجر عثمان نے کہا۔

"تمہیں اُس وقت پتہ چلے گا جب یہ ہو چکا ہو گا" ـــــ میجر سمیع نے کہا ـــــ "اور اس وقت تم اپنی اس پوزیشن کو قبول کر چکے ہو گے۔ تمہیں اُس راستے پر لے جایا جا رہا ہے"۔

"لیکن لُوسی کا اغوا میرے لئے بڑا تکلیف دہ مسئلہ بن گیا ہے" ـــــ میجر عثمان نے کہا ـــــ "اور پھر انٹیلی جنس کے میجر کا میرے پاس آنا...."

"ٹھنڈے دل سے سنو" ـــــ میجر سمیع نے کہا ـــــ "آج ہم تمہیں یہ بھی سنا دیتے ہیں کہ یہ سب کیا تھا.... اس لڑکی کو ہم نے اغوا کیا تھا اور اس لئے اغوا نہیں کیا تھا کہ ہم اس کی عصمت دری کرنا چاہتے تھے بلکہ اس لئے کہ ہم نے اس کی اصلیت معلوم کرنی تھی۔ ہم دونوں وہاں گئے تھے۔ جہاں اسے رکھا گیا تھا۔ تمہارے سسرال کا ایک نوکر پہرے پر تھا۔ اس لڑکی نے اپنا آپ ظاہر نہ ہونے دیا۔ میجر امتیاز بھی وہاں گیا تھا۔ اس نے لڑکی کو اپنی نظر سے دیکھا تھا اور اس کی رائے یہ ہے کہ یہ لڑکی مشکوک ہے.... اب غور کرو کہ اس لڑکی کے ہاتھ میں کتنی پاور ہے۔ وہ نہ صرف فرار ہوئی بلکہ نوکر کو بھی اُڑا کے لے گئی اور اسے قتل کر کے لاش نہر میں پھینک دی۔ یہ ایک ثبوت ہے کہ یہ لڑکی کتنے مضبوط اور طاقتور رِنگ سے تعلق رکھتی ہے"۔

"یہ تو رِنگ کی مضبوطی کی بات ہے" ـــــ کیپٹن آصف نے کہا ـــــ "خود لڑکی کی مضبوطی دیکھو' عثمان جیسے پختہ کار شخص کا اس نے کیا حال کر دیا ہے.... اور اس نے ہمیں آپس میں لڑانے کے لئے کیا بیان گھڑا ہے کہ ہم نے اسے کسی اور نیّت سے اغوا کیا تھا اور ہم نے اس کی آبرو ریزی کی ہے"۔

"ایک بات بتاؤ" ـــــ میجر عثمان نے پوچھا ـــــ "کیا میرے سالے امجد اور اختر بھی پاکستان کے اتنے خیر خواہ ہیں کہ انہوں نے لڑکی کو اس نیت سے اغوا کرایا ہے؟"

"ذرا سمجھنے کی کوشش کرو عثمان!" ـــــ میجر سمیع نے کہا ـــــ "یہ ان کی بہن کی ازدواجی زندگی کا مسئلہ بھی ہے۔ میں تمہیں ایک بات اور بتا دینا چاہتا ہوں کہ یہ دونوں اپنے نوکر کے قتل پر بہت بھڑکے ہوئے ہیں۔ وہ تو اپنی بہن کو اپنے گھر لے جانے پر تُلے

ہوئے تھے لیکن بھابی وینا کی وفاداری دیکھو کہ وہ تمہیں اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتیں"۔

"عثمان بھائی!" ـــــ کیپٹن آصف نے کہا ـــــ "ایک وہ عورت ہے جو تمہارے ہوش و حواس پر قبضہ کر کے تمہیں اور تمہارے ملک کو بھی تباہ و برباد کرنے کے ڈھنگ کھیل رہی ہے اور ایک یہ عورت ہے جو نہ جانے تمہارا کیسا سلوک برداشت کر کے تمہیں بچانے کے جتن کر رہی ہے"۔

عثمان کی ذہنی کیفیت اب یہ ہو گئی تھی کہ وہ کچھ سمجھنے کی حالت میں آ گیا تھا لیکن اس کے ذہن پر لُوسی اس حد تک سوار تھی کہ اپنے آپ کو سمجھاتے سمجھاتے جب لُوسی اس کے ذہن میں آتی تھی تو ویسے ہی ہوتا تھا جیسے چھوٹا سا بچہ چلتے چلتے ٹھوکر کھا کر گر پڑا ہو۔ اس کے یہ دونوں دوست بہت دیر اس کے پاس بیٹھے رہے اور معلوم یہی ہوتا تھا کہ اُنہوں نے عثمان پر اپنا اثر پیدا کر لیا ہے لیکن وہ اٹھ کر چلے گئے تو عثمان پھر اپنے خیالوں میں الجھنے لگا۔ وہ بہت دیر اکیلا ہی کمرے میں بیٹھا رہا۔ اسے جیسے محسوس ہی نہ ہُوا ہو کہ اس کے دوست جا چکے ہیں اور اس کی بیوی اس کے پاس کھڑی ہے۔

وینا نے اس کے ساتھ بے تکلفی سے بات کرنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ ازدواجی بے تکلفی سے بات کرتی تھی تو عثمان کو غصہ آ جاتا تھا۔ غصہ بھی ایسا جیسے اسے دھتکار رہا ہو لیکن وینا زہر کا یہ گھونٹ پی جاتی تھی۔ اب اس نے عثمان کو اس طرح کھویا کھویا سا بیٹھا دیکھا اور اس کے چہرے پر اضطراب اور تذبذب کے گہرے آثار دیکھے تو اس کے جی میں آئی کہ اسے سینے سے لگا لے اور اسے کہے کہ اپنے دکھ' اپنے غم میرے سینے میں ڈال دے لیکن اسے یاد آ گیا کہ اس نے ایسی بے تکلفی کا مظاہرہ کیا تو عثمان نہ صرف یہ کہ قبول نہیں کرے گا بلکہ ایسا دھکا دے گا کہ وہ دروازے سے باہر جا پڑے گی۔ اس نے عثمان کے ساتھ کوئی بات کئے بغیر چائے کے برتن سمیٹنے شروع کر دیئے۔

عثمان بے زاری کی سی کیفیت میں اٹھا۔ اس کا انداز شکست خوردگی جیسا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ڈرائنگ روم سے کسی دوسرے کمرے میں چلا گیا۔



صغیر پر برین واشنگ کا بڑا ہی خوبصورت عمل جاری تھا۔ مُنی اس کے ساتھ رہتی تھی۔ کھانے میں اسے نشہ آور چیزیں کھلائی جا رہی تھیں اور اب اُس نے یہ کہنا چھوڑ دیا تھا کہ وہ ان کے راستے پر نہیں آئے گا۔

ایک رات اس کی آنکھ کھلی تو اُس نے گھٹن سی محسوس کی جو بڑھتے بڑھتے صورت اختیار کر گئی جیسے کوئی اس کا گلا دبا رہا ہو۔ وہ اٹھ بیٹھا۔ اسے چکر سا آیا اور جسم میں اس نے نقاہت سی محسوس کی اور اس کے ساتھ اس پر ڈیپریشن طاری ہونے لگی۔ وہ کمرے سے نکلا اور زور سے آواز دی —— "کوئی ہے؟"

سریش جو قریب ہی کسی کمرے میں سویا ہوا تھا' دوڑا آیا اور صغیر سے پوچھا' کیا بات ہے۔

"معلوم نہیں کیا بات ہے" —— صغیر نے اپنی گردن کو شہ رگ کی طرف سے آہستہ آہستہ دباتے ہوئے کہا —— "دم گھٹ رہا ہے۔ جی چاہتا ہے یہاں سے بھاگ جاؤں"۔

"جانے دو یار!" —— سریش نے دوستانہ بے تکلفی سے کہا —— "تم تو بچوں کی طرح ڈر رہے ہو۔ کوئی اوٹ پٹانگ خواب دیکھا ہو گا.... کمرے میں چلو' میں تمہاری طبیعت ٹھیک کرتا ہوں"۔

صغیر اپنے کمرے میں پلنگ پر جا بیٹھا اور سریش دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں گلاس تھا جو اس نے صغیر کو دیا۔

"کولڈ کافی ہے" —— سریش نے کہا —— "پی لو۔ ابھی طبیعت سنبھل جائے گی"۔

صغیر نے کولڈ کافی پی لی۔ چند منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ اس کی ڈیپریشن پر بشاشت غالب آنے لگی اور وہ اپنے آپ میں بہتر تبدیلی محسوس کرنے لگا۔

"تم تنہائی محسوس کر رہے ہو" —— سریش نے صغیر سے کہا —— "میں خود تمہارے پاس بیٹھتا' لیکن میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جی چاہتا ہے ہر وقت تمہارے پاس ہی بیٹھا رہوں۔ معلوم نہیں تم میں کیا جادو ہے کہ میں تو تمہارا مرید ہو گیا ہوں۔ تمہیں تو پاکستان کا لیڈر ہونا چاہئے تھا لیکن پاکستانیوں نے تمہاری قدر نہیں کی"۔

سریش کمار کی یہ باتیں برین واشنگ کے عمل کا ایک لازمی حصہ تھیں۔ صغیر پر پہلے نشہ طاری کیا جاتا پھر سریش اسے باتوں باتوں میں زمین سے اٹھا کر آسمان پر پہنچا دیتا۔ نشے کی کیفیت میں سریش کی یہ باتیں صغیر کے ذہن پر نقش ہوتی چلی جاتیں اور وہ اپنے آپ کو عوام کی صف سے بہت بلند اٹھا کر حکمرانوں کی صف میں کھڑا کر دیتا —— "کچھ کمر

جاتی تو وہ کمی پوری کر دیتی تھی۔

سریش صغیر سے یہ کہہ کر کمرے سے نکل گیا کہ وہ مُنّی کو بھیجے گا۔

"تم اپنا کام ٹھیک طرح نہیں کر رہی" —— سریش نے مُنّی کو اس کے کمرے میں بلا کر کہا —— "آج شام تم نے اسے بہت تھوڑی ڈوز دی ہے یا دی ہی نہیں"۔

"میں نے پوری ڈوز دی تھی" —— مُنّی نے کہا —— "جوان آدمی ہے۔ ہضم کر گیا ہو گا.... کیوں؟ کیا ہوا؟"

"وہ تو کمرے سے نکل آیا تھا" —— سریش نے کہا —— "اگر وہ آواز نہ دیتا تو میری آنکھ نہ کھلتی اور وہ باہر نکل جاتا.... جاؤ' تھوڑی دیر اس کے پاس بیٹھو' میں نے اسے ڈوز دے دی ہے' جلدی سو جائے گا اور دیکھو' اپنے آپ کو بچا کر رکھنا۔ تم جانتی ہی ہو.... اسے تشنہ رکھو"۔

"کیا بات کرتے ہو سریش!" —— مُنّی نے کہا —— "میں اُس کی داشتہ تو نہیں۔ تم فکر نہ کرو"۔

مُنّی صغیر کے کمرے میں چلی گئی اور اس کے پلنگ پر بیٹھ کر اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ تھوڑی ہی دیر میں صغیر کی آنکھ لگ گئی اور مُنّی اٹھ کر چلی گئی۔

لُوسی کراچی پہنچ چکی تھی۔ شام کے بعد وہ ایک کوٹھی میں بیٹھی ہوئی تھی۔ چار پانچ اور آدمی بھی تھے۔ لُوسی کو یہاں آئے کچھ دن گزر گئے تھے۔ وہ اپنے آدمیوں کو بتا چکی تھی کہ اس کے ساتھ لاہور میں کیا ہوا ہے اور وہ کس طرح یہاں پہنچی ہے۔ کراچی میں اس رِنگ کا لیڈر کوئی اور تھا۔ اُس نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ لُوسی چونکہ دوسری لائن میں مہارت رکھتی ہے اس لئے اسے اسی لائن پر رکھا جائے۔

"کراچی اور سندھ کا معاملہ کچھ اور ہے" —— لیڈر نے کہا —— "یہاں لڑکیوں کی ضرورت کم ہی پڑتی ہے۔ یہاں تو تخریب کاری اور خون خرابہ کرنے والے آدمیوں کی ضرورت ہے"۔

اُسی شام اس کوٹھی میں اس رِنگ کی ایک اہم میٹنگ ہو رہی تھی۔

"تم سب دیکھ رہے ہو کہ کراچی میں معاملہ کچھ سرد پڑ گیا ہے" —— لیڈر نے کہا —— "ٹھوٹھاہ جاری رہنی چاہئے۔ سندھ کے اندر تو معاملہ ٹھیک چل رہا ہے۔ سندھ کو

اپنا ہی سمجھو۔ ہم نے یہاں مشرقی پاکستان والے حالات پیدا کرنے میں مکمل کامیابی حاصل کرلی ہے"۔

"ہم نے ٹھوٹھاہ جاری رکھی ہوئی ہے" ___ ایک آدمی بولا ___ "پرسوں ہمارے دو لڑکوں نے بہاریوں کی کالونی میں فائرنگ کی تھی اور باقی لڑکوں نے واویلا بپا کیا تھا کہ یہ افغانیوں نے گولیاں چلائی ہیں"۔

"ہاں ہاں" ___ لیڈر نے کہا ___ "وہ رپورٹ مجھے مل چکی ہے۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ پاکستان کے سیاسی حالات ہمارے حق میں ہوتے جارہے ہیں۔ سیاسی لیڈروں نے آپس میں لڑنا شروع کر دیا ہے۔ اس جلتی پر تیل ڈالنا بہت ضروری ہے۔ یہاں کے لیڈروں کو اپنے ملک کی سلامتی کا ذرا سا بھی خیال نہیں۔ یہ حالات ہماری کامیابی کے ضامن ہیں"۔

"ہم ان حالات سے اچھی طرح آگاہ ہیں" ___ میٹنگ کے شرکاء میں سے ایک اور بولا ___ "ہمارے آدمی یہاں کی دو سیاسی پارٹیوں میں داخل ہو چکے ہیں اور دونوں نے سندھی مسلمانوں کے بہروپ میں بڑی اچھی پوزیشنیں حاصل کر لی ہیں۔ کراچی میں امن قائم نہیں ہونے دیں گے"۔

"آپ مشرقی پاکستان کا حوالہ نہ دیا کریں" ___ ایک اور ذمہ دار آدمی نے کہا ___ "وہاں آخر میں فوج اور ایئرفورس سے حملہ کرنا پڑا تھا۔ سندھ بغیر حملے کے ہمارے پاس آ جائے گا۔ حملہ کرنے کی ضرورت ہی نہیں"۔

"وہ تو صاف نظر آ رہا ہے" ___ رنگ لیڈر نے کہا ___ "یہاں کے لیڈر خود ہی مشرقی پاکستان والے حالات پیدا کرتے چلے جارہے ہیں"۔

اس میٹنگ میں ایک لیڈر قسم کا آدمی اندرون سندھ سے آیا تھا۔ اس نے رپورٹ دی کہ ہر طرف کامیابی حاصل ہوئی ہے' ڈکیتی' راہزنی اور اغوا کی وارداتیں اتنی زیادہ کرائی جارہی ہیں کہ اب یہ پتہ بھی نہیں چلتا کہ ہمارے سامنے گھومنے پھرنے والے لوگوں میں سے کون ڈاکو اور کون پُرامن شہری ہے۔ ہم نے امن و امان تو رہنے ہی نہیں دیا"۔

پاکستان کے اخباروں میں خبریں چھپتی رہتی تھیں کہ سندھ میں غیر ملکی ہاتھ کام کر رہا ہے۔ بعض خبروں میں صاف لکھا ہوتا تھا کہ انڈیا کا جاسوسی اور تخریب کاری کا ادارہ "را"

سندھ اور کراچی میں سرگرم ہے اور یہ خبریں تو ہر روز اخباروں میں چھپتی تھیں کہ آج فلاں فلاں جگہ ڈاکے کی وارداتیں ہوئی ہیں اور فلاں فلاں کو ڈاکو اغوا کر کے لے گئے ہیں۔ اتنا خوفناک مسئلہ خبروں تک ہی محدود رہتا تھا۔ اگر کوئی کارروائی ہوتی تھی تو صرف یہ کہ ایک دو وزراء کے بیان اخباروں میں چھپ جاتے تھے:

"سندھ میں شہریوں کے جان و مال کی پوری حفاظت کی جائے گی"۔

"ہم سندھ میں امن قائم کر کے دم لیں گے"۔

"سندھ کی صورت حال ہمارے قابو میں ہے"۔

"ہم نے فیصلہ کر رکھا ہے کہ ڈاکوؤں کو کیفر کردار تک پہنچائیں گے"۔

یہ بیانات ایسے ہی ڈرائنگ روموں میں بیٹھ کر جاری کئے جاتے تھے جس طرح کے ڈرائنگ روم میں انڈیا کے تخریب کاروں کے لیڈروں کی میٹنگ ہو رہی تھی۔

ایک طرف خالی الفاظ تھے۔

دوسری طرف عمل ہی عمل تھا.... تباہی اور بربادی کا سامان تھا۔

پاکستان کے لیڈر پاکستانیوں کو تھپکیاں دے دے کر سلا رہے تھے۔

بھارتی لیڈر پاکستان کی تباہی کو تیز تر کرنے کے لئے سراپا عمل بنے ہوئے تھے۔ انہوں نے پاکستان سے اپنے ایجنٹوں کی ایک فوج تیار کر لی تھی۔



وینا کا بڑا بھائی امجد اُن دنوں اپنے کاروباری سلسلے میں کراچی گیا اور ایک ہوٹل میں ٹھہرا۔

اگلے روز وہ ایلفنسٹن سٹریٹ میں جا رہا تھا تو اسے ایک کار میں سے لُوسی ایک آدمی کے ساتھ نکلتی نظر آئی۔ امجد کچھ دور جا کر رک گیا اور لُوسی پر نظریں جمائے رکھیں۔ لُوسی ایک دکان میں چلی گئی۔ امجد دیکھتا رہا۔

اسے لُوسی کے نکلنے کا انتظار کرنا پڑا۔ لوسی کم و بیش آدھے گھنٹے بعد نکلی اور اس آدمی کے ساتھ کار میں بیٹھ گئی۔ امجد نے ٹیکسی لی اور ڈرائیور سے کہا کہ فلاں گاڑی کے پیچھے چلو۔

ٹیکسی نے لُوسی کی گاڑی کا تعاقب شروع کر دیا۔ امجد نے ٹیکسی ڈرائیو کو زیادہ پیسوں کا لالچ دیا تھا اس لئے ڈرائیور بڑی استادی سے گاڑی کا تعاقب کر رہا تھا ورنہ کراچی

کی ٹریفک میں کسی گاڑی کا تعاقب کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔

لُوسی کی گاڑی شہر سے نکل گئی اور کوٹھیوں کی ایک کالونی میں داخل ہو گئی۔ کئی موڑ کاٹ کر گاڑی ایک کوٹھی میں چلی گئی۔ امجد نے ٹیکسی کی رفتار کم کروا کے کوٹھی کا نمبر دیکھ لیا اور ٹیکسی ڈرائیور سے کہا کہ اُسے واپس اسی جگہ لے چلے جہاں سے آئے تھے۔

میجر عثمان کی حالت دن بدن بگڑتی جا رہی تھی۔ کبھی اس پر ایسی کیفیت طاری ہوتی تھی جیسے نشے میں ہو اور کبھی ایسی جیسے نشے سے ٹوٹا ہُوا ہو۔ عام طور پر اس پر غنودگی سی طاری رہتی تھی جس کی صورت ایسی تھی جیسے وہ اپنی بیوی اور بچوں سے اکتایا ہُوا ہو اور ان سے بے رخی برت رہا ہو۔ کبھی گھر میں آتا تو ذرا سی بات پر بھی بگڑ جاتا اور بیوی یا بڑے بچے پر جو ابھی تین سال کا تھا' غصہ نکالنا شروع کر دیتا۔ وہ جب غصے والی مزاجی کیفیت میں ہوتا تھا تو دودھ پیتے بچے کے رونے پر بھی بھڑک اٹھتا اور بیوی کو بے نقط سنانی شروع کر دیتا۔

"اس گھر میں ایک منٹ گزارنا بھی محال ہے"۔

"بچوں کو تمیز سکھانا ماں کا کام ہے"۔

"اس گھر میں داخل ہونے کو جی نہیں چاہتا"۔

"یہ گھر جہنم ہے"۔

اور ایسے ہی بے شمار طعنے اور کوسنے تھے جو اس کی زبان پر چڑھ گئے تھے اور جب اس کے مزاج میں چڑچڑا پن آ جاتا تو یہ الفاظ تیروں کی طرح وینا پر برسانا شروع کر دیتا تھا۔ پہلے پہل وینا اپنے دفاع میں کچھ بولتی تھی لیکن اس کا بولنا لڑائی جھگڑے کا باعث بن جاتا تھا۔ میجر عثمان کچھ سمجھنے کی بجائے مشتعل ہو کر آگ بگولہ بن جاتا اور کبھی تو اس پر ایسا باؤلا پن طاری ہو جاتا تھا کہ وہ وینا پر حملہ کرنے پر اُتر آتا تھا لیکن اب وینا نے اپنے رویے میں یہ تبدیلی پیدا کر لی تھی کہ وہ عثمان کی ہر کڑوی کسیلی بات بلکہ گالیاں بھی سن کر پی جاتی تھی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اس شخص پر اُس لڑکی کا جادو اس حد تک سوار ہے کہ اس کی

شخصیت اور اُس کی سوچیں بھی اُسی کے قبضے میں ہیں۔

وینا نے اپنے رویّے میں یہ تبدیلی اُسی روز پیدا کرلی تھی جس روز عثمان نے اُسے غصے میں کہا تھا کہ تم اپنے گھر دفع کیوں نہیں ہو جاتیں۔ عثمان نے یہ بھی کہا تھا کہ تم میری زندگی سے نکل جاؤ تو مجھے روحانی سکون محسوس ہو گا۔

"عثمان!" —— وینا نے غصے کا جواب غصے میں دینے کے بجائے پُرعزم لہجے میں کہا۔ —— "میں نے اگر اس گھر سے اور تمہاری زندگی سے نکلنا ہوتا تو کبھی کی نکل گئی ہوتی لیکن عثمان! میں تمہاری اس حیثیت کو کبھی نہیں بھولوں گی کہ تم میرے بچوں کے باپ ہو۔ اگر تم اس اعزاز اور اس سعادت کو قبول نہیں کرتے تو میں تمہیں یہ کہوں گی کہ ہمت کرو اور مجھے اس گھر سے نکال کر دیکھو"۔

"بکواس بند کرو" —— عثمان نے دانت پیس کر کہا تھا —— "تم نہیں نکلو گی تو میں اپنے ہاتھوں تمہارا گلا گھونٹ کر تمہاری لاش گندے نالے میں پھینک آؤں گا"۔

"یاد رکھو عثمان!" —— وینا نے متین سے لہجے میں کہا تھا —— "میری جن باتوں کو تم آج بکواس کہہ رہے ہو، کل یہی باتیں تمہارے زخموں پر مرہم کا کام کریں گی، وقت آنے دو"۔

یہ کہہ کر وینا دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی۔

وہ اُس روز کے بعد خاموش ہو گئی تھی۔ میجر عثمان نے اس کے ساتھ بڑھ بڑھ کر بدتمیزیاں، واہی تباہی اور طعنے جاری رکھے تھے۔ وینا سمجھ گئی تھی کہ اس کے خاوند کو ہپناٹائز کرلیا گیا ہے۔ وہ اب خاوند کی بجائے خدا سے ہمکلام ہوتی تھی۔ وہ خاوند کی روز بروز بگڑتی ہوئی حالت دیکھ رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ عثمان شراب بھی پیتا ہے لیکن اس پر غنودگی کی جو کیفیت طاری رہنے لگی تھی وہ شراب کا نشہ نہیں تھا۔ وہ جب کبھی خوش باش گھر آتا تھا تو وینا سمجھ جاتی تھی کہ شراب پی کر آیا ہے لیکن یہ غنودگی کسی اور ہی نشے کی تھی اور یہ کوئی بہت ہی بُرا نشہ تھا۔ اس میں شگفتہ مزاجی کی بجائے ڈیپریشن ہوتی تھی۔ اگر ڈیپریشن نہیں ہوتی تھی تو مزاج میں غصہ بھر جاتا تھا۔

وینا روحانی اذیّت میں مبتلا تھی۔ اس کی روح ناقابلِ برداشت عذاب کو برداشت کر رہی تھی اور اس نے یہ صورتِ حال قبول کرلی تھی لیکن جب وہ اپنے بڑے بچے کو دیکھتی تھی تو اپنے آنسوؤں کو نہیں روک سکتی تھی۔ بچہ باپ کو پہچانتا تھا۔ اسے معلوم تھا

کہ یہ باپ ہے اور اس سے اسے پیار ملنا چاہئے اور بچہ اپنا حق سمجھتا تھا کہ باپ اسے اٹھائے اور ذرا باہر گھما پھرا لائے مگر باپ کی حالت یہ تھی جیسے اس نے اس بچے کو اپنا سمجھنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ وینا کو یہ دیکھ کر بہت دکھ ہوتا تھا۔ وہ تعلیم یافتہ لڑکی تھی۔ جانتی تھی کہ جو بچہ پیار سے محروم ہوتا ہے اور جسے پیار کی بجائے دھتکار یا پھٹکار ملتی ہے وہ اسی عمر میں ابنارمل ہو جاتا ہے۔ اگر باپ مر چکا ہو تو ماں بچے کو یہ کہہ کر بہلا ہی لیا کرتی ہے کہ تمہارے ابّو ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے ہیں۔

وینا کو یہی غم کھائے جا رہا تھا کہ کپڑے لتّے، کھانے پینے اور تعلیم کے لحاظ سے تو اس کے بچے کسی سے پیچھے نہیں رہیں گے، شہر کے بہترین اور ہائی کلاس سکولوں اور کالجوں میں پڑھیں گے لیکن باپ کے پیار اور باپ کی شفقت کی محرومی کی وجہ سے ان کی ذہنیت مجرمانہ ہو جائے گی اور یہ اخلاق اور کردار کی بلندی پر نہیں بلکہ عمیق پستیوں میں زندگی گذاریں گے۔

وینا اللہ کے حضور رو رو کر یہی ایک دعا مانگا کرتی تھی —— "اللہ، میرے بچوں کو ان کا باپ واپس دے دے"۔

ایک رات عثمان گھر آیا۔ بچے سو گئے تھے۔ وینا جذباتی خلفشار میں اُلجھی ہوئی جاگ رہی تھی۔ ویسے ہی بچوں کے پاس لیٹی ہوئی تھی۔ دروازے کی گھنٹی بجی تو اس نے دروازہ کھولا۔ وہ عثمان تھا جس کے منہ سے السلام علیکم کے الفاظ بھی نہ نکلے۔ وینا نے السلام علیکم کہی تو عثمان چپ چاپ اس کے قریب سے گزر گیا۔

"کھانا لاؤں؟" —— وینا نے کمرے میں جا کر رسمی طور پر پوچھا۔

"نہیں" —— عثمان نے ایسی بے رخی سے کہا جس کی وینا عادی ہو چکی تھی۔

"چائے یا کافی؟"

"نہیں"۔

وینا نے فوراً نوٹ کر لیا کہ عثمان کی ذہنی حالت صحیح نہیں۔ وہ تو اب اس کے چہرے کو دیکھ کر ایک سیکنڈ میں پہچان لیتی تھی کہ وہ نشے میں ہے یا نشے سے ٹوٹا ہُوا۔ اُس رات وہ نشے سے ٹوٹا ہُوا لگتا تھا لیکن اس کے مزاج میں غصہ نہیں تھا۔

"پانی لاؤ" —— عثمان نے اس طرح کہا جیسے تھکا ہُوا آدمی گھر آ کر نوکر کو کوئی کام کہتا ہے۔

وینا پانی لینے چلی گئی۔ واپس آئی تو اس نے دیکھا کہ عثمان میز کی دراز میں سے کچھ نکال کر دراز بند کر رہا تھا۔ وینا نے اس کے ہاتھوں کی حرکت دیکھی۔ اس کے ہاتھ میں گولیوں کا ایک پتا تھا اور عثمان اس میں سے گولیاں نکال رہا تھا۔ وینا جب اس کے پاس پانی لے کر پہنچی تو عثمان چار گولیاں نکال چکا تھا اور باقی پتا اپنی جیب میں ڈال رہا تھا۔

وینا نے یہ پتا دیکھ لیا اور وہ جان گئی کہ یہ کیسی گولیاں ہیں۔ عثمان جب گولیاں منہ میں ڈالنے لگا تو اس نے دوسرا ہاتھ وینا کی طرف پانی کا گلاس لینے کے لئے کیا۔ وینا نے گلاس پیچھے کرلیا اور دوسرے ہاتھ سے اس کا وہ ہاتھ پکڑ لیا جس میں گولیاں تھیں۔

"یہ کیا بیہودہ حرکت ہے؟" ــــ عثمان نے ایسے لہجے میں کہا جس میں غصہ نہیں تھا افسردگی سی تھی۔

"عثمان!" ــــ وینا نے عثمان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑے پختہ انداز میں کہا ــــ "یہ گولیاں نہیں کھانے دوں گی"۔

"کیوں؟" ــــ عثمان نے پوچھا ــــ "کیا ہے ان گولیوں میں؟ .... میرا سر درد سے پھٹ رہا ہے اور یہ سر درد کی گولیاں ہیں"۔

"عثمان!" ــــ وینا نے ایسے جرأت مندانہ لہجے میں کہا جیسے ماں اپنے چھوٹے سے بچے کو کسی غلط حرکت سے روک رہی ہو ــــ "میں نے کہا ہے میں تمہیں یہ گولیاں نہیں کھانے دوں گی۔ باہر سے کھا کر آجاتے تو ٹھیک تھا"۔

"کیا مجھے پریشان کر کے تمہیں خوشی ہوتی ہے؟"

"میں نے کہہ دیا ہے یہ گولیاں نہیں کھانے دوں گی" ــــ وینا نے کہا۔

"کیا میں اپنے سر درد کا کوئی علاج نہ کروں؟"

"یہ سر درد تمہارا نہیں میرا ہے" ــــ وینا نے کہا ــــ "میں جاہل اور ان پڑھ نہیں۔ میں کہتی ہوں اس لڑکی کو جو ہمارے درمیان آگئی ہے گھر لے آؤ۔ اسے بیڈروم میں لے جاؤ، خدا کی قسم کھا کر وعدہ کرتی ہوں اُف نہیں کروں گی لیکن یہ گولیاں نہیں کھانے دوں گی"۔

وینا حیران ہو رہی تھی کہ آج اس شخص کا غصہ کہاں گیا۔ عثمان نے بڑے آرام سے اپنا گولیوں والا ہاتھ وینا کے ہاتھ سے چھڑا کر جیب میں ڈال لیا۔

"تم کیا سمجھی ہو؟" ــــ عثمان نے پوچھا ــــ "یہ کیسی گولیاں ہیں جو تم مجھے کھانے

نہیں دے رہیں؟ .... یہ زہر تو نہیں کہ میں کھا کر مر جاؤں گا"۔

"زہر کھا لو تو وہ اچھا ہے" ــــ وینا نے کہا ــــ "تم مجھ سے ہمیشہ کے لئے چھٹکارا پا لو گے اور میں کچھ دن رو پیٹ کر چپ ہو جاؤں گی اور اس صورتِ حال کو قبول کرلوں گی کہ میرے بچے یتیم ہو گئے ہیں لیکن تم وہ زہر کھا رہے ہو جو تمہیں مرنے بھی نہیں دے گا اور جینے بھی نہیں دے گا۔ تم ہر روز ایسی خودکشی کرتے ہو جو تمہاری دماغی صلاحیتوں اور جسمانی توانائی کو آہستہ آہستہ مار رہی ہے.... میں جانتی ہوں یہ ٹرانکولائزر ہیں جو ڈاکٹر کسی کسی مریض کو ذہنی سکون کے لئے دیتے ہیں اور کچھ لوگ یہ نشے کے طور پر کھاتے ہیں۔ مجھے آج پتہ چلا ہے کہ تم غنودگی کی حالت میں کیوں رہتے ہو"۔

"میرا خیال ہے مجھے تمہاری نصیحتوں کی اور تمہارے فلسفے کی ضرورت نہیں" ــــ میجر عثمان نے کہا ــــ "اور بہتر یہ ہے کہ تم مجھے تنہا چھوڑ دو"۔

"کس چیز کی ضرورت ہے اور کیا غیر ضروری ہے، یہ میں بہتر سمجھتی ہوں" ــــ وینا نے کہا ــــ "اور میں تمہیں بتا دیتی ہوں میں تمہیں تنہا نہیں چھوڑوں گی"۔

میجر عثمان پلنگ پر جا کر یوں بیٹھا اور لیٹ گیا جیسے گر پڑا ہو۔ وینا کو یہ خطرہ نظر آ رہا تھا کہ عثمان اس کی باتوں پر غصے میں آ جائے گا اور چونکہ وہ نشے سے ٹوٹا ہوا ہے اس لئے ہر اوچھی حرکت کر گزرے گا، پھر بھی وہ عثمان کے پاس پلنگ پر بیٹھ گئی۔ اس نے دیکھا کہ عثمان کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ عثمان کے اندر کوئی نفسیاتی خامی ہے جسے دبانے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ کمزوری جو کچھ بھی تھی، وہ اُبھر آئی تھی اور عثمان بے بس سا لگتا تھا۔

"یہ مردوں کا شیوہ نہیں عثمان!" ــــ وینا نے کہا ــــ "کوئی مسئلہ ہے تو مردانہ وار اس کا مقابلہ کرو۔ آج میں تمہارے ساتھ دو ٹوک بات کرنا چاہتی ہوں .... تمہارا مسئلہ یہ ہے کہ تم دو عورتوں میں بٹ گئے ہو بلکہ صحیح صورت یہ ہے کہ تم دو عورتوں کے درمیان اس طرح پس رہے ہو جس طرح گندم کا دانہ چکی کے دو پتھروں کے درمیان آ جاتا ہے اور اپنی اصلیت کھو بیٹھتا ہے۔ ایک وہ عورت ہے جسے تم چھوڑ نہیں سکتے اور ایک میں عورت ہوں جو تمہیں چھوڑ نہیں سکتی"۔

"چار نہ سہی وینا!" ــــ عثمان نے کہا ــــ "دو گولیاں کھا لینے دو"۔

"چلو دو کھا لو" ــــ وینا نے کہا ــــ "میں تم سے وعدہ کرتی ہوں عثمان! میں

تمہارے راستے میں نہیں آؤں گی۔ جو جی میں آئے کرو لیکن خدا کے لئے اور پھر اپنے بچوں کے لئے یہ گولیاں کھانی چھوڑ دو"۔

وینا نے اٹھ کر پانی کا گلاس عثمان کو دیا اور عثمان نے دو گولیاں کھالیں۔ وینا اس کے ساتھ باتیں کرتی رہی اور عثمان پر غنودگی طاری ہوتی گئی۔ وینا کو شاید پہلی بار پتہ چلا تھا کہ عثمان ٹرانکولائزر گولیوں کا عادی ہو چکا ہے۔ اسے کیا پتہ چلتا' یہ تو عثمان کو بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ گولیوں کا عادی کس طرح ہوا تھا حالانکہ دوستوں نے اسے بتایا تھا کہ لوسی اسے دھوکے میں مشروبات' چائے' کافی وغیرہ میں ٹرانکولائزر پلا رہی ہے۔ عثمان نے صرف اتنا تسلیم کیا تھا کہ وہ جب اس کے ہاں سے اٹھتا ہے تو اس پر نشے جیسی غنودگی طاری ہوتی ہے لیکن وہ اس غنودگی سے لطف اندوز ہوتا رہا تھا۔ اب لوسی کی جدائی کا غم وہ ان گولیوں کے ذریعے دبانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ نہیں سمجھ رہا تھا کہ وہ ان گولیوں کا نشئی ہو چکا ہے اور یہ گولیاں اس کے لئے ذہنی بیساکھیاں بنتی جا رہی ہیں۔

عجیب بات یہ ہے کہ وینا کی تو وہ ایسی بات بھی برداشت نہیں کیا کرتا تھا جس میں اس کا فائدہ ہی کیوں نہ ہوتا لیکن اُس رات اس نے وینا کی ہر بات برداشت کر لی اور چار گولیاں کھانے کی بجائے دو گولیاں کھائیں۔ وینا اُس وقت وہاں سے اٹھی جب میجر عثمان کپڑے بدلے بغیر سو گیا تھا۔

وینا بہت بڑا بوجھ دل پر لے کر وہاں سے اٹھی۔ اس بوجھ کو تو وہ برداشت کر رہی تھی کہ اس کا خاوند کسی اور لڑکی کے قبضے میں آ گیا تھا لیکن اس بوجھ تلے کہ اس کا خاوند نشہ آور گولیوں کا عادی ہو گیا تھا' اس کی ہڈیاں ٹوٹنے لگیں لیکن وینا بے بس تھی۔



اگلی شام میجر سمیع اور کیپٹن آصف میجر عثمان سے ملنے اس کے گھر آئے۔

"یار' آج تم نے اچھا کیا کہ آ گئے ہو" ـــــ عثمان نے کہا ـــــ "آج تو میں بہت ہی ڈیپریسڈ ہوں"۔

"یہ کوئی نئی خبر تو نہیں" ـــــ میجر سمیع نے مسکراتے ہوئے کہا ـــــ "ایک وہ وقت تھا کہ مجھے ڈیپریشن ہوتی تھی تو میں تمہارے پاس آ جایا کرتا تھا۔ تم کتنے زندہ دل تھے کہ تمہیں دیکھتے ہی ڈیپریشن ہوا ہو جاتی اور دل باغ باغ ہو جاتا تھا مگر اب کسی نے اپنے اوپر ڈیپریشن طاری کرنی ہو تو وہ تمہارے پاس آ بیٹھے"۔

"یہ سب عشق بازی کا نتیجہ ہے" ـــــ کیپٹن آصف نے کہا ـــــ "عشق بازی بھی مشکوک لڑکی کے ساتھ .... اس کا کوئی فون آیا؟"

"نہیں یار!" ـــــ عثمان نے جواب دیا۔

"آئے گا بھی نہیں" ـــــ میجر سمیع نے کہا ـــــ "وہ جہاں ہے وہاں اس نے تم جیسا کوئی اور پھانس لیا ہے"۔

"میں تمہیں کس طرح بتاؤں یار!" ـــــ میجر عثمان نے جھنجھلا کر کہا ـــــ "وہ ایسی نہیں' اس کی کوئی مجبوری ہو گی کہ وہ فون نہیں کر سکی۔ میں جانتا ہوں میرے بغیر وہ کس طرح زندہ ہو گی"۔

"اگر یہ جاننا چاہتے ہو کہ وہ کس طرح زندہ ہو گی تو میں تمہیں کراچی کی ایک کوٹھی کا ایڈریس دیتا ہوں" ـــــ میجر سمیع نے کہا ـــــ "خود جا کر دیکھ لو کہ تمہارے بغیر اس کی زندگی کس طرح گزر رہی ہے"۔

"کیسا ایڈریس؟" ـــــ عثمان نے پوچھا۔

"یہ لو" ـــــ میجر سمیع نے کاغذ کا ایک ٹکڑا میجر عثمان کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا ـــــ "خود کراچی چلے جاؤ اور چھپ کر اس کوٹھی پر نظر رکھنا۔ تمہیں اپنی محبوبہ نظر آ جائے گی"۔

"اسے کس نے دیکھا ہے وہاں؟" ـــــ عثمان نے پوچھا۔

"یہ بتانے کی ضرورت نہیں" ـــــ میجر سمیع نے کہا ـــــ "ہم تمہیں بتا چکے ہیں کہ یہ لڑکی انٹیلی جنس کی نظر میں ہے اور مجھے پل پل کی خبر مل رہی ہے"۔

"میجر امتیاز نے بتایا ہو گا؟" ـــــ میجر عثمان نے کہا۔

"کسی نے بھی بتایا ہو" ـــــ میجر سمیع نے کہا ـــــ "میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ وہاں اسے تم جیسے ایک اور آدمی کے ساتھ شاپنگ کرتے اور پھر اس کوٹھی میں جاتے دیکھا گیا ہے"۔

میجر سمیع اور کیپٹن آصف نے عثمان کو یہ سوچ کر نہ بتایا کہ یہ خبر وینا کے بڑے بھائی امجد نے دی ہے۔ اگر امجد کا حوالہ دیا جاتا تو عثمان فوراً بگڑ جاتا اور کہتا کہ یہ سب جھوٹ ہے۔

"عثمان!" ـــــ میجر سمیع نے کہا ـــــ "ہم دونوں کو یقین ہے کہ تم ہمیں اپنا ہمدرد

سمجھتے ہو اور سوچ بھی نہیں سکتے کہ ہم تمہیں دھوکہ دیں گے"۔

"ایسی بات کیوں کہتے ہو جو سو فیصد سے بھی زیادہ صحیح ہے" ___ عثمان نے کہا ___ "میں نے تمہارے خلوص اور تمہاری محبت پر کبھی شک نہیں کیا۔ ہماری محبت اور بے تکلفی کی مثال یہ ہے کہ آصف کیپٹن ہے اور ویسے بھی یہ مجھ سے اور تم سے بہت جونیئر ہے لیکن یہ ہمیں تم اور تُو کہہ کر بات کرتا ہے۔ کیا آرمی میں اس طرح ہوتا ہے؟ بعض جونیئر کیپٹن سینئر کیپٹنوں کو سر کہہ کر بات کرتے ہیں لیکن ہماری بے تکلفی کچھ اور ہے"۔

"عثمان یار!" ___ کیپٹن آصف نے کہا ___ "ایک طرف تم ہماری محبت کو اور ہمارے خلوص کو دل کی گہرائیوں سے قبول کرتے ہو اور دوسری طرف تم ہم پر عجیب و غریب شُبہے کرتے ہو۔ ہماری ہر اس بات کا جس کا تعلق اس مشکوک لڑکی کے ساتھ ہو بُرا مانتے ہو"۔

"دیکھ آصف!" ___ عثمان نے کہا ___ "میرے دل میں اپنے خلاف شُبہے تم نے خود پیدا کئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ لڑکی کو اغوا کیا گیا تھا اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اغوا تم نے اور میرے سالوں نے کیا تھا۔ اگر میں لڑکی کے اس الزام کو جھوٹ سمجھ لوں کہ تم نے اس کی آبرو ریزی کی تھی تو یہ میرے لئے کوئی مسئلہ نہ رہتا۔ مسئلہ یہ ہے کہ تم لوگوں نے اسے اغوا کیوں کیا؟ .... اس کے جسم کے ساتھ کھیلنے کے لئے یا کسی اور مقصد کے لئے؟ امجد اور اختر نے تو اسے اس لئے اغوا کیا تھا کہ وہ میری زندگی سے نکل جائے اور ان کی بہن کی ازدواجی زندگی مضبوط ہو جائے لیکن لڑکی وہاں سے بھاگ آئی۔ مجھے افسوس تم دونوں پر آتا ہے"۔

"یہ معمّہ حل ہو سکتا ہے" ___ میجر سمیع نے کہا ___ "صرف اس صورت میں کہ لڑکی ہمارے درمیان موجود ہو .... لیکن عثمان! تم ہماری بات سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کر رہے۔ ہم بھابی وینا اور تمہارے بچوں کو دیکھتے ہیں اور پھر یہ دیکھتے ہیں کہ تم ایک مشکوک لڑکی کے جال میں پھنسے ہوئے پاگل ہوئے جا رہے ہو تو یوں لگتا ہے جیسے تم ایک سرسبز نخلستان میں جس میں شفاف پانی کا چشمہ ہے، بیٹھے ہوئے تھے اور بیٹھے بٹھائے ایک سراب کے پیچھے چل پڑے۔ ہماری باتوں پر ذرا غور کرو ...."

"میں جاہل تو نہیں سمیع بھائی!" ___ میجر عثمان نے کہا ___ "یہ نصیحتیں اور یہ لیکچر

میں خود دوسروں کو دے سکتا ہوں۔ تم جو کہنا چاہتے ہو وہ میں بڑی اچھی طرح سمجھ سکتا ہوں۔ آج میں تمہیں اپنی ذہنی کیفیت بتانا چاہتا ہوں" ___ عثمان کی آواز دب سی گئی اور اس نے سر جھکا لیا۔ سر اٹھایا تو اس کے دوستوں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تھی۔ اس کے منہ سے سِسکی سی نکلی ___ "میرے پیارے دوستو! میری مدد کرو" ___ اور اس نے پھر سر جھکا لیا۔

"ہوش میں آ یار!" ___ میجر سمیع نے کہا ___ "اپنی اسی حالت کو دیکھو عثمان! تم جیسا مضبوط اعصاب والا اور اتنا انٹیلی جنٹ کس ذہنی حالت تک پہنچ گیا ہے .... صرف ایک غیر عورت کے پیچھے .... اپنی اتنی خوبصورت بیوی اور پھولوں جیسے دو بچوں کو دھتکار کر تم کس پاگل پن میں جا پہنچے ہو۔ اسے کہتے ہیں اصل راستے سے ہٹ کر غلاظت میں اندھے منہ گرنا"۔

"میجر عثمان!" ___ کیپٹن آصف بولا۔

"اوہ شٹ اپ آصف!" ___ عثمان نے آصف کو ڈانٹتے ہوئے کہا ___ "پرائیویٹ محفل میں مجھے میجر نہ کہا کرو جس طرح میں تمہیں کیپٹن نہیں سمجھتا .... پلیز .... فار گاڈ سیک!"

"تھینک یو عثمان!" ___ آصف بولا ___ "آئی ایم ساری .... میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ تمہاری یہ حالت اس لڑکی کے ساتھ صرف عشق و محبت کی وجہ سے نہیں ہوئی۔ تم مانو یا نہ مانو، ہم جانتے ہیں کہ تمہاری اس ذہنی تباہی میں ٹرانکولائزر گولیوں کا ہاتھ زیادہ ہے۔ وہ بدبخت تمہیں دھوکے میں نیند کی یہ گولیاں گھول گھول کر پلاتی رہی اور پھر تم خود بھی ان کے عادی ہو گئے۔ کیا تم یہ بھی نہیں سمجھتے کہ یہ گولیاں ذہنی مریضوں اور پاگلوں کو دی جاتی ہیں یا اُن مریضوں کو دی جاتی ہیں جنہیں کسی وجہ سے نیند نہیں آتی لیکن ڈاکٹر چند دنوں بعد یہ گولیاں بند کر دیتے ہیں"۔

"ہاں یار!" ___ عثمان نے کچھ بے بسی کے عالم میں کہا ___ "میں آج یہ اعتراف بھی کرنا چاہتا ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ میں ان گولیوں کا عادی ہو چکا ہوں۔ اب تو یہ عالم ہے کہ ذرا سی پریشانی ہوتی ہے یا اس لڑکی کا خیال آ جاتا ہے تو میں دو تین گولیاں منہ میں ڈال کر پانی پی لیتا ہوں۔ میں اندر سے بہت کمزور ہو گیا ہوں۔ کبھی تو ایسا لگتا ہے جیسے میں مر ہی گیا ہوں"۔

"جانتے ہو کیوں؟" ___ میجر سمیع نے کہا ___ "اس لئے کہ تم نے اس لڑکی کو اپنے آپ پر آسیب کی طرح سوار کر رکھا ہے' اپنی شخصیت اور اپنا آپ اس کے قدموں میں رکھ دیا ہے اور وہ وہی رول ادا کر رہی ہے جو قلو پطرہ نے جولیس سیزر اور انتھونی کی زندگی میں کیا تھا۔ وہ رومن جنگجو جن کے قدموں تلے زمین کانپتی تھی' ایک عورت کے قدموں تلے آ کر ریت کی ڈھیریاں بن گئے تھے۔ تمہارا حال وہی ہُوا"۔

"بلکہ تم نے اپنا حال وہی کیا" ___ کیپٹن آصف نے کہا ___ "اگر تم صرف یہ محسوس کر لو کہ تم وہ نہیں رہے جو ہُوا کرتے تھے تو تم واپس آ سکتے ہو"۔

"ہاں یار!" ___ عثمان نے شکست خوردہ لہجے میں کہا ___ "میں اپنی اس کمزوری کو تسلیم کرتا ہوں لیکن اس کا جب خیال آتا ہے تو میری تمام قوتیں مفلوج ہو کے رہ جاتی ہیں اور پھر یہ کہتے ہوئے مجھے شرم بھی آتی ہے کہ میں یوں محسوس کرتا ہوں جیسے میں عثمان نہیں' میں لُوسی ہوں"۔

میجر عثمان کے دوست اسے پہلی بار اس کیفیت میں دیکھ رہے تھے کہ وہ اتنی زبان شکست خوردگی کی باتیں کر رہا تھا۔ وہ تعلیم یافتہ تھے' سب کچھ سمجھتے تھے۔ انہوں نے سوچا کہ لوہا گرم ہے اس لئے ابھی ضربیں لگا کر اسے اپنی مطلوبہ شکل میں لایا جائے' چنانچہ انہوں نے اس کی حوصلہ افزائی شروع کر دی اور کچھ اس کے غلط خیالوں کی بھی تائید کرتے گئے۔ وہی عثمان جو اس قسم کی باتوں سے غصے میں آ جاتا تھا' اب بڑے تحمل اور اطمینان سے سن رہا تھا۔ یہاں وہ بات سچ ثابت ہو رہی تھی جو ہمارے مفکر شاعر نے کہی تھی ___ "بات جو دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے!" ___ لیکن یہاں دشواری یہ تھی کہ عثمان کے دوستوں کے دل تو عثمان کے سینے میں دھڑک رہے تھے لیکن عثمان کے دل پر ایک خوبصورت اور عیار لڑکی کا قبضہ تھا۔

"گزشتہ رات عجیب بات ہوئی" ___ عثمان نے کہا ___ "میں چار خواب آور گولیاں کھانے لگا تھا تو وینا نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میرے دل میں وینا کی وہ محبت رہی ہی نہیں جو ہُوا کرتی تھی' پھر بھی میں اس کے سامنے بے بس ہو گیا اور صاف طور پر محسوس کیا کہ میں وینا کا سامنا نہیں کر سکتا۔ میں نے اپنے دل کو یہ سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ وینا محبت کے قابل نہیں اور یہ لُوسی کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں لیکن وینا میرے ذہن اور دل پر ایسی غالب آئی کہ میں نے گولیاں نہ لیں مگر اُس وقت مجھے ان گولیوں کی

شدید ضرورت تھی۔ میرے دل میں آتی تھی کہ وینا کو ڈانٹ ڈپٹ کر کمرے سے نکال دوں لیکن میں اپنے آپ کو اتنا کمزور سمجھ رہا تھا کہ میں پلنگ پر جا گرا اور اس کی منت سماجت کی کہ مجھے ایک دو گولیاں لے لینے دو۔ آخر اس نے مجھے دو گولیاں کھانے کی اجازت دے دی.... ایسا کیوں ہُوا ہے یار؟...."

"کیونکہ تم نے اپنے آپ کو ذہنی طور پر مفلوج کر لیا ہے" ___ کیپٹن آصف نے کہا۔

"میں نے ایسا ہی ایک کیس پہلے بھی دیکھا تھا" ___ میجر سمیع نے کہا ___ "مجھے ڈر ہے تم بھی اُس حد تک نہ پہنچ جاؤ۔ وہ حد یہ ہے کہ ذہن کسی اور وجہ سے اُکھڑا ہُوا ہوتا ہے یا غصہ کسی اور وجہ سے آتا ہے تو یہ بیوی بچوں پر' اپنے ماتحتوں پر' حد یہ کہ اپنے ماں باپ اور بزرگوں پر نکالا جاتا ہے۔ ایسے خاوند اکثر اپنی بیویوں اور بچوں کی پٹائی بھی کرتے رہتے ہیں اور لوگ اصل وجہ سمجھے بغیر یہ کہتے ہیں کہ یہ شخص تو پاگل ہے"۔

"مجھے بھی یہی ڈر ہے سمیع!" ___ عثمان نے کہا ___ "میں اُس حد تک پہنچنے والا ہوں.... لیکن میں اس لڑکی کو ایک بار دیکھنا یا ملنا ضرور چاہتا ہوں"۔

"دیکھ لو' مل لو اسے" ___ سمیع نے کہا ___ "میں نے تمہیں بتا دیا ہے کہ اسے کہاں دیکھا گیا ہے"۔

"لیکن ایک خطرہ ہے عثمان!" ___ کیپٹن آصف نے کہا ___ "تم اسے دیکھ کر پھر اس کے جال میں پھنس جاؤ گے.... وہ تمہیں مل بھی گئی تو کیا کرو گے؟ کیا کہو گے اسے؟"

"وہ تمہیں پھر گمراہ کر دے گی" ___ میجر سمیع نے کہا ___ "پھر ہمارے خلاف زہر اُگلے گی اور تم پھر ہمیں اپنا دشمن سمجھنے لگو گے.... لیکن چاہتا میں بھی یہی ہوں کہ کراچی جاؤ اور اسے دیکھو"۔

عثمان تو جانا ہی چاہتا تھا۔ اس کا مقصد اور ارادہ جو کچھ بھی تھا' اس نے جانے کا ارادہ پکا کر لیا۔ دراصل میجر سمیع اور کیپٹن آصف بھی یہی چاہتے تھے کہ وہ کراچی جائے اور اس لڑکی کو دیکھے۔ ان دونوں کو خطرہ یہ نظر آ رہا تھا کہ عثمان لڑکی کو دیکھتے ہی اس کے جال میں جا پھنسے گا۔ اس خطرے کو کم کرنے کے لئے دونوں نے عثمان کو بڑی اچھی طرح سمجھا دیا اور قائل کر لیا کہ وہ اُسے دیکھتے ہی دوڑ کر اس تک نہ پہنچے بلکہ کسی طرح اپنے آپ کو

چھپا کر ایک دو دن دیکھے کہ وہ کہاں جاتی ہے' کیا کرتی ہے اور اس کے شب و روز کس
طرح گزرتے ہیں۔

○

پاکستان کی جڑوں میں اُترے ہوئے جاسوسوں کی سرگرمیاں بڑی ہی پُراسرار اور
پُرخطر تھیں۔ لُوسی کراچی میں موجود تھی۔ اس کے متعلق پاکستان میں مقیم انڈیا کے سفیر
نے بڑی سختی سے یہ حکم جاری کیا تھا کہ اس لڑکی کو اس جگہ سے دور رکھا جائے جہاں یہ
پہچانی گئی تھی اور اگر خطرہ ہو تو کراچی میں ہی چھپا کر رکھا جائے یا اندرون سندھ بھیج دیا
جائے' اور اگر ضرورت پڑی تو اسے واپس انڈیا بھیج دیا جائے گا۔

لوسی کوئی عجیب و غریب لڑکی نہیں تھی نہ ہی یہ کوئی طلسماتی چیز تھی۔ ایسی نہ جانے
کتنی لڑکیاں ہمارے سامنے ہمارے معاشرے میں گھومتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ سول اور
فوج کے افسر انہیں پھانسنے کے جتن کرتے رہتے ہیں۔ یہ لڑکیاں سرحد پار سے اسی مقصد
کے لئے بھیجی گئی تھیں کہ وہ افسروں کے ہاں پھنس جائیں مگر ظاہر یہ کریں کہ وہ ہائی
کلاس سوسائٹی کے معزز خاندانوں کی لڑکیاں ہیں اور پھنسنے پھنسانے کو اپنے خاندان کی
توہین سمجھتی ہیں۔ انہیں خاص طور پر ٹریننگ دی گئی تھی کہ اپنے مطلب کے افسر کے
لئے خوبصورت اور دلکش سراب بن جاؤ' اس کے آگے آگے چلو' اسے اپنے پیچھے پیچھے
چلاؤ اور جب وہ اپنی سفلی خواہشات کی تپش اور حیوانی جذبات کی تشنگی سے مجبور ہو کر
گرنے لگے تو اس کے سینے سے راز نکال لو اور اسے اپنے حسن و جوانی کے دو گھونٹ پلا
کر اس قابل بنا دو کہ اٹھ کر تمہارے پیچھے چلنے اور لپکنے کے قابل ہو جائے۔

ایسی لڑکیاں سرحد پار سے ہی نہیں آتی تھیں۔ پاکستان میں ایسے میٹھے زہر اور
دلنشیں سراب کی کوئی کمی نہیں تھی۔ راتوں رات امیر بننے کی خواہش نے' شہزادیوں
جیسی زندگی بسر کرنے کی ہوس نے اور ڈسکو طرزِ زیست نے اخلاقیات اور کردار کا گلا
گھونٹ دیا تھا۔ دین و ایمان جل کر راکھ ہو گئے تھے اور یہ لڑکیاں دانستہ یا غیر دانستہ طور پر
انڈیا کے جاسوسی اور تخریب کاری کے گروہوں میں شامل ہو جاتی تھیں۔

لُوسی کراچی میں تھی۔ وہاں کا رِنگ زیادہ مضبوط اور زیادہ محفوظ تھا۔ اس رِنگ کے
پنجے کراچی اور اندرونِ سندھ میں گہرے اُترے ہوئے تھے۔ رِنگ لیڈر کوئی ہندو نہیں
تھا بلکہ وہ اسی علاقے کا رہنے والا خدا بخش نامی ایک ادھیڑ عمر آدمی تھا جس نے اپنا نام

دلیپ کمار مشہور کر رکھا تھا۔ وہ علیحدگی پسند سندھیوں کے لیڈروں میں شمار ہوتا تھا اور
جئے سندھ تحریک کا سرگرم ورکر تھا۔ اندرون سندھ میں وہ خاص طور پر مشہور اور مقبول
تھا۔ دشمن کے جاسوس اور تخریب کار اس علاقے میں کامیاب ہوتے ہیں جس علاقے
کے رہنے والوں میں سے کچھ بااثر لوگ ان کے ساتھ مل جائیں۔

"راؤ!" — لُوسی نے ایک روز اپنے رنگ کے ایک ساتھی راما راؤ سے کہا —
"میں پاکستان کے دو شہروں' لاہور اور اسلام آباد میں رہی ہوں۔ رہی تو میں آزادی سے
ہوں لیکن یہ خوف کبھی کم کبھی زیادہ دل میں موجود رہا کہ میں پکڑی جاؤں گی' حالانکہ میں
دیکھ رہی تھی کہ پاکستان کے بڑے آدمیوں کو عورت کی جھلک چاہئے خواہ وہ عورت ان
کی جانی دشمن ہی کیوں نہ ہو' لیکن کراچی اور سندھ میں آ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے
میں انڈیا میں آ گئی ہوں"۔

"اری بے وقوف!" — راما راؤ نے کہا — "یہ علاقہ ہے ہی انڈیا کا۔ مشرقی
پاکستان تو ہمیں لڑ جھگڑ کر اور زمین دوز کارروائیاں کر کر کے ملا تھا' سندھ کو لینا اتنا مشکل
نہیں ہو گا۔ بھگوان پاکستان کے لیڈروں اور حکمرانوں کی عقل اور آنکھوں پر اسی طرح
پردہ ڈالے رکھے تو ہماری حکومت جب چاہے سندھ پر ہاتھ صاف کر سکتی ہے"۔

"اور کرے گی" — لُوسی نے کہا — "میں کہنا یہ چاہتی تھی کہ میں نے پاکستان
کے صرف شہر اور شہری زندگی دیکھی ہے' دل چاہتا ہے سندھ کا دیہاتی علاقہ دیکھوں۔
ابھی میرا کوئی کام تو ہے نہیں نہ ابھی کوئی ذمہ داری دی گئی ہے۔ یہاں کے کرتا دھرتا تم
ہی ہو۔ مجھے سندھ کی سیر کرا سکتے ہو؟"

"کیوں نہیں" — راما راؤ نے کہا — "یہ تو تمہارا حق ہے .... تم نے ذمہ داری
کی بات کی ہے۔ میں تمہیں ایک مشن پر لگاؤں گا۔ تم جانتی ہو یہاں پاکستان کی نیوی
ہے۔ دو افسر ہمارے ہاتھ آئے ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ پاکستان نیوی کہیں سے نئے
میزائل لے رہی ہے لیکن ابھی یہ کام شروع کرنے میں کچھ وقت لگے گا۔ میں تمہیں
اندرون سندھ گھما پھرا لاؤں گا"۔

"جانتے ہو میں کیا دیکھنا چاہتی ہوں؟" — لُوسی نے کہا اور خود ہی جواب دیا —
"سندھ کے ڈاکو بہت مشہور ہو گئے ہیں۔ میں انہیں یا ان میں سے کسی ایک بڑے گروہ کو
دیکھنا چاہتی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ ان تک پہنچنا آسان نہیں ہو گا۔ اتنے بڑے ڈاکو

سامنے گھومتے پھرتے تو نظر نہیں آتے"۔

"یہ وہ کتابوں اور افسانوں والے ڈاکو نہیں لوسی!" ___ راما راؤ نے اسے بتایا ___ "وہ ڈاکو کبھی کے ختم ہو چکے ہیں جو انگریزوں کے زمانے میں ہوا کرتے تھے۔ یہ جو سندھ میں ڈاکے ڈالتے پھرتے ہیں' کوئی پیشہ ور ڈاکو نہیں' ڈکیتی اور اغوا کا سلسلہ ہم نے یہاں کے سٹوڈنٹس اور دوسرے لوگوں سے شروع کروایا ہے۔ مشرقی پاکستان میں تو ہم نے اسی نوے ہزار کمانڈو داخل کر دیئے تھے جو وہاں کے بنگالیوں میں گھل مل گئے تھے' یہاں ہم نے ڈاکے اور اغوا کا سلسلہ شروع کروادیا ہے۔ جب یہ وارداتیں بڑھنے لگیں اور کوئی پکڑ دھکڑ نہ ہوئی تو کچھ لوگوں نے ڈکیتی کو پیشہ اور شغل بنالیا۔ یہ سب اپنے آدمی ہیں۔ میں تمہیں ان میں سے ایک ایسے آدمی سے ملواؤں گا جو اُن سب کا لیڈر اور پیر و مرشد ہے"۔

"یہ دیکھ لو راؤ!" ___ لوسی نے کہا ___ "میرا وہاں جانا میرے لئے خطرناک تو نہیں!"

"نہیں" ___ راؤ نے جواب دیا ___ "میں تمہیں کسی ڈاکو یا کسی اور آدمی کے پاس اکیلا چھوڑ آؤں' وہ آدمی خواہ کتنا ہی بڑا اور کتنی ہی بڑی حیثیت کا کیوں نہ ہو' میں صرف یہ کہہ دوں کہ اس لڑکی کا خیال رکھنا' انڈیا کی ہے اور یہ ہماری لڑکی ہے تو وہ آدمی تمہیں مذہبی کتاب کی طرح سنبھال کر رکھے گا۔ دوسری طرف ان لوگوں کا یہ حال ہے کہ اپنے ہی کسی رشتہ دار کی بیٹی کو اغوا کر کے اس کے ماں باپ کو اطلاع بھجوائیں گے کہ اتنے لاکھ روپیہ دو اور بیٹی کو چھڑوا لو۔ لڑکی کو جو خراب کریں گے وہ الگ معاوضہ ہو گا.... ہاں لوسی! ایک بات ذہن میں آگئی ہے۔ کہنے کی ضرورت تو نہیں۔ تم سب کچھ سمجھتی ہو۔ اپنے آپ کو سنبھال کر رکھنا"۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"میرا مطلب تمہارے جسم سے ہے" ___ راما راؤ نے کہا ___ "اپنے جسم کے استعمال میں محتاط رہنا"۔

"اوہ راؤ!" ___ لوسی نے طنزیہ سی ہنسی ہنس کر کہا ___ "اس احتیاط کی تو مجھے اتنی پریکٹس ہو گئی ہے کہ آدمی کو اپنی مٹھی میں لے لیتی ہوں اور اسے یہ تاثر دیتی ہوں کہ اُس نے مجھے مٹھی میں لے لیا ہے اور جب وہ مکمل طور پر حیوان بن کر مجھ پر لپکتا ہے تو

بڑی خوبی اور کامیابی سے اسے کل کے وعدے پر راضی کر لیتی ہوں۔ اگر میں یہ احتیاط نہ کرتی تو پاکستان کے یہ افسر اور لیڈر مجھے اس وقت تک ٹی بی کا مریض بنا چکے ہوتے۔ لاہور میں میرا آخری شکار پاک آرمی کا ایک میجر تھا۔ اس کی جسمانی ہوس پوری کئے بغیر میں نے اسے صحیح معنوں میں پاگل بنا دیا ہے' اور اسے جس طرح میں نے دونوں ہاتھوں سے لوٹا ہے وہ تم تصور میں بھی نہیں لا سکتے۔ وہ میری ہر فرمائش پوری کرنے میں فخر اور دلی سکون محسوس کرتا تھا۔ بدبخت کے پاس پیسے کی بھی کمی نہیں تھی۔ میں اسے ایک سو روپے کا تحفہ دے کر اس کے جواب میں ایک ہزار روپے کا تحفہ لے لیا کرتی تھی۔ اس نے جو کپڑے مجھے دیئے ہیں وہ تو کوئی شہزادی ہی پہنتی ہو گی"۔

"یہ استادوں کی ٹریننگ کا کمال ہے" ___ راما راؤ نے کہا ___ "ورنہ تمہاری عمر کی لڑکی جذبات میں آکر خراب ہو ہی جاتی ہے"۔

"استادوں کا کمال تو ہے" ___ لوسی نے کہا ___ "لیکن میں نے یہ ٹریننگ ایک پاکستانی عورت سے حاصل کی ہے۔ اس کے ساتھ ایک فنکشن میں ملاقات ہوئی تھی۔ اس کی عمر چالیس سال کے قریب ہے لیکن کمبخت بیس سال کی لگتی ہے۔ ایسی استاد عورت ہے کہ ایک آدمی کو پھنسائے رکھتی ہے۔ اس نے مجھے صاف الفاظ میں بتایا تھا کہ وہ جسے پھانستی ہے' اس کی ایک دو نفسیاتی کمزوریاں بھانپ لیتی ہے پھر ان کمزوریوں کو اپنی مٹھی میں لے لیتی ہے اور پھر باتوں اور ایکٹنگ سے اس کی ان کمزوریوں کو محرومیوں کا رنگ دے کر اس کی تسکین کرتی رہتی ہے۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ وہ باتوں سے اپنے شکار کو ہپناٹائز کر لیتی ہے' اپنے جسم کو بچا کر رکھتی ہے' پیار و محبت میں کوئی کسر نہیں چھوڑتی لیکن اس سے آگے بات بڑھنے بھی نہیں دیتی اور اپنے شکار کا وہی حال کر دیتی ہے جو جالے میں آئی ہوئی مکھی کا مکڑی کرتی ہے....

"اس نے اپنے خاوند کو بھی انگلیوں پر نچا رکھا ہے۔ میرے ساتھ اس کی دوستی بڑی گہری ہو گئی۔ میری استادی دیکھ کہ میں نے اسے شک تک نہیں ہونے دیا کہ میری اصلیت کیا ہے۔ کردار اور اخلاق کے لحاظ سے وہ اونچے درجے کی طوائف کی مانند ہے یعنی ایسی طوائف جو صرف دو تین مستقل گاہک بنا کر رکھتی ہے۔ میں نے اُس سے کام کے گر سیکھے تھے.... یہ عورت دراصل ہمارے کام کی ہے لیکن میں نے اس سے بچ کر رہنا ہی بہتر سمجھا کیونکہ اس قسم کی عورتیں ڈبل کراس شروع کر دیتی ہیں۔ اس عورت

کی شہرت یہ ہے کہ کئی گھر اور کئی لوگوں کے کاروبار تباہ کر چکی ہے لیکن کیا کمال ہے اس عورت کا کہ جو اس کی اس ہسٹری سے واقف ہیں وہ بھی اس کے جال میں آ جاتے ہیں"۔

پاکستان اور پاکستانیوں کی کمزوریوں اور دکھتی رگوں پر کچھ دیر تبادلۂ خیالات کر کے راما راؤ نے لُوسی کے ساتھ اندرون سندھ کی سیر کا پروگرام طے کیا۔



جاسوسی یا جاسوسوں کی دنیا میں ایک ڈرامہ لاہور کی ایک کوٹھی میں کھیلا جا رہا تھا جس کا تعلق صغیر کے ساتھ تھا۔ صغیر کی برین واشنگ نشہ آور دوائیوں اور ایک بڑی خوبصورت شوخ اور اداکار قسم کی لڑکی کے ذریعے کی جا رہی تھی اور یہ برین واشنگ ہو چکی تھی۔ صغیر ابھی زیرِ نگرانی تھا۔

"اب نگرانی کی بھی ضرورت نہیں" ــــ ایک روز مُنی نے سریش کو رپورٹ دی ــــ "تم خود دیکھ لو' میرا خیال تو یہ ہے کہ اسے کھلا چھوڑ دیا جائے تو گھوم پھر کر یہیں آ جائے گا"۔

"تمہیں زیادہ پریشان تو نہیں کرتا؟" ــــ سریش نے پوچھا۔

"میری پریشانی کی بات کرتے ہو!" ــــ منی نے ہنستے ہوئے کہا ــــ "یہ تو میرا جادو ہے کہ میں ابھی تک اس سے بچی ہوئی ہوں ورنہ اس کا حال یہ ہو جاتا ہے جیسے مجھے کچا کھا لے گا۔ میں نے اس پر سچے عشق کا ایسا بھوت سوار کر رکھا ہے کہ میں اپنے جسم کو بچالیتی ہوں۔ کبھی کبھی خطرہ سا نظر آتا ہے کہ اس نے مجھے کبھی دبوچ لیا تو میں اس سے بچ نہیں سکوں گی۔ ویسے اس بندے کو اپنا ہی بندہ سمجھو"۔

"تم فکر نہ کرو" ــــ سریش نے کہا ــــ "میں نے تمہیں بتانا ہی تھا کہ اس کے متعلق گزشتہ رات فیصلہ ہو چکا ہے کہ اسے انڈیا لے جانا ہے لیکن ایک مشکل پیش آ رہی ہے۔ پاکستان کی انٹیلی جنس کچھ زیادہ ہی چوکنی ہو گئی ہے۔ انہی دنوں ہمارے ایک رنگ کے دو آدمی گرفتار ہو گئے ہیں۔ ریل گاڑی سے جانا ذرا خطرے والی بات ہو گئی ہے۔ پاکستان کے سنٹرل انٹیلی جنس بیورو اور آئی ایس آئی کے آدمی ریلوے سٹیشنوں پر موجود رہتے ہیں اور چیکنگ بڑی سخت ہو گئی ہے"۔

"تو کچھ دن انتظار کیا جا سکتا ہے" ــــ مُنی نے کہا۔

"نہیں" ــــ سریش نے کہا ــــ "اس شخص کے لئے انتظار مناسب نہیں۔ اس کی ذہنی حالت ایسی ہے کہ اسے فوراً سرحد پار بھیجنا ہے"۔

"کیا یہ آدمی اتنا زیادہ اہم ہے؟" ــــ منی نے پوچھا۔

"اہم ہے یا نہیں" ــــ سریش نے کہا ــــ "یہ اوپر والوں کا فیصلہ ہے۔ میں اتنا جانتا ہوں کہ یہ شخص ہے بڑے کام کا۔ شاید اس لئے ہمارا چیف اسے ضائع نہیں کرنا چاہتا"۔



جس وقت یہ دونوں آپس میں صغیر کے متعلق باتیں کر رہے تھے اُس وقت صغیر دو کمرے چھوڑ کر ایک کمرے میں گہری نیند سویا ہُوا تھا۔ دن کا پچھلا پہر تھا۔ اچانک صغیر کی بڑی بلند آواز سنائی دی۔ وہ مُنی کو بلا رہا تھا۔

"اسے جلدی یہاں سے لے جاؤ سریش!" ــــ مُنی نے اُکتائے ہوئے سے لہجے میں کہا ــــ "اس نے میری تو جان کھالی ہے"۔

"تنخواہ کس کام کی لیتی ہو؟" ــــ سریش نے ہنستے ہوئے کہا ــــ "اور جو عیش موج کرتی ہو.... یہی تو تمہارا کام ہے۔ جاؤ اور اپنے شکار کے ساتھ کھیلو"۔

تپائی پر شراب کی بوتل رکھی تھی۔ مُنی نے دو پیگ گلاس میں ڈالے اور اپنے حلق میں انڈیل لئے۔ اس نے بھی آخر اپنے اعصاب کو مضبوط رکھنا تھا۔ صغیر جیسے شکار کے ساتھ کھیلنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ مُنی صغیر کے کمرے میں چلی گئی۔

"کہاں مر جاتی ہو؟" ــــ صغیر نے رُوٹھے ہوئے بچے کے لہجے میں کہا۔

"تم سو گئے تھے" ــــ مُنی نے اس کے پاس بیٹھ کر اور اس کے گلے میں بازو ڈال کر اور پھر اپنا گال اس کے گال سے لگا کر کہا ــــ "میں تمہیں چھوڑ کر بھلا کہاں جا سکتی ہوں"۔

سچے عشق کی اداکاری شروع ہو گئی۔ ایک طرف اداکاری تھی اور دوسری طرف نشہ آور دوائیوں کے خمار میں جھومتی جھامتی ہوئی ایک حقیقت تھی۔ مُنی اداکاری تو بڑی کامیابی سے کر رہی تھی لیکن اس کے دل میں وہ تنخواہ اور عیش و عشرت تھی جو اس اداکاری کے عوض اسے یہاں مل جاتی تھی اور اس کا کچھ حصہ معاہدے کے مطابق انڈیا میں اس کے ماں باپ کو مل جاتا تھا۔

"تم شاید پی کر آئی ہو" ــــ صغیر نے اُس کی سانسیں سونگھ کر کہا۔

"تم بھی پیو گے؟" ــــ مُنی نے بڑے پیار سے پوچھا۔

"تم نے پی ہے تو میں کیوں نہ پیوں" ــــ صغیر نے کہا ــــ "تمہارے ہاتھ سے تو میں زہر کا پیالہ بھی پی لوں گا"۔

مُنی اس کے ہونٹ چُوم کر ہنستی ہوئی باہر نکل گئی۔ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک گلاس تھا جس میں شراب کے دو پیگ اور کچھ سوڈا تھا اور اس میں تھوڑی سی آمیزش ایک نشہ آور دوائی کی تھی۔ صغیر نے اس کے ہاتھ سے گلاس لیا اور ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا۔

"میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ تمہیں انڈیا کی سیر کراؤں گی" ــــ مُنی نے کہا ــــ "میں نے انتظام کر لیا ہے"۔

"کب چلیں گے؟" ــــ صغیر نے بے تابی سے پوچھا ــــ "آگرہ کا تاج محل دکھاؤ گی نا؟.... اور قطب مینار تو میں ضرور دیکھوں گا"۔

"سیر کرانے کے لئے ہی تو تمہیں لے جا رہے ہیں" ــــ مُنی نے کہا ــــ "وہاں تمہیں تاج محل اور قطب مینار کے علاوہ ایسی ایسی جگہیں اور چیزیں دکھائیں گے کہ تم حیران رہ جاؤ گے اور واپس آنا ہی نہیں چاہو گے"۔

"دیکھو مُنی!" ــــ صغیر نے بچوں کے سے لہجے میں کہا ــــ "میں واپس آنے کے لئے نہیں جاؤں گا۔ پاکستان میں رکھا ہی کیا ہے۔ اس ملک کا تو میں بیڑہ ہی غرق کر دوں گا"۔

مُنی اس کے لب و لہجے اور انداز سے اندازہ کر رہی تھی کہ نشہ آور دوائی کا اثر شروع ہُوا ہے یا نہیں۔ یہ اثر شروع ہو چکا تھا بلکہ صغیر کے دماغ کو تقریباً پوری طرح اپنے قبضے میں لے چکا تھا۔ مُنی نے اسے انڈیا کی خوبیاں اور پاکستان کی خرابیاں سنانی شروع کر دیں۔

یہ تو روز مرّہ کا معمول بن گیا تھا۔ صغیر کو تو معلوم ہی نہیں تھا کہ اسے نشہ آور دوائیاں دی جا رہی ہیں۔ وہ اپنے آپ میں نشے کی جو کیفیت محسوس کرتا تھا اسے وہ مُنی کے عشق کا خمار اور سرور سمجھتا تھا۔ اس ذہنی کیفیت میں مُنی یا سریش جو باتیں اس کے ذہن میں ڈالنا چاہتے تھے وہ بغیر کسی کاوش اور بغیر استدلال کے اُس کے ذہن میں اُتر جاتی

تھیں اور پھر وہ انہیں ذہنی طور پر قبول کر لیتا تھا۔ اُس روز بھی مُنی نے یہی عمل دہرایا اور صغیر اُٹھ کر بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ وہ بار بار کہتا تھا کہ وہ فوراً انڈیا پہنچنا چاہتا ہے۔

"لیکن ایک مشکل آ پڑی ہے صغیر!" ــــ مُنی نے کہا ــــ "ہم ریل گاڑی سے نہیں جا سکیں گے۔ ریلوے سٹیشن پر چیکنگ بڑی سخت ہو گئی ہے۔ اس مشکل کو تم اچھی طرح سمجھتے ہو۔ شاید ہمیں رات کے وقت سرحد پار کرنی پڑے گی .... کر لو گے؟"

"تم سرحد کی بات کرتی ہو؟" ــــ صغیر نے مخمور سی آواز میں کہا ــــ "میں آگ میں سے بھی گزر جاؤں گا۔ تمہیں شاید معلوم نہیں کہ ایک بار سرحد پار کر چکا ہوں"۔

"پھر انڈیا میں کہاں تک گئے تھے؟"

"یہی تو افسوس ہے" ــــ صغیر نے کہا ــــ "جالندھر تک گئے۔ تین چار روز رہے پھر انہوں نے واپس بھیج دیا۔ میں تو جالندھر کے سوا انڈیا کا کچھ بھی نہیں دیکھ سکا تھا۔ میرے لئے سرحد پار کرنا کوئی مشکل کام نہیں .... تم ساتھ ہو گی؟.... تمہیں ساتھ نہیں ہونا چاہئے۔ لڑکی کے لئے اس طرح سرحد پار کرنا بڑا ہی خطرناک ہے"۔

"میں تو گاڑی سے جاؤں گی" ــــ مُنی نے جھوٹ بولا ــــ "میرے لئے کوئی مسئلہ نہیں۔ ہو سکتا ہے میں تم سے پہلے دِلّی پہنچ جاؤں"۔

مُنی اس کے پاس بیٹھی رہی۔ عشق و محبت کا کھیل چلتا رہا اور رات آ گئی۔



مُنی جیسی ہی ایک خوبصورت ناگن کا ڈسا ہُوا میجر عثمان بڑی تکلیف دہ ذہنی کیفیت میں مبتلا تھا۔ وہ تو یوں سمجھئے کہ حُسن و جوانی اور ریاکاری کی تلوار نے اس کے وجود کو اوپر سے نیچے تک دو حصوں میں کاٹ دیا تھا۔ اس کے دونوں حصے زندہ تھے۔ زندہ ہی نہیں بیدار بھی تھے اور دونوں حصے الگ الگ ہو کر پہلے سے زیادہ سرگرم ہو گئے تھے۔

"اب تو مجھے بھی شک ہونے لگا ہے کہ لوسی اصل میں کچھ اور ہے"۔

"میں لوسی کے بغیر شاید زندہ نہ رہ سکوں۔ وہ نہیں تو میں بھی نہیں"۔

"میرے دوست کم از کم میرے ساتھ جھوٹ نہیں بول سکتے"۔

"دوست بھی آخر مجھ جیسے فوجی ہیں۔ لُوسی اس طرح ہاتھ نہ آئی تو اغوا کر کے اُس کی آبروریزی کر لی"۔

"وینا خوبصورت بھی ہے زندہ مزاج بھی۔ کیا خامی ہے اس میں؟ اور اتنے پیارے بچے؟"

"وینا میں وہ بات کہاں جو لُوسی میں ہے۔ بچے تو ابھی ہونے ہی نہیں چاہئیں تھے"۔

"میں لُوسی پر لعنت بھیجتا ہوں"۔

"لعنت ان سب پر جو میرے اور لُوسی کے درمیان آنا چاہتے ہیں"۔

"میں اسے دیکھنے کراچی جاؤں گا۔ کسی کے ساتھ دیکھی تو اس کا گلا گھونٹ دوں گا"۔

"لُوسی کو کسی اور کے ساتھ دیکھا تو اسے زبردستی اٹھا کر لے آؤں گا خواہ وینا کو طلاق دینی پڑے"۔

"لُوسی کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دوں گا..... بھول جاؤں گا"۔

"میں اسے کیسے چھوڑ دوں' وہی تو میری زندگی ہے"۔

اور ایسے ہی متضاد خیالات' سوچیں اور ارادے تھے جو بجلی کی نیگیٹو اور پازیٹو کرنٹ کی طرح ایک دوسرے سے ٹکراتے تھے تو میجر عثمان کی ذات میں شعلے چمکتے اور دھماکے ہوتے۔ اس کیفیت میں وہ گھر سے بھاگ جانے کی بھی سوچ لیتا اور ملٹری سروس سے بھی بیزار ہو جاتا۔ اسے اپنا رینک اور سوشل پوزیشن محض بیکار چیزیں نظر آتیں۔ اسے غصہ بھی آ جاتا جو وہ وینا اور بچوں پر نکال تو لیتا لیکن اب اس میں یہ تبدیلی آ گئی تھی کہ اپنے بیوی بچوں پر غصہ نکال کر پچھتاتا تھا اور یہ اس کے لئے ایک اور روحانی اذیت بن گئی تھی۔

وینا نے اس میں معمولی سی یہ تبدیلی بھی دیکھی کہ اب وہ اس کے ساتھ ذرا اچھی طرح بولتا تھا اور کبھی بچوں کی بات بھی سن لیتا تھا' پھر بھی وہ جب لوسی کو اپنے دماغ پر سوار کر لیتا تو بیوی بچے اس کے لئے اجنبی بن جاتے تھے۔

اس دوران دوست اسے اکساتے رہے کہ وہ کراچی جائے اور جلدی جائے۔ دوستوں کو یہ خطرہ بھی نظر آ رہا تھا کہ کراچی اگر لُوسی اسے مل گئی تو وہ پھر اسے اپنے طلسم میں گرفتار کر لے گی لیکن اس کے ساتھ ہی وہ سوچتے تھے کہ لُوسی کو اب عثمان کے ساتھ دلچسپی نہیں رہی اور وہ عثمان کو دھتکار دے گی۔ بہرحال میجر سمیع اور کیپٹن آصف نے یہ خطرہ مول لے لیا اور عثمان کو کراچی جانے پر آمادہ بلکہ تیار کر لیا۔

"وینا!" —— ایک روز میجر عثمان گھر آیا اور وینا سے کہا —— "میں کل صبح کراچی جا رہا ہوں"۔

"ڈیوٹی پر؟"

"ہاں" —— عثمان نے جوبا دیا —— "ڈیوٹی پر ہی جا سکتا ہوں"۔

"کتنے دن؟"

"نو دس دن تو لگ جائیں گے" —— عثمان نے جواب دیا۔

وینا کے دل پر بڑی زور کی چوٹ پڑی۔ اسے معلوم تھا لُوسی کراچی پہنچ گئی ہے۔ عثمان سے تو وہ پوچھ نہیں سکتی تھی کہ وہ لُوسی کے لئے جا رہا ہے یا واقعی ڈیوٹی پر۔ اسے یہ ڈر بھی محسوس ہُوا کہ لُوسی نے عثمان کو فون کیا ہو گا اور اسی ڈائن نے اسے کہا ہو گا کہ کراچی آؤ۔ وینا بجھ کے رہ گئی۔

شام کو عثمان باہر نکل گیا تو وینا نے میجر سمیع سے بات کرنے کے لئے اس کی یونٹ کے آفیسرز مَیس میں فون کیا۔ میجر سمیع کو کمرے میں اطلاع ملی تو وہ دوڑتا ہُوا فون پر پہنچا۔

"بھائی جان" —— وینا نے میجر سمیع سے کہا —— "اس چڑیل نے تو ہمیں کراچی پہنچ کر بھی نہیں بخشا۔ عثمان کراچی جا رہا ہے اور کہتا ہے کہ ڈیوٹی پر جا رہا ہوں۔ مجھے عثمان کی کسی بات پر یقین نہیں آتا۔ آپ نے بھی دیکھا ہے کہ وہ کس قدر جھوٹ بولتا ہے... کیا آپ اس کے آفس سے معلوم کروا سکتے ہیں کہ وہ واقعی ڈیوٹی پر جا رہا ہے؟"

"میں نے آپ سے بات کرنی تھی بھابی!" —— میجر سمیع نے کہا —— "آپ اتنا زیادہ پریشان نہ ہوں۔ میں اور کیپٹن آصف خود عثمان کو کراچی بھیج رہے ہیں۔ امجد صاحب اور اختر صاحب کو بھی معلوم ہے۔ یہ تو آپ جانتی ہیں کہ لُوسی کو امجد صاحب نے کراچی میں کسی کے ساتھ دیکھا تھا۔ میں آپ کو پہلے بتا دیتا لیکن آپ کے ساتھ علیحدگی میں بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ ہم نے عثمان سے کہا ہے کہ خود کراچی جا کر اس ایڈریس پر لُوسی کو دور کھڑے ہو کر اور چھپ کر دیکھے۔ آپ کے ساتھ عثمان نے صرف اتنا سا جھُوٹ بولا ہے کہ وہ ڈیوٹی پر جا رہا ہے دراصل وہ دس دنوں کی چھٹی پر جا رہا ہے"۔

"وہ شیطان عورت عثمان کو پھر اپنی لپیٹ میں لے لے گی" —— وینا نے کہا۔

"ہم نے یہ خطرہ مول لیا ہے" —— میجر سمیع نے کہا —— "آپ اللہ کے حضور دعا کریں۔ یہ کیس ایسا ہے جو دعاؤں سے ہی ٹھیک ہو سکتا ہے۔ بہرحال عثمان کا کراچی جانا اور لُوسی کو دیکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے"۔

"میں بھی ساتھ نہ چلی جاؤں؟"

"ہاں' کیوں نہیں" —— میجر سمیع نے کہا —— "اسے یہ نہ پتہ چلے کہ آپ کو معلوم ہو گیا ہے کہ وہ ڈیوٹی پر نہیں بلکہ چھٹی پر جا رہا ہے۔ اب یہ آپ کا کمال ہے کہ اسے منوا لیں کہ وہ آپ کو ساتھ لے جائے"۔

"آپ نے تو بھائی جان' میرے دل سے بوجھ اٹھا دیا ہے" —— وینا نے کہا —— "میں تو ڈر گئی تھی کہ اب عثمان آئے دن کراچی ہی جاتا رہے گا"۔

"مجھے امید ہے کہ اللہ جو کرے گا بہتر ہی ہو گا" —— سمیع نے کہا —— "ہم بھی یہیں ہیں۔ کوئی ناگوار صورتِ حال پیدا ہو گئی تو سنبھالنے کی کوشش کریں گے"۔

رات کو عثمان گھر واپس آیا تو وینا نے کچھ زیادہ ہی پیار سے اس کا استقبال کیا اور عملی طور پر پہلے سے کہیں زیادہ وفاداری کا مظاہرہ کیا۔

"نیند نہ آئے تو دو تین گولیاں کھا لینا عثمان!" —— وینا نے ماؤں جیسے پیار سے کہا۔

"نہیں" —— عثمان نے لاپرواہی کے انداز میں کہا —— "میں ان گولیوں کی عادت توڑنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ شاید آج رات ایک بھی گولی نہ لوں"۔

"ایسے نہیں" —— وینا نے کہا —— "عادت توڑنی ہے تو آہستہ آہستہ توڑیں۔ یکلخت چھوڑنا ٹھیک نہیں۔ آج میں آپ کو اپنے ہاتھ سے دو گولیاں دوں گی"۔

میجر عثمان نے چونک کر وینا کی طرف دیکھا۔ وینا کے رویے میں یہ تبدیلی اس کے لئے حیران کن تھی۔ وینا نے عثمان کی میز کی دراز سے گولیوں کا پتہ نکالا اور دو گولیاں اس کے ہاتھ میں دے کر پانی لینے چلی گئی۔ عثمان اسے جاتے بڑی غور سے دیکھتا رہا اور جب وینا واپس آئی تو عثمان کی نظریں ابھی تک دروازے پر لگی ہوئی تھیں اور وینا کو دیکھنے لگیں۔ عثمان نے گولیاں نگل لیں اور پانی پی لیا۔

"ایک بات مانو گے عثمان؟"

"میں جانتا ہوں تم مجھ سے کون سی بات منوانا چاہتی ہو" —— عثمان نے قدرے شگفتہ لہجے میں کہا —— "یہی کہو گی ناکہ لُوسی کا خیال دل سے نکال دو"۔

"نہیں میرے یار!" —— وینا نے بڑی بے تکلفی سے اس کے پاس بیٹھتے اور بازو اس کے گلے میں ڈالتے ہوئے کہا —— "تم تو ڈیوٹی پر جا رہے ہو' مجھے بھی ساتھ لے چلو۔ خدا کی قسم باہر نکلے ایک زمانہ ہو گیا ہے۔ ایک بات تو مان لو"۔

وینا نے کچھ ایسی پیاری اور جذباتی سی حرکتیں کیں کہ عثمان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

"چلی چلو" —— عثمان نے کہا —— "میں تو ڈیوٹی پر رہا کروں گا تم بچوں کے ساتھ ہوٹل میں رہ لینا"۔

"تمہاری دونوں وَردیاں تیار کر لوں؟" —— وینا نے پوچھا۔

"نہیں" —— عثمان نے کہا —— "وردی کی ضرورت نہیں۔ یہ ڈیوٹی ایسی ہے کہ سول کپڑوں میں رہنا پڑے گا .... ایک بات کہوں وینا!"

"ایک نہیں سو باتیں کہو" —— وینا نے اس کے گرد اپنے بازوؤں کا گھیرا اور زیادہ تنگ کرتے ہوئے کہا۔

"تم اگر لُوسی سے بڑھ کر نہیں تو اس جتنی چالاک ضرور ہو" —— عثمان نے مسکراتے ہوئے کہا —— "تم نے ایسے طریقے سے اپنی خواہش ظاہر کی ہے کہ میں انکار نہیں کر سکا"۔

"چالاکی نہیں عثمان!" —— وینا نے کہا —— "اسے محبت کہو"۔

"معلوم ہوتا ہے میرے لئے محبت مر گئی ہے" —— عثمان نے آہستہ سے کہا۔

"محبت نہیں مری عثمان!" —— وینا نے کہا —— "تمہاری وہ نظر مر گئی ہے جس نظر سے تم نے پہلی رات مجھے دیکھا تھا۔ محبت کرنے والوں میں کوئی ایک مر جائے تو اسے دفن کر دیتے ہیں لیکن محبت زندہ رہتی ہے .... میں وعدہ کرتی ہوں عثمان! میں کبھی نہیں کہوں گی کہ لُوسی کو بھول جاؤ۔ نہ بھولو۔ اسے دل میں رکھو۔ میں صرف یہ کہتی ہوں کہ مجھے اور اپنے بچوں کو نہ بھول جانا۔ ایک دن آئے گا کہ تم پچھتے ہوئے میرے پاس آؤ گے"۔

"اور تم مجھے طعنہ دو گی کہ کہاں ہے تمہاری وہ" —— عثمان نے کہا —— "اور ایسے ہی طعنے دو گی"۔

"میں ایسی اوچھی نہیں عثمان!" —— وینا نے کہا —— "میرے دل میں تمہاری محبت

نہ ہوتی تو آج میں یہاں نہ ہوتی۔ تمہاری محبت پر میں نے اپنی خودداری کو اور خاندانی وقار کو قربان کر دیا ہے۔ میری عقل حاضر ہے۔ میں جانتی ہوں کہ طعنوں اور کوسنوں سے کبھی کوئی کسی کا نہیں بنا۔ دل میں سچی محبت اور خلوص ہو تو یہ دل اپنے محبوب کو مقناطیس کی طرح کھینچ لیتا ہے"۔

عثمان اپنے آپ میں وہ کمزوری محسوس کرنے لگا جس کا ذکر اس نے میجر سمیع اور کیپٹن آصف کے ساتھ بھی کیا تھا۔ اس میں کھری بات کا اور کسی سچے انسان کا سامنا کرنے کا حوصلہ رہا ہی نہیں تھا۔ لُوسی نے اسے بڑے خوبصورت خواب دکھا کر اور خود ایک خوبصورت خواب بن کر اس کی شخصیت اور اس کی اخلاقی جرأت کو کچل اور مسل ڈالا تھا۔ اسے سوچنے کے قابل ہی نہیں چھوڑا تھا۔ لوسی نے یہ اس لئے کیا تھا کہ اس کے کام اسی صورت میں نکل سکتے تھے کہ عثمان آزادانہ طور پر کچھ سوچنے کے قابل نہ رہے۔ بات بڑی صاف تھی کہ لُوسی جاسوس تھی اور اس نے عثمان سے راز لینے تھے اور اس کا دوسرا مقصد عیش و عشرت سے تھا جو عثمان اسے حد سے زیادہ کراتا تھا۔ وہ عثمان سے تحفوں اور اعلیٰ درجے کے ہوٹلوں میں کھانے کے علاوہ کیش بھی وصول کرلیتی تھی۔

عثمان اپنی بیوی بچوں کے لئے شیر بنا ہُوا تھا لیکن وینا نے جب جذباتی باتیں کیں یا یوں کہئے کہ وینا کے دل سے جب سچے عشق و محبت کی باتیں نکلیں تو عثمان مجبور اور بے بس ہو گیا۔ اس کمزوری نے اسے پریشان سا کر دیا۔ وینا نے اسے جو دو خواب آور گولیاں کھلائی تھیں ان کا اثر بھی شروع ہو گیا تھا۔ وہ جمائیاں لینے لگا تو وینا نے اُسے یوں سلا دیا جیسے ماں بچے کو سلا دیتی ہے۔

○

اگلا دن کراچی جانے کی تیاریوں میں گزر گیا۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ اپنی گاڑی پر کراچی جائیں گے۔ وینا نے اسے کہا کہ سندھ کے علاقے میں سے گزرنا خطرناک ہو سکتا ہے۔ اکثر خبریں آتی ہیں کہ ڈاکوؤں نے ایک کار کو روک لیا اور لُوٹ کر غائب ہو گئے۔

"کوئی ڈاکو ایسی جرأت نہیں کر سکتا" ـــــ عثمان نے کہا ـــــ "میں اپنا ریوالور ساتھ لے جا رہا ہوں۔ دو نالی بندوق بھی لے چلتے ہیں۔ ضرورت پڑی تو میں ریوالور فائر کروں گا اور تم بندوق چلانا۔ چلے ہوئے کارتوس نکال کر دونوں بیرلوں کو پھر لوڈ کرنا جانتی

ہو۔ دو تین بار تم میرے ساتھ شکار پر جا چکی ہو"۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے" ـــــ وینا نے کہا۔

اگلی صبح ابھی تاریک ہی تھی جب ان کی گاڑی گیراج سے نکلی اور پھر لاہور شہر سے نکل گئی۔

وہ ملتان میں داخل ہو ہی رہے تھے کہ انجن میں کسی گڑبڑ کی وجہ سے گاڑی رک گئی۔ یہ بھی اچھا ہُوا کہ وہ شہر میں داخل ہو چکے تھے ورنہ کہیں جنگل میں خوار ہوتے رہتے۔ عثمان نے ایک تانگہ پکڑا اور جا کر مکینک کو لے آیا۔ کم و بیش اڑھائی گھنٹے گاڑی نے ضائع کر دیئے۔ فائدہ یہ ہُوا کہ خطرناک نقص یہیں ٹھیک ہو گیا۔ انہوں نے دوپہر کا کھانا ملتان میں کھایا اور چل پڑے۔

بہاولپور پہنچے تو اچھی خاصی شام ہو گئی۔ اس سے آگے رات کا سفر خطرے سے خالی نہ تھا۔ انہوں نے بہاولپور کے ایک ہوٹل میں قیام کیا۔ رات گزری اور علی الصبح پھر روانہ ہو گئے۔

○

گاڑی سندھ کے وسط تک پہنچی تو دور دور تک کسی اور گاڑی کا نام و نشان نہیں ملتا تھا۔ کوئی اکا دُکا ٹریکٹر ٹرالی نظر آتی تھی جو گرد اُڑاتی قریب سے گزر جاتی تھی۔ کاروں والے کراچی سے پشاور تک شوقیہ کاروں پر سفر کیا کرتے تھے لیکن اب وہ بات نہیں رہی تھی۔ سندھ ڈاکے اور اغوا کی وارداتوں کا صوبہ بن گیا تھا۔ آئے دن خبریں ملتی تھیں کہ گاڑی روک لی گئی، لُوٹی گئی یا گاڑی والوں کو اغوا کر لیا گیا۔

عثمان نے ریوالور لوڈ کر کے اپنے سامنے ڈیش بورڈ پر رکھ لیا۔ وینا نے بندوق کی دونوں نالیوں میں کارتوس ڈال لئے اور بندوق اپنے گھٹنوں کے درمیان کھڑی کر لی۔

اب گاڑی اُس علاقے میں جا رہی تھی جہاں دونوں طرف درختوں کے جنگلات تھے۔ گاڑی ایک موڑ سے مُڑی تو کم و بیش ایک سو گز دور تین آدمی سڑک کے کنارے کھڑے تھے۔ انہوں نے عثمان کی گاڑی کی طرف دیکھا اور تینوں ادھر منہ کر کے سڑک کے درمیان آ گئے۔

ایک آدمی کے کندھے کے ساتھ کلاشنکوف لٹک رہی تھی۔ دوسرے نے رائفل لاٹھی کی طرح ہاتھ میں لے رکھی تھی اور تیسرے کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ ان تینوں

ہتھیاروں میں سے کسی ایک کی بھی نالی گاڑی کی طرف نہیں تھی۔ گاڑی اپنی رفتار پر چلی جارہی تھی۔

درمیان والے آدمی نے ہاتھ اوپر کر کے رکنے کا اشارہ کیا۔

"ہوشیار ہو جاؤ وینا!" ___ عثمان نے وینا سے کہا ___ "بندوق باہر نکال کر اندھا دھند فائر کردو۔ پہلے ایک پھر دوسرا کارتوس فائر کرنا۔ پرواہ نہیں بندوق کا منہ کس طرف ہے"۔

ان کے دونوں بچے پچھلی سیٹ پر تھے۔ چھوٹا بچہ سویا ہُوا تھا اور بڑا بچّہ پچھلی سیٹ پر کھڑا پیچھے دیکھ رہا تھا۔

گاڑی اور ان تین آدمیوں میں پندرہ بیس گز کا فاصلہ رہ گیا تھا جب عثمان نے ریوالور باہر کر کے فائر کیا۔ اس کے ساتھ ہی وینا نے ایک نالی کا کارتوس فائر کیا۔ فوراً بعد دوسرا کارتوس بھی فائر کردیا۔ تینوں آدمی اس قدر تیز دائیں اور بائیں کو بھاگے جیسے وہاں تھے ہی نہیں۔ وینا نے بڑی تیزی سے دو اور کارتوس لوڈ کر لئے۔ عثمان نے اس جگہ سے جس جگہ آدمی کھڑے تھے گزرتے ریوالور کا سلنڈر خالی کر دیا اور اس کے ساتھ ہی ایکسی لیٹر پر پاؤں دبایا تو رفتار کی سوئی ایک سو تیس کلومیٹر سے بھی آگے نکل گئی اور اس رفتار پر گاڑی نے موڑ جو کاٹا تو پہیوں کی چیخوں نے سندھ کی زمین کو ہلا ڈالا۔

"اللہ کا شکر ادا کرو وینا" ___ عثمان نے کہا ___ "اس کی ذاتِ باری نے بال بال بچا لیا ہے"۔

وینا کے ہونٹ تو پہلے ہی ہل رہے تھے اور وہ اللہ کا شکر ادا کر رہی تھی۔ اس کا تین سالہ بیٹا گولیوں کی آواز پر قہقہے لگا رہا تھا۔ وہ معصوم یہی سمجھتا ہو گا کہ اس کے ماں باپ نے تفریحاً گولیاں چلائی ہیں۔

○

عثمان کی کوشش یہ تھی کہ شام تک کراچی پہنچ جائیں۔ وہ راستے میں کہیں رکنا نہیں چاہتا تھا لیکن اسے رکنا پڑا۔ وہ خود نہیں رکا تھا' اسے روکا گیا تھا۔

پچھلے پہر کے چار بج چکے تھے۔ گاڑی پھر ایک ایسے علاقے میں سے گزر رہی تھی جس کے دائیں بائیں سندھ کے مخصوص چھوٹے چھوٹے درختوں کا بڑا گھنا جنگل تھا اور یوں معلوم ہوتا تھا جیسے یہاں سے کبھی کسی انسان کا گزر ہُوا ہی نہیں۔ ایک موڑ ایسا تھا کہ

گاڑی کی رفتار بہت ہی کم کرنی پڑی۔

گاڑی اس موڑ سے مُڑی ہی تھی اور ابھی رفتار میں تیزی نہیں آئی تھی کہ اچانک چار آدمی اس حالت میں سڑک پر آ گئے کہ دو نے کلاشنکوفوں کی نالیاں' دو نے رائفلوں کی نالیاں گاڑی کی طرف کر رکھی تھیں اور ہتھیاروں کے بٹ ان کے کندھوں کے ساتھ تھے۔ وہ چاروں باقاعدہ نشانہ باندھے ہوئے تھے۔

"اب کیا کریں عثمان؟" ___ وینا نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"فائر نہ کرنا وینا!" ___ عثمان نے بڑی تیزی سے کہا ___ "بندوق دیکھتے ہی وہ ٹریگر دبا دیں گے .... رکنا پڑے گا .... جو اللہ کرے گا"۔

اتنے میں گاڑی ان آدمیوں کے پاس پہنچ گئی۔ ان میں دو تو واضح طور پر سندھی معلوم ہوتے تھے اور دوسرے دو شکل و صورت اور لباس کے لحاظ سے سندھی نہیں تھے۔ دو آدمی کلاشنکوفوں کی نالیاں گاڑی کی طرف کئے کھڑے رہے اور دو گاڑی تک آئے۔

"گاڑی سے باہر آ جاؤ" ___ ایک نے کہا ___ "ریوالور اور بندوق وہیں رہنے دو"۔

"کیا بات ہے بھائی!" ___ عثمان نے کہا ___ "ہم پاکستانی ہیں اور دیکھو ہمارے ساتھ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں"۔

"بچوں کی فکر نہ کرو" ___ اس آدمی نے کہا ___ "بچوں کو کوئی تکلیف نہیں ہو گی' ریوالور اور بندوق ادھر مجھے دے دو"۔

وینا نے رونا شروع کر دیا۔ اس کے لئے یہ صورتِ حال بڑی ہی خوفناک تھی اور زندگی میں پہلی بار وہ اس ہولناک شکنجے میں آئی تھی۔

"مت رو وینا!" ___ میجر عثمان نے اسے ڈانٹ کر کہا ___ "ایسی بھی بزدل نہ بنو۔ یہ کیا ہیں! میری تمہاری طرح انسان ہیں' بھیڑیئے تو نہیں" ___ عثمان ان لوگوں سے مخاطب ہُوا اور بارعب انداز سے پوچھا ___ "اب کہو بھائی! کیا حکم ہے"۔

"گاڑی تم ہی چلاؤ گے" ___ ان میں سے ایک آدمی نے کہا۔ وہ بڑی صاف اُردو بول رہا تھا ___ "دو آدمی تمہارے ساتھ ہوں گے اور گاڑی اُدھر جائے گی جدھر یہ دو آدمی کہیں گے"۔

"تم ہندو ہو" —— عثمان نے قدرے حقارت سے اس آدمی سے کہا —— "میں جانتا ہوں تم ہندو ہو۔ تمہارے پاس کلاشنکوفیں ہیں اور میں نہتّہ ہوں۔ اگر تم جیسے چار ہندو میری طرح نہتّے ہو کر میرے مقابلے میں آجائیں تو خدا کی قسم' دو منٹ بھی نہ لگیں اور تم چاروں سڑک پر بے ہوش پڑے ہوئے ہو.... چلو بیٹھو گاڑی میں"۔

عثمان کی اس بات پر چاروں آدمی ہنس پڑے۔ یہ طنزیہ ہنسی تھی۔ دو آدمی پچھلی سیٹ پر بچوں کے ساتھ بیٹھ گئے۔ انہوں نے عثمان کو بتایا کہ سڑک سے ہٹ کر کس طرف جانا ہے۔

یہ کچھ کچا کچھ پکا اور کچھ ریتلا رستہ تھا جس پر گاڑی جا رہی تھی۔ کم و بیش دو میل دور جا کر ان آدمیوں نے گاڑی رکوا لی۔ پہلے خود اترے پھر عثمان سے کہا کہ وہ اس عورت اور بچوں کے ساتھ اتر آئے۔ سب کو گاڑی سے اتار کر گاڑی کی چابی ایک آدمی نے لے لی۔

"فکر نہ کرنا" —— چابی لینے والے آدمی نے کہا —— "تمہاری گاڑی بالکل ٹھیک رہے گی اور تمہیں واپس مل جائے گی۔ تم سب ہمارے ساتھ آجاؤ"۔

"دیکھو بھائی!" —— عثمان نے انہیں کہا —— "میں تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا کیونکہ میں تم میں اکیلا ہوں اور میرے ہاتھ میں کوئی ہتھیار نہیں۔ اگر تم اپنے آپ کو جوانمرد اور دلیر مرد سمجھتے ہو تو اس عورت پر ہاتھ نہ اٹھانا اور اس کی عزت کو اپنی ماں بیٹی کی عزت جیسا سمجھنا.... اور اگر تم ہندو ہو تو پھر میں تمہیں کچھ بھی نہیں کہوں گا کیونکہ میں ہندو کی ذہنیت کو جانتا ہوں۔ ہندو سب سے پہلے عورت پر دست درازی کرتا ہے"۔

ان دونوں میں ایک شاید ہندو ہی تھا اور شاید دونوں ہندو تھے۔ ایک نے عثمان کو مکا مارا لیکن عثمان نے اپنا بایاں بازو بڑی تیزی سے اوپر کر کے اس کا مکا اپنے منہ سے دور ہی روک لیا اور پوری طاقت سے اس شخص کے منہ پر مکا مارا۔ وہ شخص پاؤں پر کھڑا نہ رہ سکا۔ چند قدم پیچھے ایسا گرا کہ پہلے اس کی پیٹھ زمین پر لگی پھر اس کی دونوں ٹانگیں اٹھ گئیں۔ دوسرے آدمی نے کلاشنکوف کندھے سے لگا کر نالی عثمان کی طرف کی۔

"نہیں" —— وینا دوڑ کر عثمان کے آگے جا کھڑی ہوئی اور بولی —— "بزدلوں والا کام نہ کرو۔ مکے کے جواب میں گولی نہ چلاؤ"۔

"گن نیچے کر لو" —— یہ آواز اس شخص کی تھی جو مکا کھا کر گرا تھا اور اب اٹھ رہا

تھا۔ "تم واقعی مرد ہو" —— مکا کھانے والے نے اٹھ کر کہا —— "لیکن اپنی یہ مردانگی یہیں تک رہنے دینا' ہم تمہیں جہاں لے جا رہے ہیں وہاں کسی کے ساتھ ایسی حرکت نہ کر بیٹھنا ورنہ مارے جاؤ گے اور پھر ہم تمہیں تمہاری بیوی کی حفاظت کی ضمانت نہیں دے سکیں گے.... ہمارے ساتھ چلو"۔

وہ علاقہ بڑا ڈراؤنا سا تھا جس میں عثمان' وینا اور ان کے بچوں کو لے جایا جا رہا تھا۔ درختوں کا جنگل ختم ہو گیا تھا اور ریتلے ٹیلوں کا علاقہ شروع ہو گیا تھا۔ دُور دُور تک آبادی کا نام و نشان نہ تھا۔ آگے دلدلی علاقہ آ گیا جو تھا تو ریتلا لیکن اس میں پاؤں دھنستے نہیں تھے۔ اس علاقے سے نکلے تو کچھ دور کھجور کے درخت نظر آنے لگے۔ عثمان تو فوجی تھا' تھکن کم ہی محسوس کر رہا تھا۔ مشکل وینا کے لئے تھی جو اب قدم گھسیٹ رہی تھی۔ اگر وہ اپنے گھر کو جا رہی ہوتی یا کسی شادی کی محفل کو جا رہی ہوتی تو اتنی تھکن محسوس نہ کرتی۔ دل پر خوف سوار تھا اس لئے جسمانی توانائی جلدی جواب دے گئی تھی۔ بچوں کو عثمان اور وینا باری باری اٹھاتے تھے۔ بچے الگ پریشان تھے کہ گاڑی میں سے نکال کر انہیں کہاں لے جایا جا رہا ہے۔

قدم گھسیٹتے کھجوروں کے درختوں تک پہنچے جو ذرا بلندی پر تھے۔ وہ چھوٹا سا نخلستان تھا۔ اس سے ذرا ہٹ کر ایک گاؤں تھا جس میں پندرہ بیس گھر تھے۔ زیادہ تر گھر گھاس پھونس کے جھونپڑے تھے جیسے سندھ کے علاقے میں دیکھنے میں آتے ہیں۔ ان میں گھرے ہوئے دو گھر پختہ تھے یعنی اینٹوں کے بنے ہوئے تھے۔

عثمان اور وینا کو اس گاؤں میں لے گئے۔ گاؤں کی گلیوں میں بچے کھیل رہے تھے۔ کچھ آدمی اِدھر اُدھر آتے جاتے نظر آتے تھے اور اس پارٹی کو رک رک کر دیکھتے تھے۔ ان کے دیکھنے کا انداز ایسا تھا جیسے یہ اجنبی سے لوگ ان کے لئے کوئی نئے اور انوکھے نہیں' ورنہ دیہات میں اور وہ بھی اتنے پسماندہ دیہات میں' دو آدمی کلاشنکوفیں اٹھا کر اور اپنے ساتھ ایک شہری مرد اور ایک عورت کو لے جا رہے ہوں تو گاؤں والے یوں رک کر دیکھتے ہیں جیسے یہ کوئی آسمانی مخلوق ہو۔ اس گاؤں کے لوگوں کے اس انداز سے پتہ چلتا تھا جیسے یہاں شہر کے لوگ آتے جاتے رہتے ہوں۔

میجر عثمان اور وینا کو ایک پختہ مکان میں لے گئے اور ایک کمرے میں چارپائیوں پر

بٹھادیا۔ یہ کمرہ کسی دیہاتی کا معلوم نہیں ہوتا تھا کیونکہ اس میں جو دو پلنگ بچھے ہوئے تھے وہ خاصے جدید اور قیمتی تھے اور ان پر بڑے نفیس پلنگ پوش پڑے ہوئے تھے۔ ایک طرف بڑی اچھی میز تھی۔ تین چار اچھی قسم کی کرسیاں تھیں اور درمیان میں ایک اچھی قسم کی لمبی تپائی رکھی ہوئی تھی۔

"تمہارا نام کیا ہے بھئی؟" —— ایک آدمی نے عثمان سے پوچھا۔

"عثمان!" —— عثمان نے جواب دیا —— "میجر عثمان .... میں پاکستان آرمی کا میجر ہوں اور یہ میری بیوی واجدہ ہے .... یہ سوچ لو کہ آرمی کو پتہ چل گیا کہ ایک میجر کو اس کے بیوی بچوں سمیت اغوا کرلیا گیا ہے تو تمہارا کوئی گاؤں سلامت نہیں رہے گا"۔

"تم بے وقوف ہو میجر صاحب!" —— ایک آدمی نے جواب دیا —— "یہاں پاکستان آرمی کا وہی حال ہو گا جو مشرقی پاکستان میں ہُوا تھا"۔

"کیسی باتیں کرتے ہو میجر صاحب!" —— دوسرا آدمی بولا —— "پاکستان آرمی کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ آرمی وہی کرے گی جو اسے حکومت سے حکم ملے گا اور تم جانتے ہو کہ تمہاری حکومت کیسی ہے۔ مشرقی پاکستان میں تمہاری حکومتوں نے ہی پاکستان آرمی کو ذلیل کروایا تھا"۔

"میجر صاحب!" —— پہلے آدمی نے کہا —— "اپنی بات کرو۔ یہاں آرمی کو اور سیاست کو بھول جاؤ"۔

"پھر یہ بتادو کہ ہمیں یہاں کیوں لائے ہو" —— میجر عثمان نے پوچھا۔

"یہ فیصلہ ہمارا سائیں کرے گا" —— عثمان کو جواب ملا —— "وہ اس وقت یہاں نہیں۔ شاید رات کو آجائے۔ میں تمہیں یہ بتا سکتا ہوں کہ تمہارا تاوان وصول کیا جائے گا"۔

"یہ بھی ضروری نہیں" —— دوسرے آدمی نے کہا —— "چونکہ تم میجر ہو اس لئے یہ ہو سکتا ہے کہ سائیں تمہاری حکومت سے کوئی مطالبہ کرے' مثلاً" یہ کہ ہمارے فلاں فلاں آدمی جو تم نے جیل میں رکھے ہوئے ہیں انہیں رہا کردو"۔

"جو کچھ بھی کرو' کر سکتے ہو" —— میجر عثمان نے کہا —— "میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ میری بیوی کو پریشان نہ کیا جائے"۔

"میجر صاحب!" —— ایک آدمی نے کہا —— "اگر ہم اتنے ظالم اور بد اخلاق ہوتے تو

جس طرح تم نے مجھے مکا مارا تھا' میں تمہیں کبھی معاف نہ کرتا اور وہیں تمہیں یا تمہارے ایک بچے کو گولی مار دیتا .... باقی باتیں ہمارے سائیں سے کرلینا۔ ہم تمہارے کھانے کا بندوبست کرتے ہیں"۔

تھوڑی ہی دیر بعد عثمان اور وینا کے آگے کھانا رکھا ہُوا تھا۔ یہ دیکھ کر عثمان کو کچھ حیرت سی ہوئی کہ اس کھانے میں گوشت تھا' سبزی الگ اور دال الگ تھی اور تازی پکی ہوئی روٹیاں تھیں۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس مکان میں رہنے والا شخص جسے یہ لوگ سائیں کہتے تھے' کوئی صاحب حیثیت آدمی ہے ورنہ اتنے دور افتادہ صحرائی گاؤں میں اتنا اچھا کھانا کوئی خواب میں بھی نہیں دیکھ سکتا۔ عثمان کا چھوٹا بچہ تو ابھی ماں کا دودھ پیتا تھا' بڑے بچے کے لئے گلاس میں دودھ آگیا۔

کھانا کھاتے ہوئے عثمان وینا کو تسلی دلاسہ دیتا رہا اور اسے بتاتا رہا کہ یہ لوگ تاوان مانگیں گے۔ اگر بے تحاشا نہ مانگا تو میرے گھر سے انہیں مل جائے گا۔



سورج غروب ہو جانے کے ڈیڑھ دو گھنٹے بعد ایک ادھیڑ عمر آدمی اس کمرے میں داخل ہُوا جس میں عثمان اور وینا کو بٹھایا گیا تھا۔ چھوٹا بچہ جو ابھی دودھ پینے کی عمر میں تھا' کچھ بھی نہیں سمجھ رہا تھا لیکن بڑا بچہ محسوس کر رہا تھا کہ انہیں کسی غلط جگہ لے آئے ہیں' وہ بار بار کہتا تھا' امی گھر چلو۔ یہ ایک اور پریشانی تھی۔ بچے کو سمجھایا نہیں جا سکتا تھا کہ وہ یہاں آئے نہیں بلکہ لائے گئے ہیں اور اب گھر جانا انہی لوگوں کے اختیار میں ہے۔

یہ شخص جو کمرے میں داخل ہُوا تھا' تقریباً" پچاس کی عمر کا آدمی تھا۔ اس کے سر پر سندھی ٹوپی اور کندھوں پر پھولدار چادر تھی اور اس کا باقی لباس بھی سندھی تھا اور چال ڈھال اور بولنے کے انداز سے بارعب اور معزز آدمی لگتا تھا۔ اس نے عثمان کے ساتھ ہاتھ ملایا اور بیٹھ گیا۔

"میرا نام خدا بخش ہے" —— اس نے عثمان سے اپنا تعارف کروایا اور بولا —— "تم نے شاید میرا نام کبھی سنا ہو گا"۔

"میں نے آپ کا نام کبھی نہیں سنا" —— عثمان نے اسے آگے نہ بولنے دیا اور کہنے لگا —— "میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ہمیں کیوں پکڑ لیا گیا ہے۔ آپ مسلمان ہیں اور

میں آپ کو اپنا باپ سمجھتا ہوں۔ ہمارے متعلق آپ نے جو فیصلہ کرنا ہے وہ ذرا جلدی ک
دیں"۔

"جلدی کر دیں گے سائیں!" —— خدا بخش نے کہا —— "جلدی کر دیں گے کیوں
گھبراتے ہو' اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے ہو"۔

یہ وہی خدا بخش تھا جس کے متعلق لوسی کو راما راؤ نے بتایا تھا کہ ان کے گروہ کا کر
دھرتا ایک سندھی ہے جس کا نام خدا بخش ہے۔ خدا بخش کوئی وڈیرا تو نہیں تھا نہ
وڈیرے اس طرح میدان میں آتے ہیں۔ یہ شخص مجرمانہ ذہنیت رکھتا تھا اور یہی اس ک
طاقت تھی۔ سندھ کی سرحد کے ساتھ ساتھ دونوں طرف کے ڈاکو اور سمگلر اس کے م
تھے اور دوست بھی تھے۔ وہ جسے چاہتا قتل کروا سکتا تھا' اس کے گھر میں ڈاکہ ڈلوا سکتا
اور اغوا بھی کرا سکتا تھا۔ اس کی اس طاقت سے وڈیرے بھی ڈرتے تھے لیکن وہ ایسا
وقوف نہیں تھا کہ کسی وڈیرے کی دشمنی مول لے لیتا۔ وڈیروں کے ساتھ اس کی
یاری تھی اور جب سے سندھ میں علیحدگی پسندوں نے اپنی بے تاج بادشاہی قائم کر
تھی' خدا بخش اس محاذ میں شامل ہو گیا تھا۔

"اب اس طرح ہو گا میجر عثمان!" —— خدا بخش نے کہا —— "تم الگ کمرے م
رہو گے اور تمہاری بیوی اور دونوں بچوں کو الگ کمرے میں رکھا جائے گا"۔

"یہ کیوں؟" —— میجر عثمان نے پوچھا اور کہنے لگا —— "میرے بیوی بچوں کو میر
ساتھ رہنے دیں ورنہ یہ الگ روتی رہے گی اور میں الگ پریشان رہوں گا .... دیکھا جا
تو میری اور آپ کی کوئی ذاتی دشمنی تو نہیں"۔

"نہیں عثمان!" —— خدا بخش نے کہا —— "میں تمہاری اصل پریشانی سمجھتا ہو
تمہیں یہ ڈر ہے کہ تمہاری بیوی کو الگ رکھا گیا تو اس کی عزت پر کوئی ہاتھ ڈالے گ
میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ ایسا نہیں ہو گا۔ تمہاری عزت کو میں اپنی عزت سمجھو
گا۔ تم نے ٹھیک کہا ہے کہ میری اور تمہاری کوئی ذاتی دشمنی نہیں۔ تمہاری بیوی ک
طرح کی میری ایک بیٹی جوان ہے اور ایک بیوی بھی اتنی ہی جوان ہے' دوسری ذ
بوڑھی ہو گئی ہے۔ تم اگر مجھ پر یہ شک کرو گے کہ میرے گھر میں تمہاری بیوی کی عز
پر کوئی ہاتھ ڈالے گا تو میں کہوں گا کہ تم نے مجھے بڑی گندی گالی دی ہے"۔

خدا بخش کی اس بات سے عثمان کے دل سے کم از کم ایک بوجھ تو اتر گیا لیکن اص

پریشانی ابھی موجود تھی۔ ایک سوال تھا جو اس کے ذہن اور دل کو بچھو کی طرح ڈنک مار رہا
تھا کہ انہیں کب تک قید میں رکھا جائے گا۔

"سائیں! ایک بات پوچھتا ہوں" —— عثمان نے کہا —— "آپ مسلمان ہیں۔
پاکستانی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ سندھ میں وہی حالات پیدا ہو گئے ہیں ...."

"نہ .... نہ .... نہ عثمان!" —— خدا بخش نے میجر عثمان کی بات کاٹتے ہوئے کہا ——
"ادھر سیاست کی بات مت کرو۔ یہ بات پاکستان اور ہندوستان کی ہے' اور پھر یہ بات
اپنے لیڈروں کے ساتھ کرو۔ میں ایک بات ضرور کہوں گا کہ بنگالیوں کو تمہارے
لیڈروں نے چوہڑہ چمار سمجھ لیا تھا۔ تم نے اس کا نتیجہ دیکھ لیا ہے لیکن تمہارے لیڈروں
نے کوئی سبق حاصل نہیں کیا۔ وہ اب سندھیوں کو وہی کچھ سمجھتے ہیں جو بنگالیوں کو سمجھتے
تھے۔ ادھر مشرقی پاکستان میں ہندوستان نے موقع دیکھا تو اپنی فوج بھیج دی۔ اب
تمہارے لیڈروں نے سندھ میں وہی حالات پیدا کر دیئے ہیں تو ہندوستان نے ادھر بھی
آدمی بھیج دیئے ہیں"۔

"لیکن سائیں!" —— عثمان نے کہا —— "آپ تو مسلمان ہیں ...."

"میں گناہگار آدمی ہوں بھائی!" —— خدا بخش نے اسے آگے بولنے نہ دیا اور کہا
—— "چھوڑو ان باتوں کو"۔

"پھر یہی بتا دیں" —— عثمان نے پوچھا —— "ہمارا کیا بنے گا؟ کب تک قید میں رکھو
گے؟"

"میں صاف بات بتا دیتا ہوں" —— خدا بخش نے جواب دیا —— "ہم نے تمہیں اور
تمہاری بیوی کو اس لئے پکڑا ہے کہ تمہارے عوض رقم مانگیں گے۔ ہمیں معلوم نہیں
تھا کہ تم فوج کے افسر ہو۔ اب میں کراچی سے اپنے بڑوں سے حکم لوں گا کہ تمہارا کیا کیا
جائے"۔

"کیا آپ لوگ فوج سے ڈرتے ہیں؟"

"ڈرتے نہیں بھائی!" —— خدا بخش نے ایسے لہجے میں کہا جس میں ہلکی سی طنز بھی
تھی —— "تم ہمارے لئے بہت قیمتی ہو۔ ہو سکتا ہے ہمارے بڑے یہ فیصلہ کریں کہ
تمہارا تاوان وصول نہ کیا جائے بلکہ تمہارے عوض ہمارے چار آدمی رہا کر دیئے جائیں
جو کراچی جیل میں بند ہیں .... کیا تمہارا باپ امیر آدمی ہے؟ جائیداد کتنی ہے؟"

"میرا باپ غریب آدمی ہے" —— عثمان نے جھوٹ بولا —— "اگر اسے آپ کہ
کہ پانچ ہزار روپیہ دو اور اپنے بیٹے اور بہو کو رہا کروا لو تو اسے پانچ ہزار روپیہ قرض ا
پڑے گا"۔

رات کو بھی عثمان اور وینا کو پہلے کی طرح اچھا کھانا کھلایا گیا۔ اس کے بعد وہ صبر آ
اور جگرپاش وقت آیا جب عثمان اور وینا کو الگ کیا گیا۔ عثمان وینا کو تسلی دے رہا تھا کہ
نہیں ہوگا اور وینا رو رہی تھی۔ دونوں بے بس اور مجبور تھے۔ انہیں الگ ہونا ہی تھا
وہ الگ کر دیئے گئے۔



عثمان کو جس کمرے میں رکھا گیا اس میں اچھی قسم کی ایک چارپائی اور اس پر صا
ستھرا بستر تھا اور ایک چھوٹی میز اور کرسی بھی پڑی ہوئی تھی۔ عثمان کو اپنے آرام و سکو
کوئی غم نہ تھا۔ وہ صرف وینا کے لئے پریشان تھا۔ وہ سوچوں اور خیالوں میں الجھ گیا۔
تو اسے پاکستان کے لیڈروں اور آتی جاتی حکومتوں پر غصہ آتا جنہوں نے یہ حالات پیدا
دیئے تھے کہ بھائی بھائی کا دشمن ہو گیا تھا اور کبھی اس کے دل میں پاکستان کی محبت آ
اور انڈیا کی ایسی نفرت ابھرتی کہ وہ مٹھیاں بھینچ لیتا اور کمرے میں اس طرح غضب نا
طریقے سے ٹہلنے لگتا جیسے کوئی ہندوستانی اس کے سامنے آیا تو وہ اس کا گلا گھونٹ د
گا۔

اسے لُوسی یاد آئی اور پھر لُوسی کے دونوں روپ باری باری اس کے سامنے آ
کبھی یوں محسوس کرتا جیسے اس کی روح کی راحت اور دل کی خوشیاں لُوسی سے وا
ہیں اور کبھی یوں سوچتا کہ لُوسی نے اسے وینا سے متنفر کر دیا ہے اور اس کی اتنی پیا
ازدواجی زندگی تباہ کر دی ہے۔

سوچوں اور خیالوں کی آندھیاں اور جھکڑ تھے جو کبھی صحرائی آندھیوں کی طرح گ
ہو جاتے اور کبھی یہ جھکڑ اتنے سرد ہو جاتے کہ عثمان کی اندر کی دنیا سکڑنے اور ٹھٹھر
لگتی۔

ادھر وینا کا حال اور زیادہ بُرا تھا۔ بچے اسے پریشان کرتے تھے' البتہ اسے کچھ سا
مل گیا۔ یہ ساتھ اس گھر کی دو عورتیں تھیں جو خاصی دیر وینا کے پاس بیٹھی رہیں اور اِد
اُدھر کی باتیں کرتی رہی تھیں۔ وہ دیہاتی اور ان پڑھ عورتیں تھیں اس لئے وینا ان

اتھ کوئی سیاسی یا عقل کی دیگر بات نہیں کر سکتی تھی۔ ان عورتوں سے اسے اتنا ہی
ائدہ پہنچا کہ وہ عثمان کی طرح سوچوں اور خیالوں میں الجھنے اور اپنے آپ کو پریشان کرنے
ے بچی رہی۔

مسلسل تین دن عثمان اپنے کمرے میں اور وینا اپنے کمرے میں بند رہی۔ انہیں
شتہ اور کھانا وغیرہ صاف ستھرا اور اچھا ملتا رہا۔ کمروں میں سے انہیں صرف بیت الخلاء
ک جانے کے لئے نکالتے تھے۔ وینا کو عثمان کا اور عثمان کو وینا کا کچھ پتہ نہیں تھا کہ وہ
س حال میں ہے۔

ایک روز اجنبی سے دو تین آدمی جو کوئی شریف آدمی نہیں لگتے تھے عثمان کے پاس
ئے تھے۔ وہ سندھی نوجوان تھے اور پڑھے لکھے معلوم ہوتے تھے لیکن چھچھورے اور
چھے سے تھے۔ عثمان کے ساتھ وہ فضول سی باتیں کرتے رہے تھے۔ ان کی باتوں میں
اق اُڑانے کا رنگ زیادہ تھا۔ انہوں نے پاکستان کا مذاق زیادہ اُڑایا تھا۔ عثمان ان کی باتیں
ن کر جل کر راکھ ہو گیا تھا۔ اسے پہلی بار محسوس ہوا کہ وہ پاکستانی ہے اور پاکستان کے
تھ بہت ہی پیار ہے اور وہ پاکستان کے نام پر مر مٹے گا۔



ایک دو دن اور گزر گئے۔ پچھلے پہر کے تین بج رہے تھے جب عثمان کے کمرے کا
وازہ کھلا اور ایک آدمی اندر آیا۔ اس آدمی کو وہ پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ یہ کوئی شہری آدمی
جس نے پتلون اور جیکٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک جوان لڑکی کمرے
آئی۔ عثمان نے اسے دیکھا تو اس نے اپنے جسم میں ایسا جھٹکا محسوس کیا جیسے بجلی کے
ے تار اس کے جسم کے ساتھ لگا دیئے گئے ہوں۔

وہ لڑکی لُوسی تھی۔

عثمان کو دیکھ کر لُوسی کا ردِعمل بھی ویسا ہی تھا جیسا عثمان کا تھا۔ لُوسی کا تو رنگ ہی پیلا
یا۔ عثمان کا چہرہ لال سرخ ہو گیا۔ پہلے تو اس نے یہ ارادہ کیا کہ اس لڑکی کا گلا گھونٹ
ے لیکن اس نے اپنے آپ پر قابو پا لیا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ لُوسی یہاں کس طرح آئی
ہے اور یہ کیا گورکھ دھندہ ہے۔

"تم یہاں کیسے؟" —— عثمان نے سکوت توڑا۔

"یہ بھی بتا دوں گی" —— لُوسی نے دبی دبی سی آواز میں جواب دیا —— "پہلے میں

تمہیں یہاں سے رہا کراؤں گی۔ اس وقت تک مجھ سے کچھ نہ پوچھنا"۔

عثمان خاموش ہو گیا اور لوسی اس آدمی کے ساتھ باہر نکل گئی جس کے ساتھ کمرے میں آئی تھی۔

دو گھنٹے گزر گئے۔ سوچ سوچ کر عثمان کو چکر آنے لگے۔ لُوسی کا اس جگہ آنا ایک ایسا معمہ تھا جس کا حل عثمان کو نہیں مل رہا تھا البتہ لُوسی کے متعلق میجر سمیع اور کیپٹن احمد نے اسے جو باتیں بتائی تھیں اور جنہیں وہ تسلیم نہیں کرتا تھا وہ صحیح معلوم ہونے لگیں۔

کمرے کا دروازہ ایک بار پھر کھلا۔ لُوسی اور اس کا ساتھی جو راما راؤ تھا کمرے میں داخل ہوئے اور ان کے پیچھے پیچھے وینا اپنے دونوں بچوں کے ساتھ کمرے میں آئی۔

"اب تم دونوں اکٹھے رہو گے" —— لوسی نے عثمان سے کہا۔

"یہ سب کیا ہے لُوسی؟" —— عثمان نے مضطرب لہجے میں پوچھا —— "کیا تم نے اپنے اغوا کا انتقام اس طرح لیا ہے کہ مجھے میرے بیوی بچوں کے ساتھ اغوا کرایا ہے۔ میرا شک ہے کہ تم نے وینا سے انتقام لیا ہے کیونکہ تمہیں اس کے بھائیوں نے اغوا کرایا تھا"۔

"نہیں عثمان!" —— لُوسی نے کہا —— "اس وہم میں مت پڑو۔ میں تمہیں یہاں سے نکلوا دوں گی اور پھر تفصیل سے بتاؤں گی کہ تمہیں یہاں کس طرح لایا گیا ہے۔ ابھی میں اتنا ہی بتاتی ہوں کہ یہ اغوا کی انہی وارداتوں میں سے ایک واردات ہے جن کی خبریں دوسرے تیسرے روز اخباروں میں پڑھتے رہتے ہو۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ تم ان لوگوں کے ہاتھ لگ گئے۔ تمہاری جگہ کوئی اور بھی ہو سکتا تھا۔ اسے انتقامی کارروائی نہ سمجھو۔ میں کراچی جا رہی ہوں۔ مجھے امید ہے کہ تم زیادہ سے زیادہ آج کی رات اور ہو سکتا ہے کل کا دن یہاں رہو۔ تمہاری گاڑی تمہیں واپس مل جائے گی۔ ریوالور اور بندوق بھی مل جائے گی اور تم بڑے آرام سے کراچی پہنچ جاؤ گے‘ یہاں مجھ سے کوئی فالتو بات پوچھنا نہ کہنا"۔

لُوسی راما راؤ کے ساتھ کمرے سے نکل گئی اور کمرے کا دروازہ بند ہو گیا۔

"یہ کون ہے؟" —— وینا نے عثمان سے پوچھا۔

"یہ وہی ہے" —— عثمان نے کہا —— "اور مجھے امید ہے یہ ہمیں چھڑوا لے گی"۔

"یہ یہاں کیسے پہنچی؟" —— وینا نے پوچھا۔

"میں تو اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ یہ یہاں پہنچ گئی ہے" —— عثمان نے کہا۔

"اس لئے کہ یہ ہمیں رہا کرا دے گی؟" —— وینا نے پوچھا۔

"ہاں" —— عثمان نے جواب دیا —— "اللہ کا شکر ادا کرنے کی یہ ایک وجہ ہے کہ یہ ہمیں شاید چھڑوائے گی لیکن دوسری وجہ یہ ہے کہ مجھے اس کے متعلق جو کچھ بھی بتایا جا رہا ہے‘ میں اسے غلط سمجھتا رہا ہوں۔ آج اسے یہاں دیکھ کر سب شکوک اور میری خوش فہمیاں دور ہو گئی ہیں۔ اب اس سے پوچھنے کی یا کسی سے کچھ اور معلوم کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ اس کا یہاں آنا اور کہنا کہ یہ ہمیں رہا کرا لے گی‘ واضح طور پر بتاتا ہے کہ اس کی اصلیت کیا ہے"۔

"مجھے تو اب بھی شک ہے عثمان!" —— وینا نے کہا —— "کہ ہمیں اسی نے اغوا کرایا ہے اور یہ اس کی انتقامی کارروائی ہے"۔

"ہو سکتا ہے" —— عثمان نے کہا —— "لیکن میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس نے ہمیں رہا کرانے کی جو بات کی ہے وہ غلط معلوم نہیں ہوتی۔ میں اس کا انداز جانتا ہوں"۔

لُوسی کا وہاں پہنچنا محض اتفاقی امر تھا۔ اس نے راما راؤ سے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ اندرون سندھ کی سیر کرنا چاہتی ہے۔ راما راؤ نے خدا بخش سے پوچھا تھا تو خدا بخش نے کہا تھا کہ اسے راما راؤ لے آئے۔ راما راؤ اسے لے گیا اور یہ دونوں سیدھے خدا بخش کے گھر پہنچے تھے۔ خدا بخش نے اپنا ایک آدمی ان کے ساتھ کر دیا تھا اور ان دونوں نے کچھ دیہاتی علاقہ گھوم پھر کر دیکھنا تھا۔

یہ دونوں جب خدا بخش کے ہاں پہنچے تو انہیں پتہ چلا کہ ایک پنجابی فیملی کو گاڑی سمیت اغوا کیا گیا ہے۔ لُوسی نے تفریح کے موڈ میں کہا کہ وہ اس فیملی کو دیکھنا چاہتی ہے۔ اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اغوا ہونے والے اس کی جان پہچان کے افراد ہیں۔ جان پہچان بھی ایسی کہ عثمان اس کا عاشقِ زار تھا۔

جس وقت عثمان اور وینا اس وہم اور وسوسوں میں اُلجھے ہوئے تھے کہ انہیں لوسی نے انتقاماً اغوا کرایا ہے اُس وقت لُوسی اور راما راؤ خدا بخش کو ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ انہوں نے دو تین آدمیوں کو دوڑا دیا تھا کہ جہاں جہاں اس کے جانے کا امکان ہے وہاں اسے دیکھیں۔

وینا کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ وہ قرآن کی آیات کا ورد کر رہی تھی اور اللہ سے
مانگ رہی تھی۔ اس نے عبادت اور دعا کا سلسلہ تھوڑے ہی عرصے سے شروع کیا تھا۔
اللہ سے صرف یہ دعا مانگتی تھی کہ اسے اس کا خاوند واپس مل جائے۔ اب اس قید میں
بھی اس کی زبان پر اور اس کے دل میں اللہ ہی کا نام تھا۔ اگر وہ عثمان کی طرح مرد ہوتی
اس کا یہ حال نہ ہوتا۔ اس قید میں جہاں کوئی قانون نہیں تھا اور اگر کوئی قانون تھا تو وہ خدا
بخش جیسے مجرمانہ ذہن کے آدمیوں کے ہاتھ میں تھا' وہاں وینا کی سب سے بڑی بدنصیبی
تھی کہ وہ جواں سال لڑکی تھی اور خوبصورت تھی۔ وہ اپنی جان دے سکتی تھی' آبرو
نہیں۔

"وینا!" — عثمان نے کہا — "تمہیں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ میری آنکھیں
کھل گئی ہیں۔ میں آج اللہ کے حضور اپنے گناہوں کا اعتراف کرتا ہوں اور گناہوں کی
بخشش بھی مانگتا ہوں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ خدا اُس وقت توبہ قبول نہیں کیا کرتا جب
گناہوں کی سزا شروع ہو جاتی ہے لیکن یہاں صورت کچھ اور ہے۔ میں اپنے گناہوں کا
کفّارہ ادا کروں گا"۔

وینا نے عثمان کے منہ کی طرف دیکھا۔ کچھ دیر دیکھتی رہی۔ عثمان کا چہرہ اس کے
آنسوؤں میں جھلملانے لگا۔ وینا جو چارپائی پر بیٹھی ہوئی تھی' یکلخت اٹھی اور عثمان کے
سامنے دو زانو ہو گئی۔ سر اس کی گود میں پھینکا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ
روئی کہ اس کا بڑا بچہ اسے دیکھ کر رونے لگا۔ اگر بچہ نہ روتا تو وینا عثمان سے اتنی جلدی
الگ نہ ہوتی۔ اس نے عثمان کی گود سے سر اٹھایا اور پھر لپک کر بچے کو اٹھایا اور اسے
لگا لیا۔

عثمان نے بچے کی طرف بازو پھیلائے۔ وینا نے بچے کو اس کی گود میں بٹھا دیا۔
عثمان نے اپنے دونوں بازو بچے کے گرد لپیٹ دیئے۔ اس کے ساتھ ہی عثمان کی آنکھوں
میں آنسو آ گئے۔ اس کے چہرے پر ایسا تاثر تھا جیسے یہ بچہ اس سے چھین لیا گیا تھا
بڑے عرصے بعد اسے واپس ملا ہو۔

عثمان اپنی بیوی اور اپنے بچوں کے پاس آ گیا تھا۔

"عثمان!" — وینا نے دوپٹے سے آنسو پونچھ کر کہا — "اس لڑکی نے اگر ہمیں
کرا دیا تو تم پھر اس کے قبضے میں آ جاؤ گے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ اتنی حسین لڑکی تمہاری

کمزوری بن گئی ہو؟"

"میں ایسا احمق تو نہیں" — عثمان نے کہا — "یہ لڑکی ہمیں بلا مقصد رہا نہیں
کرائے گی۔ رہا کرا کے اپنا کوئی نہ کوئی مطالبہ کرے گی۔ یہ مجھے اپنا شکار سمجھتی ہے لیکن
میں اب اسے اپنا شکار سمجھتا ہوں۔ تم مطمئن رہو۔ مجھ سے تو اللہ ناراض ہو گا' تم اللہ
سے خیر مانگتی رہو"۔



رات کا پہلا پہر تھا جب خدا بخش آ گیا۔ لُوسی اور راما راؤ اس کا انتظار کر رہے تھے۔
اس نے انہیں بتایا کہ وہ کسی کام سے ذرا دور چلا گیا تھا اس لئے ان کے استقبال کے لئے
گھر میں ہی نہ رُک سکا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔

"آج ہم نے ایک شکار مارا ہے" — خدا بخش نے خوشخبری سنانے کے انداز میں
انہیں بتایا — "پتہ چلا کہ یہ شکار تو بہت ہی قیمتی ہے۔ یہ آدمی فوج میں میجر ہے۔
دوسری بات یہ کہ لڑکی بڑی خوبصورت ہے اور تیسری بات یہ ہے کہ ان کے ساتھ دو
چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ ان کے عوض ہم جو کچھ بھی مانگیں گے وہ حکومت کی طرف
سے مل جائے گا۔ تم لوگ بھی مجھے مشورہ دو۔ ہم نے اپنے چار آدمی جیل سے رہا کرانے
ہیں۔ اگر ان کے خلاف مقدمہ شروع ہو گیا تو چودہ چودہ سال سے کم سزا نہیں ملے گی"۔

"ہمارا مشورہ کچھ اور ہے" — لُوسی نے کہا — "ہم ان قیدیوں کو دیکھ چکے ہیں۔
اس میجر کو میں اچھی طرح جانتی ہوں اور یہ میرا آدمی ہے۔ آپ اس کے عوض صرف
چار آدمی چھڑوانا چاہتے ہیں لیکن میں اس کے عوض پورا پاکستان لے لوں گی' آپ اسے
فوراً چھوڑ دیں"۔

لُوسی اور راما راؤ نے خدا بخش کو تفصیل سے بتایا کہ اس آدمی کو لُوسی نے کس طرح
اپنے جال میں لے رکھا تھا لیکن درمیان میں ایک واقعہ ہو گیا جس کے نتیجہ میں لُوسی اور
عثمان الگ ہو گئے۔ اب عثمان کو پھر یہاں دیکھ کر لُوسی بہت خوش ہے کہ اس کی محنت
ضائع نہیں گئی اور یہ آدمی پھر اس کے ہاتھ میں آ گیا ہے۔

"یہ میجر لاہور بریگیڈ ہیڈ کوارٹر میں ہوتا ہے" — لُوسی نے کہا اور تھوڑا سا جھوٹ
بھی بولا — "میں اس سے بڑے قیمتی راز لے چکی ہوں اور آگے چل کر اور زیادہ قیمتی
راز حاصل ہوں گے۔ ان میں بعض راز کی باتیں ایسی ہیں جن کا تعلق سندھ کے ساتھ

ہے۔ میں آپ کو یہ ساری باتیں بتا نہیں سکتی۔ آپ یہ کرم کریں کہ انہیں چھوڑ دیں۔ آگے میرا کام ہے کہ میں انہیں کراچی کس طرح پہنچاتی ہوں۔ مجھے ایک فائدہ اور مل رہا ہے۔ وہ یہ کہ اس کی بیوی میری دشمن بنی ہوئی تھی۔ اب وہ بھی میری احسان مند ہو گی اور میں اسے بھی اپنی لائن پر چلا لوں گی"۔

خدا بخش لُوسی کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا اور اس کی ہاں میں ہاں ملاتا چلا جا رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے جیسے اسے سوائے لُوسی کے اور کسی چیز کے ساتھ دلچسپی نہیں۔ لُوسی کے لئے وہ اگر پورا پاکستان نہیں تو سندھ کا صوبہ دینے کو تیار تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ راما راؤ اور لُوسی کس حیثیت کے لوگ ہیں اور اگر ان کے ساتھ بگڑ گئی تو اس کا کیا حشر ہو گا۔ عثمان اور وینا کو چھوڑ دینا اس کے اختیار میں تھا۔ ان کا اغوا اس کا ذاتی فعل تھا۔ لُوسی اور راما راؤ کی بات نہ ماننے کا مطلب یہ تھا کہ اس نے انڈیا کو ناراض کر دیا ہے۔ وہ انڈیا کی ناراضگی بلکہ انڈیا کی انٹیلی جنس کی ناراضگی کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ ویسے بھی وہ اَن پڑھ آدمی تھا۔ اس کا اثر و رسوخ اور رعب داب ایک خاص علاقے اور خاص ماحول میں چلتا تھا۔

"اگر یہ لوگ تمہارے کام کے ہیں تو میں انہیں کیسے روک سکتا ہوں" —— خدا بخش نے کہا —— "لے جائیں انہیں۔ یہ خیال رکھنا کہ آپ نے میرے ہاتھ سے بڑا موٹا شکار لے لیا ہے"۔

"ہم آپ کو اس سے بڑا شکار دے دیں گے" —— راما راؤ نے کہا۔



لُوسی نے رات کو ہی عثمان اور وینا کو یہ خوشخبری سنا دی کہ انہیں صبح چھوڑ دیا جائے گا۔

"تم جا کہاں رہے تھے؟" —— لُوسی نے عثمان سے پوچھا اور اس کے ساتھ ہی اس نے اپنا ایک بازو وینا کے گلے میں ڈال کر اس کا گال چوم لیا۔

"یہ تو اکیلے ریل گاڑی پر یا بائی ایئر کراچی جا رہے تھے" —— وینا نے کہا —— "میری ضد پر انہوں نے دس دنوں کی چھٹی لے لی اور مجھے بھی کراچی سیر کرانے کے لئے اپنی گاڑی پر جانے کا پروگرام بنا لیا۔ میں تو اس گھڑی کو کوستی ہوں جب میں نے ضد کی اور انہوں نے میری بات مان لی تھی"۔

"آدھی چھٹی تو یہاں گزر گئی ہے" —— عثمان بولا —— "پانچ دن باقی رہ گئے ہیں۔ ہیں سے واپس چلے جائیں گے"۔

"واپس کیوں چلے جائیں گے؟" —— راما راؤ نے کہا —— "کراچی چلیں، ہمارے ساتھ ٹھہریں"۔

"ہاں عثمان!" —— لُوسی نے کہا —— "یہیں سے واپس نہ جانا۔ وینا کو مایوسی ہو گی۔ ے کراچی کی سیر کراؤ"۔

"بہتر یہی ہے" —— عثمان نے کہا —— "پہلے بھی ہوٹل میں ٹھہرنے کا ارادہ تھا، اب ی ہوٹل میں ہی ٹھہریں گے اور میں کوشش کروں گا کہ وہاں سے اپنے بریگیڈ کمانڈر کو ن کر کے چھٹی میں دو تین دنوں کا اضافہ کرا لوں .... لیکن میں واپس گاڑی پر تو نہیں ؤں گا"۔

"پھر کیسے آئیں گے؟" —— وینا نے پوچھا۔

"بائی ایئر آئیں گے" —— عثمان نے جواب دیا —— "بائی ایئر آئیں گے اور گاڑی ل گاڑی سے بُک کرا دیں گے"۔

اگلی صبح سورج کی کرنیں ابھی زرد ہی تھیں جب دو کاریں کراچی کی طرف جا رہی یں۔ اگلی کار راما راؤ چلا رہا تھا اور لُوسی اس کے پاس بیٹھی تھی۔ پچھلی کار عثمان کی تھی اسے صحیح و سلامت واپس مل گئی تھی۔ بندوق بھی مل گئی اور ریوالور بھی مل گیا تھا۔

"یہ شکار ہاتھ سے جانا نہیں چاہئے" —— لُوسی راما راؤ سے کہہ رہی تھی —— ماف پتہ چلتا ہے کہ میں نے اس شخص سے کوئی بہت ہی بڑا کام لینا ہے۔ اسے تو میں ن سے اتار رہی تھی لیکن کس طرح غیر متوقع طور پر یہ پھر میرے جال میں آ گیا"۔

"وینا!" —— عثمان کہہ رہا تھا —— "لُوسی کے ساتھ میری ایسی باتیں ہوں گی جو ہیں پھر پہلے جیسے شک میں ڈال دیں گی لیکن دل مضبوط رکھنا۔ میں اس کا زر خرید غلام ن جاؤں گا اور تم میری تائید کرنا جیسے تم مجھے اسی حالت میں دیکھ کر خوش ہو۔ یہ دونوں مجھتے ہیں کہ انہوں نے مجھے پھر اپنے جال میں پھانس لیا ہے لیکن انہیں معلوم نہیں کہ ہ یہ میرے جال میں آئے ہیں۔ خداوند تعالیٰ نے شاید یہ نیکی میرے کھاتے میں لکھ دی ہے۔ تم دیکھتی رہنا میں بے وقوف بن کر انہیں کس طرح بے وقوف بناتا ہوں"۔

"ذرا سنبھل کر عثمان!" —— وینا نے التجا کے لہجے میں کہا —— "مجھ پر تو خوف طاری

ہو گیا ہے۔ یہ لوگ تو کسی بھی حد تک پہنچ سکتے ہیں۔ اپنے آپ کو بچا کر رکھنا"۔

"اور خیال رکھنا راما!" —— لوسی راما راؤ سے کہہ رہی تھی —— "میں جب عثمان کے ساتھ باتیں کر رہی ہوں گی تو تم چپ ہی رہنا کیونکہ اس شخص کو میں ہی سمجھ رہی ہوں"۔

"تم چپ ہی رہنا وینا!" —— عثمان وینا سے کہہ رہا تھا —— "ہو سکتا ہے کوئی ایسی بات ہو جائے جو تمہیں بہت ہی بری لگے۔ دل پر پتھر رکھ لینا"۔

دونوں کاریں کراچی کی طرف دوڑی جا رہی تھیں۔ شام چار بجے کے درمیان یہ لوگ کراچی پہنچ گئے۔ عثمان نے درمیانہ درجے کے ایک اچھے ہوٹل کا انتخاب کیا اور ایک کمرہ لے لیا۔

"اچھا عثمان!" —— لوسی نے کہا —— "ہم چلتے ہیں، کل صبح دس بجے تک آ جائیں گے"۔

لوسی نے وینا کو اپنے بازوؤں میں لے لیا اور اس کا گال چوم کر بولی —— "تم سے مل کر تو مجھے بہت ہی خوشی ہوئی ہے"۔

لوسی اور عثمان نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ دونوں کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم آیا اور لوسی راما راؤ کے ساتھ کمرے سے نکل گئی۔

رات تاریک تھی۔

پاکستان اور بھارت کی سرحد کی فضا خاموش تھی۔ ستارے کچھ زیادہ ہی روشن لگتے تھے۔ ٹمٹماتے ہوئے یہ ستارے تاریکی کے پردے چاک کرنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔

سرحد کوئی ایسی دیوار نہیں تھی جو دن کو نظر آتی یا اندھیرے میں نظر نہ آتی تو کوئی اس سے ٹکرا کر پیچھے ہٹ جاتا کہ یہ تو دیوار ہے۔ سرحد ایک لکیر ہوتی ہے جو صرف نقشے پر نظر آتی ہے لیکن دو ملکوں کے درمیان اس کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ یہ لکیر دلوں میں کھنچی ہوئی ہوتی ہے اور یہ صرف انہیں نظر آتی ہے جو اپنے ملک کی سرحد کی حرمت اور عظمت کو پہچانتے ہیں اور یہ لکیر تاریکی میں بھی وطن کے اُن سرفروشوں اور جانبازوں کو نظر آ جاتی ہے جو سرحد کی لکیر کو اپنی کنواری بہن کی مانگ سمجھتے ہیں۔

پاکستان اور بھارت کے درمیان جو نظر نہ آنے والی ٹیڑھی میڑھی لکیر کھینچی ہوئی ہے وہ اپنے اندر لہو کے دریا جذب کر چکی ہے۔ سرحد وطن کی قربان گاہ ہے جس پر ماؤں نے اپنے سجیلے بیٹے، بہنوں نے اپنے گبھرو بھائی اور سہاگنوں نے اپنے سہاگ قربان کر دیئے ہیں۔ وطن سے محبت کرنے والے جانتے ہیں کہ سرحد خون مانگتی ہے اور اگر اس کا مطالبہ پورا نہ کیا جائے تو پورے وطن کی آبروریزی ہو جاتی ہے۔

پاکستان کی سرحد پر 1947ء میں لاکھوں مسلمانوں، ان کی مستورات اور ان کے بچوں کا خون بہہ گیا تھا۔ اس سرحد نے لاکھوں بچوں کی قربانی لی تھی، پھر پاکستان کے جیالے جوان اس خون کا خراج اپنے خون سے دیتے رہے۔

پاکستان کی سرحد کے ساتھ ساتھ جو ہری بھری کھیتیاں ہیں اور جو بنجر زمین ہے وہاں کہیں بھی کھدائی کریں تو اس میں سے ہڈیوں کے ڈھانچے برآمد ہوں گے۔ یہ مردوں، عورتوں اور بچوں کی ہڈیاں ہیں جو سرحد پار سے ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھوں زخمی ہو کر پاکستان میں آئے تھے۔ وہ صرف سرحد تک پہنچ سکے اور ایسے گرے کہ اُٹھ نہ سکے، پھر انہیں سرحد کے ساتھ ہی گڑھے کھود کر دفن کر دیا گیا۔ وہ بے کفن ہوئے تھے۔

بھارت کے بڑے ہی شدید اور طاقتور حملوں کو سہہ کر پاکستان ابھی تک جو زندہ ہے تو وہ پاکستان کے نام پر قربان ہونے والے انہی شہیدوں کی ہڈیوں کے صدقے زندہ ہے۔ ایک بزرگ نے سچ کہا تھا کہ پاکستان کا تحفظ شہید کر رہے ہیں۔

واہگہ کے قریب پاکستان کے دو کھیت ہیں۔ اگر ان دونوں کھیتوں کو کھودا جائے تو کم و بیش ہڈیوں کے اڑھائی سو ڈھانچے پہلو بہ پہلو پڑے ہوئے نظر آئیں گے۔ یہ مہاجرین کے ایک قافلے کے شہید تھے۔ اتنی زیادہ قبریں کھودنا ممکن نہ تھا۔ کالج کے لڑکوں نے لاہور شہر سے بلڈوزر منگوائے اور وسیع و عریض گڑھا کھود کر ان شہیدوں کو پہلو بہ پہلو رکھ دیا اور اوپر مٹی ڈال دی۔

آج وہاں سرسبز کھیتیاں لہرا رہی ہیں۔ شہیدوں کی ہڈیوں پر لوگوں نے دو دو تین منزلہ مکان بنا لئے ہیں .... اور ان ہڈیوں کے اوپر سے سمگلروں کی کاریں اور ٹرک گزرتے ہیں اور انہی ہڈیوں کے اوپر ملک کی عصمت و آبرو کا سودا ہوتا ہے۔

○

پاکستان کے نام پر شہید ہونے والوں کو پاکستانی اپنے ذہن اور دل سے کھرچ چکے تھے۔ پاکستان جوان ہو چکا تھا۔ ہمارا دشمن پاکستان کو اسی طرح دیکھ رہا تھا جس طرح بھیڑیا بھیڑ کے بچے کو دیکھتا ہے لیکن بھیڑیا جانتا تھا کہ یہ بچہ اب جوان ہو چکا ہے اور اس پر حملہ خطرے سے خالی نہیں۔ بھیڑیا جھپٹا بھی مگر اپنے دانت تڑوا کر سرحد پار جا بیٹھا اور اپنے زخم چاٹنے لگا۔ اب اس بھیڑیئے نے زمین کے نیچے جا کر اپنے پنجے پاکستان کی جڑوں میں ڈال دیئے تھے اور ان جڑوں کو کھوکھلا کر رہا تھا۔

سرحد کی وہ رات جتنی تاریک تھی اس سے کہیں زیادہ خاموش تھی۔ کسی وقت اونچی گھاس اور فصل میں، بڑی زور کی سرسراہٹ اٹھتی اور خاموشی میں تحلیل

ہو جاتی۔ یہ جنگلی سور تھے جو رات کے وقت سرحد کے اِدھر اُدھر اپنی خوراک کی تلاش میں آتے جاتے ہیں، یا کہیں دور سے اُلو کی آواز ابھرتی اور دب جاتی تھی۔

سرحد کی راتیں بڑی پراسرار اور خطرناک ہوتی ہیں۔ اُن کی خاموشی طوفان سے پہلے والی خاموشی کی مانند ہوتی ہے۔ سرحد کے رکھوالے کہتے ہیں کہ سرحد کی رات جتنی خاموش ہو اتنی ہی زیادہ پُرخطر ہوتی ہے۔ اس خاموشی میں ہلکی سی سرسراہٹ بھی سرحد کے رکھوالوں کو چوکنا کر دیتی ہے۔ اکثر ایسے بھی ہوتا ہے کہ کسی جنگلی سؤر کے پاؤں کے نیچے درخت کی خشک ٹہنی ٹوٹنے کی آواز پیدا ہو تو رینجر کا سپاہی اس طرف گولی چلا دیتا ہے۔

اُس رات پاکستان کی سرحد کے ساتھ ساتھ کھیتوں میں تین سائے سے چلے جا رہے تھے۔ وہ کچھ جھکے جھکے سے تھے اور قدم پھونک پھونک کر رکھ رہے تھے۔ وہ سرحد کی طرف بڑھے چلے جا رہے تھے۔

"بس پہنچ ہی گئے ہیں" —ان میں سے ایک کی سرگوشی ابھری— "تھوڑا سا ہی فاصلہ ہے"۔

"فاصلہ زیادہ ہوا تو کیا!" —ایک اور سرگوشی ابھری جو کچھ زیادہ ہی پُرعزم تھی— "میں پہلی بار یہاں نہیں آیا۔ پہلے ایک بار اس پُل صراط سے گزر چکا ہوں۔ گھبراؤ نہیں"۔

"ہم گھبرانے والے لوگ نہیں صغیر بھائی!" —ان میں سے ایک نے کہا— "بارڈر پر ہر روز ایک جیسے حالات نہیں رہتے۔ کبھی ہم یوں گزر جاتے ہیں جیسے یہ اپنے شہر کی گلی ہو اور کبھی ایسے حالات ہو جاتے ہیں کہ قدم قدم پر موت نظر آتی ہے .... ہوشیار رہنا"۔

"وہ آئے ہوئے ہوں گے" —ایک اور سرگوشی ابھری۔

ان میں ایک صغیر تھا اور دو اس کے ساتھی تھے۔ دونوں ہندو تھے جو صغیر کو سرحد پار لے جا رہے تھے۔ صغیر کے ساتھ زبردستی نہیں کی جا رہی تھی بلکہ یہ اس کی شدید خواہش تھی کہ انڈیا کی سیر کرے۔ اس کے دل میں یہ خواہش مُنی نے پیدا کی تھی۔ مُنی نے اس پر اپنے حُسن و جوانی کا نشہ طاری کر رکھا تھا اور اسے خاص قسم کے ٹرانکولائزر دیئے جاتے رہے تھے۔ مُنی اور ان دوائیوں نے مل کر اس کی برین واشنگ کا عمل مکمل

کر دیا تھا۔ مکمل بھی ایسا کہ صغیر اپنی ذات کو، اپنے دین و ایمان کو اور اپنی اصلیت کو بالکل ہی بھول گیا تھا۔ اس کے ذہن پر انڈیا جنّت کی صورت سما گیا تھا اور اس کے لئے وہ ہر قربانی دینے کے لئے تیار ہو گیا تھا۔

اُس کی اصل برین واشنگ تو مُنّی نے کی تھی جو اتنی زیادہ پُرکشش اور خوبصورت تھی یا نہیں، اس نے اداکاری ایسی پُرکشش کی تھی کہ صغیر اُسی کا ہو کر رہ گیا تھا۔ مرد کی سب سے بڑی کمزوری کا تیکھا پنجہ صغیر کی عقل و ہوش میں اُتر گیا تھا۔ یہ وہی صغیر تھا جس کا بھائی انہی تخریب کاروں کے ایک دھماکے میں مارا گیا تھا اور صغیر نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ان کا ساتھ چھوڑ دے گا۔ اُس نے ایذا رسانی کے ان مرحلوں میں بھی اپنے جسم کو پتھر بنا لیا تھا جن مرحلوں میں سے کوئی زندہ نہیں نکل سکتا۔ اس کی زبان پر انکار ہی رہا اور وہ غیر انسانی اور مہلک اذیتیں برداشت کرتا رہا لیکن اسی پتھر کو ایک حسین و جمیل لڑکی نے اپنی دلکش اداکاری سے موم کر لیا اور اس موم کو اپنے سانچے میں بلکہ اپنے ملک اور اپنے دین کے ازلی دشمن کے سانچے میں ڈھال لیا تھا۔

وہ صغیر اب دو ہندوؤں کے ساتھ اُس دیس کو جا رہا تھا جس دیس میں گنگا بہتی ہے۔ صغیر اپنے مرے ہوئے بھائی کو ہی نہیں بلکہ اپنے مقدس وطن کو ہی دل سے اُتار چکا تھا۔



جاسوس اور سمگلر سرحد پار کرتے ہی رہتے ہیں۔ سرحد پر رینجرز بھی ہوتے ہیں اور اُس طرف بارڈر سیکورٹی فورس بھی ہوتی ہے۔ جاسوس اور سمگلر دونوں طرف کے پہریداروں کو اور سرحد کے رکھوالوں کو جل دے کر اِدھر اُدھر ہو جاتے ہیں اور کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ سرحد کے پہریدار اور بارڈر کراس کرنے والے اچانک آمنے سامنے آ گئے اور گولی چل گئی۔

صغیر اور اس کے ساتھی سرحد کے اُس مقام پر پہنچ گئے جہاں سے گزرنا کوئی زیادہ خطرناک نہیں تھا۔ انڈیا کی زمین دس بارہ قدم کے فاصلے پر رہ گئی تھی۔ یہ ایک برساتی نالہ تھا جو خشک پڑا تھا۔ یہ تینوں اس نالے میں اس کے اونچے کنارے کی اوٹ میں چلے جا رہے تھے۔ صغیر خالی ہاتھ تھا۔ اس کے دونوں ساتھیوں کے پاس ریوالور تھے۔ صغیر کو مصلحتاً خالی ہاتھ رکھا گیا تھا کیونکہ کسی بھی لمحے اس کے بگڑ جانے کا خطرہ موجود تھا۔

اس نالے نے انہیں سرحد پار لے جاتا تھا۔ اچانک دو تین سؤر بڑے تیز دوڑتے آئے۔ وہ شاید آپس میں لڑ رہے تھے۔ ان میں سے ایک اونچے کنارے سے پھسل کر نیچے آ پڑا۔ نیچے یہ تینوں جا رہے تھے۔ اوپر سے دو تین اور سؤر جو شاید گرنے والے سؤر کے تعاقب میں تھے، وہ بھی نیچے کو کود آئے اور ان تینوں پر گرے۔ اندھیرا اتنا سیاہ تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ ایک ہندو کی چیخ نکل گئی۔ دوسرے ہندو نے اسے چُپ رہنے کو کہا لیکن بڑی بلند آواز سے کہا۔

رات کی خاموشی میں یہ آوازیں لاؤڈ سپیکر کی آوازوں جیسی بلند سنائی دیں۔ ایک ہی بار دو یا تین رائفلیں فائر ہوئیں یا کلاشنکوف کا مختصر سا برسٹ فائر ہُوا۔ یہ پاکستان کے ایک رینجر نے ان آوازوں پر فائر کیا تھا۔ یہ رینجرز کا گشتی پہرہ تھا جو کہیں قریب ہی سے گزر رہا تھا۔ ان کی چلائی ہوئی گولیاں ان تینوں کے درمیان سامنے والے کنارے پر لگیں۔

"بھاگو" — ایک ہندو نے کہا۔

"انڈیا کی طرف بھاگنا" — دوسرا ہندو بولا — "پیچھے کو نہ دوڑنا۔ ہم پہنچ گئے ہیں"۔

"مجھے گولی لگ گئی ہے" — صغیر نے کہا۔

"کہاں؟"

"گولی ران میں سے گزر گئی ہے" — صغیر نے جواب دیا — "فکر نہ کرو، میں گروں گا نہیں"۔

رینجرز کی طرف سے چند اور گولیاں آئیں لیکن وہ دُور دُور گریں۔ رینجر تاریکی میں اپنے ٹارگٹ کو دیکھے بغیر گولیاں چلا رہے تھے۔ دونوں ہندو خاصے تیز دوڑ رہے تھے اور صغیر ران میں سے گولی گزر جانے کے باوجود اُن کا ساتھ دے رہا تھا۔ یہ نالہ مڑ کر سرحد کے ساتھ ہو گیا تھا۔ گولیاں بند ہو گئی تھیں۔ صغیر کی رفتار خاصی کم ہو گئی تھی۔ ٹانگ کا درد اس پر غالب آ گیا تھا اور خون بڑی تیزی سے بہہ رہا تھا۔

اس کے ہندو ساتھی ڈھلانی کنارے سے اوپر چڑھنے لگے اور صغیر نے بھی چڑھنے کی کوشش کی لیکن گر پڑا۔ دونوں ہندوؤں نے اسے کچھ اٹھایا، کچھ دھکیلا، کچھ گھسیٹا اور اوپر لے گئے۔ وہ اب انڈیا میں تھے۔

وہاں سے کچھ دور آگے لے جاکر صغیر کے ساتھیوں نے اسے ایک درخت کے ساتھ بٹھادیا۔ ان میں سے ایک نے اپنا رومال نکالا اور اسے اچھی طرح تہہ کر کے صغیر کے زخم پر رکھ دیا۔ تب پتہ چلا کہ زخم تو دونوں طرف ہے۔ گولی ایک طرف سے داخل ہوئی دوسری طرف نکل گئی تھی۔ دوسرے ہندو نے اپنا رومال نکالا اور اس کا پیڈ بنا کر دوسری طرف کے زخم پر رکھ دیا۔ ایک ہندو نے اپنی قمیض کی آستین کندھے تک الگ کرلی اور یہ صغیر کی ران پر کس کر باندھ دی۔

"معلوم نہیں ہم کہاں ہیں" —— ایک ہندو نے کہا —— "یہ کیسے پتہ چلے کہ بارڈر فورس کی کوئی پوسٹ قریب ہے یا نہیں"۔

"یوں کرتے ہیں" —— دوسرے ہندو نے کہا —— "تم اس طرف جاؤ اور میں اُدھر طرف جاتا ہوں۔ جسے پوسٹ مل گئی وہ وہاں سے کسی کو ساتھ لے آئے۔ شاید وہاں سے جیپ بھی مل جائے"۔

یہ ہندو اب اپنے ملک میں تھے اور جاسوس تھے اور ایک پاکستانی جاسوس کو ساتھ لائے تھے۔ ان کی حیثیت سرکاری تھی۔ انہیں انڈیا کا وزیراعظم اور صدر بھی نہیں روک سکتا تھا۔ بارڈر سیکیورٹی فورس والے تو ان کے پابند تھے۔ انہیں صغیر کی خاطر مدد کی ضرورت تھی۔ ان دونوں میں سے ایک؛ ایک طرف اور دوسرا دوسری طرف چلا گیا۔ صغیر درد کی شدت برداشت کرنے کی کوشش میں مصروف ہوگیا۔

جسمانی طور پر صغیر شدید درد میں مبتلا تھا۔ گولی کا زخم چھری چاقو کے زخم سے بہت مختلف ہوتا ہے اور اس کا درد بھی مختلف ہوتا ہے۔ وہ اس لئے کہ گولی جسم کو کاٹتی بھی ہے اور جلاتی بھی ہے کیونکہ وہ سخت گرم ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اتنی دور سے دوڑتے اور چلتے آنے کی وجہ سے خون بڑی تیزی سے نکل گیا تھا جو ابھی تک رکا نہیں تھا۔ جسم کا آدھے سے زیادہ خون نکل گیا تھا۔ اس وجہ سے وہ نقاہت بھی محسوس کر رہا تھا۔ اندھیرا تو تھا ہی لیکن تھوڑی تھوڑی دیر بعد صغیر کو یوں لگتا تھا جیسے اندھیرا اور زیادہ گہرا ہوگیا ہو۔ جس درخت کے نیچے وہ بیٹھا تھا اس کی شاخوں میں سے اسے ستارے نظر آتے تھے۔ دو تین بار اس نے محسوس کیا جیسے ستارے یا پورے کا پورا آسمان ایک چکر میں چل پڑا ہو۔ آسمان رکتا تھا اور پھر ایک چکر میں چل پڑتا تھا۔

جوں جوں اسے چکر آتے گئے' نقاہت بڑھتی گئی اور درد ناقابلِ برداشت ہوتا گیا۔ اس کے ذہن میں بیداری سی آتی گئی۔ وہاں ممی بھی نہیں تھی اور وہ ٹرانکولائزر بھی نہیں تھے جو اس کے ذہن کو سُلائے رکھتے تھے۔ جوں ہی اس کا ذہن بیدار ہوتا تھا اور اس کے منہ سے حقیقت کی کوئی بات نکل جاتی تھی تو ممی پہنچ جاتی اور اس کے ساتھ ہی اسے پینے والی کسی چیز میں نشے والی دوائی پلا دی جاتی تھی مگر وہاں انڈیا کی سرحد پر ایک درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے وہ صرف حقیقت کو ہی دیکھ سکتا تھا یا اپنے قریب سے گزرتے ہوئے کسی سؤر کے قدموں کی آہٹ سن سکتا ہے۔

سرحد پر دونوں طرف رات کے وقت سؤر اور سمگلر ہی آتے جاتے ہیں۔

صغیر کو کچھ ایسے محسوس ہونے لگا کہ وہ زندہ نہیں رہ سکے گا۔ اس کے دل پر خوف سا طاری ہونے لگا۔ اس نے اپنی ران پر بندھے ہوئے کپڑوں پر ہاتھ رکھا تو اس کا ہاتھ خون سے لتھڑ گیا۔ خون بدستور بہہ رہا تھا۔

صغیر کو اپنے عزیز یاد آنے لگے اور پھر اُس کا ذہن اسے اس کمرے میں لے گیا جہاں بند کر کے اسے اذیتیں دی گئی تھیں اور اسے بار بار کہا جاتا تھا کہ مان جاؤ تم ہمارا ساتھ نہیں چھوڑو گے۔ اس یاد نے اس پر کوئی اور ہی تاثر پیدا کر دیا۔ یہ تاثر اُس کی اس خواہش پر غالب آنے لگا کہ وہ انڈیا کی سیر کرے گا۔

"واپس چلے جاؤ صغیر!" —— اسے جیسے اپنی آواز سنائی دی ہو —— "پاکستان دور نہیں"۔

"پاکستان میں کیا رکھا ہے" —— یہ دوسری آواز تھی —— "پاکستان نے مجھے دیا ہی کیا ہے"۔

"پاکستان دور نہیں" —— اُس کی ذات سے آواز اٹھی —— "یہ نالہ اُترو اور سامنے والے کنارے پر چڑھ جاؤ"۔

اسے خیال آیا کہ وہ واپس چلا جائے تو آوازیں دے کر رینجرز کو بلا لے اور انہیں بتائے کہ وہ انڈیا کے دو جاسوسوں کے ساتھ انہیں پکڑوانے کے لئے آیا تھا لیکن خود زخمی ہو کر پیچھے رہ گیا ہے اور وہ نکل گئے ہیں۔ اسے وہ کوٹھی معلوم تھی جس میں اسے قید میں رکھ کر اذیتیں دی گئی تھیں اور پھر برین واشنگ کر کے اسے پھر اپنے رنگ میں رنگ لیا تھا۔ اس نے ارادہ کیا کہ جا کر اس کوٹھی کی بھی نشاندہی کرے اور اس طرح اس کے گناہوں کا کفارہ ادا ہو جائے گا۔

درد کی ایسی شدید ٹیس اُٹھی کہ اس کے دانت کٹکٹانے لگے اور اس کے ذہن میں جو خیالات آئے تھے وہ اس طرح نکل گئے جیسے الٹنے سے برتن خالی ہو جاتا ہے۔ اب تو اس پر غشی کے دورے پڑنے لگے تھے۔ ذرا ہوش ٹھکانے آتے تو اسے اپنے سامنے موت ناچتی نظر آتی۔

اس نے اتنا ہی محسوس کیا کہ وہ ایک طرف کو لڑھک رہا ہے۔ پھر اس کی آنکھوں کے سامنے رات اور تاریک ہو گئی اور ذہن پر بھی سیاہ پردہ چھا گیا۔



وہ جب ہوش میں آیا تو اسے خواب کا دھوکا ہُوا۔ ایک خیال یہ بھی آیا کہ وہ غشی میں ہے اور اسے واہمے نظر آنے لگے ہیں اور اسے خیال آیا کہ یہ جو کچھ ہے یہ حقیقت نہیں۔ وہ ایک نرم سے بستر پر لیٹا ہُوا تھا۔ زخم کے درد کا نام و نشان نہیں تھا۔ اس کے بازو میں ایک سوئی لگی ہوئی تھی۔ اس نے اوپر دیکھا تو اسے پتہ چلا کہ اسے گلوکوز اور خون دیا جا رہا ہے۔

وہ جالندھر کے ملٹری ہسپتال کے ایک کمرے میں پڑا ہُوا تھا۔ ایسے کمرے افسروں کے لئے مخصوص ہوتے تھے۔ اس ہسپتال میں وہ اس طرح پہنچا تھا کہ اس کا ایک ہندو ساتھی بارڈر سیکیورٹی فورس کی ایک بڑی پوسٹ پر پہنچ گیا۔ وہاں اس نے بتایا تھا کہ وہ انٹیلی جنس کا آدمی ہے اور پھر اس نے بتایا کہ اس کے ساتھیوں پر کیا بیتی ہے۔ اس پوسٹ کے کمانڈر نے اپنے کمانڈر کو فون پر بتایا تو ایک جیپ آگئی۔ اس جیپ پر وہاں پہنچے جہاں صغیر کو بٹھا آئے تھے۔ اُس وقت تک وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ اسے جیپ میں ڈال کر بڑی پوسٹ پر لے گئے جہاں خون روکنے کے لئے اسے فرسٹ ایڈ دی گئی اور صبح تک اسے جالندھر ملٹری ہسپتال میں پہنچا دیا گیا۔ ہسپتال کے صرف کمانڈنٹ کو بتایا گیا کہ یہ پاکستانی ہے اور انڈین انٹیلی جنس کا کارندہ ہے۔

صغیر کو معلوم نہیں تھا کہ اس کے کمرے کے باہر سول کپڑوں میں آرمی کا ایک آدمی پہرے پر موجود ہے۔ صغیر کے ہندو ساتھیوں نے ہسپتال کے کمانڈنٹ کو جو ایک مشہور سرجن تھا' بتایا تھا کہ اس زخمی کو ذرا نشے میں رکھنا ہے۔ چنانچہ صغیر کو گلوکوز کے ساتھ ہی ٹرانکولائزر دیئے جانے لگے۔

اگلے ہی روز دلّی سے انڈین انٹیلی جنس کا ایک کرنل آگیا۔ وہ صغیر سے اس طرح ملا

جیسے باپ کو ایک عرصے بعد گمشدہ بچہ مل گیا ہو۔ اس کرنل نے صغیر سے کہا کہ اسے یہاں نہیں رہنے دیا جائے گا بلکہ انبالہ کے ملٹری ہسپتال میں رکھا جائے گا۔

اگلے ہی روز صغیر کو ایک وہیل چیئر پر بٹھا کر ایمبولینس تک پہنچایا گیا۔ ایمبولینس اسے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر تک لے گئی جہاں سے اسے پھر وہیل چیئر پر بٹھا کر ہیلی کاپٹر تک لے گئے اور اس میں سوار کرا دیا گیا۔ ہیلی کاپٹر زمین سے اٹھا تو صغیر نے یوں محسوس کیا جیسے اس کی شخصیت پستی سے اُٹھ کر ایسی بلندی پر پہنچ گئی ہو جہاں تک کوئی عام آدمی نہیں پہنچ سکتا۔ اسے وی آئی پی بنا دیا گیا تھا۔ ہیلی کاپٹر میں اسے سٹریچر پر لٹایا گیا تھا اور اس کے بازوؤں میں بدستور خون اور گلوکوز لگا ہُوا تھا۔

انسانی فطرت بہت مضبوط بھی ہے اور کمزور اتنی کہ ذرا سی ٹھوکر سے ٹوٹ پھوٹ جائے۔ ضروری نہیں کہ ٹھوکر بڑی ہی سخت ہو۔ کسی دانشمند کو صبح شام یہ کہنے لگو کہ تم احمق ہو اور اس کے کانوں میں یہی الفاظ ڈالتے چلے جاؤ تو وہ احمقوں جیسی حرکتیں کرنے لگے گا اور صغیر جیسے چھوٹے سے آدمی کے کان میں یہ ڈالنا شروع کر دو کہ تم تو بہت بڑے آدمی ہو اور اس کے ساتھ عملاً اسے ہاتھوں پر اٹھانا شروع کر دو اور اس کے آگے چند آدمی بار بار آ کر جھکیں تو وہ اپنے آپ کو مہاراجہ سمجھ لیتا ہے۔

صغیر کو گولی کا زخم اپنے آپ میں لے آیا تھا لیکن انٹیلی جنس کے کرنل نے جب آ کر اس کا پُرتپاک استقبال کیا اور پھر جب اسے ہیلی کاپٹر میں بٹھایا گیا اور جب ہیلی کاپٹر کے پائلٹ نے اس سے ان الفاظ میں پوچھا —— "سر! کوئی تکلیف ہو تو فوراً بتانا" —— تو صغیر غبارے کی طرح پھُول گیا اور ہیلی کاپٹر سے اونچا اُڑنے لگا۔

یہ انٹیلی جنس والے ہی بہتر سمجھتے تھے کہ اسے انبالہ ہسپتال میں کیوں لے جایا گیا۔ ہیلی کاپٹر انبالہ کے ملٹری ہسپتال کے قریب اُترا۔ ہسپتال والوں کو پہلے اطلاع دے دی گئی تھی کہ ایک وی آئی پی زخمی حالت میں آ رہا ہے۔ ایک آدمی صغیر کے ساتھ تھا۔ یہ وہی آدمی تھا جو جالندھر ملٹری ہسپتال میں صغیر کے کمرے کے باہر موجود رہتا تھا۔

ہیلی کاپٹر انبالہ ہسپتال کے قریب اُترا تو ایمبولینس بڑی تیزی سے ہیلی کاپٹر تک پہنچی۔ چار آدمیوں نے صغیر کا سٹریچر اٹھایا اور ایمبولینس میں ڈال دیا۔ گلوکوز اور خون کے بیگ دو آدمیوں نے اپنے ہاتھوں میں اٹھا رکھے تھے۔ ہسپتال کے دو فوجی افسر وہاں موجود تھے۔ دونوں نے صغیر کو سیلوٹ کیا۔ صغیر نے سیلوٹ کا جواب سیلوٹ سے دیا۔

صغیر اپنی اصلیت کو بھلا بیٹھا۔ وہ سمجھ نہ سکا کہ جس اصلیت کو وہ بھلا بیٹھا ہے وہ ان بھارتیوں کی آنکھوں کے سامنے ہے اور وہ اس کی اصلیت کو بڑی اچھی طرح جانتے ہیں اور انہوں نے اسے وی آئی پی اسی لئے بنایا ہے کہ وہ ان کے سانچے میں ڈھل جائے اور ان کی انگلیوں پر ناچے۔ ان بھارتیوں کی نگاہ میں صغیر ایمان فروش اور غدار تھا اس لئے وہ اس پر اعتماد نہیں کر سکتے تھے۔ وہ انہیں بھی دھوکہ دے سکتا تھا۔

صغیر کو ملٹری ہسپتال کے ایک الگ کمرے میں لے گئے۔ چونکہ اس کا خون بہت ضائع ہو گیا تھا اس لئے اسے مسلسل خون دیا جا رہا تھا۔ زخم بھی کچھ پیچیدہ سا تھا۔ خطرہ تھا کہ ٹانگ کی کوئی اہم رگ کٹ گئی ہو گی۔ ظاہر ہے ہسپتال والوں کو بتایا گیا ہو گا کہ یہ زخمی انٹیلی جنس کے لئے بہت اہم ہے اس لئے ہسپتال کے ڈاکٹر بھی صغیر پر خصوصی توجہ دے رہے تھے۔ ایک نرس بار بار اسے آکر دیکھتی اور حال احوال پوچھتی تھی۔ جس آدمی کو کمرے کے باہر ڈیوٹی پر بٹھایا گیا تھا وہ تھا تو پہرہ دار لیکن اوپر والوں کے حکم کے مطابق وہ صغیر کے ساتھ اس طرح سلوک اور برتاؤ کرتا تھا جیسے وہ اس کا خادم ہو اور اس کی خدمت کے لئے اسے وہاں بھیجا گیا ہو۔ ایک ڈاکٹر دن رات میں کئی بار صغیر کو دیکھنے آتا تھا۔ وہ فوجی نہیں سویلین ڈاکٹر تھا۔ یہ ڈاکٹر گلوکوز یا خون کی نالی میں ایک انجکشن صبح اور ایک انجکشن شام کو ڈالتا تھا۔

صغیر کے ذہن سے ایک بار پھر پاکستان، اپنا مرا ہوا بھائی اور عزیز و اقارب نکل گئے۔ اسے تو جیسے یہ بھی یاد نہیں آ رہا تھا کہ اس کا مذہب کیا ہے۔ کمرے میں کسی کو بھی آنا ہوتا، خواہ وہ ڈاکٹر ہوتا یا کوئی اور افسر، وہ دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر آتا تھا۔ صغیر کی جذباتی حالت یہ تھی کہ جب بھی دروازے پر دستک ہوتی وہ چونک کر اور بڑے اشتیاق سے دروازے کی طرف اس امید پر دیکھتا کہ مُنی آئی ہے۔ لاہور سے رخصت ہوتے وقت مُنی نے اُسے کہا تھا کہ وہ گاڑی پر انڈیا جائے گی اور اس سے پہلے پہنچ جائے گی اور اس کا استقبال کرے گی۔

کچھ دنوں بعد صغیر خون اور گلوکوز کی ان نالیوں اور سُوئیوں سے جو اُس کے بازو میں اُتری رہتی تھیں، آزاد ہو گیا۔ اب اسے زخم نے پابند کر رکھا تھا۔ گولی کا زخم اتنی جلدی ٹھیک نہیں ہُوا کرتا۔ اسے اب باتھ روم تک جانے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ باتھ روم کمرے کے ساتھ ہی تھا۔ صغیر چل تو سکتا تھا لیکن ذرا زیادہ چلنے سے ران کے اندر

درد شروع ہو جاتا تھا۔

صغیر کے کمرے کے دروازے پر جو آدمی موجود رہتا تھا وہ سویلین تھا اور اس کا تعلق انٹیلی جنس کے ساتھ تھا۔ وہ صغیر کے پاس جا بیٹھتا اور گپ شپ لگاتا تھا۔ وہ دراصل یہ جائزہ لیتا رہتا تھا کہ صغیر ذہنی طور پر بیدار ہے یا اس کے احساسات سوئے ہوئے ہیں۔

صغیر کی ذہنی بیداری انجکشنوں سے ختم کر دی گئی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ جسمانی طور پر بیدار رہتا تھا۔ وہ نشے والی ان دوائیوں کا عادی ہو چکا تھا۔ وہ بظاہر جاگتا رہتا تھا لیکن اس کا ذہن سویا ہُوا ہوتا تھا۔ یوں کہہ لیں کہ اس کی عقل اور ہوش پر پردہ پڑا ہُوا تھا۔

اس کا پہرہ دار اس کے ساتھ خاصا بے تکلف ہو گیا۔ ایک روز پہرہ دار اس خیال سے کچھ دیر کے لئے کسی کام سے چلا گیا کہ صغیر چل پھر تو سکتا نہیں، اس نے کہاں بھاگ جانا ہے۔ جو سویلین ڈاکٹر صغیر کو انجکشن وغیرہ دینے آتا تھا، وہ آیا تو اس نے بھی حسبِ معمول صغیر کے ساتھ بے تکلفی کے انداز میں باتیں کیں۔ ڈاکٹر کی عمر تیس بتیس سال تھی اور وہ جسم اور دماغ کے لحاظ سے خاصا مستعد اور سمارٹ تھا۔

"ڈاکٹر صاحب!" ـــ صغیر نے پوچھا ـــ "چھٹی کب ملے گی؟"

"چھٹی کا انحصار آپ کے زخم پر ہے" ـــ ڈاکٹر نے دوستانہ انداز میں کہا ـــ "کیا جلدی ہے آپ کو؟ کچھ دن اور ہمارے مہمان رہیں اور ہمیں مزید خدمت کا موقع دیں"۔

"آپ شاید مسلمان ہیں" ـــ صغیر نے کہا ـــ "آپ کا انداز اور آپ کی باتیں بتاتی ہیں کہ آپ مسلمان ہیں"۔

"آپ کا اندازہ صحیح ہے" ـــ ڈاکٹر نے کہا ـــ "میرا نام عبدالرشید ہے .... کیا آپ بھی ...."

"جی ہاں" ـــ صغیر درمیان میں بول پڑا ـــ "میں بھی مسلمان ہوں اور میرا نام صغیر احمد ہے"۔

"آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟"

"میرٹھ!" ـــ صغیر نے جھوٹ بولا۔

ڈاکٹر صغیر کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے بار بار دروازے کی طرف دیکھتا تھا جیسے کوئی خطرہ محسوس کر رہا ہو۔ یہ تو اسے بتا دیا گیا تھا کہ یہ خاص قسم کا مریض ہے اور یہ تو ڈاکٹر نے دیکھ ہی لیا تھا کہ اسے فوجی یہاں لائے تھے اور ڈاکٹر کو یہ بھی معلوم تھا کہ اس مریض کا تعلق انٹیلی جنس کے ساتھ ہے۔ اب اسے پتہ چلا کہ یہ مریض مسلمان ہے تو اس کا تجسس بڑھ گیا۔ یہ دراصل تجسس نہیں تھا بلکہ یہ ایک جذبہ سا تھا لیکن اس کے چہرے سے پتہ چلتا تھا کہ وہ اس جذبے کا اظہار کرنے سے گھبراتا ہے۔



صغیر کی دیکھ بھال کے لئے ایک نرس بھی تھی جس کی عمر پچیس چھبیس سال تھی۔ شکل و صورت میں کشش تھی اور اس کا جسم سمارٹ تھا اور رنگ بھی کچھ گورا گورا سا تھا۔ اپنی ڈیوٹی کے دوران وہ سات آٹھ مرتبہ صغیر کو دیکھنے آتی' اس کا ٹمپریچر' نبض اور بلڈ پریشر چیک کرتی اور جس دوائی کا وقت ہوتا وہ اسے دے دیتی تھی۔ وہ خود تو صغیر کے ساتھ بے تکلف نہ ہوئی' صغیر نے اسے اپنے ساتھ ذرا کھول لیا تھا۔

"تم میری اتنی زیادہ خدمت کرتی ہو" —— ایک روز صغیر نے اس نرس سے کہا اور پوچھا —— "تمہارا نام کیا ہے؟"

"خالدہ" —— نرس نے جواب دیا۔

"اور یہ جو دوسری نرس تمہاری ڈیوٹی کے بعد آتی ہے" —— صغیر نے پوچھا۔ "ہندو ہے یا کرسچین؟ .... ویسے وہ بھی تمہاری طرح میرا بہت خیال رکھتی ہے"۔

"وہ کرسچین ہے" —— خالدہ نے کہا۔

دوسری نرس جو کرسچین تھی شام کی ڈیوٹی پر آیا کرتی تھی۔ خالدہ کی ڈیوٹی ان دنوں صرف دن کی تھی۔ کرسچین نرس کی عمر کم و بیش پینتیس سال تھی اور اس کا رنگ گہرا سانولا اور جسم خاصا فربہ تھا۔

"میرا خیال ہے آپ بھی مسلمان ہیں" —— خالدہ نے قدرے جھجکتے ہوئے کہا۔ "آپ کا بیڈ کارڈ یہاں ہونا چاہئے تھا۔ معلوم نہیں آپ کا بیڈ کارڈ یہاں کیوں نہیں رکھا گیا۔ بہرحال میں نے ایک جگہ آپ کا نام پڑھ لیا تھا"۔

"ہاں خالدہ!" —— صغیر نے کہا —— "میں مسلمان ہوں اور میں میرٹھ کا رہنے والا ہوں"۔

"میرٹھ میں مسلمانوں پر کیا گزر رہی ہے؟" —— خالدہ نے پوچھا اور اسے بتایا —— "وہاں تو آئے دن دنگا فساد ہوتا رہتا ہے اور مسلمان بیچارے قتل ہوتے رہتے ہیں' ہندو ان کے گھروں کو لوٹ لیتے ہیں اور ان کی عورتوں کی بے حرمتی کرتے ہیں"۔

"ہاں خالدہ!" —— صغیر نے کہا —— "ہوتا تو یہی ہے .... کیا یہاں کے ہندو مسلمانوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ نہیں کرتے؟"

"آپ کے اس سوال کا جواب دیتے ڈر لگتا ہے" —— خالدہ نے کہا —— "یہاں کے مسلمان نام کے مسلمان ہیں۔ خوف و ہراس میں زندگی گزار رہے ہیں۔ ہندوؤں کو جھک جھک کر سلام کرتے ہیں۔ مسجدیں تو ہیں لیکن نمازی نہیں۔ میں یہیں انبالہ کی رہنے والی ہوں .... معاف رکھنا صغیر صاحب! میں نے فضول باتیں شروع کر دی ہیں۔ خدا کے لئے یہاں کسی کو یہ نہ بتا دیجئے گا کہ میں نے آپ کے ساتھ یہ باتیں کی ہیں"۔

"کیا تمہیں مجھ پر اتنا بھی اعتبار نہیں خالدہ!" —— صغیر نے پوچھا —— "کیا تم مجھ سے یہ توقع رکھتی ہو کہ میں تمہاری شکایت کر کے تمہیں سزا دلواؤں گا؟"

خالدہ کا سر جھک گیا۔

"کیا بات ہے خالدہ!" —— صغیر نے اپنائیت کے لہجے میں پوچھا۔

خالدہ نے سر اٹھایا تو صغیر نے دیکھا کہ لڑکی کی آنکھوں میں آنسو تھے جو اس نے فوراً ہاتھ سے پونچھ ڈالے۔

"بیٹھ جاؤ خالدہ!" —— صغیر نے اپنے بیڈ پر پرے کو سرکتے ہوئے کہا —— "یہاں بیٹھو"۔

خالدہ نے کچھ کہنے کی بجائے سر ہلایا جس کا مطلب تھا کہ وہ اس کے پاس نہیں بیٹھے گی کیونکہ کسی نرس کو کسی مرد مریض کے پاس بیٹھنے کی اجازت نہیں تھی۔

"میں جاؤں؟" —— خالدہ نے غمزدہ سی آواز میں پوچھا۔

"میں تمہیں روک نہیں سکتا" —— صغیر نے کہا —— "لیکن یہ سوچ لو کہ تمہارے آنسو مجھے پریشان کر رہے ہیں اور تم چلی جاؤ گی تو میں اور زیادہ پریشان ہوں گا"۔

"ان آنسوؤں کی بات سنانے سے تو ڈرتی ہوں" —— خالدہ نے کہا۔

"کیوں ڈرتی ہو؟"

"غور فرمائیں صغیر صاحب!" —— خالدہ نے دبی دبی سی آواز میں کہا —— "ہم

مسلمان اتنے مجبور ہیں کہ ایک دوسرے کو اپنا دکھ بھی نہیں سنا سکتے۔ اگر آپ اجنبی ہوتے تو میں کُھل کر بات کرتی .... لیکن صغیر صاحب! آپ خود مسلمان ہیں اور انڈیا میں رہتے ہیں، کیا آپ نہیں جانتے کہ مسلمان یہاں کتنے مجبور اور بے بس ہیں؟"

"جانتا ہوں خالدہ!" —— صغیر نے کہا۔

"اچھا میں چلتی ہوں" —— خالدہ نے کہا اور کمرے سے نکل گئی۔

صغیر کی نظریں دروازے کے ان کواڑوں پر لگی رہیں جو خالدہ بند کر کے چلی گئی تھی۔



صغیر کے شب و روز اس کمرے میں اسی بیڈ پر گزر رہے تھے۔

خالدہ کے جانے کے ڈیڑھ دو گھنٹے بعد ڈاکٹر عبدالرشید آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں سرنج تھی جس میں دوائی بھری ہوئی تھی۔ یہ اس نے صغیر کو انجکشن دینا تھا۔

"بیٹھیں ڈاکٹر صاحب!" —— صغیر نے کہا —— "انجکشن لگتے ہی رہتے ہیں تھوڑی دیر بعد سہی .... میرٹھ میں تو مسلمانوں کا جینا حرام ہو رہا ہے، میرا خیال ہے آپ لوگ یہاں انبالہ میں پرسکون زندگی گذار رہے ہیں"۔

"ہاں صغیر بھائی!" —— ڈاکٹر رشید نے کہا —— "غلام جب غلامی کو ذہنی طور پر قبول کر لیتے ہیں تو اُن کی زندگی پرسکون ہو جاتی ہے۔ جس دل سے آزادی کی تڑپ نکل جاتی ہے اور وہ اپنے آقا کو اَن داتا سمجھ لیتا ہے، وہ دل بہت خوش رہتا ہے .... میرٹھ میں آپ لوگ ہندوؤں کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اکثریت میں تو ہندو ہی ہیں۔ حکومت بھی ہندوؤں کی ہی ہے۔ پولیس ان کے ساتھ ہوتی ہے۔ مسلمان قتل اور زخمی ہونے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتے لیکن ہم لوگ بہت بُری اقلیت میں ہیں اس لئے دبے دبے رہتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ یہاں وہ دنگا فساد نہیں ہوتا جو میرٹھ میں ہوتا ہے"۔

خالدہ تو بات کرتے ڈر گئی تھی، ڈاکٹر عبدالرشید کے انداز میں وہ ڈر نہیں تھا۔ وہ یہ بھی بھول گیا کہ صغیر کا تعلق فوج اور انٹیلی جنس کے ساتھ ہے۔ اس نے صرف یہ ذہن میں رکھا کہ صغیر مسلمان ہے۔ وہ دونوں خاصی دیر باتیں کرتے رہے۔

"ایک بات بتائیں صغیر صاحب!" —— ڈاکٹر رشید نے پوچھا —— "آپ کو یہ انجکشن کیوں دیئے جا رہے ہیں؟"

"ڈاکٹر آپ ہیں!" —— صغیر نے کہا —— "یہ تو آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ مجھے کیا دیا جا رہا ہے اور کیوں دیا جا رہا ہے"۔

"آپ کا نسخہ میں نے نہیں لکھا" —— ڈاکٹر عبدالرشید نے کہا —— "صبح کے وقت وہ میجر ڈاکٹر راؤنڈ پر آتا ہے، آپ کا نسخہ وہ لکھتا ہے اور یہ انجکشن اسی نے لکھے ہیں .... کیا آپ کو نیند نہیں آتی؟"

"آتی ہے" —— صغیر نے جواب دیا۔

"کیا آپ ذہنی یا جسمانی طور پر بے چینی محسوس کرتے ہیں؟"

"نہیں ڈاکٹر صاحب!" —— صغیر نے جواب دیا۔

"کیا آپ نے یہاں آتے ہی ڈاکٹر سے نیند نہ آنے کی یا بے چینی کی شکایت کی تھی؟" —— ڈاکٹر رشید نے پوچھا۔

"نہیں" —— صغیر نے جواب دیا اور پوچھا —— "کیوں ڈاکٹر صاحب کیا بات ہے؟ .. آپ کے پوچھنے کے انداز سے مجھے کچھ شک سا ہوتا ہے"۔

"صغیر بھائی!" —— ڈاکٹر عبدالرشید نے کہا —— "میں پہلی درخواست آپ سے یہ کروں گا کہ میں آپ کے ساتھ جو بھی بات کروں وہ خدا کے سوا کسی تک نہ پہنچے۔ یہ جان لیں کہ میں مسلمان ہوں۔ اگر مجھ پر ذرا سا بھی شک ہو گیا کہ میں نے آپ کے ساتھ کوئی ایسی ویسی بات کی ہے تو میں مارا جاؤں گا"۔

"بات کریں ڈاکٹر صاحب!" —— صغیر نے کہا —— "مسلمان ہو کر میں کسی مسلمان کو نہیں مرواؤں گا"۔

"بات یہ ہے صغیر بھائی!" —— ڈاکٹر نے کہا —— "یہ انجکشن کسی پاگل کو پاگل خانے میں دیئے جاتے ہیں یا کسی ایسے آدمی کو دیئے جاتے ہیں جس کے ذہن کو اپنے سانچے میں ڈھالنا مقصود ہوتا ہے"۔

"ڈاکٹر صاحب!" —— صغیر نے بڑی گہری سنجیدگی سے کہا —— "میں پاگل نہیں اور میں نے یہاں کے کسی بھی بڑے ڈاکٹر سے نہیں کہا تھا کہ میں اپنے جسم میں کوئی بے چینی یا ذہن میں کوئی تلخی یا نیند میں کمی محسوس کرتا ہوں۔ معلوم نہیں یہ لوگ مجھے یہ انجکشن کیوں دے رہے ہیں"۔

"اگر آپ کہیں تو میں ڈاکٹر کی حیثیت سے آپ کو اپنے دل کی بات بتا دوں" ——

ڈاکٹر نے کہا۔

"کہیں ڈاکٹر صاحب!" ــــ صغیر نے کہا ــــ "ضرور کہیں۔ میں خدا کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ میں کسی اور کے ساتھ بات نہیں کروں گا"۔

"راز کی کوئی بات نہیں صغیر بھائی!" ــــ ڈاکٹر رشید نے کہا ــــ "میں مسلمان ہوں اور میں نہیں چاہتا کہ میرے ہاتھوں یا میرے سامنے کسی مسلمان کو کسی قسم کا نقصان پہنچے۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ آپ کو یہ انجکشن بلاوجہ اور بلا ضرورت دیئے جارہے ہیں۔ خطرہ یہ ہے کہ کچھ دن اور آپ کو یہ انجکشن ملتے رہے تو آپ ان کے عادی ہو جائیں گے۔ پھر جب آپ ہسپتال سے ٹھیک ہو کر نکلیں گے تو آپ کا ذہن ان دوائیوں کا مطالبہ کرے گا اور جب آپ کو نشے والی یہ دوائیاں نہیں ملیں گی تو آپ کی حالت پاگلوں جیسی ہو جائے گی۔ یہ انجکشن آپ کو میرے ہاتھ سے دلوائے جارہے ہیں اور میں یہ محسوس کرتا ہوں جیسے مجھ سے ایک گناہ کروایا جارہا ہو"۔

"اگر آپ یہ انجکشن مجھے نہ دیں تو کیا ہوگا؟" ــــ صغیر نے پوچھا۔

"ہو گا یہ" ــــ ڈاکٹر رشید نے کہا ــــ "کہ میجر یا کرنل ڈاکٹر کو پتہ چل گیا کہ میں نے آپ کو انجکشن نہیں لگایا تو مجھے صرف نوکری سے ہی برطرف نہیں کر دیا جائے گا بلکہ باقاعدہ مقدمہ چلا کر مجھے دو چار سالوں کے لئے جیل میں ڈال دیا جائے گا۔ مسلمانوں کے خلاف تو یہ لوگ بہانے ڈھونڈتے رہتے ہیں"۔

"میں آپ سے کہتا ہوں کہ مجھے یہ انجکشن نہ لگائیں" ــــ صغیر نے کہا ــــ "وہ ڈاکٹر ہر صبح آ کر پوچھتا ہے کہ انجکشن لگ رہے ہیں؟ میں اسے بتاؤں گا کہ لگ رہے ہیں"۔

"اگر آپ میرے ساتھ یہ تعاون کریں تو یہ ایک نیکی ہو گی" ــــ ڈاکٹر عبدالرشید نے کہا ــــ "میں آج سے ہی یہ کام شروع کر دیتا ہوں۔ یہ انجکشن آپ کو نہیں لگاؤں گا۔ انجکشن لے آیا کروں گا اور یہاں آ کر غسل خانے میں گرا دیا کروں گا۔۔۔ لیکن صغیر بھائی میں صرف یہی کام نہیں کروں گا بلکہ میں یہ بھی دیکھتا رہوں گا کہ ان انجکشنوں کے بغیر آپ کو کوئی ذہنی تلخی تو محسوس نہیں ہوتی۔ اگر ہوئی تو میں اپنے طور پر اس کا بندوبست کروں گا"۔

ڈاکٹر عبدالرشید کے ہاتھ میں سرنج تھی جس میں ایک دو سی سی ٹرانکولائزر دوائی

بھری ہوئی تھی۔ ڈاکٹر نے باتھ روم میں جا کر یہ دوائی ضائع کر دی۔ اسے یہ تو معلوم ہی نہیں تھا کہ صغیر کو کس مقصد کے تحت یہ انجکشن دیئے جا رہے ہیں۔ اگر اسے معلوم ہو جاتا تو شاید وہ صغیر کو انجکشن نہ دینے کا خطرہ مول نہ لیتا۔



اگلی صبح میجر ڈاکٹر راؤنڈ پر آیا۔ وہ ہندو تھا۔ اس نے حسبِ معمول صغیر سے حال احوال پوچھا اور پھر پوچھا کہ دوائیاں ٹھیک مل رہی ہیں؟ انجکشن لگ رہے ہیں؟ صغیر نے جواب دیا کہ دوائیاں اور انجکشن باقاعدگی سے مل رہے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالرشید بھی اس کے ساتھ تھا۔ صغیر کا جواب سن کر ڈاکٹر رشید کا چہرہ چمک اٹھا۔

ڈاکٹر کے راؤنڈ کے کوئی ایک گھنٹہ بعد خالدہ آ گئی۔ صغیر نے اس طرح بے تکلفی اور پیار سے اس کا استقبال کیا جیسے اس کی اپنی کوئی قریبی عزیزہ آ گئی ہو۔ خالدہ نے اس کا بلڈ پریشر، نبض اور ٹمپریچر چیک کرنا شروع کر دیا۔

"رات نیند ٹھیک آئی؟" ــــ خالدہ نے صغیر سے پوچھا۔

"ٹھیک ہی سمجھو" ــــ صغیر نے جواب دیا ــــ "پہلے جیسی نہیں آئی۔ دو تین بار آنکھ کھلی اور ذہن بھٹکتا رہا"۔

"ذہن کہاں بھٹکتا رہا؟" ــــ خالدہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"تمہارے کل کے آنسوؤں میں!" ــــ صغیر نے کہا ــــ "ڈاکٹر عبدالرشید صاحب بھی چونکہ مسلمان ہیں اس لئے کل ان کے ساتھ بہت باتیں ہوئی ہیں۔ تم ڈرتی تھی کہ میں تمہاری کوئی بات کسی اور کو نہ بتاؤں۔ یقین کرو خالدہ! میں نے ڈاکٹر رشید صاحب کو بھی نہیں بتایا کہ تم نے میرے ساتھ ذاتی قسم کی کوئی بات کی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے بتایا ہے کہ یہاں مسلمان بڑی مجبوری اور بے کسی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ تم یہ باتیں زبان پر کیوں نہیں لاتیں؟"

"آپ کیسی باتیں کرتے ہیں؟" ــــ خالدہ نے پوچھا ــــ "کیا آپ کو معلوم نہیں کہ اس ملک میں مسلمانوں کی حیثیت کیا رہ گئی ہے؟ کیا آپ انڈین مسلم نہیں ہیں؟"

"یہی سمجھ لو کہ میں انڈین مسلم نہیں ہوں اور کہیں باہر سے آیا ہوں" ــــ صغیر نے کہا ــــ "میں تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ انبالہ کے مسلمان باعزت زندگی گزار رہے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالرشید کو اس ہسپتال میں نوکری ملی ہوئی

ہے اور تم بھی یہاں سروس کر رہی ہو.... اور کیا چاہئے!"

"صغیر صاحب!" ___ خالدہ نے آہستہ سے کہا ___ "زندگی کا مقصد صرف نوکری اور پیسے کمانا ہی نہیں ہوتا۔ عزت اور آبرو بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ میری نوکری ایک میں نہیں ایک منٹ میں ختم ہو سکتی ہے اگر میں اس میجر ڈاکٹر کو جو راؤنڈ پر آیا کرتا ہے ناراض کر دوں"۔

"خواہ مخواہ اسے ناراض کرو گی!" ___ صغیر نے کہا ___ "اپنا کام باقاعدگی اور دلجمعی سے کرتی رہو شکایت کا موقع نہ دو اور اوپر والوں کا ہر حکم مانو"۔

"لیکن مجھے اس میجر کا ایک ناجائز حکم بھی ماننا پڑتا ہے" ___ خالدہ نے کہا ___ "وہ مجھے دن میں دو مرتبہ اپنے کمرے میں بلاتا ہے اور اپنی گود میں بٹھا لیتا ہے۔ آگے آپ خود سمجھتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ تم میرے ساتھ لگ جاتی ہو تو میرا ذہن اور میرے اعصاب ریلیکس ہو جاتے ہیں.... اگر میں کسی ایک وقت اس کی یہ فرمائش پوری نہ کروں تو اسی وقت مجھے نوکری سے جواب مل جائے"۔

"پھر تم اس نوکری پر لعنت کیوں نہیں بھیجتیں؟"

"میں جانتی تھی آپ یہی فیصلہ دیں گے" ___ خالدہ نے کہا ___ "اور آپ یہی نصیحت کریں گے۔ صغیر صاحب! میں نوکری پر لعنت بھیج سکتی ہوں لیکن میں اپنی بیمار ماں پر لعنت نہیں بھیج سکتی جس کا پرسانِ حال کوئی بھی نہیں۔ میں اپنے دو چھوٹے بھائیوں پر لعنت نہیں بھیج سکتی جن کی تعلیم کے اخراجات پورے کرنے والا میرے سوا اور کوئی نہیں۔ میں اپنے بوڑھے باپ پر لعنت نہیں بھیج سکتی جس کی پنشن ناکافی ہے اور جو دمے کا مریض ہے۔ میں تو خدا سے بھی شکوہ نہیں کرتی جس نے مجھ سے میرا بڑا بھائی ہمیشہ کے لئے چھین لیا تھا۔ میرے خاندان کی تمام تر ذمہ داریاں میرے کندھوں پر ہیں۔ میں اس امید پر اپنی امنگیں اور ارمان قربان کر رہی ہوں کہ چھوٹے بھائی پڑھ لکھ کر جوان ہو جائیں گے تو کہیں اچھی نوکری کر لیں گے"۔

صغیر کی نظریں خالدہ کے پُرشباب چہرے پر جم کے رہ گئی تھیں۔ خالدہ کے چہرے پر شباب تو تھا لیکن جوانی کی رونق اداسیوں کی تہہ میں چھپی ہوئی تھی۔ صغیر کو آٹھ دس گھنٹوں بعد ٹرانکولائزر دوائی کا انجکشن دیا جاتا تھا۔ سولہ سترہ گھنٹوں سے اسے ایک بھی انجکشن نہیں ملا تھا اس لئے وہ ذہنی طور پر بیدار تھا۔ وہ نشے سے ٹوٹا ہُوا نہیں لگتا تھا۔ وہ

خود محسوس کر رہا تھا جیسے وہ سب کچھ سمجھ رہا ہے اور اس کی تمام حسیں بیدار ہیں۔

"1947ء میں تمہارے والدین دوسرے مسلمانوں کے ساتھ پاکستان کیوں نہیں چلے گئے؟" ___ صغیر نے پوچھا۔

"جا نہیں سکے" ___ خالدہ نے جواب دیا ___ "میں تو ابھی پیدا ہی نہیں ہوئی تھی۔ ابا بتاتے ہیں کہ وہ یہاں پھنس کے رہ گئے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ اپنا سب کچھ یہاں چھوڑ کر چلے جانے پر ان کا دل آمادہ نہ ہُوا۔ میں اپنی اس خواہش کو کبھی بھی دبا نہیں سکی کہ ایک بار پاکستان جاؤں اور دیکھوں کہ مسلمان کس طرح آزادی سے رہتے ہیں"۔

"تم پاکستان آؤ" ___ صغیر نے کہا ___ "میں تمہیں اپنے گھر رکھوں گا۔ تم نے میری جو خدمت کی ہے، میرا جی چاہتا ہے کہ تم اپنے پورے خاندان کے ساتھ پاکستان آ جاؤ"۔

"کیا آپ پاکستانی ہیں؟" ___ خالدہ نے پوچھا اور کہا ___ "آپ تو کہتے تھے کہ آپ میرٹھ کے رہنے والے ہیں"۔

صغیر یک لخت سنجیدہ ہو گیا اور کچھ گھبرایا بھی۔ فوراً ہی وہ ہنس پڑا۔ خالدہ کوئی ایسی بچّی تو نہیں تھی کہ اس کی سنجیدگی اور پھر ہنسی کو نہ سمجھ سکتی۔

"صغیر صاحب!" ___ خالدہ نے کہا ___ "حقیقت کو آپ ہنسی سے چھپا نہیں سکتے۔ میں شروع سے دیکھ رہی ہوں کہ آپ کا لب و لہجہ میرٹھ اور دلّی وغیرہ والا ہے ہی نہیں۔ بے شک آپ اردو ہی بولتے ہیں لیکن آپ کا لب و لہجہ پنجاب کے لوگوں جیسا ہے۔ آپ پنجابی ہیں۔ یہ آپ ہی بتا سکتے ہیں کہ آپ انڈیا کے پنجاب کے رہنے والے ہیں یا پاکستان کے پنجاب کے۔ اب آپ نے پاکستان کا ذکر کرتے ہوئے خود ہی کہہ دیا ہے کہ آپ مجھے اور میرے خاندان کو اپنے گھر میں رکھیں گے.... سچ بتائیں آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟ مجھ سے کوئی قسم لے لیں، میں کسی کو نہیں بتاؤں گی"۔

"ہاں خالدہ!" ___ صغیر نے کہا ___ "میں پاکستانی ہوں۔ میں تم سے کوئی قسم نہیں لیتا۔ اسلام کے ناطے سے یہ امید رکھوں گا کہ کسی کے ساتھ یہ بات نہیں کرو گی.... میں ہندوستانی مسلمانوں کے متعلق اتنا ہی جانتا ہوں کہ ہندو انہیں قتل کرتے رہتے ہیں اور ویسے بھی ان کے ساتھ بہت بُرا سلوک کرتے ہیں۔ تم یہ سمجھ لو کہ میں اس ملک کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتا۔ مجھے بتاؤ کہ یہاں مسلمان کس طرح زندگی گذار رہے ہیں"۔

ان دونوں کے درمیان مشکل یہ پیدا ہو گئی تھی کہ خالدہ تفصیل سے بات کرنے سے ڈرتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ صغیر کوئی خاص اور خفیہ قسم کی شخصیت ہے ورنہ بڑے بڑے فوجی افسروں کے ساتھ بھی یہاں اس قسم کا خاص اور اتنا اعلیٰ سلوک نہیں ہوتا تھا۔ صغیر کو ٹرانکولائزر نہیں مل رہے تھے اس لئے اس کی اصل شخصیت اور اصل کردار بیدار ہو گیا تھا۔ وہ خالدہ کے پیچھے پوری طرح پڑ گیا اور اس نے خالدہ کو بولنے پر آمادہ کر لیا۔

"صرف ایک بات سے آپ کو پتہ چل جانا چاہئے کہ مسلمان یہاں کس طرح جی رہے ہیں" —— خالدہ نے کہا —— "وہ بات یہ ہے کہ میں آپ کو بتانے سے ڈرتی ہوں کہ یہاں مسلمانوں کی حالت کیا ہے اور روز بروز کس طرح بگڑ رہی ہے۔ میں آپ کو پہلے بتا چکی ہوں کہ مسلمان یہاں خوف و ہراس میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہمیں یہاں کی سوسائٹی میں اچھوتوں جیسا درجہ حاصل ہے۔ ہم مسلمان انسانی حقوق کی بات کرنے کا بھی حق نہیں رکھتے۔ کسی مسلمان لڑکی پر ہندو دست درازی کریں اور اس کی آبرو سے بھی کھیل جائیں تو تھانے والے بھی مظلوم لڑکی کی بات نہیں سنتے۔ اگر لڑکی کے لواحقین شور شرابا یا قانونی چارہ جوئی کریں تو ہندو ان کا جینا حرام کر دیتے ہیں۔ ہندو جس وقت چاہیں اور جہاں چاہیں مسلمانوں پر یلغار کر دیتے ہیں جس میں کئی مسلمان مارے جاتے اور زخمی ہوتے ہیں اور ان کے گھر اور ان کی عزتیں بھی لوٹ لی جاتی ہیں۔ خوف و ہراس کا یہ غلام ہے کہ مسلمان کسی اجنبی ہندو کو یہ بتاتے ہوئے بھی ڈرتا ہے کہ وہ مسلمان ہے۔ یہاں بعض جگہوں پر ہندوؤں نے مسلمانوں پر اتنا خوف طاری کر رکھا ہے کہ مسلمان یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ اپنا مذہب چھوڑ کر ہندو ہو جائیں تو شاید سکھ چین سے رہیں گے۔ کوئی بتا نہیں سکتا کہ دیہات میں کتنے مسلمان ہندو ہو چکے ہیں۔ ان پر مسلسل خوف طاری کیا جاتا رہا ہے اور ان کا سوشل بائیکاٹ بھی کر دیا جاتا ہے"۔

خالدہ جوں جوں بھارتی مسلمانوں کی حالتِ زار کی تفصیلات سناتی جا رہی تھی، صغیر کے چہرے کا رنگ بدلتا جا رہا تھا۔ دو تین مرتبہ تو اس نے اپنے ایک ہاتھ پر دوسرے ہاتھ کا مکہ مارا جس سے پتہ چلتا تھا کہ وہ غصے سے بے قابو ہوا جا رہا ہے۔ یہ حقیقت اس کے سامنے ناچنے لگی تھی کہ وہ بھی مسلمان ہے اور اس کے ہم مذہب یہاں مجبوری اور بے کسی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

"صغیر صاحب!" —— خالدہ نے کہا —— "میرے محلے میں دو سکھ عورتیں ہیں جن کے بچے جوان ہو گئے ہیں۔ وہ اصل میں سکھ نہیں تھیں۔ انہیں 1947ء میں سکھوں نے اغوا کیا تھا۔ پہلے تو انہیں بہت خراب کیا گیا پھر دو سکھوں نے ان کے ساتھ شادیاں کر لیں۔ ان کی مجبوری تھی کہ باوقار گھرانوں کی مسلمان لڑکیاں تھیں اور اپنے آپ کو سکھوں سے بچا نہ سکیں۔ اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود انہوں نے سکھ مذہب کو قبول نہیں کیا۔ آج بھی وہ اپنی اُس زندگی کو یاد کرتی ہیں جو انہوں نے اغوا سے پہلے تک گزاری تھی۔ وہ اپنے مذہب کو نہیں بھولیں۔ ان میں سے ایک نے میری موجودگی میں میری امی کو بتایا تھا کہ وہ کبھی کبھی چوری چھپے نماز پڑھ لیتی ہے اور اللہ سے معافی مانگتی ہے .... یہاں یہ دو عورتیں ہی نہیں جنہیں مسلمان سے سکھ بنا کر بیویاں بنا لیا گیا تھا اور انہوں نے سکھ پیدا کئے۔ بعض ہندوؤں کے گھروں میں بھی مسلمان عورتیں ہیں۔ انہیں بھی 1947ء میں اغوا کیا گیا تھا"۔

کمرے کا دروازہ کھلا۔ وہ آدمی آیا تھا جو صغیر کے کمرے کے باہر بیٹھا رہتا تھا۔ خالدہ نے اپنا سامان اٹھایا اور کمرے سے نکل گئی۔ وہ محسوس نہ کر سکی کہ صغیر کس قدر مشتعل ہو گیا ہے۔ صغیر دراصل کمزور شخصیت کا آدمی تھا جس پر جذبات کا غلبہ بڑی جلدی ہو جاتا تھا۔ کبھی ہندوؤں کے ایجنٹوں نے پاکستان کے خلاف اپنے پُراثر انداز میں باتیں کیں تو وہ پاکستان کے ہی خلاف ہو گیا۔ اب ایک مسلمان لڑکی نے انڈیا کے مسلمانوں کی حالتِ زار کا نقشہ کھینچا تو وہ ہندوؤں کو اپنا دشمن سمجھنے لگا۔

اپنے ملک کے جاسوسوں کے ہاتھوں میں ایسے ہی نوجوان کھیلنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں جو انتہا پسند اور ذہنی طور پر ابنارمل ہوتے ہیں۔ صغیر کا بھی ذہنی توازن بگڑا ہوا تھا۔



اگلے روز ڈاکٹر عبدالرشید صغیر کو نشے والی دوائی کا انجکشن لگانے آیا تو اس نے سرنج باتھ روم میں جا کر فلش میں خالی کر دی اور خالی سرنج بالٹی میں پھینک دی۔

"صغیر بھائی!" —— ڈاکٹر عبدالرشید نے کہا —— "یہ تیسرا انجکشن ہے جو میں تمہیں نہیں دے رہا۔ یہ بتاؤ کہ تم کوئی تکلیف تو نہیں محسوس کر رہے؟ .... کسی قسم کی بے چینی یا بے خوابی کی شکایت تو نہیں؟"

"کچھ نہ کچھ تو ہوتا ہے ڈاکٹر صاحب!" —— صغیر نے کہا —— "لیکن ایسا نہیں کہ

میں اسے برداشت ہی نہ کر سکوں۔ آپ نے ان دوائیوں کے متعلق جو باتیں بتائی تھیں وہ میں نے سمجھ لی تھیں۔ میں تو بیدار ہو گیا ہوں .... ڈاکٹر صاحب! میں ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے کچھ کر سکتا ہوں!"

"کیا بات کی ہے آپ نے صغیر صاحب!" ---- ڈاکٹر عبدالرشید نے قدرے طنزیہ سے لہجے میں کہا ---- "پورا پاکستان کچھ نہیں کر سکا تو ایک اکیلا بھارتی مسلمان کیا کرے گا۔ ایک وقت تھا کہ ہماری نظریں پاکستان پر لگی ہوئی تھیں۔ پاکستان کی فوج کی بہادری کے بہت چرچے سنے تھے۔ ستمبر 1965ء کی جنگ میں پاکستان کی آرمی' ایئر فورس اور نیوی نے پورے انڈیا میں خوف کی لہر دوڑا دی تھی۔ آپ کو یاد ہو گا کہ ہندو ہمیں یعنی انڈیا کے مسلمانوں کو کس طرح جُھک جُھک کر سلام کرتے تھے۔ یہ خبر مشہور ہو گئی تھی کہ پاکستان آرمی پورے پنجاب پر چھا گئی ہے اور ایک دو مہینوں بعد دلّی پہنچ جائے گی۔ ہندو تو صحیح معنوں میں گیدڑ بن گئے اور یہاں کے مسلمان شیر ہو گئے لیکن اعلان تاشقند کے بعد معاملہ پھر وہیں کا وہیں جا پڑا جہاں پہلے تھا....

"پھر آپ کو یہ بھی یاد ہو گا کہ دسمبر 1971ء میں تو ہندوؤں نے ہم پر طعنوں کے وہ تیر برسائے کہ ہم منہ چھپاتے پھرتے تھے۔ وہی پاکستان جس کی فوج سے پورا انڈیا ڈرتا تھا' ساری دنیا میں ایک کمزور ملک کے روپ میں مشہور ہو گیا۔ آپ نے مجھے کہا تھا کہ تم لوگ پاکستان کیوں نہیں چلے جاتے۔ میں نے گول مول سا جواب دے دیا تھا لیکن صغیر بھائی! اصل بات یہ ہے کہ پاکستان میں جا کر کیا کریں گے۔ ہمیں یہاں ہندوؤں کے دیس میں اپنی مستورات کی بے حُرمتی کا غم لگا رہتا ہے۔ ہماری عزت محفوظ نہیں۔ مجھے یہ بتائیں' کیا پاکستان میں خود اپنی ہی مستورات کی عزت محفوظ ہے؟ .... ہم اخباروں میں پڑھتے رہتے ہیں۔ آپ بھی ہندوستانی مسلمان ہیں۔ یہاں کے اخبار ضرور پڑھتے ہوں گے۔ کبھی کبھار کسی کا کوئی پاکستانی رشتہ دار یہاں آ جاتا ہے تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ پاکستان میں نہ کسی کا گھر لٹنے سے محفوظ ہے نہ کسی کی عزت کی کوئی گارنٹی دے سکتا ہے"۔

ڈاکٹر عبدالرشید اور صغیر کچھ دیر اسی موضوع پر باتیں کرتے رہے۔ باتیں کرتے کرتے ان کے درمیان دوستانہ بے تکلفی پیدا ہو گئی۔ چونکہ صغیر کا ذہن بیدار ہو گیا تھا اس لئے اس کے جذبات بھڑک اٹھے۔ اس نے ڈاکٹر رشید کو بتایا کہ اس نے سنا ہے کہ ہندو تخریب کار پاکستان میں جا کر کیسی کیسی تباہ کاریاں کرتے ہیں لیکن پاکستان کی حکومت

ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرتی۔

"ایک بات کہتا ہوں صغیر بھائی!" ---- ڈاکٹر عبدالرشید نے کہا ---- "ہر کام حکومت پر ڈال دینا ہی ٹھیک نہیں ہوتا۔ اگر عوام میں سے ہر آدمی اپنے آپ کو پاکستان کا محافظ سمجھے تو وہ بہت کچھ کر سکتا ہے لیکن ہم جب سنتے ہیں کہ انڈین انٹیلی جنس کے ایجنٹ پاکستانی بھی ہیں اور پاکستانی بڑی آسانی سے ہندوؤں کے ایجنٹ بن جاتے ہیں تو شرم سے ہمارے سر جھک جاتے ہیں اور ہم ایسے پاکستانیوں پر لعنت بھیجتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اللہ ایسے مسلمانوں کو زمین کے تختے سے اٹھا لے جو تیرا نام لے کر تیرے دشمنوں کا ساتھ دیتے ہیں"۔

صغیر کا سر جھک گیا جیسے اسے نیند آ رہی ہو یا جیسے وہ کسی گہری سوچ میں کھو گیا ہو۔ ڈاکٹر رشید کوئی بات کر رہا تھا لیکن صغیر پر خاموشی طاری تھی۔ اس کے منہ سے ہوں یا ہاں بھی نہیں نکلتی تھی۔ ڈاکٹر رشید نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر سر اوپر اٹھایا تو اس نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں لال ہو گئی تھیں۔

"کیوں صغیر صاحب!" ---- ڈاکٹر رشید نے پوچھا ---- "کیا بات ہے؟ .... میں اچھی طرح جانتا ہوں آپ کیا محسوس کر رہے ہیں۔ آخر آپ بھی ہندوستانی مسلمان ہیں"۔

"نہیں!" ---- صغیر نے دبی دبی سی آواز میں کہا اور اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے ---- "ڈاکٹر صاحب! میں اگر آپ سے کہوں کہ میں ہندوستانی نہیں' پاکستانی ہوں تو آپ کیا کہیں گے؟"

"میں کیا کہوں گا؟" ---- ڈاکٹر نے کہا ---- "ایک تو میں خوشی کا اظہار کروں گا کہ مجھے ایک پاکستانی بھائی کی خدمت کا موقع ملا لیکن اس کے ساتھ ہی میں یہ ضرور پوچھوں گا کہ آپ نے یہ کیوں کہا تھا کہ آپ میرٹھ کے رہنے والے ہیں اور پھر میں آپ سے یہ بھی پوچھوں گا کہ آپ کو وی آئی پی ٹریٹ منٹ کیوں دیا جا رہا ہے۔ یہ میں اس لئے پوچھوں گا کہ یہاں کوئی پاکستانی آ جائے تو اسے مشتبہ اور جاسوس سمجھا جاتا ہے۔ یہ بھی نہیں دیکھا جاتا کہ پاکستان میں اس کی سوشل یا سرکاری حیثیت کیا ہے۔ یہاں اس کے پیچھے سی آئی ڈی لگی رہتی ہے۔ آپ کوئی خاص پاکستانی لگتے ہیں۔ صغیر بھائی!...."

"ڈاکٹر صاحب!" ---- صغیر نے ہاتھ اٹھا کر ڈاکٹر کو آگے بولنے سے روک دیا ---- "آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ میں خاص قسم کا پاکستانی ہوں" ---- صغیر کی آواز دب گئی۔ گھونٹ

سانگل کراس نے کہا ——— "میں جذباتی آدمی ہوں۔ آپ مجھے ذہنی مریض بھی کہہ سکتے ہیں۔ آپ کی باتیں سنیں تو یوں محسوس ہُوا جیسے کسی نے مجھے جھنجھوڑ کر جگا دیا ہو..... میں آپ کو اپنا مونس اور غمخوار سمجھ کر بتاتا ہوں کہ میرا تعلق انڈین انٹیلی جنس کے ساتھ ہے۔ یوں کہہ لیں کہ میں انڈین انٹیلی جنس کا پاکستانی ایجنٹ ہوں۔ بارڈر کراس کرتے ہوئے پاکستانی رینجرز نے گولی چلادی تھی اور ایک گولی مجھے لگی"۔

ڈاکٹر عبدالرشید پر سکتہ طاری ہوگیا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کا دل دھڑکنا بھول گیا ہو اور اس کی آنکھیں جھپکنے سے قاصر رہ گئی ہوں۔ وہ بُت بنا کھڑا رہا اور اس کی نظریں صغیر کے چہرے پر جمی رہیں۔

"کیوں ڈاکٹر صاحب!" ——— صغیر نے ڈاکٹر کو بیدار کر دیا اور کہا ——— "میں جانتا ہوں آپ میرے متعلق کیا سوچ رہے ہیں۔ آپ کے دل میں میری محبت پیدا ہو گئی تھی جو آن واحد میں نفرت میں بدل گئی ہے"۔

"نہیں صغیر بھائی!" ——— ڈاکٹر رشید نے بیدار ہو کر کہا ——— "محبت، محبت ہی رہے گی، نفرت میں نہیں بدلے گی۔ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ آپ نے یہ راز مجھے کیوں دیا ہے"۔

"صرف اس لئے ڈاکٹر صاحب!" ——— صغیر نے کہا ——— "آپ نے مجھے ٹرانکولائزر انجکشن دینے بند کر دیئے تھے۔ ایک تو یہ وجہ ہوئی کہ میرا دماغ واپس میرے قبضے میں آ گیا۔ پھر آپ نے مجھے یہاں کے مسلمانوں کی حالتِ زار سنائی تو میرے اندر ایمان بیدار ہو گیا۔ اس سے پہلے خالدہ نرس مجھے یہی باتیں سنا چکی تھی اور میرا خون کھول رہا تھا۔ مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے"۔

"میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟" ——— ڈاکٹر رشید نے کہا ——— "میں آپ کی خدمت کر سکتا ہوں جو کر رہا ہوں اور جب تک آپ یہاں ہیں میں اور زیادہ خلوص اور پیار سے آپ کی خدمت کروں گا"۔

"نہیں ڈاکٹر صاحب!" ——— صغیر نے کہا ——— "یہ نہیں۔ جس مدد کی مجھے ضرورت ہے وہ شاید آپ نہ کر سکیں نہ ہی میں آپ کو اتنے سخت بلکہ اتنے خطرناک امتحان میں ڈالنا چاہتا ہوں"۔

"آپ بات تو کریں" ——— ڈاکٹر رشید نے کہا ——— "میں ہوں تو ڈاکٹر لیکن آپ سے

بڑھ کر جذباتی ہوں۔ مجھے بتائیں آپ کو کیسی مدد کی ضرورت ہے"۔

"میں واپس پاکستان جانا چاہتا ہوں" ——— صغیر نے کہا ——— "بارڈر کراس کرنا میرے لئے کوئی مشکل نہیں۔ مجھے کسی طرح بارڈر کے پاس پہنچا دیا جائے۔ بارڈر خود کراس کر لوں گا۔ بہت ہُوا تو یہی ہو گا کہ پاکستانی رینجرز دیکھ لیں گے اور گولی مار دیں گے۔ مجھے خوشی ہو گی۔ میں کسی پاکستانی کی گولی سے مرنا پسند کروں گا اور اگر میں سرحد سے آگے خیریت سے نکل گیا تو میں اپنے گناہوں کا کفارہ اس طرح ادا کروں گا کہ پاکستان میں انڈیا کے جاسوسوں اور تخریب کاروں کا ایک رنگ پکڑوا دوں گا .... مجھے بارڈر تک پہنچا دیں"۔

ڈاکٹر گہری سوچ میں کھو گیا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ صغیر کی نظریں اس کے ساتھ ساتھ گھومتی رہیں۔

"صغیر بھائی!" ——— ڈاکٹر نے کہا ——— "یہ صورت حال میرے لئے اتنی مشکل ہے کہ میں اسے ناممکن بھی کہہ سکتا ہوں۔ سرحد انبالہ سے بہت دور ہے لیکن میں آپ کو یہ جواب کبھی نہیں دوں گا کہ میں آپ کی یہ مدد نہیں کر سکتا۔ میں آپ کی مدد کروں گا۔ میں آپ سے بڑھ کر جذباتی ہوں۔ میں نے آپ سے کہا تھا کہ ہم مسلمانوں نے یہاں کے معاشرے کو قبول کر لیا ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ میں نے دل کی گہرائی سے اس ہندو معاشرے کو قبول کیا ہے تو اس سے بڑا جھوٹ اور کوئی نہیں ہو گا۔ میں نہیں بھول سکتا کہ میں مسلمان ہوں اور میں یہ بھی نہیں بھول سکتا کہ یہاں مسلمان ہی نہیں بلکہ اسلام بھی غلام ہو گیا ہے۔ میں اکیلا یا ہم بکھرے ہوئے، کچلے اور مسلے ہوئے مسلمان کیا کر سکتے ہیں۔ میں اگر آپ کو سرحد تک پہنچا دوں اور آپ پاکستان جا کر انڈین انٹیلی جنس کو یہ کاری ضرب لگائیں کہ اس کا ایک رِنگ پکڑوا دیں تو اس سے بڑی نیکی اور کیا ہو سکتی ہے۔ میں اس کارِ خیر میں شامل ہوں گا اور ضرور ہوں گا"۔

"آپ مجھے امرتسر تک تو پہنچا سکتے ہیں؟" ——— صغیر نے کہا ——— "میں امرتسر سے پیدل چل پڑوں گا اور راوی میں اُتر جاؤں گا"۔

"میں آپ کو کسی خطرے میں نہیں ڈالوں گا نہ میں آپ کو کوئی مشورہ دوں گا" ——— ڈاکٹر رشید نے کہا ——— "مشورہ دینے والے اور آپ کا ساتھ دینے والے آدمی موجود ہیں.... مجھے کچھ سوچنے دیں .... لیکن صغیر بھائی! اس کی کیا گارنٹی ہے کہ میں آپ سے

محفوظ رہوں گا؟"

"آپ سے کا کیا مطلب؟" —— صغیر نے پوچھا۔

"مطلب یہ" —— ڈاکٹر رشید نے کہا —— "کہ آپ میرے خلاف یہی رپورٹ نہ دے دیں کہ اس ڈاکٹر کو یہاں سے نکالو کیونکہ اس کے دماغ میں پاکستانی جراثیم موجود ہیں"۔

صغیر نے چونک کر ڈاکٹر عبدالرشید کی طرف دیکھا۔ دونوں چپ چاپ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر دیکھتے ہی دیکھتے صغیر کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ ڈاکٹر اسے چپ چاپ دیکھتا رہا۔

"کیا میں اس قدر ذلیل اور کمینہ سمجھ لیا گیا ہوں؟" —— صغیر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا —— "آپ ٹھیک کہتے ہیں ڈاکٹر صاحب! یہ خصلت ہندوؤں کی ہے جو آپ کو شک ہے کہ میری بھی ہو گی۔ مجھے اپنی اس حالت پر افسوس ہو رہا ہے اور شرم بھی آ رہی ہے کہ میں دھتکارا ہوا لعنتی انسان بن گیا ہوں ..... میں آپ کو کس طرح یقین دلاؤں کہ میں آپ کو دھوکا نہیں دے رہا۔ آپ کو دھوکا دے کر مجھے حاصل بھی کیا ہو گا۔ مجھے تو بہت بڑے بڑے ٹارگیٹ دیئے جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے ڈاکٹر صاحب! انڈین انٹیلی جنس کا ٹارگیٹ پورا پاکستان ہے۔ میری حالت ایک گولی کی سی ہے جو ہندوؤں کی بندوق سے نکلتی ہے اور پاکستان کے وجود میں اُتر جاتی ہے لیکن میں جاگ اٹھا ہوں ڈاکٹر رشید صاحب! میں جاگ اٹھا ہوں، مجھے پاکستان پہنچا دیں۔ سرحد تک پہنچا دیں"۔

"پہنچا دوں گا" —— ڈاکٹر نے کہا —— "سرحد تک پہنچانے سے پہلے میں آپ کو اپنے گھر پہنچاؤں گا۔ کچھ دن آپ کو میرے گھر میں چھپا کر رکھا جائے گا۔ یہاں یہ ظاہر کیا جائے گا کہ آپ یہاں سے بھاگ گئے ہیں۔ میرے تین چار مسلمان دوست ہیں۔ وہ ہماری مدد کریں گے۔ آپ کو میں صرف اپنے گھر ہی نہیں رکھوں گا۔ ایک ایک دو دو راتیں میرے دوست آپ کو اپنے اپنے گھر رکھیں گے ..... پہلے میں اپنے دوستوں کے ساتھ بات کر لوں۔ آپ نے یہ کام کرنا ہے کہ جب بڑے ڈاکٹر آپ کو دیکھنے آئیں تو آپ یہ شکایت کریں کہ زخم میں آپ کو درد مسلسل رہتا ہے اور چلنے میں درد اور بڑھ جاتا ہے۔ اس سے ایک فائدہ تو یہ ہو گا کہ آپ کو ہسپتال میں کچھ دن اور ٹھہرنے کا بہانہ مل جائے گا اور دوسرا فائدہ یہ ہو گا کہ آپ کا تعاقب بہت دیر بعد شروع ہو گا۔ پہلے تو

آپ کو ہسپتال میں ہی ڈھونڈتے رہیں گے۔ کوئی مانے گا ہی نہیں کہ جو مریض اچھی طرح چل نہیں سکتا وہ فرار ہو گیا ہے۔ بہرحال آپ مطمئن رہیں۔ میں آپ کو یہاں سے نکالوں گا ..... آپ کو انڈیا میں کیوں لایا گیا ہے؟"

"میری اپنی خواہش تھی کہ میں انڈیا کی سیر کروں" —— صغیر نے جواب دیا —— "یہ لوگ مجھے خوش کر رہے ہیں اور یہاں میری کچھ اور ٹریننگ کریں گے اور پھر مجھے کوئی بہت بڑا مشن دے کر پاکستان بھیج دیں گے"۔

"کیا آپ نے بہت جاسوسی کی ہے؟" —— ڈاکٹر عبدالرشید نے پوچھا۔

"جاسوسی نہیں" —— صغیر نے کہا —— "میرا کام تخریب کاری ہے۔ میں نے کئی جگہوں پر دھماکے کئے ہیں ..... مت پوچھیں ڈاکٹر صاحب! تخریب کاری کی کئی قسمیں ہیں" —— صغیر ذرا سا چپ ہو کر جھنجھلایا اور بولا —— "مت پوچھیں ڈاکٹر صاحب! میں قاتل ہوں۔ خدا مجھے معاف نہیں کرے گا۔ میرا اپنا سگا بھائی میرے ایک ساتھی تخریب کار کے دھماکے کی بھینٹ چڑھ چکا ہے۔ میں اس بھائی کی روح کا سامنا نہیں کر سکتا۔ میں اب گناہوں کا کفارہ ادا کروں گا"۔

ڈاکٹر نے دیکھا کہ صغیر کے چہرے پر اذیت کے بڑے نمایاں اور واضح تاثرات چھا گئے تھے اور اس کے بولنے کے انداز میں بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ روحانی اذیت میں مبتلا ہے۔ ڈاکٹر نے بہتر سمجھا کہ صغیر کے ساتھ اس موضوع پر باتیں نہ کی جائیں۔

"صغیر بھائی!" —— ڈاکٹر نے کہا —— "آپ مسلمان ہیں۔ آپ نے قرآن میں پڑھا ہو گا کہ اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ وہ رحمٰن ہے، رحیم ہے، کریم ہے۔ آپ نے سچے دل سے توبہ کر لی ہے تو میں نے آپ کی کیا مدد کرنی ہے، آپ کی مدد تو اللہ کرے گا۔ میں اللہ سے دعا مانگوں گا کہ آپ کی مدد کا ذریعہ اور سبب مجھے بنائے۔ یہ سعادت مجھے ملے تو میری روح کو سکون آ جائے گا ..... میں آج رات اپنے دوستوں سے، اپنے والد اور اپنے بڑے بھائی سے بات کروں گا۔ وہ یقیناً مدد کریں گے اور کل رات ہو سکتا ہے، میں آپ کو یہاں سے نکال کر لے جاؤں"۔

"میں ہر مشکل اور مصیبت میں جانے کے لئے تیار ہوں" —— صغیر نے کہا —— "لیکن میں آپ کو یہ بتا دوں کہ جہاں میں نے دیکھا کہ آپ یا یہاں کا کوئی بھی مسلمان

میری وجہ سے پھنس رہا ہے تو میں اپنے آپ کو پیش کر کے سب کی سزا اپنے ذمے لے لوں گا"۔

"اللہ مالک ہے صغیر بھائی" ــــ ڈاکٹر نے کہا ــــ "میں نے آپ کے کمرے میں ضرورت سے زیادہ وقت گذار دیا ہے۔ مجھے چلنا چاہئے"۔

ڈاکٹر کمرے سے نکل گیا۔

کچھ دیر بعد خالدہ نرس آگئی اور صغیر کا بلڈ پریشر وغیرہ چیک کرنے لگی۔

"کیا بات ہے صغیر صاحب!" ــــ خالدہ نے پوچھا ــــ "آپ کا بلڈ پریشر تھوڑا سا اوپر ہو گیا ہے"۔

"یہ تو ہونا ہی تھا" ــــ صغیر نے کہا ــــ "تمہاری باتیں سن کر خون کھول اٹھا ہے۔ یہ اسی کا اثر ہے .... ایک بات بتاؤ خالدہ! یہ ڈاکٹر عبدالرشید کیسا آدمی ہے؟ میرا مطلب ہے کہ ذاتی طور پر کیسا آدمی ہے۔ ڈاکٹر کی حیثیت سے تو یہ بہت ہی اچھا آدمی ہے"۔

"پہلے یہ بتائیں" ــــ خالدہ نے پوچھا ــــ "کہ آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"ویسے ہی" ــــ صغیر نے جواب دیا ــــ "ان کا میرے ساتھ سلوک اتنا اچھا ہے کہ میں اس شخص سے بہت ہی متاثر ہُوا ہوں"۔

"رشید بہت اچھا آدمی ہے" ــــ خالدہ نے کہا ــــ "پیارا آدمی ہے۔ میری شادی اسی سے ہو گی"۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے خالدہ!" ــــ صغیر نے کہا ــــ "ایک بات میرے ذہن میں آتی ہے۔ کیا اسے معلوم نہیں کہ میجر ڈاکٹر تمہیں اپنے کمرے میں بلا کر پیار و محبت کرتا ہے۔ اگر ڈاکٹر رشید کو اس کا علم ہو گیا تو پھر یہ آپ کے ساتھ شادی نہیں کرے گا"۔

"رشید کو معلوم ہے" ــــ خالدہ نے کہا ــــ "اور رشید اسی وجہ سے میرے ساتھ شادی کر رہا ہے۔ شادی ہوتے ہی میں سروس چھوڑ دوں گی۔ رشید نے مجھے یہاں سے آزاد کرانے اور میری عزت بچانے کا یہ طریقہ سوچا ہے کہ مجھے اپنی بیوی بنا رہا ہے۔ یقین کرنا صغیر صاحب! رشید کو ایک مسلمان لڑکی کے والدین کے پیغام ملے ہیں۔ یہ لڑکی ایم بی بی ایس ہے، مجھ سے زیادہ خوبصورت ہے۔ آج کل ہاؤس جاب کر رہی ہے لیکن ڈاکٹر رشید نے اسے قبول نہیں کیا اور مجھے میری عزت بچانے کی خاطر قبول کر لیا ہے۔

رشید امیر ماں باپ کا بیٹا ہے۔ یہ جانتا ہے کہ میرے گھر کے مالی حالات کتنے خراب ہیں۔ اگر میں نوکری نہ کروں تو میری ماں کا علاج نہ ہو اور میرے بھائی تعلیم بھی حاصل نہ کر سکیں۔ رشید نے مجھے کہا ہے کہ میرے گھر کی یہ ذمہ داریاں وہ سنبھال لے گا۔ اس سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ مسلمانوں اور اسلام کے متعلق رشید کتنا جذباتی ہے اور ہر طرح کی قربانی دے سکتا ہے"۔

○

جب صغیر انبالہ ہسپتال سے فرار کی تیاری کر رہا تھا اُس وقت میجر عثمان کراچی میں ایک کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ لُوسی بیٹھی تھی۔ کچھ دیر پہلے ان کے پاس دو آدمی بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ لُوسی نے عثمان کا تعارف ان کے ساتھ کرایا تھا۔ وہ دونوں کراچی کے مسلمان تھے۔ وہ لوسی اور عثمان کو اکیلا چھوڑ کر اٹھ گئے تھے۔

عثمان اپنی بیوی وینا اور بچّوں کے ساتھ کراچی کی سیر کو آیا تھا لیکن راستے میں یہ پوری فیملی اغوا ہو گئی اور لُوسی نے انہیں رہا کروایا اور کراچی پہنچ کر عثمان نے ایک ہوٹل میں کمرہ لے لیا تھا۔ لُوسی اس کمرے تک اس کے ساتھ گئی تھی اور پھر انہوں نے خفیہ طریقے سے اگلے روز ملاقات کا وقت طے کر لیا تھا۔ اس طرح عثمان اگلے روز اُس کوٹھی میں پہنچ گیا تھا جہاں لوسی رہتی تھی۔

"اب بتاؤ لوسی!" ــــ میجر عثمان نے پوچھا ــــ "تم سندھ کے اتنے دور دراز صحرائی علاقے میں کہاں اور کیوں جا پہنچی تھیں؟"

"تم مانو گے نہیں" ــــ لُوسی نے اپنا ایک بازو عثمان کی گردن کے گرد لپیٹ کر اور اپنا ایک گال عثمان کے گال کے ساتھ لگا کر کہا ــــ "میں تمہیں کبھی ایک لمحے کے لئے بھی دل سے نہیں اتار سکی۔ ظاہری طور پر تو یہ ہُوا کہ میں نے یہاں اپنے عزیزوں سے خواہش ظاہر کی کہ میں سندھ کا دیہاتی علاقہ دیکھنا چاہتی ہوں لیکن عثمان! یقین کرنا کہ اس خواہش کے ساتھ تم یوں میرے سامنے آگئے تھے جیسے میں ہاتھ آگے کروں گی تو تمہیں چھُو لوں گی۔ تم تصوّر نہیں بلکہ ایک حقیقت بن کر میرے سامنے آگئے تھے۔ میرا دل کہتا تھا کہ تم کسی مصیبت میں پھنس گئے ہو اور مجھے تمہاری مدد کو پہنچنا چاہئے۔ اسے کہتے ہیں روحانی محبت۔ تم مانو نہ مانو، میں اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتی کہ تمہاری محبت میری روح میں اتری ہوئی ہے"۔

"میں یہ مان لیتا ہوں کہ تم نے میری محبت کو اپنی روح میں اتار رکھا ہے"۔ عثمان نے کہا ۔۔۔ "لیکن میں یہ نہیں مانوں گا کہ تم سندھ کا اندرونی علاقہ دیکھنا چاہتی تھیں۔ میری اور تمہاری کلاس کی کوئی لڑکی ایسی خواہش نہیں کرے گی کہ جس علاقے میں ڈاکوؤں کی حکمرانی ہو اور جہاں آئے دن لڑکیاں بھی' بچے اور جوان بھی اغوا ہو رہے ہوں وہاں کی سیر کا پروگرام بنا لے۔ پھر میں نے دیکھا کہ اتنے بڑے ڈاکو نے تمہارا یہ حکم مان لیا کہ وہ مجھے رہا کر دیں اور اس نے ہمیں رہا کر دیا۔ تم اگر صرف سیر کے لئے وہاں گئی ہوتیں تو وہاں تمہارا حکم نہ چلتا بلکہ تم خوف سے کانپ کانپ کر بے ہوش ہو جاتیں... مجھے صحیح بات بتاؤ لُوسی ورنہ میں سمجھوں گا کہ یہ جو تم محبت محبت کی رٹ لگا رہی ہو یہ محض دھوکا ہے"۔

لُوسی نے بہت کوشش کی کہ اپنے اوپر پردہ ڈالے رکھے لیکن عثمان اس کے پیچھے پڑا رہا۔ سندھ کے اندرونی علاقے میں ان کی ملاقات ایسی تھی کہ لوسی اب اپنے آپ پر کوئی پردہ نہیں ڈال سکتی تھی۔ اپنا پردہ اٹھانے کی بجائے لوسی نے پیار و محبت اور عریاں حرکتوں سے عثمان کی عقل پر پردہ ڈالنے کی کوشش شروع کر دی۔ وہ عثمان کو اس طرح چاٹ رہی تھی جیسے کسی ماں کو گمشدہ بچہ مل گیا ہو۔

عثمان کوئی زاہد اور پارسا نہ تھا۔ وہ امیر کبیر باپ کے گھر میں پیدا ہُوا تھا اور ڈسکو سوسائٹی میں پل کر جوان ہُوا اور عیش و عشرت کے سوا اس نے کچھ سیکھا نہ تھا۔ فوج میں اسے صرف افسر بننے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ اس کی شخصیت میں اتنی قوتِ مدافعت نہیں تھی کہ وہ اتنے زیادہ حسین اور دلکش بلکہ طلسمِ ہوش ربا جیسے فریب کو قبول نہ کرتا۔ اس کی سوئی ہوئی حسیں بیدار ہو گئیں۔ یہ وہی حسیں تھیں جو عثمان کو لوسی کے جال میں لے گئی تھیں۔ وہ بے خود ہوتا چلا گیا۔

"اوہ!" ۔۔۔ لوسی نے چونک کر کہا ۔۔۔ "کافی تو ٹھنڈی ہو رہی ہے"۔

اس وقت عثمان صوفے پر دراز تھا۔ لُوسی اس سے ذرا الگ ہوئی اور اس نے کافی کی ٹرالی اپنی طرف گھسیٹی اور پیٹھ عثمان کی طرف کر لی۔ اس طرح وہ عثمان کی آنکھوں اور ٹرالی کے درمیان آ گئی۔ ٹرالی پر جو نیپکن رکھے تھے' لوسی نے ان میں سے ایک کی تہوں کے نیچے ہاتھ ڈالا اور ایک گولی اس کے ہاتھ میں آ گئی جو اس نے بڑی تیزی سے ایک پیالی میں رکھ دی اور اس پیالی میں کافی ڈالی پھر ایک اور پیالی میں کافی ڈالی۔

"چینی کتنی پیؤ گے؟" ۔۔۔ لوسی نے عثمان سے پوچھا ۔۔۔ "اُتنی ہی پیتے ہو یا کچھ کم کر دی ہے؟"

"اتنی ہی ڈال دو" ۔۔۔ عثمان نے کہا۔

لوسی نے اس پیالی میں چینی ڈالی جس میں اس نے پہلے ایک گولی ڈالی تھی۔ خود ہی چمچ سے ہلا کر اس نے یہ پیالی عثمان کی طرف بڑھائی۔ عثمان جو صوفے پر لیٹا ہُوا تھا' اٹھ بیٹھا اور اس نے پیالی اپنے ہاتھ میں لے لی۔ پھر دونوں کافی پینے لگے۔

"وینا تو بڑی خوبصورت لڑکی ہے" ۔۔۔ لوسی نے کہا ۔۔۔ "مجھے تو اپنا دشمن سمجھتی ہو گی"۔

"سمجھتی رہے" ۔۔۔ عثمان نے کہا ۔۔۔ "میں اسے دھتکار بھی تو نہیں سکتا"۔

لوسی نے وینا کے متعلق بچ بچ کر باتیں پوچھنی اور کہنی شروع کر دیں۔ کبھی وہ اس کی تعریف کر رہی ہوتی اور کبھی عثمان کو خبردار کر رہی ہوتی کہ وہ وینا پر اتنا زیادہ بھروسہ بھی نہ کرے۔ وہ کہتی تھی کہ اس کے اغوا میں یقیناً وینا کا ہاتھ بھی تھا۔

میجر عثمان اس کی ان باتوں سے دو حصوں میں کٹتا جا رہا تھا۔ کبھی تو وہ وینا کے حق میں ہو جاتا اور کبھی خود ایک دو باتیں وینا کے خلاف کہہ گزرتا۔ اتنے میں وہ گولی جو لوسی نے کافی میں ڈالی تھی' اثر دکھانے لگی۔ اس کے ساتھ لوسی اپنے حسن و شباب کا جادو چلانے لگی۔ عثمان پر لوسی کا طلسم طاری ہو گیا اور وہ سو فیصد لوسی کے حق میں اور وینا کے خلاف ہو گیا۔

یہ شراب' چرس یا ہیروئن جیسا نشہ نہیں تھا کہ وہ بہکی بہکی باتیں کرنے لگتا۔ اس گولی نے میجر عثمان کے ذہن کو سلا دیا تھا' بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اس گولی کے ذریعے لوسی نے اس کے ذہن پر قبضہ کر لیا تھا۔

"اب بتاؤ" ۔۔۔ عثمان نے لوسی سے پوچھا ۔۔۔ "تم وہاں کیوں گئی تھیں؟"

"دیکھو عثمان!" ۔۔۔ لوسی نے بڑے پیارے انداز میں کہا ۔۔۔ "میں آج تم پر ایک راز فاش کر رہی ہوں۔ یہ راز سن کر تمہیں اندازہ ہو گا کہ مجھے تم سے کتنی محبت ہے۔ میں کوئی بات تم سے چھپا نہیں سکتی .... میرا تعلق انڈیا کی انٹیلی جنس کے ساتھ ہے۔ تم نے 'را' کا لفظ تو سنا ہو گا"۔

"ہاں ہاں" ۔۔۔ عثمان نے قدرے چونک کر کہا ۔۔۔ "فوجی افسر ہو کر میں اگر اس نام

سے واقف نہیں تو میں فوجی افسر بھی نہیں۔ کیا تمہارا تعلق را کے ساتھ ہے؟"

"ہاں عثمان!" —— لوسی نے جواب دیا —— "میرا تعلق را کے ساتھ ہے ...اور تمہارا تعلق بھی را کے ساتھ ہے"۔

"میرا کیوں؟"

"کیا میں اور تم دو انسان ہیں؟" —— لوسی نے عثمان کو اپنے قریب کرتے ہوئے —— "تمہیں یاد ہو گا کہ ایک دو مرتبہ میں نے تمہیں کہا تھا کہ تم شہزادے ہو لیکن تم ملک میں پیدا ہوئے ہو۔ میں نے یہ بھی کہا تھا کہ میں تمہیں صحیح معنوں میں شہزادہ چاہتی ہوں لیکن میں یہ نہ بتا سکی کہ میں تمہیں کس طرح شہزادہ بناؤں گی۔ وہ اب بتا رہی ہوں۔ یہ تو تم نے کئی بار کہا تھا کہ تم کسی جذبے کے تحت فوج میں نہیں گئے تھے تمہارے ڈیڈی تمہیں فوجی افسر بنانا چاہتے تھے کیونکہ وہ خود انگریزوں کی فوج کے افسر تھے"۔

"ہاں ہاں" —— عثمان نے کہا —— "مجھے یہ سب باتیں یاد ہیں۔ تم بتاؤ کہنا کیا چاہتی ہو۔ اپنا مطلب بیان کرو"۔

"تمہارے ہاتھ میں خزانہ ہے" —— لوسی نے کہا —— "یہ ایسا خزانہ ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔ تم اس میں سے جتنا بھی خرچ کرو گے اس سے زیادہ پاؤ گے"۔

لوسی نے اسے تفصیل سے بتایا کہ وہ انڈین انٹیلی جنس کا ایجنٹ بن جائے تو اسے کیا کرنا ہو گا اور اسے اس کا کتنا معاوضہ ملے گا۔ دولت کے ساتھ دنیا کی بہترین شراب اور انتہائی حسین اور دلکش لڑکیاں ملیں گی۔ لوسی کا ایک ایک لفظ عثمان کے دل میں اترتا رہا تھا۔ یہ اس نشے کا اثر تھا جو لوسی نے اس پر طاری کر دیا تھا۔ یہ ایسا نشہ تھا جو میجر عثمان جیسی شخصیتوں پر ہی طاری ہوا کرتا ہے کیونکہ یہ لوگ ایسے ہی نشے کے متلاشی اور ... ہوتے ہیں۔ یہ ایسی کمزور شخصیتیں ہوتی ہیں جو اس قسم کی دلکش لڑکیوں کی سحر انگیز باتیں سن کر اپنے پیدا کرنے والے کو بھی بھول جاتے ہیں۔ لوسی تو اس فن کی ماہر تھی۔ قدرت نے اسے ہر اس ہتھیار سے لیس کر رکھا تھا جو عثمان جیسے آدمیوں کو ذرا سی کوشش میں گھائل کر دیا کرتا ہے۔

لوسی کا حسن کوئی غیر معمولی حسن نہیں تھا۔ اس ملک میں اس سے کہیں زیادہ حسین لڑکیاں موجود تھیں۔ وینا ہی کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ لوسی سے کہیں زیادہ حسین

لیکن وینا ایک زنجیر تھی' ایک رکاوٹ تھی اور وہ ایک حقیقت تھی اور پھر اس میں یہ بات بھی تھی کہ اس نے دو بچے جن کر عثمان کو کچھ ذمہ داریوں میں جکڑ دیا تھا۔ اس کے مقابلے میں لوسی اس فن کی ماہر تھی جو ایک نظر میں ذمہ داریوں کی بڑی مضبوط زنجیریں توڑ دیا کرتا ہے۔ اس کے پاس لذت تھی اور فرار کے راستے تھے۔ اداکاری ایسی جس پر حقیقت اور قدرتی بے ساختگی کا گمان ہوتا تھا۔ وہ جب جذباتی ہوتی تھی تو عثمان تو کچھ بھی نہیں تھا' ریت کی ڈھیری تھی' کسی زاہد اور پارسا کی بھی قسمیں ٹوٹ جاتی تھیں۔

ڈرائنگ روم کے بند دروازے کے اندر نرم و گداز صوفے پر لوسی نے اپنے جسم کا اور اپنی زبان کا جو جادو چلایا اس نے میجر عثمان کو اس کے جسم میں جذب کر دیا۔ عثمان پاتال ہو چکا تھا۔ لوسی ایک حسین خواب تھا جس سے کوئی بیدار نہیں ہونا چاہتا۔

لوسی پہلے مرحلے میں کامیاب تھی۔ اب اس نے دوسرے مرحلے کا آغاز کیا۔ وہ اس طرح کہ عثمان کو آہستہ آہستہ حقیقت کی طرف لانے لگی۔

"یہ خیال رکھنا عثمان!" —— لوسی نے کہا —— "وینا کو شک نہ گزرے کہ میں تمہیں کسی اور راستے پر لے جا رہی ہوں۔ اچھا ہوا کہ اس کے ساتھ میرا تعارف ہو گیا ہے۔ تم جتنے دن یہاں ہو میں اسے اپنے قریب کرنے کی پوری کوشش کروں گی لیکن یہ خیال رکھنا کہ وہ تمہیں گمراہ کرے گی"۔

"کیا تم لاہور واپس آ جاؤ گی؟" —— میجر عثمان نے لوسی سے پوچھا۔

"آخر وہیں آنا ہے" —— لوسی نے جواب دیا —— "لیکن اتنی جلدی نہیں آؤں گی کیونکہ وہاں میرے لئے خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ وہاں میں پہچانی گئی ہوں۔ وینا کے بھائی اور تمہارے فوجی دوست مجھے پکڑوا دیں گے"۔

"ایک بات بتاؤ" —— عثمان نے پوچھا —— "کیا تمہیں واقعی وینا کے بھائیوں اور تمہارے فوجی دوستوں نے اغوا کیا تھا؟"

"ہاں" —— لوسی نے جواب دیا —— "انہوں نے ہی اغوا کیا تھا اور وہ اس کمرے میں میرے پاس آئے بھی تھے"۔

"اب یہ بتاؤ" —— عثمان نے پوچھا —— "کیا انہوں نے واقعی تمہاری آبروریزی کی تھی؟"

"نہیں، عثمان!" —— لوسی نے جواب دیا —— "اب جبکہ تم میرے ساتھی بن گئے

ہو؛ میں تم سے جھوٹ نہیں بولوں گی۔ ان میں سے کسی ایک نے بھی کوئی بیہودہ حرکت نہیں کی تھی۔ میرے جسم کو ہاتھ تک نہیں لگایا تھا البتہ اس نوکر کو میں نے اپنے جرم رشوت دی تھی جس نے مجھے وہاں سے نکالا تھا۔ اس کے بغیر میں وہاں سے نکل نہیں سکتی تھی"۔

"وہ نوکر کہاں گیا؟"

"اس کی تو ہڈیاں بھی خاک ہو چکی ہوں گی" ــــ لوسی نے جواب دیا ــــ "میرے آدمی اس کی لاش نہر میں پھینک آئے تھے اور یہ قتل اس طرح ہضم ہو گیا جس طرح پاکستان میں لوگ قتل ہوتے ہیں اور قاتلوں کا کوئی سراغ نہیں ملتا..... عثمان! ہم یہ طاقت تمہیں بھی دیں گے۔ تم جسے چاہو قتل کرو گے اور پکڑے نہیں جاؤ گے۔ میں ایک بار تمہیں بتا دینا چاہتی ہوں کہ اپنے دوستوں سے بچ کے رہنا وہ مخلص اور سچے پاکستانی ہیں کہیں ایسا نہ ہو تم بھولے پن میں انہیں اپنا راز دے دو اور پھنس جاؤ"۔



عثمان جب واپس ہوٹل میں آیا تو اس کی چال ڈھال میں کچھ اور ہی جوش اور کچھ اور ہی انداز تھا۔ وینا کو اس نے گلے لگا لیا لیکن اس پر ایسی کیفیت طاری تھی کہ وینا کے جسم سے اُسے لُوسی کے جسم کی بُو آتی تھی۔ وہ ابھی تک وہی خواب دیکھ رہا تھا جو اسے لُوسی نے دکھائے تھے۔

"کیا کر کے آئے؟" ــــ وینا نے پوچھا ــــ "لوسی ملی؟"

"ہاں" ــــ عثمان نے جواب دیا ــــ "اُسی کے پاس بیٹھا رہا ہوں لیکن اتنی چالاک لڑکی ہے کہ اس نے پتہ نہیں چلنے دیا کہ وہ سندھ کے اتنے دور دراز علاقے میں کیوں گئی تھی لیکن وینا میں اس کی اصلیت معلوم کر کے ہی رہوں گا"۔

میجر عثمان لوسی کے خلاف باتیں کرتا رہا۔ وہ دراصل وینا کو دھوکا دے رہا تھا لیکن ہوا یہ کہ باتیں کرتے کرتے وہ حقیقی طور پر لوسی کے خلاف ہو گیا جیسے وہ اچانک مخلص پاکستانی بن گیا ہو۔ اپنے دشمن ملک کا جاسوس بن جانا ایسا اقدام نہیں کہ ضمیر اسے فوراً قبول کر لیتا۔ ہوٹل کے کمرے میں جب اپنی بیوی اور معصوم بچوں میں وہ بیٹھا ہوا تھا تو اسے محسوس ہوا جیسے یہ معصوم بچے اس پر طنز کر رہے ہوں کہ یہ دیکھو ہندوؤں کا جاسوس بیٹھا ہے۔ اسے یوں لگا جیسے وہ اپنے معصوم بچوں پر بمباری اور توپوں کی گولہ باری کروا رہا

ہو۔ اس کی شخصیت جو دراصل پہلے ہی کٹی پھٹی تھی، دو حصّوں میں بٹ گئی اور اس کے اندر ایک کشمکش شروع ہو گئی۔ ایک حصے پر لوسی غالب تھی اور دوسرے پر وینا اور دو معصوم بچے۔ وہ اپنے آپ میں بے چینی سی محسوس کرنے لگا۔

"کیوں!" ــــ وینا اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی اور بڑے پیار سے پوچھا ــــ "کچھ پریشان سے دکھائی دیتے ہیں"۔

"نہیں تو!" ــــ عثمان نے سر جھٹک کر جواب دیا اور اپنے چہرے پر خوشگوار سا تاثر پیدا کر لیا۔ وینا کو اپنے ایک بازو کے گھیرے میں لے کر بولا ــــ "تم ہو تو پریشانی کیسی!"

"یہ تو آپ نے ضرور سوچا ہو گا" ــــ وینا نے کہا ــــ "کہ ہمارے ساتھ جو واقعہ ہوا ہے یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں۔ ایک فوجی افسر کا پوری فیملی کے ساتھ اغوا ہو جانا اور وہ بھی اپنے ہی ملک میں۔ یہ اخباروں میں آنے والی خبر ہے اور اس خبر سے جی ایچ کیو اور گورنمنٹ کے حلقوں میں تہلکہ برپا ہو جانا چاہئے۔ سندھ انڈیا کا صوبہ تو نہیں، پاکستانی علاقہ ہے۔ میں اس قسم کے اغوا اور ڈاکوؤں کی خبریں پڑھتی رہی ہوں لیکن جب میں خود اغوا ہوئی تو احساس ہُوا کہ یہ معاملہ کتنا تشویشناک ہے۔ اس کے ساتھ ایک جواں سال لڑکی کا وہاں جانا اور ایک اشارے سے ہمیں رہا کرا لینا کوئی معمولی بات نہیں۔ اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو ایک روز سندھ بڑے آرام سے انڈیا کا صوبہ بن جائے گا اور یہاں جتنے پاکستانی یعنی غیر سندھی ہوں گے وہ سب مشرقی پاکستان کی طرح انڈیا کے قیدی ہوں گے۔ ذرا غور کرو عثمان! کہ یہ معاملہ کس قدر سنگین ہے۔ اس لوسی کو گرفتار کروانا ہے اور آپ یہ معاملہ اپنے آپ تک ہی محدود نہ رکھیں۔ ہماری جانیں اور عزت تو بچ گئی ہے۔ یہ سوچیں کہ پاکستان کس خطرے میں آیا ہُوا ہے۔ ہم اپنی ذاتی عزت، جان اور مال پاکستان پر قربان کر سکتے ہیں اور کرنا چاہئے"۔

عثمان یوں وینا کے منہ کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے چھوٹا سا کوئی بچہ جو کچھ سمجھنے کی اہلیت نہ رکھتا ہو بات کرنے والے کے منہ کی طرف دیکھ رہا ہو یا جیسے کوئی احمق ہو اور دانشور کی بات سمجھنے کی کوشش نہ کرتے ہوئے سن رہا ہو۔

عثمان پر لُوسی نے جو نشہ طاری کر دیا تھا وہ اُتر رہا تھا اور اب اس پر وہ کیفیت طاری ہو رہی تھی جو نشہ اُترنے کے بعد ہُوا کرتی ہے اور جو ڈیپریشن سے ملتی جلتی ہے۔ آہستہ

آہستہ عثمان کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمودار ہونے لگے۔

"عثمان!" —— وینا نے عثمان کی اندرونی کیفیت کو سمجھے بغیر کہا —— "کیا آپ کی غیرت نے یہ گوارہ کرلیا ہے کہ آپ کو آپ کی جوان بیوی اور معصوم بچوں کے ساتھ اغوا کرلیا جائے؟ .... خدا کی قسم میں مرد ہوتی تو نہ جانے کس انتہا تک پہنچ کر انتقام لیتی۔ لوسی آپ کے ہاتھ میں ہے۔ میں یہ تو کبھی مشورہ نہیں دوں گی کہ آپ اس لڑکی کا گلا گھونٹ دیں۔ میں جانتی ہوں کہ اس اکیلی کو مار ڈالنے سے اس کا پورا گروہ زمین کے نیچے چلا جائے گا۔ پھر بھی آپ اس لڑکی کو اپنے ہاتھ میں رکھیں اور کسی نہ کسی طرح اس سے اس کے ساتھیوں کی نشاندہی کروائیں"۔

"وہی تو میں کر رہا ہوں" —— عثمان نے اُکھڑے ہوئے سے لہجے میں کہا جیسے اس کے دل میں کچھ اور ہو اور منہ سے کچھ اور نکل گیا ہو۔

"میں تو سوچ سوچ کر پریشان ہوگئی ہوں" —— وینا نے کہا —— "کیا ہندو میں یہ جرأت پیدا ہوگئی ہے کہ اس نے پاکستان کی زمین کو اپنے باپ دادا کی جاگیر سمجھ لیا ہے اور اس ملک کو اپنے جاسوسوں' تخریب کاروں اور لوسی جیسی لڑکیوں سے بھر دیا ہے؟.... آپ کو تو راتوں کو بھی نیند نہیں آنی چاہئے۔ آپ کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک تو آپ میری طرح اور ہر پاکستانی کی طرح پاکستانی ہیں اور دوسری حیثیت زیادہ اہم ہے۔ وہ یہ کہ آپ فوجی افسر ہیں اور یہ ذمہ داری آپ پر عائد ہوتی ہے کہ ملک کو دشمن سے بچائیں' دشمن خواہ زمین کے نیچے سے حملہ آور ہو یا اپنی جنگی طاقت سے حملہ کرے"۔

"میں جانتا ہوں وینا!" —— عثمان نے پہلے سے زیادہ اُکھڑی ہوئی اور ذرا کانپتی ہوئی سی آواز میں کہا —— "مجھے اپنی ذمہ داریوں کا پورا پورا احساس ہے .... دیکھو میں کیا کرتا ہوں"۔

"یہ تو آپ بہتر سمجھتے ہیں کیا کرنا چاہئے" —— وینا نے کہا —— "میں یہ مشورہ دیتی ہوں کہ یہاں انٹیلی جنس' آئی ایس آئی کا دفتر تو ضرور ہوگا۔ وہاں جائیں اور انہیں بتا دیں۔ میرا خیال ہے وہ کوئی بہتر طریقہ سوچ سکیں گے"۔

عثمان چونک اٹھا اور اس نے وینا کی طرف دیکھا پھر اس کی نظریں جھک گئیں۔ پاک آرمی کے ایک میجر کو سب سے پہلے یہی کرنا چاہئے تھا کہ وہ آئی ایس آئی کو اس واقعہ کی تفصیل سناتا اور پھر کہتا کہ یہ لڑکی اس کے ہاتھ میں ہے اور یہ اس لڑکی کو اس کے گروہ کی

نشاندہی کے لئے استعمال کر سکتا ہے۔ عثمان نے سوچا بھی یہی تھا لیکن لوسی نے اسے اپنے طلسم میں گرفتار کر لیا اور عثمان کی عقل پر ایسا پردہ پڑا کہ وہ لوسی کے گروہ میں شامل ہو گیا۔ وینا نے باتیں کیں تو عثمان الٹے پاؤں پیچھے کو چل پڑا۔ اس نے دیکھا کہ وینا کمرے میں ٹہل رہی تھی۔ کبھی وہ کھڑکی کے سامنے جا کھڑی ہوتی اور باہر دیکھنے لگتی۔ ہوٹل کا یہ کمرہ دوسری منزل پر تھا جس کی کھڑکی سے کراچی کا شہر دور دور تک نظر آتا تھا۔ سڑکوں اور فٹ پاتھوں پر لوگوں کا جم غفیر اِدھر اُدھر آ جا رہا تھا۔ اس ہجوم میں بوڑھے بھی تھے' جوان بھی' عورتیں بھی تھیں بچے بھی۔ وینا اس متحرک ہجوم کو دیکھتی رہی۔ وہ یکلخت پیچھے کو مڑی اور عثمان کو دیکھا۔

"عثمان!" —— وینا نے جذبات کی شدت سے قدرے لرزتی ہوئی آواز میں کہا —— "ہم نے یہ ملک لاکھوں جانوں کی قربانی دے کر حاصل کیا ہے" —— وینا نے کمرے میں کھیلتے ہوئے اپنے دونوں بچوں کی طرف اشارہ کر کے کہا —— "قوم نے اتنے چھوٹے چھوٹے بچے پاکستان پر قربان کئے ہیں۔ کیا ایک آوارہ اور بدکار لڑکی کی وجہ سے ان معصوموں کی قربانیاں رائیگاں جائیں گی؟ اپنے ان بچوں کو دیکھیں عثمان اور پھر اس کھڑکی میں کھڑے ہو کر باہر دیکھیں۔ یہ وہ قوم ہے جس نے ضربِ کلیمی سے برصغیر کے دو ٹکڑے کر دیئے تھے لیکن میں ان قربانیوں کو سوچتی ہوں جو قوم نے پاکستان کی خاطر دی تھیں۔ آج اس ملک کے وجود میں ہندو جیسے دشمن کے پنجے گہرے اُتر رہے ہیں .... کچھ کرو عثمان! کچھ کرو اور جلدی کرو"۔

"کر رہا ہوں وینا" —— عثمان نے کہا —— "تم دیکھنا میں کیا کرتا ہوں"۔

اُس رات عثمان اچھی طرح سو بھی نہ سکا۔ اس کے ذہن میں شدید کشمکش جاری رہی۔ کبھی تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے اس کی ذات میں دو انسان لڑ رہے ہیں اور ایک دوسرے کا خون بہا رہے ہیں۔ صبح آنکھ کھلی تو سب سے پہلے اسے لوسی کا خیال آیا۔ نیم بیداری کے عالم میں اسے عجیب سا سکون اور سرور سا محسوس ہُوا۔

وینا جو کچھ دیر پہلے کی جاگی ہوئی تھی' باتھ روم سے نکل کر کمرے میں آئی تو عثمان کی نظر اس پر پڑی۔ عثمان یوں بجھ کے رہ گیا جیسے کسی نے جلتا چراغ پھونک مار کر بجھا دیا ہو۔ عثمان کے ذہن میں وینا کی باتیں گونجنے لگیں پھر اسے اپنے دونوں بچے نظر آئے۔ بڑا بچہ جس کی عمر تین سال تھی پلنگ پر چھوٹے بچے کے ساتھ کھیل رہا تھا جو ابھی بیٹھ بھی

نہیں سکتا تھا۔ عثمان کو دونوں بچے اتنے پیارے لگے کہ وہ اپنے دل پر جو گرفت سی اور بوجھ سا محسوس کر رہا تھا وہ اتر گیا اور وینا اسے کچھ زیادہ ہی خوبصورت اور دلکش نظر آئی۔ وہ اٹھا اور کھڑکی کھول کر باہر دیکھنے لگا۔

"اپنے بچوں کو دیکھیں" ___ عثمان کے ذہن میں وینا کے گذشتہ شام والے الفاظ گونجنے لگے ___ "اس کھڑکی میں کھڑے ہو کر دیکھیں۔ یہ وہ قوم ہے جس نے ضربِ کلیمی سے برِصغیر کے دو ٹکڑے کر دیئے تھے لیکن میں ان قربانیوں کو سوچتی ہوں...."

عثمان تیزی سے پیچھے کو مڑا۔

"دیکھنا وینا!" ___ عثمان نے پُرعزم لہجے میں کہا ___ "ملک کے ان دشمنوں کو میں اپنے ہاتھوں گولی ماروں گا"۔

"جذبات میں آکر نہیں عثمان!" ___ وینا نے کہا ___ "سوچ سمجھ کر کوئی فیصلہ کرنا۔ جوش میں آکر اس کیس کو بگاڑ نہ دینا۔ میں تمہارے ساتھ ہوں"۔

عثمان کے وجود میں ایک پاکستانی بیدار ہو گیا۔



انبالہ کے ملٹری ہسپتال کے کمرے میں صغیر پہلے کی طرح بیڈ پر لیٹا ہوا تھا۔ زخم خاصہ بہتر ہو گیا تھا اور صغیر کمرے میں چل پھر بھی سکتا تھا لیکن تیز چلنا ابھی مشکل تھا کیونکہ زخم میں درد شروع ہو جاتا تھا پھر بھی اس نے اپنے فرار کے ارادے کے پیش نظر تیز چلنے کی کوشش شروع کر دی تھی۔ دو بار خالدہ کمرے میں آئی تو اسے چلتے دیکھا۔ خالدہ نے اسے سختی سے منع کیا کہ وہ اتنا زیادہ نہ چلے۔ خالدہ کو خوش کرنے کے لئے وہ بیڈ پر بیٹھ گیا۔

اس کے کمرے کے باہر جو آدمی موجود رہتا تھا' وہ پہلے ہی صغیر کے ساتھ بے تکلف ہو گیا تھا لیکن اب صغیر نے اس کے ساتھ کچھ زیادہ ہی بے تکلفی شروع کر دی تھی اور اس کے ساتھ ایسی باتیں کرنے لگا تھا جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ وہ انڈیا میں آکر بہت خوش ہے اور باقی زندگی یہیں گذارے گا۔ بہرحال وہ قیدی تو تھا نہیں پھر بھی صغیر نے اس آدمی کو پہلے سے زیادہ اعتماد میں لے لیا۔

"تمہیں خواہ مخواہ میرے ساتھ باندھ دیا گیا ہے" ___ گذشتہ رات صغیر نے اس آدمی سے کہا ___ "رات کو تم اپنے گھر چلے جایا کرو"۔

"یہ تو میں نے دیکھ لیا ہے صغیر صاحب!" ___ اس آدمی نے کہا ___ "لیکن آپ جانتے ہیں کہ یہاں میرے محکمے کا کوئی نہ کوئی افسر آنکلتا ہے۔ رات کو میں ساتھ والے کمرے میں سوتا ہوں اور دو تین مرتبہ اٹھ کر آپ کو دیکھ لیتا ہوں۔ یہ تو میں جانتا ہوں کہ آپ قیدی نہیں لیکن آپ کی دیکھ بھال کے لئے میرا یہاں رہنا ضروری ہے"۔

صبح پہلے ہندو میجر ڈاکٹر آیا اور صغیر سے حال احوال پوچھا۔ صغیر نے بتایا کہ زخم کا درد کم نہیں ہوا۔ ڈاکٹر نے درد کی گولیاں لکھ دیں اور صغیر کو تسلی دی کہ وہ جلدی ٹھیک ہو جائے گا۔ اس میجر ڈاکٹر کے جانے کے بعد ڈاکٹر عبدالرشید آگیا اور اس نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔

"صغیر بھائی!" ___ ڈاکٹر عبدالرشید نے کہا ___ "میں نے رات کو آپ کا سارا انتظام کر دیا ہے۔ میرے گھر والے اور میرے دوست آپ کو اپنے ہاں رکھنے پر نہ صرف آمادہ ہو گئے ہیں بلکہ وہ خوشی محسوس کر رہے ہیں کہ ایک پاکستانی کی مدد کرنے کا انہیں موقع ملا ہے اور جب میں نے انہیں بتایا کہ یہ پاکستانی کس نوعیت کا ہے تو وہ اور زیادہ خوش ہوئے کہ وہ ہندو کے ایک حربے کو بیکار کر دیں گے.... آج رات بارہ بجے کے بعد آپ یہاں سے نکلنے کے لئے تیار رہیں۔ گیٹ تک آپ کو پیدل چلنا پڑے گا۔ آگے گاڑی کا انتظام ہے"۔

"میں بالکل تیار ہوں" ___ صغیر نے کہا ___ "اور کوشش کروں گا کہ گیٹ تک اس طرح پیدل چلوں کہ کسی کو شک نہ ہو کہ زخمی یا مریض ہوں"۔



رات ساڑھے بارہ بجے کے لگ بھگ ڈاکٹر عبدالرشید صغیر کے کمرے میں آیا۔ وہ آدمی جو صغیر کے پاس رہتا تھا ساتھ والے کمرے میں گہری نیند سویا ہوا تھا۔ اس نے صبح تک جاگنا ہی نہیں تھا حالانکہ رات کم از کم تین مرتبہ اٹھ کر صغیر کو دیکھا کرتا تھا۔ اس رات اس کی گہری نیند کا انتظام اس طرح کیا گیا تھا کہ شام کے کھانے کے بعد ساڑھے آٹھ نو بجے کے درمیان صغیر نے چائے کی دو پیالیاں منگوائیں اور اس آدمی کی نظر بچا کر ایک پیالی میں نیند کی گولی جو ڈاکٹر رشید اسے دے گیا تھا ڈال دی اور اسے اچھی طرح ہلا کر صغیر نے اس آدمی کو بلایا۔

"یہ لو بھائی میرے" ___ صغیر نے اسے کہا ___ "آؤ بیٹھو چائے پیو اور گپ شپ

لگاؤ۔ میں تو اکیلے گھبرا جاتا ہوں۔ خدا جانے کب یہاں سے جان چھوٹے گی اور انبالہ کی سیر کرنے کے قابل ہوں گا"۔

اس آدمی نے بڑے مزے لے لے کر چائے پی تھی اور صغیر کے ساتھ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ وہ زیادہ تر پاکستان کے متعلق باتیں پوچھتا تھا اور کہتا تھا کہ وہ پاکستان دیکھنا چاہتا ہے۔ باتیں کرتے کرتے اس نے اونگھ محسوس کی۔

"آج تو مجھے بھی کچھ جلدی ہی نیند آنے لگی ہے" ــــ اس آدمی نے جمائی لیتے ہوئے کہا اور اٹھ کر چل پڑا۔

اسے بڑی تیز خواب آور گولی دی گئی تھی۔ صبح سورج نکلنے تک اس کی آنکھ کھلنے کا خطرہ نہیں تھا۔

ڈاکٹر رشید صغیر کو ایک اوور کوٹ اور ایک جناح کیپ اور شلوار قمیض دے گیا اور اسے یہ بتا کر کہ اس نے کیا کرنا ہے کمرے سے نکل گیا تھا۔ صغیر نے ہسپتال کے کپڑے اتار کر شلوار قمیض پہنی۔ اوپر اوور کوٹ پہنا اور سر پر ٹوپی رکھی۔ اُس کے اپنے شوز بھی تھے جو پلنگ کے نیچے رکھے تھے۔ اس نے یہ شوز پہن لئے اور آہستہ آہستہ کمرے سے نکل گیا۔ وہ یوں ٹہلتا ہوا چل رہا تھا جیسے کسی کام سے کوئی اجنبی ہسپتال میں آیا ہو۔ اس نے یہ بھی خیال رکھا کہ لنگڑا کر نہ چلے۔

خراماں خراماں چلتا وہ ہسپتال کی بلڈنگ سے نکلا اور گیٹ کی طرف چلنے لگا۔ وہ خاصے عرصے سے انڈین انٹیلی جنس میں تھا۔ اسے خاص قسم کی ٹریننگ بھی دی گئی تھی جو اس موقع پر اس کی مدد کر رہی تھی۔ وہ چلتے چلتے رُکتا اور اِدھر اُدھر دیکھتا اور پھر چل پڑتا۔ کسی کو شک تک نہیں ہوتا تھا کہ یہ کوئی مریض ہے اور ہسپتال سے فرار ہو رہا ہے۔ ہسپتال کی علیل فضا میں خاموشی تھی۔ گیٹ پر ایک چوکیدار سٹول پر بیٹھا ہوا تھا اور فوجی سنتری گیٹ کے ساتھ بنے ہوئے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ رات کے اُس وقت اُس کا کوئی کام نہ تھا۔

صغیر گیٹ تک پہنچ گیا۔ گیٹ بند تھا۔ صغیر نے چوکیدار کو اشارے سے بلایا۔

"باہر دیکھو" ــــ صغیر نے اسے افسرانہ لہجے میں کہا ــــ "ایک سفید سوزوکی کار آئی ہو گی۔ ڈرائیور سے کہو میں آگیا ہوں" ــــ صغیر نے ذرا درشت لہجے میں کہا ــــ "کمبخت اتنی دیر سے گاڑی لایا ہے"۔

چوکیدار نے گیٹ کھولا اور باہر نکلا۔ صغیر بھی آہستہ آہستہ چلتا گیٹ سے نکل گیا۔ گیٹ سے کچھ دور ایک طرف سوزوکی کار کھڑی تھی۔ چوکیدار نے اس کار کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔ صغیر اس کار کی طرف چل پڑا اور چلتے چلتے چوکیدار سے کہا کہ وہ اپنی ڈیوٹی پر بیٹھ جائے۔ کار سٹارٹ ہوئی اور صغیر کی طرف آئی۔ صغیر کار کی طرف جا رہا تھا۔ کار اس کے قریب آکر رکی۔ پچھلا دروازہ کھلا اور صغیر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس سیٹ پر ایک آدمی بیٹھا تھا۔ اگلی سیٹ پر ایک اور آدمی اور اس کے ساتھ ایک آدمی سٹیئرنگ پر بیٹھا ہوا تھا۔ ان تینوں نے صغیر کو السلام علیکم کہی اور گاڑی چل پڑی۔ گاڑی کے آگے اور پیچھے کوئی نمبر پلیٹ نہیں تھی۔

گاڑی چھاؤنی کے علاقے سے نکل کر انبالہ شہر کی طرف چلی گئی اور پھر شہر کے گنجان علاقے میں داخل ہو گئی۔ ایک گلی کے سامنے رک گئی۔ دو آدمی صغیر کے ساتھ گاڑی سے نکلے اور گلی میں داخل ہو گئے۔ پروگرام کے مطابق گاڑی چلانے والا گاڑی لے گیا۔

"آپ کو چلنے میں دشواری تو محسوس نہیں ہو رہی؟" ــــ ایک آدمی نے صغیر سے پوچھا۔

"اگر دشواری ہو بھی رہی ہے تو آپ فکر نہ کریں" ــــ صغیر نے کہا ــــ ضرورت پڑی تو میں دوڑ بھی پڑوں گا"۔

"نہیں صغیر صاحب!" ــــ ایک آدمی نے اسے کہا ــــ "ایسی کوئی ضرورت نہیں پڑے گی۔ آپ بیشک آہستہ آہستہ چلیں"۔

آہستہ آہستہ چلتے وہ ایک گلی کا موڑ مڑے اور تین چار گھر آگے جا کر ایک گھر کے دروازے کے سامنے جا رکے۔ دستک پر دروازہ کھلا اور وہ تینوں اس گھر میں داخل ہو گئے۔ اندر جا کر وہ صغیر کو ایک کمرے میں لے گئے۔ کمرے میں ایک اچھی قسم کا پلنگ بچھا ہوا تھا۔ ایک بڑی تپائی اور اچھی قسم کی چار پانچ کرسیاں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ صاف ستھرا اور سجا سجایا کمرہ تھا۔ ہر چیز سلیقے اور قرینے سے رکھی ہوئی تھی۔ صغیر کو پلنگ پر بٹھا دیا گیا۔ وہ زخم میں درد محسوس کر رہا تھا۔

"کیا یہ ڈاکٹر صاحب کا گھر ہے؟" ــــ صغیر نے پوچھا۔

"نہیں" ــــ ایک آدمی نے جواب دیا ــــ "ڈاکٹر صاحب کا گھر نئی آبادی میں ہے۔ یہ ان کے چچا کا گھر ہے اور ہم دونوں ان کے چچا زاد بھائی ہیں .... آپ اوور کوٹ

اتاریں اور بے خوف و خطر آرام کریں۔ صبح ڈاکٹر رشید آکر آپ کو دیکھے گا اور یہ
آپ کا علاج ہو گا"۔

ڈاکٹر عبدالرشید ہسپتال میں موجود رہا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ صغیر جا رہا ہے پھر اس
دیکھا کہ صغیر گاڑی میں بیٹھ گیا ہے۔ وہ دور بر آمدے میں کھڑا دیکھ رہا تھا۔ جب اس
دیکھا کہ گاڑی صغیر کو لے گئی ہے تو وہ آہستہ آہستہ ہسپتال کی بلڈنگ سے نکلا اور وہ
تک پہنچا جہاں اس کا موٹر سائیکل کھڑا تھا۔ وہ موٹر سائیکل پر بیٹھا اور موٹر سائیکل ا
گیٹ سے نکال کر لے گیا۔

ڈاکٹر عبدالرشید نے اپنا فرض خوش اسلوبی سے ادا کر دیا تھا۔

"کیا زخم ٹھیک ہونے تک میں یہیں رہوں گا؟" ——صغیر اپنے میزبانوں سے پو
رہا تھا۔

"ہاں صغیر صاحب!" ——اس کے ایک میزبان نے جواب دیا ——"ہم آپ کو ا
حالت میں تو نہیں جانے دیں گے۔ جب آپ بھاگنے دوڑنے کے قابل ہو جائیں گے
آپ کی روانگی ہو گی۔ یہاں سے نکلنا اور سرحد تک پہنچنا کوئی آسان کام نہیں۔ ہم
آپ بہت بڑا خطرہ اپنے سر لے رہے ہیں۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے، پھر بھی اللہ کی بارگاہ
اچھی امید رکھنی چاہیے"۔

کچھ دیر بعد صغیر کی آنکھ لگ گئی۔

صغیر کی آنکھ کھلی۔ روشن دان سے صبح کی روشنی آ رہی تھی۔ صغیر کو رات کے
واقعات یاد آنے لگے۔ وہ اپنے آپ میں ہیجانی سی کیفیت محسوس کر رہا تھا
س میں اطمینان کی جھلک بھی تھی۔ اسے ٹانگ میں ہلکا ہلکا درد محسوس ہو رہا تھا

صغیر کی آنکھ کھلنے سے پہلے اس ملٹری ہسپتال والوں کی آنکھیں ضرورت سے زیادہ
کھل گئی تھیں جہاں سے صغیر فرار ہوا تھا۔ سب سے پہلے وہ آدمی کمرے میں آیا جو صغیر
ر ڈیوٹی دیتا تھا۔ اس نے صغیر کو کمرے میں نہ پا کر باتھ روم کا دروازہ کھولا تو صغیر وہاں بھی
یں تھا۔ باہر دیکھا۔ نرس اور نوکروں وغیرہ سے پوچھا۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ اس
کمرے میں جو زخمی داخل تھا وہ کہاں چلا گیا ہے۔

کوئی ایک گھنٹہ ہر طرف دیکھنے کے بعد رپورٹ میجر ڈاکٹر تک پہنچی۔

"وہ واپس آئے تو اسے بیڈ کے ساتھ باندھ دو" ——میجر ڈاکٹر نے کہا ——"نہیں
تا تو جائے بھٹے میں۔ وہ ہمارا مریض تھا۔ علاج نہیں کرانا چاہتا تو نہ کرائے" ——اچانک
اکٹر چونک اٹھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار آ گئے۔ اس نے کہا
—"اوہ .... اس مریض کے متعلق تو ہمیں کچھ اور حکم ملا تھا .... اسے ڈھونڈو بھائی! وہ تو
ٹیلی جنس کا آدمی تھا"۔

"ہر طرف ڈھونڈ چکے ہیں سر!" ——میجر ڈاکٹر کو جواب ملا ——"صبح سے اب تک
ا تلاش کے بعد آپ کو رپورٹ دی ہے"۔

میجر ڈاکٹر کچھ کہے بغیر بہت تیز تیز چلتا کمرے سے نکل گیا اور ہسپتال کے کمانڈنٹ
کے دفتر میں داخل ہو گیا۔ کمانڈنٹ نے جب سنا کہ یہ زخمی لاپتہ ہو گیا ہے تو اس نے بھی

گھبراہٹ کا مظاہرہ کیا اور کہنے لگا کہ وہ انٹیلی جنس کو اطلاع دے گا۔

انٹیلی جنس کو کمانڈنٹ کا فون ملا تو وہاں بھی ہلچل مچ گئی۔ وہاں کے افسر دوڑے ہوئے پہنچے اور کمانڈنٹ سے جواب طلبی کرنے لگے۔

"مریضوں کو فرار سے روکنے کا میرے پاس کوئی ذریعہ نہیں" ــــ کمانڈنٹ نے جو عہدے کا بریگیڈیئر تھا' رعب دار آواز میں کہا ــــ "اگر وہ آپ کا قیدی تھا تو اس پر ایسکارٹ لگانا آپ لوگوں کا کام تھا۔ آپ نے صرف ایک آدمی سویلین کپڑوں میں وہاں بٹھا رکھا تھا۔ یہ اس کی ذمہ داری تھی کہ وہ مریض پر نظر رکھتا.... وہ تھا کون؟ کیا وہ آپ کا قیدی تھا؟"

"قیدی تو نہیں تھا سر!" ــــ انٹیلی جنس کے ایک میجر نے جواب دیا ــــ "ہمیں بتانا تو نہیں چاہئے لیکن آپ بریگیڈیئر ہیں اس لئے ہم یہ راز آپ کو دے دیتے ہیں کہ وہ پاکستانی ہے اور ہمارا بڑا ہی کار آمد ایجنٹ ہے۔ ہم اسے یہاں مزید ٹریننگ اور کچھ برین واشنگ کے لئے لائے تھے"۔

"ہاں ہاں' مجھے یاد آ گیا" ــــ بریگیڈیئر ڈاکٹر نے کہا ــــ "اسے وہ انجکشن دیئے جا رہے تھے .... لیکن سوچنے والی بات یہ ہے کہ ان انجکشنوں کے باوجود وہ نکل کیسے گیا!"

"کیا آپ کے سٹاف میں مسلمان ڈاکٹر وغیرہ بھی ہیں؟" ــــ انٹیلی جنس کے میجر نے پوچھا۔

"ہیں تو سہی!" ــــ بریگیڈیئر نے جواب دیا ــــ "میں سمجھ گیا ہوں آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ آپ کو یہ شک ہے کہ یہاں کے کسی مسلمان نے اسے ورغلا لیا ہو گا"۔

"یس سر!" ــــ انٹیلی جنس کے دوسرے افسر نے جواب دیا۔

"میں نہیں مان سکتا" ــــ بریگیڈیئر نے کہا ــــ "اسے جو انجکشن دیئے جا رہے تھے وہ اس کے ذہن کو کسی اور طرف جانے کی اجازت نہیں دے سکتے"۔

"سر!" ــــ انٹیلی جنس کے میجر نے کہا ــــ "یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اسے انجکشن دیئے ہی نہ گئے ہوں ...."

"اسے انجکشن کون دیا کرتا تھا؟" ــــ انٹیلی جنس کے ایک اور میجر نے پوچھا۔

"ایک مسلمان ڈاکٹر" ــــ بریگیڈیئر نے جواب دیا ــــ "ڈاکٹر عبدالرشید .... لیکن میں نہیں مان سکتا کہ ڈاکٹر مسلمان ہو یا ہندو' یہ جرأت کرے کہ وہ مریض کو پوری دوائی بھی نہ دے اور پھر ڈاکٹر عبدالرشید نہایت شریف اور دیانتدار ڈاکٹر ہے۔ میں اس پر شک نہیں کر سکتا کہ اس نے اس مریض کو انجکشن نہ دیئے ہوں"۔

"ایکسکیوزمی سر!" ــــ انٹیلی جنس کے میجر نے کہا ــــ "آپ ڈاکٹر ہیں۔ آپ انسانوں کو کسی اور نظر سے دیکھتے ہیں۔ آپ کے سامنے دشمن ملک کا زخمی یا مریض لایا جائے تو آپ اسے صرف مریض اور ایک دکھی انسان سمجھیں گے اور یہ بھول جائیں گے کہ یہ دشمن کا آدمی ہے اور تندرست ہو کر دشمن ہی رہے گا لیکن سر! ہم انسانوں کو کسی اور نظر سے دیکھتے ہیں۔ ہم انسانوں کو اندر سے جھانکتے ہیں۔ آپ نے جس مسلمان کو شریف اور دیانتدار ڈاکٹر کہا ہے وہ مسلمان بھی ہے۔ انڈیا میں کسی بھی مسلمان کا وجود دیانتدار ہو سکتا ہے لیکن انڈیا کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ اگر آپ کو یہ شک ہے کہ ہمارے زخمی کو انجکشن نہیں دیئے گئے ہوں گے تو میں وثوق سے کہتا ہوں کہ اس میں اس مسلمان ڈاکٹر کا ہاتھ ہے اور یہی ڈاکٹر اس کے فرار کا ذریعہ بنا ہو گا"۔

"میرا دل نہیں مانتا میجر پرشاد!" ــــ بریگیڈیئر نے قدرے مسکراتے ہوئے کہا ــــ "رشید صحیح معنوں میں ڈاکٹر ہے"۔



اتنے میں انٹیلی جنس کا ایک کرنل جو ہندو تھا آ گیا۔ صغیر کے فرار کی اطلاع جب انٹیلی جنس کے دفتر میں پہنچی تھی' یہ کرنل دفتر میں نہیں تھا۔ وہ دفتر میں آیا تو اسے بتایا گیا کہ اس کے افسر ملٹری ہسپتال چلے گئے ہیں اور کس اطلاع پر گئے ہیں۔ کرنل جیپ میں بیٹھا اور ملٹری ہسپتال بریگیڈیئر کمانڈنٹ کے دفتر میں جا پہنچا۔ وہ خاصی پریشانی کے عالم میں تھا۔ اس نے اپنے طور پر بریگیڈیئر سے سوال و جواب کا سلسلہ شروع کر دیا۔ وہ بھی بریگیڈیئر سے جواب طلبی کر رہا تھا۔ بریگیڈیئر ڈاکٹر نے اسے بھی وہی جواب دیا جو وہ میجر کو دے چکا تھا' بلکہ اس نے کرنل کو تھوڑا سا ڈانٹ بھی دیا اور کہا کہ ایسے مریض پر انہیں ایسکارٹ کا انتظام کرنا چاہئے تھا۔ ہسپتال والوں کا کام علاج معالجہ ہے۔

"یہ بھی سوچو کرنل!" ــــ بریگیڈیئر نے کہا ــــ "کہ آپ مجھ سے ایک ایسا کام کرواتے رہے ہیں جو کوئی ڈاکٹر کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ آپ مجھ سے اس مریض کو ایسے انجکشن دلواتے رہے ہیں جو مینٹل ہاسپٹل میں بھی ڈاکٹر انتہائی خطرناک پاگلوں کو دینے سے پہلے کئی بار سوچتے ہیں"۔

"ہم نے آپ کو بتا دیا تھا کہ اس شخص کو یہ انجکشن کس مقصد کے لئے دیئے جا رہے ہیں" ---- کرنل نے کہا ---- "امریکہ کی سی آئی اے ان انجکشنوں کا استعمال بے دھڑک کرتی ہے"۔

"میں جانتا ہوں" ---- بریگیڈیئر ڈاکٹر نے کہا ---- "یہی سوچ کر میں یہ انجکشن اس شخص کو دلواتا رہا ہوں.... میں پھر کہتا ہوں کہ یہ انجکشن اسے نہیں دیئے گئے"۔

"ایک بات بتائیں سر!" ---- کرنل نے پوچھا ---- "کیا ان انجکشنوں کا ایسا اثر بھی ہو سکتا ہے کہ آدمی باہر نکل جائے اور ان انجکشنوں کے زیر اثر یہ جانے بغیر کہ وہ کہاں جا رہا ہے، چلتا ہی چلا جائے؟"

"نہیں" ---- بریگیڈیئر نے جواب دیا ---- "ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ اسی ماحول میں رہنا پسند کرے گا جس میں اسے نشہ مل رہا ہے حالانکہ اسے پتہ نہیں ہو گا کہ اسے نشہ دیا جا رہا ہے.... اس پہلو پر بھی غور کریں کہ وہ زخمی تھا اور اس کی ٹانگ اس قابل نہیں ہوئی تھی کہ اس کے جسم کا بوجھ چند قدم دور تک اٹھا سکتی"۔

"تو کیا اسے کوئی اٹھا کر لے گیا ہے؟" ---- کرنل نے پوچھا۔

"یہ سراغ لگانا آپ کا کام ہے کرنل!" ---- بریگیڈیئر نے کہا ---- "میں نے اپنی جو رائے دینی تھی دے دی ہے۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جانتا"۔

"سر!" ---- کرنل نے کہا ---- "مجھے کچھ اور بھی پوچھنا ہے۔ ان سوالوں کے جواب مجھے مل جانے چاہئیں.... کیا یہ مسلمان ڈاکٹر رات کو بھی ڈیوٹی پر ہوتا ہے؟"

بریگیڈیئر نے میجر ڈاکٹر کی طرف دیکھا جو وہاں موجود تھا۔

"نہیں سر!" ---- میجر ڈاکٹر نے کہا ---- "ڈاکٹر عبدالرشید کی نائٹ ڈیوٹی ان دنوں نہیں ہے"۔

"کیا پاکستان کی انٹیلی جنس اتنی تیز ہے کہ اسے پتہ چل گیا ہو کہ یہ شخص پاکستانی ہے اور انڈین انٹیلی جنس کے جال میں آیا ہوا ہے؟" ---- بریگیڈیئر نے پوچھا ---- "میں سوال یہ سوچ کر پوچھ رہا ہوں کہ اگر اس شخص کو لے جایا گیا ہے تو یہ پاکستان کی انٹیلی جنس کے ایجنٹوں کا کام ہو سکتا ہے جو یہاں موجود ہیں"۔

"آپ کا یہ شک صحیح ہو سکتا ہے سر!" ---- کرنل نے کہا ---- "اگر میں یہ کہوں کہ پاکستان کی انٹیلی جنس میں اتنی تیزی اور اہلیت نہیں تو میں بہت بڑا احمق ہوں گا۔ دشمن

کمزور اور نالائق سمجھنا بہت بڑی حماقت ہوتی ہے۔ انڈیا کے مسلمانوں کو انڈیا کا وفادار سمجھنا بھی ایک حماقت ہے۔ ہم تو یہاں کے مسلمانوں کے چھوٹے بچوں پر بھی اعتبار نہیں کرتے"۔

"اس زخمی کے کمرے میں دو نرسوں کی ڈیوٹی تھی" ---- میجر ڈاکٹر نے کہا ---- "ایک مسلمان اور دوسری کرسچین"۔

"مجھے افسوس ہے کہ ہم آپ کو پوری انسٹرکشن نہ دے سکے" ---- کرنل نے کہا ---- "اس مریض کے ساتھ نہ مسلمان نرس لگانی چاہئے تھی نہ کرسچین۔ ہم کسی کرسچین پر بھی اعتبار نہیں کرتے۔ بے شمار کرسچین فیملیوں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ ہوت آہستہ آہستہ مسلمان ہوتے چلے جا رہے ہیں"۔

"کیا یہ مسلمان نرس رات کو ڈیوٹی پر تھی؟" ---- انٹیلی جنس کے کرنل نے پوچھا۔

"نہیں سر!" ---- میجر ڈاکٹر نے جواب دیا ---- "ان دنوں وہ دن کی ڈیوٹی پر ہے"۔

"تفتیش کی ابتدا اپنے آدمی سے کریں" ---- بریگیڈیئر نے کہا ---- "پہلے تو اس سے پوچھیں کہ وہ رات کمرے کے باہر موجود تھا یا کہیں چلا گیا تھا!"

"تھینک یو سر!" ---- کرنل نے اٹھتے ہوئے کہا ---- "ہمیں فوری طور پر تفتیش شروع کر دینی چاہئے۔ ہمیں آپ کے سٹاف کے تعاون کی ضرورت ہو گی"۔

بریگیڈیئر نے میجر ڈاکٹر کی طرف دیکھا اور ذرا سا سر ہلایا جو ایک حکم تھا کہ انٹیلی جنس کے ساتھ پورا پورا تعاون کیا جائے۔

"یس سر!" ---- میجر ڈاکٹر نے کہا۔

انٹیلی جنس کے افسر بریگیڈیئر ڈاکٹر کو سیلوٹ کر کے کمرے سے نکل گئے۔



پاکستان میں میجر عثمان اپنی بیوی وینا اور دو بچوں کے ساتھ سمندر کے سینے پر تیر رہا تھا۔ وینا کراچی کی سیر کرنا چاہتی تھی اسی لئے وہ اس کے ساتھ کراچی گئی تھی۔ اس روز عثمان بیوی اور بچوں کو سمندر کی سیر کے لئے لے گیا تھا۔ اس نے ایک لانچ کرائے پر لے لی تھی اور وہ سمندر میں کچھ دور چلے گئے تھے۔ وینا عثمان کو اپنے قریب پا کر بہت ہی خوش تھی۔ ان کا تین سالہ بچہ لانچ میں اچھل کود رہا تھا۔

بندرگاہ میں کھڑے بحری جہازوں کو دیکھ دیکھ کر وینا پر کچھ عجیب سا تاثر طاری ہوتا جا

رہا تھا۔ وہ عثمان سے پوچھ رہی تھی کہ پاک بحریہ کے جہاز کون کون سے ہیں۔ عثمان نے لانچ والے سے کہا کہ وہ لانچ بحری جہازوں کے قریب سے گزارے۔ جب لانچ جہازوں کے قریب سے گزرنے لگی تو عثمان نے وینا کو بتانا شروع کر دیا کہ فلاں فلاں جہاز اپنی نوعیت کا ہے۔

"کیا ہمارے پاس اتنی بحری طاقت ہے کہ ہم انڈیا کا مقابلہ کر سکیں؟" —— وینا نے عثمان سے پوچھا۔

"نہیں وینا!" —— عثمان نے جواب دیا —— "ہماری بحری طاقت کھلے سمندروں میں انڈیا کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ انڈیا کے پاس طیارہ بردار بحری جہاز بھی ہے اور دوسرے بحری جہاز بھی زیادہ بڑے اور تعداد میں بھی زیادہ ہیں .... ہمارا ملک بھکاری ملک ہے۔ امریکہ ہماری جھولی میں جو بھیک ڈالتا ہے وہ افسر شاہی اور بادشاہی کرنے والے حکمران اوپر ہی اوپر کھا پی جاتے ہیں"۔

"میں پاکستان کو ایک طاقتور ملک بنا ہوا دیکھنا چاہتی ہوں" —— وینا نے جذباتی سے لہجے میں کہا —— "اتنا طاقتور کہ انڈیا ہماری سرحد کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھ سکے... اور پھر عثمان صاحب! میں جب اُس وقت کی باتیں سنتی ہوں جب پاکستان بنا تھا تو ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں کا قتلِ عام کیا تھا۔ میں نے سنا ہے کہ کم و بیش ایک لاکھ مسلمان لڑکیاں سکھوں نے اغوا کر لی تھیں اور معلوم نہیں کتنے ہزار لڑکیاں سکھوں کے تشدد سے شہید ہو گئی تھیں۔ ہم نے ان معصوم لڑکیوں کا انتقام لینا ہے"۔

"انتقام غیرت والے لیا کرتے ہیں وینا!" —— عثمان نے کہا —— "یہاں تو ہر اس حکمران کو جس کے ہاتھ پاکستان کی حکومت آئی' اپنا ہی گھر بھرنے کی فکر لگی رہی اور ملک کا کاروبار دوسرے ملکوں سے بھیک مانگ مانگ کر چلایا"۔

"ایک سوچ مجھے اکثر پریشان کیا کرتی ہے" —— وینا نے کہا —— "دو ملکوں کی لڑائی ہو' لمبی جنگ ہو یا فرقہ وارانہ فسادات ہوں' پہلا شکار عورت ہوتی ہے۔ ہندو تو پہلا حملہ مسلمان عورت پر کرتے ہیں۔ کشمیر میں عورتوں کی بے حرمتی ہوتی چلی آ رہی ہے۔ پاکستان اور انڈیا کی جب بھی جنگ ہوئی' ہندو فوجی سرحدی دیہات سے ہماری عورتوں کو اٹھا کر لے گئے۔ یہ سوچ کر مجھے خیال آتا ہے کہ پاکستان اور کشمیر کی نوجوان لڑکیوں کو لڑنے کی اور مختلف ہتھیار استعمال کرنے کی ٹریننگ ملنی چاہئے اور انہیں اس قسم کی ٹریننگ بھی ملنی چاہئے جیسے فوجیوں کو ملتی ہے کہ انہیں جنگلوں میں لے جا کر مشکلات اور تکلیف میں کچھ دن رکھتے ہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ہماری عورتوں کو ہر طرح کی مشکل تکلیف دہ صورتِ حال میں اپنے آپ کو اور اپنی عصمت کو بچانے کی ٹریننگ دی جائے"۔

"یہاں تو مردوں کی ٹریننگ کا بھی کوئی رواج نہیں" —— عثمان نے بیزاری سے کہا "کالجوں کے لڑکے اسی وجہ سے غلط اور اخلاق سوز مشغلے اپنا لیتے ہیں کہ انہیں کوئی نصب العین نہیں دیا جاتا نہ انہیں قومی تشخص سے آگاہ کیا جاتا ہے"۔

لانچ سمندر کو چیرتی جا رہی تھی۔ سمندر کی ہوا بڑی خوشگوار اور روح افزا تھی۔ عثمان اور وینا کا بڑا بچہ لانچ میں اِدھر اُدھر دوڑتا اور سمندر سے پوری طرح لطف اندوز ہوتا نے لگا رہا تھا۔ وینا اسے اور کبھی اپنی گود میں لئے ہوئے چھوٹے بچے کو دیکھتی تھی۔

"میں اپنے دونوں بچوں کو آپ کی طرح فوج میں بھیجوں گی" —— وینا نے کہا —— "آپ کا کیا خیال ہے' فوج میں بھیجیں یا نیوی میں؟"

"ایک کو تو میں پاکستان ایئر فورس میں فائٹر پائلٹ بناؤں گا" —— عثمان نے کہا۔

عثمان نے یہ کہہ تو دیا کہ وہ اپنے ایک بیٹے کو فائٹر پائلٹ بنائے گا لیکن وہ وینا کی باتیں صرف سن رہا تھا۔ اس کا دھیان نہ پاک بحریہ کے جہازوں کی طرف تھا نہ اپنے بچوں کی طرف اور نہ ہی اسے وہ وقت یاد آیا تھا جب پاکستان اور انڈیا الگ ہوئے تھے اور ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں کا قتل عام کیا اور مسلمانوں کی بہو بیٹیوں کو اغوا کیا تھا۔ اس کے ذہن پر لوسی کی باتیں سوار تھیں۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ یہی لانچ تیرنے کی بجائے اڑنا شروع کر دے اور اسے لوسی تک پہنچا دے لیکن وینا کے ساتھ وہ ایسا رویہ اختیار کرنے کی کوشش میں تھا جس سے وینا کو یہ تاثر ملے کہ وہ وینا کے سوا کسی اور عورت کا خیال ذہن میں لانے کو گناہ سمجھتا ہے۔ لوسی نے اسے کہا تھا کہ وہ وینا کو ذرا سا بھی شک نہ ہونے دے کہ اس کی توجہ وینا سے ہٹ گئی ہے۔ لوسی نے اسے یہ بھی کہا تھا کہ وہ خود بھی وینا کے ساتھ بے تکلف ہو جائے گی۔

لوسی غیر معمولی طور پر چالاک اور ذہنی طور پر ہوشیار لڑکی تھی۔ اس نے لاہور میں پہلا تجربہ یہ کیا تھا کہ عثمان کو یہ تاثر دیا تھا کہ وہ اس کے بغیر ایک لمحہ بھی زندہ نہیں رہ سکتی اور عثمان کو اپنا مجنوں بنانے کے لئے اس کے دل میں وینا کی نفرت پیدا کر دی تھی۔

اس کے نتیجے میں لوسی وینا کے بھائیوں اور عثمان کے دوستوں کے ہاتھوں اغوا ہوئی اور ...
اسے لاہور کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہنا پڑا۔ یہ تجربہ اتنا مہنگا پڑا تھا کہ اب وہ اسے دہرانے کی
جرأت نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس کی بجائے اس نے اب یہ پینترہ بدلا کہ عثمان کو اس لائن
پر چلا دیا کہ وہ وینا کو کوئی شک نہ ہونے دے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ وینا کو ایسا تاثر
دے جیسے وہ اس پر دل و جان سے فریفتہ ہے۔ یہ طریقہ عثمان کو بھی اچھا لگا تھا۔

وینا اپنے اغوا کے سلسلے میں مطمئن تھی۔ عثمان نے اسے یقین دلایا تھا کہ وہ لوسی کو
دوستی کا جھانسہ دے کر پھندے میں لائے گا ورنہ یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا کہ وہ اس کا
خاوند' چھوٹے چھوٹے بچوں اور گاڑی سمیت اغوا ہو گئی تھی۔ اگر لوسی نہ آ جاتی تو نہ
معلوم تھا کہ اس کے ساتھ کیا سلوک ہونا تھا' لیکن یہ سوال اس کے لئے اور زیادہ پریشان
کن اور حیران کن بھی تھا کہ لوسی سندھ کے دور اندر کے اس علاقے میں ڈاکوؤں کے
ہاں کیا کرنے آئی تھی۔

"عثمان صاحب!" ——— وینا نے کہا ——— "مجھے اغوا یاد آتا ہے تو رونگٹے کھڑے
جاتے ہیں.... کیا آپ اسے جلدی پکڑوا دیں گے؟"

"ہاں ہاں" ——— میجر عثمان نے جواب دیا ——— "اگر صرف لوسی کو پکڑوانا ہو تو ...
ایک دن میں اسے پکڑوا سکتا ہوں لیکن اس اکیلی کے پکڑے جانے سے اس کا باقی گر...
چھپ جائے گا۔ میں لوسی کے ذریعے اس کے گروہ کے تمام افراد کا سراغ لگا لوں گا تم
نہ کرو"۔

لانچ واپس کیماڑی جا رہی تھی۔ کچھ دیر بعد عثمان اور وینا اپنی گاڑی میں ...
ہوٹل کو جا رہے تھے۔

○

شام کے بعد میجر عثمان وینا کو یہ کہہ کر چلا گیا کہ وہ ملیر کینٹ اپنے ایک میجر دو...
سے ملنے جا رہا ہے۔

"کھانا کھا کے نہیں جائیں گے؟" ——— وینا نے پوچھا۔

"نہیں وینا!" ——— عثمان نے بڑے پیارے انداز میں جواب دیا ——— "آج تم ...
کھانا کھا لو۔ اگر میں کھانے کے لئے رک گیا تو اس میجر سے ملاقات نہیں ہو سکے گی۔
کوئی رسمی ملاقات نہیں۔ یہ میجر انٹیلی جنس میں ہے۔ میں نے اسے اپنے اغوا کا سا...
...اور لوسی کے متعلق سب کچھ بتانا ہے پھر وہ جیسے کہے گا میں ویسے ہی کروں گا۔ شاید
مجھے وہاں زیادہ وقت لگ جائے۔ تم جانتی ہو کہانی ذرا لمبی ہے"۔

"ہاں ہاں!" ——— وینا نے پیارے سے لہجے میں کہا ——— "یہ کام کھانے سے زیادہ
ضروری ہے آپ فوراً چلے جائیں"۔

وینا جذبات میں ایسی الجھی کہ محسوس نہ کر سکی کہ اس کے خاوند نے جھوٹ بولا
ہے۔ وینا تو خوش تھی کہ اس کا خاوند اسے واپس مل گیا ہے لیکن خاوند اب جھوٹ کے پر
لگا کر پھر انہی فضاؤں میں اُڑنے لگا تھا جہاں سے وینا سمجھتی تھی کہ وہ نیچے آ گیا ہے۔

عثمان نے زندگی کا جو راستہ اختیار کر لیا تھا اس میں جھوٹ لازمی تھا۔ جھوٹ کے بغیر
وہ ایک قدم نہیں چل سکتا تھا۔ ایسے آدمی کو جھوٹ بول کر عجیب سی لذت محسوس ہوتی
ہے۔ عثمان کو معلوم نہیں تھا کہ جھوٹ دل سے خوفِ خدا کو بھی مٹا دیتا ہے۔ اسے
صرف یہ دلچسپی تھی کہ جھوٹ ایک ایسی چیز ہے جو تمام زنجیریں توڑ دیتا ہے اور انسان کو
آزاد کر دیتا ہے کہ وہ جو جی میں آئے کرے۔ عثمان کو معلوم نہیں تھا کہ خوفِ خدا کو دل
سے نکال دینے سے اللہ کی قوت کو ختم یا کمزور نہیں کیا جا سکتا۔ جھوٹ اللہ کی لاٹھی کو
نہیں روک سکتا۔ عثمان صرف یہ دیکھ رہا تھا کہ جھوٹ بڑے ہی کام کی چیز ہے۔

جھوٹ جب ایک عادت کی صورت اختیار کر لیتا ہے تو یہ ایک نشہ سا بن جاتا ہے
اور کچھ عرصے بعد انسان جھوٹ نہ بولنا چاہے تو بھی اس کے منہ سے جھوٹ ہی نکلتا ہے
اور پھر ایک دن اچانک اُس اللہ کی لاٹھی چل پڑتی ہے جس کا خوف جھوٹ بولنے والا
آدمی دل سے نکال چکا ہوتا ہے۔ اس وقت جھوٹ اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔

جھوٹ اور عورت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ کوئی عورت کسی غیر مرد کے ساتھ
تعلقات قائم کرے گی تو وہ جھوٹ کا ہی سہارا لے گی اور کوئی مرد کسی عورت کے ساتھ
ناجائز مراسم پیدا کرے گا تو وہ بھی اپنے بیوی بچوں اور گھر والوں کے ساتھ جھوٹ ہی
بولے گا۔ عورت ایک ایسا نشہ ہے جو کسی کو لگ جائے تو وہ دین کا رہتا ہے نہ دنیا کا اور
اس کے ساتھ جھوٹ اس کی شخصیت کو مسخ کر کے رکھ دیتا ہے لیکن وہ سمجھتا ہے کہ اس
نے سب کو بے وقوف بنا لیا ہے۔

خدا کے بندوں کو بے وقوف بنایا جا سکتا ہے' خدا کو نہیں ——— یہ الگ بات ہے کہ
خدا اپنے جھوٹے بندے کو سنبھلنے اور سنورنے کی مہلت دیتا ہے اور جب وہ گناہگار بندہ

خدا کی دی ہوئی مہلت سے فائدہ نہیں اٹھاتا تو خدا اسے ایسا پکڑتا ہے کہ اسی دنیا میں اسے جہنم دکھا دیتا ہے۔

عثمان اللہ کے انہی بندوں میں سے تھا جو سمجھتے ہیں کہ وہ خدا کو بھی دھوکا دے سکتے ہیں۔ یہ اللہ کا فرمان ہے اور دنیا کے تمام مذاہب اس اصول کو اہمیت دیتے ہیں کہ جھوٹ وہ گناہ ہے جو ہر گناہ کو جنم دیتا ہے اس لئے صرف اس گناہ سے یعنی جھوٹ بولنے سے باز آجاؤ تو ایک سو گناہوں سے بچ جاؤ گے۔

عثمان نے جھوٹ کا سہارا لیا تو وہ ان لوگوں میں پہنچ گیا جو اللہ کے دین کے اور قرآن کی سرزمین پاکستان کے دشمن تھے۔ لوسی اس کی منتظر تھی۔ پچھلی ملاقات میں اس نے لوسی کو بتا دیا تھا کہ وہ وینا کو سمندر کی سیر کے لئے لے جائے گا اور شام کے بعد لوسی کے پاس پہنچ جائے گا۔

اس شام اس کوٹھی میں جس میں لوسی رہتی تھی ایک تو راما راؤ تھا جو سندھ میں کام کرنے والے گروہ کا انچارج تھا' لوسی تھی اور ایک لڑکی اور وہاں موجود تھی جس کی عمر چوبیس پچیس سال تھی۔ عثمان لوسی کو بڑی خوبصورت لڑکی سمجھا کرتا تھا اور پھر وہ کسی لڑکی کو حسین سمجھتا تھا تو وہ وینا تھی لیکن اس لڑکی کو اس نے دیکھا تو کچھ دیر کے لئے لوسی اور وینا اس کے ذہن سے نکل گئیں۔ عثمان کو دیکھ کر جس طرح اس لڑکی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی وہی عثمان پر جادو کا اثر کر گئی۔ چند سیکنڈ کے لئے عثمان اس لڑکی میں کھو گیا۔

ایک تو وہ حسن ہوتا ہے جو خدا کسی عورت یا مرد کو عطا کرتا ہے اور ایک حسن وہ ہے جو عورت اپنے آپ میں پیدا کرتی ہے۔ عام فہم زبان میں اسے ناز و انداز کہا جاتا ہے لیکن اکثر عورتیں ناز و انداز میں سے تصنع اور بناوٹ نہیں نکال سکتیں۔ کوئی کوئی عورت ایسی ہوتی ہے جو اپنی ڈیل ڈول میں' چال ڈھال اور بات کرنے کے انداز میں ایسا رنگ پیدا کر دیتی ہے جو قدرتی لگتا ہے اور قدرتی حسن کو دوبالا کر دیتا ہے۔ اگر عورت کو کوئی استاد مل جائے تو وہ اسے ٹریننگ دے کر اس کے حسن میں طلسماتی اثر پیدا کر دیتا ہے۔

"عثمان!" ـــ لوسی نے کہا ـــ "یہ فوزی ہے.... فوزیہ کلیم.... یہ تمہیں ملنے کے لئے بیتاب تھی"۔

"مجھے؟" ـــ عثمان نے حیران سا ہو کر کہا ـــ "یہ مجھے کیسے جانتی ہے؟"

"آپ بھی بھولے بادشاہ ہیں عثمان بھائی!" ـــ راما راؤ نے کہا ـــ "آپ کو کون نہیں جانتا۔ میں تو کہتا ہوں کہ انڈیا کا پرائم منسٹر بھی آپ کے نام سے واقف ہو گا"۔

"یہ ہے عثمان" ـــ لوسی نے فوزی سے کہا ـــ "اچھی طرح دیکھ لو۔ تم صبح شام میرے پیچھے پڑی رہتی تھیں کہ عثمان سے ملواؤ"۔

"تم سب نے ان کی تعریفیں ہی اتنی کی تھیں کہ میں انہیں دیکھنے کو بے تاب ہو گئی" ـــ فوزی نے بڑے پیارے سے انداز سے مسکراتے اور شرماتے ہوئے کہا ـــ "یہ تو اس سے بہت زیادہ اچھے اور پیارے لگتے ہیں جتنا تم لوگ بتاتے رہے ہو"۔

"عثمان بھائی!" ـــ راما راؤ بولا ـــ "تم نے اپنے آپ کو چھوٹا سا آدمی سمجھ رکھا ہے۔ تمہارے والد صاحب کو تو دنیا جانتی ہے۔ میں دہلی گیا تو دو آدمیوں نے تمہارے ڈیڈی کا ذکر کیا۔ ایک نے تو یہاں تک کہا کہ ان کا بیٹا عثمان ان سے زیادہ نامور ہے"۔

لُوسی اور راما راؤ اپنے مخصوص اور پُراثر انداز سے عثمان کو غبارے کی طرح پُھلا رہے تھے۔ ان کی باتوں کے ساتھ ساتھ فوزی کا عثمان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بار بار دیکھنا اور ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم لے آنا عثمان پر نشے کی سی کیفیت طاری کر رہا تھا اور عثمان بڑی تیزی سے اونچا ہی اونچا اڑتا جا رہا تھا۔ وہ اتنا اونچا چلا گیا جہاں سے اسے پاکستان کی زمین بھی اور اپنے بیوی بچے بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔

"عثمان بھائی!" ـــ راما راؤ نے کہا ـــ "گاڑی بدل لو۔ تم اس پرانے ماڈل کی کار میں اچھے نہیں لگتے"۔

"کم از کم مرسڈیز ہو" ـــ لُوسی بولی ـــ "پجارو ہو"۔

"ہونڈا اکارڈ بھی اچھی گاڑی ہے" ـــ راما راؤ نے کہا ـــ "میرا مطلب ہے گاڑی اپنی حیثیت کے مطابق ہونی چاہئے' تم فوج میں میجر ہو جو کوئی اتنا بڑا رینک نہیں لیکن سوسائٹی میں تمہارا مقام بہت اونچا ہے"۔

"میں بھی یہی سوچ رہا تھا" ـــ عثمان نے کہا ـــ "لیکن ذرا بجٹ کا معاملہ ہے' پھر بھی گاڑی تو ضرور لوں گا"۔

"بجٹ کا کیا معاملہ ہے!" ـــ راما راؤ نے کہا ـــ "بجٹ کا معاملہ ہم پر چھوڑو گاڑی مل جائے گی۔ ہم تمہیں اس گاڑی میں نہیں دیکھنا چاہتے" ـــ راما راؤ نے لوسی سے کہا ـــ "انہیں کو کھانا لگا دیں"۔

لوسی چلی گئی پھر راما راؤ اٹھا اور یہ کہہ کر کمرے سے نکل گیا کہ ابھی آتا ہوں
کمرے میں فوزی اور عثمان رہ گئے۔

"شکر ہے یہ لوگ یہاں سے اٹھے" ــــ فوزی نے کہا ــــ "میں کچھ دیر آپ
پاس بیٹھنا چاہتی تھی"۔

"کیوں؟" ــــ عثمان نے مسکراتے ہوئے پوچھا ــــ "مجھ میں تم نے کیا خوبی دیکھی
ہے جو تم میرے پاس بیٹھنا چاہتی ہو؟"

"بعض خوبیاں ایسی ہوتی ہیں جو نظر آتی ہیں لیکن بیان نہیں کی جا سکتیں"
فوزی نے اس طرح جھجکتے شرماتے ہوئے کہا جیسے وہ چودہ پندرہ سال کی کمسن لڑکی ہو
بڑی مشکل سے ایک جوان آدمی کے ساتھ بات کر رہی ہو۔ وہ کہہ رہی تھی ــــ "
حال میرا ہے۔ بڑے خوبصورت جوان بھی دیکھے ہیں لیکن ایک نظر میں ہی جو بات
میں دیکھی ہے وہ کسی اور میں نظر نہیں آئی لیکن مجھے یہ دیکھ کر مایوسی ہو رہی ہے
لوسی آپ کی ملکیت کا دعویٰ کرتی ہے۔ میں آپ کو لوسی سے چھیننا نہیں چاہتی لیکن
کی قربت حاصل کئے بغیر رہ بھی نہیں سکتی .... کیا کبھی تھوڑا سا وقت مجھے دیا کریں گے

"وقت تو دے دیا کروں گا لیکن میں پرسوں صبح واپس لاہور جا رہا ہوں"۔

"پھر تو اور زیادہ اچھا ہے" ــــ فوزی نے کہا ــــ "میں بھی لاہور جا رہی ہوں"

"کب؟" ــــ عثمان نے پوچھا۔

"میں دو تین دنوں تک پہنچ جاؤں گی"۔

"کیا تم لوسی کی جگہ جا رہی ہو؟" ــــ عثمان نے پوچھا۔

"ہاں" ــــ فوزی نے جواب دیا ــــ "وہاں مجھے آپ کے ساتھ کی اور آپ کی
کی بہت ضرورت ہو گی"۔

"ساتھ بھی مل جائے گا اور مدد بھی" ــــ عثمان نے کہا ــــ "تمہارا گروپ کمانڈر
تمہیں پوری ہدایات دے گا اور کچھ باتیں میں تمہیں بتاؤں گا"۔

"مجھے تو اس کی بڑی خوشی ہے کہ آپ وہاں ہوں گے" ــــ فوزی نے کہا۔

کچھ دیر بعد نوکر نے آ کر اطلاع دی کہ کھانا تیار ہے۔ عثمان اور فوزی اٹھ کر ڈائننگ
روم میں چلے گئے۔ اتنے میں راما راؤ اور لوسی بھی آ گئے۔ اس وقت تک عثمان آپے
سے باہر ہو چکا تھا۔ اسے اپنی اصلیت یاد نہیں رہی تھی۔ ان لوگوں نے مل جل کر

شہزادہ بنا دیا تھا۔ کھانے کے دوران راما راؤ، لوسی اور فوزی نے سوائے اس کے اور کوئی
بات ہی نہ کی کہ عثمان کو ہوا دیتے رہے اور وہ کھوکھلا غبارہ بن کر پھولتا چلا گیا۔

دشمن کے جاسوس وہی بنتے ہیں جو اپنی اصلیت، شخصیت اور قومیت کو بھول جاتے
ہیں۔ کردار کی یہ کمزوری ایسی کمزوری ہے جسے دشمن نہایت خوبصورت طریقے سے
استعمال کرتا ہے اور اپنے شکار کو یہ تاثر دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے کہ وہ تو بہت ہی
اونچی شخصیت ہے اور وہ غلط ملک میں اور غلط گھر میں پیدا ہوا ہے۔ ایسے انسان کو پستی
میں بلندی اور اپنے ایمان کی بے حرمتی میں وقار نظر آتا ہے۔

غداروں میں یہی کمزوری پیدا کی جاتی ہے۔ وہ اپنے ملک کے دشمن کے ہاتھوں میں
کٹھ پتلی بن جاتے ہیں لیکن انہیں تاثر یہ دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے ملک کے بھی اور دشمن
کے ملک کے بھی بادشاہ ہیں۔ تجربہ کر کے دیکھیں، کسی انتہائی گھٹیا اور بے وقار انسان کے
سامنے جھک جائیں اور اسے فرشی سلام کریں تو وہ عجز و انکسار کی بجائے گردن کو اکڑا کر
رعونت کا رنگ پیدا کر لے گا اور آپ کو چھوٹا سا آدمی سمجھے گا۔

عثمان کی شخصیت میں تو پہلے ہی خامیاں موجود تھیں۔ وہ امیر ماں باپ کا اکلوتا بیٹا
تھا۔ اس کا باپ انگریزوں کا پروردہ جاگیردار تھا اور عثمان ڈسکو سوسائٹی میں پلا اور بڑھا تھا۔
میجر ہوتے ہوئے وہ ڈسکو سوسائٹی کے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی محفلوں میں جاتا تھا اور
اس کے ذاتی اخراجات اتنے زیادہ تھے جو میجر تو دور کی بات ہے، بریگیڈیئر بھی برداشت
نہیں کر سکتا۔ ایسے انسان تو پھونک اور ہوا کو فوراً قبول کرتے اور اپنی شخصیت غیروں
کے حوالے کر دیتے ہیں۔ عثمان کے ذہن پر دو ہی چیزیں غالب تھیں ــــ خوبصورت
لڑکی اور روپیہ پیسہ ــــ روپیہ پیسہ بھی اتنا جو ختم نہ ہونے پائے اور جس ذریعے سے بھی
ملے، حلال ہے۔ عورت بازی کے ساتھ روپے پیسے کا جو تعلق ہے وہ لازم و ملزوم ہے۔
عورت کوئی عام قسم کی ہو تو اور بات ہے، عورت لوسی اور فوزی جیسی تربیت یافتہ ہو تو
پیسے کے ساتھ دین و ایمان بھی ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔

کھانے کے بعد راما راؤ اور فوزی کمرے سے نکل گئے۔ لوسی عثمان کو اپنے کمرے
میں لے گئی اور کافی وہیں منگوالی۔

"فوزی لاہور جا رہی ہے" ــــ لوسی نے عثمان سے کہا ــــ "میں نے اسے سمجھا دیا
ہے۔ تمہاری زندگی میں میرا جو خلا پیدا ہو گیا ہے وہ فوزی ایسے طریقے سے پُر کر دے گی

کہ تم مجھے بھول جاؤ گے"۔

"کیا تم چاہتی ہو کہ میں تمہیں بھول جاؤں؟" ——— عثمان نے پوچھا۔

"ہاں عثمان!" ——— لوسی نے کہا ——— "میں یہی چاہتی ہوں اور اب اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں۔ میرے اغوا نے صورتِ حال بدل ڈالی ہے۔ میں شاید انڈیا چلی جاؤں۔ میں نہیں چاہتی کہ تمہاری زندگی میں کوئی خلا پیدا ہو۔ میں تمہیں اپنے سے زیادہ خوبصورت لڑکی دے کر جا رہی ہوں۔ تمہارا خوب ساتھ نبھائے گی"۔

"میں شاید تمہیں دل سے اتار نہ سکوں" ——— عثمان نے کہا ——— "لیکن اب ایک پہلو میرے سامنے آ گیا ہے۔ تم نے اپنی اصل حقیقت بتا کر میرا کام کچھ آسان کر دیا ہے۔ تم نے میرے ساتھ جو محبت کی ہے وہ اسی کام کے لئے کی تھی جو تم نے اب مجھے بتایا ہے اور اب تم اپنی جگہ ایک اور لڑکی مجھے دے کر جا رہی ہو .... لیکن لوسی تمہاری کمی تم ہی پوری کر سکتی ہو، پھر بھی میں تمہارا مشکور ہوں کہ تم نے میری پسند کی لڑکی مجھے دے دی ہے"۔

"عثمان!" ——— لوسی نے کہا ——— "لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں۔ ہم نے مرسڈیز اور پجارو کی جو بات چھیڑی تھی، وہ بلا مقصد نہیں۔ ہم تمہیں مرسڈیز دیں گے۔ اس کے علاوہ تمہیں ہماری وجہ سے جو سوشل سٹیٹس حاصل ہو گا وہ تم تصور میں نہیں لا سکتے.... میں کوئی زیادہ بات نہیں کروں گی۔ لاہور تمہیں وہی لوگ ملیں گے جنہیں میں اپنے رشتہ دار بتایا کرتی تھی۔ میں تمہیں یہ بھی بتا دیتی ہوں کہ ایم اے خان دراصل منور آھوجا ہے اور وہ میرا باپ نہیں۔ باقی ہدایات تمہیں وہاں سے مل جائیں گی .... میں فوزی کو تمہارے پاس بھیجتی ہوں پھر تم چلے جانا اور خیال یہ رکھنا کہ پہلے کی طرح وینا کو ناراض نہ کر دینا۔ اس کے ساتھ اس قدر پیار اور محبت کرنا کہ اس کا دماغ خراب ہو جائے"۔

کافی پیتے پیتے عثمان نے سرور اور خمار سا محسوس کرنا شروع کر دیا جیسے وہ یورپ کی اعلیٰ درجے کی شراب پی رہا ہو۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کی کافی میں ایک خاص قسم کا نشہ شامل کر دیا گیا تھا جس کا کوئی ذائقہ نہیں تھا، البتہ اس کا اثر ایسا تھا جو انسان کو جہنم سے جنت میں پہنچا دیتا تھا۔

لوسی اٹھی اور عثمان کو اس نے ہاتھوں سے پکڑ کر اٹھایا اور اس طرح اپنے سینے سے لگا لیا جیسے ماں اپنے بچے کو لگاتی ہے۔ یہ ان کی الوداعی ملاقات تھی جو اتنی جذباتی تھی کہ عثمان کی پسلیاں چٹخنے لگیں اور دونوں کی سانسیں ایک ہو گئیں۔ یوں لگتا تھا جیسے دونوں جسم ایک ہو گئے ہوں اور دونوں دل ایک دوسرے سے مل کر دھڑک رہے ہوں۔

اگر لوسی عثمان سے الگ نہ ہوتی تو عثمان اس جذباتی ملاپ میں رات یہیں گذار دیتا۔

"میں فوزی کو بھیجتی ہوں" ——— لوسی نے کہا اور کمرے سے نکل گئی۔

فوزی یوں کمرے میں داخل ہوئی جیسے وہ دروازے کے ساتھ ہی کھڑی تھی۔ اس نے اندر آتے ہی دروازہ بند کر دیا۔ عثمان نے اپنے بازو پھیلا دیئے۔ فوزی نئی نویلی دلہن کی طرح آہستہ آہستہ عثمان کی طرف بڑھی۔ اس کے چہرے پر دلہنوں والی شرمیلی سی مسکراہٹ تھی اور اس کے چلنے کا انداز ایسا تھا جیسے وہ چلنا تو چاہتی ہے لیکن رکنا بھی چاہتی ہے۔ دو تین لمحوں بعد فوزی عثمان کے بازوؤں میں تھی۔

عثمان جب اس کمرے سے نکلا تو اس پر کچھ اور ہی نشہ طاری تھا۔ فوزی کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ تھی جس میں شرمیلا پن نمایاں تھا لیکن عثمان جیسی شخصیتیں یہ سمجھنے سے قاصر ہوتی ہیں کہ یہ مسکراہٹ شرمیلی نہیں بلکہ فاتحانہ ہے۔

عثمان جب ہوٹل میں اپنے کمرے میں داخل ہُوا اور اس نے وینا کو دیکھا تو اس وقت بھی اس کے نتھنوں میں فوزی کے جسم اور سانسوں کی بُو رچی بسی ہوئی تھی۔ وہ ابھی تک فوزی کے جسم کا لمس محسوس کر رہا تھا۔ اس کیفیت میں وینا اسے اچھی نہ لگی لیکن اسے یاد آ گیا کہ وینا کے ساتھ تو بنا کر رکھنی ہے۔

"لو وینا!" ——— عثمان نے کہا ——— "کام ہو گیا۔ آٹھ دس دنوں تک لوسی اور اس کے سارے گروہ کو تم جیل میں دیکھو گی۔ میں تمہیں جیل میں لے جا کر لوسی کو سزائے قید سناتا دکھاؤں گا اور گروہ کے ہر آدمی کو تم وہاں دیکھو گی"۔

"اللہ!" ——— وینا نے خوش ہو کر اور دونوں ہاتھ ملتے ہوئے کہا ——— "آپ کتنے اچھے ہیں۔ میں اس خوبصورت چڑیل کو جیل میں دیکھنے ضرور جاؤں گی"۔

... بجے سو گئے تھے۔ وینا عثمان کے گلے لگ گئی اور عثمان اسے اپنے بازوؤں میں بھینچتے ہوئے فوزی کے تصور میں گم ہو گیا۔

انبالہ کے فوجی ہسپتال میں صغیر کے فرار کی تفتیش شروع ہو چکی تھی اور یہ تفتیش ہسپتال کے مین گیٹ سے شروع ہوئی تھی۔ فرار کی رات جو آدمی مین گیٹ پر ڈیوٹی دے رہے تھے' انہوں نے بتایا کہ رات ساڑھے بارہ ایک بجے کے درمیان ایک آدمی اوور کوٹ پہنے ہوئے باہر نکلا تھا۔ اس نے چوکیدار سے کہا تھا کہ میرے ڈرائیور کو بلاؤ۔ چوکیدار کے جانے کی ضرورت ہی نہ پڑی' ایک سوزوکی کار آئی جس میں ڈرائیور کے علاوہ دو آدمی' ایک آگے اور ایک پیچھے' بیٹھے ہوئے تھے اور ہسپتال سے نکلنے والا آدمی اس کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا اور کار چلی گئی۔

"نمبر تو نہیں دیکھا صاحب!" ——— چوکیدار نے کہا اور سوچ میں پڑ گیا۔ پھر کہنے ——— "مجھے کچھ یوں شک ہوتا ہے کہ کار کا نمبر تھا ہی نہیں" ——— چوکیدار پھر یاد کرنے کوشش کرنے لگا اور اس نے دوٹوک لہجے میں کہا ——— "ہاں صاحب کار کے نہ آگے نمبر تھا نہ پیچھے"۔

"کیا تم ہسپتال سے نکلنے والے آدمی کا حلیہ بیان کر سکتے ہو؟"

چوکیدار سوچ میں پڑ گیا اور اس نے آہستہ آہستہ' سوچ سوچ کر صغیر کا حلیہ بیان لیکن وہ صغیر کا چہرہ اچھی طرح نہ دیکھ سکنے کی وجہ سے بیان نہ کر سکا۔

چوکیدار کے بیان سے تفتیش کرنے والے افسروں نے یہ رائے اخذ کی اوور کوٹ پہنے ہوئے یہ شخص اگر صغیر ہی تھا تو اسے مسلمانوں نے باقاعدہ پلان کے تحت فرار کروایا ہے اور اس میں ہسپتال کے سٹاف کے ایک دو آدمی ضرور شامل ہوں گے ڈاکٹر عبدالرشید پر بجا طور پر شک کیا جا سکتا تھا۔ وہ مسلمان تھا اور اس کے ساتھ بریگیڈیئر ڈاکٹر نے کہا تھا کہ اسے پختہ شک ہے کہ صغیر کو انجکشن نہیں دیئے گئے انجکشن دینے کی ذمہ داری ڈاکٹر عبدالرشید کی تھی۔

"کیا گزشتہ رات ڈاکٹر عبدالرشید یہاں آئے تھے؟" ——— انٹیلی جنس کے ایک نے ان آدمیوں سے پوچھا جو گیٹ پر ڈیوٹی پر تھے۔

"جی ہاں" ——— چوکیدار نے جواب دیا ——— "وہ تقریباً بارہ بجے آئے تھے اور پھر ا بجے کے کچھ بعد یہاں سے نکلے تھے"۔

"کیا یہ ڈاکٹر اس وقت یہاں سے گیا تھا جب اوور کوٹ والا آدمی گاڑی میں بیٹھ کر گیا تھا؟" ——— تفتیشی افسر نے پوچھا۔

"جی ہاں" ——— چوکیدار نے جواب دیا۔

تفتیشی افسروں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ہسپتال کے کمانڈنٹ بریگیڈیئر کے دفتر میں چلے گئے۔

"ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ڈاکٹر عبدالرشید گزشتہ رات ڈیوٹی پر تھا؟" ——— تفتیش کرنے والے میجر نے بریگیڈیئر سے پوچھا۔

بریگیڈیئر نے اس افسر کو بلایا جو اس سوال کا صحیح جواب دے سکتا تھا۔ اس افسر نے بتایا کہ گزشتہ رات ڈاکٹر عبدالرشید ڈیوٹی پر نہیں تھا اور ان دنوں اس کی نائٹ ڈیوٹی ہوتی ہی نہیں ہے"۔

"سر!" ——— انٹیلی جنس کے میجر نے بریگیڈیئر سے کہا ——— "ہمیں تفتیش کے لئے الگ کمرہ چاہئے پھر جب ضرورت ہوئی تو ہم جس جس کو بھی شامل تفتیش کریں گے اسے اپنے ہاں لے جائیں گے"۔

بریگیڈیئر کے حکم سے انہیں ایک الگ کمرہ دے دیا گیا اور ڈاکٹر عبدالرشید کو اس کمرے میں بلایا گیا۔

"ڈاکٹر صاحب!" ——— میجر نے ڈاکٹر رشید سے پوچھا ——— "کیا آپ گزشتہ رات ڈیوٹی پر تھے؟"

"نہیں" ——— ڈاکٹر رشید نے جواب دیا۔

"پھر آپ ہاسپٹل میں کیوں آئے تھے؟"

"ایک مریض کو دیکھنے!" ——— ڈاکٹر رشید نے جواب دیا ——— "کل اس کا آپریشن ہُوا تھا۔ چونکہ میں بھی اس آپریشن میں شامل تھا اس لئے میں نے ضروری سمجھا کہ رات کو مریض کو دیکھ آؤں"۔

"کیا ہر اُس مریض کو آپ رات کو دیکھنے آتے ہیں جس کا اس دن آپریشن ہُوا ہو؟"

"ہر مریض کے لئے یہ ضروری نہیں ہوتا" ——— ڈاکٹر رشید نے جواب دیا ——— "بعض مریض ایسے ہوتے ہیں جنہیں دیکھنا ضروری ہوتا ہے مثلاً" اس مریض کے پتے میں پتھریاں تھیں اس لئے یہ پتّا نکالنا ضروری تھا۔ پتّا نکال دیا جائے تو پہلے ایک دو دن کے دوران کوئی پیچیدگی پیدا ہو سکتی ہے"۔

"یہ مریض کون سے وارڈ میں ہے؟" ——— میجر نے پوچھا ——— "اس کا نام کیا ہے اور بیڈ کا نمبر کیا ہے؟"

ڈاکٹر عبدالرشید نے اس مریض کا نام' بیڈ نمبر اور وارڈ بتا دیا۔ پھر میجر نے اپنے ساتھی تفتیشی افسر کو اس وارڈ میں بھیجا۔ یہ افسر واپس آیا تو اس نے بتایا کہ رات بارہ بجے کے لگ بھگ ڈاکٹر عبدالرشید اسے دیکھنے آیا تھا اور اس مریض نے تصدیق کی کہ اس کا پتّا کل نکالا گیا تھا۔

"کیا آپ نے بارہ سے ایک بجے تک اسی مریض کے ساتھ وقت گذارا؟"

"جی نہیں" ——— ڈاکٹر رشید نے کہا ——— "میں نائٹ ڈیوٹی والے ڈاکٹر کے پاس بیٹھ گیا تھا اور باتیں کرتے کرتے ایک بج گیا"۔

ڈیوٹی ڈاکٹر چونکہ نائٹ ڈیوٹی پر تھا اس لئے ڈاکٹر عبدالرشید کے جواب کی تصدیق نہ ہو سکی۔

"کیا آپ رات کو صغیر کے کمرے میں گئے تھے؟"

"نہیں" ——— ڈاکٹر رشید نے جواب دیا ——— "اسے رات کو دیکھنا قطعاً ضروری نہیں تھا اس لئے اُدھر نہ گیا"۔

انٹیلی جنس کا ایک کیپٹن ان دو افسروں سے الگ تھلگ ہسپتال کے ملازموں سے پوچھ گچھ کرتا پھر رہا تھا۔ اس کے سامنے سوال یہ تھا کہ رات بارہ بجے سے کچھ دیر پہلے یا بعد صغیر کے کمرے میں ہسپتال کا یا باہر کا کوئی آدمی صغیر کے کمرے میں گیا تھا یا اس کمرے کے باہر ویسے ہی کھڑا کوئی آدمی دیکھا گیا تھا۔

ایک نرسنگ سپاہی نے بتایا کہ اس نے رات بارہ بجے کے لگ بھگ ڈاکٹر عبدالرشید کو صغیر کے کمرے میں جاتے اور پھر آتے دیکھا تھا۔

ایک اور ملازم نے بتایا کہ اس نے دیکھا تھا کہ ڈاکٹر عبدالرشید کمرے سے نکل گیا تو ایک دو منٹ بعد اوور کوٹ پہنے ہوئے ایک آدمی کمرے سے نکلا اور باہر کی طرف چلا گیا تھا۔

کیپٹن نے یہ اطلاع تفتیش کے انچارج میجر کو دی۔ اس وقت ڈاکٹر عبدالرشید سے ہی پوچھ گچھ ہو رہی تھی۔

"اب بتائیں ڈاکٹر صاحب!" ——— میجر نے ڈاکٹر عبدالرشید سے کہا ——— "اب اپنی

پوزیشن واضح کریں۔ آپ کہتے ہیں کہ آپ صغیر کے کمرے میں نہیں گئے تھے اور ہاسپٹل کے دو آدمی بتا رہے ہیں کہ آپ اس کمرے میں گئے تھے"۔

"دیکھئے میجر صاحب!" ——— ڈاکٹر رشید نے کہا ——— "میں ڈاکٹر ہوں اور ڈاکٹر وارڈوں میں ہی گھومتے پھرتے اور مریضوں کو دیکھتے رہتے ہیں۔ بعض اوقات یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ کس مریض کے پاس گئے تھے اور ....."

تفتیش کرنے والے دونوں میجر اکٹھے ہی ہنس پڑے اور ڈاکٹر رشید چپ ہو گیا۔

"ڈاکٹر عبدالرشید صاحب!" ——— ایک میجر نے بڑے آرام سے کہا ——— "سچ بول دیں۔ آپ یقیناً بڑے اچھے اور معزز خاندان کے فرد ہیں' تب ہی تو آپ ڈاکٹر بنے ہیں۔ اگر آپ نے سچ نہ بولا تو آپ وہ کچھ برداشت نہیں کر سکیں گے جو ہمارے تفتیشی سنٹر میں ہو گا۔ یہ مریض ہمارے حوالے کر دیں۔ ہم آپ سے وعدہ کرتے ہیں کہ آپ کے خلاف کوئی قانونی یا محکمانہ کارروائی نہیں کی جائے گی"۔

"اور ڈاکٹر صاحب!" ——— دوسرے میجر نے کہا ——— "ان تین آدمیوں کے نام اور ایڈریس بھی ہمیں بتا دیں جو اس مریض کو سوزوکی کار میں لے گئے تھے.... ڈاکٹر صاحب! اس شہادت کو جو آپ کے خلاف ملی ہے' آپ غلط ثابت نہیں کر سکیں گے۔ آپ ڈاکٹر ہیں۔ ہم آپ کا اس سے زیادہ احترام کرتے ہیں جو عام طور پر ڈاکٹروں کا کیا جاتا ہے"۔

ڈاکٹر عبدالرشید کو پہلے تو یوں لگا جیسے وہ کمرہ جس میں تفتیش ہو رہی تھی' ایک چکر میں گھوم رہا ہو۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ اس کے خلاف شہادت واقعی مضبوط ہے جسے وہ جھٹلا نہیں سکے گا۔ اسے معلوم تھا کہ اقبال جرم کی صورت میں اسے بخشا نہیں جائے گا۔ جیل جانے کے علاوہ اس کا ڈاکٹری کا لائسنس ہمیشہ کے لئے منسوخ کر دیا جائے گا۔ اس کی تو ساری زندگی تباہ ہو گئی تھی۔ اس کا دماغ بڑی تیزی سے سوچنے لگا۔ اسے ان ساتھیوں کا خیال آیا جنہوں نے اس کا ساتھ دیا تھا اور صغیر کو کامیابی سے فرار کرایا تھا۔ اسے دوسرا خیال یہ آیا کہ انہوں نے کسی عورت کو اغوا نہیں کیا بلکہ ایک مسلمان ملک کی سلامتی کی خاطر ایک آدمی کو اپنے ہی ملک کا دشمن بنتے بنتے بچا لیا تھا۔

کمرہ جو ایک چکر میں گھوم رہا تھا' اچانک رک گیا اور ڈاکٹر عبدالرشید کے دل پر جو بوجھ آ پڑا تھا وہ یک لخت اتر گیا۔ اسے نمایاں طور پر محسوس ہوا جیسے اللہ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ لیا ہے۔ اس کا ضمیر بیدار ہو گیا۔

"مت ڈرو رشید!" ——اس کی ذات سے جیسے اپنی ہی آواز اٹھی ہو—— "اسلام کی شمع اہل اسلام کے لہو سے جلتی ہے۔ قرآن کی سرزمین شہیدوں کے لہو سے لالہ زار بنی ہے۔ قربان ہو جاؤ اللہ تمہارے ساتھ ہے"۔

"ڈاکٹر عبدالرشید صاحب!" ——ایک میجر کی آواز سنائی دی—— "اتنی گہری سوچ میں نہ پڑیں۔ ہم آپ کی پوری مدد کریں گے۔ آپ ہماری مدد کریں"۔

"کیا یہ مریض آپ کا قیدی تھا؟" ——ڈاکٹر رشید نے پوچھا۔

"فضول باتیں نہ کریں ڈاکٹر صاحب!" ——میجر نے کہا—— "وہ ہمارا قیدی تھا یا نہیں، بہرحال وہ ہمارا آدمی تھا اور آپ نے اسے غائب کر کے ہمیں کوئی ذاتی نقصان نہیں پہنچایا بلکہ اس ملک کو نقصان پہنچایا ہے جس کے آپ باشندے ہیں اور آپ کے اس جرم کو غداری کہا جاتا ہے"۔

"اور آپ نے اپنے ملک کے ایک دشمن ملک کی مدد کی ہے" ——دوسرے میجر نے کہا—— "میں آپ کو آخری مرتبہ کہتا ہوں کہ سچ بول دیں اور ہم سے عزت کروائیں"۔

"میجر صاحب!" ——ڈاکٹر رشید نے کہا—— "میں آپ کو کوئی بیان نہیں دوں گا۔ مجھے اپنے سب سے بڑے آفیسر کے پاس لے چلیں۔ میں انہیں بیان دوں گا"۔

"ہمیں صرف یہ بتا دیں کہ صغیر کو آپ نے فرار کروایا ہے؟"

"جی ہاں" ——ڈاکٹر رشید نے جواب دیا—— "میں پورا بیان آپ کے کسی بریگیڈیئر یا جنرل کو دوں گا"۔

"اس کی کوئی وجہ؟"

"آپ دونوں بہت چھوٹے آفیسر ہیں" ——ڈاکٹر رشید نے جواب دیا—— "اور میری کارروائی جسے آپ جرم اور غداری کہتے ہیں، بہت بڑی ہے۔ آپ کو دیا ہوا میرا بیان کسی سٹیج پر موڑا توڑا جا سکتا ہے۔ میں پوری ذمہ داری سے کسی ذمہ دار آفیسر کو بیان دینا زیادہ مناسب سمجھتا ہوں"۔

"اگر ہم کہیں کہ بیان صرف ہمیں دیں تو آپ کیا کریں گے؟" ——ایک میجر نے پوچھا۔

"میں بیان نہیں دوں گا" ——ڈاکٹر رشید نے جواب دیا—— "اور پھر آپ کو پریشانی

کا سامنا ہو گا"۔

ایک میجر اٹھا اور کمرے سے نکل گیا۔ دوسرا میجر ڈاکٹر عبدالرشید سے تفتیش کرتا رہا۔

"ڈاکٹر عبدالرشید صاحب!" ——اس میجر نے کہا—— "ایک مسلمان نرس دن کی ڈیوٹی پر ہوتی ہے اور وہ صغیر کو اٹینڈ کیا کرتی تھی۔ اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"

"دیکھو میجر!" ——ڈاکٹر رشید نے بھڑک کر کہا—— "اگر تم نے اس لڑکی کا نام بھی لیا تو میں تمہارے دانت توڑ دوں گا۔ تمہاری پاور صرف اتنی ہے کہ تم انٹیلی جنس کے میجر ہو، ہندو ہو اور یہ تمہارا ملک ہے"۔

"کیا یہ آپ کا ملک نہیں ہے؟" ——میجر نے غصے میں آنے کی بجائے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"میں تمہارے ساتھ بحث نہیں کرنا چاہتا" ——ڈاکٹر رشید نے کہا—— "صرف یہ کہتا ہوں کہ اس نرس کو صرف اس لئے پریشان نہ کرنا کہ یہ مسلمان ہے اور یہ صغیر کو اٹینڈ کرتی تھی۔ انڈیا میں کوئی مسلمان لڑکی اتنی بڑی کارروائی میں شامل ہونے کی جرأت نہیں کر سکتی۔ یہ تو ایک معزز گھرانے کی شریف لڑکی ہے"۔

"اگر میں تفتیش نہ کر رہا ہوتا تو میں دیکھتا کہ آپ میرے دانت توڑنے کی بات کس طرح کرتے ہیں" ——میجر نے کہا—— "میں آپ کا چیلنج قبول کر کے آپ کو کہتا کہ آؤ اور میرے دانت توڑ کر دکھاؤ۔ پھر دیکھتے کہ دانت کس کے ٹوٹتے ہیں .... آپ اچھے خاصے خطرناک آدمی نظر آتے ہیں۔ آپ پر پاکستان کا ایجنٹ ہونے کا الزام لگایا جا سکتا ہے"۔

"لگا دیں" ——ڈاکٹر رشید نے طنزیہ سی ہنسی ہنستے ہوئے کہا—— "جھوٹ تو تمہاری قوم کا قابل فخر وصف ہے"۔

میجر ہنس پڑا۔

اتنے میں دوسرا میجر آ گیا۔

"ڈاکٹر صاحب کو ساتھ لے چلو" ——اس میجر نے کہا—— "جنرل صاحب نے کہا ہے کہ انہیں میرے پاس لے آؤ"۔

⊙

کچھ دیر بعد ڈاکٹر عبدالرشید انڈین انٹیلی جنس کے جنرل کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔

"کیا وجہ ہے کہ آپ صرف مجھے بیان دینا چاہتے ہیں؟" —— جنرل نے پوچھا۔

"میں صرف بیان نہیں دینا چاہتا جنرل صاحب!" —— ڈاکٹر عبدالرشید نے کہا۔ "میں اقبالی بیان دینا چاہتا ہوں۔ میں نے آپ کے دونوں میجروں کو بتا دیا تھا کہ میں نے انہیں بیان دیا تو اسے موڑا توڑا بھی جا سکتا ہے"۔

"چلئے میں آپ کا بیان سن لیتا ہوں" —— جنرل نے کہا —— "اس کے بعد آپ کا بیان ریکارڈ کیا جائے گا"۔

"جنرل صاحب!" —— ڈاکٹر عبدالرشید نے اپنا بیان ان الفاظ میں شروع کیا۔

"میں ڈاکٹر ہوں۔ آپ جانتے ہیں ڈاکٹر کا کام ہے مریض اور زخمی کا علاج معالجہ۔ مریض یا زخمی دشمن ملک کا ہو تو بھی ڈاکٹر کا فرض ہے کہ وہ اس کا علاج اپنا دوست اور ایک انسان سمجھ کر کرے۔ یہ زخمی آیا تو اس کے علاج کی ذمہ داری مجھے سونپی گئی۔ اسے گلوکوز اور تازہ خون دیا گیا اور اس کے ساتھ ہی مجھے انجکشن دیئے گئے کہ یہ ایک انجکشن روزانہ گلوکوز کی نالی میں زخمی کو دینا ہے۔ میں نے انجکشن دیکھے تو میں پریشان ہو گیا میں بھی تو آخر ڈاکٹر ہوں۔ اس زخمی کو ایسے انجکشنوں کی ضرورت نہیں تھی۔ اسے ایسے انجکشنوں کی ضرورت تھی کہ اس کے زخم میں پس نہ پڑے اور زخم خراب نہ ہونے پائے یا خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے اسے طاقت کے انجکشنوں کی ضرورت تھی۔ لیکن جو انجکشن اسے دیئے جانے لگے وہ تو کچھ اور ہی اثر رکھتے تھے۔ میں نے اس انچارج میجر ڈاکٹر کے ساتھ بات کی تو اس نے بتایا کہ یہ زخمی انٹیلی جنس کا ہے اور اسے انجکشن ضرور دینے ہیں....

"میں نے حکم کی تعمیل شروع کر دی لیکن میرا ضمیر میرا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ میں نے ایک روز اس زخمی سے پوچھا کہ اسے نیند نہیں آتی یا وہ ذہنی طور پر کسی قسم کی بے چینی محسوس کرتا ہے جو اس کی برداشت سے باہر ہے؟.... اس نے بتایا کہ وہ کچھ بھی محسوس نہیں کرتا سوائے اس کے کہ وہ زخم میں درد محسوس کرتا ہے۔ میں نے اسے کہا کہ وہ یہ انجکشن نہ لے تو بہتر ہے۔ اس نے کہا کہ وہ ڈاکٹروں کو کیسے مشورہ دے سکتا ہے کہ اسے فلاں دوائی نہ دی جائے اور فلاں دوائی دی جائے....

"چونکہ میں ہی اسے اٹینڈ کر رہا تھا اس لئے کچھ بے تکلفی پیدا ہو گئی۔ اس نے مجھے

بتایا کہ وہ پاکستانی ہے۔ مجھے اس نے شاید اس لئے اعتماد میں لے لیا تھا کہ میں مسلمان ہوں۔ قدرتی طور پر میں نے اس سے پوچھنا شروع کر دیا کہ وہ کہاں اور کیسے زخمی ہوا ہے۔ تب اس نے بتایا کہ وہ انڈین انٹیلی جنس کا ایجنٹ ہے اور پاکستان میں جاسوسی کرتا ہے.... جنرل صاحب! میں مسلمان ہوں۔ یہ ایسا رشتہ ہے جو مجھے پاکستان سے لاتعلق نہیں ہونے دیتا"۔

"اس کا مطلب یہ ہوا ڈاکٹر عبدالرشید!" —— جنرل نے ہونٹوں پر طنزیہ سی مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا —— "کہ آپ کی وفاداری پاکستان کے ساتھ ہے۔ کیا آپ اسے جرم نہیں سمجھتے؟"

"اگر بات بحث مباحثے کی ہے تو میں آپ کو تسلی بخش جواب دوں گا جنرل صاحب!" —— ڈاکٹر عبدالرشید نے کہا —— "پاکستان کے ساتھ میری وفاداری اس حد تک ہے کہ یہ ایک مسلمان ملک ہے اور یہ میرے باپ اور دادا کی جدوجہد کا حاصل ہے۔ میں ذاتی طور پر پاکستان کو اتنا ہی مقدس سمجھتا ہوں جتنا سرزمینِ عرب کو.... اور انڈیا کے ساتھ میری وفاداری اس لئے ہے کہ یہ میرا ملک ہے جہاں میں پیدا ہوا تھا اور جو میرے خاندان کو پال پوس رہا ہے"۔

"لیکن آپ نے اپنے اس ملک کے ساتھ غداری کی ہے" —— جنرل نے کہا —— "میں نے ابھی آپ کا پورا بیان نہیں سنا اس لئے میری جرح بے موقع ہے۔ میں نے یہ بات یہ فرض کر کے کہی ہے کہ آپ اقبال جرم کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ضرور کہوں گا کہ آپ کو یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ پاکستان ہمارے ملک کا دشمن ہے"۔

"جنرل صاحب!" —— ڈاکٹر رشید نے کہا —— "جہاں تک بھولنے اور نہ بھولنے کا تعلق ہے، مجھے اور بھی بہت کچھ یاد ہے جو میں نہ صرف یہ کہ مرتے دم تک نہیں بھول سکوں گا بلکہ یہ یادیں اپنے بچوں کے ذہنوں میں منتقل کر کے مروں گا۔ میں تو اُس وقت پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔ آپ اُس وقت نوجوانی کی عمر میں ہوں گے۔ آپ نے اپنی آنکھوں دیکھا ہو گا کہ ہندوؤں اور سکھوں نے کس طرح مسلمانوں کو قتل کیا تھا اور ان کی بیٹیوں کو اغوا اور بے آبرو کیا تھا۔ ان کے گھر لوٹے تھے۔ ان کے گھروں کو نذرِ آتش بھی کیا تھا اور جو مسلمان کسی طرح بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوئے تھے وہ یہاں سے پاکستان کی سرحد تک پا پیادہ، بھوکے پیاسے اور دہشت زدہ کس طرح پہنچے ہوں گے۔ مجھے یہ دردناک

داستان میرے والد صاحب نے سنائی تھی اور میں یہ اپنے بچوں کو سناؤں گا۔ آپ اُس وقت یقیناً" نوجوان تھے۔ آپ نے بھی دو چار مسلمانوں کو قتل کیا ہو گا"۔

"سنو ڈاکٹر!" ——— جنرل نے جرنیلوں کی طرح کہا ——— "یہ باتیں کہہ کے تم اپ جرم کی تصدیق کر رہے ہو"۔

"یس سر!" ——— ڈاکٹر عبدالرشید نے جرأت مندی سے کہا ——— "اگر اپنی قوم ک شہیدوں کو اور ان مظلوموں کو یاد رکھنا اور ان کی باتیں کرنا جرم ہے تو میں اس جرم مجرم ہوں۔ مجھے سزا دیں ..... اور جنرل صاحب! میں کیسے آنکھیں بند کر سکتا ہوں ک مسلمانوں کا قتل عام اب بھی جاری ہے۔ ان کے گھر اب بھی لٹ رہے ہیں ..... اور م کیسے برداشت کر سکتا ہوں کہ مسلمان لڑکیوں کے باپوں اور بھائیوں کو مجبور کر کے ان شادیاں ہندوؤں کے ساتھ کرائی جا رہی ہیں۔ انہیں ترقی اور روپے پیسے کے لالچ د جاتے ہیں۔ اگر کوئی ہندو لڑکی کسی مسلمان کے ساتھ اپنے دل سے مجبور ہو کر شادی لے تو ہندو اس پوری مسلمان آبادی پر قاتلانہ حملے شروع کر دیتے ہیں بلکہ باقاعدہ حملہ دیتے ہیں"۔

"پلیز ڈاکٹر!" ——— جنرل نے اکتائے ہوئے سے لہجے میں کہا ——— "اس وقت تم ا زخمی کے فرار کی بات کرو۔ میں یہ سمجھ گیا ہوں کہ تم پسِ پردہ پاکستانی ہو اور تم ج انڈین مسلم پاکستان کے جاسوس بنتے ہیں۔ میں نے دیکھ لیا ہے کہ تمہارے اندر انڈیا خلاف اور ہندوؤں کے خلاف زہر بھرا ہوا ہے۔ تم اس ملک کے لئے خطرناک ثابت سکتے ہو اور ہو چکے ہو ..... پہلے اپنا بیان پورا کر لو"۔

"میں بالکل صحیح جواب دے رہا ہوں جنرل صاحب!" ——— ڈاکٹر رشید نے کہا ——— "میں کہہ رہا تھا کہ اس نے بے تکلفی سے مجھے بتا دیا کہ وہ پاکستانی ہے اور انڈیا کے جاسوسی اور تخریب کاری کرتا ہے۔ میں نے اس کے ساتھ اس سلسلے میں باتیں کیں اس نے کہا کہ وہ یہاں سے پاکستان جانا چاہتا ہے لیکن اس کی مدد اور رہنمائی کرنے و کوئی نہیں"۔

"اسے ایک خاص قسم کے انجکشن دیئے جا رہے تھے" ——— جنرل نے پوچھا ——— "کیا یہ انجکشن دینا تمہاری ذمہ داری تھی؟"

"یس سر!"

"کیا تم اسے باقاعدگی سے انجکشن دیتے رہے تھے؟"

"پہلے ایک دو دن دیئے تھے" ——— ڈاکٹر رشید نے جواب دیا ——— "پھر ایک روز میں نے اس سے پوچھا کہ اسے نیند کی شکایت ہے یا وہ بے چینی محسوس کر رہا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ اسے ایسی کوئی پرابلم نہیں۔ میں نے اسے بتایا کہ پھر وہ یہ انجکشن نہ لے۔ اس نے وجہ پوچھی تو میں نے اسے بتایا کہ اس انجکشن کے اثرات کیا ہیں۔ پھر جب اس نے بتایا کہ وہ پاکستانی ہے اور انڈین انٹیلی جنس کا ایجنٹ ہے تو میں سمجھ گیا کہ ان انجکشنوں کے ذریعے اس کی برین واشنگ کی جا رہی ہے اور اسے یہاں اور زیادہ ٹریننگ دے کر پاکستان بھیجا جائے گا۔ میں جس کام کی تنخواہ لیتا ہوں، مجھے وہ کام کرنا چاہئے تھا۔ اگر میں نہیں کرتا تو یہ بددیانتی ہے لیکن میری دو حیثیتیں اور بھی ہیں اور میرے اندر ضمیر بھی ہے۔ میری ایک حیثیت تو یہ ہے کہ میں ڈاکٹر ہوں اور دوسری حیثیت یہ کہ میں مسلمان ہوں۔ ڈاکٹر کی حیثیت سے میں دیکھ رہا ہوں کہ ایک آدمی کی شخصیت تبدیل کی جا رہی ہے، اس کا کردار اور اس کا ایمان مسخ کیا جا رہا ہے اور اسے آزادانہ طور پر کچھ سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت سے محروم کیا جا رہا ہے۔ یہ آدمی مسلمان ہے۔ اگر ہندو، سکھ، عیسائی یا کسی اور مذہب کا ہوتا تو بھی میں اسے ان انجکشنوں سے بچا لیتا۔ یہ میرے ضمیر کی آواز ہے۔ میں نے اس مریض کو یہ انجکشن دینے بند کر دیئے۔ اس کے نتیجے میں اس کا ذہن بیدار ہو گیا پھر اس نے خواہش ظاہر کی کہ وہ اپنے وطن واپس جانا چاہتا ہے"۔

"تم نے اسے یہاں سے بھاگ جانے پر اکسایا ہو گا" ——— جنرل نے کہا۔

"میرے اکسانے کی ضرورت ہی نہیں تھی" ——— ڈاکٹر عبدالرشید نے کہا ——— "وہ خود میرے پیچھے پڑ گیا تھا کہ میں اسے یہاں سے فرار کراؤں۔ میں نے اسے فرار کرا دیا"۔

"کیسے؟"

"میں نے اسے اوور کوٹ اور کپڑے لا کر دیئے" ——— ڈاکٹر رشید نے جواب دیا ——— "رات کو اسے ہسپتال سے نکال دیا"۔

"ہسپتال سے اسے کہاں لے گئے تھے؟" ——— جنرل نے پوچھا ——— "اور اسے کون لے گیا تھا؟ ان کے نام پتے وغیرہ بتاؤ اور یہ بھی بتاؤ کہ وہ سوزوکی کار کس کی تھی جس میں اسے لے جایا گیا تھا؟ اور یہ بھی بتاؤ کہ صغیر اس وقت کہاں ہے؟"

"بارڈر کے قریب پہنچ چکا ہو گا" ——— ڈاکٹر رشید نے جواب دیا۔

"میں پوچھ رہا ہوں کیسے؟" ـــ جنرل نے جرنیلوں کی طرح پوچھا ـــ "کس نے پہنچایا؟ کیسے پہنچایا؟"

"جنرل صاحب!" ـــ ڈاکٹر عبدالرشید نے ہونٹوں پر عجیب جذباتی سی مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا ـــ "میں احمق نہیں ہوں نہ بزدل ہوں کہ آپ سے یا سزا سے یا سزائے موت کے ڈر سے بیان دے رہا ہوں۔ میں نے مسلمان کی حیثیت سے جو کیا ہے وہ اللہ کی راہ میں ٹھیک کیا ہے۔ مجھے اللہ کی خوشنودی چاہئے' آپ کی یا آپ کی حکومت کی نہیں۔ میں اپنے ایمان کی رُو سے بیان دے رہا ہوں۔ میں ایک جہاد کر رہا ہوں جو آپ کے لئے مذاق ہو گا لیکن یہ میرا ایک مقدس فرض ہے۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ میرے دادا جان تحریکِ پاکستان کے سرگرم رکن تھے اور وہ گرفتار ہوئے اور چند مہینے انبالہ جیل میں رہے تھے۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ دادا جان کو دو تین دن حوالات میں رکھ کر ان پر اتنا تشدد کیا گیا تھا کہ وہ بے ہوش ہو گئے تھے۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ جب وہ ہوش میں آئے تو ان کے منہ سے پہلی بات ایک گرج کی طرح یہ نکلی ـــ 'لے کے رہیں گے پاکستان .... زندہ باد پاکستان' ـــ میں اس دادا کے نقشِ قدم پر چل رہا ہوں"۔

"کیا پاکستان تمہیں ہمارے قانون سے چھڑا لے گا؟"

"نہیں" ـــ ڈاکٹر رشید نے بڑے مضبوط لہجے میں جواب دیا ـــ "میں نے پہلے کہا ہے کہ میں احمق نہیں ہوں۔ میں اس قسم کی انہونی بات سوچ ہی نہیں سکتا کہ پاکستان مجھے اس جرم کی سزا سے بچا لے گا۔ میں نے تو یہ سوچ کر یہ قدم اٹھایا ہے کہ میری اس کارروائی سے پاکستان کی سلامتی کو تقویت ملے گی"۔

"میں تمہیں ایک بات بتاؤں ڈاکٹر!" ـــ جنرل نے بڑے پیارے مگر طنزیہ سے لہجے میں کہا ـــ "پاکستان کچھ دنوں کا مہمان ہے۔ اگر تم پاکستان کے بل بوتے پر اس اپنے ملک انڈیا کی جڑیں کاٹ رہے ہو تو یوں سمجھو کہ تم دلدل میں کھڑے ایک طاقتور دشمن کو للکار رہے ہو۔ دشمن تمہارے قریب کھڑا ہنس رہا ہے اور دلدل تمہیں بڑی تیزی سے نگلتی چلی جا رہی ہے.... پاکستان اس وقت ایک دلدل کی مانند ہے جس میں اتنی ہمت نہیں کہ ایک دانہ بھی اگا سکے۔ یہ انسانوں اور حیوانوں کو ایک ہی طرح کھا جانے والی دلدل ہے۔ ایک دن یہ دلدل سوکھ جائے گی"۔

ڈاکٹر عبدالرشید طنزیہ سی ہنسی ہنس پڑا اور بولا ـــ "آساں نہیں مٹانا نام و نشاں

ہمارا!"

"تم کہتے ہو میں احمق نہیں ہوں" ـــ جنرل نے کہا ـــ "لیکن تم بہت ہی زیادہ احمق ہو۔ تم کس جذباتی اور خیالی دنیا میں رہ رہے ہو۔ ہمارا ایک ایجنٹ یہاں سے بھگا کر تم نے انڈیا کا کچھ بھی نہیں بگاڑا۔ پاکستان سے ہمیں اس ایک کی بجائے دس ایجنٹ مل جائیں گے۔ اس ایک ایجنٹ کو بھگا کر تم نے پاکستان کو کچھ نہیں دیا۔ البتہ اپنے پورے خاندان کا بیڑا غرق کر لیا ہے"۔

ڈاکٹر عبدالرشید پر کچھ ایسی کیفیت طاری ہو چکی تھی کہ اس کی آنکھوں میں چمک اور اس کے ہونٹوں پر جاندار مسکراہٹ کِھلی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر وہی تاثر آ گیا تھا جو راہِ حق کے شہیدوں کے چہروں پر دیکھا جاتا ہے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اس بوڑھے جرنیل کو طفلِ مکتب سمجھ رہا ہو یا جسے ہندوستان کی زبان میں مورکھ بالک کہا جاتا ہے۔

"میں تمہیں آخری بار وارننگ دیتا ہوں" ـــ جنرل نے کہا ـــ "ان تمام آدمیوں کے نام اور ایڈریس بتا دو جو تمہارے ساتھ تھے اور اس سوزوکی کار کا نمبر اور اس کے مالک کا نام اور ایڈریس بھی بتا دو۔ یہ بھی بتا دو کہ صغیر اس وقت کہاں ہے۔ میں مان نہیں سکتا کہ رات بارہ بجے ایک آدمی یہاں سے فرار ہوا ہو اور اس وقت تک بارڈر تک پہنچ چکا ہو"۔

"نہیں بتاؤں گا جنرل صاحب!" ـــ ڈاکٹر عبدالرشید نے بڑے مستحکم لہجے میں جواب دیا ـــ "میں نے اعتراف کر لیا ہے کہ اس جرم کا مجرم میں ہوں۔ میں نے اس پاکستانی کو انجکشن دینے بند کر دیئے تھے اور اس کی جو برین واشنگ آپ لوگوں نے کی تھی وہ صاف کر دی تھی اور اس میں یہ جذبہ بیدار کر دیا تھا کہ وہ مسلمان ہے اور پاکستانی ہے اور اس کے ذہن پر قبضہ کر کے اسے اللہ کی سرزمین کی تباہی کا ذریعہ بنایا جا رہا ہے... میں نے اسے فرار کرایا اور پاکستان کی طرف روانہ کر دیا تھا۔ اب آپ بارڈر سیکیورٹی کو الرٹ کر دیں کہ اس شخص کو روک لے۔ یہ آپ کا کام ہے۔ میں نے اپنا کام کر دیا ہے"۔

"اور وہ جو مسلمان نرس اس کمرے میں ڈیوٹی پر تھی...."

"جنرل صاحب!" ـــ ڈاکٹر عبدالرشید نے جنرل کی بات پوری نہ ہونے دی اور میز پر ہاتھ مار کر بولا ـــ "وہ معصوم لڑکی اتنی جرأت نہیں کر سکتی کہ اتنے بڑے جرم میں

میرا ساتھ دیتی۔ پھر یہ بھی سوچیں کہ ہم مسلمان ہیں۔ اگر یہ لڑکی میرا ساتھ دینا چاہتی تو بھی میں اسے روک دیتا۔ ہم مسلمان اتنے بے غیرت نہیں کہ اپنی نوجوان اور کنواری لڑکیوں کو جاسوسی وغیرہ میں استعمال کریں۔ یہ کام آپ کی قوم کرتی ہے۔ آپ کی بیٹیوں کو پاکستان میں جاسوسی اور تخریب کاری کے لئے بھیجا جاتا ہے۔ یہ ذلت اور بے غیرتی صرف آپ کی قوم یا یہودیوں کی قوم قبول کرلیا کرتی ہے کہ اپنی بیٹیوں اور بہنوں کو دوسرے ملکوں میں بھیج دیا جاتا ہے کہ وہ وہاں جاسوسی کریں اور اس کے عوض اپنی عصمت معاوضے کے طور پر دیتی پھریں .... آپ کا اشارہ جس نرس کی طرف ہے وہ ایک معصوم لڑکی ہے۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں کیا کررہا ہوں"۔

"تم اچھے خاصے بکواسی آدمی معلوم ہوتے ہو" —— جنرل نے کہا —— "میری ڈیوٹی ایسی ہے کہ میں تمہاری بکواس تحمل سے سن رہا ہوں۔ اگر باہر کہیں تم مجھ پر بے غیرتی اور ذلالت کا الزام لگاؤ تو میں تمہارا گلا گھونٹ دوں"۔

"جنرل صاحب!" —— ڈاکٹر رشید نے کہا —— "یہ مسئلہ میرا اور آپ کا ذاتی نہیں۔ ہم قومی سطح پر بات کررہے ہیں۔ آپ مسلمان قوم کی بہو بیٹیوں کو بُرا بھلا کہہ لیں میں نہیں بولوں گا۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کی یعنی ہندو قوم کی نگاہ میں عورت کی عزت ہوتی ہی نہیں۔ آپ کو پنڈت چانکیہ نے یہ زریں اصول دیا تھا کہ اپنے دشمن کو نقصان پہنچانے کے لئے اپنی بیوی بھی اس کے حوالے کرنی پڑے تو کردو"۔

"شٹ اپ یو فول!" —— جنرل نے ڈاکٹر رشید کو ڈانٹتے ہوئے کہا —— "میں نے جو سوال پوچھے ہیں ان کے جواب دو"۔

"میں جواب دے چکا ہوں جنرل صاحب!" —— ڈاکٹر رشید نے کہا —— "میں اپنے سوا کسی اور کا نام نہیں بتاؤں گا"۔

"تم سب کچھ بتادو گے" —— جنرل نے کہا —— "میں تمہیں اُس جہنم سے بچانا چاہتا ہوں جس میں تمہاری ہڈی پسلی ایک ہوجائے گی۔ تم سب کچھ اگل دو گے"۔

"میں جانتا ہوں جنرل صاحب!" —— ڈاکٹر عبدالرشید نے کہا —— "میں اس کے لئے تیار ہوں۔ میں اُس بلال حبشیؓ کی یاد تازہ کردوں گا جنہیں گرم ریت پر لٹا کر کوڑے مارے جاتے تھے کہ وہ اللہ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نہ لیں لیکن بلالؓ ہوش میں آتے تھے تو ان کے منہ سے پہلی بات یہ نکلتی تھی کہ محمدؐ اللہ کے رسول ہیں

اور اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں"۔

"تم پر مذہب کا جنون طاری ہے" —— جنرل نے کہا اور پھر اپنے آپ سے بات کرنے کے انداز میں بولا —— "اُتر جائے گا۔ یہ جنون بھی اُتر جائے گا"۔

جنرل نے گھنٹی بجائی۔ اردلی اندر آیا اور اس نے سیلوٹ کیا۔ جنرل نے اسے ایک لیفٹیننٹ کرنل کا نام لے کر کہا کہ اسے اندر بھیجے .... ایک ہندو لیفٹیننٹ کرنل اندر آیا۔ اس نے سیلوٹ کیا۔

"اسے لے جاؤ" —— جنرل نے کرنل سے کہا —— "اس نے آدھا بیان دیا ہے مگر یہ اپنے ساتھیوں کے نام نہیں بتا رہا اور یہ بھی نہیں بتا رہا کہ ہمارا مفرور اس وقت کہاں ہے .... اور بارڈر سیکورٹی کو الرٹ کردو اور بتادو کہ اس حلیے کا آدمی آرہا ہے اور اسے روکا جائے"۔

○

جس وقت ملٹری ہاسپٹل سے انٹیلی جنس کے میجر ڈاکٹر عبدالرشید کو اپنے ساتھ تفتیشی سنٹر میں لے گئے تھے، اُس وقت ہسپتال کا ایک مسلمان ملازم کسی بہانے ہسپتال سے نکل گیا اور ڈاکٹر رشید کے گھر پہنچا۔ اُس وقت صغیر اس مکان کے ایک کمرے میں موجود تھا اور اس کے پاس تھوڑی ہی دیر پہلے وہ دو آدمی آئے تھے جو اسے فرار کی رات ملٹری ہسپتال سے سوزوکی کار میں یہاں لائے تھے۔ ہسپتال کا ملازم اس کمرے میں گیا جس میں صغیر اور یہ دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔

"انہیں یہاں سے غائب کرو" —— ملازم نے ان دو آدمیوں سے کہا اور صغیر کی طرف اشارہ کیا —— "سراغ مل گیا ہے اور ڈاکٹر رشید صاحب کو انٹیلی جنس والے لے گئے ہیں"۔

"کیا ڈاکٹر رشید نے اپنا جرم تسلیم کرلیا ہے؟" —— ایک آدمی نے پوچھا۔

"تمہیں جو کچھ معلوم ہے وہ بتادو" —— دوسرے آدمی نے کہا۔

"شہادت ایسی ملی ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو اقبال جرم کرنا ہی پڑے گا" —— ہسپتال کے ملازم نے کہا —— "میں پوری خبر لیتا رہا ہوں۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ تفتیش کرنے والوں کو معلوم ہوگیا ہے کہ رات کو ڈاکٹر رشید ہسپتال میں بغیر کسی کام کے آئے تھے اور اس مریض کے کمرے سے ڈاکٹر کے ساتھ ایک آدمی اوورکوٹ پہنے ہوئے نکلا تھا، پھر یہ

شہادت بھی مل گئی ہے کہ اوور کوٹ پہنے ہوئے ایک آدمی رات ساڑھے بارہ بجے ایک بجے کے درمیان ہاسپٹل کے گیٹ سے نکلا تھا اور ایک بے نمبر سوزوکی کار میں بیٹھ کر چلا گیا تھا"۔

صغیر کا اور اس کے پاس بیٹھے ہوئے دونوں آدمیوں کے چہروں کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ یہ خبر بُری تھی۔

"رشید ایسا کچا آدمی تو نہیں" —— ایک آدمی نے کہا —— "لیکن کچھ کہا بھی نہیں جا سکتا۔ اسے ٹارچر کریں گے تو وہ سب کچھ اگل دے گا"۔

ہاسپٹل کا جو ملازم آیا تھا' اس نے مشورہ دیا کہ صغیر کو فوراً یہاں سے غائب کر دیا جائے۔

"غائب تو ہمیں بھی ہو جانا چاہئے" —— ڈاکٹر رشید کے ان ساتھیوں میں سے ایک نے کہا —— "ہماری گرفتاری صاف نظر آنے لگی ہے"۔

"نہیں" —— صغیر بول پڑا —— "ہو سکتا ہے ڈاکٹر رشید صاحب آپ کی نشاندہی نہ کریں۔ اگر انہوں نے اقبال جرم کر لیا ہے اور آپ کی نشاندہی نہیں کی اور آپ اگر غائب ہو گئے تو آپ پر شک کیا جائے گا۔ آپ یہیں رہیں۔ بھاگ کر جائیں گے بھی کہاں۔ اگر بھاگ جائیں گے تو آپ کے گھر کے بچے بچے کو پریشان کیا جائے گا۔ مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے آپ سب لوگ مصیبت میں گرفتار ہوئے"۔

"ایسی بات نہ کہیں صغیر صاحب!" —— ایک آدمی نے کہا —— "ایسے کام خطرہ مول لے کر ہی کئے جاتے ہیں۔ ہم نے ڈاکہ تو نہیں ڈالا نہ کسی عورت کو اغوا کیا ہے۔ اب جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ آنے دو جس مصیبت کو آنا ہے۔ آپ نے ٹھیک مشورہ دیا ہے کہ ہمیں غائب نہیں ہونا چاہئے ورنہ ہمارے گھر والوں پر مصیبت کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں گے اور گھر کی مستورات کو بھی ذلیل و خوار کیا جائے گا۔ یہ ہم جانتے ہیں کہ اب کسی بھی لمحے اس گھر کی تلاشی ہو گی"۔

باتوں کا وقت نہیں تھا۔ سورج غروب ہونے کو تھا۔ ان لوگوں نے ہر قسم کی صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لئے انتظام کر رکھا تھا۔ انہوں نے ڈاکٹر عبدالرشید کے والد صاحب کو کمرے میں بلایا اور انہیں بتایا کہ ان کا یہ کارنامہ کس مرحلے میں داخل ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر رشید کے بوڑھے باپ کے چہرے پر مردنی سی چھا گئی۔ انڈیا میں مسلمانوں

کے ساتھ جو سلوک ہو رہا تھا' اس سے وہ بے خبر نہیں تھا۔ وہاں تو بہانہ تراش کر مسلمانوں کو پریشان اور ذلیل کیا جاتا تھا۔ اب تو ان کو ایک معقول بہانہ مل گیا تھا۔

ڈاکٹر عبدالرشید کے متعلق باپ زیادہ پریشان ہُوا۔ ایک اس لئے کہ وہ پکڑا گیا تھا اور دوسرے اس لئے کہ انہوں نے اس بیٹے پر بہت زیادہ خرچ کر کر کے اسے ڈاکٹر بنایا تھا' وہ اس کا بڑا ہی قیمتی بیٹا تھا' اس کی ابھی شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔ ایک دو مہینوں بعد خالدہ کے ساتھ اس کی شادی ہونے والی تھی۔ یہ سب کچھ سوچ کر باپ کا چہرہ مرجھا گیا لیکن کچھ ہی دم بعد اس کی جھکی ہوئی کمر سیدھی ہو گئی اور سر اونچا ہو گیا۔

"اللہ مالک ہے" —— باپ نے کہا —— "ہم جو کچھ کر رہے ہیں وہ اللہ کی خوشنودی اور پاکستان کی سلامتی کے لئے کر رہے ہیں .... اب بتاؤ کیا کرنا ہے؟"

"صغیر صاحب کو دوسری جگہ شفٹ کرنا ہے" —— باپ کو جواب ملا —— "ہم نے دوسری جگہ تیار کر رکھی ہے .... انہیں یہاں سے فوراً نکالنا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ انٹیلی جنس والے یا پولیس والے فوراً یہاں آ جائیں اور چھاپہ ماریں"۔

"فوراً نہیں" —— ڈاکٹر رشید کے باپ نے کہا —— "اگر صغیر صاحب کو اس وقت گھر سے نکالا گیا تو گلی میں کوئی دیکھ لے گا۔ یہ کام رات کو کرنے والا ہے"۔

"اتنا وقت نہیں" —— ایک آدمی نے کہا —— "ہم نے پہلے اس صورتِ حال سے نمٹنے کی سکیم بنائی تھی' ہم اس پر عمل کریں گے"۔

صغیر کو اٹھایا گیا اور اوور کوٹ پہنانے کی بجائے ایک بڑا اچھا کمبل اسے دیا گیا جو اس نے بڑے اچھے طریقے سے اوڑھ لیا۔ اس کے سر پر جناح کیپ رکھی گئی اور اوور کوٹ لپیٹ کر ساتھ رکھ لیا گیا۔ اسے اندر صحن میں لے گئے۔ وہاں سے سیڑھیوں کے ذریعے چھت پر گئے۔ ساتھ والا مکان بھی ایک مسلمان کا تھا۔ دونوں مکانوں کی چھتوں کے درمیان فصیل تھی۔ ڈاکٹر رشید کے باپ کے ساتھ جو باتیں ہوئی تھیں وہ ذرا لمبی تھیں۔ اس دوران سورج غروب ہو چکا تھا۔ اندھیرا زیادہ گہرا تو نہیں ہُوا تھا لیکن اتنا گہرا ہو گیا تھا کہ کچھ دور سے اچھی طرح دیکھنا آسان نہیں رہا تھا۔

صغیر کو پہلے بتا دیا گیا تھا کہ شفٹ کس طرح ہونا ہے۔ چھت پر جا کر صغیر نے فصیل پھلانگی اور ساتھ والے مکان کی چھت پر چلا گیا۔ وہ اکیلا تھا۔ ایک آدمی ساتھ والے گھر کے مالک کو بتانے چلا گیا تھا کہ صغیر آ رہا ہے۔ صغیر چھت پر چلا تو اسے سیڑھیاں نظر آ

گئیں۔ وہ ان سیڑھیوں سے اتر گیا۔ سیڑھیوں میں اس گھر کا ایک آدمی اور ایک آدمی جسے صغیر جانتا تھا اس کے استقبال کے لئے کھڑے تھے۔

اس گھر میں صغیر کو بٹھایا نہیں گیا۔ چند منٹ وہ صحن میں ہی کھڑے رہے اور صغیر کو بتایا گیا کہ اب اسے کہاں لے جایا جائے گا۔ اس گھر کا آدمی باہر نکلا اور اس کے پیچھے صغیر نکلا۔ دونوں اکٹھے ایک طرف چل پڑے۔ اب اگر کسی نے صغیر کو اس گھر سے نکلتے دیکھا بھی تھا تو یہ کوئی خطرے والی بات نہیں تھی۔ اگر صغیر ڈاکٹر کے گھر سے نکلتے دیکھ لیا جاتا تو دیکھنے والا یہ گواہی دے سکتا تھا کہ فلاں وقت اس گھر سے ایک اجنبی نکلا تھا۔

صغیر اس آدمی کے ساتھ آہستہ آہستہ چلتا گیا۔ وہ گلی کی نکڑ سے مڑے اور چند گھر آگے جا کر ایک معمولی سے مکان میں داخل ہو گئے۔

"اب آپ کے کچھ دن یہاں گزریں گے" —— اس آدمی نے صغیر سے کہا —— "یہ ہمارے ایک غریب سے دوست کا گھر ہے۔ اس گھر پر کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا کہ اس گھر کے آدمی اتنا بڑا جرم کرنے کی جرأت رکھتے ہیں"۔

اس گھر میں دو بھائی اکٹھے رہتے تھے۔ ایک بھائی شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ تھا اور دوسرا کالج میں فورتھ ایئر میں پڑھ رہا تھا۔ بڑا بھائی ایک سرکاری دفتر میں اکاؤنٹنٹ تھا۔ چھوٹا بھائی پڑھتا بھی تھا اور ٹیوشن بھی پڑھاتا اور اپنی تعلیم کے اخراجات پورے کرتا تھا۔ ان کے والدین فوت ہو چکے تھے۔ یہ گھرانہ تنگ دست تو نہیں تھا لیکن دو وقت کی روٹی اور ضروریاتِ زندگی ذرا مشکل سے ہی پوری ہوتی تھیں۔ انہیں لوئر مڈل کلاس بھی کہا جا سکتا تھا اور غریب بھی لیکن دین و ایمان اور جذبے کے لحاظ سے یہ دونوں بھائی مالا مال تھے۔ ان کے اس جذبے کو دیکھتے ہوئے ہی انہیں اعتماد میں لیا گیا تھا اور انہیں پہلے بتا دیا گیا تھا کہ ضرورت پڑی تو ایک پاکستانی کو ان کے ہاں ایک آدھ دن کے لئے چھپایا جائے گا۔ انہیں یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ یہ آدمی کس نوعیت کا ہے اور اصل مسئلہ کیا ہے۔ دونوں بھائیوں نے اپنے تعاون کا اور ہر طرح کی قربانی دینے کا وعدہ خندہ پیشانی سے کیا تھا۔

صغیر کو جب اس گھر میں داخل کیا گیا تھا اُس وقت اندھیرا اتنا گہرا ہو چکا تھا کہ کچھ دور سے نظر نہیں آتا تھا اور اُس وقت گلی میں کوئی دیکھنے والا بھی نہیں تھا۔

○

جس وقت صغیر کو اس گھر میں چھوڑ کر ڈاکٹر رشید کا ساتھی باہر آ رہا تھا' اُس وقت انڈین انٹیلی جنس کے دو افسر اور دو تین چھوٹے عہدوں کے آدمی ڈاکٹر رشید کے دروازے پر آن رکے۔ ڈاکٹر عبدالرشید ان کے ساتھ تھا اور اسے ہتھکڑی لگی ہوئی تھی جسے انڈین آرمی کے ایک باوردی نائیک نے پکڑ رکھا تھا۔ باقی تمام افسر اور دیگر آدمی پرائیویٹ کپڑوں میں تھے۔ دروازے پر دستک دی گئی۔ رشید کے باپ نے دروازہ کھولا۔

دروازہ کھلتے ہی یہ تمام آدمی اندر چلے گئے۔ دو آدمی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ باقی کمروں کی تلاشی لینے لگے۔ گھر کی عورتوں کو جن میں رشید کی ماں' دو بہنیں اور ایک بھابی تھیں' بچوں سمیت الگ کھڑا کر لیا گیا۔

کمروں کی تلاشی اس طرح لی گئی کہ چارپائیوں کے نیچے بھی دیکھا۔ الماریاں' ٹرنک' اٹیچی کیس اور گدّوں رضائیوں والی پیٹی بھی کھول کر دیکھی گئی۔ باورچی خانے میں بھی گئے۔ کوڑے کباڑ والے سٹور میں سے ہر ایک چیز اٹھا اٹھا کر صحن میں پھینکی گئی۔ بیت الخلاء اور غسل خانہ بھی دیکھا گیا۔ یوں سمجھیں جیسے اس گھر کی نیچے کی مٹی اوپر کر دی گئی اور اس کے بعد گھر کے افراد سے بڑے توہین آمیز طریقے سے پوچھ گچھ شروع ہو گئی۔ مستورات بچوں کے ساتھ ایک طرف کھڑی تھیں۔ ایک میجر ان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

"یہاں ایک آدمی آیا تھا" —— میجر نے مستورات سے پوچھا —— "آیا تھا یا نہیں؟"

چاروں مستورات نے سر ہلا کر جواب دیا کہ یہاں باہر کا کوئی آدمی نہیں آیا تھا۔

"آپ کب کی بات کرتے ہیں؟" —— رشید کی ماں نے میجر سے پوچھا۔

"گذشتہ رات کی" —— میجر نے کہا —— "ہو سکتا ہے آج صبح آیا ہو"۔

"نہ جی!" —— ڈاکٹر رشید کی ماں نے جواب دیا —— "آپ گذشتہ رات اور آج صبح کی بات کرتے ہیں۔ یہاں تو ایک مدت سے باہر کا کوئی آدمی نہیں آیا نہ ہماری کہیں رشتہ داری ہے کہ ان میں سے کوئی آ جاتا .... یہ معاملہ کیا ہے؟ میرے بیٹے کو آپ نے ہتھکڑی کیوں لگا رکھی ہے؟ کیا اس نے کسی عورت کو اغوا کیا ہے یا کہیں ڈاکہ ڈالا ہے؟؟"

"تمہیں یہ بھی پتہ چل جائے گا" —— میجر نے جواب دیا —— "میں جو پوچھتا ہوں وہ بتاؤ۔ یہاں پاکستان کا ایک آدمی آیا تھا" —— میجر ڈاکٹر رشید کی بہنوں سے مخاطب ہوا ——

"تم بتاؤ۔ سچ نہیں بتاؤ گی تو بہت ذلیل ہو گی"۔

دونوں بہنوں نے بھی ماں والا جواب دیا۔

بچے بہت چھوٹے تھے اور وہ یہ دیکھ دیکھ کر رو رہے تھے کہ یہ کوئی ڈاکو ہیں جو بغیر بتائے کمروں میں گھس گئے ہیں اور سامان الٹ پلٹ کر رہے ہیں۔ میجر نے ان سے بھی پوچھا کہ یہاں ایک آدمی آیا تھا۔ بچوں نے اور زیادہ رونا شروع کر دیا۔

مستورات کو صغیر کی موجودگی کا علم تھا اور انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ صغیر کس قسم کا مہمان ہے اور یہاں کیوں لایا گیا ہے۔ تحریکِ پاکستان کے دور میں صغیر کی ماں کی عمر سولہ سترہ سال تھی۔ تحریکِ پاکستان کو مرد چلا رہے تھے۔ 1946ء میں جب تحریک کا عروج شروع ہُوا اور اس ایشو پر الیکشن شروع ہوئے کہ برِصغیر میں مسلمان ایک الگ تھلگ قوم ہیں اور انہیں اپنی الگ اور آزاد مسلم مملکت ملنی چاہئے، مسلمان عورتیں خصوصاً کالجوں میں پڑھنے والی مسلمان لڑکیاں بھی میدان میں آ گئیں۔ صغیر کا باپ سرکاری ملازم ہوتے ہوئے اس تحریک میں پیش پیش تھا۔ صغیر کی ماں میٹرک پاس کر کے گھر میں بیٹھی تھی۔ وہ بھی دوسری عورتوں اور نوجوان لڑکیوں کے ساتھ تحریک میں شامل ہو گئی تھی۔ ہندو لڑکیاں انہیں کہتی تھیں کہ اگر پاکستان کا مطالبہ منظور ہو بھی گیا تو انبالہ پاکستان میں نہیں آئے گا اور پاکستان یہاں سے بہت دور بنے گا جہاں تک یہ پہنچ بھی نہیں سکیں گی پھر ان کے لئے بہتر یہ ہے کہ کانگریس میں شامل ہو جائیں اور ہندوؤں کے لئے کام کریں تاکہ آزادی ملے تو انہیں پورا حصہ ملے۔

مسلمان لڑکیاں صرف یہ جواب دیتی تھیں کہ مسلمان ایک الگ تھلگ قوم ہے اور ہندو اور مسلمان اکٹھے رہ ہی نہیں سکتے۔

پھر ایسے ہی ہُوا کہ پاکستان دنیا کے نقشے پر ابھرا اور انبالہ سے بہت دور معرضِ وجود میں آیا۔ اس وقت مسلمانوں کا جو قتلِ عام ہُوا وہ اس خاتون کو یاد تھا۔ انبالہ کے بیشتر مسلمان قتل ہوئے، زخمی ہوئے۔

ایک طرف اس ماں کا جوان بیٹا ہتھکڑیوں میں بندھا کھڑا تھا جسے سزا سے بچانے کے لئے یہ ماں اپنی جان بھی قربان کر سکتی تھی اور دوسری طرف پاکستان تھا جس کا تقدس اس کے دل میں رچا بسا ہُوا تھا۔ اسے وہ خون یاد آ گیا جو اس کی آنکھوں کے سامنے پاکستان کے نام پر بہایا گیا تھا۔ یہ ماں بڑے ہی کڑے امتحان میں آ گئی تھی۔ اس نے بار بار کہا

جواب دیا کہ یہاں کوئی آدمی نہیں آیا تھا۔

انٹیلی جنس کے یہ افسر ایک کمرے میں چلے گئے اور آپس میں صلاح مشورہ کرنے لگے۔

"ڈاکٹر اتنا بے وقوف نہیں ہو سکتا کہ مفرور کو اپنے گھر میں چھپا لیتا" ــــ ایک میجر نے کہا۔

"میں بھی تمہیں یہی مشورہ دینا چاہتا تھا" ــــ دوسرا میجر بولا ــــ "میں نے کمروں کو بہت ہی غور سے دیکھا ہے۔ مجھے کوئی ایسا سراغ نہیں ملا کہ یہاں کوئی باہر کا آدمی آیا ہو"۔

"جانے دے یار!" ــــ پہلے میجر نے طنزیہ سے لہجے میں کہا ــــ "تم کہاں کے فرشتے آ گئے ہو جو کمروں میں گھوم پھر کر بتا سکتے ہو کہ یہاں گھر کے آدمیوں کے علاوہ باہر کا کوئی آدمی بھی آیا تھا.... میری سنو۔ اس ڈاکٹر کو لے چلتے ہیں۔ صبح تک ہمارے پاؤں میں سر رکھ کر بتائے گا کہ مفرور کہاں ہے۔ مجھے اس کا باپ بھی بڑا گہرا آدمی لگتا ہے۔ یہ معلوم کرنا بھی ضروری ہے کہ اس کا باپ بھی اس کے جرم میں شامل ہے یا نہیں"۔

"میں ایک اور بات سوچ رہا ہوں" ــــ دوسرے میجر نے کہا ــــ "یہ سارا محلہ مسلمانوں کا ہے۔ کوئی بعید نہیں کہ اسے اس محلے کے کسی گھر میں چھپا کے رکھا گیا ہو"۔

"ہم سارے محلے کی تلاشی تو لے نہیں سکتے"۔

"کیوں نہیں لے سکتے؟" ــــ دوسرے میجر نے کہا ــــ "پورے محلے کو گھیر کر سب آدمیوں کو باہر نکال لیں گے، عورتوں کو گھروں میں رہنے دیں گے اور محلے سے باہر جانے کی کسی کو اجازت نہیں دیں گے"۔

"یہ کارروائی ہم خود تو نہیں کر سکتے" ــــ اس کے ساتھی میجر نے کہا ــــ "یہ تو جنرل صاحب کی اجازت لینی پڑے گی اور جنرل صاحب کو بھی شاید جی ایچ کیو سے پوچھنا پڑے گا.... یہ بھی سوچو کہ ڈاکٹر نے جنرل کو یہ بتایا ہے کہ مفرور کو پاکستان کی طرف رات کی رات روانہ کر دیا تھا۔ اگر میری رائے پوچھو تو میں اس خانہ تلاشی کو بیکار سمجھتا ہوں لیکن کچھ کارگزاری تو دکھانی پڑے گی"۔

"پھر یوں کرو" ــــ دوسرا میجر بولا ــــ "ان تمام گھروں کے دروازوں پر دستک دیتے ہیں اور ہر گھر کے ہیڈ آف دی فیملی کو باہر بلا لیتے ہیں۔ اس سے یہ ہو گا کہ مفرور

کسی بھی گھر میں ہُوا تو اسے جلد از جلد یہاں سے نکال دیا جائے گا۔ ہم اپنے مخبر ادھر ادھر کھڑے کر دیں گے۔ ہو سکتا ہے ہمیں کچھ کامیابی حاصل ہو جائے"۔

"یہ کارروائی کی جاسکتی ہے" ـــــ اس کا ساتھی میجر بولا۔

○

رات کے ابھی دس ہی بجے تھے کہ محلے کے تمام گھروں پر باری باری دستک ہونے لگی۔ دروازہ کھلتا تو دروازہ کھولنے والے کو یہ حکم دیا جاتا کہ بڑے میاں کو باہر بھیجو۔ اس طرح تھوڑی ہی دیر میں ہر گھر کے بڑے میاں گلی میں اکٹھے ہو گئے۔ ان میں وہ آدمی بھی تھا جس کے گھر میں صغیر کو چھپایا گیا تھا۔ ہر شخص کے چہرے پر گھبراہٹ تھی۔ سب سے زیادہ گھبراہٹ اُس شخص پر تھی جس کا گھر ڈاکٹر رشید کے پڑوس میں تھا اور جہاں سے صغیر کو اتار کر باہر نکالا گیا تھا' یا گھبراہٹ اُس شخص کے چہرے پر تھی جس کے گھر میں صغیر چھپا ہُوا تھا۔

"آپ سب میرے باپ اور میرے بڑے بھائی ہیں" ـــــ انٹیلی جنس کے ہندو میجر نے ان لوگوں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا ـــــ "میں دل کی گہرائیوں سے آپ کی عزت کرنا چاہتا ہوں لیکن دیکھنا یہ ہے کہ آپ سب کو بھی اپنی عزت کا خیال ہے یا نہیں؟"

"بیٹا!" ـــــ ایک ضعیف العمر مسلمان نے میجر سے پوچھا ـــــ "پہلے یہ تو بتائیں آپ ہیں کون؟ کیا آپ پولیس کے افسر ہیں' سی آئی ڈی کے ہیں یا آپ فوج سے تعلق رکھتے ہیں؟ پھر یہ بتائیں کہ اصل بات کیا ہے!"

"میں اصل بات پر آ رہا ہوں بڑے میاں!" ـــــ میجر نے کہا ـــــ "میں سی آئی ڈی کا آدمی ہوں اور تفتیش کے لئے آیا ہوں۔ پہلے آپ میری بات سن لیں پھر کوئی سوال کرنا ہے تو کر لینا۔ بات یہ ہے کہ ایک پاکستانی ویزا کے بغیر یہاں آیا ہے۔ اس کے پاس پاسپورٹ بھی نہیں اور وہ غیر قانونی طور پر انڈیا میں داخل ہُوا ہے۔ ہمیں مخبروں نے رپورٹ دی ہے کہ وہ اس محلے میں چھپا ہُوا ہے۔ میں آپ سے عزت اور احترام سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ جس کسی کے ہاں مہمان بن کے ٹھہرا ہُوا ہے وہ اسے ہمارے حوالے کر دے۔ ہم کوئی کارروائی نہیں کریں گے۔ ہم جانتے ہیں کہ اس طرح کوئی اجنبی مہمان آجائے تو اسے گھر سے نکالا نہیں جاسکتا۔ میرے گھر کوئی ہندو اجنبی آجائے اور کہے کہ میں مصیبت میں ہوں' مجھے پناہ دو تو میں اسے غیر قانونی طور پر بھی ضرور پناہ

دوں گا۔ آپ مسلمان ہیں۔ اگر پاکستان کا کوئی آدمی اس طرح آکر آپ سے درخواست کرے کہ اسے ایک دو دنوں کے لئے پناہ دی جائے تو سچے مسلمان کی حیثیت سے آپ اسے ضرور پناہ دیں گے۔ میں آپ پر کوئی الزام نہیں لگاؤں گا۔ ہمیں صرف اس آدمی کی ضرورت ہے۔ میں آپ کو یہ مہلت بھی دے سکتا ہوں کہ صبح تک وہ آدمی اس گلی میں کھڑا ہونا چاہئے اگر ایسا نہ ہُوا تو گھر گھر کی تلاشی لی جائے گی اور پھر جس گھر سے وہ شخص برآمد ہُوا اس کا انجام آپ جانتے ہیں کیا ہو گا"۔

یہ خبر تو سارے محلے میں پھیل گئی تھی کہ ڈاکٹر عبدالرشید کو گرفتار کر لیا گیا ہے اور اس کے گھر کی تلاشی ہو رہی ہے۔ جس وقت یہ میجر لوگوں کو شریفانہ انداز میں دھمکیاں دے رہا تھا' ڈاکٹر رشید کو محلے سے باہر لے گئے تھے تاکہ محلے کا کوئی آدمی اسے دیکھ نہ سکے۔

میجر کے اس دھمکی آمیز خطاب کے بعد یہ لوگ آپس میں کھسر پھسر کرنے لگے۔ انٹیلی جنس کے افسر الگ کھڑے رہے۔

"مہاراج!" ـــــ ایک معمر مسلمان نے میجر کے پاس جا کر کہا ـــــ "ہم نے ایک دوسرے سے پوچھا ہے۔ سب یہی جواب دیتے ہیں کہ کسی بھی گھر میں کوئی پاکستانی نہیں آیا اور نہ ہی کوئی اتنی جرأت کر سکتا ہے کہ ملک میں غیر قانونی طور پر آئے ہوئے کسی آدمی کو پناہ دے۔ اگر آپ اپنی تسلی کرنا چاہتے ہیں تو ہمارے دروازے کھلے ہیں۔ آپ تلاشی لے لیں"۔

"ہم آپ سے پورا پورا تعاون کریں گے" ـــــ ایک اور معزز بزرگ بولا۔

انٹیلی جنس کے ان افسروں کی مجبوری یہ تھی کہ وہ اتنے بڑے محلے کے ہر گھر کی تلاشی اوپر والوں کی اجازت کے بغیر نہیں لے سکتے تھے کیونکہ یہ مسئلہ فرقہ وارانہ سیاست کی صورت اختیار کر سکتا تھا۔ اس کے لئے انٹیلی جنس کو کوئی خاص ہی انتظام کرنا تھا۔ ان افسروں کو اپنا رعب بھی قائم رکھنا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ ان لوگوں کو مرعوب کئے رکھیں۔

"میں آپ سب کا مشکور ہوں" ـــــ ایک میجر بولا ـــــ "آپ نے ہمارے ساتھ بہت تعاون کیا ہے۔ میں آپ کی اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ اس محلے میں کوئی پاکستانی نہیں آیا۔ آپ لوگ جائیں اور آرام کریں"۔

یہ کہہ کر انٹیلی جنس کے دونوں میجر وہاں سے ہٹ آئے۔

"یہ تم نے کیا کیا؟" ——— دوسرے میجر نے کہا ——— "ان لوگوں کو ڈرا کر رکھنا تھا، اگر صبح تک کوئی نتیجہ برآمد ہو جاتا"۔

"تم انٹیلی جنس میں رہنے کے قابل نہیں ہو" ——— پہلے میجر نے کہا ——— "اگر یہ انہیں یہ دھمکی دیتا کہ صبح ہر گھر کی تلاشی ہوگی تو اگر ہمارا مفرور یہاں ہُوا تو اسے رات ہی رات غائب کر دیں گے۔ میں نے انہیں یہ یقین دلا دیا ہے کہ اب ہم اس محلے میں آئیں گے ہی نہیں اور انہوں نے جو جواب دیا ہے وہ ہم نے قبول کر لیا ہے۔ ہم جا کر مخبروں کا انتظام کریں گے جو اس محلے پر نظر رکھیں گے"۔

محلے کے یہ سب آدمی گھروں کو جانے کی بجائے گلی میں کھڑے رہے اور آپس میں اس واردات پر تبادلۂ خیالات کرنے لگے۔ سب ڈاکٹر عبدالرشید کے باپ کے ارد گرد اکٹھے ہو گئے تھے اور اس سے پوچھ رہے تھے کہ ان کے گھر کی تلاشی کیوں ہوئی ہے۔

"دشمنی" ——— ڈاکٹر عبدالرشید کے باپ نے بتایا ——— "کسی دشمن نے ملٹری انٹیلی جنس کو غلط اطلاع دی ہے کہ غیر قانونی طور پر آیا ہُوا ایک پاکستانی اس گھر میں چھپا ہُوا ہے"۔

"تو پھر معلوم کریں کہ یہ دشمن کون ہے" ——— ایک بزرگ نے کہا ——— "اس محلے میں سے تو کوئی ہو نہیں سکتا۔ کوئی ہندو ہی ہو گا"۔

"میرا خیال ہے ملٹری ہسپتال میں میرے بیٹے کا کوئی دشمن ہے" ——— ڈاکٹر رشید کے باپ نے کہا ——— "سروس میں آپ جانتے ہیں اس قسم کی چپقلش اور دشمنی عداوت پیدا ہو ہی جاتی ہے.... دیکھو بھائیو! وار بھی کتنا زبردست اور اوچھا کیا ہے"۔

یہ تو کوئی مان ہی نہیں سکتا تھا کہ ڈاکٹر عبدالرشید یا اس کے خاندان کا کوئی دشمن ہو سکتا ہے۔ یہ ایک معزز اور شریف خاندان تھا اور سارا محلہ اس گھر کا احترام کرتا تھا۔ بہر حال ڈاکٹر رشید کے باپ نے اصل واردات پر پردہ ڈال لیا۔

"مجھے ایک اور شک ہے" ——— ایک معمر بزرگ نے کہا ——— "یہ سب ڈرامہ ہے۔ ان بدبخت ہندوؤں نے ہمارے خلاف کوئی اوچھی کارروائی کرنے کا ایک بہانہ تراش لیا ہے۔ مجھے تو شک ہے کہ یہ جو آئے تھے، ان کا تعلق نہ پولیس کے ساتھ تھا، فوج کی خفیہ پولیس کے آدمی ہیں۔ یہ ہمارے خلاف ایک فتنہ کھڑا کرنے آئے تھے اور

سمجھو کہ یہاں فساد ہُوا کہ ہُوا"۔

ڈاکٹر عبدالرشید کے باپ کو تو حقیقت معلوم تھی۔ اس نے سب کو تسلیاں دیں کہ گھبرائیں نہیں ہو سکتا ہے کوئی پاکستانی ادھر آنکلا ہو۔

"پھر بھی" ——— ایک اور بزرگ نے کہا ——— "ہمیں چوکنا رہنا چاہئے۔ ہندوؤں کو یہاں مسلمانوں کے خلاف کوئی فساد کھڑا کرتے دیر تو نہیں لگتی۔ ہمارے گھروں کی تلاشی لینے کے بہانے یہ گھروں کو آگ بھی لگا سکتے ہیں اور لُوٹ مار بھی کر سکتے ہیں"۔

سب آدمی دل میں خوف و ہراس اور گھبراہٹ لئے ایک ایک کر کے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔

○

وہ دونوں بھائی بھی جن کے گھر صغیر چھپا ہُوا تھا، ان لوگوں میں موجود تھے۔ وہ اپنے گھر گئے تو صغیر نے ان سے پوچھا کہ باہر کیا ہو رہا تھا۔

"انٹیلی جنس کے افسر آئے تھے" ——— بڑے بھائی نے اسے جواب دیا ——— "ڈاکٹر عبدالرشید کے گھر کی تلاشی ہوئی ہے اور یہ بھی پتہ چلا ہے کہ ڈاکٹر عبدالرشید کو ہتھکڑیوں میں ساتھ لائے تھے"۔

صغیر بدک اٹھا اور اس کی آنکھیں اس طرح کھل گئیں جیسے اس کے ڈھیلے باہر آ جائیں گے۔

"تم تو کچھ زیادہ ہی گھبرا گئے ہو صغیر بھائی!" ——— بڑے بھائی نے کہا ——— "یہ تو ہونا ہی تھا"۔

"یہ نہیں ہونا چاہئے تھا عابد صاحب!" ——— صغیر نے کہا ——— "میں تم لوگوں سے اتنی بڑی قربانی نہیں مانگوں گا۔ میں گرفتاری کے لئے پیش ہو جاؤں گا اور ڈاکٹر عبدالرشید کو چھڑوا لوں گا۔ میں کہوں گا کہ ڈاکٹر صاحب کی سزا بھی مجھے دو"۔

"یہ حرکت نہ کر بیٹھنا صغیر بھائی!" ——— عابد نے کہا ——— "اگر تم پیش ہو گئے تو ہم دونوں بھائی بھی گرفتار ہو جائیں گے.... خطرہ ٹل گیا ہے۔ انٹیلی جنس کے افسر کہہ گئے ہیں کہ انہیں یقین ہو گیا ہے کہ اس محلے میں کوئی پاکستانی نہیں آیا"۔

"میں انٹیلی جنس کا تربیت یافتہ آدمی ہوں" ——— صغیر نے کہا ——— "وہ تمہیں دھوکہ دے گیا ہے۔ وہ کسی بھی وقت آ کر گھر گھر کی تلاشی لے سکتے ہیں اور میں تمہیں خبردار

کرتا ہوں کہ کل صبح ہی صبح وہ پولیس کو لے کر آئیں گے اور آپ سب کو باہر نکال کر
گھر کی تلاشی لیں گے۔ مجھے یہاں سے چلے جانا چاہئے"۔

"کہاں جائیں گے آپ؟" ___ عابد کے چھوٹے بھائی رفیق نے پوچھا اور کہا۔
"عابد بھائی جان آپ سے کہہ چکے ہیں کہ اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کرنے
حماقت نہ کرنا"۔

"میں ڈاکٹر رشید صاحب کو چھڑانا چاہتا ہوں" ___ صغیر نے کہا ___ "میں کہوں گا
میں خود ہسپتال سے بھاگا تھا اور کسی نے بھی میری مدد نہیں کی"۔

"صغیر بھائی!" ___ رفیق نے کہا ___ "آپ کو بتایا جا چکا ہے کہ ڈاکٹر رشید صاحب
بڑی مضبوط شہادت کی بنا پر گرفتار کیا گیا ہے۔ آپ اس شہادت کو کس طرح جھٹلائیں
گے؟"

"رشید تو پکڑا گیا ہے" ___ عابد نے کہا ___ "اسے تو چھوڑیں گے نہیں اور تم بھی
پکڑے جاؤ گے۔ اب دیکھا جائے گا جو ہو گا"۔

"میرے بھائیو!" ___ صغیر نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا ___ "اگر میں یہاں چھپا
رہا تو کل صبح ہی صبح چھاپہ پڑے گا اور آپ دونوں بھائی پکڑے جائیں گے۔ پھر اس گھر
اور بچوں کا کیا بنے گا.... نہ بھائی نہ.... میں تم لوگوں سے اتنی بڑی قربانی نہیں لوں گا
میں آپ کی یہ بات مان لیتا ہوں کہ گرفتاری کے لئے پیش نہیں ہوں گا لیکن یہ نہیں
مانوں گا کہ میں یہاں چھپا رہوں۔ یہاں چھاپہ اتنا زبردست پڑے گا کہ یہ کافر مجھے زمین
کے نیچے سے بھی برآمد کر لیں گے پھر تمہارا اور تمہارے خاندان کا بیڑہ غرق ہو جائے گا
..مجھے جانے دو" ___ صغیر اٹھ کھڑا ہوا۔

دونوں بھائیوں نے مل کر اسے پکڑ لیا اور اسے کہنے لگے کہ وہ اچھی طرح چل تو
نہیں جائے گا کہاں اور کیسے!

"میں ان کافروں کے پاس نہیں جاؤں گا" ___ صغیر نے پُرعزم لہجے میں کہا ___
"میں رات ہی رات یہاں سے بہت دور نکل جاؤں گا۔ مجھے اللہ کے حوالے کر دو۔ میں
تمہیں پھر کہتا ہوں کہ میں اپنی سلامتی کی خاطر تم جیسے سچے اور مخلص مسلمانوں کو تباہ و
برباد نہیں کروں گا۔ میں تمہارے بچوں کا مستقبل تاریک نہیں ہونے دوں گا۔ میں کہیں
پکڑا گیا تو ٹھیک ہے۔ جیل میں پڑا رہوں گا۔ اگر کہیں مر مرا گیا تو اور زیادہ اچھا ہے"۔

صغیر یک لخت جذباتی ہو گیا اور کہنے لگا ___ "میں نے جو گناہ کئے ہیں ان کی مجھے سزا ملنی
چاہئے"۔

"کیا آپ کو اس علاقے سے کچھ واقفیت ہے؟" ___ عابد نے پوچھا۔
"کیا آپ پاکستان کی طرف جانے والے راستے اور ذرائع جانتے ہیں؟" ___ رفیق
نے پوچھا۔
"اللہ میری راہنمائی کرے گا" ___ صغیر نے کہا ___ "اللہ میری مدد کرے گا....
میں تمہارے جذبے اور تمہارے خلوص کی قیمت ادا نہیں کر سکتا۔ معلوم نہیں پھر کبھی
مل سکیں گے یا نہیں"۔

صغیر دونوں کو گلے لگا کر ملا۔ دونوں بھائیوں کی آنکھوں میں آنسو تھے اور صغیر کی
جذباتی کیفیت تو یہ تھی کہ روتے روتے سسکنے لگا اور اسی کیفیت میں وہ اس گھر سے نکل
گیا۔ اسے نہ کسی راستے سے واقفیت تھی نہ اس علاقے سے واقف تھا۔ سب سے بڑی
مشکل یہ تھی کہ اس کی ٹانگ زخمی تھی اور وہ اچھی طرح چل نہیں سکتا تھا۔ اس کے
ساتھ ایک خطرہ یہ کہ لنگڑانے کی وجہ سے وہ شک میں پکڑا بھی جا سکتا تھا۔ انٹیلی جنس
کے مخبروں کو بتا دیا گیا تھا کہ مفرور کی ٹانگ زخمی ہے اور وہ ٹھیک طرح چل نہیں سکتا۔

رات کے بارہ بج رہے تھے۔

انبالہ سے دور، بہت دور لاہور کی ایک کوٹھی میں میجر عثمان ایک کمرے میں بیٹھا ہوا
تھا۔ فوزی اس کے ساتھ لگ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا سر عثمان کے کندھے پر تھا۔ اس کا
ایک بازو عثمان کی کمر کے گرد لپٹا ہوا تھا اور عثمان نے فوزی کو اپنے بازوؤں کے گھیرے
میں لے رکھا تھا۔ فوزی کے ریشم جیسے نرم و ملائم بال میجر عثمان کے ایک گال سے مس کر
رہے تھے اور عثمان پر بے خودی طاری تھی۔ اس نشیلی کیفیت کے لئے وہ پورے پاکستان
کی قیمت دینے پر تیار ہو چکا تھا۔

اس کے گھر میں وینا اس خوش فہمی میں مبتلا سو گئی تھی کہ عثمان اسے واپس مل گیا
ہے اور اب وہ لُوسی اور اس کے گروہ کو پکڑوا دے گا۔

اگلی صبح انٹیلی جنس کا بریگیڈیئر اپنے آفس میں داخل ہونے لگا تو اُس نے دیکھا کہ وہ میجر اور کیپٹن جو صغیر کے فرار کی تفتیش کر رہے تھے اُس کے آفس کے باہر کھڑے تھے۔

"کیا رپورٹ ہے؟" — بریگیڈیئر نے اُن سے پوچھا اور اپنے دفتر میں داخل ہو گیا۔

میجر اور کیپٹن اُس کے پیچھے پیچھے اُس کے دفتر میں گئے۔ بریگیڈیئر نے اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے اُنہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ دونوں بیٹھ گئے۔

"رات کیا ہُوا؟" — بریگیڈیئر نے پوچھا۔

میجر نے اس کارروائی کی تفصیلی رپوٹ دی جو اس نے رات ڈاکٹر عبدالرشید کے گھر اور محلے میں کی تھی۔

"مفرور کا کوئی سراغ نہیں ملا" — میجر نے کارروائی کی پوری رپورٹ دے کر کہا — "ڈاکٹر رشید کے گھر کی تلاشی بڑی باریکی سے لی۔ اس گھر کے بوڑھے سے بچے تک کو ڈرا دھمکا کر پوچھا لیکن سب نے یہ ماننے سے انکار کیا کہ اس گھر میں کوئی اجنبی آیا تھا۔ بڑے تیز اور ہوشیار لوگ معلوم ہوتے ہیں.... یہ محلہ مسلمانوں کا ہے۔ ہم نے ہر گھر کے بڑے مرد کو باہر بلا کر بہت ڈرایا لیکن سب کے سر انکار میں ہی ہلتے رہے"۔

"سر!" — میجر نے کہا — "معلوم تو یہی ہوتا ہے کہ مفرور اس محلے میں آیا ہی نہیں یا لایا ہی نہیں گیا"۔

"اسے اِسی محلے میں لایا گیا تھا" — بریگیڈیئر نے کہا — "اور اس ڈاکٹر نے اُسے اپنے گھر میں رکھا تھا اور اسے پاکستان کی طرف بھیج دیا"۔

میجر اور کیپٹن حیرت زدگی کے عالم میں بریگیڈیئر کے منہ کی طرف دیکھنے لگے۔

"یہ انفارمیشن کہاں سے ملی سر؟" — کیپٹن نے پوچھا۔

"ڈاکٹر رشید نے خود مجھے بتایا ہے" — بریگیڈیئر نے جواب دیا — "اس نے پورا بیان دیا ہے لیکن اس سے آگے وہ نہیں بولتا۔ اب معلوم یہ کرنا ہے کہ اس سارے جرم میں ڈاکٹر رشید کے ساتھ کون کون تھا۔ وہ سفید گاڑی ملنی چاہئے۔ گاڑی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان لوگوں میں کوئی روپے پیسے والا آدمی بھی ہے ورنہ مسلمانوں میں گاڑی رکھنے کی ہمت کہاں ہے"۔

"گاڑی کی نمبر پلیٹ نہیں تھی سر!" — میجر نے کہا — "اتنا ہی پتہ چلا ہے کہ گاڑی سوزوکی تھی اور اس کا رنگ سفید تھا۔ ہم انفارمر مقرر کر دیں گے جو یہ دیکھیں گے کہ رشید یا اس کے خاندان کے مراسم کسی ایسے آدمی کے ساتھ ہوں گے جس کے پاس سفید سوزوکی ہو گی۔ ہمارے انفارمر اس محلے میں بھی دیکھیں گے کہ سفید سوزوکی کس کے پاس ہے"۔

"ایک اور شخص ذہن میں رکھو" — بریگیڈیئر نے کہا — "شک ہے کہ یہاں پاکستان کی انٹیلی جنس کا کوئی آدمی موجود ہو گا۔ وہ صغیر کو جانتا ہو گا کہ یہ ہماری انٹیلی جنس کا آدمی ہے۔ اُس نے صغیر کو یہاں سے نکلوایا ہو گا۔ مجھے صغیر کے متعلق جو رپورٹ ملی ہے وہ بڑی اچھی ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ پاکستان سے صغیر سے بہتر اور قابلِ اعتماد کوئی آدمی نہیں مل سکتا۔ میں نے خود اس شخص کی کارگزاری دیکھی ہے۔ یہ واقعی کارآمد اور قابلِ اعتماد ایجنٹ ہے۔ یہاں مجھے شک ہوتا ہے کہ اُسے اغوا کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر عبدالرشید کے بیان سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اس نے پاکستان کی محبت کے جوش میں صغیر کو یہاں سے نکالا ہے' ہو سکتا ہے ورغلا کر نکالا ہو..... میں نے بارڈر سیکورٹی فورس کو الرٹ کر دیا ہے لیکن تم جانتے ہو کہ بارڈر کراس کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ صغیر بارڈر کراس کرنا جانتا ہی ہو گا۔ ہمارے لئے یہ معلوم کرنا بہت ضروری ہے کہ صغیر کے ساتھ اور کون کون تھا۔ یہ تو تمہیں معلوم ہو ہی چکا ہے کہ دو تین آدمی سفید سوزوکی میں بیٹھے ہوئے تھے اور وہ صغیر کو گاڑی میں بٹھا کر لے گئے تھے..... میں رشید سے معلوم کرنے کی کوشش کروں گا۔ اگر وہ نہ بولا تو دوسرا طریقہ اختیار کیا جائے گا"۔

"دوسرا طریقہ تو اختیار کیا ہی جائے گا سر!" — میجر نے کہا — "ہم اس ڈاکٹر کے گھر کے تمام افراد کو یہاں بلا لیتے ہیں۔ اس کا باپ شاید کچھ اُگل دے"۔

"ہم یہ بھی سراغ لگالیں گے کہ ڈاکٹر رشید کی دوستی اور اُٹھنا بیٹھنا کس کس کے ساتھ ہے" — کیپٹن نے کہا — "مجھے اُمید ہے ہم ڈاکٹر کے دوستوں کا اتہ پتہ معلوم کرلیں گے"۔

بریگیڈیئر نے ان دونوں کو کچھ ہدایات دیں اور ایک کرنل کا نام لے کر کہا کہ وہ چلے جائیں اور اس کرنل کو اُس کے پاس بھیج دیں۔ دونوں اُٹھے اور کمرے سے نکل گئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایک ہندو کرنل کمرے میں داخل ہوا اور بریگیڈیئر کے اشارے پر اُس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ بریگیڈیئر نے اسے صغیر کے فرار کے متعلق بتانا شروع کر دیا اور یہ بھی بتایا کہ ڈاکٹر رشید نے کیا بیان دیا ہے۔

"اِسے تم ٹیک اوور کرلو" — بریگیڈیئر نے کرنل سے کہا — "اس سے اس کے ساتھیوں کے نام پتے معلوم کرتے ہیں۔ اس کے گھر کے ہر فرد کو بلانا ہے لیکن یہ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ میں کوشش کروں گا کہ یہ ڈاکٹر خود بتا دے۔ میں اُسے اپنے پاس بلا رہا ہوں۔ تم ابھی اپنے آفس میں جاؤ۔ میں تمہیں بلالوں گا"۔

○

ڈاکٹر عبدالرشید نے وہ رات اِسی جگہ انویسٹی گیشن سیل میں گذاری تھی۔ یہ تھانوں جیسی حوالات تھی جس میں وہ اکیلا بیٹھا رہا تھا۔ اُس کا بستر فرش پر بچھا ہُوا تھا۔ بستر کیا تھا' دو کمبل فرش پر بچھے تھے اور ایک کمبل اُوپر لینے کے لئے دیا گیا تھا۔ تکیہ ایسا جس کی روئی پتھر ہو گئی تھی اور اس میں سے بدبو آتی تھی۔

ڈاکٹر رشید کا بڑا ہی سخت امتحان شروع ہو چکا تھا۔ خدا کے سوا اُس کی مدد کرنے والا کوئی نہ تھا۔ وہ رات بھر سوچتا رہا تھا کہ اُس کے گھر والوں کے ساتھ کیا سلوک ہو گا۔ باہر کی دنیا سے اُس کا رابطہ ٹوٹ چکا تھا۔ اُسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اُس کے محلے میں انٹیلی جنس نے کیا تفتیش اور کیا کارروائی کی تھی اور کہیں ایسا تو نہ ہوا ہو کہ کسی نے یہ راز اُگل دیا ہو کہ صغیر کو فلاں گھر میں رکھا گیا تھا۔ سب سے بڑا اور تلخ سوال جو اُسے پریشان کر رہا تھا' وہ یہ تھا — کیا صغیر وہاں سے نکل گیا ہو گا یا انٹیلی جنس اور پولیس نے چھاپہ مار کر اُسے پکڑ لیا ہے!

ڈاکٹر رشید نے رات پریشانی کے عالم میں تڑپتے گذار دی۔ اُس میں اتنا اخلاقی حوصلہ تھا کہ اپنے سامنے آئے ہوئے خطرے کا مقابلہ جوانمردی سے کر سکتا تھا لیکن جن خطرات کو وہ صرف محسوس کرتا تھا اور دیکھ نہیں سکتا تھا اُن کا مقابلہ کرنے کے لئے اُس کے پاس صرف جذبہ تھا' طریقہ اور ذریعہ کوئی نہیں تھا۔

انہی اذیت ناک سوچوں اور وسوسوں میں رات گزر گئی۔ صبح ایک مگ میں اُس کے لئے چائے آئی۔ ایک پلیٹ میں چنے کی دال اور دو پھلکے بھی آئے۔ اُس نے دو تین لقمے کھائے اور دو تین گھونٹ چائے پی کر مگ الگ رکھ دیا۔ کچھ تو چائے پینے کے قابل نہیں تھی اور نہ پینے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ بہت پریشان تھا۔

اتنے میں کوٹھری کا دروازہ ایک بار پھر کھلا۔ ایک حوالدار نے اُسے کہا کہ وہ بریگیڈیئر صاحب کی پیشی کے لئے چلے۔

وہ اُٹھا اور حوالدار کے ساتھ چل پڑا۔

"ہیلو ڈاکٹر رشید!" — بریگیڈیئر نے ڈاکٹر رشید کو اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی پُرتپاک طریقے سے کہا — "رات کیسی گزری؟ کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟"

ڈاکٹر رشید ہنس پڑا۔ یہ ہنسی پُرمسرت نہیں تھی' اس ہنسی میں طنز تھی اور بریگیڈیئر کے سوال کا بہترین جواب۔ بریگیڈیئر نے بھی اپنے سوال کے جواب کا انتظار نہ کیا یا ضرورت ہی نہ سمجھی۔ رشید کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور رشید اُس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

"تمہارا پروفیشن ایک نوبل پروفیشن ہے" — بریگیڈیئر نے دوستانہ سے لہجے میں کہا — "بائی گاڈ' میں ڈاکٹروں کی بہت عزت کرتا ہوں۔ تمہیں ملزم کی حیثیت سے یہاں دیکھ کر میرے دل کو بہت تکلیف ہو رہی ہے.... بات کچھ بھی نہیں ڈاکٹر رشید! جو بات تھی وہ سامنے آگئی ہے' بلکہ تم نے خود بڑی دیانتداری سے اصل واقعہ مجھے بتا دیا ہے۔ تم نہیں سمجھ سکتے کہ میں تمہارا کتنا مشکور ہوں۔ یہ ذہن میں رکھو کہ صغیر کوئی مجرم تو نہیں جس نے قتل یا ڈکیتی کی واردات کی ہو اور تم نے اُسے جیل سے یا حوالات سے فرار کر دیا ہو۔ یہ سمجھ لو کہ وہ ہمارا مہمان تھا اور تم نے اُسے بھگا دیا"۔

"بریگیڈیئر صاحب!" — ڈاکٹر رشید نے ہونٹوں پر طنزیہ سی مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا — "اگر بات کچھ بھی نہیں تو اِسے یہیں پر ختم کر دیں۔ میں نے آپ کے

مہمان کو بھگا کر واقعی بد تمیزی اور بد تہذیبی کا مظاہرہ کیا ہے۔ میں اِس کی معافی مانگ رہا ہوں"۔

"ڈاکٹر رشید!" — بریگیڈیئر نے مشفقانہ سے لہجے میں کہا — "جس طرح میں تمہارے پروفیشن کے متعلق کچھ نہیں جانتا بالکل ایسے ہی تم میرے پروفیشن کی باریکیوں سے واقف نہیں۔ جس طرح آپریشن ٹیبل پر کوئی مریض مرجائے تو ہم کہتے ہیں ڈاکٹر کی کوتاہی سے یہ مریض مرگیا حالانکہ یہ صرف ڈاکٹر ہی بتا سکتا ہے کہ موت کا باعث کیا تھا۔ ایسے ہی میری جس کارروائی کو تم بے مقصد اور فضول سمجھتے ہو' اس کی اہمیت کو صرف میں یا انٹیلی جنس کا کوئی سینئر آفیسر ہی سمجھ سکتا ہے۔ میری ڈیوٹی کا تقاضا یہ ہے کہ تم صرف یہ بتا دو کہ وہ سفید گاڑی کس کی تھی اور تمہارے ساتھ کون کون تھا"۔

"میں ان سوالوں کے جواب کل دے چکا ہوں" — ڈاکٹر رشید نے پُرعزم لہجے میں کہا — "آپ نے میرے پروفیشن کو نوبل پروفیشن کہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مَیں بھی ایک نوبل آدمی ہوں۔ مَیں اپنی اس حیثیت کو قائم رکھنا چاہتا ہوں۔ اگر میں اپنے دو تین دوستوں کو اس مصیبت میں پھنسا دوں جس میں مَیں پھنسا ہُوا ہوں تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ میں نوبل آدمی نہیں ہوں اور میں بڑا ہی گھٹیا اور فریب کار انسان ہوں.... میں حیران ہوں کہ اس سارے معاملے کو آپ ایک معمولی بات کہہ رہے ہیں اور اس کے ساتھ ہی آپ پولیس کی طرح تفتیش کر رہے ہیں"۔

"تم میرے بیٹے ہو رشید!" — بریگیڈیئر نے کہا — "میں تمہیں بہت بڑی تکلیف سے بچانا چاہتا ہوں۔ میں نے تمہیں کل بھی کہا تھا اور آج بھی کہتا ہوں کہ ڈاکٹر کی حیثیت سے اور ملٹری ہاسپٹل کے ایک ملازم کی حیثیت سے تم نے اور کسی کو نہیں تو اپنے پروفیشن کو اور اپنے ہاسپٹل کو بہت بڑا دھوکہ دیا ہے۔ ایک ایسے مریض کو تم نے ہسپتال سے نکال دیا ہے جس کا علاج ابھی مکمل نہیں ہوا تھا اور تم نے یہ بھی نہ دیکھا کہ وہ زخمی تھا اور زخم بھی ٹانگ کا تھا جس پر سارے جسم کا بوجھ پڑتا ہے۔ اس کا زخم ابھی خراب تھا کیا تم مجھے یقین دلا سکتے ہو کہ یہ زخمی کسی ایسی جگہ رکھا گیا ہے جہاں تم اس کی باقاعدہ مرہم پٹی کر رہے ہو؟.... یہی جرم ایک بڑا جرم ہے"۔

"بریگیڈیئر صاحب!" — ڈاکٹر رشید نے کہا — "میں نے جو کچھ کیا ہے سوچ سمجھ

کر کیا ہے"۔

"اچھا یہ بتاؤ ڈاکٹر رشید!" — بریگیڈیئر نے پوچھا — "کیا تمہارے والدین اور گھر کے دیگر افراد کو معلوم تھا کہ تم نے صغیر کو اپنے گھر رکھا ہے اور انہیں یہ بتایا ہو گا کہ یہ کون ہے؟"

"نہیں!" — ڈاکٹر رشید نے کہا — "پہلی بات تو یہ ہے کہ میرے گھر والوں کو میری اس کارروائی کا علم ہی نہیں اور دوسری بات یہ کہ میں صغیر کو اپنے گھر لایا ہی نہیں تھا۔ میں ایسا بے وقوف تو نہیں کہ اپنے بوڑھے اور معزز والدین کو اس مصیبت میں ڈال دیتا۔ میں جانتا تھا کہ میں ایک غلط کارروائی کر رہا ہوں اور اس کی ساری ذمہ داری صرف مجھ پر عائد ہونی چاہئے"۔

"اگر میں تمہارے والدین کو اس مصیبت میں پھنسا لوں تو کیا کہو گے؟" — بریگیڈیئر نے پوچھا۔

"میں کہوں گا کہ یہ بریگیڈیئر ایک اوچھا آدمی ہے" — ڈاکٹر رشید نے بڑی جرأت سے جواب دیا — "اور میں کہوں گا کہ انڈیا میں ہندو مسلمانوں کو پریشان کرنے کے بہانے ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ اگر آپ میرے والدین اور میرے گھر کی مستورات اور بچوں کو پریشان کریں گے تو میرے دل میں آپ کی اور اس ملک کی نفرت پیدا ہو جائے گی۔ میں آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا بریگیڈیئر صاحب! آپ جو چاہیں کریں اور میں جانتا ہوں کہ آپ میرے گھر کے بچے بچے کو شامل تفتیش کر لیں گے لیکن میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ آپ کو دلی تسکین تو ضرور ہو گی لیکن تفتیش کے معاملے میں آپ کو کچھ حاصل نہیں ہو گا....

"مَیں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرے گھر والے میری اس کارروائی سے واقف نہیں۔ اُنہیں پہلے ہی بہت پریشان اور ذلیل کیا جا چکا ہے مجھے ہتھکڑی لگا کر وہاں لے گئے اور میرے گھر کی تلاشی لی گئی۔ سوئے ہوئے بچوں کو جگایا گیا۔ تلاشی لینے والوں سے پوچھیں کہ وہاں سے اُنہیں کیا ملا۔ اگر کوئی کسر رہ گئی ہے تو وہ آپ پوری کر لیں"۔

"مجھے کسی شریف خاندان کو پریشان کرنے کا کوئی شوق تو نہیں" — بریگیڈیئر نے کہا — "تم انہیں خود ان پریشانیوں سے بچا سکتے ہوں۔ سیدھی سی بات ہے کہ اپنے ساتھیوں کے نام اور پتے بتا دو"۔

اس کے بعد بریگیڈیئر نے پیار اور محبت سے ڈاکٹر رشید سے اپنے سوال کا جواب حاصل کرنے کی پوری کوشش کر ڈالی۔ پھر وہ لالچ دینے پر اُتر آیا۔ اُس نے ڈاکٹر رشید کو یہ بھی کہا کہ وہ اُسے وعدہ معاف گواہ بنا لے گا جس سے وہ سزا سے بھی بچ جائے گا اور اُس کی عزت بھی محفوظ رہے گی اور ملٹری ہاسپٹل میں اُس کی ملازمت بھی برقرار رہے گی۔

"بریگیڈیئر صاحب! مَیں نے نتائج کو سامنے رکھ کر صغیر کو یہاں سے نکالا ہے"۔ ڈاکٹر رشید نے کہا — "میں نے آپ کو کل اچھی طرح بتا دیا تھا کہ میں نے اسے یہاں سے کیوں نکالا۔ یہ ایک جذبہ ہے۔ اس میں مجھے کوئی مالی فائدہ حاصل نہیں ہُوا۔ مَیں نے اپنے جذبے کی تسکین کی ہے۔ اس جذبے کو آپ جرم کہتے ہیں لیکن میرے مذہب میں یہ میرا فرض تھا۔ مَیں آپ کو صاف الفاظ میں بتا دیتا ہوں کہ غلام اپنی آرزوؤں کے لئے لڑتے ہیں تو اُن کے بادشاہ اُنہیں دہشت گرد کہتے ہیں لیکن غلاموں کے لئے یہ جنگ آزادی ہوتی ہے۔ آپ میرے جذبے کو جرم کہہ کر مجھے سزا دے سکتے ہیں"۔

"لیکن بیٹا!" — بریگیڈیئر نے کہا — "سزا ملنے سے پہلے ایک ایسے مرحلے سے گزرنا پڑے گا جو تمہاری برداشت سے باہر ہو گا۔ اس سے بچنا چاہتے ہو تو میرے سوالوں کا جواب دے دو ورنہ جس مرحلے کی مَیں نے بات کی ہے وہ تمہیں جسمانی طور پر ساری عمر کے لئے معذور کر دے گا"۔

"میں تیار ہوں" — ڈاکٹر رشید نے جواب دیا۔

بریگیڈیئر نے گھنٹی بجائی۔ اردلی اندر آیا۔ بریگیڈیئر نے کسی میجر کا نام لے کر کہا اُسے بلاؤ۔

ڈاکٹر رشید ایک بار پھر سلاخوں کے پیچھے سیل میں بیٹھا ہُوا تھا اور بریگیڈیئر اپنے آفس میں میجر سے کہہ رہا تھا کہ اس سالے مسلمان کی ہڈیاں توڑ دو۔ مر جاتا ہے تو مرنے دو۔ اس کے گھر کے بچے بچے کو بلاؤ اور دیکھو وہ کیا کہتے ہیں۔

○

صغیر اُس گھر سے نکل تو گیا لیکن وہ اس شہر سے اور اس سارے علاقے سے بالکل ہی ناواقف تھا بلکہ وہ اس پورے مُلک میں ایک اجنبی تھا۔ اُس نے کردار کی بلندی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اُس کی شخصیت مکمل طور پر بیدار ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر رشید اور نرس خالدہ نے اس کی روح کو بھی بیدار کر دیا تھا۔ اسے یہ بھی احساس تھا کہ ڈاکٹر رشید نے اسے ہسپتال سے نکلوا کر کتنا بڑا خطرہ مول لیا ہے۔ یہ تو اسے وہیں ڈاکٹر رشید کے محلے کے ایک گھر میں معلوم ہو گیا تھا کہ اس کے فرار کی تفتیش اس محلے کے مسلمانوں کے لئے کس قدر توہین آمیز ہو رہی ہے۔ انہیں اس ذلت سے بچانے کے لئے وہ یہی کر سکتا تھا کہ یہاں سے نکل جائے اور وہ نکل گیا۔ اس نے اپنا انجام سوچا ہی نہیں۔ اگر اس کی ٹانگ زخمی نہ ہوتی تو وہ ہر مشکل برداشت کر سکتا تھا۔ اب اس کی حالت یہ تھی اس سے چلا بھی نہیں جاتا تھا۔

وہ شہر سے نکلا تھا تو رات کے اُس وقت سڑکیں تقریباً سنسان پڑی تھیں۔ اگر چھاؤنی کے علاقے میں ہوتا تو وہاں ابھی بہت رونق تھی۔ وہ شہر سے ویرانے کی طرف نکل گیا۔ وہ زخم میں درد محسوس کرنے لگا تھا اور مسلسل چلتے رہنے سے درد میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اس سے تیز چلا نہیں جا رہا تھا۔ یہ اُس کی قوتِ ارادی کا کمال تھا کہ وہ چل رہا تھا۔

انڈیا سے نکل جانا اُس کے لئے ایک چیلنج بن گیا تھا۔ اس مُلک کو وہ اپنا بدترین دشمن سمجھنے لگا تھا۔

وہ ایک پگڈنڈی کے کنارے کنارے اپنے آپ کو گھسیٹ رہا تھا۔ پگڈنڈی کے دونوں طرف کھیت تھے۔ وہ ایک جگہ بیٹھ گیا۔ اُس نے پینٹ اُتار کر اپنی زخمی ران ننگی کی۔ اُسے شک ہو رہا تھا جیسے اُس کے زخم سے خون رِس رہا ہو۔ یہ دیکھ کر اُسے اطمینان ہُوا کہ پٹی خشک تھی۔ چونکہ وہ ایک ٹانگ گھسیٹ کر چلتا تھا اس لئے دوسری ٹانگ بہت جلدی ہی تھک گئی۔

رات کے پچھلے پہر کا چاند اُوپر آ گیا تھا۔ صغیر نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور ایک سگریٹ مُنہ میں لے کر ماچس جلائی اور اس روشنی میں اُس نے وقت دیکھا۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ یہیں کہیں صبح ہو گئی تو وہ کہاں چھپے گا۔ فصل خاصی اُونچی تھی۔ اُس نے سوچا کہ اس فصل میں ہی چھپ کر دن گزار لے گا لیکن اس کے ساتھ ہی اسے خیال آیا کہ شہر سے دور نکل جانا بہت ضروری ہے۔ اس نے یہ بھی سوچا کہ اتنے زرخیز علاقے میں گاؤں بھی بہت ہوں گے۔

ان سے دُور دُور رہنا ہی بہتر رہے گا۔ یہ سوچ کر وہ اُٹھا اور چل پڑا۔

دُور سے اسے گھوڑے کے ٹاپ سنائی دیئے۔ اُس نے گھوم کے دیکھا۔ دُور ایک تانگہ چلا آ رہا تھا۔ صغیر نے سوچنا شروع کر دیا کہ چھپ جائے یا آہستہ آہستہ چلتا رہے۔ چھپنے میں اُسے یہ خطرہ محسوس ہوا کہ تانگے میں بیٹھی ہوئی سواریاں اسے دیکھ چکی ہوں گی اور اس صورت میں انہیں شک ہو گا۔ اس نے چلتے رہنا ہی بہتر سمجھا۔

تانگہ قریب آ گیا۔ صغیر نے ایک بار پھر مڑ کے دیکھا۔ تانگ کی چھت نہیں تھی اور چاندنی میں صرف تانگہ بان نظر آ رہا تھا۔ تانگے کی رفتار کم ہو گئی۔ صغیر آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ تانگے میں کوئی اور سواری نہیں۔

"کہاں جا رہے ہو بھئی؟" — صغیر کو تانگہ بان کی آواز سنائی دی۔

صغیر رُک گیا اور پھر تانگہ بھی اُس کے پاس آ کر رک گیا۔

"آؤ بیٹھ جاؤ!" — تانگہ بان نے کہا — "جانا کہاں ہے؟ جو جی چاہے دے دینا۔ مَیں اپنے گاؤں کو واپس جا رہا ہوں"۔

صغیر کے پاس انڈیا کی کرنسی کے ڈیڑھ پونے دو ہزار روپے تھے جو اُسے پاکستان میں ہی دے دیئے گئے تھے۔ چونکہ سرحد پار کرنی تھی اس لئے کچھ پتہ نہیں تھا کہ کیا ہو جائے اور ساتھی بچھڑ جائیں۔ صغیر کو بتا دیا گیا تھا کہ اس صورت میں وہ کہاں جائے۔ اس رقم کے علاوہ صغیر کو ایک لمبا چاقو بھی دیا گیا تھا جو اُس نے خطرے کے وقت استعمال کرنا تھا۔ ہسپتال میں اُسے ہسپتال کا پاجامہ اور بش شرٹ پہنا دی گئی تھی۔ اُس نے اپنے کپڑے اور یہ ساری چیزیں اپنے کمرے میں رکھی تھیں جو وہ فرار کے وقت اپنے ساتھ لے آیا تھا۔

"کیوں بھائی!" — تانگہ بان نے ایک بار پھر اُسے کہا — "چلنا ہے تو آ جاؤ رات آدھی گزر گئی ہے"۔

"نیچے آؤ" — صغیر نے تانگے والے سے کہا — "میری ایک بات سُن لو، پھر چلتے ہیں"۔

تانگہ بان تانگے سے اُترا۔ جب وہ صغیر کے پاس پہنچا تو کھلے ہوئے چاقو کی نوک اُس کی شہ رگ پر ٹک گئی جس کی چبھن کو تانگہ بان محسوس کر رہا تھا۔

"مجھ سے تمہیں کیا ملے گا بھائی!" — تانگہ بان نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا —

"غریب آدمی ہوں پچاس ساٹھ روپے سارے دن میں کمائے ہیں، وہ تم لے لو۔ میرا گھوڑا اور میرے بچے ایک دن بھوکے رہ لیں گے"۔

"میں راہزن نہیں ہوں" — صغیر نے عام سے لہجے میں کہا — "میں تم سے ایک بات پوچھوں گا، وہ صحیح صحیح بتا دو"۔

فوراً پوچھو بھائی!" — تانگہ بان نے بڑی تیز تیز کہا — "فوراً پوچھو، اپنے اللہ کی قسم، قرآن مجید کی قسم، بالکل سچ بتاؤں گا"۔

"بس اتنا ہی کافی ہے" — صغیر نے ہلکی سی ہنسی ہنستے ہوئے کہا — "تم نے میرے سوال کا جواب دے دیا ہے۔ میں یہی معلوم کرنا چاہتا تھا کہ تم مسلمان ہو یا ہندو"۔

"ہاں بھئی!" — تانگہ بان نے کہا — "اللہ اور رسولؐ کے فضل و کرم سے مَیں مسلمان ہوں اِسی لئے تو مَیں نے اللہ اور قرآن کی قسمیں کھائی ہیں.... اب بتاؤ تم نے یہ کیوں پوچھا ہے؟"

صغیر نے چاقو بند کر کے جیب میں ڈال لیا اور تانگہ بان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تھپکی دی۔

"مجھے اِس وقت ایک مسلمان کی ہی ضرورت ہے" — صغیر نے مطمئن سے لہجے میں کہا — "لیکن ضرورت سچے اور پکے مسلمان کی ہے"۔

"ایک بات سمجھ لو بھائی میرے!" — تانگہ بان نے کہا — "اگر تم سچّا اور پکا مسلمان اُسے کہتے ہو جو نمازیں پڑھتا اور روزے رکھتا ہے تو وہ میں نہیں ہوں۔ اگر مسلمانوں کے دوسرے وصف دیکھنا چاہتے ہو مثلاً قول کا پکا، یاروں کے ساتھ یاری نبھانے والا، یاروں پر جان قربان کرنے والا اور دھوکہ نہ دینے والا تو تمہیں مجھ سے زیادہ پکا اور سچا مسلمان کوئی نہیں ملے گا.... کہو کیا بات ہے"۔

"بات بتا دوں گا" — صغیر نے جواب دیا — "کوئی خطرے والی بات نہیں۔ میں ڈاکو یا مفرور ملزم نہیں ہوں نہ کسی کو قتل کر کے بھاگا ہوں۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تم جا کہاں رہے ہو؟"

"مَیں اپنے گاؤں جا رہا ہوں" — تانگہ بان نے جواب دیا — "صبح سویرے تانگہ شہر لے جاتا ہوں اور رات اس وقت واپس آتا ہوں۔ تمہیں دیکھ کر اس خیال سے تانگہ روک لیا کہ جہاں تمہیں جانا ہے وہاں پہنچا دوں گا اور دو چار روپے کی آمدنی ہو

جائے گی مگر تم نے تو چاقو ہی نکال لیا تھا"۔

صغیر کے لئے یہ سوال بڑا ہی پیچیدہ اور پُرخطر تھا کہ وہ اس شخص پر اعتبار کرے یا نہ کرے۔ یہ شخص اُس سے بھید لے کر اُس کی مخبری بھی کر سکتا تھا لیکن اور کوئی چارہ کار بھی نہ تھا۔ اُس نے بہتر سمجھا کہ اس آدمی کو آزما لیا جائے۔ صغیر کو پناہ اور رہنمائی کی ضرورت تھی۔ صغیر کوئی کم عقل آدمی نہیں تھا۔ اسے انٹیلی جنس کی ٹریننگ ملی تھی اور اسے خاص تجربہ بھی حاصل ہو چکا تھا۔ وہ انسانوں کو پہچان کر اس کے مطابق بات کرنے کا تجربہ رکھتا تھا۔ اس نے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور ایک سگریٹ تانگے والے کو دے کر دوسرا خود سلگایا۔

"میرے پاس پیسے ہیں" — صغیر نے کہا — "تمہیں پوری اُجرت ملے گی اور ہو سکتا ہے کچھ انعام بھی مل جائے"۔

"بھائی میرے!" — تانگہ بان نے جھنجھلا کر کہا — "اب اصل بات پر آجاؤ اور بتاؤ تم چاہتے کیا ہو؟"

تانگہ بان ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ اس کی عمر پینتالیس سال سے کچھ زیادہ ہی معلوم ہوتی تھی۔ اُس کے بولنے کے انداز سے پتہ چلتا تھا کہ یہ گھاگ اور ہوشیار آدمی ہے۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" — صغیر نے تانگے والے سے پوچھا۔

"عبدالرحمٰن" — تانگے والے نے جواب دیا — "لیکن اس سارے علاقے میں رحمو تانگے والا کے نام سے مشہور ہوں۔ یہاں کسی گاؤں میں جا کر کسی سے پوچھو کہ رحمو تانگے والا کہاں رہتا ہے تو وہ تمہیں میرے گاؤں اور میرے گھر تک پہنچا دے گا"۔

"تم اتنے مشہور کیوں ہو؟" — صغیر نے پوچھا۔

"معلوم نہیں تم مانو گے یا نہیں" — تانگے والے نے کہا — "اُلٹی کرتوت والا آدمی جلدی مشہور ہوتا ہے اور اُس کی شہرت دُور دُور تک پھیل جاتی ہے۔ شہرت نہیں ملتی تو شریف آدمی کو نہیں ملتی۔ میں شریف آدمی نہیں ہوں"۔

"پھر تو مجھے تم پر اعتبار نہیں کرنا چاہئے" — صغیر نے کہا۔

"میں تمہیں ایک مشورہ دوں؟" — تانگے والے نے طنزیہ سے لہجے میں کہا — "کسی مُلّا ملوانے پر اعتبار نہ کر بیٹھنا۔ میری شہرت صرف یہ نہیں کہ میں بدمعاش ہوں

شہرت اس وجہ سے ہے کہ ہر کسی کے دُکھ کو اپنا دُکھ سمجھتا ہوں اور ہر کسی کے کام آتا ہوں.... دوسروں کے کام ہمیشہ بدمعاش ہی آیا کرتے ہیں کسی شریف آدمی یا مولوی کو مدد کی ضرورت آ پڑے تو مولوی صاحب سوچوں میں ڈوب جاتے ہیں کہ اس شخص کا کام کر دیا تو لوگ کیا کہیں گے اور کبھی یہ سوچتے ہیں کہ یہ کام کیا تو خُدا ہی ناراض نہ ہو جائے۔ مجھ جیسے آدمی کسی کی ناراضگی کی پرواہ نہیں کیا کرتے۔ کوئی ناراض ہوتا ہے تو ہوتا رہے' وہ کام سے کام رکھتے ہیں اور بدمعاشی وہاں کرتے ہیں جہاں بدمعاشی کرنے کی ضرورت ہوتی ہے.... تم جا کہاں رہے ہو؟"

"یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں" — صغیر نے جواب دیا — "اگر تم واقعی قول کے پکے اور دوسروں کے کام آنے والے ہو تو مجھے بتاؤ میں کہاں جاؤں"۔

"یہ تو پتہ چل گیا ہے کہ تم مسلمان ہو۔ اگر تم ہندو ہوتے تو میں کبھی تمہارے ساتھ اتنی باتیں نہ کرتا لیکن تم مسلمان بھائی ہو' میرا دل کہتا ہے کہ میں تمہیں یہاں اکیلا نہ چھوڑوں"۔

صغیر نے اس آدمی کی فطرت کو سمجھنے کی مزید کوشش اس طرح کی کہ اس کے ساتھ بہت سی باتیں کیں اور اس سے باتیں اُگلوائیں۔

"ایک بات بتاؤ!" — صغیر نے اُس سے پوچھا — "تم نے کہا تھا کہ میں ہندو ہوتا تو تم میرے ساتھ اتنی باتیں نہ کرتے۔ تم نے ایسا کیوں کہا تھا؟"

"یوں کرو" — تانگے والے نے کہا — "تانگے میں بیٹھو۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔ میرے بچے انتظار کر رہے ہوں گے۔ تم جہاں کہو گے وہاں اتار دوں گا۔ تانگے میں باتیں کرتے چلیں گے"۔

"ایک بات سُن لو رحمو!" — صغیر نے کہا — "اگر تم نے مجھے دھوکہ دیا تو تمہارے بچے تمہیں ڈھونڈتے ہی رہیں گے...."

"میرے ساتھ آجا یار!" — تانگہ بان نے اس کا ایک بازو پکڑتے اور تانگے کی طرف چلتے ہوئے کہا۔

صغیر جب چلنے لگا تو درد کی شدت کی وجہ سے اس کے منہ سے کربناک سی آواز نکل گئی اور اس کے لئے چلنا مشکل ہو گیا۔ تانگے والے نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا کہ یہ کیا بات ہے۔ صغیر نے اسے بتایا کہ اس کی ٹانگ زخمی ہے اور وہ

ٹھیک طرح چل نہیں سکتا اور زخم میں درد بھی ہو رہا ہے۔
تانگے والا اسے تانگے تک لے گیا اور پچھلی سیٹ پر بٹھا دیا۔

○

تانگے والا اپنی سیٹ پر بیٹھا اور کمزور سا گھوڑا چل پڑا۔

"تم نے مجھ سے ہندوؤں کے بارے میں پوچھا تھا" — تانگے والے نے کہا۔ "مجبوری ہے کہ میں اس ملک میں رہتا ہوں۔ کوئی اور ٹھکانہ نہیں۔ تانگہ بانی خاندانی پیشہ نہیں۔ اس انبالہ شہر میں ہم ایک پکے مکان میں رہا کرتے تھے۔ میرے ا... کی منیاری کی دکان تھی۔ دو بڑے بھائی تھے۔ ایک بھائی باپ کے ساتھ دکان پر رہ... اور باپ نے دوسرے بھائی کو الگ دکان کروا دی تھی۔ میں اس وقت بہت چھوٹا... 1947ء میں ملک کا بٹوارہ ہوا۔ پاکستان الگ اور ہندوستان الگ ہو گیا تو ہندوؤں... سکھوں نے مسلمانوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ کس طرح انہوں نے مسلمانوں کا خ... بہایا' کس طرح اُن کے گھر بار لُوٹے اور کس طرح ان کی عورتوں کو اغوا کیا اور... طرح مسلمان یہاں سے بھاگے' یہ سب تو تم جانتے ہی ہو.....

"انبالے کے لوگ بھی کٹے اور مرے اور جو بچ گئے وہ قافلے بن کر پاکستان... گئے لیکن مجھ پر جو ظلم کا پہاڑ گرا وہ شاید میرے حصے میں آیا تھا۔ اس وقت میری عمر... تیرہ سال تھی۔ میرے گھر کا بوڑھا' بچہ' عورتیں سب قتل ہو گئے۔ میں اس طرح... کہ کوٹھے پر بھاگ گیا تھا..... یہ بڑی لمبی باتیں ہیں میرے بھائی ویسے بھی سنانے لگوں... دل دُکھتا ہے اور ان ہندوؤں پر اتنا غصہ آتا ہے جو میرا ہی خون جلا دیتا ہے"۔

"نہ ہی سناؤ تو اچھا ہے" — صغیر نے اپنی آواز میں افسردگی اور اُداسی پیدا کر... ہوئے کہا — "مجھ پر بھی یہ گزر چکی ہے میں بھی اپنے خاندان کا ایک ہی فرد رہ گیا... ..... ہاں پھر کیا ہوا! تم اپنی سناؤ"۔

"ہونا کیا تھا یار!" — تانگے والے نے کہا — "یہاں تو قیامت کا منظر تھا۔ کسی... کسی کی ہوش نہیں تھی۔ ہمیں آزادی بڑی مہنگی پڑی تھی۔ میں صبح کو کوٹھے سے ا... گھر کے تمام افراد اور بچے مرے پڑے تھے۔ گھر میں کوئی چیز سلامت نہیں رہی تھی... ایک دو سکھوں نے گھر لُوٹ لیا تھا۔ میں باہر نکل گیا۔ دل پر ایسا خوف تھا کہ رونا... جیسے بھول ہی گیا تھا۔ باہر بندے بندے سے ڈر لگتا تھا۔ کوئی بتانے والا نہیں تھا کہ

...ؤں۔ میرے محلے میں کوئی مسلمان نہیں رہا تھا۔ میں دیہاتی علاقے میں نکل گیا۔ یقین ...کرتا کہ دس بارہ دن ڈرے ہوئے جانوروں کی طرح میں فصلوں اور کھڈ نالوں میں چھپتا ...پھرتا رہا۔ یہ تو بعد میں پتہ چلا تھا کہ یہاں کہیں ریفیوجی کیمپ بنا تھا جہاں بچے کھچے مسلمان جا جمع ہوئے تھے اور وہ پاکستان چلے گئے تھے.....

"مجھے یاد نہیں نہ اُس وقت احساس تھا کہ سورج کدھر سے نکلا ہے اور کدھر ڈوب گیا ہے۔ غم اور خوف کا اثر ایسا تھا کہ یوں لگتا تھا جیسے میں ہوا میں اُڑ رہا ہوں اور کبھی یوں جیسے ہر طرف گھپ اندھیرا ہے اور میں ٹھوکریں کھاتا چلا جا رہا ہوں"۔

"مت سناؤ یار!" — صغیر نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا — "یہی کچھ میرے ساتھ بیتی تھی۔ بات ذرا مختصر کرو"۔

"مختصر بات یہ ہے" — تانگے والے نے کہا — "میرے اتنے بڑے مکان پر ہندوؤں نے قبضہ کر لیا۔ ہماری دُکانوں میں ہندو جا بیٹھے۔ مجھے جب ذرا ہوش آیا تو میں اپنے گھر کے دروازے پر جا کھڑا ہوا۔ اندر سے ایک عورت نکلی۔ میں نے اُسے کہا کہ یہ میرا گھر ہے۔ وہ عورت پہلے تو بڑے زور سے ہنسی پھر اس نے مجھے دھکے دے کر وہاں سے ہٹا دیا' پھر میں اپنی دُکان پر گیا۔ وہاں بھی ہندو بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے اور رو کر کہا کہ یہ دکان ہماری ہے۔ وہاں ایک ہندو نے بازو سے پکڑ کر دکان کے باہر لا کھڑا کیا اور کہنے لگا کہ پھر کبھی یہاں نہ آنا ورنہ جس طرح یہاں کے مسلمان قتل ہوئے ہیں اِسی طرح تمہارا سر بھی اُتار دیں گے۔ میں نے بھیک مانگنی شروع کر دی.....

"بازار میں دیہاتی سے ایک آدمی نے جو امیر معلوم ہوتا تھا مجھ سے اپنا کچھ سامان اٹھوایا اور اڈے تک لے گیا۔ اس نے مجھے پیسے دیئے۔ میں رو پڑا اور اسے اپنا حال سنایا۔ وہ زمیندار تھا۔ مجھے اپنے ساتھ گاؤں میں لے گیا۔ اس گاؤں میں زیادہ تر مسلمان رہتے تھے۔ یہ 1950ء کی بات ہے۔ قتل و غارت بند ہو گئی تھی۔ مسلمان جو پیچھے رہ گئے تھے انہوں نے اپنے کام کاج اور کھیتی باڑی وغیرہ شروع کر دی تھی۔ اس آدمی نے مجھے اپنے گھر رکھ لیا۔ میری عمر اب چودہ پندرہ سال ہو گئی تھی۔ میں تو اس عمر میں جوان ہو گیا تھا۔ تم جانتے ہو بھئی! بھکاری کا اخلاق کیا ہوتا ہے۔ میں نے چھوٹی موٹی چوریاں کیں اور پیٹ بھرنے کے لئے کیا کیا پاپڑ بیلے۔ میں بڑا ہوتا گیا اور گاؤں میں ہی میری زندگی ایک راستے پر چلتی گئی۔ پھر پانچ سات سال اور گزرے تو غریب سی ایک لڑکی

کے ساتھ شادی ہو گئی"۔

"پھر تم بدمعاش کس طرح بن گئے؟"

"کتے جب کھانے والی کسی چیز پر آپس میں لڑتے ہیں تو وہ چیز اُس کتے کے ہاتھ آتی ہے جو سب سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے" — تانگے والے نے جواب دیا — "میری حالت یہی تھی۔ میں نے یہی سیکھا کہ سیدھے ہاتھ سے کچھ نہیں ملتا۔ میں لڑکپن ہی میں ہاتھ پلہ مارنا شروع کر دیا تھا۔ بڑے پکے بدمعاشوں کی شاگردی میں اُن کی خدمت کی' پھر چھوٹے موٹے ڈاکوؤں اور پیشہ ور چور اُچکوں کے ساتھ بھی بیٹھتا رہا۔ تانگہ بنایا تو وہ بھی ان لوگوں نے استعمال کیا پھر میری رسائی طوائفوں تک گئی۔ انہیں گاہکوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں نے ان کے لئے شہر سے گاہک میں بٹھا کر لے جانے شروع کر دیئے۔ جس طوائف کے لئے میں گاہک لے جاتا تھا سے کمیشن لیتا تھا۔ یہ سلسلہ اب بھی چل رہا ہے۔ بس یہ ہے میری زندگی .... اب اپنی کہو"۔

"میری بپتا تو تم نے اپنی زبان سے سنا ڈالی ہے" — صغیر نے جھوٹ بولا اور کہا "فرق یہ ہے کہ تم انبالہ میں تھے اور میں جالندھر میں۔ میں بھی اپنے خاندان میں بچا تھا۔ اس وقت میری عمر پانچ چھ سال تھی۔ شاید اِس سے بھی کم ہو۔ میرے والے مجھے پاکستان لے گئے تھے۔ تم تو شاید اپنے گھربار کو بھول چکے ہو گے میں بھولا۔ میں جب بڑا ہوا تو مجھے بتایا گیا کہ میں جالندھر کا رہنے والا تھا اور میرے گھر تمام افراد قتل کر دیئے گئے تھے۔ مجھے وہ وقت خواب کی طرح یاد ہے"۔

"میرا گاؤں تو آ گیا ہے" — تانگے والے نے کہا — "تم بتاؤ کہاں جاؤ گے؟"

"تانگہ روک لو" — صغیر نے کہا — "میں اپنی بات پوری کر لوں پھر آگے چلے گے .... دراصل بھائی میرے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ جُوں جُوں بڑا ہوتا گیا مجھے میرا جالندھر والا گھر اور ماں باپ اور گھر کے دوسرے روز بروز زیادہ ہی یاد آتے رہے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ وقت کے ساتھ ساتھ میں سب کو بھول جاتا۔ میں پاکستان میں جس گھر میں پل کر جوان ہوا وہ بڑے ہی خاند لوگ ہیں۔ انہوں نے مجھے 'اپنا بیٹا سمجھ کر پالا' پڑھایا بھی اور پڑھا لکھا کر بڑی اچھی نوکر بھی دلا دی۔ وہ تو میری شادی بھی کرا دینا چاہتے تھے لیکن میں نے معلوم نہیں کیا

کر شادی کی طرف توجہ نہیں دی"۔

"شادی کر لیتے تو اچھا تھا" — تانگہ بان نے کہا — "تم اپنے سارے خاندان کو بھول جاتے اور تمہاری زندگی سُکھی ہو جاتی"۔

"اپنے والدین وغیرہ کو یاد کرتے ہوئے مجھے جو بھی دیکھتا اور سنتا تھا وہ یہی مشورہ دیتا تھا کہ میں شادی کر لوں" — صغیر نے کہا — "لیکن اپنے جالندھر والے گھر اور اپنے خاندان کی یاد میرے دماغ میں ایک جنون بلکہ ایک پاگل پن کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ میں نے تہیّہ کر لیا کہ ایک بار جالندھر جاؤں گا۔ میں نے ان لوگوں سے جو مجھے جالندھر سے لائے تھے' اپنے گھر اور محلے کی نشانیاں پوچھنی شروع کر دیں۔ اُنہیں خود بھی وہ محلہ اور چھوڑے ہوئے وہ گھر یاد آتے تھے اس لئے وہ مجھے مزے لے لے کر چھوٹی چھوٹی باتیں بھی بتاتے رہتے تھے۔ میں نے یہ ساری نشانیاں اپنے ذہن میں محفوظ کر لیں۔ پھر اِدھر اُدھر سے یہ پوچھنا شروع کر دیا کہ مَیں جالندھر کس طرح جا سکتا ہوں۔ اگر یہاں میرا کوئی عزیز رشتہ دار ہوتا تو میں اُس سے ملنے کا جواز پیدا کر کے ویزا لے لیتا لیکن ہندوستان میں آنے کا میرے پاس کوئی جواز نہیں تھا اس لئے مَیں غیر قانونی طور پر ہی اِدھر آ سکتا تھا....

"میں نے انڈین کرنسی اکٹھی کرنی شروع کر دی اور کافی پیسے جمع کر لئے اور ایک روز دماغ ایسا خراب ہوا کہ میں رات کو چل پڑا اور اندھا دھند سرحد پار کر لی۔ اتنا زیادہ پڑھا لکھا ہونے کے باوجود میں نے یہ سوچ لیا تھا کہ سرحد پار کرنا کوئی مشکل کام نہیں لیکن ہوا یہ کہ اچانک ایک طرف سے آواز آئی کہ رُک جاؤ' کون ہو۔ میں رُکنے کی بجائے دوڑ پڑا۔ عقل ایسی پھری کہ پاکستان کی طرف دوڑنے کی بجائے میں اس طرف کو بھاگ اٹھا۔ ایک گولی چلی جو میری ٹانگ سے گزر گئی"۔

"بڑی ہمت والے آدمی ہو یار!" — تانگہ بان نے کہا — "گولی کھا کر تم انبالہ تک پہنچ گئے؟ مرہم پٹی کہاں کراتے رہے؟"

"تم جیسا ایک دردمند مل گیا تھا" — صغیر نے نہایت چابکدستی سے جھوٹ بولتے ہوئے کہا — "جس طرح تم اتفاق سے مل گئے ہو اور تم ہو بھی مسلمان اور تمہارے دل میں وہی درد ہے جو میرے دل میں ہے' اسی طرح سرحد سے تھوڑی دور ایک گاؤں میں ایک مسلمان مل گیا۔ میں نے اسے بتایا تو اس نے مجھے گھر میں چھپا لیا۔ مرہم پٹی بھی

کی۔ خدا کا شکر ہے کہ ہڈی نہیں ٹوٹی۔ گولی پیچھے سے گزری تھی....

"وہ ایک غریب آدمی تھا تین چار دن اُس نے اپنے گھر رکھا اور ایک دن پولیس آ گئی۔ میں اٹھتے بیٹھتے اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس کی ذات باری نے ہر مشکل میں میری دستگیری کی۔ پولیس گھوم پھر کر چلی گئی۔ لیکن یہ خطرہ پیچھے رہ گیا کہ میں کسی بھی وقت پکڑا جا سکتا ہوں۔ مجھے جن لوگوں نے پناہ دی تھی وہ دیہاتی اور اَن پڑھ قسم کے لوگ تھے۔ وہ مجھے صرف چھپا سکتے تھے' میری رہنمائی کرنے کی عقل نہیں رکھتے تھے۔ میں ایک رات ان کے گھر سے نکل آیا۔ بدقسمتی سے میں غلط بس میں بیٹھ گیا اور اس طرح جنگل خراب ہوتے یہاں تک پہنچ گیا۔ اتنی لمبی بات کیا سنو گے"۔

"تمہاری بات سمجھ لی ہے" — رحمو تانگے والے نے کہا — "تم تو بڑے برے جال میں پھنس گئے ہو۔ اگر تم پکڑے گئے تو کہیں گے کہ تم پاکستان کے جاسوس ہو۔ اگر یہ الزام ثابت نہ ہوا تو تمہیں غیر قانونی طور پر اس ملک میں داخل ہونے کے جرم میں سزا دے دیں گے۔ تم زخمی بھی ہو۔ تمہیں پناہ چاہئے اور پناہ بھی ایسی ہو جس پر کسی کو شک بھی نہ ہو.... مجھے سوچنے دو کہ میں تمہاری یہ مدد کر سکتا ہوں یا نہیں"۔

"مدد کرو گے تو پوری اُجرت دوں گا" — صغیر نے کہا — "میرے پاس تقریباً پونے دو ہزار ہندوستانی روپے ہیں۔ جتنا مانگو گے اتنا دوں گا"۔

"لعنت ہے رحمو تانگے والے پر کہ وہ ایک پیسہ بھی وصول کرے" — تانگے والے نے کہا — "میں چرسی ہوں' افیمی ہوں' شریف آدمی بالکل نہیں ہوں لیکن یہ میں کبھی نہیں بھولا کہ میں مسلمان ہوں اور ہندو میرے دُشمن ہیں۔ میں اپنے خاندانوں کے خون کے ایک قطرے کا بھی بدلہ نہیں لے سکتا۔ میں کسی ہندو کو قتل نہیں کر سکتا لیکن ہر وہ کام ضرور کرتا ہوں جس سے ہندوؤں کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اگر تم مجھ پر اعتبار کرو تو میں تمہیں کچھ دن چھپا کر رکھوں گا اور ایسی جگہ رکھوں گا کہ یہاں کی پولیس کو تمہاری مشک بھی نہیں ملے گی.... اگر زخم کی مرہم پٹی خود کر سکتے ہو تو سارا سامان لا دوں گا"۔

"مرہم پٹی بعد کی بات ہے" — صغیر نے کہا — "پہلے تو یہ دیکھنا ہے کہ تمہارے گاؤں میں مَیں کتنے دن چھپ کر رہ سکتا ہوں"۔

"میرے گاؤں میں صرف دو گھر ہندوؤں کے ہیں" — تانگے والے نے کہا —

"باقی سب مسلمان ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ سب غریب سے کسان ہیں یا محنت مزدوری کر کے بال بچوں کا پیٹ پالتے ہیں"۔

رحمو تانگے والے نے تانگہ چلا دیا اور گاؤں کے باہر ایک گھر کے سامنے رک گیا۔ اُس نے صغیر کو بتایا کہ یہ اُس کا گھر ہے۔ وہ اترا اور صغیر کو بھی تانگے سے اتارا۔ دروازہ دستک کے بغیر ہی کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والی اس کی بیوی تھی جس نے تانگے کی آواز پر دروازہ کھول دیا تھا۔

○

رحمو تانگے والے کے اس کچے سے مکان کے تین کمرے تھے اور ایک کمرہ گھوڑی کے لئے تھا۔ وہ صغیر کو اندر لے گیا اور ایک کمرے میں جا کر بٹھایا۔ بیوی کھانا گرم کرنے کے لئے رسوئی میں چلی گئی۔ رحمو بھی اُس کے پاس جا بیٹھا۔

"میری ایک بات اچھی طرح سُن لو شادو!" — رحمو نے اپنی بیوی سے کہا — "یہ آدمی جو میرے ساتھ آیا ہے میرا بڑا پُرانا یار ہے۔ جالندھر سے آیا ہے اور وہیں کا رہنے والا ہے"۔

"مسلمان ہے؟" — شادو نے پوچھا۔

"کبھی کسی ہندو یا سکھ کو ساتھ لایا ہوں؟" — رحمو نے رعب دار سی آواز میں کہا — "مسلمان ہے اور بڑا پکا مسلمان ہے"۔

"تم جیسا ہی پکا مسلمان ہو گا" — شادو نے بے تکلفی کے لہجے میں کہا — "مولوی تو ہو نہیں سکتا۔ مجھے یہ بتا دو کہ کوئی مشتبہ تو نہیں؟ کل پولیس پہنچی ہوئی ہو اور مجھے بھی باندھ کے لے جائے"۔

"پوری بات تو سن لے نیک بخت!" — رحمو نے کہا — "مشتبہ تو ہے لیکن چور اُچکا نہیں' نہ شرابی کبابی ہے' ڈکیت اور بدمعاش بھی نہیں' جالندھر میں اس کا کسی کے ساتھ جھگڑا ہو گیا تھا تو ہندوؤں نے اکٹھے ہو کر اس کے خلاف کوئی پھڈا بنا دیا اور اس کی گرفتاری کا بندوبست کر دیا۔ یہ بیچارہ شریف آدمی وہاں سے بھاگ آیا اور مجھے مل گیا"۔

"تمہارے ساتھ اس کی دوستی کب سے ہے؟" — شادو نے پوچھا۔

"میں تو اِسے جانتا بھی نہیں" — رحمو نے جواب دیا — "مجھے راستے میں مل گیا

اور میں نے اِسے سواری سمجھ کر تانگے میں بٹھا لیا تب اس نے بتایا کہ اس پر واردات گزری ہے۔ ہندوؤں نے وہاں جالندھر میں اسے مارا پیٹا تھا۔ ایک چاقو اس کی ران میں لگا ہے اور یہ زخم خاصا گہرا ہے۔ اگر یہ مسلمان نہ ہوتا تو میں اسے گھر نہ لاتا لیکن یہ کچھ دن جالندھر سے دور رہنا چاہتا ہے۔ خیال رکھنا کہ اسے یہاں کوئی دیکھ نہ سکے۔ اگر کوئی دیکھے بھی تو اسے یہ پتہ نہ چلے کہ یہ کوئی اجنبی ہے۔ کوئی پوچھے تو بتانا کہ رحمو کا کوئی دوست ہے"۔

رحمو تانگے والے کی بیوی بظاہر غریب اور سیدھی سادی سی تھی لیکن عقل اور ہوش والی تھی اور تیز طرار بھی تھی۔ گاؤں میں لوگ رحمو کی عزت اس لئے کرتے تھے کہ اس کا اٹھنا بیٹھنا بدمعاشوں کے ساتھ تھا اور سب جانتے تھے کہ ڈاکوؤں اور رہزنوں کے ساتھ بھی اس کا دوستانہ ہے اور یہ بھی مشہور تھا کہ وہ پولیس کا مخبر بھی ہے۔ اس کے اس رعب کی وجہ سے اس کی بیوی کی بھی لوگ عزت کرتے تھے اور بیوی سینہ تان کر گاؤں میں گھومتی پھرتی تھی۔ ان کے تین بچے بھی تھے۔ سب سے بڑے بچے کی عمر پندرہ سولہ سال تھی جو لڑکا تھا۔ اس سے چھوٹی دو بہنیں تھیں۔ رحمو کو اپنی بیوی پر اعتماد تھا۔ وہ دھوکہ دینے والی عورت نہیں تھی۔

رحمو بیوی کو صغیر کے متعلق بتا کر صغیر کے پاس گیا اور اسے بتا دیا کہ اس نے اپنی بیوی کے آگے کیا جھوٹ بولا ہے اور صغیر بھی یہی جھوٹ اپنے ذہن میں رکھے اور شادو کو پتہ نہ چلنے دے کہ وہ پاکستانی ہے۔

شادو دونوں کے لئے کھانا لے آئی اور ان کے آگے رکھا۔ کھانے کے بعد سب سو گئے۔

علی الصبح رحمو حسب معمول تانگہ لے کر نکل گیا۔ صغیر ابھی سویا ہوا تھا۔ وہ رات بھر کا تھکا ہوا تھا۔ اس کی آنکھ اس وقت کھلی جب سورج بہت اوپر آ گیا تھا۔ شادو نے اس کے آگے ناشتہ رکھا۔

"جالندھر سے آئے ہو؟" — شادو نے صغیر سے پوچھا۔

"ہاں!" — صغیر نے جواب دیا اور پوچھا — "کیا رحمو نے تمہیں میرے متعلق سب کچھ بتا دیا ہے؟"

"ہاں" — شادو نے جواب دیا — "اس نے سب کچھ بتا دیا ہے.... تم بے غم رہو

کسی کو پتہ نہیں چلے گا۔ ہم ان ہندوؤں کا تو کچھ نہیں بگاڑ سکتے لیکن تمہیں کچھ دنوں کے لئے یہاں چھپا کر ان سے بچا سکتے ہیں۔ اب یہ تم سوچ لو کہ تم نے واپس ان ہندوؤں میں ہی جانا ہے وہ پھر تمہارے پیچھے پڑ جائیں گے"۔

"اللہ مالک ہے بہن!" — صغیر نے کہا — "وہاں کچھ لوگ میرے دشمن کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اُمید ہے دو چار دن تک اُن کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا"۔

"ہم بھی ہندوؤں کے ستائے ہوئے ہیں" — شادو نے کہا — "رحمو کا کوئی بھروسہ نہیں لیکن زبان کا بڑا پکا ہے۔ کسی مسلمان کو دھوکا نہیں دیتا"۔

○

صغیر نے سارا دن گھر کے اندر ہی گزارا۔ شادو نے باہر والے دروازے کی اندر سے زنجیر چڑھا دی تھی تاکہ کوئی آئے تو دروازہ کھلنے تک صغیر کمرے میں چلا جائے۔

رحمو کا بڑا بیٹا کچھ دیر صغیر کے پاس بیٹھا رہا۔ یہ لڑکا گاؤں سے تقریباً تین میل دور نویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ صغیر نے یہ چیک کیا کہ لڑکا باپ کی طرح پکا ہے یا اس کی ذہانت اور فطرت کچھ مختلف ہے۔ صغیر کو یہ دیکھ کر بڑا اطمینان ہوا کہ لڑکے کے خیالات باپ جیسے ہی تھے۔ لڑکے نے صغیر کو بتایا کہ رحمو نے اسے یہ سبق دے رکھا ہے کہ ہندو پر کبھی اعتبار نہ کرنا اور ہندو مسلمان کا بدترین دشمن ہے۔

رات کو رحمو معمول سے خاصا پہلے واپس آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں مرہم پٹی کا سامان تھا جو اس نے صغیر کو دیا۔ صغیر نے پٹی کھولی اور اپنا زخم دیکھا۔ زخم خراب تو نہیں ہوا تھا لیکن کچھ بہتر بھی نہیں تھا۔ رحمو جو دوائی لایا تھا وہ ایک ٹیوب میں تھی۔ صغیر نے اس ٹیوب سے دوائی نکال کر زخم پر لگائی اور پٹی باندھ دی اس سے اسے درد میں خاصا افاقہ ہُوا۔

"اب مجھے یہاں سے نکلنے کا کوئی بندوبست کرو رحمو!" — صغیر نے کہا — "کسی طرح مجھے امرتسر تک پہنچا دو آگے میں خود چلا جاؤں گا"۔

"بھیجنے کو تو میں تمہیں کل بھیج سکتا ہوں" — رحمو نے کہا — "میں یہاں سے تمہیں تانگے میں بٹھا کر ریل گاڑی یا بس پر سوار کرا سکتا ہوں لیکن پکڑے جانے کا خطرہ ساتھ ساتھ لگا رہے گا۔ سوچ لو' چیکنگ ایسی بھی تو نہیں ہوتی کہ جگہ جگہ ہر مسافر کو

دیکھتے ہوں"۔

رحمو اس خیال کے پیش نظر ریل یا بس سے سفر کا مشورہ دے رہا تھا کہ صغیر کے متعلق وہ یہی یقین کر چکا تھا کہ یہ پاکستانی ہے اور غیر قانونی طور پر یہاں آیا ہے۔ یہ صرف صغیر جانتا تھا کہ وہ مفرور ہے اور انڈین انٹیلی جنس یقیناً اسے ڈھونڈ رہی ہو گی اور انٹیلی جنس نے سب سے پہلا انتظام یہ کیا ہو گا کہ بارڈر سیکورٹی فورس اور پولیس وغیرہ کو اس کا حلیہ دے کر چوکنا کر دیا ہو گا۔ صغیر انٹیلی جنس کا آدمی تھا۔ اسے معلوم تھا کہ انٹیلی جنس کے آدمیوں کی نظریں کتنی تیز ہوتی ہیں۔ وہ اندھا دھند سرحد کی طرف جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اس کی سب سے بڑی پہچان یہ تھی کہ اس کی ران زخمی تھی اور وہ لنگڑا کر چلتا تھا۔ یہ ایسی نشانی تھی جس سے وہ دور سے پہچانا جا سکتا تھا۔

"مجھے زخم ٹھیک ہونے تک انتظار کرنا چاہئے" — صغیر نے رحمو سے کہا — "ایسا نہ ہو کہ میں کہیں چلنے سے معذور ہو جاؤں اور پکڑا جاؤں"۔

"میں تمہیں گھر سے نکال تو نہیں رہا" — رحمو نے کہا — "تم ٹھیک ہونے تک یہیں رہو' البتہ احتیاط لازمی ہے"۔

○

اصل ضرورت احتیاط کی ہی تھی لیکن احتیاط نہ ہو سکی۔ وجہ یہ ہوئی کہ رحمو کی دو بچیاں بھی تھیں۔ انہوں نے معصومیت میں باہر بچوں کو بتا دیا کہ ان کے گھر ایک مہمان آیا ہوا ہے جو سارا دن گھر میں ہی رہتا ہے۔ صغیر کو اس گھر میں آئے تیسرا دن تھا جب پہلی عورت نے رحمو کی بیوی شادو سے پوچھا کہ اس کے گھر میں کون مہمان آیا ہوا ہے۔ شادو کے لئے جواب دینا مشکل ہو گیا۔ اس نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ رحمو کا ایک دوست ہے۔

دو دن اور گزرے تو ایک عورت نے جو شادو کی گہری سہیلی تھی شادو سے پوچھا کہ اس کے گھر کون مہمان آیا ہوا ہے جو دن رات اندر بیٹھا رہتا ہے۔

"رحمو کا دوست ہے اور کچھ بیمار ہے" — شادو نے کہا — "ایک دو دن بعد چلا جائے گا"۔

"دیکھ شادو!" — اس عورت نے کہا — "گاؤں کا معاملہ ہے' لوگ بات کا بتنگڑ بنا

لیتے ہیں۔ گاؤں کی عورتوں نے طرح طرح کی باتیں کرنی شروع کر دی ہیں۔ اگر یہ مہمان رحمو کا دوست ہے تو ایک کمرے میں بند نہیں رہنا چاہئے۔ تم یہ بھی جانتی ہو کہ رحمو کی شہرت اچھی نہیں اور اس کا یارانہ اُلٹے سیدھے لوگوں کے ساتھ ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ رحمو کا یہ دوست کہیں کوئی واردات کر کے آیا ہو اور پولیس اس کے پیچھے ہو۔ تم جانتی ہو مجرم کو پناہ دینا جرم ہے جس کی سزا ملتی ہے"۔

اُسی رات رحمو گھر آیا تو شادو نے اسے بتایا کہ گاؤں کے لوگوں نے ان کے مہمان پر شک کرنا شروع کر دیا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک دن پولیس کا چھاپہ پڑ جائے۔

رحمو کے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ گاؤں کے دو آدمیوں نے اس سے بھی پوچھا تھا کہ تمہارا یہ مہمان کون ہے' کہاں سے آیا ہے اور باہر کیوں نہیں نکلتا۔ رحمو ہر کسی کے آگے جھوٹ بولتا رہا لیکن اس نے محسوس کر لیا کہ صغیر کو وہ زیادہ دن اپنے گھر میں نہیں رکھ سکے گا۔

صغیر نے رحمو کو اپنا نام اکبر علی بتایا تھا۔

"اکبر بھائی!" — ایک رات رحمو نے صغیر سے کہا — "گاؤں میں تمہارا رہنا مشکوک سا ہو گیا ہے۔ میری بچیوں نے کہیں باہر بچوں کو بتا دیا ہے کہ ہمارے ہاں ایک مہمان آیا ہے جو ایک کمرے میں بند رہتا ہے۔ گاؤں میں ہندوؤں کے دو ہی گھر ہیں لیکن یوں سمجھو کہ گاؤں میں اُنہی کی بادشاہی ہے۔ وہ تو جیسے یہی دیکھتے رہتے ہیں کہ مسلمان کوئی اُلٹی سیدھی حرکت کریں تو پولیس کو جھوٹ مُوٹ کی رپورٹ دے کر انہیں پریشان کریں"۔

"تو پھر میں یہاں سے چلا جاؤں؟" — صغیر نے پوچھا اور جواب کا انتظار کئے بغیر کہنے لگا — "میں چلا ہی جاؤں تو اچھا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے یہاں کسی مسلمان کو ذرا سی بھی تکلیف پہنچے"۔

"میں نے تمہارے چلے جانے کی بات تو نہیں کی" — رحمو نے کہا — "تمہیں پناہ میں رکھنے کے لئے میرے پاس اور جگہ بھی نہیں۔ خدا کی قسم اکبر! میں تمہیں اپنے خدا کی امانت سمجھتا ہوں۔ تم اس پاکستان کے رہنے والے ہو جس پاکستان کے نام پر میرا پورا خاندان قتل کر دیا گیا تھا۔ اگر اس پاکستان کے لئے مجھے اپنی جان دینی پڑے تو میں جان دے دوں گا"۔

رحمو جذباتی سے انداز میں بولتا جارہا تھا اور صغیر اپنے خیالوں میں کھو گیا تھا۔ اسے اپنے آپ سے شرمساری سی محسوس ہونے لگی تھی۔ ایک یہ چرسی اور رافیمی تانگے والا تھا جو اپنی زبان سے کہتا تھا کہ میں شریف آدمی نہیں لیکن پاکستان کے نام پر وہ اپنی جان بھی قربان کرنے کو تیار تھا۔ ایک وہ خود تھا کہ جس پاکستان نے اسے پالا پوسا، تعلیم دی، عزت اور آبرو دی، وہ اس پاکستان کی جڑیں کھوکھلی کرنے کے لئے دشمن کا جاسوس بن گیا۔ اسے افسوس ہونے لگا کہ اس نے محض روپے پیسے کی خاطر پاکستان میں تخریب کاری کی تین چار وارداتیں کی تھیں اور انڈیا کو کچھ راز بھی دیئے تھے۔

صغیر کا دل ایسا بھر آیا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے جو اس نے منہ پھیر کر ہاتھ سے پونچھ ڈالے۔ اچانک اسے خیال آ گیا کہ وہ اب صراطِ مستقیم پر آ گیا ہے اور وہ گناہوں کا کفارہ ادا کرے گا۔ اسے ڈاکٹر عبدالرشید یاد آیا جس نے پاکستان کی خاطر اپنے پورے خاندان کی عزت و آبرو کو خطرے میں ڈال کر اسے فرار میں مدد دی تھی۔

"میں گناہوں کا کفّارہ ادا کروں گا" — صغیر کو اپنے ضمیر کی آواز سنائی دی جو رحمو تانگے والے کے کانوں تک نہیں پہنچ سکتی تھی" — "میں پاکستان کے نام پر اپنا آپ قربان کر دوں گا لیکن اس سے پہلے پاکستان کے جتنے بھی دشمنوں کو قتل کر سکا کروں گا اور پاکستان پہنچ کر ان تمام ہندوستانی جاسوسوں کو پکڑواؤں گا جو پاکستان کے اندر بیٹھے پاکستان کی جڑیں کاٹ رہے ہیں"۔

یہ اس کی اپنی روح یا اپنے ضمیر کی آوازیں تھیں جنہوں نے اسے نہ صرف یہ کہ زندہ و بیدار کر دیا بلکہ اسے ایک ایسی روحانی قوت دی جس سے وہ پہلے ناآشنا تھا۔ اس کی مجبوری یا کمزوری یہ تھی کہ وہ اونچے درجے کا یا افسری سطح کا جاسوس نہیں تھا۔ وہ ایک بہت بڑی اور پیچیدہ مشینری کا معمولی سا پرزہ تھا۔ ایسا کوئی پرزہ بگڑ جاتا ہے تو اسے مشین سے نکال کر پھینک دیا جاتا ہے اور اس کی جگہ نیا پرزہ فٹ کر دیا جاتا ہے۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ انٹیلی جنس کے اندرونی حلقوں میں اور بالائی سطح پر کیا ہوتا ہے پھر بھی جس حد تک اس کی عقل پہنچتی تھی، اس نے تہیّہ کر لیا کہ پوری جوابی کارروائی کرے گا۔

بہت دنوں تک وہ اس ملک سے نکل نہیں سکتا تھا۔ اس کی ایک مجبوری تو اس کی ٹانگ کا زخم تھا۔ زخم بھی ایسا جو ایک طرف سے دوسری طرف تک چلا گیا تھا۔ دوسری

وجہ یہ تھی کہ وہ جانتا تھا کہ انڈین انٹیلی جنس نے سرحد پر سب کو چوکنّا کر دیا ہوگا اور بہت دنوں تک وہ سرحد پار نہیں کر سکے گا۔ راستہ صاف ہونے تک اسے انڈیا میں ہی چھپے رہنا تھا۔ اگر اس کی ٹانگ زخمی نہ ہوتی تو وہ آبادیوں سے دور دور جنگلوں بیابانوں میں پیدل ہی چلتا چلا جاتا اور ایک نہ ایک دن سرحد تک پہنچ جاتا۔ بہرحال اس نے قوتِ ارادی کو ایسا بیدار کیا کہ اس کے زخم کا درد کم ہو گیا اور وہ ہر خطرے کا سامنا کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔

"رحمو بھائی!" — صغیر نے کہا — "تم میرے بڑے بھائی ہو۔ چھوٹے چھوٹے تمہارے بچے ہیں اور تمہاری آمدنی بھی میں جانتا ہوں کتنی ہوگی۔ مجھ سے کچھ پیسے لے لو" — صغیر نے جیب میں سے بٹوہ نکالا۔

"میزبان مہمانوں کے منہ پر تھوکا تو نہیں کرتے" — رحمو نے اس کے بٹوے والے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا — "تم نے مجھے بڑا بھائی کہا ہے۔ کیا بڑا بھائی چھوٹے بھائی سے پیسے لے گا؟.... میں گناہگار ہوں اکبر بھائی! پاپی ہوں میں۔ مجھے یہ ایک نیکی تو کر لینے دو۔ یہ اللہ کی مرضی ہے مجھے بخشے چاہے نہ بخشے، مجھے اپنی روح کو کچھ تو تسکین دینے دو۔ ان پیسوں کی مجھے نہیں تمہیں ضرورت پڑے گی۔ میں تمہیں ایک جگہ لے جا رہا ہوں۔ وہاں تک کوئی نہیں پہنچ سکے گا سوائے میرے۔ میں وہاں تمہاری خبر لیتا رہوں گا لیکن یہ سوچ لو کہ تم اس جگہ ٹھہر سکو گے یا نہیں؟"

"کیسی ہے وہ جگہ جہاں میں ٹھہر نہیں سکوں گا؟" — صغیر نے پوچھا — "کیا تم مجھے کوئی شہزادہ یا نواب زادہ سمجھتے ہو؟ مجھے کسی جھگی میں رکھو گے نا؟"

"نہیں اکبر!" — رحمو نے کہا — "میں تمہیں طوائفوں کے ٹھکانے پر رکھوں گا۔ وہ میری اپنی جگہ ہے۔ تم شاید وہاں نہ رہنا چاہو لیکن اس سے بہتر مجھے کوئی اور جگہ نظر نہیں آتی۔ یہ نہ سمجھنا کہ وہ کنجر ہیں اور تمہیں دھوکہ دیں گے۔ ایسا نہیں ہوگا"۔

"کنجروں کے ساتھ تمہارا تعلق ہے؟"

"یہ بھی میری روزی کا ایک ذریعہ ہے" — رحمو نے کہا — "تم سمجھتے ہو گے کہ میری آمدنی تھوڑی ہے۔ تم ٹھیک سمجھتے ہو۔ یہ مرّیل سی گھوڑی میرے بچوں کو صرف روٹی کھلا سکتی ہے، اس کے بعد میری آمدنی حرام کی ہے جو بہت ہے۔ اس گاؤں میں سارے مقروض ہوں گے، میں نے کسی کا ایک پیسہ نہیں دینا۔ دل کھلا رکھا ہوا ہے۔

کسی حاجت مند مسلمان کو دیکھتا ہوں تو اپنی ہمت اور توفیق کے مطابق اس کی مالی امداد ضرور کرتا ہوں .... میں جن کنجروں کی بات کر رہا ہوں یہ کوئی عام قسم کے عصمت فروش نہیں۔ ان کے پاس اعلیٰ درجے کی دو لڑکیاں ہیں۔ دونوں بہنیں ہیں۔ ان کے گاہک نواب زادے اور جاگیردار ہیں اور وہ بھی کوئی زیادہ نہیں۔ اگر تم ان لڑکیوں کو باہر کہیں دیکھو تو یقین نہ کرو کہ یہ پیشہ کرتی ہیں۔ اس طرح دو اور آدمی ہیں جن کا پیشہ ہی یہی ہے۔ میں ان کے لئے امیر کبیر گاہک پھانس کر ان کے حوالے کرتا ہوں اور اس کی مجھے کمیشن مل جاتی ہے۔ کبھی کبھار کوئی نامی گرامی ڈاکو آ نکلتا ہے تو اسے رات دو رات اپنے پاس رکھ لیتا ہوں۔ وہ بھی جاتے جاتے کچھ دے جاتا ہے۔ دو مرتبہ ایک ڈاکو کے ساتھ ڈکیتی کی وارداتیں بھی کی ہیں .... لیکن اکبر بھائی دل میں کبھی میل نہیں رکھی۔ میں تمہارے دل کی خوشی کے لئے نہیں بلکہ اپنی روح کی خوشی کے لئے کہہ رہا ہوں کہ پاکستان کا نام دل میں آتا ہے تو ایسے لگتا ہے جیسے خانہ کعبہ یاد آ گیا ہو۔ احترام اور پیار کی ایک لہر اٹھتی ہے پھر اپنے ہی دل سے ایک آواز آتی ہے' رحمو! پاکستان پاک لوگوں کا ملک ہے' تجھ جیسے گناہگاروں کا وہاں کیا کام!"

صغیر رحمو کے مُنہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ رحمو نے جب پاکستان کو کعبہ و قبلہ سے وابستہ کر دیا اور جب یہ کہا کہ پاکستان پاک لوگوں کا ملک ہے تو صغیر کے دل سے ہوک سی اٹھی۔ کچھ دیر کے لئے تو اسے ایسے لگا جیسے اسے ہارٹ اٹیک ہو گیا ہو۔ اسے خیال آیا کہ اس پاک ملک کو اس ملک کے اپنے ہی حکمرانوں نے اور لوگوں نے کس قدر ناپاک کر دیا ہے۔ وہ ملک جسے رحمو پاک لوگوں کا ملک کہہ رہا تھا' مجھ جیسے ناپاک لوگوں کا ملک بنتا جا رہا ہے۔ صغیر نے اپنے آپ کو معاف نہ کیا اس نے سوچا کہ وہ خود بھی کس قدر ناپاک ہے .... اسے رحمو کی سادگی پر دکھ سا ہوا۔ اسے خیال آیا کہ وہ رحمو سے کہے کہ عصمت فروشی' ڈکیتی' راہ زنی اور بدمعاشی ہی کرنی ہے تو میرے ساتھ پاکستان چلے چلو۔ وہاں کی مٹی ان جرائم کے لئے بڑی زرخیز ہے لیکن وہ اپنے دشمن ملک میں بیٹھ کر اپنے ملک کی توہین کرنے سے گریز کر رہا تھا۔ اس کے سینے میں وہ ایمان بیدار ہو گیا تھا جسے اس نے بیچ ڈالا تھا۔

انسان بِک جایا کرتے ہیں۔ ایمان نہیں بکا کرتا۔

ایمان میں اتنی طاقت ہے کہ وہ اُٹھتا ہے اور ایمان فروشوں کے مُنہ نوچ کر اپنی

طاقت منوا لیتا ہے۔

"ہاں رحمو!" — صغیر نے کہا — جہاں لے جاؤ گے وہاں رہوں گا.... لیکن بھروسہ میں صرف تم پر کروں گا"۔

"بھروسہ اللہ کا!" — رحمو نے کہا — "میں تمہارے لئے اللہ کا سبب بنا ہوں اور اپنی ذمہ داری آخر دم تک نبھاؤں گا"۔

○

اگلا سارا دن صغیر اسی گھر میں رہا۔ سورج غروب ہو گیا پھر اندھیرا گہرا ہو گیا تو رحمو آ گیا۔ اُس کے گھوڑے اور تانگے کی آواز نہ آئی۔ رحمو پہلے اپنی بیوی کے پاس گیا اور اپنے بڑے بیٹے کو بھی وہاں بلا لیا۔

"دونوں بڑی غور سے سن لو" — رحمو نے کہا — "میں مہمان کو لے جا رہا ہوں۔ تانگہ گاؤں سے دور کھڑا کر آیا ہوں۔ کبھی کوئی پوچھ بیٹھے کہ یہاں کوئی مہمان آیا تھا تو کہنا کہ رحمو کا ایک دوست تھا جو ایک رات رہ کر چلا گیا ہے۔ کوئی اس کا نام پوچھے تو کہنا کہ نام شاید حمید تھا.... میں اکبر کو لے جا رہا ہوں۔ رات کچھ دیر سے آؤں گا۔ تم ذرا کھانا کھلا دو"۔

رحمو صغیر کے پاس جا بیٹھا اور اُسے بتایا کہ وہ اُسے نئے ٹھکانے پر لے جا رہا ہے اور اسے یہ بھی بتایا کہ وہ جہاں اسے لے جا رہا ہے وہ کیسے لوگ ہیں اور صغیر کو وہاں کس طرح رہنا پڑے گا۔

"ایک بات بتاؤ رحمو!" — صغیر نے پوچھا — "تمہارا تو پاکستان کے ساتھ کچھ تعلق بنتا ہے اس لئے تم میری مدد کر رہے ہو' میں حیران ہوں کہ جن لوگوں کے پاس مجھے لے جا رہے ہو ان کا تو کوئی دین اور مذہب ہوتا ہی نہیں۔ وہ تمہاری طرح مجھے اللہ کی امانت کیوں سمجھیں گے!"

"اوہ اکبر بھائی!" — رحمو نے صغیر کی ران پر ہاتھ مار کر اور مُسکراتے ہوئے کہا — "میرے ساتھ ہیرا پھیری کر کے وہ جائیں گے کہاں۔ خدا کی قسم ان کی لڑکیوں کو نچوا دوں۔ ان کی دُکھتی رگیں میرے ہاتھ میں ہیں.... یہ کوئی اور ہی دنیا ہے جسے میں سمجھتا ہوں تم نہیں سمجھ سکتے۔ تم بے فکر ہو کر چلے چلو"۔

کھانے کے بعد رحمو صغیر کو اپنے ساتھ باہر لے گیا۔ دن بھر کے تھکے ہارے لوگ

گہری نیند سو گئے تھے۔ صرف دو کتے تھے جو بیدار تھے۔ وہ رحمو کو پہچانتے تھے اس لئے
بھونکے نہیں۔ رحمو اور صغیر بڑے اطمینان سے اُن کے قریب سے گزر گئے۔ صغیر
آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ وہ گاؤں سے کچھ دور نکل گئے۔ آگے تانگہ کھڑا تھا۔ وہ تانگے
میں بیٹھے اور تانگہ شہر کی جانب چل پڑا۔

○

خوش قسمتی سے موسم سردیوں کا تھا جس سے صغیر نے اپنے اوپر ایک کھیس
لے رکھا تھا۔ یہ رحمو کا انتظام تھا۔ گاؤں سے شہر تک تو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ خطرہ شہر کے
اندر تھا جہاں کی سڑکیں اور گلیاں روشن تھیں اور لوگ ابھی گھوم پھر رہے تھے۔

تانگہ شہر میں داخل ہُوا تو صغیر نے کھیس سر پر لے کر بکل ماری اور پھر تانگہ اُس
بازار میں داخل ہوا جس کی راتیں دن سے زیادہ روشن ہوتی ہیں۔ رحمو نے اس علاقے
کے قریب تانگوں کے اڈے پر تانگہ کھڑا کیا اور صغیر کو ساتھ لے کر پیدل چل پڑا۔ وہ
ایک گلی میں داخل ہو گئے جس کے دونوں طرف دروازوں میں اپنے سامنے سو سو اور
دو دو سو کے بلب یا ٹیوبیں روشن کئے طوائفیں کرسیوں پر بیٹھی تھیں۔ گلی میں تماش
بینوں کا ایک ہجوم رواں دواں تھا۔

اس گلی سے گزر کر آگے ایک کشادہ گلی آگئی جو کچھ تاریک تھی۔ اس گلی میں
اچھی قسم کے مکان تھے جن میں زیادہ تر دو منزلہ تھے۔ رحمو ایک مکان کے دروازے
میں داخل ہو گیا۔ اس نے صغیر سے کہا کہ وہ اس کے پیچھے پیچھے آئے۔

کسی مکان سے گانے بجانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ گھنگرو بھی بج رہے تھے۔
مکان کے اندر ایک صحن تھا اور اس کے اردگرد برآمدہ اور کمرے تھے۔ مکان اتنا اچھا
اور صاف ستھرا تھا کہ یہ کسی دولت مند کا مکان معلوم ہوتا تھا۔ رحمو نے کسی کو آواز
دی۔

ایک کمرے سے ایک ادھیڑ عمر آدمی نکلا۔

"آ بھئی رحمو!" — اس آدمی نے رحمو کی طرف آتے ہوئے اور ہاتھ آگے
بڑھاتے ہوئے کہا — "تم آگئے..... آجاؤ..... اچھا یہ ہیں وہ صاحب!"

اس آدمی نے رحمو اور صغیر کے ساتھ ہاتھ ملایا اور انہیں ایک کمرے میں لے گیا۔

"تمہیں سب کچھ بتا دیا ہے؟" — رحمو نے اس آدمی سے کہا — "یہ بیچارہ ذرا

تھا۔ میں نے اسے تسلّی دے دی"۔

"ڈرنے کی کیا بات ہے یار!" — اس آدمی نے صغیر سے کہا — "جتنا عرصہ چاہو
یہاں رہو۔ ہم نے تو رحمو بھائی کا حکم ماننا ہے"۔

"اور سناؤ" — رحمو نے اس آدمی سے پوچھا — "کیسا چل رہا ہے؟"

"تم تو جانتے ہی ہو" — اس آدمی نے جواب دیا — چھوٹی کو چلانا مشکل ہو رہا
ہے"۔

"ابھی چھوٹی ہے نا" — رحمو نے کہا — "چل پڑے گی"۔

"یہ کیا معاملہ ہے؟" — صغیر نے پوچھا۔

"نہ بھائی!" — رحمو نے کہا — "تم اس دُنیا کے معاملے نہیں سمجھ سکتے"۔

"بتاؤ تو سہی" — صغیر نے کہا — "شاید سمجھ لوں"۔

صغیر اس معاملے کو سمجھ چکا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ پاکستان کے معاملے میں
بیدار ہو گیا تھا اور اس نے اپنے آپ کو یہ یقین دلا لیا تھا کہ ہندو پاکستان کا سب سے بڑا
دشمن ہے اور اس نے اپنے متعلق تسلیم کر لیا تھا کہ وہ اس دشمن سے منہ مانگے پیسے
لے کر مادرِ وطن کی آبرو کو پامال کرتا رہا ہے۔ اس نے یہ بھی تسلیم کر لیا تھا کہ وہ ایمان
فروش بن چکا تھا۔ اس اعتراف اور پاکستانی ہونے کے احساس نے اسے سچا پاکستانی بنا دیا
تھا اور اس کے اندر یہ احساس بیدار ہو گیا تھا کہ وہ مسلمان ہے اور مسلمان کا شیوہ کچھ
اور ہوتا ہے' لیکن وہ یک لخت شریف آدمی یا مردِ مومن نہیں بن گیا تھا۔ وہ گناہوں
کے راستے پر چلا تھا تو وہ کون سا گناہ تھا جو اس نے نہیں کیا تھا۔ حرام کی کمائی اسے
گناہوں کی خوشنما وادی میں بہت دور تک لے گئی تھی۔ حرام کی کمائی سے کوئی مدرسے
اور مسجدیں نہیں بنایا کرتا۔

صغیر پکا شرابی بن گیا تھا۔ وہ اعلیٰ درجے کی طوائفوں کے ہاں جاتا تھا اور بازارِ حُسن
کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ عصمت فروشوں کی دنیا کے گوشے گوشے سے واقف تھا اور ان
کے کاروباری راز بھی جانتا تھا۔ رحمو اُسے کچھ اور سمجھا تھا لیکن صغیر کچھ اور تھا۔ رحمو
نے اسے جن لوگوں میں لا بٹھایا تھا ان لوگوں سے صغیر خوب واقف تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ
ان عصمت فروشوں کے پاس کوئی ایسی لڑکی ہے جو ان کے رستے پر نہیں آرہی۔

عصمت فروش دُنیا کے کسی بھی ملک میں ہوں' اُن کے مسائل' معاملے اور اندر

کے بھید ایک جیسے ہوتے ہیں۔ صغیر انبالہ کے بازارِ حسن میں جا بیٹھا تو اسے یوں لگا جیسے وہ لاہور کی ہیرامنڈی یا کراچی کی جاپانی روڈ کے علاقے میں بیٹھا ہو۔

"تم یہاں کی بات مت پوچھو اکبر بھائی!" — اس آدمی نے صغیر سے کہا۔ "ہمارے معاملے عام لوگوں کی سمجھ میں نہیں آیا کرتے"۔

"میں کچھ سوچ کر پوچھ رہا ہوں" — صغیر نے کہا — "میں نے کچھ دن یہاں (رہنا) ہے۔ ہو سکتا ہے یہ دن زیادہ لمبے ہو جائیں۔ میں سوچتا ہوں کہ تمہیں اور تو کچھ نہیں دے سکتا، تمہارے کسی کام آؤں"۔

"تم ضد کرتے ہو تو میں بتا دیتا ہوں" — اس آدمی نے کہا — "لیکن یہ تمہاری بس کی بات نہیں"۔

"سیدھی بات ہے بھائی!" — صغیر نے کہا — "تمہارے پاس کوئی لڑکی ہے (جو) چل نہیں رہی۔ مجھے بتاؤ۔ اس لڑکی کو میرے پاس بٹھا دو، شاید میں اِسے چلا لوں"۔

رحمو اور وہ آدمی ہنس پڑے۔

"میں نے یہاں سے بھاگ تو نہیں جانا" — صغیر نے کہا — "ایسا تو کوئی خطرہ نہیں کہ میں تمہاری لڑکی کو بھگا لے جاؤں گا۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں تمہارے کسی کام آؤں۔ میں باتیں کر سکتا ہوں.... کوشش ہے، کر کے دیکھتے ہیں"۔

کچھ دیر تک یہ تینوں اس مسئلے پر باتیں کرتے رہے۔ رحمو اور اس آدمی نے محسوس کیا کہ صغیر کوئی سیدھا سادا آدمی نہیں اور اس کے پاس زبان کا جادو ہے۔ صغیر نے ان دونوں پر اپنا اثر جمالیا اور اچھی خاصی بے تکلفی پیدا کرلی۔

اتنے میں باہر کوئی آدمی آ گیا جو اس جگہ کا مستقل گاہک ہی ہو سکتا تھا۔ رحمو کا دوست اُٹھ کر چلا گیا۔

"اکبر بھائی!" — رحمو نے کہا — "تم نے یہ بڑا اچھا کیا ہے کہ اِن لوگوں کے اِس مسئلے میں دلچسپی ظاہر کی ہے۔ میں جانتا ہوں تم ان کے کام نہیں آ سکتے لیکن یہ آدمی خوش ہو گیا ہے کہ تم کوئی گئے گزرے آدمی نہیں بلکہ تمہارے دل میں دوسروں کا درد بھی ہے"۔

"رحمو یار!" — صغیر نے کہا — "تم مجھے بتا دو کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ میں کچھ کر سکوں یا نہ کر سکوں، کم از کم ان کے دُکھ سکھ میں شریک ہو جاؤں گا اور یہ خوش رہیں

گے"۔

"بات یہ ہے اکبر بھائی!" — رحمو نے کہا — "یہاں دو لڑکیاں ہیں۔ یہ دونوں بہنیں ہیں اور دونوں مسلمان ہیں اور دونوں پاکستان کے پنجاب کی ہیں"۔

"پاکستان کے پنجاب کی؟" — صغیر نے چونک کر پوچھا — "کیا اِنہیں اُدھر سے اغوا کر کے لائے تھے؟"

"اُدھر سے نہیں" — رحمو نے جواب دیا — "ان دونوں کو 1971ء میں بنگالی بدمعاشوں نے ڈھاکہ سے اغوا کیا تھا۔ تم جانتے ہو کہ 71ء میں بنگالیوں کا جو خون مشرقی پاکستان میں بہایا گیا تھا وہ تو تم کبھی نہیں بھولو گے۔ تمہارا پاکستان آدھا رہ گیا ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ یہ قتل و غارت اور اغوا اور ساری تباہی بنگال کے ہندوؤں نے مچائی تھی اور یہ ہندو اِدھر سے گئے تھے۔ وہاں سے زیادہ تر بہاریوں کی لڑکیاں اغوا ہوئی تھیں اور انہیں کلکتہ میں لایا گیا تھا۔ ان میں کچھ تعداد پاکستان کے دوسرے صوبوں کی لڑکیوں کی بھی تھی۔ تم نے اخباروں میں پڑھا ہو گا کہ مشرقی بنگال سے اغوا کی ہوئی لڑکیوں کو کلکتہ لا کر بیچا گیا تھا۔ انڈیا کے بڑے بڑے بردہ فروش اور عصمت فروش کلکتہ پہنچ گئے تھے۔ اس جگہ جہاں ہم دونوں بیٹھے ہوئے ہیں پہلے چار اور عورتیں ہوتی تھیں جو بہت خوبصورت اور جوان تھیں پھر یہ دونوں بہنیں کلکتہ سے خرید کر یہاں لائی گئیں....

"بڑی بہن جس کی اب عمر ستائیس اٹھائیس سال ہے، یہاں آتے ہی چل پڑی تھی۔ ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے وہ پہلے ہی اس لائن پر چلی ہوئی تھی۔ میں جانتا ہوں کہ بڑے امیر گھر کی بیٹیاں ہیں اور یہ دونوں بہنیں بڑی آزاد خیال تھیں۔ چھوٹی بہن کی عمر اس وقت پندرہ سولہ سال تھی۔ اس نے اس جگہ کو قبول نہیں کیا اور نہ ہی اس عمر میں اسے اس لائن پر چلایا گیا۔ یہ اعلیٰ درجے کی عصمت فروش ہیں اور ان کے گاہک بڑے مالدار ہوتے ہیں۔ اب یہ چھوٹی لڑکی اٹھارہ اُنیس سال کی ہو گئی ہے۔ اس کے لئے پہلا گاہک تیار ہے لیکن یہ لڑکی نہیں مانتی۔ کہتی ہے خودکشی کر لوں گی یہ کام نہیں کروں گی۔ بڑی بہن نے بھی اسے بہت سمجھایا بجھایا ہے لیکن یہ نہیں مانتی....

"بڑی بہن کہتی ہے کہ اِسے کچھ عرصہ اور اِس ماحول میں رہنے دو خود ہی مان جائے گی۔ آج کل یہ لوگ اِسی چکر میں پڑے ہوئے ہیں۔ ویسے یہ لڑکی یہاں سے بھاگنے کی کوشش نہیں کرتی اور ٹھیک ٹھاک رہتی ہے۔ ایک مسلمان جاگیردار اس کی

بہت خواہش کرتا ہے۔ وہ اس جگہ کا مستقل گاہک ہے وہ تو یہاں تک کہتا ہے کہ وہ اِس
لڑکی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے' قیمت بتاؤ' وہ تو اس کے لئے اپنی آدھی جائیداد بیچنے
کو بھی تیار ہے"۔

رحمو ان دونوں بہنوں کے متعلق صغیر کو تفصیلات بتا رہا تھا لیکن صغیر اپنے خیالوں
میں نہ جانے کہاں پہنچ گیا تھا۔ وہ بالکل ہی گم صم ہو گیا تھا۔ شاید اُسے 1971ء کا المیہ یاد
آ گیا تھا۔ کمرے میں کوئی داخل ہُوا تو صغیر اپنے خیالوں سے یک لخت بیدار ہو گیا۔ اس
نے دروازے کی طرف دیکھا۔ دو بڑی خوبصورت لڑکیاں کمرے میں آ گئی تھیں۔

"یہ ہیں دونوں بہنیں" — رحمو نے صغیر سے کہا — بڑی شمیم ہے اور چھوٹی
نائلہ"۔

"ان صاحب کی تعریف؟" — شمیم نے رحمو سے پوچھا۔

"اپنے دوست ہیں" — رحمو نے اسے بتایا — "کچھ دن تمہارے پاس رہیں
گے"۔

صغیر کی نظریں نائلہ پر جم کے رہ گئی تھیں۔ وہ بہت ہی خوبصورت اور دلکش لڑکی
تھی۔ صغیر نے دونوں بہنوں کے چہروں کو اچھی طرح دیکھا۔ یوں تو شمیم بھی خوبصورت
تھی لیکن اس کے اور نائلہ کے چہرے میں جو فرق تھا وہ ایسے ہی تھا جیسے ایک ستارے
اور مصنوعی سیّارے میں ہوتا ہے۔ نائلہ کے چہرے پر معصومیت تھی اور شاید اسی لئے
وہ زیادہ خوبصورت لگتی تھی۔ شمیم نے ہلکا سا میک اَپ کر رکھا تھا اُس کی آنکھیں خاص
طور پر دلکش اور دلوں کو موہ لینے والی تھیں لیکن ان آنکھوں میں یہ تاثر بڑا نمایاں تھا
جیسے شیرنی اپنے شکار کو بھانپ رہی ہو۔

صغیر بھی شکل و صورت کے لحاظ سے خوبرو کہا جا سکتا تھا۔ وہ جواں سال آدمی تھا
وہ بھی اپنی آنکھوں سے شکار کو بھانپ لیتا تھا۔ اس کے سراپا میں ایک خاص قسم کی
دلکشی تھی۔ اُس نے نائلہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ نائلہ نے نظریں جھکا دیں
اور ایک بار پھر نظریں اُوپر کر کے صغیر کو دیکھا۔

"بیٹھ جاؤ" — صغیر نے آہستہ سے کہا۔

نائلہ ہونٹوں پر ہلکا سا تبسّم لئے صغیر کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی اور اس
کی بہن شمیم دوسرے صوفے پر بیٹھی۔

صغیر نائلہ کے چہرے سے کوشش کے باوجود نظریں نہ ہٹا سکا۔

دِینا ایک دو دنوں کے لئے اپنے والدین کے ہاں گئی ہوئی تھی۔ اُس نے عثمان
میں یہ تبدیلی دیکھی تھی کہ پہلے وہ عثمان سے کہتی تھی کہ امّی کے پاس جانا
چاہتی ہوں تو عثمان اُسے حیلے بہانے سے روکنے کی کوشش کرتا تھا مگر اب کراچی سے آ کر
عثمان کبھی کبھی اُسے کہہ دیتا تھا کہ جاؤ امّی سے مل آؤ۔ عثمان کو یہ نیا نکتہ سمجھا دیا گیا
تھا کہ دِینا کو اپنے ہاتھ میں رکھنا ہے اور کوئی ایسی حرکت نہ ہو جس سے دِینا کو ذرا سا بھی
شبہ ہو۔ عثمان کا دینا سے یہ کہنا کہ جاؤ امّی سے مل آؤ دِینا کو اچھا لگتا تھا۔ کراچی سے آ کر
پہلی بار وہ اپنے والدین کے ہاں گئی تھی۔

شام کے بعد اُس کے دونوں بھائی اختر اور امجد دِینا کے پاس بیٹھے تھے کہ گیٹ کی
گھنٹی بجی۔ نوکر نے بتایا کہ میجر سمیع اور کیپٹن آصف آئے ہیں۔ اختر اور امجد نوکر سے یہ
کہہ کر کہ انہیں ڈرائنگ روم میں بھیج دو' دِینا کو ساتھ لے کر ڈرائنگ روم میں چلے
گئے۔ سمیع اور آصف نے سب سے پہلے دِینا سے میجر عثمان کے متعلق پوچھا تو دِینا نے
بڑے خوشگوار لہجے میں جواب دیا کہ وہ کسی کام سے چلے گئے ہیں۔

جب سے میجر عثمان اور دِینا کراچی سے آئے تھے' میجر سمیع اور کیپٹن آصف دِینا
سے پہلی دفعہ مل رہے تھے۔

"آپ اتنے دن کہاں رہے سمیع بھائی!" — دِینا نے میجر سمیع سے پوچھا — "آپ
کو تو معلوم تھا کہ عثمان کی چھٹی کب ختم ہو رہی ہے"۔

"ہمارا بریگیڈ ایکسرسائز پر چلا گیا تھا" — میجر سمیع نے کہا — "آج دوپہر واپس
آئے ہیں اور سب سے پہلے اختر صاحب اور امجد صاحب سے ملنے آ گئے۔ معلوم نہیں
تھا کہ آپ بھی یہیں ہوں گی۔ یہاں سے اُٹھ کر آپ کے ہاں آنے کا ارادہ تھا.... کہئے

سیر کیسی رہی؟"

"یہ تو پوری فیملی سندھ میں اغوا ہو گئی تھی" — اختر نے کہا — "اللہ نے معجزہ کیا اور یہ بچ کے نکل آئے"۔

"وہ کیسے؟" — میجر سمیع نے صوفے سے اُچھلتے ہوئے پوچھا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ!" — کیپٹن آصف نے حیرت زدگی کے عالم میں پوچھا۔

وِینا نے اپنے اغوا کی پوری تفصیل سنائی۔

"اور بتاؤں کہ ہمیں رہائی کِس نے دلائی؟" — وِینا نے کہا — "لُوسی نے!"

میجر سمیع اور کیپٹن آصف کا ردِ عمل یہ تھا جیسے اُن کی آنکھوں کے ڈھیلے باہر آ جائیں گے۔ اُن کے مُنہ کُھل گئے تھے۔

"وہ وہاں کیسے پہنچ گئی؟" — میجر سمیع نے پوچھا۔

"عثمان نے مجھے بتایا تھا کہ لُوسی اندرون سندھ کی سیر کے لئے آئی تھی" — وِینا نے کہا — "میں نے دیکھا بھائی! وہاں لُوسی کا حکم چلتا تھا۔ اُس کے ایک اشارے پر ہمیں رہا کر دیا گیا اور لُوسی ہمیں کراچی لے گئی۔ ہم ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ لُوسی وہاں آتی رہی"۔

"کیا عثمان لُوسی کے ہاں جاتا رہا ہے؟" — کیپٹن آصف نے پوچھا۔

"ہاں!" — وِینا نے جواب دیا — "عثمان وہاں جاتا رہا ہے۔ میں تو کہتی ہوں کہ خداوند تعالیٰ نے عثمان کو جھٹکا دینے کے لئے ہمیں اغوا کرایا تھا اور ہمیں لوسی کی اصلیت دکھا دی۔ اندرون سندھ میں ان لوگوں میں لوسی کو دیکھ کر جو اغوا اور ڈکیتی کی وارداتیں کرتے ہیں، عثمان کیسے کہہ سکتا تھا کہ لوسی ایک شریف عورت ہے۔ خود لوسی اپنے متعلق کوئی جھوٹ نہیں بول سکتی تھی۔ اس کا اثر عثمان پر یہ ہُوا کہ اُس نے کہا کہ وہ لوسی کے ساتھ دوستی لگائے رکھے گا اور اُس کے پورے گروپ کو پکڑوائے گا۔ میں نے خود لوسی کے ساتھ بظاہر دوستانہ تعلق پیدا کر لیا تھا اور مَیں نے اُس پر ظاہر نہیں ہونے دیا کہ مَیں اُسے اپنا اور اپنے مُلک کا دشمن سمجھتی ہوں۔ یُوں سمجھیں کہ مَیں اُس کے سامنے بیوقوف بنی رہی۔ خود عثمان نے ایسا رویّہ اختیار کئے رکھا جیسے اُسے لوسی پر کسی قسم کا شک نہیں۔ مَیں تو بھائی جان! اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں کہ اس کی ذاتِ باری نے ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ عثمان مجھے واپس مل گیا ہے۔ اب پتہ چلتا ہے کہ وہ میرا

خاوند اور میرے بچوں کا باپ ہے"۔

"مَیں آپ کو ایک اور بات بتانا چاہتا ہوں سمیع صاحب!" — اختر نے کہا — "اس واقعہ کی تفصیل وِینا نے سنائی ہے۔ عثمان اس کے ساتھ ہی تھا۔ اس نے یہ واقعہ نہیں سنایا اور نہ کسی ردِ عمل کا اظہار کیا۔ ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے عثمان کو اس واقعہ کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں۔ ہمارے لئے تو یہ بہت بڑا اور بے حد خطرناک واقعہ ہے۔ میں نے میجر عثمان سے پوچھا کہ اُس نے اس کی رپورٹ اپنے کمانڈنگ آفیسر کو دی ہے یا نہیں۔ عثمان نے بالکل عام سے لہجے میں کہا کہ وہ یہ واقعہ کسی کو سنانا ہی نہیں چاہتا تھا کیونکہ وہ لوسی کے رِنگ کو کہیں اکٹھا کر کے پکڑوانے کا پلان بنا رہا تھا۔ عثمان کا انداز ایسا تھا جیسے اُسے اچھا نہ لگا ہو کہ وِینا نے یہ واقعہ سب کو سنا دیا ہے"۔

"عثمان ملے تو اس سے بات ہو گی" — میجر سمیع نے کہا — "یہ رپورٹ تو فوراً انٹیلی جنس کے پاس جانی چاہئے"۔

"وِینا بھابی!" — کیپٹن آصف نے پوچھا — "کیا اس وقت میجر عثمان گھر ہوں گے؟ اگر ہیں تو ہم ابھی اُن کے پاس جائیں گے"۔

"فون کر کے پوچھ لیتے ہیں" — وِینا نے کہا۔

"کیا فون یہاں آ سکتا ہے؟" — میجر سمیع نے پوچھا — "مَیں خود عثمان سے بات کرنا چاہتا ہوں"۔

ٹیلی فون ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ میجر سمیع نے عثمان کے گھر کا نمبر ملایا۔ رِنگ جاتی رہی اور کسی نے فون نہ اُٹھایا۔

"کہیں نکل گیا ہو گا" — وِینا نے کہا۔

"عثمان سے جلدی ملنا ضروری ہو گیا ہے" — کیپٹن آصف نے کہا۔

"بہت ضروری ہو گیا ہے" — میجر سمیع نے کہا — "میں حیران ہوں کہ عثمان کراچی کے رِنگ کو کِس طرح گرفتار کروائے گا!"

"مَیں ایک بات بتا دیتی ہوں" — وینا نے کہا — "عثمان مجھے کئی بار کہہ چکا ہے کہ اغوا کا واقعہ کسی کو نہ سنانا"۔

"بیوقوف آدمی ہے" — میجر سمیع نے کہا — "معلوم نہیں وہ کِس طرح اس رِنگ کو پکڑوا سکے گا"۔



اگلی شام میجر سمیع، کیپٹن آصف اور انٹیلی جنس کا میجر امتیاز عثمان کے گھر بیٹھے ہوئے تھے۔ وِینا وہاں نہ تھی۔ وہ اپنے والدین کے ہاں تھی۔ میجر سمیع کے کہنے پر عثمان اُنہیں اپنے اغوا کا اور لُوسی سے ملاقاتوں کا تمام تر واقعہ سنا چکا تھا۔

"میجر عثمان!" — امتیاز نے پوچھا — "آپ یہ بتائیں کہ اس رِنگ کو آپ کس طرح پکڑوانا چاہتے ہیں؟"

"میں تو یہ بھی پوچھنا چاہوں گا" — میجر سمیع نے کہا — "کہ تم خود ہی اس رِنگ کو کیوں پکڑوانا چاہتے ہو۔ یہ کام انٹیلی جنس کا ہے اور انٹیلی جنس والے ہی بہتر سمجھتے ہیں کہ کسی بھی رِنگ کو کس طرح توڑا جاتا ہے۔"

"اور دیکھیے میجر عثمان!" — میجر امتیاز نے کہا — "یہ آپ کا ذاتی کیس نہیں۔ یہ تو انٹیلی جنس کا کیس ہے۔ یہ ایسی بات تو نہیں کہ آپ کا کسی کے ساتھ لڑائی جھگڑا ہو گیا ہو تو آپ نے یہ ارادہ کر لیا کہ تھانے میں رپورٹ نہیں دوں گا اور خود انتقام لوں گا۔ کل آپ دس بجے ہمارے آفس میں آجائیں اور ہمارے چیف کو یہ سارا واقعہ سنائیں۔ یہ کوئی معمولی رِنگ نہیں۔ ذرا غور کریں۔ اس رِنگ کا رابطہ اور گہرا تعلق سندھ کے ڈاکوؤں اور رہزنوں کے ساتھ بھی ہے۔ ہم تو انہیں بھی پکڑنا چاہیں گے۔ ان کا تعلق انڈیا کے ساتھ ہے۔"

میجر عثمان کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ وہ تو خود اس رِنگ کا ایک اہم ممبر تھا۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں میجر امتیاز!" — میجر عثمان نے کہا — "اسے میری حماقت کہہ لیں، میں اسے اپنا ذاتی کیس سمجھ رہا ہوں اور میں خود انتقام لینا چاہتا ہوں۔"

"لیکن کیسے؟" — میجر سمیع نے پوچھا۔

عثمان کے سامنے کوئی پلان ہوتا تو وہ بتاتا۔ اسے خاموش دیکھ کر میجر امتیاز نے ایک بار پھر کہا کہ اگلے روز دس بجے عثمان انٹیلی جنس آفس میں پہنچ جائے۔



اگلے روز دس بجے عثمان انٹیلی جنس کے کرنل کے آفس میں بیٹھا ہُوا تھا۔ میجر امتیاز ساتھ تھا۔ کرنل کے کہنے پر میجر عثمان نے اپنے اور اپنی فیملی کے اغوا کا واقعہ سنایا۔ کرنل نے لُوسی کے متعلق پوچھنا شروع کر دیا۔

"سر!" — میجر عثمان نے کہا — "اس لڑکی کے ساتھ میری فرینڈشپ تھی۔ ذرا سا بھی شک نہیں ہوتا تھا کہ یہ جاسوس ہے۔"

"کیا تم اس کے گھر بھی جاتے رہے ہو؟"

"یس سَر!" — عثمان نے جواب دیا — "مَیں اس کے والدین سے بھی ملتا رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ یہ لوگ اس کے والدین نہیں بلکہ اس رِنگ کے ممبر ہیں۔"

کرنل کے پوچھنے پر عثمان نے لُوسی کے متعلق وہ ساری باتیں بتائیں جو کراچی میں ہوئی تھیں۔

"کیا لُوسی نے یا اس رِنگ کے کسی ممبر نے تم سے کوئی ملٹری سیکرٹ معلوم کرنے کی کبھی کوشش کی تھی؟" — کرنل نے پوچھا۔

"یس سر!" — عثمان نے جواب دیا — "انہوں نے ایک دو باتیں پوچھی تھیں اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے مجھے کہا تھا کہ ہم تمہیں پاکستان کا شہزادہ بنا دیں گے۔"

کرنل اور میجر امتیاز نے میجر عثمان سے اور بھی بہت کچھ پوچھا جس میں لاہور کی کوٹھی اور کراچی کی کوٹھی کے ایڈریس بھی شامل تھے۔

"میجر عثمان!" — کرنل نے کہا — "مَیں تمہیں سختی سے کہتا ہوں کہ یہ بڑا سنگین کیس ہے اور اسے اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش نہ کرنا۔ تم ہمارے گائیڈ ہو گے۔ ہم ب چھاپہ ماریں گے تو تم ہمارے ساتھ ہو گے۔ سب سے پہلے تو ہم اُس جگہ کو دیکھیں گے جہاں سے تم اپنی فیملی کے ساتھ اغوا ہوئے تھے۔ تم نے اب یہ کام کرنا ہے کہ لاہور ل ان میں سے جس جس کے ساتھ 'تمہارا تعلق تھا' اُسے ملتے ملاتے رہنا تاکہ اُنہیں ی قسم کا شک نہ ہو.... اب تم جا سکتے ہو۔ ہمیں جس وقت تمہاری ضرورت پڑی، ہم ہیں بُلا لیں گے۔ تمہیں ہر وقت لاہور میں موجود رہنا پڑے گا۔"

وہاں سے اُٹھ کر میجر عثمان بریگیڈ ہیڈ کوارٹر میں چلا گیا۔

اُسی دن ڈھائی تین بجے میجر عثمان آفس سے اُٹھ کر اپنے سسرال چلا گیا۔ وِینا وہیں ی۔ جب سے وِینا اپنے والدین کے ہاں گئی تھی میجر عثمان کا یہی معمول تھا کہ آفس ے اُٹھ کر سسرال چلا جاتا اور کھانا کھا کر اپنے گھر آجاتا تھا۔ اُس روز بھی وہ اپنے سرال گیا۔ اس نے وِینا سے بالکل نہ کہا کہ وہ اس کے ساتھ چلے۔ وِینا تو اب اُسے ے مخلص خاوند سمجھتی تھی اور وہ خوش تھی کہ عثمان راہِ راست پر آگیا ہے۔ وِینا بھی

ایک دو دن اور اپنے والدین کے ہاں رُکنا چاہتی تھی۔ عثمان اپنے گھر چلا گیا۔

اپنے گھر جا کر عثمان نے پہلا کام یہ کیا کہ ٹیلی فون کے پاس جا بیٹھا اور ایک نمبر ڈائل کیا۔

"ہیلو' کون؟" — عثمان نے کہا — "اچھا اچھا .... فون اُنہیں دو .... ہیلو چیف! کوٹھی خالی کر دیں .... نہیں مہندر صاحب! خطرہ سر پر آ گیا ہے۔ کوٹھی خالی کر دیں اور لاہور سے نکل جائیں۔ کوٹھی میں کوئی ایسی چیز نہ رہ جائے جس سے انٹیلی جنس کو شک ہو۔ فوزیہ کو لے کر فوراً غائب ہو جائیں اور جب تک مَیں نہ کہوں واپس نہ آئیں۔ کوٹھی کے باہر تالا لگا دینا .... اور ہاں' نوکروں کو بھی وہاں سے بھیج دیں اور اُنہیں بتائیں کہ آپ کچھ دنوں کے لئے کراچی جا رہے ہیں۔ مَیں اب آپ سے ملوں گا نہیں' آپ سب سمجھتے ہیں" — عثمان نے ریسیور رکھ دیا۔

اُس نے ایک اور نمبر ڈائل کیا جو کراچی کا تھا۔

"ہیلو لُوسی!" — عُثمان نے پُرجوش انداز میں کہا — "میری خوش قسمتی ہے کہ تم مل گئی ہو .... ہاں ہاں مَیں ٹھیک ہوں لیکن حالات ٹھیک نہیں رہے .... زیادہ مت پوچھو اور وہاں سے سب کو ساتھ لے کر لاپتہ ہو جاؤ .... وِینا نے یہاں سب کو اغوا کا واقعہ سنا دیا ہے اور تمہاری ملاقاتوں کا سلسلہ بھی بے نقاب کر دیا ہے۔ بات اُوپر تک پہنچ گئی ہے .... ہاں ہاں مَیں نے لاہور والوں کو بھی خبردار کر دیا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ تمہارے پاس ہی آ جائیں۔ بس اب تم کوٹھی خالی کرنے کا کام کرو۔ میرے ساتھ رابطہ رکھنا .... فوزی کے ساتھ اچھا وقت گزرا۔ اب کچھ عرصہ جدائی برداشت کرنی پڑے گی .... او کے .... بائی بائی"۔



انبالہ کے انٹیلی جنس سنٹر کے انویسٹی گیشن سَیل میں فرش پر بچھے ہوئے کھردرے فوجی کمبل پر ایک جوان آدمی کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ اُس کے اوپر میلی کچیلی سی ایک چادر ڈال دی گئی تھی۔ کمرے کی بند فضا بدبُو سے بوجھل تھی۔

کمرے کا دروازہ سلاخوں والا تھا۔ یہ دروازہ کھلا۔ دو میجر کمرے میں داخل ہوئے اور سیدھے اس لاش تک پہنچے۔ چادر ہٹائی' ایک میجر ایک طرف اور دوسرا دوسری طرف فرش پر اکڑوں بیٹھ گئے۔ ایک نے لاش کی نبض پر اُنگلیاں رکھیں اور دوسرے

نے اپنی ایک اُنگلی لاش کی ناک کے آگے رکھی۔

"باسٹرڈ زندہ ہے" — ایک میجر نے کہا۔

"تو کیا تمہیں یہ شک تھا کہ مر گیا ہو گا؟" — دوسرے میجر نے پوچھا۔

"حیران ہوں یہ مسلمان کس میٹریل کے بنے ہوئے ہیں"۔

"اتنا ٹارچر گھوڑا بھی برداشت نہیں کر سکتا۔"

دونوں میجر اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"اسے ہوش میں لایا جائے؟" — ایک میجر نے پوچھا — "یا خود ہی ہوش میں آ جائے گا"۔

"ہوش میں لانا پڑے گا" — دوسرے میجر نے کہا — "کل دوپہر کو اِسے تھوڑا سا کھانا دیا گیا تھا اور اب پورے چوبیس گھنٹے گزر گئے ہیں۔ اب اسے کچھ کھلائیں پلائیں گے"۔

دونوں میجر سَیل سے نکلے اور سنتری سے کہا کہ وہ دروازہ بند کر لے۔

"کیا رات کو بھی تمہاری ڈیوٹی تھی؟" — ایک میجر نے سنتری سے پوچھا۔

"ہاں سر!" — سنتری نے جواب دیا — "رات بارہ سے دو بجے تک میری ڈیوٹی تھی"۔

"کیا یہ ساری رات اِسی طرح پڑا رہا ہے؟"

"نہیں سر!" — سنتری نے جواب دیا — "پہلے تو یہ اِسی طرح پڑا رہا۔ بارہ بجے کے کچھ بعد یہ بیٹھ گیا اور چادر اُوپر کر کے مُنہ مغرب کی طرف کر لیا اور کچھ مُنہ ہی مُنہ میں پڑھتا رہا پھر اس نے ہاتھ پھیلا دیئے جس طرح مسلمان دُعا مانگا کرتے ہیں۔ پھر اس نے بلند آواز سے کچھ پڑھنا شروع کر دیا۔ میرا خیال ہے یہ اپنے قرآن کی کوئی آیتیں پڑھ رہا تھا۔ مَیں نے مسلمانوں کو اونچی آواز میں قرآن پڑھتے دیکھا ہے۔ پھر یہ نماز کی طرح سجدے میں چلا گیا اور بہت دیر سجدے میں پڑا رہا۔ میرا خیال تھا کہ یہ سجدے میں مر گیا ہے لیکن یہ سجدے سے اُٹھا اور اس نے بلند آواز سے کہا — 'یا اللہ میری قربانی قبول کر لے اور مجھے اتنی ہمت دے کہ میں تیری خوشی کے لئے یہ تکلیفیں برداشت کر لوں' — پھر اس نے زور سے اللہ اکبر تین بار کہا پھر لیٹ گیا۔ مجھے پتہ نہیں سو گیا تھا یا بیہوش ہو گیا تھا"۔

"میری ایک بات سنو!" — ایک میجر نے دوسرے سے کہا — "مسلمان عقیدے کے بڑے پکے ہوتے ہیں۔ اگر اس ڈاکٹر نے ایسے ہی کیا ہے جیسے یہ سنتری بتا رہا ہے تو یہ مر جائے گا' کچھ بتائے گا نہیں۔ ہمارے ہندو اتنا زیادہ ٹارچر برداشت نہیں کر سکتے۔ اس کی جگہ کوئی ہندو ہوتا تو کل تک مر گیا ہوتا"۔

دونوں میجر چلے گئے۔

تقریباً نصف گھنٹہ بعد ایک کیپٹن ڈاکٹر سیل میں داخل ہُوا۔ اُس کے ساتھ ایک سپاہی تھا جس نے ایک ہاتھ میں دُودھ' دوسرے میں ڈبل روٹی اور ایسے ہی کھانے کی کوئی اور چیز اُٹھا رکھی تھی۔

"ڈاکٹر رشید!" — کیپٹن ڈاکٹر نے اُس جیتی جاگتی لاش کے قریب بیٹھ کر اُسے پکارا — "ڈاکٹر رشید.... رشید!" — اُس نے ہاتھ آگے کر کے ڈاکٹر عبدالرشید کا سر آہستہ آہستہ ہلایا۔

یہ ڈاکٹر عبدالرشید تھا جس نے صغیر کو فرار کروایا تھا۔ تین چار دنوں سے اسے غیر انسانی ایذارسانی کے ظالمانہ عمل میں سے گذارا جا رہا تھا اور اس پر غشی طاری تھی۔ کیپٹن ڈاکٹر کے بُلانے پر اس نے آنکھیں کھولیں۔ اس میں اتنی سی بھی سکت نہیں تھی کہ آنکھیں بھی پوری طرح کھول سکتا۔ اُس نے اُٹھنے کی کوشش کی۔

"لیٹے رہو ڈاکٹر رشید!" — کیپٹن ڈاکٹر نے کہا — "مَیں تمہارے مُنہ میں دُودھ ٹپکاؤں گا"۔

"اللہ اکبر" — ڈاکٹر رشید نے نقاہت زدہ آواز میں کہا اور جسم کو جھٹکا دے کر اُٹھ کے بیٹھ گیا۔ اس نے کیپٹن ڈاکٹر سے کہا — "مَیں تمہاری عزت اس لئے کرتا ہوں کہ تم بھی ڈاکٹر ہو لیکن تمہارے ہاتھ سے کچھ کھانا پینا نہیں چاہوں گا کیونکہ تم ہندو ہو"۔

"ڈاکٹر رشید!" — کیپٹن ڈاکٹر نے کہا — "اپنے خون میں اتنا اُبال پیدا نہ کرو۔ تم میں بولنے کی طاقت نہیں۔ یہ لو' یہ دُودھ ہے اور یہ توش ہے' اس میں آملیٹ ہے۔ کھاؤ اور دُودھ پی لو' اور یہ بھی ذہن میں رکھو کہ مَیں ڈاکٹر ہوں اور اس لحاظ سے ہم دونوں بھائی ہیں"۔

"اگر ہم کسی ہسپتال میں اپنی ڈیوٹی دے رہے ہوتے تو مَیں تمہیں اپنا بھائی سمجھتا" — ڈاکٹر رشید نے نحیف سی آواز میں کہا — "لیکن یہاں مَیں ملزم ہوں اور تم لڑنے والوں میں سے ہو۔ یہ بھی ذہن میں رکھو کہ یہ تفتیش نہیں بلکہ یہ ایک جنگ ہے جو زمین کے نیچے لڑی جا رہی ہے۔ لڑنے والے انڈیا اور پاکستان ہیں۔ پاکستان ایک اسلامی مُلک ہے اور مَیں مسلمان ہوں۔ اس جنگ میں اگر مَیں مارا گیا تو مَیں شہید کہلاؤں گا اور میری رُوح کو ابدی سکون ملے گا۔ میرے جسم کو کاٹتے چلے جاؤ' بوٹی بوٹی کر دو' میرے مُنہ سے اُف یا ہائے نہیں نکلے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میری رُوح زندہ ہے۔ میرے جسم کو جتنا بھی کچلو گے میری رُوح اتنی ہی زیادہ زندہ و توانا ہوتی چلی جائے گی .... اور سنو ڈاکٹر! مَیں اپنے جسم سے دستبردار ہو چکا ہوں۔ اس وقت تمہارے سامنے ایک رُوح بیٹھی ہے۔ انہیں کہہ دو کہ مَیں انہیں کچھ بھی نہیں بتاؤں گا.... تم کہاں ہوتے ہو ڈاکٹر! میں نے تمہیں ملٹری ہسپتال میں تو کبھی نہیں دیکھا"۔

"کوئی دو مہینے ہوئے مَیں دلی سے آیا ہوں" — کیپٹن ڈاکٹر نے جواب دیا — "اور مجھے انٹیلی جنس کے ساتھ لگا دیا گیا.... تمہارے دل میں تو ہندوؤں کی بڑی زبردست نفرت بیٹھی ہوئی ہے"۔

"نفرت بھی' حقارت بھی!" — ڈاکٹر رشید نے کراہتی ہوئی آواز میں کہا — "تمہیں شاید معلوم نہیں کہ مَیں نے کیا کیا ہے"۔

"نہیں" — کیپٹن ڈاکٹر نے کہا — "کیا کیا ہے تم نے؟"

ڈاکٹر عبدالرشید نے کیپٹن ڈاکٹر کو صغیر کے فرار کا سارا واقعہ سنا دیا اور کہا کہ اس نے اپنے اس جرم کا اقبال بڑے تفصیلی بیان میں کر دیا ہے لیکن وہ یہ نہیں بتائے گا کہ اس کے ساتھ مددگار کون کون تھا۔

"کیا تمہارے دل میں عیسائیوں' پارسیوں اور سکھوں کی بھی نفرت ہے؟" — کیپٹن ڈاکٹر نے پوچھا۔

"نہیں" — ڈاکٹر رشید نے جواب دیا — "مَیں عیسائیوں کو پسند کرتا ہوں۔ وہ بھی اس لئے کہ حضرت عیسیٰؑ نے محبت اور امن کا پیغام دیا ہے۔ اس کے علاوہ عیسائی بھی انڈیا میں اقلیت میں ہونے کی وجہ سے مظلوم ہیں۔ خُدا کی قسم! جسے مَیں نے فرار کرایا ہے' اگر وہ عیسائی ہوتا تو بھی مَیں اُسے اپنی جان پر کھیل کر فرار کراتا۔ تم ہندو ہو۔ اپنے بریگیڈیئر اور دوسرے افسروں سے کہہ دینا کہ رشید اس قسم کی باتیں کرتا ہے"۔

"اگر مَیں ہندو ہوتا تو اُنہیں ضرور بتاتا" — لیکن کیپٹن ڈاکٹر نے کہا — "مَیں ہندو

نہیں ہوں"۔

کیپٹن ڈاکٹر نے کچھ دُور کھڑے سپاہی کی طرف دیکھا اور اُس سے کہا کہ وہ چلا جائے۔

"ڈاکٹر رشید!" — کیپٹن ڈاکٹر نے کہا — "مَیں کرسچیئن ہوں۔ مجھ پر اعتبار نہ ہو تو اس سپاہی سے پوچھ لو کہ میرا نام کیا ہے.... میرا نام فرانسس ہے" — ڈاکٹر فرانسس نے ایک گولی کا نام لیا اور پوچھا — "جانتے ہو اس گولی کے اثرات کیا ہیں؟"

"جانتا ہوں" — ڈاکٹر رشید نے کہا — "کوئی آدمی کوئی نشے والی چیز کھا لے تو یہ گولی نشہ اُتار دیتی ہے اور نشے سے پہلے یہ دو گولیاں لے لو تو نشے کا اثر نہیں ہوتا.... کیا تم میرا امتحان لے رہے ہو؟"

"نہیں بھائی!" — ڈاکٹر فرانسس نے کہا — "یہ لوگ شاید تمہیں مزید ٹارچر نہ کریں۔ تمہیں بڑا اچھا کھانا دیں گے اور اس میں نشے والی گولیاں ملا دیں گے"۔

"مَیں جانتا ہوں" — ڈاکٹر رشید نے کہا — "یہ زیادہ تر ایل ایس ڈی استعمال کرتے ہیں"۔

"اور تم یہ بھی جانتے ہو گے کہ ایل ایس ڈی کے اثرات کیا ہوتے ہیں" — ڈاکٹر فرانسس نے کہا — "تمہیں یہ گولیاں دی جائیں گی۔ مَیں کچھ دیر بعد آؤں گا۔ یہ گولیاں ساتھ لے آؤں گا اور یہاں کمرے میں کسی جگہ چھپا کر رکھ دُوں گا۔ تم جانتے ہو یہ ایک گولی صبح اور ایک شام کھانے سے پہلے لے لیا کرنا۔ ہوش میں رہو گے اور یہ لوگ تمہارے منہ سے کوئی بات نہیں نکلوا سکیں گے۔ یہ سوچ لو کہ تمہاری نیند اُڑ جائے گی"۔

"کوئی بات نہیں" — ڈاکٹر رشید نے کہا — "یہ میں برداشت کر لوں گا"۔

"لو' یہ دُودھ پی لو" — ڈاکٹر فرانسس نے دُودھ کا گلاس اُس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا — "اور یہ بھی کھا لو۔ مَیں جا رہا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد آؤں گا"۔

"ڈاکٹر فرانسس!" — ڈاکٹر رشید نے کہا — "تمہاری یہ آفر بھی ایک دھوکہ ہو سکتا ہے۔ اگر میرے ساتھ دھوکہ کرو گے تو یہ کوئی بہادری نہیں ہو گی اور پھر یہ کبھی فخر سے نہ کہنا کہ تم ڈاکٹر ہو۔ مَیں فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ مَیں ڈاکٹر ہوں۔ ڈاکٹروں کے پیشے کی اخلاقیات سے تم واقف ہو اور تم نے اِسی بنیاد پر حلف بھی اُٹھایا ہے"۔

"تم کیسی باتیں کرتے ہو ڈاکٹر رشید!" — ڈاکٹر فرانسس نے قدرے جھنجلا کر کہا "مَیں تمہارے ساتھ کوئی دھوکہ نہیں کروں گا۔ معلوم نہیں تم اس وہم میں کیوں پڑ گئے ہو"۔

"انڈیا کی زمین ایسی ہے کہ یہاں دھوکہ اور فریب جنم لیتے ہیں" — ڈاکٹر رشید نے کہا — "تم کرسچیئن ہو' میرے اپنے مسلمان بھائی غدار ہو گئے ہیں.... مجھے دیکھو' مَیں غداری نہیں کر رہا۔ یہی میرا جرم ہے کہ مَیں اُن لوگوں کے نام نہیں بتا رہا جنہوں نے اس آدمی کو فرار کرانے میں مدد دی تھی.... اور میں تمہیں یہ بتا رہا تھا کہ ڈاکٹر کی عظمت کیا ہوتی ہے۔ میں نے اس آدمی کو اس لئے فرار کرایا کہ اُس کی عقل کو بیکار کرنے کے لئے اسے ایل ایس ڈی سے بھی زیادہ خطرناک انجکشن دیئے جا رہے تھے اور اس شخص کو غلط طریقے سے استعمال کیا جا رہا تھا"۔

"میں جانتا ہوں بھائی!" — ڈاکٹر فرانسس نے کہا — "وہ انڈین انٹیلی جنس کا آدمی تھا اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ پاکستانی ہے.... تم دیکھو گے ڈاکٹر رشید کہ میری طرف سے تمہارے ساتھ دھوکہ نہیں ہو گا اور تم جب تک زندہ رہو گے یاد کرو گے کہ کسی نے مشکل کے وقت مدد کی تھی۔ میں تمہیں یہاں سے نکلوا نہیں سکتا۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو میں تمہیں یہاں سے فرار کروا دیتا"۔

"مجھے جو شک تھا وہ میں نے ظاہر کر دیا ہے" — ڈاکٹر رشید نے کہا — "تم دھوکہ کرو یا بھلا کرو میں نے تو جیل میں جانا ہی ہے۔ بھلا کرو گے تو واقعی ساری عمر یاد رکھوں گا اور اس کا صلہ تمہیں خُدا کی طرف سے مِلے گا"۔

"میں جو کچھ کر رہا ہوں ڈاکٹر رشید!" — ڈاکٹر فرانسس نے اُٹھتے ہوئے کہا — "وہ میں خدا کے واسطے کر رہا ہوں' مجھے کسی انعام کی ضرورت نہیں"۔

ڈاکٹر فرانسس چلا گیا۔



اسی بلڈنگ میں جہاں ڈاکٹر عبدالرشید قید تھا' اوپر کی منزل پر ایک کمرہ تھا۔ یہ کمرہ کسی وزیر کا دفتر معلوم ہوتا تھا۔ اِس کے باہر اردلی کھڑا تھا۔ اندر چار پانچ فوجی افسر بیٹھے ہوئے تھے جو فوجی وردی میں نہیں تھے۔ ان میں ایک کرنل تھا اور باقی سب میجر تھے۔ یہ ایک اجلاس تھا جس کی صدارت ایک بریگیڈیئر کر رہا تھا۔

"دیکھا جائے تو بات کچھ بھی نہیں" — بریگیڈیئر نے ان افسروں سے کہا۔ "جس آدمی کو فرار کرایا گیا ہے وہ کوئی مجرم نہیں تھا یا وہ پاکستان کا جاسوس نہیں تھا' وہ ہمارے لئے کام کر رہا تھا۔ ہم اُسے آسانی سے پاکستان میں قتل کروا سکتے ہیں۔ جہاں ہم ایک دھماکہ کروا کے ایک درجن پاکستانی ہلاک کروا سکتے ہیں اور سندھ میں ہم جو کچھ کروا رہے ہیں وہ تم سب جانتے ہو' وہاں ایک آدمی کو قتل کروانا کوئی بڑی بات نہیں"۔

"یس سر!" — تقریباً تمام افسروں نے کہا اور کرنل بولا — "یہ تو کوئی مشکل نہیں"۔

"پاکستان میں کسی پاکستانی کو کسی پاکستانی کے ہاتھ سے ہی مروا دینا کوئی ٹیڑھا مسئلہ نہیں" — ایک میجر نے کہا۔

"لیکن" — بریگیڈیئر نے کہا — "اُسے فرار کرانے والوں کو ہم معاف نہیں کر سکتے۔ اگر ہم اس ڈاکٹر کو چھوڑ دیں تو کم از کم انبالہ کے مسلمان اور زیادہ دلیر ہو جائیں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہاں کے مسلمانوں پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ بے شک ہم نے ان میں سے کچھ مسلمانوں کو اپنے ساتھ لگا لیا ہے لیکن ان پر بھی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس وقت ضرورت یہ ہے کہ اس ڈاکٹر کو عبرت کی ایک مثال بنا دیا جائے لیکن تم جانتے ہو یہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ منظم گروہ ہے۔ اس گروہ کا ایک ایک آدمی پکڑنا ہمارے لئے بہت ضروری ہے.... مجھے تم روز بروز رپورٹ دیتے رہے ہو اور بتاتے رہے ہو کہ یہ ڈاکٹر تو جیسے لوہے کا بنا ہُوا ہے۔ میں خود حیران ہوں کہ تھرڈ ڈگری کی آخری سٹیج کو بھی اس شخص نے برداشت کر لیا ہے۔ میں نہیں سمجھ سکا اس کی کیا وجہ ہے"۔

"سَر!" — ایک میجر نے کہا — "مَیں ایک وجہ بتا سکتا ہوں۔ آپ شاید میرا مذاق اُڑائیں لیکن اسے ہم نظر انداز بھی نہیں کر سکتے.... میں نے ایک سنتری سے پوچھا تھا کہ رات کو ڈاکٹر رشید بیہوش پڑا رہتا ہے یا سویا رہتا ہے یا اس کی حالت کیا ہوتی ہے؟ سنتری نے مجھے بتایا کہ یہ رات کو بیٹھ کر مغرب کی طرف مُنہ کر کے کچھ پڑھتا رہتا ہے' سجدے بھی کرتا ہے اور ہاتھ پھیلا کر قرآن کے الفاظ بلند آواز سے بولتا ہے۔ کئی کئی بار اللہ اکبر بہت زور سے کہتا ہے۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اس نے اپنی روحانی قوّت کو بیدار کر لیا ہے"۔

"یہ فیتھ ہے جسے مسلمان عقیدہ کہتے ہیں" — بریگیڈیئر نے کہا — "یہ ہمارے مذہب میں بھی ہے۔ ہمارے سادھو اور جوگی گھنٹہ گھنٹہ سانس رو کے رکھتے ہیں"۔

"معاف رکھنا سر!" — کرنل نے کہا — "ہمارے سادھو اور جوگی تو بیس بیس سال سانس روکنے کی یا کوئی سپر نیچرل طاقت پیدا کرنے کی پریکٹس کرتے ہیں۔ بعض تو اِسی پریکٹس میں بوڑھے ہو جاتے ہیں پھر کہیں جا کر اُنہیں یہ طاقت حاصل ہوتی ہے۔ اس ڈاکٹر کی اتنی عمر ہی نہیں۔ یہ ممکن نہیں کہ ہمارے سَیل میں آکر اسے یہ طاقت حاصل ہو گئی ہو۔ میرا کہنے سے مطلب یہ ہے کہ اِس نے ایسی یکسوئی پیدا کر لی ہے کہ اپنے جسم کو یہ اپنا جسم سمجھتا ہی نہیں"۔

یہ تمام افسر ہندو تھے۔ ان میں کوئی بھی یہ اعتراف نہیں کرنا چاہتا تھا کہ قرآن کے الفاظ میں ایسی طاقت موجود ہے جو انسان میں مافوق الفطرت قوت پیدا کر سکتی ہے' شرط یہ ہے کہ انسان گناہ گار نہ ہو اور جس کام کے لئے وہ غیر قدرتی قوّت حاصل کرنا چاہتا ہے وہ کام نیکی کا ہو اور بنی نوع انسان کی بھلائی کا کام ہو۔ ڈاکٹر عبدالرشید نے اپنے جسم سے دستبردار ہو کر یہ روحانی قوّت پیدا کر لی تھی۔ ان افسروں کے چہروں کے تاثرات بتاتے تھے کہ وہ حیران ہیں کہ ایک نوجوان آدمی نے ایسی قوّت کیسے حاصل کر لی۔

"تھرڈ ڈگری چھوڑ دو" — بریگیڈیئر نے دو ٹوک فیصلہ دیا — "اِسے اچھا کھانا دو اور کھانے میں وہ سب کچھ ڈالو پھر دیکھو کیا ہوتا ہے۔ مَیں دیکھتا ہوں اس کی روحانی قوّت اس کا ساتھ دیتی ہے۔ ہمیں ہر قیمت پر اس کے گینگ کو پکڑنا ہے۔ یہ بھی ذہن میں رکھو کہ ہمیں دِلّی والوں کو جواب دینا ہے ورنہ سب رگڑے جاؤ گے"۔

"سر!" — کرنل نے کہا — "ابھی ایک طریقہ اور بھی ہے۔ اس کے گھر والوں کو بُلانا ہے' خصوصاً عورتوں کو۔ مسلمان بڑے غیرت مند ہوتے ہیں۔ مذہب اور اپنے گھر کی عورتوں کی عزت پر مر مٹتے ہیں۔ میرا خیال ہے یہ طریقہ استعمال کر لینا چاہئے"۔

"اوہ' نو!" — بریگیڈیئر نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مار کر کہا — "یہ طریقہ ہم ابھی استعمال نہیں کر سکتے۔ ایک ہفتہ پہلے مَیں دِلّی گیا تھا۔ تمہیں معلوم ہے کہ پرائم منسٹر کو انٹیلی جنس کے متعلق بریفنگ دینی تھی اور کچھ اُس کے آرڈر لینے تھے۔ چیف بھی ساتھ تھا۔ پرائم منسٹر نے بڑی سختی سے کہا ہے کہ الیکشن شروع ہونے والے ہیں اس لئے مسلمانوں اور عیسائیوں کو اپنے ہاتھ میں رکھنا اور ان کے مذہب کا بہت زیادہ خیال

رکھنا۔ پرائم منسٹر نے یہ بھی کہا تھا کہ مسلمانوں کے ساتھ اپنا رویّہ ایسا کر لو جیسے تمہیں ان کی عزت کا بہت ہی خیال ہے۔ یہ خاص طور پر خیال رکھنا کہ ان کی عورتوں اور ان کی مسجدوں کا احترام کرنا۔ الیکشن کے بعد دیکھی جائے گی .... بس یہ مجبوری ہے کہ ہم اس ڈاکٹر کے گھر کی عورتوں کو یہاں نہیں بلا سکتے۔ اگر ہم ایسا کر بیٹھیں تو یہاں کے مسلمان ایک ہنگامہ کھڑا کر دیں گے اور یہ ہنگامہ دلّی تک پہنچے گا اور نہ جانے کہاں کہاں پہنچے۔ اس کا فائدہ رُولنگ پارٹی کے مخالفین کو پہنچے گا"۔

اسی دوران چائے آ گئی اور یہ افسر چائے پینے میں مصروف ہو گئے اور اس دوران وہ اس کیس کے متعلق بھی باتیں کرتے رہے۔

اُس وقت ڈاکٹر فرانسس ایک بار پھر ڈاکٹر رشید کے سَیل میں موجود تھا۔ اُس نے ڈاکٹر رشید کو فرش پر لٹا کر ایسا تاثر پیدا کر رکھا تھا جیسے وہ اس کا تفصیلی ڈاکٹری معائنہ کر رہا ہو۔ سنتری کی اس طرف توجہ نہیں تھی۔ وہ دروازے سے ہٹ گیا تھا۔ اس سَیل کے ساتھ اٹیچ باتھ تھا اور اس باتھ کا چھوٹا سا روشندان بھی تھا۔ ڈاکٹر فرانسس باتھ روم میں گیا اور گتّے کی ایک لمبوتری سی ڈبیا کموڈ کے اوپر کھڑے ہو کر روشندان میں ایسی جگہ رکھ آیا جہاں سے نیچے کھڑے آدمی کو نظر نہیں آ سکتی تھی۔

"میں نے وہاں دو چیزیں رکھی ہیں" — ڈاکٹر فرانسس نے ڈاکٹر رشید کو بتایا — "ایک نیوروبیون کی گولیاں ہیں اور دوسری تم جانتے ہو۔ نیوروبیون صبح ایک ہی لینی ہے...."

"ہاں ہاں فرانسس!" — ڈاکٹر رشید نے کہا — "میں جانتا ہوں۔ دوسری صبح اور شام ایک ایک گولی لے لیا کروں گا یا ہر کھانے سے پہلے لے لوں گا"۔

"بہتر یہ ہو گا" — ڈاکٹر فرانسس نے کہا — "جس وقت کھانا آئے تم باتھ روم میں چلے جایا کرو اور کموڈ پر کھڑے ہو کر ایک گولی منہ میں ڈال لیا کرو اور اندر سے نکلتے ہی دو چار گھونٹ پانی پی لیا کرو اور کھانا پندرہ بیس منٹ بعد کھانا"۔



ساڑھے بارہ بج رہے تھے' ڈاکٹر رشید کے سَیل کا دروازہ کھلا۔ ڈاکٹر رشید کا کھانا آیا تھا۔ اُس نے جب کھانا لانے والے دو آدمیوں کو دیکھا تو اُسے حیرت کا دھچکہ سا لگا۔ دونوں آدمیوں کے ہاتھوں میں ایک ایک ٹرے تھی۔ اس سے پہلے فضول سی ایک چنگیر

اور ٹیڑھی میڑھی ایک پلیٹ میں کھانا آیا کرتا تھا۔ چنگیر میں دو روٹیاں اور پلیٹ میں پتلی سی دال ہُوا کرتی تھی لیکن اب اچانک ڈاکٹر رشید وی آئی پی بن گیا۔ دونوں ٹرے اس کے آگے رکھی گئیں تو وہ کھانا دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کھانا مرغّن تھا۔ اس میں گوشت کا سالن تھا۔ ایک ٹکڑا روسٹ مُرغی کا تھا' سبزی بھی تھی' ساتھ چپاتیاں تھیں اور سویٹ بھی تھی۔

"لو صاحب!" — ایک آدمی نے کہا — "کھانا کھا لیں' ہم کچھ دیر بعد برتن لے جائیں گے"۔

دونوں آدمی چلے گئے۔ ڈاکٹر رشید کچھ دیر کھانے کو دیکھتا رہا اور دل ہی دل میں ہنس پڑا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کھانے میں کیا ہے۔ وہ باتھ روم میں گیا۔ یہ کوئی صاف ستھرا نہیں بلکہ انتہائی غلیظ باتھ روم تھا جس کا کموڈ بھی بوسیدہ تھا۔ وہ کموڈ پر چڑھ گیا اور روشندان میں ہاتھ پھیرا۔ اُس کا ہاتھ ڈبیا تک پہنچ گیا۔ ڈبیا گھسیٹ کر کھولی تو اس میں اسے دو قسم کی گولیاں پڑی نظر آئیں۔ اُس نے بی کمپاؤنڈ کی ایک گولی اور ایک دوسری گولی نکال کر ڈبیا وہیں چھپا دی اور کموڈ سے اُتر آیا۔ دونوں گولیاں منہ میں ڈالیں اور کمرے میں آ کر وہ پانی پیا جو کھانے کے ساتھ آیا تھا۔ پھر وہ اپنے خیالوں میں گم ہو گیا۔ اُس نے ارادہ کیا تھا کہ کم و بیش آدھے گھنٹے بعد کھانا کھائے گا۔

ڈاکٹر رشید کی جسمانی حالت بہت ہی بری تھی لیکن اُس نے اپنے آپ میں جو قوّتِ ارادی پیدا کر لی تھی اس سے اُس نے درد اور اینٹھن وغیرہ پر قابو پا لیا تھا۔ ڈاکٹر فرانسس کو وہ فرشتہ سمجھ رہا تھا۔ اس سے اس کو یہ تاثر ملا کہ اللہ اس کی مدد کر رہا ہے۔ اس تاثر نے اس کی روحانی قوّت کو مزید تقویت دی۔

اس نے کھانا بڑے اطمینان سے کھایا اور اس کے بعد اپنا جائزہ لینے لگا کہ اس پر غنودگی طاری ہوتی ہے یا نہیں۔ کچھ دیر بعد اس پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ وہ ڈاکٹر تھا اس لئے سمجھتا تھا کہ یہ غنودگی نیند کی ہے اور اس نیند کی وجہ یہ ہے کہ اسے دو دن اور دو راتیں سونے نہیں دیا گیا تھا اور اذیّتیں دی گئی تھیں۔ وہ نوٹ کر رہا تھا کہ اس کی ذہنی حالت نارمل تھی پھر اس کی آنکھ لگ گئی۔

اسے کسی نے جگا دیا۔ کمرے کا بلب روشن تھا اور دروازے کے باہر اسے برآمدے کے بلب کی روشنی میں سنتری کھڑا نظر آ رہا تھا اور اس سے پرے تاریکی تھی۔

وہ سمجھ گیا کہ وہ کم و بیش پانچ گھنٹے سویا رہا ہے۔ اس نے جگانے والے کو دیکھا جسے وہ جانتا تھا۔ یہ ایک میجر تھا اور یہی میجر اسے ایذا رسانی کے ظالمانہ عمل سے گزارتا تھا۔ ڈاکٹر رشید اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"اس کمرے میں چلیں؟" — ڈاکٹر رشید نے نارمل ذہنی حالت میں میجر سے پوچھا۔

"نہیں ڈاکٹر صاحب!" — میجر نے بڑے احترام سے کہا — "آئی ایم ویری ساری ڈاکٹر رشید! سمجھ نہیں آئی مَیں آپ سے کیسے معافی مانگوں۔ مَیں درخواست دینے والا ہوں کہ مجھے میری یونٹ میں ٹرانسفر کر دیں۔ مَیں یہ کام نہیں کر سکتا کہ آپ جیسے معزز آدمی کے ساتھ ایسا سلوک کروں جو مجھ سے کروایا گیا۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا"۔

"آپ کا رینک کیا ہے؟"

"میں میجر ہوں ڈاکٹر صاحب!" — میجر نے جواب دیا — "میرا تعلق انفنٹری سے ہے"۔

"میں آپ کا بہت مشکور ہوں میجر صاحب!" — ڈاکٹر رشید نے کہا — "لیکن مَیں حیران ہوں کہ اچانک آپ کا روّیہ کیوں بدل گیا ہے!"

"آپ تو ڈاکٹر ہیں" — میجر نے کہا — "میرے اندر انسانیت بیدار ہو گئی ہے۔ یہ میرے ضمیر کی آواز ہے"۔

ڈاکٹر رشید اُس سے پوچھنے ہی لگا تھا کیا ہندوؤں کا بھی ضمیر ہوتا ہے؟ لیکن اُس نے زبان بند رکھی۔ وہ کسی کو یہ تاثر نہیں دینا چاہتا تھا کہ کھانے میں اُسے ٹرانکولائزر دیا گیا ہے جس کا اس پر کچھ اثر نہیں ہُوا۔ ڈاکٹر رشید دیکھ رہا تھا کہ میجر جو کچھ کہہ رہا تھا وہ اُس تاثر سے مختلف تھا جو اُس کے چہرے پر تھا۔ یہ ہندو میجر ڈاکٹر رشید کو ٹیڑھی سی نگاہوں سے سر سے پاؤں تک دیکھ رہا تھا۔ ڈاکٹر رشید ان نگاہوں کو سمجھتا تھا۔

"میرا خیال ہے آپ کو نیند آ رہی ہے" — میجر نے کہا — "ابھی ساڑھے دس ہی بجے ہیں، آپ سو جائیں"۔

"سو جاؤں گا" — ڈاکٹر رشید نے کہا — "آپ میرے پاس بیٹھنا چاہتے ہیں تو بیٹھیں، باتیں کریں، باتیں سنیں"۔

"ڈاکٹر رشید صاحب!" — میجر نے کہا — "مَیں اس وقت باتیں کرنے کے ہی موڈ

میں ہوں لیکن زیادہ موڈ یہ طاری ہے کہ آج آپ کچھ باتیں کریں۔ مشکل یہ ہے کہ آپ ہندوؤں کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں اور آپ نے اپنے اِردگرد اسلام کا ایسا دائرہ ڈال رکھا ہے کہ نہ اس میں سے آپ باہر آتے ہیں نہ کسی اور مذہب کے آدمی کو اس دائرے میں داخل ہونے دیتے ہیں"۔

"نہیں میجر صاحب!" — ڈاکٹر رشید نے کہا — "اسلام کے اس دائرے کا ایک دروازہ کھلا رہتا ہے۔ اگر آپ اس دائرے میں آنا چاہتے ہیں تو مجھے بہت خوشی ہو گی لیکن آپ کو ہمیشہ کے لئے اس دائرے میں آنا پڑے گا جسے دوسرے لفظوں میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ کو مسلمان ہونا پڑے گا"۔

"اپنے دل کی بات بتاؤں ڈاکٹر رشید؟" — میجر نے کہا — "کئی بار دل میں آئی ہے کہ مسلمان ہو جاؤں"۔

"وہ کیوں؟"

"اگر آپ کی میرے ساتھ ملاقات باہر ہو جاتی تو آپ خود سمجھ لیتے" — میجر نے کہا — "میرے تین چار دوست ہیں۔ یہ سب مسلمان ہیں۔ بڑے اچھے خاندانوں کے لوگ ہیں۔ مَیں مسلمانوں کے ساتھ کھاتا پیتا ہوں۔ حلال گوشت کھاتا ہوں.... بائی دی وے، یہ جو گوشت آج آپ کو بھیجا گیا تھا یہ حلال تھا۔ کہیں یہ نہ سمجھ بیٹھنا کہ آپ کو جھٹکے کا گوشت کھلاتے ہیں.... اگر مجھ پر خاندانی پابندیاں نہ ہوتیں تو میں کبھی کا مسلمان ہو چکا ہوتا"۔

"کیا آپ مجھے اس وقت جگا کر یہی بتانے آئے ہیں؟"

"یہی سمجھ لیں" — میجر نے کہا — "میں اس وقت ڈیوٹی پر ہوں اور یہ میری ڈیوٹی میں شامل ہے کہ آپ کو دیکھوں.... آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو میں دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کرتا۔ آپ ڈاکٹر ہیں۔ میں نے آپ کا گھر دیکھا ہے۔ اس کی تلاشی لی ہے۔ اس گھر کے بچے سے لے کر آپ کے والد صاحب تک کو دیکھا ہے۔ اس سے زیادہ معزز خاندان اور کون سا ہو گا۔ میں آپ کی عظمت کو خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں۔ آپ نے ایک پاکستانی کو فرار کرایا اور بغیر کسی لالچ یا تشدّد کے ہمارے بریگیڈیئر کو قبل سے بتا دیا کہ آپ نے اُسے فرار کرایا ہے، اور اب آپ اپنے ساتھیوں کی نشاندہی نہیں کر رہے۔ یہ بھی آپ کی عظمت کا ثبوت ہے۔ کم از کم مَیں آپ سے نہیں

پوچھوں گا کہ وہ لوگ کون ہیں.... البتہ ایک خدشہ نظر آتا ہے۔ ان میں سے کوئی خود ہی آگے نہ آ جائے اور وعدہ معاف گواہ نہ بن جائے۔ ظاہر ہے یہ آدمی آپ کے دوست ہوں گے' آپ کے محلے میں رہتے ہوں گے یا ہاسپٹل میں آپ کا کوئی کولیگ ہو گا"۔

"ظاہر ہے میجر صاحب کہ وہ میرے اعتماد کے ہی لوگ ہوں گے" — ڈاکٹر رشید نے کہا — "یہی وجہ ہے کہ مَیں اُن کے نام نہیں بتا رہا۔ اگر اُن میں سے کوئی خود ہی آگے آ جاتا ہے تو یہ اُس کا اور میرا معاملہ نہیں بلکہ اُس کا اور اللہ کا معاملہ ہے۔ مَیں اُنہیں دھوکہ نہیں دُوں گا"۔

"مجھ پر آپ اعتماد نہیں کریں گے" — میجر نے کہا — "اگر مجھے ذرا سا بھی علم ہو جائے تو مَیں اُن لوگوں پر نظر رکھوں"۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں میجر صاحب!" — ڈاکٹر رشید نے کہا — "مَیں آپ پر اعتماد نہیں کر سکتا۔ آپ اپنی ڈیوٹی کے پابند ہیں اور مجھ پر اپنے ایمان کی پابندی ہے"۔

یہ دراصل ایک قسم کی معرکہ آرائی تھی جو اس ہندو میجر اور اس مسلمان ڈاکٹر کے درمیان ہو رہی تھی۔ میجر یہ دیکھ رہا تھا کہ کھانے میں جو ٹرانکولائزر ڈالے گئے تھے ان کا ڈاکٹر پر کتنا کچھ اثر ہُوا ہے' اور خود ڈاکٹر یہ دیکھ رہا تھا کہ اُس کی ذہنی حالت بگڑ تو نہیں رہی۔ ڈاکٹر اللہ کا شکر ادا کر رہا تھا کہ اُس کی ذہنی حالت بالکل نارمل تھی۔ اسے خیال آیا کہ اس میجر پر یہ ظاہر کر دے کہ اُس پر غنودگی طاری ہو رہی ہے تاکہ وہ اگلے کھانے میں اس سے زیادہ ٹرانکولائزر نہ ڈال دے۔ یہ سوچ کر اس نے اس طرح کی ایکٹنگ شروع کر دی کہ آہستہ آہستہ آنکھیں بند کرتا اور سر کو جھٹکا دے کر آنکھیں کھول دیتا۔

"اوہ!" — میجر نے کہا — "آپ کو نیند آ رہی ہے"۔

"نہیں" — ڈاکٹر رشید نے جھوٹ بولا — "نیند تو اتنی نہیں آ رہی جتنا میں سُرور سا محسوس کر رہا ہوں"۔

میجر کے چہرے پر رونق سی آ گئی جیسے اُس کا مقصد حل ہو رہا ہو۔

"اگر نیند آ رہی ہے تو مَیں چلا جاتا ہوں" — میجر نے کہا — "مَیں نے بتایا ہے ناکہ مَیں باتوں کے مُوڈ میں ہوں۔ اس وقت بالکل فری ہوں"۔

"آپ نے تو مجھ پر بھی باتوں کا موڈ طاری کر دیا ہے" — ڈاکٹر رشید نے ایسی آواز میں کہا جس میں ہلکا ہلکا نشے کا تاثر تھا — "بیٹھیں باتیں کریں.... آپ شادی شدہ ہیں؟"

"ہاں ڈاکٹر صاحب!" — میجر نے جواب دیا — "میرا ایک بچہ بھی ہے.... اور آپ؟"

"نہیں" — ڈاکٹر رشید نے جواب دیا — "میں تو ابھی رومان لڑانے کے موڈ میں ہوں۔ میری منگیتر ملٹری ہاسپٹل میں میرے ساتھ نرس ہے"۔

"اس کا نام شاید خالدہ ہے" — میجر نے پوچھا۔

"ہاں خالدہ!" — ڈاکٹر رشید نے جواب دیا — "آپ نے اُسے دیکھا ہو گا"۔

"ہاں.... بڑی اچھی لڑکی ہے"۔

"بہت خوبصورت لڑکی ہے" — ڈاکٹر رشید نے رومانی سے لہجے میں کہا — "اور آپ نے دیکھا ہے کہ کتنی پیاری اور دلکش ہے۔ وہ میری منگیتر ہے اور ابھی ہم رومان لڑا رہے ہیں"۔

"اُسے یہ بھی معلوم ہو گا کہ آپ نے یہ جرم کیا ہے" — میجر نے کہا۔

"نہیں" — ڈاکٹر رشید نے کہا — "مَیں اُسے نہیں پھنسانا چاہتا تھا۔ ویسے بھی مسلمانوں کا یہ دستور ہے کہ وہ اس قسم کی خفیہ کارروائیوں میں کسی عورت کو شامل نہیں کیا کرتے۔ خالدہ کو تو معلوم ہی نہیں کہ میں نے کبھی صغیر کو فرار کرانے کی سوچی بھی تھی"۔

اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر رشید نے خالدہ کے متعلق رومانی باتیں جھوم جھوم کر کرنی شروع کر دیں۔ اسے کوئی بھی دیکھتا تو یہی کہتا کہ یہ شخص نشے میں ہے۔

"آپ شملہ تو جاتے ہوں گے" — میجر نے پوچھا — "آپ جیسے رومان پسند نوجوان گرمیوں میں شملہ ضرور جاتے ہیں"۔

"ہاں ہاں" — ڈاکٹر رشید نے کہا — "مَیں ہر گرمیوں میں جاتا ہوں"۔

"آپ کی اپنی گاڑی تو نہیں؟"

"نہیں" — ڈاکٹر رشید نے جواب دیا — "کبھی گاڑی بھی مل جائے گی"۔

"آپ کے دوستوں میں سے تو کسی کی گاڑی ہو گی!" — میجر نے کہا — "جو مزہ اپنی گاڑی میں ہے وہ بس وغیرہ میں کہاں"۔

"میرے کسی دوست کے پاس اپنی کار نہیں" — ڈاکٹر رشید نے کہا۔

ڈاکٹر عبدالرشید کا ذہن زندہ و بیدار تھا اور وہ چوکنّا تھا۔ میجر نے جب گاڑی کا ذکر کیا تو ڈاکٹر رشید فوراً سمجھ گیا کہ اُس کا اشارہ کِس گاڑی کی طرف ہے۔ صغیر کو ہسپتال سے ایک سوزوکی کار میں لے جایا گیا تھا۔

میجر اس یقین کے ساتھ کہ ڈاکٹر رشید پر ٹرانکولائزر کا اثر ہو چکا ہے اس سے دوستانہ اور اُستادانہ طریقے سے راز کی باتیں معلوم کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور ڈاکٹر رشید نشے کی ایکٹنگ سے اُس کے یقین کو پختہ کر رہا تھا۔

میجر نے گھڑی دیکھی۔ اُسے ڈاکٹر رشید کے پاس آئے ڈیڑھ گھنٹہ گُزر چکا تھا۔ وہ یقیناً سوچ رہا تھا کہ نشے کا اثر عروج پر ہونا چاہئے لیکن رشید کے منہ سے راز کی کوئی بات نہیں نکل رہی تھی۔ ڈاکٹر رشید نے آنکھیں بند کرنی شروع کر دیں۔ میجر بھی اُکتا گیا تھا۔

"اچھا ڈاکٹر صاحب!" — میجر نے اُٹھتے ہوئے کہا — "آپ کو نیند آ رہی ہے۔ سو جائیں۔ پھر آؤں گا۔ کوشش کریں کہ آپ کا دل میری دوستی کو قبول کر لے۔ مَیں ثابت کر دوں گا کہ مَیں آپ کا دوست ہوں"۔

اُس نے ڈاکٹر رشید سے ہاتھ ملایا اور چلا گیا۔

ڈاکٹر رشید کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ اُس نے نیند کی ایکٹنگ کی تھی۔ اسے اطمینان محسوس ہو رہا تھا کہ ڈاکٹر فرانسس نے اس کے ساتھ دھوکہ نہیں کیا۔ وہ لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔



صغیر اُن ہی عصمت فروشوں کے ہاں چھپا بیٹھا تھا جہاں رحمو تانگے والا اسے چھوڑ آیا تھا۔ ان عصمت فروشوں کے پاس دو بہنیں تھیں .... شمیم اور نائلہ .... شمیم تو عصمت فروشی کی منڈی میں نام پیدا کر چکی تھی لیکن نائلہ اس لائن کو قبول نہیں کر رہی تھی۔ صغیر نے ان کے آقاؤں کو یقین دلایا تھا کہ وہ نائلہ کو تیار کر لے گا۔ رحمو تانگے والے نے صغیر کے متعلق ان عصمت فروشوں کو ایسا تاثر دیا تھا جیسے یہ جرم و گناہ کی دُنیا کا کوئی اُستاد ہے اور اِسے تھوڑے عرصے کے لئے روپوش رہنے کی ضرورت ہے۔ ان عصمت فروشوں کو رحمو پر اعتماد تھا اس لئے انہوں نے یہ پوچھنے کی ضرورت محسوس

نہیں کی تھی کہ صغیر کہاں کا رہنے والا ہے اور اس کی ہسٹری کیا ہے۔

صغیر نے دو تین دنوں میں ہی ان لوگوں پر اپنا رُعب اور اپنا اعتماد پیدا کر لیا تھا۔ ان لوگوں نے اُس کی زخمی ٹانگ کی مرہم پٹی کا انتظام بھی خفیہ طریقے سے کروا دیا تھا۔ چونکہ اُس نے کہا تھا کہ وہ نائلہ کو اس لائن پر چلا لے گا اس لئے نائلہ کو موقع دیا جاتا تھا کہ وہ صغیر کے پاس الگ تھلگ بیٹھ جایا کرے۔ صغیر نے اپنا نام اکبر بتایا تھا۔

"تم جس طرح یہاں پہنچی ہو وہ مَیں یہاں آنے سے پہلے ہی سُن چکا ہوں" — صغیر نے نائلہ سے پہلی تنہائی کی ملاقات میں کہا — "مجھے بتایا گیا ہے کہ تم اس راستے پر چلنے کے لئے اپنے آپ کو آمادہ نہیں کر رہی جس طرح تمہاری بہن چل پڑی ہے۔ مَیں نے تمہارے مالکوں کو یہ امید دلائی ہے کہ میں تمہیں اس کام کے لئے تیار کر لوں گا لیکن نائلہ! میں ایسا گناہ کبھی نہیں کروں گا لیکن تمہارے مالکوں کو یہ بتاتا رہوں گا کہ اس لڑکی کو میں تیار کر رہا ہوں۔ تم انہیں ایسا تاثر نہ دینا کہ تم میرے ساتھ بہت خوش ہو لیکن ایسی ایکٹنگ کرتی رہنا جیسے تم تیار ہو رہی ہو"۔

"تمہیں میرے ساتھ کیا دلچسپی ہے؟" — نائلہ نے پوچھا۔

"یہ اُس وقت بتاؤں گا جب تم پر میرا اعتماد پکا ہو جائے گا" — صغیر نے جواب دیا — "میں تمہیں دھوکہ نہیں دوں گا۔ تمہارے مطلب کی بات میں نے پہلے ہی کہہ دی ہے کہ تمہیں نہ بدکاری کے لئے تیار کروں گا اور نہ تمہیں اس راستے پر چلنے دوں گا خواہ خود تم آمادہ بھی ہو جاؤ۔ مَیں تمہیں یہاں سے نکالنے کی پوری کوشش کروں گا"۔

"مجھے یقین نہیں آتا" — نائلہ نے کہا — "اس غلیظ دنیا میں جہاں عصمتیں نیلام ہوتی ہیں، کسی ہمدرد کا وجود قابل یقین نہیں لگتا"۔

"دیکھو نائلہ!" — صغیر نے کہا — "تم نے پوچھا تھا کہ میرے دل میں تمہاری ہمدردی کیوں پیدا ہوئی ہے۔ میں اسی پنجاب کا رہنے والا ہوں جہاں کی تم رہنے والی ہو۔ میرا مطلب پاکستانی پنجاب سے ہے۔ 1971ء میں پاکستان آدھا رہ گیا تھا لیکن اصل یہ تھا کہ تم جیسی ہزاروں لڑکیاں کلکتہ کے بازاروں میں پہنچا دی گئی تھیں۔ ان میں تم ایک مجھے مل گئی ہو۔ میں اسے ایک نیکی سمجھوں گا کہ تمہیں یہاں سے نکال کر تمہارے گھر تک پہنچا دوں"۔

"تم پاکستانی پنجاب کے ہو" — نائلہ نے کہا — "پھر یہاں کیا لینے آئے ہو؟ کیا یہ

لوگ تمہارے رشتہ دار تھے؟"

"میرے متعلق مجھ سے کچھ بھی نہ پوچھو" — صغیر نے کہا — "اگر اپنا بھلا چاہتی ہو تو مجھے ایک انسان اور مسلمان سمجھو۔ میری اصلیت کو یہ لوگ بھی نہیں جانتے اور یہ جان بھی نہیں سکیں گے۔ میں تمہیں یہاں سے نکال کر لے جاؤں گا"۔

یہ تو پہلی ملاقات تھی۔ ایسا تو ہو نہیں سکتا تھا کہ پہلی ملاقات میں ہی نائلہ اس اجنبی پر اعتماد کر لیتی۔ ایسی دو تین ملاقاتیں ہوئیں تو نائلہ کو یقین آنے لگا کہ صغیر پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ صغیر کوئی شریف آدمی نہیں تھا۔ اس نے تو اپنا ملک اور اپنا ایمان بھی بیچ ڈالا تھا۔ اس سے زیادہ گھناؤنا جرم اور گناہ اور کیا ہو سکتا تھا۔ اس نے انٹیلی جنس سے تربیت حاصل کی تھی۔ وہ لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی مہارت رکھتا تھا اور چرب زبانی کا بھی ماہر تھا۔ اس نے نائلہ پر اپنا اثر پیدا کر لیا اور پھر ایسے بھی ہُوا کہ نائلہ آدھی رات کو اٹھ کر بھی اس کے کمرے میں چلی جاتی تھی۔

پھر ان کی یہ ملاقاتیں محبت کی صورت اختیار کر گئیں۔ یہاں تک بھی ہُوا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے اتنے قریب بیٹھنے لگے کہ ان کے درمیان سے ہوا کا گزر بھی ناممکن ہو جاتا تھا۔ ان کی سانسیں ٹکراتی تھیں۔ ان کی انگلیاں ایک دوسری سے الجھ جاتی تھیں اور دلوں کی دھڑکنیں کہیں زیادہ تیز ہو جایا کرتی تھیں پھر بھی صغیر نے پاکیزگی کا دامن نہ چھوڑا اور یہ احتیاط بھی کی کہ محبت کے رومانی جذبات سے مغلوب ہو کر بھی اس نے اپنی اصلیت نائلہ پر ظاہر نہ ہونے دی۔

○

"نائلہ!" — ایک ملاقات میں صغیر نے نائلہ سے پوچھا — "مَیں حیران ہوں کہ تمہاری بڑی بہن کس طرح پختہ کار طوائف بن چکی ہے"۔

"مَیں بتاتی ہوں" — نائلہ نے کہا — "شمیم تو جوان ہوتے ہی رومان پسند ہو گئی تھی۔ ہم ڈھاکہ میں ہُوا کرتے تھے۔ ہمارے ابّا جان بہت بڑے ٹھیکیدار تھے۔ ٹھیکے لینے کے لئے انہیں ٹھیکے دینے والے افسروں کی بہت خدمت کرنا پڑتی تھی۔ شمیم اُس وقت جوان تھی۔ ابّا جان نے اسے افسروں کے ساتھ فری ہونے کا موقع دیا اور ساتھ ہی یہ ٹریننگ بھی دی کہ وہ اپنی عزت کو بچا کر رکھے۔ اُس وقت شمیم کالج میں پڑھتی تھی۔ میں چھوٹی تو تھی لیکن اتنی چھوٹی بھی نہیں کہ کچھ سمجھ نہ سکتی۔ میں جانتی تھی کہ شمیم

نے کالج میں دوستیاں لگا رکھی ہیں۔ ہمارے گھر میں پیسے کی فراوانی تھی۔ شمیم نوجوان اور خوبصورت تھی، ہماری ماں تک کا دماغ دولتمندی کی وجہ سے خراب ہو گیا تھا۔ وہ خوش ہوتی تھی کہ اس کی بیٹی ماڈرن ہے۔ میں جانتی تھی کہ شمیم ماڈرن بننے کی کیا قیمت دے رہی ہے۔ اُس وقت اور آج کے وقت میں فرق صرف یہ ہے کہ اُس وقت شمیم کو کوئی طوائف نہیں کہتا تھا اور اب یہ طوائف کہلاتی ہے.....

"مَیں بھی اِسی فیملی کی لڑکی تھی لیکن یہ اللہ کا کرم ہے کہ میرا دماغ اس طرح ماڈرن بننے کی طرف نہ گیا۔ شاید اس لئے کہ بچپن سے ہی میری سہیلیاں اُن گھروں کی لڑکیاں بنیں جن میں مذہب اور اخلاق موجود تھا۔ اس سے ذرا بڑی ہوئی تو مشرقی پاکستان میں قیامت کا طوفان آ گیا۔ ابّا جان قتل ہو گئے۔ ماں کا کچھ پتہ نہ چلا۔ ایک ہی بھائی تھا، اس کا بھی کچھ پتہ نہ چلا اور ہم دونوں اغوا ہو گئیں۔ مجھے شروع سے ہی ہندوؤں سے نفرت تھی۔ ہمیں بہت ذلیل و خوار کر کے یہاں تک پہنچایا گیا۔ اللہ کا شکر ہے کہ میں جب اغوا ہوئی اور یہاں تک پہنچی اُس وقت تک میں چھوٹی تھی اس لئے میری عصمت محفوظ رہی۔ میں یہاں جوان ہوئی ہوں اور ابھی تک باعصمت ہوں....

"یہاں کا ایک جاگیردار میرا پہلا گاہک بننے کی خواہش کرتا ہے لیکن میرا ذہن قبول نہیں کر رہا۔ ایک بار اس جاگیردار نے شمیم کو اور مجھے اپنے گھر مدعو کیا تھا۔ ہمارے یہ مالک بھی ساتھ تھے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ یہ عام قسم کے عصمت فروش نہیں بلکہ یہ شریفوں کی کسی بڑی اونچی محفل میں جا بیٹھیں تو انہیں نہ جاننے والے یہی کہیں گے کہ یہ تو بڑے شائستہ اور تہذیب یافتہ لوگ ہیں۔ جاگیردار کوئی زیادہ عمر کا آدمی نہیں۔ میرا خیال ہے اُس کی عمر پینتیس سال سے کم ہی ہو گی اور وہ خوبرو آدمی ہے"۔

"ایسا خوبرو تو نہیں کہ تم اس کی محبت میں گرفتار ہو جاؤ؟" — صغیر نے جذباتی سے انداز میں کہا۔

"تم ایسی باتیں کیوں کرتے ہو اکبر!" — نائلہ نے کہا — "مَیں ایسی تو نہیں کہ کسی بدکار خوبرو آدمی کو دیکھوں تو اُس کی شکل و صورت اور دولت پر مر مٹوں۔ میں تمہیں یہ ساری باتیں اس لئے بتا رہی ہوں کہ شاید تم یہاں سے نکلنے اور مجھے یہاں سے نکالنے کا کوئی راستہ یا ذریعہ سوچ سکو"۔

یہ الگ بات ہے کہ صغیر کا دماغ قومی جذبے کے تحت اپنے اصل مقام پر آ گیا تھا

لیکن یہ دماغ ہندو جیسی عیّار قوم کا تربیت یافتہ تھا اور پھر اسے انٹیلی جنس کی ٹریننگ دی
تھی اس لئے وہ بہتر سے بہتر راستے اور ذریعے سوچ سکتا تھا۔ اس معاملے میں بھی اس
نے ایک راستہ دیکھ لیا۔

"نائلہ!" — صغیر نے کہا — "ذہن میں ایک بات آتی ہے۔ یہ سوچ لو کہ میں
یہاں کیوں چھپا ہُوا ہوں۔ میں کوئی چور اور ڈاکو نہیں۔ بات یہ ہے کہ مَیں بغیر ویزا اور
پاسپورٹ کے یہاں آ گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میرا خاندان یہاں سے ہجرت کر کے
پاکستان گیا تھا۔ میرے والدین مجھے ایسی باتیں سناتے رہے ہیں کہ میرے خون میں اُبال
آ گیا اور مَیں اس عمر میں آ کر اس اُبال کے جوش میں اندھا دُھند سرحد پار کر کے یہاں آ
گیا۔ تم نے دیکھ لیا ہے کہ مَیں کتنا جذباتی آدمی ہوں۔ تمہارے متعلق پتہ چلا کہ تم
عصمت فروشی کو قبول نہیں کر رہیں تو مَیں اپنی مشکلات کو بھُول کر تمہاری مدد کے لئے
تیار ہو گیا۔ معلوم نہیں تم جانتی ہو یا نہیں کہ انڈیا کی پولیس مجھ جیسے پاکستانیوں کی تلاش
میں رہتی ہے۔ اگر کوئی مجھ جیسا آدمی انہیں مل جائے تو اُسے جاسوس کہہ کر جیل میں
ڈال دیتے ہیں اور پھر اسے پاکستان کے خلاف جاسوسی کے لئے تیار کرتے ہیں۔ میں
گرفتار نہیں ہونا چاہتا نائلہ! یہاں کی پولیس نے مجھے دیکھ لیا ہے اور وہ مجھے تلاش کر
رہے ہیں"۔

"میں بھی تمہاری ہی طرح پاکستان کے معاملے میں جذباتی ہوں" — نائلہ نے کہا
— "اگر تمہاری یہ مشکل ہے تو تم نے بیان کی ہے تو خدا کی قسم، میں تمہاری پوری مدد
کروں گی اور جان پر کھیل جاؤں گی"۔

"میں نے ایک راستہ سوچا ہے" — صغیر نے کہا — "میں اگر اس جاگیردار سے
ملوں اور اس سے کہوں کہ اگر تمہیں نائلہ کی ضرورت ہے تو اسے میں لے آؤں گا شرط
یہ ہے کہ مجھے یہاں سے نکالو"۔

"وہ دھوکہ بھی دے سکتا ہے" — نائلہ نے کہا۔

"میں اتنا کچا نہیں نائلہ!" — صغیر نے کہا — "میں اگر اس سے ملا تو اس کی نیت
بھانپ لوں گا۔ مجھے اس کا گھر معلوم ہونا چاہئے"۔

"یہ تو میں بھی بتا سکتی ہوں" — نائلہ نے کہا۔

"مشکل یہ ہے نائلہ!" — صغیر نے کہا — "مَیں اس شہر سے واقف نہیں"۔

"اس کا گھر ڈھونڈنا بڑا آسان ہے" — نائلہ نے کہا — "میں تمہیں موٹی موٹی
نشانیاں بتا دوں گی اور تم آسانی سے اس کے پاس پہنچ جاؤ گے .... اس سے زیادہ آسان
طریقہ یہ ہے کہ وہ مشہور آدمی ہے۔ تانگے والے بھی اسے جانتے ہیں۔ میرا خیال ہے
کہ کسی بھی تانگے والے کو اس کے گھر کا نام بتاؤ گے تو وہ تمہیں وہاں تک پہنچا دے گا۔
اب یہ سوچنا تمہارا کام ہے کہ تمہارا اس سے ملنا ٹھیک ہے یا نہیں"۔

"یہ میں سوچ لوں گا" — صغیر نے کہا۔



صغیر کو نائلہ کے ساتھ دلچسپی تھی یا نہیں، اس کا اصل مسئلہ تو یہ تھا کہ پاکستان پہنچنے
کا کوئی ذریعہ نکل آئے۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ نائلہ کو وہ یہاں سے نکالنے کا
ارادہ کر چکا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس کے دل میں نائلہ کی وہ محبت پیدا ہو گئی تھی
جس کی خاطر انسان بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لئے بھی تیار ہو جاتا ہے۔ اس نے اس
پر بھی غور کیا کہ وہ اکیلا نہیں نکل سکتا تو نائلہ کو ساتھ لے کر پاکستان تک کیسے پہنچے گا۔
بہت سوچ بچار کے بعد اس نے ایک راستہ سوچ لیا۔

اُسے رحمو تانگے والے کا خیال آیا اور وہ سوچنے لگا کہ رحمو کے ساتھ وہ بات کر
لے تو کیا رحمو اُسے اس جاگیردار تک پہنچا دے گا؟ سوچ سوچ کر وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ
ان عصمت فروشوں کے ساتھ رحمو کا بڑا پرانا یارانہ ہے اور یہ عصمت فروش اُس کی
آمدنی کا ذریعہ بھی ہیں اس لئے رحمو تعاون نہیں کرے گا بلکہ وہ دھوکا بھی دے
سکتا ہے۔ بیشک رحمو کے دل میں ہندو کی نفرت اور پاکستان کی محبت موجود تھی لیکن وہ
کوئی اتنا زیادہ پڑھا لکھا آدمی نہیں تھا۔ قدرتی بات تھی کہ اُس نے اپنا مفاد بھی سوچنا
تھا۔

اتنے دن صغیر نے شیو نہیں کی تھی۔ اُس کی داڑھی خاصی نکل آئی تھی جس سے
اس کا چہرہ کچھ ڈھانپا گیا تھا۔ وہ اب لنگڑائے بغیر چل سکتا تھا۔ ایک رات اُس نے اپنے
عصمت فروش میزبانوں سے کہا کہ وہ ذرا گھومنے پھرنے کے لئے جانا چاہتا ہے۔ انہوں
نے اُسے روکا کہ وہ باہر نہ نکلے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ پکڑا جائے۔ صغیر جاگیردار تک پہنچنے
کا ارادہ کر چکا تھا۔ اس کے علاوہ اُس نے سوچ لیا تھا کہ کوئی نہ کوئی خطرہ تو مُول لینا ہی
پڑے گا۔ اندر بیٹھے بیٹھے تو انڈیا سے فرار کا کوئی ذریعہ پیدا نہیں ہو گا۔

تھوڑی دیر بعد صغیر بازارِ حسن میں سے گزر رہا تھا۔ اُسے نائلہ کے مالکوں نے اپنے کپڑے دیئے تھے۔ ان میں ایک چغہ بھی تھا۔ سر پر اُس نے مولویوں جیسی پگڑی لپیٹ لی تھی۔ کندھے پر تولیہ ڈال لیا تھا۔ وہ کسی مدرسے یا مسجد کا مولوی لگتا تھا۔

یہ رات کا وقت تھا جب عصمت فروشی کے بازار میں دن کا سماں ہوتا ہے۔ بازار کی رونق جوبن پر تھی۔ کوئی کسی کو پہچاننے کی کوشش نہیں کر رہا تھا بلکہ ہر کسی کی کوشش تھی کہ کوئی اُسے نہ پہچان لے۔ صغیر تماش بینوں کے اس متحرک ہجوم میں سے گزرتا تانگوں کے اڈے تک پہنچ گیا۔ دو تین تانگے والے اُس کی طرف دوڑے اور پوچھا کہ وہ کہاں جانا چاہتا ہے۔

"چوہدری قادر بخش کا گھر جانتے ہو؟" — صغیر نے اُن سے پوچھا اور کہا — "وہ جو بہت بڑے جاگیردار ہیں" — اور اُس نے ایک نشانی اور بھی بتائی۔

"مَیں جانتا ہوں" — ایک کوچوان نے کہا — "آیئے مولوی صاحب' اِدھر آ جائیں"۔

تانگے والے نے اُسے جاگیردار کے گھر پہنچا دیا اور منہ مانگے پیسے لے لئے۔

رات کے گیارہ بج رہے تھے جب صغیر ایک اجنبی جاگیردار کے دروازے پر کھڑا تھا۔ یہ ایک عالیشان کوٹھی تھی۔ اندر کمروں میں روشنی تھی۔ صغیر نے ڈرتے ڈرتے دروازے کی گھنٹی کا سوئچ دبا دیا جس کے جواب میں اندر سے دو کُتوں کے بھونکنے کی آوازیں آئیں اور پھر ایک نوکر باہر آیا اور صغیر سے پوچھا کہ وہ کِس سے ملنا چاہتا ہے۔

"چوہدری صاحب سے ملنے آیا ہوں" — صغیر نے کہا — "اگر وہ آرام نہ کر رہے ہوں تو انہیں اطلاع دو .... اور یہ ضرور کہنا کہ وہ مجھے نہیں جانتے' کام بہت ضروری ہے"۔

نوکر کچھ کہے بغیر چلا گیا اور جلد ہی واپس آکر اُس نے صغیر سے کہا کہ وہ آ جائے۔

چوہدری قادر بخش ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہُوا تھا۔ نوکر نے صغیر کو ڈرائنگ روم میں داخل کر دیا۔ چوہدری قادر بخش نے بڑے اچھے طریقے سے صغیر کا استقبال کیا اور اُسے احترام سے بٹھایا۔

"آپ آرام تو نہیں کر رہے تھے؟" — صغیر نے پوچھا۔

"آرام کر رہا تھا تو کیا!" — چوہدری قادر بخش نے بڑے شگفتہ لہجے میں کہا —

"آپ نہ جانے کتنی دُور سے آئے ہیں تو کیا مَیں یہ جواب دیتا کہ مَیں آرام کر رہا ہوں؟ آپ حکم کریں مَیں کیا خدمت کر سکتا ہوں"۔

صغیر نے چوہدری قادر بخش کے انداز سے ہی اندازہ کر لیا کہ یہ شخص اُن جاگیرداروں سے بالکل مختلف ہے جن کی کہانیاں ہم سنتے سناتے رہتے ہیں اور جو ہماری آنکھوں کے سامنے اپنے علاقے کے لوگوں کے لئے فرعون بنے رہتے ہیں۔

"مَیں بغیر تمہید کے بات کروں گا" — صغیر نے کہا — "آپ مجھے ایک معزز آدمی سمجھ رہے ہوں گے لیکن میری بات کا تعلق عصمت فروشوں کے ساتھ ہے .... البتہ یہ یقین دلا سکتا ہوں کہ میرا اِن لوگوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ میرا تعلق ایک نوجوان لڑکی کے ساتھ ہے جو ان کے پاس ہے اور معلوم ہُوا ہے کہ آپ اس لڑکی میں دلچسپی رکھتے ہیں"۔

"آپ نائلہ کی بات تو نہیں کر رہے؟" — چوہدری قادر بخش نے پوچھا۔

"جی چوہدری صاحب!" — صغیر نے جواب دیا — "مَیں آپ کو سب سے پہلے یہ بتا دوں کہ مَیں اس لڑکی کا سودا کرنے نہیں آیا بلکہ اُسے وہاں سے نکالنے کے لئے آیا ہوں"۔

صغیر نے یہ بات اندھا دُھند کہہ دی تھی۔ جاگیردار نے تو یہی کہنا تھا کہ ہاں بھئی اُس لڑکی کو نکال لاؤ اور میرے گھر لے آؤ۔ صغیر نے یہ خاص طور پر دیکھا تھا کہ یہ جاگیردار جوان آدمی ہے' خوبرو ہے اور اس کی طبیعت میں شگفتگی بھی ہے۔

"پہلے آپ یہ بتائیں" — چوہدری قادر بخش نے پوچھا — "آپ کا اس لڑکی کے ساتھ کیا تعلق ہے اور آپ اِسے وہاں سے کیوں نکالنا چاہتے ہیں۔ مجھے آپ کی بات کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے .... جس طرح آپ نے اپنے متعلق بتایا ہے کہ آپ کا تعلق عصمت فروشوں کے ساتھ نہیں اس طرح مَیں آپ کو صاف الفاظ میں بتا دیتا ہوں کہ مَیں اس لڑکی کا گاہک نہیں بننا چاہتا۔ مجھ میں یہ خرابی ہے کہ مَیں گانے سننے کا عادی ہوں بدکاری کا نہیں۔ مَیں نے اس لڑکی کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ یہ مجھے اتنی اچھی لگی اور اتنی بھولی بھالی کہ مَیں نے اس کے حالات معلوم کئے' پتہ چلا یہ دو بہنیں ہیں۔ بڑی بہن اس پیشے میں رواں دواں ہے اور یہ چھوٹی انکار کر رہی ہے۔ مَیں نے اس کے مالکوں سے یہ ضرور کہا تھا کہ مَیں اس کا پہلا گاہک بننا چاہتا ہوں لیکن مَیں نے دل میں یہ رکھی

ہوئی تھی کہ ایک بار یہ لڑکی میرے پاس آ جائے تو پھر خدا کے سوا اِسے مجھ سے کوئی
واپس نہیں لے سکتا۔ مَیں اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہوں"۔

"الحمدللہ" — صغیر نے کہا — "اس سے زیادہ نیک ارادہ اور کیا ہو گا.... اب مَیں
آپ کو بتاتا ہوں کہ میرا اس لڑکی کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ یہ دونوں بہنیں 1971ء میں
ڈھاکہ سے اغوا ہوئی تھیں"۔

"یہ مَیں جانتا ہوں" — چوہدری قادر بخش نے ہنستے ہوئے کہا — "مَیں ان کے
متعلق سب کچھ جانتا ہوں"۔

"پھر آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ یہ دو بہنیں پاکستانی ہیں" — صغیر نے کہا۔
"اور مَیں ان کا قریبی رشتہ دار ہوں۔ اگر مَیں آپ کو بتاؤں کہ مَیں ان تک کس طرح
پہنچا تو اس میں ایک خطرہ تو یہ ہے کہ آپ یقین نہیں کریں گے اور دوسرا خطرہ یہ کہ
آپ میرے خلاف کارروائی بھی کر سکتے ہیں۔ یہ مَیں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ یہاں کے
مسلمان ہندوؤں سے مرعوب اور ہندوؤں کو خوش کرنے کی کوشش میں لگے رہتے
ہیں"۔

"میرے ہاں ایسی کوئی بات نہیں" — چوہدری قادر بخش نے کہا — "مجھے کسی کی
خوشامد کرنے کی ضرورت نہیں۔ میری اپنی ایک حیثیت ہے جسے ہندو بھی مانتے ہیں۔
بڑے بڑے افسروں تک میرا اثر و رسوخ بھی ہے۔ آپ دل سے تمام خطرے اُتار دیں
اور کُھل کر بات کریں"۔

"مَیں پاکستانی ہوں" — صغیر نے کہا — "مَیں یہاں بغیر پاسپورٹ اور ویزا کے آیا
تھا" — صغیر نے وہی چھوٹی کہانی چوہدری قادر بخش کو بھی سنا دی جو وہ رحمو اور نائلہ کو
بھی سنا چکا تھا — "اتفاق دیکھئے کہ ایک تانگے والا مل گیا۔ وہ بھی میری طرح کا زخم خوردہ
تھا۔ اُس نے مجھے ان عصمت فروشوں کے ہاں چھپا لیا اور وہاں شمیم اور نائلہ سے
ملاقات ہوئی۔ مجھے پتہ چلا کہ نائلہ اپنے جسم کو بیچنا نہیں چاہتی۔ ان عصمت فروشوں
نے مجھ پر بھروسہ کیا۔ مَیں تو کہتا ہوں کہ یہ اتفاق اللہ نے پیدا کیا ہے کہ مجھے ان لڑکیوں
تک پہنچا دیا۔ میرا خیال ہے نائلہ بھی آپ کو چاہتی ہے۔ اگر آپ سچے دل سے اس کے
ساتھ شادی کرنا چاہتے ہیں تو مَیں اُس لڑکی کو یہاں تک لا سکتا ہوں۔ اس اُمید کے ساتھ
کہ آپ سچے دل سے اس کے ساتھ شادی کریں گے۔ مَیں آپ سے صرف یہ اُجرت

لُوں گا کہ مجھے پاکستان پہنچا دیں"۔

"کیا آپ مجھ سے قرآن پر حلف لینا چاہتے ہیں؟"

"نہیں چوہدری صاحب!" — صغیر نے کہا — "مَیں آپ سے کوئی قسم نہیں لینا
چاہتا۔ یہ میرا تجربہ ہے کہ قسمیں کھانے والے لوگ سچے نہیں ہوتے .... میری
دیانتداری کا اندازہ اس سے کریں کہ مَیں آپ سے لڑکی کی قیمت کا مطالبہ نہیں کر رہا۔
میرا مطالبہ یا میری ضرورت یہ ہے کہ مجھے اپنے گھر میں چھپائے رکھیں اور جب آپ
موقع محل دیکھیں، مجھے یہاں سے نکال دیں"۔

"آپ لڑکی کو لائیں گے کیسے؟" — چوہدری قادر بخش نے پوچھا۔

"وہاں سے نکال لاؤں گا" — صغیر نے کہا — "آگے آپ کا ایسا انتظام ہونا چاہئے
کہ یہاں تک خیریت سے پہنچ جائیں۔ یہ بھی دیکھ لیں کہ میری ٹانگ زخمی ہے"۔

"یہ کوئی مشکل کام نہیں" — چوہدری قادر بخش نے کہا — "اُس بازار کے باہر
میری گاڑی کھڑی ہو گی۔ لڑکی کو وہاں سے گاڑی تک پہنچانا آپ کا کام ہے۔ گاڑی تک
پہنچ گئے تو وہاں سے میری ذمہ داری شروع ہو جائے گی"۔

دونوں نے نائلہ کے فرار کی ترکیبوں پر تبادلۂ خیالات کیا اور آخر ایک بات طے
ہو گئی۔ صغیر نے کہا کہ کل ہی رات گاڑی آ جائے اور جتنے گھنٹے انتظار کرنا پڑے
ڈرائیور انتظار کرے۔

چوہدری قادر بخش نے صغیر کی خاطر مدارات کی اور اپنی گاڑی پر اُسے واپس
بھیجا۔ صغیر نے ڈرائیور کو جگہ بتا دی کہ کل رات گاڑی یہاں ہونی چاہئے۔

○

صغیر واپس عصمت فروشوں کے ٹھکانے تک پہنچ گیا۔ وہ لوگ اُس کے لئے
پریشان تھے۔ کہتے تھے کہ وہ تو یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ صغیر پکڑا گیا ہے۔ نائلہ تو اور زیادہ
پریشان تھی۔ وہ صغیر کے پاس بیٹھ گئی۔ اُس کے مالکوں نے انہیں تنہا چھوڑ دیا۔ انہیں
یقین ہو گیا تھا کہ صغیر نائلہ کو عصمت فروشی کے لئے تیار کر رہا ہے اور یہ یقیناً کامیاب
ہو گا۔

"وہ تو تمہارے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے نائلہ!" — صغیر نے نائلہ کو بتایا اور
چوہدری کے ساتھ اُس کی جتنی باتیں ہوئی تھیں وہ سب سنائیں اور اپنی رائے یہ دی

— "وہ شادی کے ارادے میں مکمل طور پر سنجیدہ نظر آتا ہے۔ باتوں باتوں میں اُس نے مجھے بتایا تھا کہ اُس کی شادی ہوئی تھی۔ ایک تو اولاد نہ ہوئی' دوسرے یہ کہ وہ لڑکی اُس کی پسند کی نہیں تھی اور وہ اس سے ازدواجی زندگی میں خاصا پریشان رہا پھر اُس کی یہ بیوی مرگئی۔ اب گذشتہ تین برسوں سے وہ اپنی پسند کی لڑکی کی تلاش میں ہے"۔

"لیکن اکبر!" — نائلہ نے کہا — "مَیں تمہیں صاف بتا دیتی ہوں کہ مَیں پاکستان جانا چاہتی ہوں اور تمہارے ساتھ شادی کروں گی۔ مَیں ایک جاگیردار کی بیوی نہیں بننا چاہتی۔ مَیں جانتی ہوں کہ ایسے جاگیردار بیوی تو ایک ہی رکھتے ہیں لیکن بے نکاحی بیویوں کا کوئی شمار نہیں ہوتا۔ اگر مَیں اُس کے ساتھ شادی کرلوں تو مجھے ہمیشہ اِسی مُلک میں رہنا پڑے گا جو مجھے منظور نہیں۔ میرے دل میں ہندوؤں کی نفرت اس قدر زیادہ ہے جس پر مَیں قابو پا ہی نہیں سکتی"۔

صغیر پر خاموشی طاری ہوگئی۔

"غور کرو نائلہ!" — صغیر نے کہا — "مَیں اکیلا اس مشل سے نہیں نکل سکتا۔ مَیں تم جیسی خوبصورت اور نوجوان لڑکی کو ساتھ لے کر کیسے نکلوں گا۔ مَیں نے دیکھ لیا ہے کہ یہ جاگیردار مجھے یہاں سے نکلوانے کا بہترین ذریعہ ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ تم اُس کے ساتھ شادی کرلو اور مَیں تمہارے ساتھ رہوں گا۔ اس چوہدری نے مجھے اپنے ساتھ رکھنے کا وعدہ کرلیا ہے۔ کچھ دِنوں بعد اِسے اُکسائیں گے کہ پاکستان کی سیر کے لئے ویزے بنوائے اور ہم دونوں کو ساتھ لے چلے۔ پاکستان پہنچ گئے تو مَیں اِسے آسانی سے قتل کرسکتا ہوں۔ اس سے یہ ہو گا کہ تم پاکستان میں بھی پہنچ جاؤ گی اور میرے ساتھ شادی بھی کرسکو گی۔ اس چوہدری کا اتنا اثر و رسوخ ہے کہ یہ تمہیں بیوی کی حیثیت سے اور مجھے نوکر کی حیثیت سے اپنے ساتھ لے جا سکتا ہے۔ یہ تو مَیں نے بھی محسوس کیا ہے کہ یہ شخص طوائفوں کے گانے سننے کا عادی ہے۔ تمہارے ساتھ شادی کر کے بھی یہ اپنا شغل جاری رکھے گا اور کسی اور نوجوان طوائف کو پسند کر کے تمہیں گھر میں قید کرلے گا لیکن یہاں سے نکلنا ہے تو اس کا ذریعہ یہی ہے جو مَیں نے بتایا ہے۔ کل رات اُس کی گاڑی آرہی ہے اور ہم نے یہاں سے نکل جانا ہے"۔

"مَیں تیار ہوں" — نائلہ نے کہا۔

○

وہ ایک تین منزلہ بلڈنگ تھی۔ نیچے سے اُوپر تک طوائفیں رہتی تھیں۔ نیچے تین چار کمرے ان لوگوں نے کرائے پر لے رکھے تھے جن کے پاس شمیم اور نائلہ تھیں۔ صغیر نے مین گیٹ کے علاوہ ایک راستہ دیکھ لیا تھا۔ یہ بلڈنگ کے پچھواڑے چھوٹا سا ایک دروازہ تھا جو عام طور پر آنے جانے کے لئے استعمال نہیں ہوتا تھا اور رات کو اُدھر اندھیرا ہی رہتا تھا۔ صغیر نے اچھی طرح دیکھ لیا تھا کہ اُدھر نکل گئے تو اتنی تاریکی ہے اور گلیوں کی بھول بھلّیاں ایسی ہیں کہ تعاقب کرنے والوں کو خاصی دشواری پیش آتی ہے۔

رات بارہ بجے کے بعد نائلہ صغیر کے پاس آئی۔ اُس وقت اس بلڈنگ میں خاصی رونق تھی۔ شمیم اپنے مستقل گاہوں کے ساتھ مصروف تھی۔ ان کے گاہک بڑی موٹی آسامیاں ہوتی تھیں۔ ان کے مالک ان گاہکوں کے ساتھ مصروف تھے۔ صغیر نے نائلہ کو ایک چادر دی جو اُس نے اپنے اُوپر اس طرح لے لی کہ چہرہ بھی ڈھانپا گیا۔ دونوں اللہ کا نام لے کر خاموشی سے اُٹھے اور جس طرف سے لوگ اس بلڈنگ میں داخل ہوتے تھے' اُدھر جانے کی بجائے پچھلی طرف چلے گئے اور پچھلا دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔ گلیوں میں گھومتے پھرتے اس علاقے سے بالکل ہی باہر چلے گئے اور پھر صغیر نے اُدھر کا رُخ کرلیا جدھر چوہدری قادر بخش کی گاڑی نے آنا تھا۔ صغیر نے دُور سے ہی دیکھ لیا کہ سٹریٹ لائٹوں کی روشنی میں گاڑی کھڑی ہے۔

صغیر اُس روشنی میں جانے سے گریز کر رہا تھا۔ اُس نے نائلہ کو اندھیرے میں کھڑا کردیا اور خود گاڑی کی طرف چل پڑا۔ ڈرائیور گاڑی کے باہر کھڑا تھا۔ تانگے اور کاریں آ جا رہی تھیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے رات گزرنے کے ساتھ ساتھ اس علاقے کی رونق بڑھتی جا رہی ہے۔ ڈرائیور نے اس طرف دیکھا تو صغیر نے ہاتھ اُوپر کر کے اشارہ کیا۔ ڈرائیور بڑی تیزی سے گاڑی میں بیٹھا اور دو منٹ بعد گاڑی صغیر کے پاس آکر رُک گئی۔

"آگے لے چلو" — صغیر نے پچھلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے ڈرائیور سے کہا۔

کار اُس جگہ رُک گئی جہاں نائلہ کھڑی تھی۔ صغیر نے اُسے دروازہ کھول کر پچھلی سیٹ پر اپنے ساتھ بٹھالیا۔

"چلو بھائی!" — صغیر نے ڈرائیور سے کہا — "تیز چلنا ہے"۔

"مجھے معلوم ہے" — ڈرائیور نے کہا۔

کار چل پڑی اور موڑ کاٹتی ہوئی چوہدری قادر بخش کی کوٹھی تک پہنچ گئی۔ چوہدری بیتابی سے انتظار کر رہا تھا۔

چوہدری نے صغیر اور نائلہ کی خاطر تواضع کی۔

"دیکھو نائلہ!" — چوہدری قادر بخش نے کہا — "مجھے غلط نہ سمجھنا۔ نکاح سے پہلے تم ان کے ساتھ الگ کمرے میں رہو گی۔ کل نکاح خواں آ جائے گا اور نکاح ہو جائے گا.... مَیں تمہیں موقع دیتا ہوں کہ اچھی طرح سوچ لو۔ مَیں تمہیں باقاعدہ شریعت کے مطابق بیوی بنا رہا ہوں۔ تم اکیلی ہو۔ اکبر صاحب کے سوا تمہارا یہاں کوئی وارث نہیں۔ مَیں یہ نہیں کہلوانا چاہتا کہ مَیں نے تمہارے ساتھ زبردستی یا تمہاری کسی مجبوری کے تحت شادی کی ہے۔ خدا نے مجھے بادشاہی بخشی ہے۔ میرے لئے لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں لیکن مجھے وہ بیوی چاہئے جسے میرا دل قبول کرے۔ میں نے تم میں صرف یہ خوبی نہیں دیکھی کہ تم خوبصورت اور نوجوان ہو بلکہ یہ خوبی دیکھی ہے کہ تم اپنے جسم کو پاک رکھنا چاہتی ہو اور تمہارا ضمیر تمہیں بدکاری کی طرف نہیں جانے دے رہا۔ مَیں تمہیں پاک لڑکی سمجھتا ہوں"۔

نائلہ نے سر جھکا لیا اور مُنہ سے کچھ بھی نہ بولی جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ رضامند ہے۔

چوہدری نے اُنہیں الگ کمرے میں بھیج دیا۔

صبح ہوئی تو ان کا ناشتہ کمرے میں ہی آیا۔ یہ دونوں ناشتہ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ بڑا ہی پُرتکلف ناشتہ تھا۔

دن کے بارہ بج رہے تھے جب چوہدری ان کے کمرے میں آیا اور انہیں اطلاع دی کہ نکاح خواں آ گیا ہے اور وہ تھوڑی دیر تک نائلہ کے پاس ایجاب و قبول کے لئے آئے گا۔

نائلہ نوخیز لڑکی تھی۔ اُس کا دل بڑی تیزی سے دھڑکنے لگا اور اس کے ساتھ ہی اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ صغیر اُس کے جذبات کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔

"امّی اور ابّو یاد آ رہے ہیں" — نائلہ نے روتے ہوئے کہا — "اگر اُن کی زندگی میں میری شادی ہوتی تو سینکڑوں لوگ مدعو ہوتے اور مَیں اب بھی تصور کر سکتی ہوں کہ

کیسی رونق لگتی لیکن خدا نے معلوم نہیں کس گناہ کی سزا دی ہے کہ کس حال میں میری شادی ہو رہی ہے اور آگے نہ جانے کیا ہو۔ میرا میکہ تو کوئی ہے ہی نہیں"۔

"دل کو مضبوط کرو نائلہ!" — صغیر نے کہا — "یہ عارضی شادی ہے۔ دُعا کرو کہ ہم نے جو سکیم سوچی ہے وہ کامیاب ہو جائے۔ شکر والی بات تو یہی ہے کہ تم گناہوں کی اُس دُنیا سے نکل آئی ہو۔ یہ اللہ کی مدد ہے اور مجھے اُمید ہے کہ اللہ آخر دم تک ہمارا مددگار رہے گا"۔

اتنے میں ایک مولوی کمرے میں داخل ہُوا۔ اُس کے ساتھ ایک آدمی اور تھا۔ مولوی نائلہ کے پاس بیٹھ گیا اور اُس نے ایجاب و قبول کا فرض پورا کر دیا۔ نائلہ نے دبی دبی سی آواز میں "ہاں" کہی تھی اور اُس نے نکاح نامے پر دستخط بھی کر دیئے۔ نکاح خواں اُس آدمی کے ساتھ چلا گیا اور صغیر کو بھی اپنے ساتھ لے گیا۔

ڈرائنگ روم میں پانچ چھ آدمی بیٹھے تھے۔ نکاح خواں نے جا کر اعلان کیا کہ لڑکی نے دُولہا کو قبول کر لیا ہے۔ اس کے بعد نکاح کی باقی رسمیں پوری کی گئیں اور یہ سب لوگ ڈائننگ روم میں چلے گئے جہاں کھانا لگا ہُوا تھا۔

"اکبر صاحب!" — چوہدری قادر بخش نے صغیر کے کان میں کہا — "نائلہ اکیلی ہے۔ آپ اس کے پاس چلے جائیں۔ آپ کا کھانا وہیں آ جائے گا"۔

صغیر نائلہ کے کمرے میں چلا گیا۔ وہاں ایک نوکرانی موجود تھی۔ نوکرانی سے پوچھنے پر پتہ چلا کہ چوہدری قادر بخش کے ماں باپ فوت ہو چکے ہیں۔ اس کی صرف دو بہنیں ہیں۔ دونوں شادی شدہ ہیں اور جائیداد سے اپنا حصہ لے کر کبھی کی الگ ہو چکی ہیں۔ ان کے علاوہ چوہدری کا کوئی عزیز رشتہ دار نہیں تھا۔ ڈرائنگ روم میں جو مہمان موجود تھے وہ چوہدری کے یار دوست تھے۔

چوہدری قادر بخش اور نائلہ میاں بیوی بن گئے۔ چوہدری نے نائلہ کے لئے بہت سے زیورات اور کپڑے تیار کروا رکھے تھے جو نوکروں نے نائلہ کے آگے لا کر ڈھیر کر دیئے۔



صغیر کو الگ کمرہ دے دیا گیا اور چوہدری نے اُس کی مرہم پٹی کا انتظام کر دیا۔ اب اُس کا زخم تقریباً ٹھیک ہو چکا تھا اور وہ بڑے آرام سے چل پھر سکتا تھا لیکن وہ چوہدری

کو بتانا نہیں چاہتا تھا کہ اُس کا زخم ٹھیک ہو گیا ہے۔ اُسے یہ خدشہ محسوس ہوتا تھا کہ اُس نے ایسا بتا دیا تو چوہدری اُسے فوراً پاکستان بھجوانے کا بندوبست کر دے گا۔ وہ اتنی جلدی نہیں جانا چاہتا تھا کیونکہ سکیم کے مطابق اُس نے نائلہ کو بھی ساتھ لے جانا تھا۔

اگلے روز جب نائلہ کا نکاح پڑھا جا رہا تھا اُس کے مالک ریلوے سٹیشن کے قریب رحمو تانگے والے کے پاس کھڑے اُسے بُرا بھلا کہہ رہے تھے کہ وہ کس چور اچکے کو ان کے پاس چھوڑ گیا تھا جو لڑکی کو بھی بھگا کر لے گیا ہے۔ رحمو بڑی شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔

"میری بات پر غور کرو" — رحمو نے کہا — "اُسے چوہدری قادر بخش اُڑا لے گیا ہو گا"۔

"لیکن یہ بھی تو سوچو" — ایک آدمی نے کہا — "تمہارا یہ یار تو چوہدری کو جانتا ہی نہیں تھا۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ چوہدری اسے بھی اغوا کر کے لے گیا ہو"۔

"یہ ہو سکتا ہے" — ایک اور آدمی نے کہا — "اس آدمی کو چوہدری نے ہی بھیجا ہو گا اور اس نے تمہارے ساتھ یہ جھوٹ بولا ہو کہ وہ بغیر ویزے کے آیا ہُوا پاکستانی ہے۔ چوہدری نے اس آدمی کو نائلہ کو اغوا کرنے کے لئے ہی یہاں بھیجا ہو گا"۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ لڑکی اکبر کے ساتھ پاکستان کی طرف روانہ ہو گئی ہو" — ان میں سے کسی نے کہا — "اکبر نے تو بہرحال پاکستان ہی جانا تھا"۔

"کیوں نہ چوہدری کے پاس چلیں" — ایک نے مشورہ دیا — "اور اُسے بتائیں کہ تمہارا مال تو چوری ہو گیا ہے"۔

وہ سب چوہدری قادر بخش کے ہاں گئے اور وہاں سے بے عزتی کروا کر نکل آئے۔ چوہدری نے انہیں بہت گالیاں دیں اور کہا کہ وہ اس شک کی بناء پر آئے ہیں کہ اُس نے ان کی لڑکی اغوا کرائی ہے۔ اُس وقت نائلہ اور صغیر اسی کوٹھی کے ایک کمرے میں بیٹھے ہنس رہے تھے۔ انہوں نے کھڑکی کا پردہ ذرا سا ہٹا کر ان لوگوں کو آتے بھی دیکھا تھا اور جاتے بھی دیکھا۔

وہاں سے آ کر وہ اس علاقے کے تھانے میں چلے گئے۔ تھانیدار انہیں دیکھ کر احترام سے اُٹھ کھڑا ہُوا۔ وہ اس لئے کہ وہ جانتا تھا کہ یہ اونچی حیثیت کے عصمت فروش ہیں اور ان سے اسے ماہانہ وظیفہ ملتا تھا۔ انہوں نے تھانیدار کو بتایا کہ ایک لڑکی

کے ساتھ ہی وہ یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ نائلہ زیادہ تر چوہدری کے ساتھ ہی رہتی تھی اور صغیر کے پاس اُس نے بیٹھنا کم کر دیا تھا۔

"نائلہ!" — ایک روز صغیر نے نائلہ سے کہا — "چوہدری کو پاکستان کے لئے تیار کرو"۔

"کر لوں گی" — نائلہ نے کہا — "ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ ابھی وہ کم از کم ایک مہینہ شملہ میں رہنا چاہتے ہیں.... اچھا مَیں چلتی ہوں، وہ میرے انتظار میں ہوں گے"۔

صغیر کے دل پر چوٹ سی پڑی۔ وہ نائلہ کو اپنے پاس بٹھانا چاہتا تھا لیکن نائلہ نے کھڑے کھڑے بات سنی اور جواب دے کر چلی گئی۔

سولہ سترہ روز گزر گئے۔ صغیر نے نائلہ میں یہ تبدیلی دیکھی کہ اُس نے اُس کے پاس آنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ ایک روز صغیر نے نائلہ کو بازو سے پکڑ کر زبردستی اپنے پاس بٹھا لیا۔

"تم مجھ سے دُور ہٹتی جا رہی ہو نائلہ!" — صغیر نے اُداس سے لہجے میں کہا۔

"مَیں صاف بتا دوں؟" — نائلہ نے کہا — "مَیں جانتی ہوں تمہیں دُکھ ہو گا لیکن اکبر! چوہدری کی وارفتگی اور والہانہ محبت نے مجھے ایسی زنجیروں میں جکڑ لیا ہے کہ مَیں چوہدری کے بغیر ایک منٹ بھی نہیں رہ سکتی۔ اس شخص سے مجھے ایک دوست کا پیار بھی ملا ہے، خاوند کی وفا بھی ملی ہے اور اس شخص نے میرے باپ کی شفقت کی کمی بھی پوری کر دی ہے.... تم جب تک ہمارے ساتھ رہنا چاہتے ہو رہو، مَیں چوہدری سے کہوں گی کہ وہ تمہیں پاکستان تک پہنچانے کا بندوبست کر دے"۔

نائلہ نے یہ کہا اور چلی گئی۔ صغیر کو بہت ہی دُکھ ہُوا لیکن اُس نے اپنے آپ کو یہ کہہ کر تسلّی دی کہ پاکستان جانے کا بندوبست ہو جائے گا، پھر اُس نے اپنے آپ کو یہ تسلّی بھی دی کہ اُس نے ایک نیک اور پاک لڑکی کو گناہوں کی دُنیا سے نکال کر کسی کی بیوی بنا دیا ہے اور یہ لڑکی اس آدمی میں گھل مل گئی ہے۔

اگلے روز سورج شملہ کی پہاڑیوں سے پیچھے چلا گیا اور تاریکی ذرا گہری ہونے لگی تو صغیر نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر دیکھا تو اُسے ایک تھانیدار اور ایک کانسٹیبل اس مکان کے احاطے میں داخل ہوتے نظر آئے جن میں اُن کی رہائش تھی۔ صغیر کا خون جم کے رہ گیا۔ پولیس کی آمد کا مطلب یہ تھا کہ اُس کی نشاندہی ہو گئی ہے اور اب اُسے گرفتار کر

وطن عزیز پر مر مٹنے والوں کی جاں گداز داستان

واجدہ وینا اور وطن

حکایت کا مشہور و معروف سلسلہ، پہلی بار کتابی صورت میں

حصّہ دوم



عنایت اللہ

پیش لفظ!

واجدہ' وینا اور وطن کا پہلا حصہ پڑھا۔ یہ خون رنگ داستان ہمارے لئے سبق آموز بھی ہے اور حقیقت آشنا بھی' یہ داستان ہماری ہے اور ہم ہی اس داستان کا حصہ ہیں۔ ہماری سانسیں اس داستان میں رچی بسی ہیں۔ ہماری دھڑکنیں اس کی دھڑکنوں کے ساتھ دھک دھک کر رہی ہیں۔ یہ داستان ہم سے اس بات کی متقاضی ہے کہ ہم اپنے دشمنوں کے لئے دشمن اور دوستوں کے لئے دوست ثابت ہوں۔ مگر یہ کیا کہ ہم تو اپنے دشمنوں کے لئے دوست اور دوستوں کے لئے دشمن ثابت ہو رہے ہیں۔ آخر ہم کس طرف جا رہے ہیں۔ یہ امن اور آزادی کا راستہ تو نہیں ہے۔ یہ تو بربادی اور غلامی کی راہوں کی طرف ہم محو سفر ہیں۔

ہم اپنے دشمنوں کے ہاتھوں میں کھلونا کیوں بن رہے ہیں۔ انہیں کیوں نہیں اپنے اشارہ ابرو پر چلنے پر مجبور کرتے۔ ہم اپنا تشخص کیوں کھو رہے ہیں۔ محض چند رنگین کاغذوں کی خاطر اپنی پاک سرزمین سے لاتعلق ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ وطن ہے تو ہم ہیں۔ ہم ہیں تو یہ وطن بھی ہیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ ہم دل ہیں تو یہ وطن اس کی دھڑکن ہے۔

بعض لوگ اپنے لئے غداری کرتے ہیں۔ بعض دوسروں کے لئے اور کچھ ایسے ناعاقبت اندیش بھی ہوتے ہیں۔ جو اپنے وطن سے غداری کرتے ہیں۔ اپنے سے غداری یہ ہمارا ذاتی فعل ہے۔ دوسروں سے غداری اجتماعی فعل ہے اور وطن سے غداری قوم کی موت ہے۔ آیئے ایسے لوگوں کے خلاف ہم کمربستہ ہو جائیں۔ جو اس ملک کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہے ہیں۔ اس ملک کے درپے آزار ہیں ہمیں ایسے دشمنوں کی

کھوج لگانی چاہیئے اور ان غدارانِ وطن کو اٹھا کر بحیرہ قلزم میں پھینک دینا چاہیئے ایسے لوگوں کے ساتھ ہمدردی دراصل اپنے ساتھ اور اپنے وطن کے ساتھ دشمنی ہے۔

دشمن ہم پر گھات لگائے بیٹھا ہے اور ہم دشمن کے دامن میں بیٹھے ہیں۔ واجدہ' وینا اور وطن ایسے ہی غدارانِ وطن اور محبِ وطن لوگوں کی داستان ہے۔ اول الذکر نے جہاں پاک سرزمین کو نشانہ بنایا ہے۔ وہاں آخر الذکر نے اس پاک سرزمین کے لئے تن من دھن کی بازی لگادی۔ جیت کس کی ہوئی' خیر کی یا شر کی۔

جیت ہمیشہ خیر ہی کی ہوتی ہے۔ شر اپنی تمام تر خباثتوں کے باوجود ہمیشہ نیست و نابود ہی ہوا ہے۔ شر کو بقاء حاصل نہیں۔ دوائم ہمیشہ خیر ہی کو حاصل رہا ہے۔ یہ شر اور خیر کی جنگ ازل سے جاری ہے اور ابد تک رہے گی مگر فتح ہمیشہ خیر ہی کی ہوئی ہے۔ شیطان لعین تو ہمیشہ ذلیل و خوار ہی ہوا ہے۔ ذلت اس کا مقدر ہے اور لعنت اس کا طوق اللہ کے جانباز جب بھی سر بکف ہو کر میدان جہاد میں اترے تو دشمن اور کفار و بھاگتے ہی بنی۔ ذلت کا طوق انہوں نے اپنے ہاتھوں سے اپنے گلے میں ڈالا۔

بنتِ حوا کو ہم نے ہمیشہ کمزور ہی جانا' مگر یہ ہماری بھول ہے' بنت حوا تو ایک عزم صمیم ہے۔ ایک مضبوط چٹان ہے۔ ہر بڑے آدمی کی پشت پر ہمیشہ ایک عظیم عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ عورت ہی آدمی کو انسان' اور انسان کو شیطان بناتی ہے اور جب بھی بنتِ حوا اپنے وطن کے لئے قربانیوں کا زیور بنتی ہے تو بڑے بڑوں کے پتے پانی ہو جاتے ہیں عورت کے لئے سب سے عظیم رشتہ شوہر کا ہوتا ہے۔ مگر وطن کا رشتہ ان تمام رشتوں پر غالب ہے۔ وہ شوہر کے لئے اپنی جان قربان کر سکتی ہے اور وطن کے لئے شوہر کو۔

پاکستان کے سبز ہلال پرچم میں ہمارے لہو کی آمیزش بھی رچی بسی ہے۔ اس لہو کی مہک ہمیں آج تک اپنی سانسوں میں محسوس ہوتی ہے۔ ہماری قربانیوں کا یہ سفر ہمیشہ جاری رہے گا۔ ہماری آنے والی نسلیں اس کی محافظ ہوں گی اور یہ سبز ہلالی پرچم انشاء اللہ ہمیشہ آزاد اور بلند فضاؤں میں لہراتا رہے گا۔

پاکستان کی انٹیلی جنس کی تنظیم آئی ایس آئی کے انٹیروگیشن سنٹر کراچی میں جگ موہن ایک کمرے میں کرسی پر بیٹھا ہُوا تھا۔ ایک کرنل اور ایک میجر سویلین کپڑوں میں اس کے سامنے بیٹھے تھے۔

"میری ایک بات کان کھول کر سن لو جگ موہن!" — کرنل اسے کہہ رہا تھا —

"یہاں جو بھی مشتبہ یا ملزم آتا ہے وہ پہلی بات یہی کہتا ہے کہ میں کچھ نہیں جانتا اور جو اپنے آپ کو بہت دلیر سمجھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم کچھ نہیں بتائیں گے لیکن دو چار دنوں میں ہی تڑپ تڑپ کر بلبلاتے ہیں اور ہماری جوتیاں چاٹ چاٹ کر کہتے ہیں کہ پوچھو کیا پوچھنا ہے' ہم سب کچھ بتائیں گے۔ اُس وقت ان کی حالت ایسی ہوتی ہے جیسے لاشیں

بول رہی ہوں۔ میں تم پر یہ مہربانی کر رہا ہوں کہ تمہیں اُس حالت سے بچا رہا ہوں۔ تم نے جہاں یہ تسلیم کر لیا ہے کہ تم انڈین انٹیلی جنس کے آدمی ہو تو تمہارے سینے میں جو کچھ ہے وہ بھی باہر نکال دو۔ ہم نے تمہارے دونوں نوکروں کو بھی پکڑ لیا ہے اور وہ

دونوں ہندو ہیں۔ تم کچھ نہیں بتاؤ گے تو وہ بتا دیں گے۔ تم خود انٹیلی جنس کے آدمی ہو اور دعویٰ کرتے ہو کہ تم اتنے کچے بھی نہیں ہو تو تمہیں معلوم ہو گا کہ انٹیلی جنس کے ہاتھ کتنے لمبے ہوتے ہیں اور وہ گمشدہ کڑیاں ملا لیا کرتے ہیں۔ اگر ساری باتیں ہمیں

دوسرے ذرائع سے پتہ چلیں تو تمہارے ساتھ ہم دوستوں والا سلوک نہیں کریں گے"۔

"میں جانتا ہوں صاحب!" — جگ موہن نے کہا — "آپ نے جتنی باتیں کی ہیں وہ آپ کی زبان پر چڑھی ہوئی ہیں۔ آپ ہر ملزم اور ہر مشتبہ کے ساتھ یہ باتیں کرتے ہیں۔ میرے لئے یہ باتیں کوئی نئی نہیں۔ میں جانتا ہوں مجھے کیسی کیسی اذیتیں دی جائیں گی لیکن میں کسی پاکستانی کی نشاندہی نہیں کر سکوں گا کیونکہ میں کسی کو نہیں جانتا۔ میرا کام کچھ اور ہے"۔

"وہی کام بتادو" — کرنل نے کہا۔

"کام یہ ہے" — جگ موہن نے کہا — "ہر محفل میں بیٹھنا اور لوگوں کے دلوں میں پاکستان کے خلاف نفرت پیدا کرنا۔ میں نے اپنا نام مسلمانوں جیسا رکھا ہُوا تھا اور سب مجھے مسلمان ہی سمجھتے رہے۔ میں جس علاقے میں رہتا ہوں وہاں جا کر میرے متعلق پوچھنا کہ شرف الدین کیسا آدمی ہے۔ کوئی ایک بھی آدمی میرے خلاف ایک لفظ منہ سے نہیں نکالے گا بلکہ کیا بچہ کیا بوڑھا' میری تعریف کرے گا۔ میں نے ان لوگوں کے دلوں میں سندھ کی محبت اور پاکستان کی نفرت پیدا کر دی ہے۔ میں نے ان کے ذہنوں میں نقش کر دیا ہے کہ سندھ سندھیوں کا ہے"۔

"یہ تمہاری زبان کا جادو ہے" — میجر نے کہا — "میں دیکھ رہا ہوں کہ پکڑے جانے کے باوجود تم خود اعتمادی اور شگفتگی سے بات کرتے ہو اور تم دوسروں کو متاثر کرنے کی مہارت رکھتے ہو"۔

"نہیں صاحب!" — جگ موہن نے مسکراتے ہوئے کہا — "یہ بات نہیں۔

آپ مجھ پر یہ مہربانی کر رہے ہیں کہ مجھے ٹارچر سے بچا رہے ہیں۔ میں اس مہربانی کے جواب میں آپ کے ساتھ یہ مہربانی کرتا ہوں کہ وہ وجوہات بتا دیتا ہوں جن کی بنا پر بنگالی آپ سے الگ ہوئے اور اب سندھی الگ ہو رہے ہیں۔ ہمارا کام یہ ہے کہ علیٰحدگی یا پاکستان کو توڑنے کے اس عمل کو تیز کر دیا جائے۔ صرف باتوں سے کوئی متاثر نہیں ہُوا کرتا۔ ہم لوگوں کی کمزوریوں کو دیکھا کرتے ہیں۔ میں اور میرے چند ایک ساتھی جو اس وقت معلوم نہیں کہاں کہاں ہیں' ان لوگوں میں پیسے تقسیم کرتے رہتے ہیں۔ کسی کو ادھار دیتے ہیں اور کسی کو مدد کے طور پر....

"میں آپ کو ایک مثال دیتا ہوں۔ میرے گھر کے قریب ہی ایک فیملی رہتی ہے۔ باپ اور بیٹا کسی دفتر میں ملازم ہیں۔ ان کا دس بارہ سال کا ایک بچہ ایسا بیمار ہُوا کہ ڈاکٹر صحیح تشخیص ہی نہ کر سکے۔ سپیشلسٹ ڈاکٹروں نے انہیں کنگال کر کے رکھ دیا۔ مجھے پتہ چلا تو میں بچے کو ایک پرائیویٹ ہسپتال میں لے گیا۔ ان لوگوں میں مالی لحاظ سے اس ہسپتال میں جانے کی ہمت نہیں تھی۔ سارا خرچ میں نے اپنے ذمے لے لیا اور پانچ چھ دنوں میں بچہ ٹھیک ہو گیا۔ بچے کے باپ نے مجھے بہت کہا کہ یہ رقم اس کے سر پر قرض ہے لیکن میں نے اسے کہا کہ کوئی قرض نہیں' اسے اللہ کی مدد سمجھیں....

"تقریباً چھ ہزار روپیہ خرچ آیا تھا جو مجھے اپنے ملک کی حکومت سے مل گیا۔ اس کے عوض مجھے یہ ملا کہ یہ پورا خاندان صرف اسی بات پر پاکستان کے خلاف ہو گیا کہ یہاں پیسے ہوں تو بچے بچ سکتے ہیں ورنہ ان کی قسمت میں صرف موت ہے.... میں نے زبان کے ذریعے اپنا جادو چلایا تو بچے کا باپ' بچے کی ماں اور اس کا بڑا بھائی ہر کسی کے ساتھ وہی باتیں کرنے لگے جو میں نے ان کے ساتھ کی تھیں۔ اس طرح میں نے کئی

آدمی اپنے ہم خیال بنالئے....

"میں لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات ڈالتا رہتا ہوں کہ پاکستان کو چند ایک لیڈروں نے اپنی جاگیر بنالیا ہے اور یہ سب لیڈر پنجابی ہیں اور ان کے دلوں میں عوام کا ذرا سا بھی خیال نہیں اور یہ چند ایک لیڈر نواب اور مہاراجے بنے ہوئے ہیں.... میرا خیال ہے آپ میری بات سمجھ گئے ہیں۔ موٹی سی بات ہے کہ غدار وہاں پیدا ہوتے ہیں جہاں انسانوں کو انسان نہیں سمجھا جاتا اور انہیں انسانیت کے بنیادی حقوق سے محروم رکھا جاتا ہے....

"آپ مجھے ٹارچر کر کر کے جان سے ہی مار ڈالیں یا مجھے گولی مار دیں تو بھی پاکستان کو توڑنے کا یہ عمل کمزور نہیں ہو گا۔ ایک تو ہمارے آدمی ہیں جو میری طرح لوگوں کو پاکستان کے خلاف کر رہے ہیں اور دوسرے آپ کے اپنے لیڈر ہیں جو صرف اقتدار کی خاطر ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں اور عوام دانے دانے کو ترس رہے ہیں۔ آپ کے لیڈر ہمارا ہی کام کر رہے ہیں۔ کراچی میں جو قتل و غارت ہوتی رہتی ہے' وہ آپ کے اپنے لیڈر کروا رہے ہیں ہم تو جلتی پر تیل ڈالتے ہیں۔ ہمارے پاس مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی زندہ مثال موجود ہے جو ہم سندھیوں کے آگے رکھتے ہیں۔ میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ مشرقی پاکستان کو بھی ہم نے ہی الگ کیا تھا۔ جس طرح مشرقی پاکستان میں سکولوں اور کالجوں میں ہندو ٹیچر موجود تھے اسی طرح سندھ میں بھی ہندو ٹیچر موجود ہیں اور آپ کے بچوں کے ذہنوں کو اپنے سانچے میں ڈھال رہے ہیں....

"میں آپ کو یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ آپ کے لیڈر اور ہم سندھ میں ایسی صورتِ حال پیدا کر رہے ہیں کہ ایک نہ ایک دن فوج کو میدان میں لایا جائے گا اور پھر اس کا

نتیجہ وہی ہو گا جو آپ نے 1971ء میں مشرقی پاکستان میں دیکھا تھا۔ سندھی اور آپ کے فوجی ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے"۔

"تم کوئی نئی بات نہیں بتا رہے جگ موہن!" — آئی ایس آئی کے کرنل نے کہا — "اپنے گروہ کے آدمیوں کی نشاندہی کر دو"۔

"کس کس کی نشاندہی کروں!" — جگ موہن نے کہا — "سارا سندھ مجھ جیسے ہندوؤں سے بھرا پڑا ہے۔ کراچی میں بھی ہندو موجود ہیں۔ میں آپ کو بتا رہا ہوں کہ میں جاسوس نہیں' یا یوں سمجھ لیں کہ میں کسی ایسے گروہ کا آدمی نہیں جو انفارمیشن ہی اکٹھی کر کے سرحد پار بھیجا کرتے ہیں۔ میں ایک عام قسم کا ہندو ہوں اور جو کام کر رہا ہوں وہ آپ کو بتا دیا ہے.... میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ یہاں جتنے ہندو آباد ہیں وہ انٹیلی جنس کے تنخواہ دار ملازم یا ایجنٹ ہوں یا نہ ہوں وہ پاکستان کو توڑنے کی باتیں کرتے رہتے ہیں اور اسے وہ اپنا مذہبی فرض سمجھتے ہیں۔ اس کا صرف یہ علاج ہے کہ یہاں کے ایک ایک ہندو کو اپنے ملک سے نکال دیں لیکن علاج یہ بھی کامیاب نہیں ہو گا کیونکہ آپ کے لیڈر خود ملک کو توڑ رہے ہیں اور آپ کی حکومتوں نے عوام کو جس طرح ضروریاتِ زندگی اور قومی وقار سے ہی محروم کیا ہے' اس کا ردِ عمل اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ آپ کے لوگوں کے دلوں میں پاکستان کی محبت بڑی تیزی سے ختم ہوتی جا رہی ہے"۔

"کیا تم مجھے اُلّو کا پٹھا سمجھتے ہو جگ موہن!" — کرنل نے طنزیہ مسکراہٹ سے کہا — "کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں یہ سب کچھ نہیں جانتا جو تم نے سنانا شروع کر دیا ہے؟ تم بات وہ کرو جو میں پوچھ رہا ہوں"۔

"جو بات آپ پوچھ رہے ہیں صاحب!" — جگ موہن نے کہا — "وہ میں نہیں جانتا۔ میں نے آپ کو بتایا ہے کہ میرا شعبہ کچھ اور ہے۔ کیا آپ یہ نہیں جانتے کہ باہر کے کسی ملک میں جب انٹیلی جنس کے آدمی جاتے ہیں تو دو گروہ ایک دوسرے سے واقف ہی نہیں ہوتے؟"

"کیا تم سندھ کے ایسے وڈیروں کے نام بتا سکتے ہو جو انڈیا کے لئے کام کر رہے ہیں؟" — کرنل نے پوچھا — "اور کیا تم اُن لوگوں کے نام بتا سکتے ہو جو اغوا اور ڈکیتی کی وارداتیں کرواتے ہیں؟"

"نہیں صاحب!" — جگ موہن نے جواب دیا۔

کرنل اُٹھ کھڑا ہوا اور میجر کی طرف دیکھ کر باہر نکل گیا۔ واپس آیا تو اس کے ساتھ دو آدمی تھے۔

"یہ لالہ جی مہاراج جگ موہن ہیں" — کرنل نے ان دو آدمیوں سے کہا — "انہیں اپنے ساتھ لے جاؤ اور ذرا ان کی خاطر تواضع کرو"۔

دونوں آدمی بڑی تیزی سے جگ موہن کی طرف لپکے۔ ایک نے ایک بغل میں دوسرے نے دوسری بغل میں ہاتھ رکھا اور یوں جھٹکا دے کر اٹھایا جیسے اناج کی بھری ہوئی بوری اٹھائی جاتی ہے۔ وہ اسے گھسیٹتے دھکیلتے کمرے سے باہر لے گئے۔

"بڑی ہی مکار قوم ہے" — کرنل نے میجر سے کہا — "تمہارا کیا خیال ہے 'کیا ہم مان لیں کہ یہ انڈین انٹیلی جنس کے کسی اور آدمی کو نہیں جانتا؟"

"بکواس کرتا ہے سر!" — میجر نے کہا — "بول پڑے گا۔ آپ تو جانتے ہیں یہ لوگ کتنے کچھ بہادر ہوتے ہیں.... اس کے نوکروں کو بھی ابھی بلا لیں سر؟"

"رات کو!" — کرنل نے جواب دیا — "رات بارہ بجے کے بعد"۔



ڈاکٹر عبدالرشید کو انڈین انٹیلی جنس کے بڑے افسروں نے پاگل قرار دے دیا تھا۔ پہلے اسے فوجی ہسپتال میں بھیجا گیا تھا۔ یہ دستور کی ایک کارروائی تھی۔ آخر اسے پاگل خانے میں بھیجنا تھا۔ ایک دو روز فوجی ہسپتال والوں نے ڈاکٹر رشید کو اپنے ہاں رکھ کر پاگل خانے بھجوا دیا۔ وہ اسی ہسپتال میں ڈاکٹر رہ چکا تھا۔ اب وہ ایک دماغی مریض کی حیثیت سے اس ہسپتال میں ایک دو دن رہا اور وہاں سے آگے بھجوا دیا گیا۔

"کیا یہ نیا مریض واقعی ڈاکٹر ہے؟" — پاگل خانے کا ایک ڈاکٹر دوسرے ڈاکٹر سے پوچھ رہا تھا۔

"ہاں بھئی!" — دوسرے ڈاکٹر نے کہا — "ایم بی بی ایس ہے اور سی ایم ایچ انبالہ میں ڈاکٹر رہ چکا ہے"۔

"پھر تو اس کا خیال رکھنا پڑے گا" — پہلے ڈاکٹر نے کہا — "آخر ہمارا ڈاکٹر بھائی ہے"۔

"ڈاکٹر تو ہے" — دوسرے ڈاکٹر نے کہا — "لیکن بد بخت مسلمان ہے"...

"تو کیا!" — پہلا ڈاکٹر بولا — "ڈاکٹر ہر مذہب کے مریض کا ڈاکٹر ہوتا ہے۔ ہسپتال میں آکر کسی کا کوئی مذہب نہیں رہتا۔ ڈاکٹر کو یہ دیکھنا ہی نہیں چاہئے کہ...."

"تم ٹھیک کہتے ہو بھئی!" — دوسرے ڈاکٹر نے کہا — "لیکن یہ پاکستان کا جاسوس ہے اور اسے اپنی انٹیلی جنس نے انبالہ سے یہاں دِلّی بھیجا ہے۔ اس کے متعلق کچھ خفیہ ہدایات ملی ہیں۔ شک یہ ہے کہ یہ پاگل نہیں بلکہ سزا سے بچنے کے لئے ایکٹنگ کر رہا ہے۔ میرا بس چلے تو میں آج ہی اسے انجکشن دے کر ختم کر ڈالوں"۔

پہلا ڈاکٹر خاموش ہو گیا۔

اُس وقت ڈاکٹر عبدالرشید کو پاگل خانے کے اُس وارڈ کی طرف لے جا رہے تھے جہاں اس نے باقی عمر گذارنی تھی۔ پاگل خانے کے دو آدمی اسے دھکے دے دے کر آگے لے جا رہے تھے۔ وارڈ ابھی کچھ دور تھا۔ ایک بار پھر ایک ملازم نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر دھکا دیا تو رشید رک گیا۔ بڑی تیزی سے پیچھے کو مڑا اور جسم کی پوری طاقت ایک گھونسے میں مرکوز کر کے گھونسہ اس ملازم کے منہ پر مارا۔ فوراً ہی اس نے دوسرا گھونسہ دوسرے ملازم کے منہ پر مارا۔ دبلے پتلے ہندو ملازم کئی قدم پیچھے کو گرے۔ دونوں کے ہونٹوں سے خون بہنے لگا۔

ملازم اٹھے۔ ایک کے پاس وِسل تھی جو اس نے بجانی شروع کر دی اور دوسرے نے شور مچایا۔ پاگل خانے میں ایسے واقعات تو ہوتے ہی رہتے تھے۔ کوئی پاگل کسی ملازم کی پٹائی کر دیتا تھا۔ پاگل خانوں کے ملازم دل کے پتھر ہُوا کرتے ہیں۔ وہاں جو مریض چلا جائے اُسے وہ انسان نہیں سمجھتے۔ ان دو ملازموں نے شور و غل کیا تو کئی ملازم دوڑے آئے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ ان کے دو ساتھیوں کے ہونٹوں سے خون بہہ رہا ہے اور نیا مریض چپ چاپ کھڑا انہیں دیکھ رہا ہے تو تمام ملازم ڈاکٹر رشید پر ٹوٹ پڑے اور اسے اتنا زدوکوب کیا کہ وہ بے ہوش ہو گیا۔

ڈاکٹر رشید کے ہوش ٹھکانے آئے تو اس نے آنکھ کھولی۔ سب سے پہلے تو اس نے سارے جسم میں درد کی ایسی ٹیسیں محسوس کیں جیسے اس کی ہڈیاں ٹوٹ گئی ہوں۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ بہت زیادہ طاقت صرف کر کے وہ اٹھا اور گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ اسے سب سے پہلے سلاخوں والا دروازہ نظر آیا جس سے اسے یقین ہو گیا کہ وہ ابھی تک انٹیلی جنس کے انٹیروگیشن سنٹر میں ہے۔ دماغ پوری طرح سوچنے

کے قابل ہُوا تو اسے یہ کوٹھری انبالہ والی کوٹھری سے مختلف نظر آئی۔

تب اسے یاد آنے لگا کہ وہ یہاں تک کس طرح پہنچا ہے۔ اس وقت اس کا دماغ نارمل طریقے سے سوچ رہا تھا۔ اس نے ذہن پر پورا زور دے کر یاد کرنا شروع کر دیا۔ اسے یاد آگیا کہ اسے بڑے تیز ٹرانکولائزر دیئے جاتے رہے تھے اور اس کے ساتھ ایک عیسائی ڈاکٹر فرانسس اسے بیدار رہنے یعنی ٹرانکولائزر گولیوں کے اثرات زائل کرنے کے لئے دوائی دیتا رہا تھا۔ اس کے بعد یادیں تاریکی میں چلی گئیں جیسے تیز رفتار گاڑی پہاڑی علاقے میں سے گزرتی ہوئی سرنگ میں داخل ہو جاتی ہے۔

اس کے خیالوں اور اس کی یادوں کی ریل گاڑی تاریک سرنگ سے نکلی تو اسے کچھ دیر پہلے کا یہ واقعہ یاد آیا کہ دو آدمی اسے دھکے دے دے کر کہیں لے جا رہے تھے اور اس نے دونوں کو ایک ایک گھونسہ مارا تھا۔ پھر اسے یہ بھی یاد آیا کہ بہت سے آدمیوں نے اسے مارا پیٹا تھا لیکن اسے یہ معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ یہ کون سی جگہ ہے۔ اس نے اپنے آپ کو یقین دلایا کہ یہ انبالہ کا ہی انٹیروگیشن سنٹر ہے اور اب اسے دوسری کوٹھری میں بند کیا گیا ہے۔

○

"اوئے!" — ڈاکٹر رشید کو آواز سنائی دی — "ہوش ٹھکانے آئے ہیں؟"

رشید نے اپنے جھکے ہوئے سر کو اوپر اٹھایا تو اسے دروازے کی سلاخوں کے باہر فضول سی خاکی وردی میں ملبوس ایک آدمی کھڑا نظر آیا۔ وہ پاگل خانے کا وارڈن تھا۔ رشید آہستہ آہستہ اٹھا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ چل نہیں سکے گا لیکن اس نے قدم گھسیٹنے شروع کر دیئے اور دروازے کے قریب چلا گیا۔

جوں جوں دروازے کے قریب ہوتا جا رہا تھا' وارڈن سلاخوں سے پیچھے ہٹتا جا رہا تھا۔ وہ خطرہ محسوس کر رہا تھا کہ یہ خطرناک پاگل اس پر حملہ کر دے گا حالانکہ دروازہ مقفّل تھا اور سلاخیں بہت موٹی تھیں۔

"پیچھے مت ہٹو بھائی!" — ڈاکٹر رشید نے وارڈن سے کہا — "میں تمہارا کیا بگاڑ سکتا ہوں۔ کیا یہاں فوجی سنتری نہیں ہوتا؟"

"نہیں!" — وارڈن نے افسروں کی طرح جواب دیا — "یہاں فوجیوں کا کیا کام!"

"میرا ایک کام کر دو" — ڈاکٹر رشید نے کہا — "ڈاکٹر فرانسس کو بلوا دو"۔

"یہاں کوئی ڈاکٹر فرانسس نہیں" — وارڈن نے جواب دیا — "اور میں تمہارے باپ کا نوکر نہیں کہ تمہارے لئے ڈاکٹروں کو بلاتا پھروں"۔

رشید نے سلاخوں میں سے باہر دیکھا تو اسے پتہ چلا کہ یہ تو کوئی اور جگہ ہے۔ انبالہ انٹیروگیشن سنٹر ایک ہی بلڈنگ میں تھا لیکن یہاں اسے سامنے بیرکیں سی نظر آ رہی تھیں۔ یہ بڑی کشادہ جگہ تھی۔ کئی آدمی اِدھر اُدھر آ جا رہے تھے۔ بعض عجیب و غریب حرکتیں کر رہے تھے۔ اسے شک ہُوا کہ یہ پاگل خانہ تو نہیں!

"یہ کیا جگہ ہے؟" — اس نے وارڈن سے پوچھا۔

"یہ پاگل خانہ ہے" — وارڈن نے طنزیہ سے انداز میں کہا — "اور تم کل شام سے یہاں بند ہو۔ تم پاگل ہو"۔

"پھر یہ انبالہ نہیں ہو سکتا" — ڈاکٹر رشید نے کہا اور پوچھا — "یہ دلّی ہے یا آگرہ؟"

"یہ دلّی ہے" — وارڈن نے جواب دیا اور وہاں سے چلا گیا۔

ڈاکٹر عبدالرشید کو غشی سی آنے لگی۔ اس نے سلاخوں کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور اپنے جسم کا بوجھ سلاخوں پر ڈال دیا۔ اپنے آپ پر قابو پا کر وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہُوا لیکن اس کی ٹانگیں اس کے جسم کا بوجھ اٹھانے سے قاصر تھیں۔ وہ وہیں سلاخوں کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔

وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کے دماغ میں بے چینی سی ہے جو اس نے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ دماغ سے زیادہ اس کے جسم کا حال بہت برا تھا۔ اُسے بھوک اور پیاس کی شدت بھی محسوس ہو رہی تھی۔

○

کچھ دیر بعد ایک ڈاکٹر آگیا۔ اس نے پہلے تو سلاخوں کے باہر سے رشید سے پوچھا کہ وہ کیسا ہے۔

"جسمانی حالت ٹھیک نہیں" — رشید نے کہا اور اس سے آگے نہ بول سکا۔

ڈاکٹر کے اشارے پر دروازے کا تالا کھولا گیا اور ڈاکٹر اندر آگیا۔ فرش پر ایک گدّا پڑا ہُوا تھا۔ رشید کو اس پر لٹا کر ڈاکٹر نے اس کا معائنہ کپڑے ہٹا ہٹا کر شروع کر دیا۔

"کیا آپ ڈاکٹر ہیں؟" — ڈاکٹر نے رشید سے پوچھا۔

"ہاں" — رشید نے جواب دیا — "ایم بی بی ایس ہوں"۔

ڈاکٹر کے پوچھنے پر رشید نے اسے بتایا کہ اس نے انبالہ کے کون سے کالج سے کس سال میں ایم بی بی ایس کلیئر کیا تھا۔ پاگل خانے کے ڈاکٹر نے شگفتہ سے لہجے میں اسے بتایا کہ اس نے دلّی کے فلاں کالج سے اسی سال ایم بی بی ایس کی ڈگری لی تھی۔

"آپ کا نام؟"

"راجیو" — پاگل خانے کے ڈاکٹر نے جواب دیا اور کہا — "ذہنی طور پر تو تم بالکل ٹھیک معلوم ہوتے ہو۔ تمہیں یہاں کیوں بھیج دیا گیا ہے؟"

"کیا تمہیں ڈاکٹر انچارج نے کچھ نہیں بتایا؟" — ڈاکٹر رشید نے جواب میں پوچھا۔

"کوئی خاص انسٹرکشن تو نہیں دی گئی" — ڈاکٹر راجیو نے کہا — "اپنے ایک کولیگ سے پتہ چلا تھا کہ تمہیں انٹیلی جنس والوں نے یا شاید سی ایم ایچ انبالہ نے ذہنی مریض قرار دے کر یہاں بھیجا ہے"۔

ڈاکٹر رشید اور ڈاکٹر راجیو ہم عمر تھے۔ راجیو کا روّیہ کچھ دوستانہ تھا اس لئے رشید نے اس کے ساتھ باتیں کرنے میں سکون سا محسوس کیا۔

"راجیو بھائی!" — رشید نے کہا — "پہلے کچھ کھلا دو اور پانی پلاؤ۔ بھوک اور پیاس بہت پریشان کر رہی ہے۔ اس کے بعد جسم کو دیکھنا۔ ان لوگوں نے مجھے ظالموں کی طرح مارا پیٹا ہے"۔

ڈاکٹر راجیو نے وارڈن سے کہا کہ وہ کھانے پینے کا فوراً بندوبست کرے اور اچھا کھانا لائے۔

"میں تمہیں دوائیاں خود لا کر دوں گا" — ڈاکٹر راجیو نے کہا — "کوئی زخم نہیں۔ سب اندر کی چوٹیں ہیں۔ ان لوگوں نے تمہیں گھونسے اور ٹھڈے مارے ہیں.... لیکن یار! تمہیں یہاں کیوں بھیج دیا گیا ہے۔ ذہنی طور پر تم بالکل ٹھیک معلوم ہوتے ہو"۔

"نہیں راجیو!" — رشید نے کہا — "میں دماغ میں اچھی خاصی بے چینی محسوس کر رہا ہوں۔ کچھ نہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔ اس کی وجہ شاید وہ ٹارچر ہے جس سے مجھے گذارا گیا ہے"۔

"کیا تم پر جاسوسی کا شک تھا؟" — راجیو نے پوچھا۔

"اگر ہم اس موضوع پر بات نہ کریں تو کیا یہ بہتر نہیں ہو گا؟" — رشید نے کہا۔

"ہاں ہاں!" — راجیو نے کہا — "یہی بہتر ہے۔ میرا اس معاملے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں.... میں چلتا ہوں۔ تمہارے لئے کھانا اور پانی آ رہا ہے اور تھوڑی دیر تک میں خود دوائیاں لے کر آ جاؤں گا"۔

ڈاکٹر راجیو چلا گیا اور کوٹھڑی کا دروازہ پھر مقفّل ہو گیا۔

اس کے جانے کے کچھ دیر بعد کھانا آ گیا جو خاصی اچھی قسم کا تھا۔ ڈاکٹر رشید کھانے پر ٹوٹ پڑا اور بڑی تیزی سے کھانے لگا اور اس کے ساتھ پانی پیتا چلا گیا۔ وہ کھانا ختم کر ہی رہا تھا کہ ڈاکٹر راجیو کچھ دوائیاں اٹھائے کوٹھڑی میں آیا۔ یہ سب گولیاں تھیں۔ ڈاکٹر راجیو نے اسے مختلف قسم کی چار گولیاں دیں اور کہا کہ وہ پانی کے ساتھ لے لے۔

ڈاکٹر عبدالرشید نے یہ گولیاں منہ میں ڈال کر پانی پیا۔ پیٹ میں غذا گئی اور پانی بھی مل گیا تو رشید کے چہرے پر رونق آ گئی۔

"تم بتا سکتے ہو ڈاکٹر راجیو!" — ڈاکٹر رشید نے پوچھا — "یہاں مجھے کب تک رہنا پڑے گا؟"

"نہیں ڈاکٹر رشید!" — ڈاکٹر راجیو نے جواب دیا — "میں جونیئر ڈاکٹر ہوں، کچھ بھی نہیں بتا سکتا کہ تمہیں کب تک یہاں رہنا پڑے گا۔ اس وقت تم ذہنی طور پر بالکل نارمل لگتے ہو۔ اگر ایسے ہی رہے تو جلدی چھٹکارا مل جائے گا"۔

"دماغ میں بے چینی بڑھتی جا رہی ہے" — ڈاکٹر رشید نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر فکرمندی کے لہجے میں کہا — "کنٹرول سے باہر ہو رہی ہے"۔

"ٹرانکولائزر دے دوں؟" — راجیو نے پوچھا۔

"دے ہی دو تو اچھا ہے" — ڈاکٹر رشید نے جواب دیا — "لیکن بہت تیز نہ ہو۔ ہلکی پوٹینسی میں دے دو"۔

ڈاکٹر راجیو نے ایک چٹ پر دوائی لکھی اور چٹ وارڈن کو دے کر کہا کہ دوڑ کر ڈسپنسری سے یہ دوائی لے آئے۔

ڈاکٹر رشید نے اپنے سر کو دو تین بار زور زور سے جھٹکا۔

"اوہ میرے خدا!" — اس نے تکلیف کی سی کیفیت میں کہا — "کچھ ہو رہا ہے

".... میرے سر میں کچھ ہو رہا ہے" — اس نے اپنے سر پر زور زور سے ہاتھ مارے۔

ڈاکٹر راجیو نے لپک کر اس کے ہاتھ پکڑ لئے اور اسے تسلی دینے لگا۔

"دیکھو" — رشید نے حکم کے لہجے میں کہا — "تم یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو۔ جا کر دیکھو ڈرائیور گاڑی لایا ہے یا نہیں۔ میں نے کانفرنس میں پہنچنا ہے۔ اسے کہو گاڑی فوراً لائے۔ چلو اٹھو یہاں سے" — اس نے راجیو کو دھکے مار کر اٹھا دیا۔

ڈاکٹر راجیو بڑی تیزی سے باہر نکلا۔ کوٹھڑی کا دروازہ باہر سے بند کیا اور دوڑتا ہوا ڈسپنسری میں پہنچا۔ ایک سرنج میں ایک دوائی بھری اور دوڑتا ہوا واپس آیا۔ اُس وقت ڈاکٹر رشید سلاخوں کو پکڑے ہوئے زور زور سے قہقہے لگا رہا تھا۔ اس پر پاگل پن کا دورہ پڑ گیا تھا۔

○

ڈاکٹر راجیو نے دو آدمیوں کو بلایا اور کوٹھڑی کا دروازہ کھول کر اندر آیا۔ ان آدمیوں نے ڈاکٹر رشید کو اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا اور ڈاکٹر راجیو نے اس کے بازو میں انجکشن لگا دیا۔ دس پندرہ منٹ بعد ڈاکٹر رشید کا جسم ڈھیلا پڑنے لگا۔ اسے گدّے پر لٹا دیا گیا اور اس کے بعد اسے کوئی ہوش نہ رہا۔

ڈاکٹر رشید پاکستان کی محبت کا دیوانہ تھا اور اس کے پاگل پن کی وجہ یہی تھی۔ کچھ لوگ انبالہ میں تھے جو رشید کے لئے پاگل ہوئے جا رہے تھے۔ وہ اتنا ہی جانتے تھے کہ رشید انٹیلی جنس والوں کے پاس ہے۔ ان لوگوں میں جو سب سے زیادہ پریشان تھے وہ رشید کے والدین تھے' اس کی بہنیں تھیں اور نرس خالدہ تھی جو اس کی منگیتر تھی اور پھر رشید کے وہ ساتھی تھے جنہوں نے صغیر کو ہسپتال سے فرار کروایا تھا۔ یہ سب اپنے اپنے طور پر سراغ رسانی کر رہے تھے کہ رشید کے ساتھ کیا سلوک ہو رہا ہے لیکن کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ ان کے محلے میں مخبر مقرر کر دیئے گئے ہیں جو ان پر دن رات نظر رکھتے ہیں۔

پاکستان کی محبت کا ایک دیوانہ اور تھا جو اُس وقت انڈیا کے ایک جنگل میں بھٹکتا پھر رہا تھا۔ وہ صغیر تھا جس کے دل سے ڈاکٹر رشید نے پاکستان کی دشمنی نکالی اور محبت پیدا کی تھی۔ ایک طرف رشید اپنی جان پر کھیل رہا تھا اور دوسری طرف صغیر نے عہد کر لیا تھا کہ وہ پاکستان پہنچے گا اور انڈیا کے جن جن جاسوسوں کو وہ جانتا ہے انہیں گرفتار کروائے گا۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ انڈیا سے نکلنا کوئی آسان کام نہیں۔ خطرہ صرف گرفتاری کا نہیں بلکہ جان کا بھی تھا۔

اُس وقت وہ جوگیوں اور سنیاسیوں کے پاس تھا جہاں اسے تین چار دن ہو گئے تھے۔ اس کی دونوں ٹانگیں زخمی تھیں۔ ایک ٹانگ میں تو گولی کا زخم تھا جو مسلسل چلتے رہنے سے کھُل گیا تھا اور دوسری ٹانگ پر سانپ کے کاٹنے کا زخم تھا۔ سانپ کے زہر کی وجہ سے یہ زخم خراب ہو گیا تھا۔ زہر کا کچھ اثر خون میں بھی چلا گیا تھا اس لئے دونوں ٹانگوں کے زخم خراب ہو گئے تھے۔

سنیاسیوں کے پاس ایسی جڑی بوٹیاں موجود تھیں جو انتہائی خراب زخموں کو بھی ٹھیک کر دیا کرتی تھیں۔ وہ صغیر کے زخموں کی مرہم پٹی بھی کر رہے تھے اور اس کے خون سے زہر کے اثرات نکالنے کے لئے بھی دوائیاں دے رہے تھے۔

"اب اپنے متعلق کچھ بتاؤ" — ایک روز سنیاسیوں نے صغیر سے پوچھا — "کہاں کے رہنے والے ہو اور اس جنگل بیابان میں کس طرح پہنچے ہو"۔

"میں دہلی کا رہنے والا ہوں" — صغیر نے جھوٹ بولا — "شملہ سیر کے لئے آیا تھا اور اوپر سے پاؤں پھسلا تو نیچے آ گرا۔ سر کو چوٹ لگی تو میں یہ سمجھا کہ میں ہوش میں ہوں لیکن میں شاید بے ہوشی کی حالت میں چلتا رہا اور کچھ پتہ نہ چلا کہ کہاں سے کہاں آ پہنچا ہوں۔ میرے گھر والے پریشان ہوں گے۔ سمجھ نہیں آتی انہیں کس طرح اطلاع دوں کہ میں کہاں ہوں"۔

"تم ابھی کہیں بھی جانے کے قابل نہیں" — بڑے سنیاسی نے اسے کہا — "تمہارے زخم ٹھیک ہو جائیں تو تمہیں شملہ تک پہنچا دیں گے۔ آگے تمہارا اپنا بندوبست ہو گا"۔

ان لوگوں نے صغیر کی اس بات کو سچ مان لیا تھا کہ وہ دِلّی کا رہنے والا ہے۔ وہ یہ سوچ رہا تھا کہ وہ یہاں سے کس طرح نکلے۔ اسے ایسا ڈر نہیں تھا کہ سنیاسیوں کو اس کی اصلیت کا علم ہو جائے گا۔ یہ لوگ تو ایک قسم کے تارک الدنیا تھے۔ انہیں شہروں کی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

○

اُسی رات یہ لوگ کھانا کھا چکے اور صغیر کو بھی انہوں نے کھانا کھلایا تو سنیاسیوں نے

حقے کی ایک ٹوپی میں چرس بھری اور کش لگانے لگے۔ انہوں نے صغیر کو بھی کش لگانے کو کہا۔ صغیر کوئی شریف آدمی نہیں تھا۔ اس نے شراب بھی پی تھی اور چرس کے ذائقے اور نشے سے بھی واقف تھا۔ اس کی ٹریننگ میں یہ سبق خاص طور پر شامل تھا کہ دشمن کے ملک میں جا کر کوئی نشہ نہیں کرنا نہ نیند کی کوئی گولی لینی ہے۔ یہ سبق اس لئے دیا گیا تھا اور ہر جاسوس کو دیا جاتا تھا کہ نشے کی حالت میں کچھ راز کی باتیں منہ سے نکل جاتی ہیں لیکن اُس رات صغیر نے چرس کے کش کی ضرورت محسوس کی اور وہ سنیاسیوں کے ساتھ باتیں کرتے کرتے کچھ زیادہ ہی کش لگا گیا اور ہوش و حواس کھو بیٹھا۔

صبح سب جاگ کر اکٹھے بیٹھے تو صغیر نے محسوس کیا کہ وہاں بیٹھا ہُوا ہر آدمی اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"ہاں بھئی" — بڑے سنیاسی نے صغیر سے کہا — "تم پاکستانی ہو اور پاکستان جانا چاہتے ہو۔ کہو تو ہم تمہیں پاکستان تک بھی پہنچا سکتے ہیں"۔

صغیر کا خون خشک ہو گیا۔ وہ ذہین آدمی تھا اور اسے جاسوسی کی ٹریننگ ملی ہوئی تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ رات چرس کے نشے میں اس کے منہ سے راز کی بات نکل گئی ہے یا ان لوگوں نے اس کے منہ سے راز اگلوا لیا ہے۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا اور ہنس پڑا۔

"میں آپ کی بات سمجھ گیا ہوں مہاراج!" — صغیر نے بڑے سنیاسی سے کہا — "میں نے رات زیادہ کش لگا لئے تھے اور معلوم ہوتا ہے کہ میں نشے میں کچھ بک بک کرتا رہا ہوں.... مجھے بتائیں میں کیا بولتا رہا ہوں"۔

"تم تو بے شمار بولے تھے" — بڑے سنیاسی نے کہا — "کچھ باتیں تو تم اوٹ پٹانگ سی کرتے رہے پھر تم نے یہ الفاظ بڑے صاف کہے کہ میں پاکستان تو پہنچ ہی جاؤں گا اور وہاں ان سب جاسوسوں کو پکڑوا دوں گا"۔

"اور تم نے یہ بھی کہا تھا" — ایک اور سنیاسی بولا — "کہ میں انڈیا کا بیڑہ غرق کروا دوں گا"۔

صغیر یہ بات سن کر پریشان ہو گیا۔ اسے اپنی اس حماقت پر افسوس ہونے لگا کہ اس نے چرس پی لی تھی اور وہ بھی اتنی زیادہ کہ اپنے دماغ پر قابو نہ رکھ سکا۔ اس نے بڑی تیزی سے سوچتے ہوئے ایک جواب گھڑ لیا۔

"مہاراج!" — صغیر نے ہنستے ہوئے کہا — "میرے گھر والے بھی مجھے بتایا کرتے ہیں کہ میں خواب میں بولتا رہتا ہوں اور میں ایسی ہی باتیں کرتا ہوں جیسی آپ نے بتائی ہیں۔ معلوم نہیں اس کی وجہ کیا ہے کہ میرے ذہن میں پاکستان اٹک گیا ہے۔ میں تو پاکستان کا نام بھی نہیں لینا چاہتا۔ میں دراصل پاکستان کا بیڑہ غرق کرنا چاہتا ہوں انڈیا تو میری دھرتی ماتا ہے.... کیا میں نے آپ کو بتایا نہیں کہ میرا نام گوپال ہے 'گوپال داس'.... ہاں مہاراج! ایک بات ضرور کہوں گا کہ میرے دل میں یہ خواہش ہے کہ میں جاسوس بن کر پاکستان جاؤں اور دھرتی ماتا کی سیوا کروں۔ اگر میری جان چلی جائے تو میں خوشی سے جان دوں گا"۔

"دیکھو بالکے!" — بوڑھے سنیاسی نے کہا — "یہ نہ سمجھنا کہ ہم جنگلوں بیابانوں میں زندگی گذار رہے ہیں تو ہمیں دنیا کا اور دنیا کے بندوں کا کچھ علم ہی نہیں۔ اگر میں کہوں کہ تم ہندو نہیں مسلمان ہو تو تم مجھے جھوٹا کہو گے۔ خواب میں کوئی ویسے ہی باتیں نہیں کیا کرتا۔ نیند میں انسان وہی بولتا ہے جو اس کے اندر چھپا ہُوا ہوتا ہے' اور یہ بھی سن لو کہ ہمارا کوئی ملک نہیں۔ ویسے تو ہم ہندو ہیں لیکن ہمارے لئے پاکستان بھی ویسا ہی ہے جیسا ہندوستان .... تم ہمیں اپنے متعلق سچ بتا دو تو ہم تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے 'فائدہ ہی دیں گے"۔

"اور مہاراج!" — صغیر نے جیب میں ہاتھ ڈال کر نوٹ نکالے اور سنیاسی کے آگے پھینکتے ہوئے کہا — "میں آپ کو اس فائدے کی قیمت دوں گا جو آپ مجھے پہنچائیں گے"۔

"یہ ابھی اپنے پاس رہنے دو" — سنیاسی نے نوٹ اس کی طرف پھینکتے ہوئے کہا — "ہم جو کچھ کرتے پھر رہے ہیں یہ سب انسانوں کے لئے ہے۔ کسی بیمار کو کچھ دے کر ٹھیک کر دیتے ہیں تو اتنے ہی پیسے لیتے ہیں جو ہمارا حق بنتا ہے۔ تمہیں ہم کیوں اٹھا لائے تھے؟ تم ہمارے کیا لگتے تھے؟ ہم نے یہ تو نہیں سوچا تھا کہ تمہیں ٹھیک کر دیں گے تو تم سے ہمیں پیسے ملیں گے .... تم اگر کسی مصیبت میں پڑے ہوئے ہو تو ہمیں بتاؤ ہم تمہاری مدد کریں گے"۔

سنیاسیوں نے ایسی باتیں کیں اور ایسے انداز سے کیں کہ صغیر متاثر ہو گیا۔ وہ

ایسی صورتِ حال میں پھنس گیا تھا جہاں ایک تنکے کا سہارا بھی اس کے لئے بہت تھا۔
اس نے سنیاسی کو پہلے تو یہ بتایا کہ وہ مسلمان ہے اور یہاں بھی اس نے اپنا نام اکبر بتایا پھر یہ جھوٹ بولا کہ وہ ہندوستان میں اپنے باپ دادا کا گھر دیکھنے آیا تھا۔ اسے توقع تھی کہ وہ جس طرح غیر قانونی طریقے سے سرحد پار کر کے آیا ہے اسی طرح واپس پاکستان چلا جائے گا لیکن پولیس اس کے پیچھے لگ گئی اور اسے اس طرح بھاگنا پڑا کہ پاکستان کی طرف جانے کی بجائے دِلّی کی طرف آ نکلا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ ٹانگ کا یہ زخم پولیس کی گولی کا ہے۔

"یہ تو میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا" — ایک سنیاسی نے کہا — "میں نے تمہارے اس زخم کی مرہم پٹی کی ہے۔ میں نے ویسے ہی تم سے نہیں پوچھا تھا کہ یہ زخم کیسا ہے۔ زخم دونوں طرف ہے اور ایسے زخم گولی کے ہُوا کرتے ہیں .... زخم کا فکر نہ کرو یہ ہم ایک دو دنوں میں ٹھیک کر لیں گے۔ سانپ کا زخم ذرا دیر سے ٹھیک ہو گا کیونکہ اس میں زہر کا اثر بھی ہے"۔

"بہرحال مہاراج!" — صغیر نے نوٹ سمیٹ کر اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا — "میں نے اپنا آپ ظاہر کر دیا ہے۔ آگے آپ کی مرضی ہے کہ میری مدد کریں یا اپنے ملک کی پولیس کی مدد کریں اور مجھے گرفتار کروا دیں۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہو گا کہ کوئی آدمی کسی دوسرے ملک میں پاسپورٹ اور اس ملک کے ویزا یعنی اجازت نامہ کے بغیر نہیں جا سکتا۔ اس لحاظ سے میں مجرم ہوں"۔

"تم ہمارے مجرم نہیں ہو" — بوڑھے سنیاسی نے کہا — "تم ہمارے مریض ہو۔ یہ سوچ لو کہ تم پاکستان سے بہت ہی دور ہو لیکن یہ کوئی مشکل نہیں۔ دِلّی سے ریل یا بس پر بیٹھ جاؤ اور جالندھر یا امرتسر تک پہنچ جاؤ۔ پولیس ریل اور بسوں کے ہر مسافر کو تو شناخت نہیں کرتی۔ اگر تمہاری داڑھی نہیں تھی تو اب تمہاری داڑھی نکل رہی ہے اسے اور لمبا ہونے دو۔ یہ کپڑے اتار دینا ہم تمہیں اپنے کپڑے دیں گے۔ تمہارا حلیہ ایسا بنا دیں گے کہ پولیس والے بھی تمہارے آگے ہاتھ جوڑیں گے اور تمہیں مہاراج جی کہیں گے۔ امرتسر سے آگے نکلنا کوئی مشکل کام نہیں لیکن یہ زخم ٹھیک ہو لینے دو"۔

"یا پھر ایک راستہ اور ہے" — ایک اور سنیاسی بولا — "انہی پہاڑوں میں پاکستان

کی طرف منہ کر کے چلتے جاؤ اور کشمیر جا نکلو گے۔ یہ سوچ لو کہ اتنا کٹھن اور اتنا لمبا سفر کرنے کی ہمت ہے تم میں؟"

"یا پھر یہ ہے" — ایک اور سنیاسی نے ہنستے ہوئے کہا — "ہمارے ساتھ رہ جاؤ۔ ہم تمہیں اپنے جیسا جوگی اور سنیاسی بنا دیں گے، بس یہ سوچ لو کہ دنیا کا لالچ طمع دل سے نکالنا پڑے گا"۔

صغیر ان کی باتیں سن رہا تھا اور غور کر رہا تھا کہ اسے کون سا راستہ اختیار کرنا چاہئے۔ وہ جوگی تو نہیں بننا چاہتا تھا۔ وہ تو فرار کا راستہ دیکھ رہا تھا، اور پھر سوچنے والی اصل بات تو یہ تھی کہ وہ ان سنیاسیوں کو اپنی اصلیت بتا بیٹھا تھا۔ اس نے یہ تو نہیں بتایا تھا کہ وہ انڈین انٹیلی جنس کا منحرف جاسوس ہے لیکن یہی بتا دینا کہ وہ پاکستانی اور مسلمان ہے، اس کے لئے بہت بڑا خطرہ بن سکتا تھا۔ یہ جوگی اور سنیاسی آخر ہندو تھے۔

"دل اور دماغ سے یہ وہم نکال دو کہ ہم تمہیں دھوکہ دیں گے" — بوڑھے سنیاسی نے صغیر سے کہا — "ہمیں پاکستان کے متعلق کچھ بتاؤ .... وہاں کے لوگ کیسے ہیں؟"

"جیسے یہاں کے لوگ ہیں" — صغیر نے جواب دیا — "وہاں سب مسلمان ہیں۔ تھوڑے سے عیسائی بھی ہیں اور بہت ہی تھوڑے ہندو بھی ہیں جو زیادہ تر سندھ کے علاقے میں ہیں لیکن وہ ایسے ہی ہیں جیسے یہاں کے ہندو، عیسائی اور مسلمان ہیں"۔

"کیا وہاں بھی ہم جیسے جوگی اور سنیاسی ہوتے ہیں؟" — سنیاسی نے پوچھا۔

"نہیں" — صغیر نے جواب دیا — "لیکن یہ کاروبار وہاں کسی اور طریقے سے چلتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ لوگ دیانتدار یا اصل جوگی نہیں لیکن یہ تو آپ مانتے ہیں کہ آپ کی نقل کرنے والے بے شمار لوگ ہوں گے جو آپ جیسا حلیہ بنا کر جعلی جڑی بُوٹیاں اور دوسری چیزیں اپنے پاس رکھتے اور لوگوں کو دھوکہ دیتے ہیں"۔

"یہ تو بالکل ٹھیک ہے" — سنیاسی نے کہا — "ہم جانتے ہیں کہ نقلی جوگی اور سنیاسی تھوڑے سے نہیں، بے شمار ہیں۔ اگر تم ان میں سے کسی کے ہاتھ لگ جاتے اور بتاتے کہ تم مسلمان ہو اور پاکستانی ہو اور پولیس کے مفرور ہو تو وہ تمہیں پولیس کے حوالے کر آتے۔ اب تمہیں خود پتہ چل جائے گا کہ ہم اصلی جوگی ہیں یا نقلی"۔

"ہمارے ملک میں نقل اور جعل سازی زیادہ چلتی ہے" — صغیر نے کہا —

دیہات کے لوگ تو سیدھے سادے ہونے کی وجہ سے جلدی دھوکے میں آجاتے ہیں، قصبوں اور شہروں کے تعلیم یافتہ لوگ بھی ان نوسربازوں کے جال میں آجاتے ہیں۔ وہاں سنیاسی نہیں ہوتے، عامل اور پیر ہوتے ہیں جو لوگوں کو یہ بتاتے ہیں کہ وہ ان کی قسمت بدل سکتے ہیں اور ان کی ہر خواہش پوری کر سکتے ہیں۔ ان عاملوں اور پیروں میں سے بعض نے دیسی دوائیاں بھی بنا کر رکھی ہوئی ہوتی ہیں اور وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ دوائیاں ایسی جڑی بُوٹیوں سے بنائی گئی ہیں جو کسی کو نہیں مل سکتیں۔ وہ قبرستانوں میں سے مُردوں کی ہڈیاں اٹھا کر لے آتے ہیں اور لوگوں کو خوب لُوٹتے ہیں"۔

"انسان بڑی مجبور چیز ہے" — سنیاسی نے کہا — "بندہ بیمار ہوتا ہے تو کہتا ہے کہ مجھ سے دولت لے لو اور مجھے صحت دے دو۔ کسی کے حالات ایسا پلٹا کھاتے ہیں کہ وہ چکرا جاتا ہے۔ حالات اس کے بس سے باہر ہو جاتے ہیں تو وہ پنڈتوں، جوتشیوں اور نجومیوں کے آگے جا ہاتھ پھیلاتا ہے اور یہ جوتشی وغیرہ اس کے زخموں پر باتوں کی مرہم رکھ کر اس کا دل پرچا لیتے ہیں اور اس کی جیب خالی کر لیتے ہیں۔ ہمارے ہندو بھائی تو ان ہی چکروں میں پڑے رہتے ہیں"۔

"پاکستان میں ہمارے مسلمان بھائی ان سے بہتر نہیں" — صغیر نے کہا — "وہاں لوگ حالات اور مالی تنگ دستی اور دوسرے مسائل سے مجبور ہو کر پیروں اور عاملوں کے پاس جا پہنچتے ہیں اور یہ لوگ ان کے ساتھ وہی سلوک کرتے ہیں جو یہاں کے پنڈت اور جوتشی ہندوؤں کے ساتھ کرتے ہیں۔ اگر آپ بُرا نہ مانیں تو ایک بات کہوں"۔

"ایسا مت کہو بیٹا!" — بوڑھے سنیاسی نے کہا — "جو دل میں آتا ہے کہو۔ ہمیں گالی دو گے تو وہ بھی ہم اپنے اندر جذب کر لیں گے"۔

"آپ نے مجھ سے یہ پوچھا تھا کہ پاکستان کے لوگ کیسے ہیں" — صغیر نے کہا — "میں آپ کو بتا رہا ہوں کہ یہاں کے ہندو اور وہاں کے مسلمان توہم پرستی میں ایک جیسے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں جعلی جوگی، سنیاسی، پنڈت، جوتشی اور نجومی وغیرہ عام ہیں اور وہاں جعلی پیر، عامل، جوتشی اور نجومی وغیرہ موجود ہیں۔ حالانکہ ہمارا مذہب کہتا ہے کہ براہِ راست خدا سے مانگو خدا دے گا لیکن ہمارے دیہات میں لوگ مصیبت اور مشکل کے وقت خدا سے مانگنے کی بجائے پیروں اور عاملوں کے پاس دوڑے جاتے ہیں۔ بات یہ ہے مہاراج! مسلمانوں نے ہندوؤں سے بہت سی رسمیں اور بہت سے وہم لے لئے ہیں بلکہ بعض غلط باتیں اپنے مذہب میں شامل کر لی ہیں"۔

"کیا پاکستان کے لوگ خوشحال ہیں؟" — سنیاسی نے پوچھا۔

"نہیں" — صغیر نے جواب دیا — "وہاں جو امیر ہیں وہ اتنے امیر ہیں کہ انہیں پتہ نہیں چلتا کہ اتنی دولت کہاں خرچ کریں اور جو غریب ہیں وہ اتنے غریب ہیں کہ انہیں پتہ نہیں چلتا کہ دن کو روٹی کھا لی ہے تو رات کو روٹی کہاں سے آئے گی"۔

"پاکستان تو اسلامی ملک ہے" — بوڑھے سنیاسی نے کہا — "وہاں چوری چکاری اور ڈکیتی وغیرہ ہوتی ہی نہیں ہو گی"۔

"صرف یہ سچ ہے کہ پاکستان اسلامی ملک ہے" — صغیر نے کہا — "لیکن چوری چکاری اور جرم وغیرہ کا یہ حال ہے کہ اگر آپ ہاتھ میں چھوٹی سی تھیلی اٹھائے چلے جا رہے ہوں گے اور اس میں خواہ زہر ہی ہو، ایک موٹر سائیکل سوار پیچھے سے آئے گا اور آپ کے ہاتھ سے تھیلی چھین کر غائب ہو جائے گا کہ اس تھیلی میں پیسے ہوں گے"۔

صغیر نے ان جوگیوں اور سنیاسیوں کو یہ تو نہ بتایا کہ پاکستانی اُس مقام تک پہنچ چکے ہیں جہاں وہ خود صغیر کی طرح اپنا ایمان بیچ کر اپنے دشمن کے جاسوس بھی بن جاتے ہیں۔ صغیر اپنے دشمن ملک میں بیٹھ کر یہ بات شاید کہنا نہیں چاہتا تھا کہ جس ملک میں ایمان نیلامی پر رکھ دیا جائے وہاں سے خدا بھی نظریں پھیر لیتا ہے، اور جس ملک سے تکریمِ انسانیت ہی اٹھ جائے وہاں انسان انسانوں کو کھانا شروع کر دیتے ہیں۔

"یہ کلجگ ہے بیٹا!" — بوڑھے سنیاسی نے کہا — "تم اپنی زبان میں معلوم نہیں اسے کیا کہو گے۔ کلجگ اُس زمانے کو کہتے ہیں جس زمانے میں ہر آدمی، کیا مرد کیا عورت، کیا حکمران کیا رعایا، گناہوں کو ہی اپنا مذہب اور اپنا دھرم بنا لیتے ہیں۔ ہندوستان میں بھی یہی کچھ ہوتا ہے۔ پاکستان میں ذرا زیادہ ہوتا ہو گا۔ جہاں ایسے حالات پیدا ہو جائیں وہاں جدھر منہ کرو اُدھر جعلسازی نظر آتی ہے .... ہٹاؤ ان باتوں کو تم اپنی بات کرو"۔

"بات کیا کرنی ہے مہاراج!" — صغیر نے کہا — "میں نے پاکستان جانا ہے۔ میرے ماں باپ، بہن بھائی بہت پریشان ہوں گے .... اور اس کے ساتھ ہی میرا مسئلہ یہ بھی ہے کہ میں پولیس کے ہاتھ نہ چڑھ جاؤں"۔

"یہ غم دل سے نکال دو" — ایک اور سنیاسی بولا — "یہاں کوئی جعلسازی نہیں

ورنہ دھوکہ بازی ہے۔ چھپنے کی بھی ضرورت نہیں۔ یہ سب جنگل تمہارا ہے' گھومو پھرو اور جو ہم کھاتے ہیں وہ تم بھی کھاؤ۔ پاکستان کے راستے پر ہم تمہیں ڈال دیں گے' آگے تمہاری قسمت"۔

○

اسی رات ایک اور واقعہ ہو گیا۔ سنیاسی اور صغیر گہری نیند سوئے تھے۔ ان میں سے کسی ایک کی آنکھ کھلی۔ یہ سب گف کے اندر تھے۔ باہر شفاف چاندنی تھی۔ پہاڑی علاقے کی چاندنی دھوپ کی طرح چمکدار ہوتی ہے۔ سنیاسیوں میں سے کسی کی ویسے ہی آنکھ کھلی تو اس نے گف کے منہ میں ایک سایہ سا کھڑا دیکھا جو ذرا آگے بڑھا اور آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا۔ جب یہ سایہ پیچھے ہٹتے ہوئے چاندنی میں گیا تو اس نے ایک نوجوان لڑکی کا روپ اختیار کر لیا۔ لڑکی اچھے لباس میں تھی یعنی اس کا لباس اس علاقے کی عام پہاڑی لڑکیوں جیسا نہیں تھا۔ یہ سنیاسی اٹھا اور باہر نکل گیا۔

لڑکی نے جب اسے دیکھا تو وہ بھاگنے لگی لیکن ٹھوکر کھا کر گر پڑی۔ سنیاسی دوڑ کر اس تک پہنچا۔ لڑکی نے چیخنا چلّانا شروع کر دیا۔ گُف میں سوئے ہوئے آدمی جاگ اٹھے۔ سب سے پہلے صغیر باہر نکلا۔ اس نے دیکھا کہ سنیاسی نے ایک لڑکی کو پکڑ رکھا ہے اور لڑکی چیخیں مار رہی ہے۔ صغیر نے آگے ہو کر لڑکی کو سنیاسی سے چھڑایا تو لڑکی منتیں کرنے لگی کہ اس پر رحم کیا جائے۔

"مت چیخو بے وقوف!" — صغیر نے اسے کہا — "تمہیں کوئی نہیں چھیڑے گا۔ ہم پر اعتبار کرو"۔

اتنے میں باقی سنیاسی بھی باہر نکل آئے تھے۔ یہ سب تقریباً ننگے تھے۔ رات کو وہ کپڑے اتار کر سوتے تھے۔ صرف پہلوانوں جیسا ایک ایک لنگوٹ باندھ کر رکھتے تھے۔ ان کے رنگ کالے تھے۔ لڑکی کا تو یہ حال تھا جیسے خوف سے اس پر غشی طاری ہوئی جا رہی ہو۔ وہ یہی سمجھ رہی ہو گی کہ جنّوں اور بھُوتوں کے جنگل میں پھنس گئی ہے۔ بڑے سنیاسی اور صغیر نے اسے ایسے انداز سے تسلیاں اور دلاسے دیئے کہ وہ کچھ سکون میں آ گئی۔

"بتاؤ کہاں جا رہی ہو؟" — صغیر نے اسے کہا — "ہم تمہیں وہاں تک پہنچا دیں گے"۔

"میں ڈاکوؤں کے ٹھکانے سے بھاگ کر آ رہی ہوں" — لڑکی نے ہانپتی کانپتی آواز میں جواب دیا۔

"ہمیں پوری بات بتاؤ" — بوڑھے سنیاسی نے کہا۔

لڑکی نے انہیں سنایا کہ وہ ایک امیر کبیر باپ کی بیٹی ہے اور ہندو ہے۔ ماں باپ نے اس کے لئے یہ مصیبت کھڑی کر دی تھی کہ اس کی شادی ایک ایسے آدمی کے ساتھ کر رہے تھے جس کی عمر لڑکی سے دگنی سے بھی زیادہ تھی۔ لڑکی اپنے گاؤں کے ایک نوجوان کو چاہتی تھی جو بڑے اچھے گھرانے کا بیٹا تھا لیکن لڑکی کے باپ کی طرح یہ گھرانہ امیر نہیں تھا۔ لڑکی اپنی پسند بتانے کی جرأت نہیں کر سکتی تھی۔ یہ راز لڑکی کے باپ تک پہنچ گیا۔ باپ نے لڑکی کو گھر میں قید کر لیا اور اپنے دو تین آدمیوں سے اس لڑکے کی ایسی پٹائی کرائی کہ وہ دو روز چارپائی سے نہ اٹھ سکا۔

یہ نوجوان بھی اپنا کچھ اثر و رسوخ رکھتا تھا۔ اس کی یاری دوستی ایک جرائم پیشہ آدمی کے ساتھ بھی تھی۔ اس نے اپنے اس دوست کو بتایا اور کہا کہ ایک تو وہ اس لڑکی کو حاصل کر کے رہے گا اور دوسرے یہ کہ وہ اپنی مار پٹائی کا انتظام بھی لے گا۔ جرائم پیشہ دوست نے دوستی کا حق اس طرح ادا کیا کہ اسے کہا کہ وہ پیشہ ور ڈاکوؤں کی ایک پارٹی کو اچھی طرح جانتا ہے۔ وہ انہیں بتائے گا۔ وہ لوگ ایک تو اس گھر میں ڈاکہ ڈالیں گے اور لڑکی کا جو جہیز بنا ہُوا ہے وہ اٹھا لائیں گے اور اس کے ساتھ وہ لڑکی کو بھی اٹھا لائیں گے۔

"میں خود ان ڈاکوؤں کو بتاؤں گا کہ یہ مکان کیسا ہے" — اس نوجوان نے کہا — "اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اصل مال کس کمرے میں رکھا ہے اور لڑکی رات کو کہاں سوتی ہے۔ تم مجھے ان تک لے چلو"۔

لڑکی اور اس لڑکے کی چوری چھپے ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ ان دونوں نے گاؤں سے نکل جانے کا فیصلہ پہلے ہی کر رکھا تھا۔ لڑکا کہتا تھا کہ دِلّی چلے جائیں گے اور وہاں وہ کہیں نوکری چاکری کر لے گا۔ لڑکی نے اسے کہا تھا کہ نوکری چاکری کی کوئی ضرورت نہیں' گھر سے اپنا تمام زیور اور جتنی بھی رقم نقد ہاتھ لگی وہ سب اٹھا لائے گی۔ اس سے یہ ہو گا کہ لڑکا کسی شہر میں جا کر کوئی کاروبار کر لے گا۔

انہوں نے جذبات کے جوش میں آ کر یہ فیصلہ تو کر لیا تھا لیکن یہ نہیں سوچا تھا کہ

دیہات کا دو چار جماعتیں پڑھا ہُوا ناتجربہ کار نوجوان شہر میں جا کر کچھ بھی نہیں کر سکے گا لیکن اب ان کے جرائم پیشہ دوست نے کوئی اور ہی ذریعہ پیدا کر لیا تھا۔

اگلے ہی روز یہ لڑکا اپنے دوست کے ساتھ گاؤں سے کم و بیش پندرہ میل دور چھوٹے سے گاؤں میں چلا گیا جہاں ان ڈاکوؤں کا صرف ایک ساتھی انہیں ملا۔

اس شخص کو انہوں نے بتایا کہ وہ کیا ارادہ لے کر آئے ہیں۔ ڈاکو نے انہیں کہا کہ وہ اپنے استاد کے ساتھ بات کرے گا اور اس نے یہ بھی کہا کہ گھر کا بھیدی مل جائے تو کام آسان اور محفوظ ہو جاتا ہے۔

لڑکی اور لڑکے کی محبت کی شدت کا یہ عالم تھا کہ لڑکے نے اس لڑکی کو اپنا یہ سارا پروگرام اور ارادہ بتا دیا اور لڑکی نے نہ صرف یہ کہ لڑکے کی تائید کی بلکہ اسے بتایا کہ زیورات اور نقدی کہاں پڑی ہے۔ محبت کی شدت کے علاوہ یہ بات بھی تھی کہ لڑکی کو بھی باپ نے اور بھائیوں نے مارا پیٹا تھا۔ سب سے بری بات تو یہ تھی کہ لڑکی کو اُس کے باپ کی عمر کے آدمی کے ساتھ بیاہا جا رہا تھا جس کے پہلے دو بچے تھے۔

پھر ایک رات لڑکی کے گھر ایسی صفائی سے ڈکیتی کی واردات ہوئی کہ گھر سے صرف دو چیزیں گئیں۔ ایک وہ ٹرنک جس میں اصل مال تھا۔ اس ٹرنک میں زیور اور رقم کے علاوہ لڑکی کے قیمتی کپڑے بھی تھے' اور دوسری جو چیز گھر سے گئی وہ لڑکی تھی۔ گھر والوں کی آنکھ تو کھل گئی تھی لیکن ڈاکوؤں کی دہشت نے انہیں شور شرابہ نہ کرنے دیا۔

لڑکی اپنے جہیز کے ساتھ ڈاکوؤں کے ٹھکانے پر پہنچ گئی۔ اگلے روز لڑکی کا عاشق بھی وہاں جا پہنچا۔ وہ اس امید پر گیا تھا کہ اسے لڑکی مل جائے گی' لڑکی کے کپڑے مل جائیں گے اور زیورات اور رقم میں سے آدھا حصہ ڈاکو رکھ لیں گے باقی اسے مل جائے گا لیکن وہاں ڈاکوؤں کی نیّت کچھ اور ہو چکی تھی۔ وہ لڑکی کو کچھ دن اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے۔

"اس لڑکی کی خاطر تو میں نے اتنی بڑی واردات کرائی ہے" — لڑکے نے ڈاکوؤں سے کہا — "یہ طوائف نہیں اور نہ ہی اس کے ساتھ میرے ناجائز تعلقات تھے۔ یہ کنواری لڑکی ہے' میں اسے کسی قیمت پر کسی کے حوالے نہیں کروں گا"۔

"تمہارے ساتھ ہم نے پہلے ہی معاملہ طے کر لیا تھا" — ڈاکوؤں کے استاد نے کہا

— "میں نے کہا تھا کہ آدھا مال ہمارا ہو گا۔ یہ تو ہم تم پر مہربانی کر رہے ہیں کہ لڑکی کو صرف پانچ چھ دن رکھیں گے' ویسے ہمارا حصہ زیادہ بنتا ہے۔ ہم لڑکی کو زیادہ عرصہ بھی رکھ سکتے ہیں"۔

اس بات پر لڑکے کی ڈاکوؤں کے ساتھ تکرار ہوئی۔ لڑکا مان نہیں رہا تھا۔ جھگڑا اتنا بڑھا کہ ڈاکوؤں نے لڑکے کو باندھ لیا اور ایک کمرے میں بند کر دیا۔

رات کا وقت تھا۔ لڑکا طاقتور جوان تھا۔ اس نے ڈاکوؤں کا مقابلہ کیا تھا اور ان کے ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ تینوں ڈاکو اس پر ٹوٹ پڑے اور اسے قابو کر لیا۔ اس لڑائی جھگڑے میں ان لوگوں کی لڑکی کی طرف سے توجہ ہٹ گئی۔ لڑکی نے یہ ہمت کی کہ وہاں سے نکل آئی اور باہر آ کر دوڑ پڑی۔ وہ پہاڑی علاقے کی رہنے والی لڑکی تھی اس لئے اس علاقے میں بھاگنے دوڑنے کی عادی تھی۔ وہ چال چلن کے لحاظ سے بالکل ٹھیک تھی اس لئے وہ اپنی عزت بچانے کی خاطر جان پر کھیل جانے کے لئے بھی تیار تھی۔ آخر وہ سنیاسیوں کی گُفا تک آن پہنچی۔

"ہم تمہیں تمہارے گھر تک پہنچا دیں گے" — بوڑھے سنیاسی نے لڑکی سے کہا — "یہ سوچ لو کہ یہ واردات تم نے خود کروائی ہے اور یہ بھی سوچ لو کہ جس کی خاطر تم نے اپنے گھر میں ڈاکہ ڈلوایا ہے وہ ڈاکوؤں کے پاس ہے۔ پولیس اسے بھی ڈاکوؤں کا ساتھی کہہ کر پکڑ لے گی"۔

"میں کچھ سمجھ نہیں سکتی" — لڑکی نے روتے ہوئے کہا — "میں اتنا ہی جانتی ہوں کہ میں تین آدمیوں کے ہاتھوں خراب نہیں ہونا چاہتی تھی۔ مجھے یہ ڈر بھی آنے لگا ہے کہ میں نے اپنا گھر لُٹوا دیا ہے اور اس کی مجھے سزا مل رہی ہے.... کیا تم لوگ واقعی مجھے میرے گھر پہنچا دو گے؟؟"

وہ کوئی جرائم پیشہ لڑکی نہیں تھی۔ اٹھارہ اُنیس سال کی نادان اور گھریلو لڑکی تھی۔ وہ امیر گھرانے میں پل کر جوان ہوئی تھی۔ اتنی سختی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ جذبات سے مغلوب ہو کر وہ بڑی ہی خوفناک حرکت کر بیٹھی تھی۔ اب اس کی یہ حالت تھی جیسے سیلاب میں گر پڑی ہو۔ وہ تو سیلاب کے بھنور میں آ گئی تھی۔

"سنو میرے بھائیو!" — بوڑھے سنیاسی نے اپنے ساتھیوں سے کہا — "ہماری ذمہ داری صرف اتنی ہے کہ اس لڑکی کو اس کے والدین کے حوالے کر آئیں۔ آگے

پولیس کا معاملہ ہے' وہ جو چاہے کرے.... تم میں سے کون اسے گھر تک پہنچائے گا"۔

"ابھی نہیں!" — صغیر نے کہا — "آج رات یہ یہیں رہے گی کیونکہ ڈاکو اس کے تعاقب اور اس کی تلاش میں بھاگ دوڑ رہے ہوں گے۔ ہمارے پاس کوئی ہتھیار نہیں۔ کل دن کے وقت میں اسے اس کے گھر تک چھوڑ آؤں گا۔ دن کے وقت کوئی ڈاکو واردات کی جرأت نہیں کرتا"۔

ان لوگوں نے لڑکی کو پھر تسلیاں وغیرہ دیں کہ وہ آرام سے سو جائے اور سورج نکلتے ہی اسے لے جائیں گے۔

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ کچھ آدمیوں کی باتوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ صغیر نے بڑی تیزی سے لڑکی کو اٹھایا اور اسے گُف کے اندر لے جا کر چھپا دیا اور خود باہر آ گیا۔ تمام سنیاسی باہر بیٹھے لڑکی کی باتیں سن رہے تھے۔ صغیر نے انہیں کہا کہ سب دائرے میں اس طرح بیٹھ جائیں جیسے کوئی عبادت کر رہے ہوں۔ یہ تو ابھی معلوم نہیں تھا کہ وہ لوگ کون ہیں جن کی باتیں سنائی دے رہی تھیں۔ شک یہی تھا کہ وہ ڈاکو ہی ہو سکتے ہیں۔ یہ کوئی راستہ نہیں تھا کہ عام لوگ اِدھر سے گزرتے ہوں۔

اتنے میں تین آدمی ان کے قریب آ کر رکے۔ بوڑھا سنیاسی کوئی جنتر منتر پڑھ رہا تھا۔ ظاہر یہ کرنا تھا کہ یہ جوگی اور سنیاسی اپنی عبادت یا کسی عمل میں مصروف ہیں۔

"اپنا راستہ پکڑو بھائی!" — بوڑھے سنیاسی نے ان تین آدمیوں سے کہا — "ہماری پرارتھنا میں گڑبڑ ہو جاتی ہے"۔

"جوگی مہاراج!" — ان تینوں میں سے ایک نے کہا — "ہماری ایک لڑکی گھر سے بھاگ آئی ہے۔ آپ نے کسی لڑکی کو اِدھر سے گزرتے تو نہیں دیکھا؟"

"نہیں بھائی نہیں" — بوڑھے سنیاسی نے کہا — "ہمیں اس وقت کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ ہم اپنی دھن میں مگن ہیں۔ ہم نے کسی لڑکی کو نہیں دیکھا"۔

یہ تین آدمی ڈاکو ہی تھے جو لڑکی کے تعاقب میں آئے تھے' وہ آگے چلے گئے۔ سنیاسی اٹھے اور اپنی گف میں آ گئے۔

صبح طلوع ہوئی' سب جاگ اٹھے۔ لڑکی کے چہرے پر خوف و ہراس تھا لیکن وہ مطمئن تھی کہ ان آدمیوں نے اسے ویسے ہی اپنی حفاظت میں رکھا تھا جیسے انہوں نے اسے رات کو یقین دلایا تھا۔ صغیر اٹھا اور اس نے کہا کہ وہ اکیلا اس لڑکی کو گھر پہنچا آئے گا۔

"ایک خطرہ تم نے نہیں سوچا؟" — بڑے سنیاسی نے صغیر سے پوچھا — "کیا تم نے یہ نہیں سوچا کہ اس لڑکی کے گھر میں پولیس آئی ہوئی ہو گی اور وہ تم سے پوچھے گی کہ تم کون ہو تو کیا جواب دو گے؟"

"میں لڑکی کے گھر تک نہیں جاؤں گا" — صغیر نے جواب دیا — "گاؤں سے کچھ دور رک جاؤں گا اور لڑکی کو آگے بھیج دوں گا اور دیکھتا رہوں گا۔ جب یہ گاؤں میں داخل ہو جائے گی تو میں وہاں سے بھاگ آؤں گا!"

صغیر لڑکی کو لے کر چل پڑا۔

"تم گھر تو جا رہی ہو" — صغیر نے لڑکی سے کہا — "گھر پہنچو گی تو تمہارے والدین تمہیں اس بڈھے سے بیاہ دیں گے"۔

لڑکی سوائے رونے کے کوئی بات نہیں کرتی تھی۔ جو بُرے حالات اس نے اپنے لئے پیدا کر لئے تھے انہوں نے اس کا دماغی توازن ہلا ڈالا تھا۔ صغیر کو لڑکی کے ساتھ اتنی ہی دلچسپی تھی کہ وہ اسے اس کے گھر تک پہنچانا چاہتا تھا اور یہ بھی اس لئے کہ اس کام کو وہ کارِ خیر سمجھتا تھا اور وہ دل میں خدا سے کہتا جا رہا تھا کہ یااللہ میری اس نیکی کو قبول کرنا اور اس کا مجھے صرف اتنا اجر دے دینا کہ میں زندہ اور سلامت پاکستان تک پہنچ جاؤں۔ اگر وہ چاہتا تو لڑکی کے ساتھ ہر بے ہُودہ حرکت کر سکتا تھا۔ لڑکی اس سے اتنی متاثر ہو چکی تھی کہ وہ صغیر کے ذرا سے اشارے پر اپنا آپ اس کے حوالے کر دیتی اور اس کے عوض صرف یہ مانگتی کہ اسے صغیر اس کے گھر پہنچا دے۔

صغیر کی مجبوری یہ تھی کہ وہ تیز نہیں چل سکتا تھا کیونکہ اس کی دونوں ٹانگوں پر زخم تھے۔ گاؤں خاصا دُور تھا' سورج اوپر آتا جا رہا تھا۔ لڑکی کو بھی راستے کا اچھی طرح علم نہیں تھا۔ وہ اپنے گاؤں سے اتنی دور کبھی نہیں آئی تھی۔ وہ صرف سمت بتا سکتی تھی کہ اس کا گاؤں فلاں طرف ہے۔

دونوں ایک ٹیکری سے گھومے تو آگے ایک کھلی سی جگہ آ گئی۔ اچانک چار آدمی ان کے سامنے آ گئے۔

"یہ ہے ہمارا مال" — ان میں سے ایک نے بے تابی سے کہا — "یہی ہے"۔

"یہ وہی ہیں" — لڑکی نے گھبراہٹ سے کانپتی ہوئی آواز میں صغیر کو بتایا اور اس

کے پیچھے ہو کر کہا — "یہ وہی ڈاکو ہیں"۔

صغیر کو یاد آیا کہ رات کو یہ تین تھے۔ ان کی تعداد اب چار ہو گئی تھی۔ ان میں سے دو نے ریوالور نکال لئے۔ ایک نے بڑا لمبا چاقو نکالا اور ایک نے خنجر نکال لیا۔ چاروں آہستہ آہستہ آگے آئے۔

"میرے پاس آ جا لڑکی!" — ایک نے کہا اور صغیر سے اس نے کہا — "اور تم بھی ہمارے ساتھ چلو"۔

"دیکھو بھائیو!" — صغیر نے کہا — "میں خالی ہاتھ ہوں اور یہ کمزور سی لڑکی ہے۔ اسے گھر جانے دو اور مجھے اپنے ساتھ لے چلو"۔

"یہاں تمہاری مرضی نہیں چلے گی" — ڈاکو نے کہا — "ہم جو کہتے ہیں وہ کرو"۔

صغیر ان کے ساتھ باتیں تو کر رہا تھا لیکن سوچ یہ رہا تھا کہ وہ ان کا مقابلہ کس طرح کرے۔ یہ تو وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ بغیر مقابلے کے لڑکی ان کے حوالے نہیں کرے گا۔ لڑکی اس کے پیچھے چھپنے کی کوشش کر رہی تھی۔

ڈاکوؤں کا سربراہ جس کے ہاتھ میں ریوالور تھا صغیر کے قریب آ گیا اور ریوالور کی نالی صغیر کی طرف کر کے دوسرا ہاتھ بڑھا کر لڑکی کا بازو پکڑ لیا اور اسے صغیر کے پیچھے سے اپنی طرف گھسیٹا۔ صغیر نے بڑی تیزی سے اس کی ریوالور والی کلائی پکڑ لی اور پوری طاقت سے گھونسہ اس کی ناک پر آنکھوں کے درمیان مارا اور اس کی ریوالور والی کلائی زور سے جھٹک کر اوپر کر دی اور ایک گھونسہ اس کے پیٹ میں مارا۔ ان دو گھونسوں سے اس شخص کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

صغیر نے دوسری چال یہ چلی کہ اس شخص کو گھما کر اس کی پیٹھ اپنے سینے کے ساتھ لگا لی۔ اس سے یہ فائدہ ہُوا کہ صغیر پر دوسرا ریوالور والا آدمی گولی نہیں چلا سکتا تھا البتہ خنجر والا آدمی صغیر پر حملہ آور ہُوا۔ ان لوگوں کو معلوم نہیں تھا کہ صغیر کو اس طرح کی لڑائی کی باقاعدہ ٹریننگ ملی ہوئی ہے۔ صغیر نے خنجر والے آدمی کے پیٹ میں اتنی زور سے لات ماری کہ وہ دوہرا ہو گیا اور اس کے ہاتھ سے خنجر گر پڑا۔

"خنجر اٹھا کر مجھے دے دو لڑکی!" — صغیر نے لڑکی نے کہا۔

لڑکی نے لپک کر خنجر اٹھایا اور صغیر کو دے دیا۔ صغیر نے اس خنجر کی نوک ڈاکوؤں کے سربراہ کی شہ رگ پر رکھ دی اور اسے کہا کہ ریوالور پھینک دے۔ ڈاکو نے ریوالور

پھینک دیا۔ اب صغیر کے ایک ہاتھ میں خنجر اور دوسرے میں ریوالور تھا۔ یہ سارا عمل چند سیکنڈ میں ہو گیا۔ باقی ڈاکوؤں کو سوچنے کی بھی مہلت نہ ملی کہ یہ سب کیا ہُوا اور کیسے ہُوا۔ صغیر نے ڈاکوؤں کے استاد کو چھوڑ دیا۔ اس نے ریوالور آگے کر کے دوسرے ریوالور والے ڈاکو سے کہا کہ وہ بھی ریوالور پھینک دے۔ وہ کوئی اناڑی معلوم ہوتے تھے۔ ریوالور والے نے ریوالور اور چاقو والے نے چاقو صغیر کی طرف پھینک دیا۔

"تم تو استاد معلوم ہوتے ہو یار!" — ڈاکوؤں کے استاد نے صغیر سے ہنستے ہوئے کہا — "بیٹھ جاؤ ذرا، تم تو ہمارے دوست معلوم ہوتے ہو"۔

صغیر بیٹھ گیا اور وہ چاروں اس کے سامنے بیٹھ گئے۔

"تم کوئی عام قسم کے آدمی نہیں" — ڈاکوؤں کے استاد نے کہا — "کوئی شک نہیں کہ تم ہمارے پیشے کے آدمی ہو۔ اتنی پھرتی کوئی عام آدمی نہیں دکھا سکتا۔ کیا یہ بتانا پسند کرو گے کہ تم کس کے ساتھ ہو اور تمہارا علاقہ کون سا ہے؟"

"تمہارے پیشے کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں" — صغیر نے جواب دیا — "اور یہ بتانے کی بھی ضرورت نہیں کہ میں کون ہوں۔ میں نے تمہیں بتا دیا ہے کہ تمہارے ساتھ میری کوئی دشمنی نہیں"۔

"دشمنی والی بات تو بن ہی جائے گی" — ڈاکو نے کہا — "یہ لڑکی اپنے گھر جائے گی تو پولیس کو ہمارا ٹھکانہ بتا دے گی۔ ہمیں شناخت بھی کر لے گی اس لئے ہم نہیں چاہتے کہ یہ لڑکی اپنے گھر جائے"۔

"میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی" — لڑکی نے روتے ہوئے کہا — "مجھے گھر جانے دو۔ میں کہوں گی کہ مجھے میری آنکھوں پر پٹی باندھ کر لے گئے تھے اور ذرا سی مہلت ملی تو میں بھاگ آئی"۔

چاروں ڈاکوؤں نے صغیر کو پختہ کار ڈاکو سمجھ کر اس کے ساتھ دوستانہ سی باتیں شروع کر دیں۔ وہ اور کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے۔ ان کے ہتھیار تو صغیر کے پاس تھے۔ انہوں نے صغیر کو بتایا کہ وہ رات بھر اس لڑکی کو اس جنگل میں ڈھونڈتے رہے ہیں۔ صبح پھر اس چوتھے ساتھی کو ساتھ لے کر اس کی تلاش کے لئے نکلے۔ انہیں توقع یہ تھی کہ لڑکی جنگل میں بھٹک گئی ہو گی اور گھر نہیں پہنچ سکے گی۔ وہ پہاڑیوں اور ٹیکریوں کا علاقہ تھا۔ وہاں بھٹک جانا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔

"تم کہتے ہو کہ تمہارا ہمارے پیشے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں" — ڈاکوؤں کے استاد نے صغیر سے کہا — "لیکن میں نہیں مانتا۔ میں ایک بات کہتا ہوں۔ ہمارے ساتھ مل جاؤ پھر ہم بڑی بڑی وارداتیں کریں گے۔ اگر تمہاری کوئی شرط ہے تو وہ بتا دو"۔

صغیر نے ہنستے ہوئے جواب دیا کہ وہ اس لائن کا آدمی نہیں اور نہ ہی وہ یہ کام کرے گا۔

"بھوک لگی ہے یار!" — استاد نے کہا اور اپنے ایک ساتھی کی طرف دیکھ کر بولا — "پراٹھے نکالو" — اس نے صغیر سے کہا — "ہمیں معلوم تھا کہ دن بھر اس جنگل میں گھومنا پھرنا پڑے گا اس لئے پراٹھے اور انڈے بنوا کر ساتھ لے آئے ہیں"۔

جس آدمی کی طرف اس نے اشارہ کیا تھا اس کے پاس چمڑے کا ایک تھیلا تھا۔ اس نے فوراً تھیلا کھولا اور اس میں سے پراٹھے وغیرہ نکالے۔ اس کے ساتھ بھنے ہوئے انڈے بھی تھے۔ ڈاکوؤں کے سردار نے اوپر والا پراٹھا اٹھا کر اپنے ایک ساتھی کو دیا' ایک دوسرے ساتھی کو' ایک تیسرے کو' چوتھا پراٹھا خود رکھا اور سب سے نیچے والا ایک پراٹھا نکال کر صغیر کو دیا اور اس پر کچھ انڈے رکھ دیئے اور ایک پراٹھا لڑکی کو انڈوں کے ساتھ دے دیا۔

صغیر کو بھی بھوک لگی ہوئی تھی۔ اس نے پراٹھا کھانا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ گپ شپ چلتی رہی اور صغیر پورا پراٹھا کھا گیا۔

دس پندرہ منٹ گزرے ہوں گے کہ صغیر کو غنودگی سی آنے لگی۔ ایسی ہی غنودگی لڑکی پر بھی طاری ہونے لگی۔ صغیر اس غنودگی کو سمجھ نہ سکا اور اسے سمجھنے کی مہلت بھی نہ ملی۔ اس کے سامنے جنگل تاریک ہو گیا اور وہ ہوش و حواس کھو بیٹھا۔

صغیر کی آنکھ کھلی تو اس نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا تو اسے پتہ چلا کہ یہ جنگل نہیں نہ ہی سنیاسیوں اور جوگیوں کی گُپھ ہے بلکہ اس کے ہر طرف دیواریں تھیں اور اوپر چھت تھی۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو اٹھ نہ سکا۔ اس کے دونوں ہاتھ اور دونوں ٹانگیں چارپائی کے ساتھ بندھی ہوئی تھیں۔ اس پر ابھی تک غنودگی کی سی کیفیت طاری تھی۔ اس نے اپنے دماغ پر زور دے کر اپنے ہوش و حواس بیدار کئے تو اسے یاد آنے لگا کہ کیا ہُوا تھا۔ اسے خیال آیا کہ ڈاکو جیت گئے ہیں۔ اسے جو پراٹھا دیا گیا تھا اس میں بے ہوشی یا نیند کی دوائی ڈالی گئی تھی۔

کچھ دیر بعد ڈاکوؤں کا سردار اس کمرے میں آیا۔ صغیر کی آنکھیں کھلی دیکھ کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔

"میں نے تمہیں استاد مان لیا ہے" — ڈاکو نے صغیر سے کہا — "لیکن تمہیں معلوم نہیں تھا کہ میں استادوں کا استاد ہوں"۔

"مجھے باندھ کر کیوں رکھا ہے؟" — صغیر نے پوچھا اور کہا — "ہاتھ پاؤں کھول دو یار! میں تمہیں پہلے بتا چکا ہوں کہ مجھے اپنا دشمن نہ سمجھو۔ تمہیں خطرہ ہے کہ تمہارے ٹھکانے کی نشاندہی ہو جائے گی۔ میری طرف سے تمہیں ایسا خطرہ نہیں ہونا چاہئے۔ یہ لڑکی میری کچھ نہیں لگتی"۔

"اب بتاؤ ہندو ہو یا مسلمان؟" — ڈاکوؤں کے سردار نے پوچھا۔

"مسلمان" — صغیر نے جواب دیا — "میرا نام اکبر ہے"۔

"میں بھی مسلمان ہوں" — ڈاکو نے کہا اور پوچھا — "کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"دِلّی" — صغیر نے جواب دیا — "سیر کے لئے شملہ آیا تھا۔ طبیعت سیلانی سی ہے۔ وہاں سے نیچے اتر آیا اور اسی جنگل میں گھوم پھر رہا ہوں۔ واپس چلا جاؤں گا اگر تم نے جانے دیا"۔

"مجھے شک ہے تم جھوٹ بول رہے ہو" — ڈاکو نے کہا — "یہ شک بھی ہوتا ہے کہ تم سی آئی ڈی کے آدمی ہو یا تمہارا تعلق پولیس یا فوج کے ساتھ تو ضرور ہے"۔

"میرا تعلق جس کسی کے ساتھ بھی ہے وہ تم بھول جاؤ" — صغیر نے کہا — "میری طرف سے تمہیں کوئی خطرہ نہیں۔ مجھے اگر کچھ دن ساتھ رکھنا چاہتے ہو تو رکھ لو' میں بھاگوں گا نہیں۔ تم اتنی سی بات نہیں سمجھتے کہ تمہارے دو ریوالور میرے ہاتھ میں آ گئے تھے۔ میں تم چاروں کو آگے لگا کر سیدھا تھانے لے جاتا لیکن میں نے کوئی ایسی کارروائی نہیں کی مگر تم نے دھوکے میں مجھے نشے والا پراٹھا کھلا دیا"۔

"یہ تو میں نے کرنا ہی تھا" — ڈاکو نے کہا — "اس قسم کے ایک دو پراٹھے ہم اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ جنگل میں گھومتے پھرتے کبھی کبھی کوئی روپے پیسے والا آدمی مل جاتا ہے۔ اس کے ساتھ اس طرح دوستانہ باتیں کر کے ایک پراٹھا کھلا دیتے ہیں اور جب وہ بے ہوش ہو جاتا ہے تو اس کی جیب خالی کر لیتے ہیں۔ گھڑی اور انگوٹھی ہو تو وہ

بھی اتار لیتے ہیں۔ یقین کرنا کہ میرے پاس جو ریوالور ہے یہ ایک آدمی سے اسی طرح اڑایا تھا۔ اسے پاس بٹھا کر بڑے پیار سے باتیں کیں اور پراٹھا کھلا کر سُلا دیا اور اس کا ریوالور لے آئے۔ اُسے وہیں پڑا رہنے دیا تھا۔ تمہیں میں اپنے ساتھ لانا چاہتا تھا اور لڑکی کو تو لانا ہی تھا۔ اسے جو پراٹھا کھلایا تھا وہ بھی نشے والا تھا۔ لڑکی ابھی تک سوئی ہوئی ہے"۔

"یہ بتاؤ کہ میرے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہتے ہو؟" — صغیر نے پوچھا — "میں تمہیں یہ بتا دیتا ہوں کہ اس لڑکی اور اس لڑکی کے گھر والوں کے ساتھ میرا کوئی تعلق، کوئی رشتہ نہیں، یہ محض انسانی ہمدردی کی وجہ سے تھا کہ میں اسے اکیلے گھر تک لے جا رہا تھا۔ میں تمہیں یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ میں کوئی سیدھا سادا شریف آدمی نہیں ہوں"۔

"وہ تو میں نے دیکھ لیا ہے" — ڈاکو بولا۔

"تم اگر مجھے چھوڑ دو گے تو میں نہ اس لڑکی کے گھر جاؤں گا نہ پولیس کے پاس" — صغیر نے کہا — "میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم مجھ پر اعتبار نہیں کرو گے۔ کرنا بھی نہیں چاہئے لیکن مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ میں کس طرح تمہیں یقین دلاؤں کہ میری طرف سے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا"۔

"ایک بات بتاؤ یار!" — ڈاکو نے پوچھا — "تم رہنے والے کہاں کے ہو؟"

"میں دِلّی کا رہنے والا ہوں!" — صغیر نے کہا — "پہلے بھی بتایا ہے"۔

"کیوں بکواس کرتے ہو" — ڈاکو نے کہا — "تم پنجابی ہو اور سوچنے والی بات یہ بھی ہے کہ تم اس علاقے کے رہنے والے دیہاتی بھی نہیں ہو۔ یہاں تم کیا کر رہے تھے؟ تم مسلمان ہو میں بھی مسلمان ہوں۔ میرا نام ارشد ہے اور لوگ مجھے ارشی کہتے ہیں۔ میرے ساتھ جھوٹ نہ بولو، اپنا آپ مجھ پر ظاہر کر دو، خدا کی قسم، دھوکہ نہیں دوں گا۔ میں تمہارے ہاتھ پاؤں کھول دیتا ہوں"۔

ارشی نے اس کے ہاتھوں اور ٹانگوں سے رسّیاں کھول دیں۔ صغیر اپنی کلائیاں اور ٹخنے ملتا ہُوا اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ بڑی تیزی سے سوچ رہا تھا کہ اُسے کیا کرنا چاہئے۔ یہ تو اس نے سوچ لیا تھا کہ ڈاکو اسے پولیس کے حوالے نہیں کریں گے کہ یہ بھاگا ہوا جاسوس ہے یا مفرور ہے لیکن وہ سوچ رہا تھا کہ یہ ڈاکو اسے بلیک میل کرنا ہی شروع نہ کر دے۔ ارشی اس کے پیچھے ہی پڑ گیا تھا کہ وہ اسے اپنی اصلیت بتائے۔ وہ صغیر کے اس جواب سے مطمئن نہیں ہُوا تھا کہ وہ دِلّی کا رہنے والا ہے اور ویسے ہی سیر سپاٹا کرنے اس جنگل میں نکل آیا ہے۔

"کیا ڈاکہ زنی تمہارا خاندانی پیشہ ہے؟" — صغیر نے پوچھا۔

"نہیں" — ارشی نے جواب دیا — "میرا باپ اسی صدمے سے مر گیا تھا کہ اس کا بیٹا اس پیشے میں جا نکلا ہے"۔

"اس پیشے میں تم کس طرح آئے؟"

"سچّی بات بتاؤں گا تو بھی نہیں مانو گے" — ارشی نے کہا — "میں مسلمان ہوں اور ہندوستان میں مسلمان ہونا بھی ایک جرم ہے۔ میں اُس وقت نویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ ہم دِلّی اور گڑگاؤں کے درمیان چھوٹے سے ایک گاؤں کے رہنے والے تھے جس میں مسلمانوں کے صرف چار گھر تھے اور باقی تمام گھر ہندوؤں کے تھے۔ ہماری ایک مسجد تھی۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کو ایسا ڈرانا شروع کر دیا کہ مسلمانوں نے مسجد میں جانا چھوڑ دیا۔ کبھی ہندو مسجد کے دروازے کے آگے اینٹوں کا یا پتھروں کا یا ملبے کا ڈھیر لگا دیتے اور کہتے کہ فلاں کا مکان بن رہا ہے۔ اس طرح کوئی مسجد میں نہ جا سکتا....

"ایک روز ہم نے مسجد میں گھوڑوں کی لید اور مویشیوں کا گوبر پھینکا ہُوا دیکھا۔ یہ ہندوؤں کی شرارت تھی۔ میں اُس وقت نویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ مسلمانوں کے چھ اور لڑکے تھے جو مجھ سے بڑے تھے۔ ہم نے خفیہ میٹنگ کی کہ مسجد کو آباد کریں گے۔ ہم نے مسجد میں جا کر جھاڑو دیا اور وہاں کھڑے کھڑے اعلان کیا کہ آج کے بعد مسجد کے دروازے کے آگے کسی نے کوئی اینٹ پتھر رکھا یا کسی ہندو نے کسی مسلمان کو مسجد میں آنے سے روکا تو اس کی خیر نہیں....

"ہندوؤں کو چیلنج کرنا بہت بڑا خطرہ تھا اور پھر ہم مسلمان آٹے میں نمک کے برابر تھے۔ ہندو اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ نکل آئے اور انہوں نے اعلان کر دیا کہ وہ اس مسجد کو آباد ہونے ہی نہیں دیں گے۔ ہم لڑکوں نے پورا پروگرام بنا رکھا تھا۔ اسے تم میری بے وقوفی یا ایمان کا جذبہ کہو، میں نے ہندوؤں کے چیلنج کو قبول کر لیا۔ ایک ٹھاکر جو اس گاؤں کا بادشاہ بنا ہُوا تھا آگے بڑھا۔ میری جیب میں چاقو تھا۔ میرے ساتھیوں کے پاس کلہاڑیاں اور ایک کے پاس برچھی تھی۔ ٹھاکر دھمکیاں دیتا ہُوا آگے آیا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ ہمیں تھانے پہنچا دے گا اور تھانے والے ہم پر کوئی جھوٹا کیس بنا کر جیل میں بند

کردیں گے اور تھانے میں جو مارپٹائی ہوگی وہ الگ ہوگی۔ میں نے بڑی تیزی سے چاقو کھولا اور ٹھاکر کے پیٹ میں پھیر دیا۔ ہندوؤں میں کھلبلی مچ گئی۔ میں بچپن ہی سے بڑا پُھرتیلا تھا۔ پڑھنے میں کوئی دلچسپی نہیں لیتا تھا۔ درختوں اور دیواروں پر چڑھنا اور تیز بھاگنا دوڑنا' کھڈ نالے پھلانگنا میرا شغل ہوتا تھا....

"میں نے ٹھاکر کا پیٹ چاک کیا اور ہندوؤں کے ہجوم میں سے اس قدر تیزی سے نکل آیا کہ کوئی مجھے دیکھ ہی نہ سکا کہ میں کدھر نکل گیا ہوں۔ میں تمہیں یہ بتا دیتا ہوں اکبر بھائی' میں بچہ تھا تو بھی مجھے احساس تھا کہ میں مسلمان ہوں اور ہندو مسلمان کا دشمن ہے اور جب میں ڈاکو بنا اور پھر ڈاکوؤں کا سردار بنا تو بھی یہ احساس زندہ ہے کہ میں مسلمان ہوں اور اپنے مقدس مذہب اسلام کے خلاف معمولی سی بات بھی برداشت نہیں کروں گا۔ اگر یہ لڑکی مسلمان ہوتی تو میں اس کے جسم کو ہاتھ بھی نہ لگاتا لیکن یہ ہندو ہے۔ میں نے اس کا گھر لُوٹا ہے اور اس لڑکی کو مہینہ دو مہینے بیوی بنا کر رکھوں گا اور پھر اسے چھوڑ دوں گا کہ اب اپنے گھر چلی جاؤ....

"میں تمہیں اتنی لمبی کہانی نہیں سناتا کہ پندرہ سولہ سال کی عمر میں ایک ٹھاکر کو قتل کر کے بھاگا تو کہاں جا نکلا اور ڈاکو کس طرح بنا۔ بس اتنا بتا دینا کافی ہے کہ ایک استاد مل گیا تھا جس نے مجھے اس لائن پر چلا دیا اور آج میں استاد ہوں۔ وہ استاد ایک سکھ تھا جس نے اپنے سر کے بال اور داڑھی صاف کر رکھی تھی۔ تم بھی مسلمان ہو اس لئے میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ میں تمہیں یہ بتا دیتا ہوں کہ میں اس لڑکی کو نہیں چھوڑوں گا"۔

"میں تمہارے پیشے کا آدمی نہیں ارشی بھائی!" — صغیر نے کہا اور وہی جھوٹ بولا جو وہ پہلے بولتا رہا تھا کہ وہ ویزے کے بغیر انڈیا میں پھنس گیا ہے' بھولا بھٹکا اِدھر آ نکلا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اس کی ایک ٹانگ میں گولی لگی تھی اور دوسری ٹانگ پر سانپ نے کاٹا تھا اور سنیاسیوں اور جوگیوں نے اسے اپنے پاس رکھ کر اس کی بہت خدمت کی ہے۔

"کیا تم مجھے پاکستان پہنچا سکتے ہو؟" — صغیر نے پوچھا۔

"میں جھوٹا وعدہ نہیں کروں گا" — ارشی نے کہا — "میں پنجاب میں کبھی بھی نہیں گیا۔ ان علاقوں سے ناواقف ہوں۔ تمہیں اسی راستے پر ڈال دوں گا۔ آگے اللہ

نگہبان ہے"۔

صغیر بھی کچھ کم استاد نہیں تھا' اس نے اپنی زبان کا جادو چلا کر ارشی اور اس کے ساتھیوں پر اپنا اعتماد قائم کر لیا۔ سب نے مل کر کھانا کھایا۔

"میرا ایک کام کر دو استاد!" — صغیر نے کہا — "سنیاسی میرے زخموں کی مرہم پٹی کرتے تھے۔ مجھے وہاں جانے دو ورنہ زخم خراب ہو جائیں گے"۔

"یہ بندوبست ہو جائے گا" — ارشی نے کہا — "لیکن رات کو وہاں جانا پڑے گا"۔

رات آئی تو یہ سب ایسے سوئے کہ انہیں ہوش ہی نہ رہا کہ سنیاسیوں کے پاس جا کر صغیر کی مرہم پٹی کرانی ہے۔ سب تھکے ہوئے تھے۔ رات کا آخری پہر تھا کہ ایک آدمی نے ارشی کو آ جگایا اور اس کے کان میں کہا کہ گاؤں پولیس کے گھیرے میں ہے۔ ارشی فوراً اٹھا اور اپنے ساتھیوں کو جگایا۔ صغیر بھی اٹھا۔

"ارشی اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو یہاں سے نکل نہیں سکو گے" — باہر سے للکار سنائی دی۔

وہ چھوٹا سا ایک گاؤں تھا۔ دس نہیں تو پندرہ گھر ہوں گے۔ پہاڑی علاقوں کے گاؤں ایسے ہی ہُوا کرتے ہیں۔ کچھ گھر پہاڑی کی ڈھلوان پر، کچھ اس سے اوپر اور دو چار دائیں اور بائیں گاؤں سے ذرا ہٹ کر۔ یہ گاؤں قدرے ہموار جگہ پر آباد تھا لیکن اس کے اردگرد کا علاقہ کسی پہلو ہموار نہیں تھا۔ ٹیلے تھے، ٹیکریاں اور چٹانیں تھیں اور جنگل خاصا گھنا تھا۔ کسی گھنی جھاڑی کے قریب سے گزرنے والوں کو پتہ نہیں چل سکتا تھا کہ اس جھاڑی میں کوئی آدمی چھپا ہُوا ہے۔

صغیر، ارشی اور اس کے تین ساتھی ایک مکان کے ایک ہی کمرے میں سوئے ہوئے تھے۔ یہ مکان ارشی کا اپنا نہیں تھا۔ ارشی اُن ڈاکوؤں میں سے تھا جو غریب دیہاتیوں کی جان اور ان کے مال و اموال کے محافظ بنے رہتے تھے اور انہیں مالی امداد بھی دیا کرتے تھے۔ غریبوں کی بیٹیوں کے جہیز کے لئے اچھی خاصی رقمیں دے دیا کرتے تھے۔ اس کے عوض دیہاتی ان کے ساتھ ہر طرح کا تعاون کرتے تھے اور جب کوئی ڈاکو کسی گاؤں میں جا چھپتا تھا تو دیہاتی اس کے لئے پہرہ دیا کرتے تھے اور پولیس آ جاتی تو اسے قبل از وقت خبردار کر کے بھگا دیا کرتے تھے۔

گاؤں کے ایک آدمی نے صغیر اور ارشی کو پہلے ہی جگا دیا تھا کہ پولیس آ گئی ہے پھر تھانے دار کی للکار سنائی دی۔ ارشی کے تینوں ساتھی بھی جاگ اٹھے تھے۔ لڑکی کسی اور مکان میں عورتوں کے پاس تھی۔

تھانے دار کی للکار ایک بار پھر بلند ہوئی۔ اب اس نے یہ بھی کہا — "ارشی! دوستوں کی طرح میرے پاس آ جاؤ، میں تمہیں زندہ رکھوں گا"۔

ارشی کے چہرے پر ذرا سی بھی گھبراہٹ نہیں تھی۔ صغیر نے اس سے پوچھا کہ اس

علاقے کے تھانے دار کا نام کیا ہے۔ اسے معلوم تھا کہ یہ اسی علاقے کا تھانے دار ہو گا۔ ارشی نے بتایا کہ یہ سب انسپکٹر پنڈت سندر داس کی آواز ہے اور وہ اس علاقے کا تھانے دار ہے۔

"پہلے کبھی تم اس طرح گھیرے میں آئے ہو؟" — صغیر نے ارشی سے، پوچھا۔

"ایک بار!" — ارشی نے جواب دیا — "لیکن میں نکل گیا تھا۔ دو ساتھی میرے ساتھ تھے۔ دونوں کو میں نکال لے گیا تھا"۔

"اب بھی نکل جائیں گے" — صغیر نے کہا۔

"لیکن استاد!" — ارشی نے کہا — "اس لڑکی کو ساتھ لے کر نکلنا بڑا مشکل نظر آتا ہے"۔

"تم تو بالکل ہی اناڑی لگتے ہو ارشی!" — صغیر نے کہا — "رہنے دو لڑکی کو یہیں۔ تمہارے لئے لڑکیوں کی تو کوئی کمی نہیں ہونی چاہئے۔ یہ لالچ تمہیں مروا دے گا"۔

ارشی ابھی تک صغیر کو ڈکیتی کے فن کا استاد سمجھ رہا تھا۔ صغیر نے اُس آدمی سے جو انہیں اطلاع دینے آیا تھا، پوچھا کہ اس کے اندازے کے مطابق پولیس کی نفری کتنی ہو گی۔

"میں نے ہر طرف گھوم پھر کر نہیں دیکھا" — اس آدمی نے بتایا — "تھانے دار کو پہچان لیا تھا۔ چاندنی کی وجہ سے میں آگے نہیں گیا۔ ایک مکان کے سائے میں چھپ کر دیکھا تو چار پانچ کانسٹیبل نظر آئے تھے۔ معلوم ہوتا ہے نفری زیادہ نہیں"۔

تھانے دار کی للکار ایک بار پھر بلند ہوئی۔ اب اس نے یہ بھی کہا — "میں صرف پندرہ منٹ کی مہلت دیتا ہوں پھر تم میرے سامنے آئے تو میں تمہیں گولی مار دوں گا اور رپورٹ دوں گا کہ تم نے ہم پر پہلے گولی چلائی تھی"۔

"تم ہی کچھ سوچو استاد!" — ارشی نے صغیر سے کہا — "ہمارے پاس صرف دو ہی ریوالور ہیں اور گولیاں بھی تھوڑی ہیں۔ گولی چلائے بغیر نکلنے کی سوچو استاد!"

صغیر نے یہ گاؤں دیکھا نہیں تھا۔ ارشی نے اسے دھوکے میں وہ پراٹھے کھلائے تھے جن میں نشے والی کوئی چیز ملی ہوئی تھی۔ صغیر گہری نیند سو گیا تھا اور اسے اٹھا کر اس گاؤں میں لائے تھے۔ اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ یہ گاؤں کتنا بڑا ہے اور اس کے اِرد گرد کی زمین کیسی ہے۔ اس نے ارشی سے کہا کہ وہ اسے اچھی طرح سمجھائے کہ یہ گاؤں اور

اس کا گرد و نواح کیسا ہے۔ ارشی نے اسے سمجھا دیا۔

صغیر نے ارشی سے ریوالور لے لیا۔ اس کے سلنڈر میں چھ گولیاں بھری ہوئی تھیں اور سولہ سترہ گولیاں بیلٹ میں تھیں جو صغیر نے اپنے ساتھ لے لیں۔ وہ اٹھا اور دروازے سے باہر جا کھڑا ہوا۔

"پنڈت سندر داس!" — صغیر نے بڑی بلند آواز سے سب انسپکٹر کو للکارا — "ہمارے پاس تین رائفلیں اور تین ریوالور ہیں۔ تم اس وقت میرے ایک آدمی کی رائفل کے نشانے میں ہو۔ تم جہاں کھڑے ہو وہیں کھڑے رہنا۔ ذرا دائیں بائیں ہوئے تو گولی تمہارے سینے سے پار ہو جائے گی۔ یہاں صرف ارشی نہیں۔ میرا نام سنو گے تو کانپنے لگ جاؤ گے۔ کوئی بے وقوفی نہ کر بیٹھنا"۔

"اپنا نام بتاؤ" — سب انسپکٹر پنڈت سندر داس نے کہا۔

"نہیں پنڈت جی!" — صغیر نے کہا — "میرا دماغ حاضر ہے۔ میری بات پر غور کرو"۔

"کیا چاہتے ہو؟" — تھانے دار نے پوچھا — "میں چلا جاؤں؟"

"تمہارا بھلا اسی میں ہے" — صغیر نے کہا — "میں اس باپ کا بیٹا اور شاگرد ہوں جسے انگریزوں کی فوج بھی نہیں پکڑ سکی تھی۔ اپنے آپ کو اور ان غریب سپاہیوں کو میرے ہاتھوں مروا کر مجھے پاپی نہ بناؤ۔ خاموشی کے ساتھ واپس چلے جاؤ۔ میں تمہیں اور تمہارے سپاہیوں کو خالی ہاتھ نہیں رخصت کروں گا"۔

"مجھے بزدل نہ سمجھو" — تھانے دار نے کہا — "میں کسی مندر کا پنڈت نہیں ہوں۔ میں اُن پنڈتوں میں سے ہوں جو اس ملک پر حکومت کر رہے ہیں"۔

"پنڈت جی مہاراج!" — صغیر نے کہا — "تم نے ہمیں پندرہ منٹ کی مہلت دی ہے۔ میں تمہیں بیس منٹ کی مہلت دیتا ہوں۔ اچھی طرح سوچ لو۔ اس وقت تمہاری جان میری مٹھی میں ہے۔ اپنی جگہ سے ہلنا نہیں ورنہ مارے جاؤ گے۔ بیس منٹ بعد جواب دینا۔ پہلی گولی میری طرف سے چلے گی"۔

صغیر نے بڑی ہی بلند آواز سے گاؤں والوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ گاؤں کا کوئی آدمی باہر نہ نکلے۔ اس کے ساتھ ہی صغیر نے چاندنی میں دیکھ لیا کہ تنگ سی یہ گلی تھی اور قریب ہی ایک اور گلی اس سے ملتی تھی اور یہ گاؤں بالکل ہی چھوٹا سا تھا۔ صغیر اندر چلا گیا۔

○

ارشی کے دماغ میں ایک ترکیب آ گئی۔ اس مکان کا چھوٹا سا صحن تھا۔ ارشی صغیر کو صحن میں لے گیا اور ایک گھوڑی دکھائی جو وہاں بندھی تھی۔ صحن میں گھاس بھی رکھی ہوئی تھی۔ ارشی نے مکان والے سے کہا کہ اسے ایک خالی بوری اور رسّی کی ضرورت ہے۔

مکان والے نے ایک بوری ڈھونڈ کر ارشی کو دے دی۔ صغیر نے اس سے پوچھا کہ وہ کرنا کیا چاہتا ہے۔ ارشی نے کہا کہ یہ گھاس بوری میں ڈال دو پھر دیکھنا کیا ہوتا ہے۔ صغیر اور ارشی نے بوری میں گھاس ڈالنی شروع کر دی اور جب بوری بھر گئی تو یہ گھوڑی کی پیٹھ پر کھڑی کر دی پھر رسّی لے کر اس بوری کو گھوڑی کی پیٹھ پر باندھ دیا۔ بوری کے ارد گرد اوپر اور درمیان میں دو رسیاں اس طرح کس کر باندھ دیں کہ دور سے پتہ چلتا تھا جیسے گھوڑے پر کوئی آدمی سوار ہو۔ تب اس نے صغیر کو بتایا کہ اس کی سکیم کیا ہے۔

صغیر نے گھوڑی کھولی اور ارشی کو ساتھ لے کر دونوں گھوڑی باہر لے گئے۔ گھوڑی کو ایک گلی میں کھڑا کیا۔ گھوڑی کا رخ گاؤں سے باہر کی طرف تھا۔ یہ گلی تین چار مکانوں کے بعد باہر نکل جاتی تھی۔ ارشی نے خنجر کی نوک بڑی زور سے گھوڑی کی پچھلی ٹانگ میں ماری اور اس کے ساتھ ہی صغیر نے ریوالور کی ایک گولی ہوا میں فائر کی۔ گھوڑی خنجر لگنے سے اور گولی کے ایسے زور دار دھماکے سے بدک کر سرپٹ بھاگ اٹھی۔

"آ جا پنڈت سندر داس، ہمیں پکڑ لے" — ارشی نے بڑی ہی بلند آواز میں کہا اور اس کے ساتھ ہی ریوالور اوپر کر کے ہوا میں فائر کیا۔

صغیر اور ارشی نے بڑی زور زور سے زمین پر دونوں پاؤں اس طرح مارے جیسے دو تین آدمی دوڑے جا رہے ہوں۔ گھوڑی چند سیکنڈ میں چھوٹے سے اس گاؤں سے نکل گئی اور گاؤں کے باہر دوڑتے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ پولیس کے آدمی گھوڑی کے پیچھے دوڑ پڑے ہیں۔ گھوڑی کی پیٹھ پر کھڑی بندھی بوری دور سے بالکل ایسے لگتی تھی جیسے اس پر کوئی سوار بیٹھا ہو۔

پولیس نے اس پر رائفلوں کا فائر کھول دیا۔ صغیر اور ارشی ہندوستان کی پولیس سے اچھی طرح واقف تھے۔ ہندوستان کی پولیس پاکستان جیسی ہی تھی.... رشوت خور اور بزدل.... جعلی پولیس مقابلوں کی عادی پولیس ڈاکوؤں کے مقابلے میں ٹھہر ہی نہیں سکتی تھی۔ کوئی ٹریننگ تو تھی نہیں نہ سب انسپکٹر پنڈت سندر داس نے اپنی اس نفری کو کسی خاص ترتیب اور تنظیم میں رکھا تھا۔ وہ خود گھوڑی کے پیچھے دوڑا تو اس کے تمام ہیڈ کانسٹیبل اور کانسٹیبل وغیرہ اس کے پیچھے دوڑ پڑے۔ صغیر، ارشی اور اس کے ساتھی دوسری طرف سے گاؤں سے نکل گئے۔ اس پہاڑی اور جنگلاتی علاقے میں انہیں پکڑنا ممکن نہیں تھا۔ کسی درخت کے تنے کے ساتھ کوئی آدمی لگ کر کھڑا ہو جاتا تو کسی کو نظر نہیں آتا تھا۔ ٹیکریاں اور ٹیلے تھے اور سبزہ اتنا زیادہ کہ کہیں بھی چھپا جا سکتا تھا۔

یہ سب سوائے صغیر کے اس علاقے سے اچھی طرح واقف تھے۔ ذرا سی دیر میں وہ خاصی دور چلے گئے۔ صغیر سے ابھی تیز نہیں دوڑا جاتا تھا کیونکہ اس کی ٹانگیں زخمی تھیں اور زخم ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہوئے تھے۔

ادھر گھوڑی کے تعاقب میں گئی ہوئی پولیس نے گھوڑی کو مار لیا۔ گھوڑی کو تین چار گولیاں لگی تھیں۔ گھوڑی گری اور ذرا دیر تڑپ کر مر گئی۔ تھانے دار اور اس کے سپاہی وغیرہ رائفلیں آگے اور انگلیاں ٹریگروں پر رکھے دبے پاؤں آہستہ آہستہ مری ہوئی گھوڑی کی طرف بڑھنے لگے۔ انہیں خطرہ نظر آ رہا تھا کہ اس کی پیٹھ پر بیٹھا ہوا ڈاکو مرتے مرتے ان پر ریوالور فائر کر دے گا۔ آخر اسے للکارتے ہوئے وہ سب قریب پہنچے تو دیکھا کہ یہ کوئی سوار نہیں تھا بلکہ ایک بوری تھی جس میں گھاس بھری ہوئی تھی۔

پنڈت سندر داس نے اپنے ان آدمیوں کو گالیاں دینی شروع کر دیں جو اُس طرف کھڑے تھے جس طرف سے گھوڑی بھاگی تھی۔ وہ تھانے دار کو یہ بیان تو نہیں دے سکتے تھے کہ انہوں نے جب گھوڑی پر سوار دیکھا اور دو گولیاں بھی فائر ہوئیں تو وہ سمجھے کہ یہ ڈاکوؤں کا سردار ہے جو دائیں بائیں فائر کرتا جا رہا ہے۔ اسے دیکھ کر اس طرف والے پولیس کے آدمی اِدھر اُدھر چھپ گئے تھے۔

پنڈت سندر داس نے حکم دیا کہ گاؤں میں چلو اور گاؤں کے گھر گھر کی تلاشی لو۔ دراصل وہ اپنا غصہ اور اپنی خفت گاؤں والوں پر نکالنا چاہتا تھا۔

پچھلے پہر کا چاند اور زیادہ روشن ہو گیا تھا۔ پہاڑی اور جنگلاتی علاقوں کی چاندنی

ویسے بھی بہت ہی شفاف ہوا کرتی ہے۔ تھانے دار نے گاؤں میں پہنچتے ہی چلّا کر حکم دیا کہ سب لوگ باہر آ جائیں۔ لوگ پہلے ہی جاگ اٹھے تھے، تھانے دار کا حکم سن کر وہ خوف کے مارے دوڑتے باہر آ گئے۔ تھانے دار نے انہیں فحش ننگی گالیاں دینی شروع کر دیں۔

"پنڈت جی مہاراج!" — ایک معمر آدمی نے ہاتھ جوڑ کر اور تھانے دار کے سامنے جا کر کہا — "ڈاکو اپنا حکم چلاتے ہیں۔ نہ مانو تو ہماری جان بھی محفوظ نہیں رہتی اور ہماری بیٹیوں کی عزت بھی۔ آپ آتے ہیں تو آپ کا رعب اور حکم بھی ہم پر ہی چلتا ہے۔ دونوں طرف کی گالیاں اور دھمکیاں ہمارے ہی حصے میں آتی ہیں"۔

یہ بھی اچھا ہوا کہ اس پنڈت تھانے دار کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ گاؤں کے ایک آدمی نے پہلے ہی ارشی کو بتا دیا تھا کہ پولیس آ گئی ہے۔ اسے پتہ چل جاتا تو اس آدمی کو تھانے دار وہیں گولی مار دیتا۔ بہرحال اس پنڈت کو گاؤں والوں پر رحم آ ہی گیا۔ اسے معلوم تھا کہ گاؤں والوں کے تعاون کے بغیر وہ ان ڈاکوؤں کو ہی نہیں بلکہ کسی بھی مفرور ملزم کو نہیں پکڑ سکتا۔ اس نے لوگوں سے کہا کہ اسے بتایا جائے کہ یہ ڈاکو کس وقت اور کس طرح اس گاؤں میں آئے تھے۔

"پہلے مجھے اُس گھر میں لے چلو جہاں ڈاکوؤں نے رات گزاری ہے" — تھانے دار نے کہا۔

تھانے دار کو اُس گھر میں لے جایا گیا۔ وہ اس گھر کو دیکھ کر اور رسمی سی تلاشی لے کر وہیں بیٹھ گیا اور بیان سننے لگا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے حکم کے لہجے میں گاؤں کے ایک بڑے آدمی سے کہا کہ اس کے لئے اور اس کی ساری نفری کے لئے ناشتے کا بندوبست کیا جائے۔

اسے پہلی بات یہ بتائی گئی کہ یہاں ایک گھر میں ایک نوجوان لڑکی ہے جسے یہ ڈاکو ساتھ لائے تھے۔ دوسری بات یہ کہ ایک گھر میں ایک جوان آدمی بند ہے جس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے ہیں۔ اسے بھی ڈاکو ساتھ لائے تھے اور یہاں پھینک کر چلے گئے اور ایک آدمی کو کندھوں پر اٹھا کر واپس آئے تھے۔ یہ آدمی بے ہوش تھا جسے پہلے تو لوگ مرا ہوا سمجھتے رہے لیکن وہ بھی ارشی ڈاکو کے ساتھ بھاگ گیا ہے۔

یہ لڑکی وہی لڑکی تھی جس نے اپنے چاہنے والے سے مل کر اپنے گھر میں ڈکیتی کی

واردات کروائی اور اپنے آپ کو خود ہی اغوا کروایا تھا۔ یہی وہ لڑکی تھی جسے صغیر اس کے ماں باپ کے گھر لے جا رہا تھا کہ راستے میں ارشی اور اس کے ساتھی مل گئے تھے۔
وہ صغیر تھا جسے ارشی اور اس کے تین ساتھی بے ہوشی کی حالت میں اٹھا کر اس گاؤں میں لائے تھے۔

جس جوان آدمی کے متعلق بتایا گیا کہ اسی گاؤں کے ایک گھر میں بند ہے' وہ وہی آدمی تھا جس سے اس لڑکی کی محبت تھی اور اس آدمی نے ہی لڑکی کے گھر ڈکیتی کی واردات کروائی اور لڑکی خود ہی اس کی خاطر گھر سے نکل آئی تھی۔ ارشی دیگر حصہ وصول کرنے کے علاوہ اس لڑکی کے جسم سے لطف اندوز ہو کر بھی اپنا معاوضہ لینا چاہتا تھا لیکن اس آدمی نے ایسا نہ ہونے دیا تو ارشی نے اسے باندھ کر بند کر دیا لیکن اس لڑائی جھگڑے میں لڑکی نکل بھاگی تھی اور صغیر سے جا اس کا آمنا سامنا ہُوا تھا۔

لوگوں کی راہنمائی میں تھانے دار اُس گھر میں گیا جہاں لڑکی کو رکھا گیا تھا۔ لڑکی وہاں بیٹھی زار و قطار رو رہی تھی۔ تھانے دار اسے تسلی دلاسے دے کر پوچھنے لگا کہ اس پر کیا بیتی ہے۔

یہ لڑکی صغیر کے لئے خطرہ پیدا کر سکتی تھی۔ وہ اس طرح کہ صحیح بیان دیتی کہ وہ سادھوؤں اور سنیاسیوں کے ہاں جا پہنچی تھی اور وہاں سے ایک آدمی اسے اس کے ماں باپ کے پاس لے جانے کے لئے چل پڑا تھا لیکن لڑکی صغیر کی نیکی کا صِلہ دینے کے لئے سادھوؤں اور سنیاسیوں اور صغیر کو گول ہی کر گئی۔ اس نے تھانے دار کو اتنا ہی بتایا کہ دو تین روز پہلے اس کے گھر ڈاکہ پڑا اور ڈاکو اسے بھی اٹھا لائے تھے۔

پھر تھانے دار اس گھر میں گیا جہاں اس لڑکی کا چاہنے والا بندھا پڑا تھا۔ اسے کھولا اور پوچھا کہ وہ ان ڈاکوؤں کے ہاتھ کس طرح چڑھ گیا تھا۔ تھانے دار ایسی بات تو مان ہی نہیں سکتا تھا کہ ڈاکو اس شخص کو بھی اغوا کر کے لے آئے ہیں۔ اگر ایسا ہی ہُوا ہے تو اس کے اغوا کی وجہ کیا ہے؟

وجہ ایسی تھی جو یہ شخص تھانے دار کو نہیں بتا سکتا تھا۔ ڈکیتی کی یہ واردات تو اس نے خود کروائی تھی۔ اسے اس لڑکی کے ساتھ اور لڑکی کو اس کے ساتھ دیوانہ وار محبت تھی۔ دوسری وجہ یہ کہ لڑکی کو باپ اپنی عمر کے ایک آدمی کے ساتھ بیاہ رہا تھا۔ تیسری وجہ یہ کہ باپ اور بھائیوں نے لڑکی کو مارا پیٹا تھا کہ وہ اس بڈھے کھسوٹ کو دھتکار رہی تھی۔ انہیں پتہ چلا کہ لڑکی اس شخص کو چاہتی ہے تو انہوں نے بدمعاشوں سے اس کی پٹائی کروا دی تھی۔ لڑکی اور اس آدمی نے انتقاماً اس واردات کا انتظام کیا تھا اور یہ انتظام اس شخص نے اپنے جرائم پیشہ دوست کے ذریعے کیا تھا۔ ارشی اس کے اس دوست کا دوست تھا۔

یہ ہندو تھانے دار ڈکیتی اور اغوا کی اسی واردات کی تفتیش کر رہا تھا۔ لڑکی کے اس عاشق نامراد کو ابھی معلوم نہیں ہُوا تھا کہ تھانے دار اتنی جلدی کس طرح اس گاؤں پر آن دھمکا ہے جہاں ارشی اس لڑکی کے ساتھ موجود ہے۔ یہ مخبری اس شخص کے اپنے جرائم پیشہ دوست نے کی تھی جس کے ذریعے واردات کروائی گئی تھی۔ اس جرائم پیشہ مخبر کو معلوم تھا کہ ارشی واردات کے بعد اسی گاؤں میں رات دو رات رکا کرتا ہے۔

ارشی تو اپنے ساتھیوں سمیت نکل بھاگا تھا لیکن تھانے دار کو لڑکی لڑکا مل گئے۔
تھانے دار نے بہت تلاشی لی لیکن جو نقدی اور زیورات چوری ہوئے تھے ان کا سراغ نہ ملا۔ یہ مال ارشی کے ساتھ ہی چلا گیا تھا۔

تھانے دار نے لڑکی اور اس دیوانے عاشق کو ساتھ لیا اور اپنے تھانے کو روانہ ہو گیا۔



صغیر' ارشی اور اس کے ساتھی بہت دور نکل گئے تھے۔ وہ بکھر کر بھاگے تھے۔ آخر ایک جگہ اکٹھے ہو گئے۔ صبح طلوع ہو رہی تھی۔

''ہم کہاں ہیں ارشی!'' — صغیر نے پوچھا اور کہا — ''اب میری فکر کرو' میں کہاں جاؤں!''

''تم کچھ ہی کیوں نہ کہو'' — ارشی نے مسکراتے ہوئے کہا — ''میں تمہیں استاد مانتا ہوں۔ اگر تم یہ اعلان نہ کرتے کہ ہمارے پاس تین رائفلیں اور تین ریوالور ہیں تو تھانے دار اپنی نفری کو ساتھ لئے گاؤں میں داخل ہو جاتا پھر ہم بچ نہیں سکتے تھے.... میری درخواست تو یہ ہے کہ میرے ساتھ رہو۔ تم ساتھ ہوئے تو ہم اتنے مضبوط ہو جائیں گے کہ بڑے شہروں میں وارداتیں کریں گے''۔

''میں تمہیں اپنی اصلیت بتا چکا ہوں ارشی!'' — صغیر نے کہا — ''مجھے نہ روکو۔ میری ٹانگوں کے زخم دیکھو۔ مجھے سنیاسیوں تک پہنچا دو' کہیں ایسا نہ ہو کہ زخم خراب

ہو جائیں پھر میں چلنے سے بھی معذور ہو جاؤں گا۔ زندگی ہوئی تو کبھی ملیں گے"۔

"میں تمہیں سمت اور راستہ بتا دیتا ہوں" — ارشی نے کہا — "بچ بچا کر وہاں تک چلے جاؤ۔ تم تو عقل مند آدمی ہو' مجھے یقین ہے تم کوئی بے وقوفی نہیں کرو گے"۔

"ایک بات بتا دو" — صغیر نے پوچھا — "اس علاقے کا تھانہ کہاں ہے؟.... ایسا نہ ہو کہ میں تھانے کے قریب سے گزروں اور پکڑا جاؤں"۔

"بہت دور!" — ارشی نے کہا — "میں تھانے کو ذہن میں رکھ کر اس طرف بھاگا تھا تاکہ تھانے کے علاقے سے دور نکل جائیں۔ تم اتنے پیارے آدمی ہو کہ میں تمہارا ساتھ چھوڑنا نہیں چاہتا لیکن میں تمہارے ساتھ وہاں تک جا نہیں سکتا۔ تمہیں اکیلے بھیجتے ہوئے میرا دل دُکھ رہا ہے"۔

"پھر میرے ساتھ پاکستان چلے چلو" — صغیر نے کہا — "اگر زندگی اسی لائن پر گزارنی ہے تو پاکستان سے بہتر اور کوئی ملک نہیں"۔

"وہ کیسے؟"

"دن دیہاڑے ڈکیتی کی وارداتیں کرتے پھرو" — صغیر نے کہا — "لُٹ جانے والے تھانے رپورٹ دینے جائیں گے تو تھانے دار ان سے ایسی باتیں کرے گا جیسے انہوں نے اپنا گھر خود ہی لُوٹ لیا ہے۔ بعض تھانے دار تو رپورٹ کرنے والوں کی بے عزتی کر کے تھانے سے نکال دیتے ہیں۔ تمہیں کوئی نہیں پوچھے گا۔ پاکستان میں ڈاکہ زنی اور رہزنی ایک جائز کاروبار ہے جس میں تھانے دار برابر کا حصہ دار ہوتا ہے۔ وہاں تمہیں سرکاری حیثیت بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ تھانے دار تمہیں اس پارٹی میں شامل کروا سکتا ہے جو اقتدار میں آتی ہے پھر جسے چاہو قتل کر دو اور جو پلاٹ یا مکان اچھا لگے اس پر قبضہ کر لو اور مکان کے مالک خود ہی بھاگ جائیں گے"۔

"نہ بھائی!" — ارشی نے حیرت زدگی کے لہجے میں کہا — "پاکستان میں ایسے نہیں ہو سکتا۔ میں نے پہلے کچھ ایسی باتیں سنی تھیں لیکن انہیں سچ نہیں مانتا تھا۔ تم پہلے پاکستانی ہو جو مجھے یہ بات سنا رہے ہو۔ ہم ہندوؤں کے سامنے پاکستان کا نام بڑے فخر سے لیا کرتے ہیں حالانکہ پاکستان آدھا رہ گیا ہے۔ جرائم اور غنڈہ گردی یہاں بھی ہے لیکن حالت یہاں ابھی تک نہیں پہنچی جو تم پاکستان کی سنا رہے ہو"۔

"دعا کرو ارشی! اللہ باقی پاکستان کو سلامت رکھے" — صغیر نے ہاتھ ارشی کی طرف بڑھا کر کہا — "گھٹا چڑھی آ رہی ہے۔ مجھے نکل جانا چاہئے.... یہ لو اپنا ریوالور اور اللہ حافظ!"

صغیر نے ریوالور اور بیلٹ ارشی کو دے دی پھر اس سے بغلگیر ہُوا اور پھر اس کے تینوں ساتھیوں سے گلے لگ کر ملا اور اس طرف چل پڑا جس طرف ارشی نے اسے بتایا تھا کہ سنیاسیوں کا ڈیرہ ہے۔

صغیر تھوڑی ہی دور گیا ہو گا کہ اس نے پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ اونچی نیچی زمین' چٹانوں اور گھنے پیڑوں نے ارشی اور اس کے ساتھیوں کو اس کی نظروں سے اوجھل کر دیا تھا۔ ذرا ہی آگے گیا تو یک لخت موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔

"یا اللہ!" — صغیر نے دونوں ہاتھ اور منہ آسمان کی طرف کر کے بلند آواز سے کہا — "اب یقین ہُوا ہے کہ تیری بے نیاز ذات نے میرے گناہ معاف کر دیئے ہیں۔ تیرا شکر میرے اللہ.... تیرا شکر میرے اللہ.... اب تیری ذاتِ اقدس کو کبھی ناراض نہیں کروں گا۔ تیری اس بارش کو بارانِ رحمت سمجھتا ہوں.... مجھے راہ دکھا میرے مولا! مجھے اپنی حفاظت میں رکھ خداوند دوعالم!"

وہ ہاتھ اپنے منہ پر پھیر کر آگے چل پڑا۔



بارش تیز تر ہوتی چلی جا رہی تھی اور چند قدم آگے بارش کی چادر کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ پہاڑیوں اور ٹیکریوں کے درمیان ندیاں بہہ نکلی تھیں۔ ان کی تیزی و تندی بڑھتی جا رہی تھی۔ صغیر کو پہلے اس بارش کا اور اس پہاڑی زمین کا تجربہ ہو چکا تھا۔ اب اُسے ایسا خطرہ نظر نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس رات کی طرح سیلاب میں بہہ جائے گا۔ وہ بے خوف و خطر بڑھتا جا رہا تھا۔

جس رات وہ شملہ سے بھاگ کر اس علاقے میں داخل ہُوا تھا' اس کے دل پر بوجھ تھا جس میں خوف بھی تھا اور انجانے خطرے بھی لیکن اب وہ اس طرح ہلکا پھلکا ہو کر چلا جا رہا تھا جیسے وہ اپنے تمام مسئلے اور اپنی تمام مشکلات رفع دفع کر چکا ہو اور اب ایک فاتح کی حیثیت سے اپنے گھر کو جا رہا ہو۔

اسے اچھی طرح احساس تھا کہ یہ قلبی سکون اس نیکی کا صلہ ہے جو اس نے ہندو لڑکی کے سلسلے میں کی ہے۔ وہ چاہتا تو اس لڑکی کے ساتھ وہی کھیل کھیل سکتا تھا جو ارشی

اس کے ساتھ کھیلنا چاہتا تھا۔ اس نے سوچا کہ وعدے کے مطابق لڑکی کو اس کے ماں باپ تک تو نہ پہنچا سکا لیکن پولیس آ گئی اور اب پولیس اسے اس کے گھر تک پہنچا دے گی۔

اسے یہ اطمینان بھی تھا کہ ایسی طوفانی بارش میں اسے کوئی دیکھ نہیں سکے گا اور پولیس کا خطرہ تو رفع ہو ہی گیا تھا۔

بہت دور آگے چلا گیا تو سیلاب نے اس کا راستہ روک لیا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ یہ کوئی باقاعدہ ندی ہے یا دو پہاڑیوں کے درمیان خالی جگہ ہے جو ندی کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ یہ ندی تھی یا نہیں' اس کی چوڑائی کوئی زیادہ نہیں تھی لیکن سیلاب اتنا تیز و تند تھا کہ صغیر جان گیا کہ اس میں سے وہ گزر نہیں سکے گا۔ پہاڑی ندی نالے اس قدر تیز و تند ہُوا کرتے ہیں کہ وزنی پتھروں کو بھی اپنے ساتھ بہا لے جاتے ہیں۔

صغیر پہاڑی کے دامن کے ساتھ ساتھ چلتا گیا۔ وہاں پانی اس کے ٹخنوں سے کچھ اوپر تک تھا اور آہستہ آہستہ اوپر ہی اوپر ہوتا جا رہا تھا۔

آگے گیا تو اسے برجیسا ایک بڑا ہی پرانا درخت نظر آیا جو پہاڑی کے دامن میں تھا۔ اس کا پھیلاؤ یعنی اس کے ٹہن ندی کے اوپر سے دوسری طرف تک چلے گئے تھے۔

صغیر سیلاب اتر جانے کا انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ وہ درخت پر چڑھ گیا اور ایک ٹہن پر سرکتا ہوا آگے کو نکل گیا۔ ٹہن کے اگلے سرے پر پہنچا تو اس کے وزن سے ٹہن نیچے کو جھک گیا۔ صغیر اوپر سے کودا اور پانی میں جا پڑا۔ وہاں پانی اس کے گھٹنوں تک تھا۔ اس سے آگے جو علاقہ آیا پھیلاؤ میں تھا اور صغیر اس علاقے میں داخل ہو گیا۔

گھٹائیں آگے نکل گئیں اور بارش کا جوش و خروش ماند پڑ گیا۔ صغیر چلتا گیا اور اب وہ اپنی ٹانگوں کے زخموں میں درد محسوس کرنے لگا۔ آدھے سے زیادہ دن گزر گیا تھا جوان آدمی تھا' اسے بھوک محسوس ہونے لگی لیکن وہ برداشت کرتا رہا۔

اس نے گھڑی دیکھی۔ شام کے چار بج چکے تھے۔ اس نے رک کر ہر طرف دیکھا تو محسوس کیا جیسے یہ علاقہ کچھ مانوس سا ہے۔ آگے چلتا گیا تو اسے یقین ہونے لگا کہ یہی علاقہ ہے جس میں سنیاسی رہتے ہیں — آخر وہ منزل پر پہنچ گیا۔ سنیاسی اپنی وسیع و عریض گف میں بیٹھے ہوئے تھے اور اُن میں کچھ سوئے ہوئے تھے۔ صغیر کو دیکھ کر سب اٹھ بیٹھے۔

"چھوڑ آئے لڑکی کو؟" — ایک بوڑھے سنیاسی نے پوچھا اور کہا — "ہم تمہارے متعلق پریشان تھے اور تمہاری واپسی کی امید کم ہی تھی"۔

صغیر نے انہیں سارا واقعہ سنا ڈالا اور آخر میں کہا کہ خدا نیکی کا صلہ دیتا ہے۔ اگر لڑکی پر اس کی نیّت خراب ہو جاتی تو اس وقت وہ حوالات میں ہوتا۔

"تم ہمارے کیا لگتے ہو؟" — بوڑھے سنیاسی نے کہا — "تمہارا مذہب اور' ہمارا مذہب اور تم ہمارے لئے اجنبی اور مشکوک بھی تھے لیکن ہم نے تمہیں ایسا انسان سمجھا جو مشکلات میں پھنس گیا تھا۔ ہم نے کسی لالچ میں تمہارے ساتھ نیکی نہیں کی' انسان کا فرض ہے کہ وہ مصیبت میں گھرے ہوئے انسان کی مدد کرے"۔

صغیر نے انہیں بتایا کہ اس کے زخم درد کی وجہ سے پریشان کر رہے ہیں۔ دو سنیاسیوں نے اس کی پٹیاں کھول کر نئی مرہم پٹی کر دی۔

"اب مجھے ایک اور خطرہ نظر آ رہا ہے" — صغیر نے کہا — "اگر لڑکی نے پولیس کو یہ بیان دے دیا کہ وہ ڈاکوؤں سے بھاگ کر یہاں آن پہنچی تھی اور پھر یہاں سے ایک آدمی اس کے ساتھ گیا تھا تو پولیس تصدیق کے لئے یہاں آ جائے گی۔ میں اس صورت میں پکڑا جاؤں گا"۔

"کس ملک کی پولیس کی بات کرتے ہو!" — بوڑھے سنیاسی نے کہا — "پولیس یہاں تک نہیں آئے گی۔ پولیس کو لڑکی مل گئی ہے اور وہ آدمی بھی مل گیا ہے جس نے لڑکی کو گھر سے اغوا کرایا تھا۔ ہندوستان کی پولیس اب یہ زحمت گوارا نہیں کرے گی کہ تصدیق کرانے کے لئے یہاں تک آ جائے"۔

"آ گئی تو ہم کیا کریں گے؟" — صغیر نے پوچھا۔

"ہم تمہیں چھپائے رکھیں گے" — سنیاسی نے کہا — "پولیس کو یہ بیان دیں گے کہ ایک آدمی یہاں آیا تھا اور وہ زخمی تھا اور وہ لڑکی کو اپنے ساتھ لے گیا تھا پھر واپس نہیں آیا"۔

صغیر کو کچھ ایسا شک ہونے لگا جیسے یہ سنیاسی اس کے ساتھ اپنا ہی کوئی کھیل کھیلنے کی کوشش میں ہوں۔ وہ سادھو قسم کے لوگ تھے' آسمان سے اُترے ہوئے فرشتے نہیں تھے۔ صغیر نے ان سادھوؤں اور سنیاسیوں کی کچھ کہانیاں سنی تھیں۔ اس نے سوچا کہ دنیا میں بڑے ہی نیک انسان موجود ہیں لیکن کسی کے ساتھ نیکی کرنے کی ایک

حد ہوتی ہے۔ یہ سنیاسی تو صغیر کی ذات سے وابستہ ہر خطرہ قبول کرتے چلے جا رہے تھے اور اس کے ساتھ ان کا رویّہ ایسا تھا جیسے صغیر کو کوئی اوتار سمجھ رہے ہوں۔

ان سوچوں نے صغیر کو اس فیصلے پر پہنچایا کہ ان سے وہ اپنے زخم ٹھیک کروائے اور ایک روز انہیں بتائے بغیر وہاں سے نکل جائے گا۔

○

کراچی کے انٹیروگیشن سنٹر میں جگ موہن کو آئی ایس آئی کے کرنل نے دو آدمیوں کے حوالے کر دیا اور کہا تھا کہ ان لالہ جی مہاراج کا دماغ درست کرنا ہے۔ اسے ٹارچر کے ایسے عمل میں ڈالنا تھا جو پتھروں کو بھی زبان دے دیا کرتا تھا۔

جگ موہن کے گھر میں دو نوکر بھی تھے۔ انہیں بھی انٹیروگیشن سنٹر میں لے گئے تھے اور تصدیق ہو گئی تھی کہ یہ بھی ہندو ہیں۔

جب جگ موہن کو دونوں آدمی خاص کمرے میں لے گئے تھے تو کرنل کے ساتھ آئے ایک میجر نے کرنل سے پوچھا کہ اس کے دونوں نوکروں کو ابھی تفتیش کے لئے بلا لیا جائے؟ کرنل نے کہا تھا کہ رات بارہ بجے انہیں یہاں لایا جائے گا۔

"ایکسکیوزمی سر!" — میجر نے کرنل سے کہا — "ایک اور کارروائی کرنی تھی جو ہمارے ذہن میں آئی ہی نہیں .... جگ موہن کے گھر میں ٹیلی فون ہے۔ ٹیلی فون ایکسچینج میں جا کر ہمیں اس نمبر پر ٹیپ لگوا دینی چاہئے تھی"۔

"گڈ آئیڈیا!" — کرنل نے کہا — "یہ کام اب بھی ہو سکتا ہے۔ تم ایکسچینج میں چلے جاؤ اور یہ کام کر دو"۔

"میں نے کچھ اور سوچا ہے سر!" — میجر نے کہا — "میں جگ موہن کے ایک نوکر کو ساتھ لے جاتا ہوں اور اس کے گھر جا کر کچھ دیر انتظار کروں گا۔ اس دوران کوئی فون آیا تو نوکر سے کہوں گا کہ وہ بات سنے اور پوچھے کہ کون بول رہا ہے"۔

کرنل نے میجر سے پوچھا کہ یہ انتظام وہ کس طرح کر سکے گا۔ نوکر بھی تربیت یافتہ ہو گا۔ وہ خفیہ الفاظ میں بتا سکتا ہے کہ یہاں معاملہ گڑبڑ ہے"۔

"مجھے ایک کوشش کرنے دیں سر!" — میجر نے کہا — "میں پہلی کوشش تو یہ کروں گا کہ نوکر کو اپنے زیر اثر کر لوں"۔

میجر نے کرنل کو واضح الفاظ میں بتایا کہ اس کی سکیم کیا ہے۔ کرنل نے کچھ دیر

سوچ کر میجر کو اجازت دے دی کہ وہ ایک نوکر کو ساتھ لے جائے۔

ان دونوں نوکروں میں ایک تو جوانی کی عمر میں تھا اور دوسرا ادھیڑ عمر تھا۔ میجر نے ادھیڑ عمر نوکر کو ساتھ لیا اور باہر لے جا کر جیپ میں بٹھایا۔ رائفلوں سے مسلح دو فوجی بھی جیپ میں بیٹھ گئے اور جیپ نے انہیں ملیر جگ موہن کے گھر پہنچا دیا۔ دروازے پر لگے ہوئے قفل کی سیل توڑ کر قفل کھولا اور میجر ادھیڑ عمر نوکر کو اُس کمرے میں لے گیا جہاں ٹیلی فون رکھا تھا۔

میجر نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔ ٹون آ رہی تھی۔ میجر نے ریسیور رکھ کر نوکر کو اسی کمرے میں اپنے سامنے بٹھا لیا۔

"میں تمہیں یہاں ایک خاص مقصد کے لئے لایا ہوں" — میجر نے نوکر سے کہا — "اس میں کوئی شک نہیں رہا کہ تم بھی جگ موہن کے رنگ کے آدمی ہو۔ جگ موہن نے پورا بیان دے دیا ہے۔ یہ سوچو کہ مجھے اس کا اصل نام کس نے بتایا ہے۔ اپنا صحیح نام جگ موہن نے خود بتایا ہے' اور تم جو دو نوکر ہو' اس نے تم دونوں کا پردہ رہنے ہی نہیں دیا۔ یہ بتاؤ کہ جگ موہن نے غلط کہا ہے؟"

"اس نے ٹھیک کہا ہے" — نوکر نے جواب دیا۔

"یہ بھی سوچو کہ ہم کراچی کس طرح اس گھر تک پہنچے ہیں" — میجر نے کہا — "ہم اسلام آباد سے آ رہے ہیں۔ ہم بڑی پکی مخبری اور رہنمائی سے یہاں آئے ہیں۔ تم اگر جھوٹ بولنا چاہتے ہو تو ہم تمہیں روکیں گے نہیں لیکن جب ہم سچ اُگلوانے پر آئیں گے تو تم ہمیں نہیں روک سکو گے لیکن اب تمہارا جھوٹ تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکے گا کیونکہ جگ موہن نے سب پردے اٹھا دیئے ہیں"۔

"لیکن صاحب!" — نوکر نے کہا — "میں نے آپ کو بتا دیا ہے کہ میں اس گھر کا نوکر ہوں اور میں جانتا ہوں کہ جگ موہن انڈیا کا جاسوس ہے۔ اس سے زیادہ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میرا یہاں کے کسی آدمی کے ساتھ کبھی رابطہ نہیں ہوا!"۔

"میں تمہیں ایک خاص بات کہنا چاہتا ہوں" — میجر نے دوستانہ لہجے میں کہا — "لیکن میں تم سے یہ امید رکھوں گا کہ یہ بات کسی کو بتاؤ گے نہیں مجھے تمہاری ذات کے ساتھ اور جگ موہن کے ساتھ بھی ذاتی دلچسپی ہے۔ میری پیدائش تو پاکستان کی ہے لیکن میرا آبائی وطن، آگرہ ہے۔ میرا خاندان اِدھر آ گیا تھا لیکن کئی ایک قریبی رشتہ

دار ابھی تک آگرہ میں ہیں اور بڑے فخر سے بھارتی یا ہندوستانی کہلاتے ہیں۔ معلوم نہیں کیا بات ہے کہ مجھے ہندوستان زیادہ اچھا لگتا ہے۔ ہو سکتا ہے کبھی وہاں جاؤں تو واپس ہی نہ آؤں۔ میں جانتا ہوں اس رِنگ میں تمہارا رول کوئی زیادہ اہم نہیں۔ میں تمہیں یہاں سے نکلوا سکتا ہوں۔ شرط یہ ہے کہ تم ویسے ہی کرنا جیسا میں بتاؤں گا۔ اگر کسی کو پتہ چل گیا کہ میں تمہاری درپردہ مدد کر رہا ہوں تو تم باقی عمر پاکستان کی کسی جیل میں پڑے رہو گے اور میری سروس ختم ہو جائے گی"۔

یہ میجر آئی ایس آئی کا تربیت یافتہ تھا اور زبان کا جادو چلانے کی مہارت رکھتا تھا۔ اس نے بڑی لمبی بات شروع کر دی تھی اور اس کے ساتھ وہ اس نوکر کے چہرے کے تاثرات پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ اس نوکر کو بھی بولنے کا موقع دے رہا تھا جس سے اسے اندازہ ہوتا جا رہا تھا کہ یہ شخص کتنے پانی میں ہے اور اس کی ذہانت کا معیار کیا ہے۔

آخر میجر نے یہ رائے قائم کی کہ یہ شخص جگ موہن کے رِنگ کا صرف ممبر ہے اور اس کا کام نوکروں اور خانساموں کی طرح اس گھر تک ہی محدود ہے۔ تجربہ کار جاسوس وفاداری کی، شکست خوردگی کی اور مظلومیت کی ایسی ایکٹنگ کر سکتے ہیں کہ اوسط درجہ ذہن کے آدمی کو متاثر کر لیتے ہیں۔ تفتیش کرنے والا افسر تجربہ کار اور گہری نظر رکھنے والا ہو تو وہ فوراً سمجھ لیتا ہے۔ کہ یہ شخص ایکٹنگ کر رہا ہے۔ میجر کو ایسا شک نہ ہُوا۔

میجر اس انتظار میں تھا کہ کسی کا فون آ جائے جو کسی بھی وقت آ سکتا تھا اس لئے اس نے نوکر کو فون کے متعلق ایک بات بتانا ضروری سمجھا جو جلدی بتا دینے والی تھی۔

"ایک ضروری بات سن لو" — میجر نے اسے کہا — "اگر کسی کا فون آ جائے تو اسے بتانا کہ جگ موہن باہر نکل گیا ہے اور کوئی پیغام ہو تو وہ دے دے۔ بات پوری سننا اور پوچھنا کہ وہ کون ہے اور کہاں سے بول رہا ہے"۔

میجر کو معلوم تھا کہ جاسوس ٹیلی فون پر راز کی کوئی بات نہیں کیا کرتے۔ اگر کوئی ایسی بات کسی مجبوری کے تحت ٹیلی فون پر کرنی ہی پڑے تو وہ خفیہ الفاظ میں کرتے ہیں اور انتہائی مختصر بات ہوتی ہے، پھر بھی میجر یہ امید لگائے ہوئے تھا کہ ہو سکتا ہے کوئی خاص بات معلوم ہو جائے۔ بظاہر یہ ممکن نہیں تھا۔

میجر کو خیال آیا کہ ٹیلی فون تو ٹیپ ہو جائے گا لیکن اس ٹیلی فون پر کسی نہ کسی کو موجود رہنا چاہئے۔ جب بات ہی نہیں ہو گی تو ٹیپ کیا ہو گا؟ اس نے ضروری سمجھا کہ کرنل سے کہہ دے کہ وہ ٹیلی فون ٹیپ کرانے کا انتظام کر دے۔ میجر نوکر کو ساتھ لے کر باہر نکلا اور اسے اپنے دونوں محافظوں کے ساتھ بٹھا دیا۔ کمرے میں واپس آ کر اس نے کرنل کو فون کیا اور اسے یہ فون نمبر بتا کر کہا کہ اسے ٹیپ کروا دیں۔ اس نے کرنل سے یہ بھی کہا کہ وہ کچھ دیر اور اس فون پر بیٹھے گا اور اگر فون آ گیا تو یہ نوکر سنے گا لیکن ٹیپ کا انتظام فوراً ہو جانا چاہئے۔

کرنل نے اُسی وقت یہ انتظام کر دیا۔ یہ آئی ایس آئی کا معاملہ تھا اس لئے ٹیلی فون ایکسچینج نے بڑی تیزی سے کارروائی مکمل کر دی۔

میجر نے باہر جا کر نوکر کو ساتھ لیا اور پھر اسے کمرے میں لے آیا۔ نوکر اس کے ساتھ بے تکلف ہو چکا تھا۔ میجر نے ایک بار پھر اس کی برین واشنگ شروع کر دی۔

کوئی آدھا گھنٹہ گزرا ہو گا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ نوکر نے میجر کی طرف دیکھا۔

"جیسے میں نے کہا تھا اسی طرح بات کرنا اور سننا" — میجر نے کہا — "میں انٹیلی جنس کا پرانا تجربہ کار افسر ہوں، تمہارے خفیہ اشارے سمجھتا ہوں۔ تم نے دھوکہ دینے کی جرأت کی تو میں گولی مار دوں گا .... چلو، اٹھاؤ ریسیور!"

نوکر نے ہیلو کہا اور پھر اپنا نام بتایا پھر اس نے کہا — "وہ تو ایک گھنٹہ ہُوا باہر نکل گئے تھے، شاید گھنٹے ڈیڑھ تک واپس آ جائیں۔ لیکن یہ بھی کہہ گئے تھے کہ زیادہ دیر بھی لگ سکتی ہے .... نہیں جی .... کوئی نہیں آیا .... کیا نام بتایا؟ .... میجر عثمان؟" .... نوکر کچھ وقت بات سنتا رہا پھر بولا — "بتا دوں گا جی! .... ایسے ہی بتاؤں گا .... ہاں جی، نام یاد رکھوں گا .... میجر عثمان!" — نوکر نے ریسیور رکھ دیا۔

میجر عثمان کا نام سن کر آئی ایس آئی کا یہ میجر چونک اٹھا تھا۔ اس نے نوکر سے پوچھا کہ کون تھا اور اس نے کیا کہا تھا۔

"یہ نہیں بتایا کون بول رہا تھا" — نوکر نے کہا — "یہ بتایا تھا کہ وہ لاہور سے بول رہا ہے۔ پہلے اس نے جگ موہن کے متعلق پوچھا پھر اس نے پوچھا کہ اسلام آباد اور لاہور سے کوئی مہمان آئے ہیں؟ میں نے کہا کہ ابھی تک تو کوئی نہیں آیا۔ میں نے کہا کہ پیغام دے دیں۔ اس نے کہا کہ تمہارے ہاں مہمان آنے والے ہیں جن کی اطلاع

دو تین روز پہلے دی تھی' ان کے ساتھ ہمارا ایک بہت ہی قریبی عزیز میجر عثمان بھی ہو گا۔ گھبرانا نہیں' میجر عثمان سارا معاملہ سنبھال لے گا۔ پھر اس نے کہا کہ یہ وہی میجر عثمان ہے جس کی اطلاع پر لاہور والی کوٹھی اور کراچی والی کوٹھی خالی کرائی گئی تھی۔ اب ادھر سے کوئی فون نہیں ہوگا۔ جگ موہن سے کہنا کہ ایسا کوئی خطرہ تو نہیں لیکن خطرہ آ بھی جائے تو قدم مضبوط رکھنا"۔

اس میجر کے ذہن میں میجر عثمان کا نام یوں آنے لگا جیسے اس کی کھوپڑی پر کوئی ہتھوڑی کی ضربیں لگا رہا ہو۔ اسے معلوم تھا کہ میجر عثمان اپنی بیوی کے ساتھ سندھ میں سے گزرتے اغوا ہو گیا تھا اور ایک لڑکی نے اسے رہائی دلائی تھی۔ میجر عثمان نے یہ ساری کہانی آئی ایس آئی کے بریگیڈیئر اور پھر میجر جنرل کو سنائی تھی۔ اسی کی نشاندہی پر لاہور والی کوٹھی جس کے باہر ایم۔ اے خان کا بورڈ لگا ہُوا تھا اور کراچی کی کوٹھی پر چھاپہ مارا گیا تھا لیکن دونوں کوٹھیاں خالی ہو چکی تھیں۔

میجر نے اُسی وقت نوکر کو ساتھ لیا اور جگ موہن کے اس گھر کو مقفل کر کے جیپ میں بیٹھا اور واپس چل پڑا۔

انٹیروگیشن سنٹر میں پہنچ کر میجر نے نوکر کو سیل میں بند کروا دیا اور اپنے کرنل کے پاس جا بیٹھا۔ اسے بتایا کہ فون آیا تھا اور نوکر نے کیا بتایا ہے۔

"کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ ٹیلی فون ایکسچینج میں جا کر ٹیپ سن لیں؟" — کرنل نے کہا — "میجر عثمان کو اس کا اشارہ تک نہ ملے"۔

کرنل اٹھ کھڑا ہُوا اور میجر کو ساتھ لے کر باہر نکل گیا۔ دونوں جیپ میں بیٹھے اور ٹیلی فون ایکسچینج میں جا پہنچے۔ اپنا تعارف کرایا اور ٹیپ طلب کی۔

ٹیپ فوراً مہیا کی گئی۔ سننے کا انتظام کرنل کے پاس تھا۔ ٹیپ سنی تو جو ذرا سا شک و شبہ باقی تھا وہ بھی نہ رہا۔ جگ موہن کے نوکر نے میجر کو ساری بات بتا دی تھی لیکن ٹیپ سنی تو ایک آدھ مزید بات معلوم ہو گئی۔ کرنل اور میجر نے فون پر بولنے والے کے صرف الفاظ ہی نہ سنے بلکہ نوٹ یہ کیا کہ وہ کس انداز سے بول رہا ہے۔ یہ رازداری والا انداز تھا یا جیسا بھی تھا' اس انداز کو آئی ایس آئی والے بہتر سمجھتے ہیں۔

اگر میجر عثمان کا نام اچانک اور کسی بیک گراؤنڈ کے بغیر یوں سامنے آتا تو شاید کرنل اور میجر اس طرف توجہ ہی نہ دیتے اور یہ سوچنے کی بھی ضرورت محسوس نہ

کرتے کہ یہ میجر عثمان اپنا ہی عثمان ہے۔ سندھ میں سے گزرتے اس کا' بیوی کا اور بچوں اغوا کوئی ایسا واقعہ نہیں تھا جسے کوئی دو چار دن سن سنا کر بھول جاتا' یہ واقعہ تو ساری پاک فوج میں پھیل گیا تھا۔ فوجی افسروں کا ردِ عمل یہ تھا کہ ان کے دلوں میں سندھیوں کی نفرت بڑھ گئی تھی اور وہ ہندوؤں کو پہلے سے زیادہ قابلِ نفرت دشمن سمجھنے لگے تھے۔ نوجوان لیفٹیننٹ اور کیپٹن تو انتقام کی باتیں کرتے تھے۔

یہ آئی ایس آئی کا کیس تھا جو اس کرنل اور میجر کو نہایت باریک تفصیلات کے ساتھ یاد تھا۔ یہ دونوں واپس انٹیروگیشن سنٹر میں آئے اور الگ بیٹھ کر اس موضوع پر تبادلۂ خیالات کرنے لگے۔ اُس وقت میجر عثمان کسی اور کمرے میں تھا۔ وہ آئی ایس آئی کا افسر نہیں تھا اس لئے اسے ہر بات میں شامل نہیں کیا جاتا تھا۔ اسے صرف متعلقہ مکانوں کی نشاندہی کے لئے یا کوئی اور بات معلوم کرنے کے لئے ساتھ لایا گیا تھا۔

"میجر امتیاز کی رائے صحیح معلوم ہوتی ہے" — کرنل نے کہا — "سب سے پہلے میجر امتیاز نے میجر عثمان سے اغوا کی پوری کہانی سنی اور پھر آئی ایس کو سنائی تھی۔ اس نے اپنی رائے یہ دی تھی کہ یہ معاملہ کچھ مشکوک نظر آتا ہے"۔

"اب تو کوئی شک نہیں رہا سر!" — میجر نے کہا — "میری رائے یہ ہے کہ میجر عثمان اپنے آپ پر پردہ ڈالنے کے لئے آئی ایس آئی کی توجہ اس لڑکی کی طرف کر رہا ہے جس نے اسے رہائی دلائی تھی اور کہتا ہے کہ اس کے ساتھ اس کی فرینڈ شپ تھی"۔

"میجر عثمان عیاش آدمی ہے" — کرنل نے کہا — "امیر خاندان کا بیٹا ہے اور فوج میں صرف آفیسر بنا ہُوا ہے۔ میں تو یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ اس میں قومی جذبہ ہے ہی نہیں نہ ہی اس میں قومی کردار ہے۔ سوچنے والی بات یہ ہے کہ میجر عثمان اپنی بیوی بچوں کے ساتھ اغوا ہُوا اور اُدھر لڑکی اتنی دور اندر سندھ میں جا پہنچی جو ڈاکوؤں اور راہزنوں کا علاقہ تھا۔ اب سوچنا یہ ہے کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے"۔

"جو حکم آپ دیتے ہیں سر!" — میجر نے کہا — "راولپنڈی واپس چلتے ہیں اور جنرل صاحب کو یہ رپورٹ پیش کر دیں گے"۔

"میں کچھ اور سوچ رہا ہوں" — کرنل نے کہا — "دو آفیسر.... میجر سمیع اور کیپٹن آصف .... میجر عثمان کے گہرے دوست ہیں۔ میرے ساتھ ان کی دو ملاقاتیں ہوئی

تھیں لیکن ان کے متعلق میجر امتیاز زیادہ انفارمیشن دے سکتا ہے۔ یہ دونوں میجر عثمان کے بڑے گہرے دوست ہیں اور ان میں صحیح پاکستانی جذبہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ پہلے لاہور ہی چلتے ہیں اور ان دونوں آفیسروں کے ساتھ کچھ باتیں کریں گے اور ان کی سنیں گے"۔

یہ کرنل اور میجر اپنے طور پر کوئی فیصلہ کرنے کی اتھارٹی نہیں رکھتے تھے۔ یہ بڑی اہم اور نازک بات تھی جو انہیں آئی ایس آئی کے بالائی افسروں تک پہنچانی تھی۔ انڈین انٹیلی جنس کے کسی رِنگ میں پاک آرمی کے کسی افسر کا نام آنا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔

کرنل نے جگ موہن اور اس کے دونوں نوکروں کو ہتھکڑیاں لگا کر راولپنڈی پہنچانے کے انتظامات کر دیئے۔ اسے خود راولپنڈی تک ساتھ جانا تھا لیکن میجر کو ساتھ بھیجا اور خود میجر عثمان کو ساتھ لئے لاہور کے لئے روانہ ہو گیا۔ اس کے ذہن میں ایک بڑی ضروری کارروائی آ گئی تھی۔

لاہور پہنچ کر اس نے میجر عثمان کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے بڑی ہی کار آمد رہنمائی اور نشاندہی کی ہے جس سے آئی ایس آئی کو کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ کرنل نے میجر عثمان کو فارغ کر دیا اور کہا کہ جب بھی اس کی ضرورت پڑی اسے بلا لیا جائے گا۔

○

میجر عثمان چہرے پر اور اپنے انداز میں فاتحانہ تاثر پیدا کئے اپنے گھر میں داخل ہُوا۔ اس کی بیوی وینا نے اسے دیکھا تو اس طرح اس تک آئی جیسے وہ لوہے کی کمزور سی پتری تھی اور عثمان بڑا ہی طاقتور مقناطیس تھا۔ وینا جذبات اور مسرّت کے جوش سے عثمان سے چپک کے رہ گئی۔ پھر عثمان نے اپنے دونوں بچوں سے اس طرح والہانہ پیار کیا جیسے برسوں کی جدائی کے بعد اسے بچے ملے ہوں۔

وینا کو بتانے والا کوئی نہ تھا کہ عثمان اسے اور بچوں کو دیکھ کر خوش نہیں ہُوا بلکہ اس کی اصل خوشی یہ ہے کہ وہ اپنے رِنگ کے تمام افراد کو بچانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس کی اطلاع پر لاہور والی کوٹھی اور کراچی والی کوٹھی بروقت خالی ہو گئی تھی۔ جگ موہن اور اس کے نوکروں کا اسے کوئی غم نہ تھا۔ ان کے ساتھ عثمان کی راہ و رسم بھی نہیں تھی۔

عثمان کی اصل فتح تو یہ تھی کہ اس نے اپنے خلاف ذرا سا بھی شک پیدا نہیں ہونے دیا تھا۔ کرنل اور میجر نے بھی تو اسے ذرا سا بھی شک نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ دونوں اسے مشتبہ سمجھ رہے ہیں۔ وہ خوش تھا کہ اس نے اس کرنل اور میجر کو ہی نہیں بلکہ پوری آئی ایس آئی کو بے وقوف بنا لیا ہے۔

میجر عثمان گریجویٹ تھا۔ اس محاورے سے کہ اللہ کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے اچھی طرح واقف تھا بلکہ اتنا زیادہ واقف تھا کہ اس محاورے کو وہ محض بے معنی سمجھتا تھا۔ اس نے اللہ کی لاٹھی کبھی چلتی نہیں دیکھی تھی' یا اُن گناہگاروں کو نہیں دیکھا تھا جن پر یہ لاٹھی چلی تھی۔

عثمان کو غالباً یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ کچھ عرصے کے لئے کچھ لوگوں کو بے وقوف بنایا جا سکتا ہے لیکن تمام لوگوں کو تمام عمر کے لئے بے وقوف بنانے میں کبھی کوئی کامیاب نہیں ہُوا۔ جھوٹ' دھوکہ دہی اور فریب کاری ہر معاشرے میں چلتی ہے لیکن کچھ عرصے کے لئے۔ اس کے بعد قدرت کا ردِ عمل شروع ہوتا ہے۔ فریب کار آدمی اپنی فریب کاریاں جاری رکھتا ہے لیکن وہ نہیں سمجھتا کہ اب وہ اللہ کے بندوں کو نہیں بلکہ اللہ کو فریب دے رہا ہے اور اللہ ایسے لوگوں کو بخشا نہیں کرتا۔۔۔ اللہ صرف ڈھیل دیتا ہے اور پھر اس کی ذاتِ باری پکڑنے پر آتی ہے تو یہ پکڑ بڑی ہی سخت ہوتی ہے۔

میجر عثمان اب اللہ کے بنائے ہوئے قانون کی گرفت میں آ گیا تھا۔

"کیا وہ پکڑی گئی ہے؟" ۔۔۔ وینا نے عثمان سے لوسی کے متعلق پوچھا۔

"وہ تو نہیں پکڑی جا سکی" ۔۔۔ عثمان نے جواب دیا ۔۔۔ "اس کے رِنگ کے تین آدمی پکڑے گئے ہیں۔ چند دنوں تک وہ بھی گرفتار ہو جائے گی"۔

وینا اُسی خوشی کی منتظر تھی کہ لوسی گرفتار کر لی گئی ہے۔ عثمان اسے کراچی کی کارکردگی سنا رہا تھا۔ اُس وقت کرنل ٹیلی فون ایکسچینج میں عثمان کے گھر کا فون ٹیپ کرانے کا انتظام کر رہا تھا۔ یہ انتظام کر کے کرنل آئی ایس آئی کے لاہور کے آفس میں چلا گیا اور میجر امتیاز سے ملا۔

"میجر عثمان کا پردہ اٹھ گیا ہے" ۔۔۔ کرنل نے کہا ۔۔۔ "تمہاری رائے صحیح معلوم ہوتی ہے۔ تم نے اس کے اغوا کی رپورٹ پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ تمہیں یہ سارا معاملہ مشکوک نظر آتا ہے لیکن معلوم نہیں بریگیڈیئر صاحب کیوں مان گئے تھے کہ میجر

عثمان کا بیان بالکل صحیح ہے"۔

کرنل نے میجر امتیاز کو ساری بات سنائی کہ میجر عثمان کا نام کس طرح سامنے آیا ہے۔ کرنل نے میجر امتیاز کو یہ بھی بتایا کہ عثمان کے فون کو ٹیپ کرنے کا انتظام کر دیا گیا ہے۔ اب یہ ٹیپ وقتاً فوقتاً سنتے رہنا میجر امتیاز کی ڈیوٹی تھی۔

"ایک بات اور ذہن میں آتی ہے امتیاز!" — کرنل نے پوچھا — "میجر عثمان کے یہ دوست میجر سمیع اور کیپٹن آصف کیسے آدمی ہیں؟ کیا ان سے کوئی تعاون یا مزید بات مل سکتی ہے؟"

"سو فی صد قابلِ اعتماد ہیں سر!" — میجر امتیاز نے جواب دیا — "اگر آپ چاہیں تو میں ان دونوں کو یہاں بلوا سکتا ہوں"۔

"ابھی نہیں!" — کرنل نے کہا — "پہلے میں چیف کو یہ ساری رپورٹ دے دوں پھر تمہیں بتائیں گے کہ ہماری ضرورت کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ابھی تم میجر سمیع اور کیپٹن آصف کو نہ بتانا کہ میجر عثمان کے متعلق کیا انکشاف ہُوا ہے۔ یہ ضرور کرنا کہ ان دونوں کو ذہنی طور پر تیار کر دینا کہ ایسی صورت پیدا ہو جائے تو کیا وہ تعاون کریں گے!"

"یس سر!" — میجر امتیاز نے کہا — "یہ دونوں میرے دوست ہیں۔ میں میجر عثمان سے بھی مل چکا ہوں۔ سمیع اور آصف مجھے ایسی باتیں بتا چکے ہیں جو میجر عثمان کے خلاف شک پیدا کرتی ہیں..... بہرحال آپ جیسا چاہیں گے ویسا ہی ہو گا"۔

کرنل اسی روز راولپنڈی چلا گیا۔



ایک وہ تھے جو پاکستان اور اسلام کے نام پر قربان ہوئے جا رہے تھے۔ ان میں ایک ڈاکٹر رشید تھا جسے انبالہ سے دِلّی لے گئے اور ایک مینٹل ہاسپٹل کے ایک سیل میں بند کر دیا گیا تھا۔ اس کی ذہنی حالت بگڑی تھی، سنبھلی نہیں تھی، ایک نوجوان ڈاکٹر نے جس کا نام راجیو تھا، ڈاکٹر رشید کو ڈاکٹر سمجھ کر علاج کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ ابھی نو آموز تھا۔

ڈاکٹر راجیو نے دوسرے ڈاکٹروں کے ساتھ یوں بات کی اور یہ بات کرتا ہی رہتا تھا، کہ یہ ڈاکٹر ہے اور ہمارا فرض ہے کہ اسے صحت یاب کریں لیکن ایک روز اسے ایک پرانے ڈاکٹر نے کہا کہ وہ اس مریض میں اتنی دلچسپی نہ لے اور وہ جیسا ہے ویسا ہی

رہنے دے۔ ڈاکٹر راجیو کو یہ بات اچھی نہ لگی۔ اس نے وجہ پوچھی۔

"کیا ہم نے پہلے تمہیں بتایا نہیں تھا کہ یہ مسلمان ہے؟" — پرانے ڈاکٹر نے غصیلی آواز میں کہا — "اسے نظر انداز کرنے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ ایک گورنمنٹ ہاسپٹل میں باقاعدہ ملازم تھا۔ کسی کو پتہ نہ چل سکا کہ یہ پاکستان کا جاسوس ہے۔ اس نے ایک ایسے پاکستانی کو ہسپتال سے فرار کرا دیا تھا جو جاسوس تھا اور اسے ہماری انٹیلی جنس زخمی حالت میں ہسپتال میں لائی تھی۔ پتہ چل گیا کہ یہ فرار اس نے کروایا ہے تو اسے پکڑا گیا لیکن یہ اپنے گروہ کے کسی اور آدمی کی نشاندہی نہیں کرتا تھا۔ اسے ٹارچر کیا گیا، ٹرانکولائزر بھی دیئے گئے لیکن اس کی زبان سے کچھ اور اگلوایا نہ جا سکا حتیٰ کہ یہ دماغی توازن کھو بیٹھا۔ یہ اب ٹھیک نہیں ہو سکتا نہ اسے ٹھیک کرنے کی کوشش کرنی ہے۔ ایک دو دنوں بعد اسے آگرہ پاگل خانے میں بھیجا جا رہا ہے"۔

"آپ کا حکم ماننا میرا فرض ہے" — ڈاکٹر راجیو نے کہا — "میں تنخواہ کی خاطر نہیں بلکہ تجربہ حاصل کرنے کے لئے نوکری کر رہا ہوں۔ میں آپ کا ماتحت ہوں۔ آپ کی حکم عدولی کی جرأت نہیں کروں گا لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ جو بات آپ نے کی ہے یہ ہمارے مقدس پیشے کی توہین ہے۔ ڈاکٹری کسی کا مذہب اور ملک نہیں دیکھا کرتی۔ اگر یہ ہمارے ملک کے دشمن کا جاسوس ہے تو کسی ڈاکٹر کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اسے سزا دے۔ ہماری انٹیلی جنس اسے عدالت میں پیش کر کے سزا دلائے"۔

"سن بالکے!" — پرانے ڈاکٹر نے کہا — "تین چیزیں ایسی ہیں جن کو تباہ کرنے کے لئے اپنے تمام اصول اور اپنے پیشے کی عظمت کو الگ پھینک دو..... اسلام، پاکستان اور مسلمان..... ہم پاکستان کو آدھا کر چکے ہیں باقی آدھے کو ختم کرنا ہے۔ میں اپنے باپ کے قاتل کو معاف کر سکتا ہوں، پاکستان کے جاسوس کو کسی قیمت پر معاف نہیں کروں گا"۔

ڈاکٹر راجیو نے سر جھکا لیا اور چلا گیا۔

انبالہ میں انڈین انٹیلی جنس نے ڈاکٹر رشید کے محلے میں مخبر چھوڑ رکھے تھے۔ ساڑھے تین چار مہینے گزر چکے تھے اور اس محلے میں کوئی خفیہ یا ظاہری قابلِ اعتراض سرگرمی نظر نہیں آئی تھی نہ کسی مشکوک اور اجنبی شخص کو محلے میں یا ڈاکٹر رشید کے گھر میں آتا دیکھا گیا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس محلے میں دم خم رہا ہی نہ ہو۔

حالات اور لوگوں کے معمولات نارمل حالت میں آ گئے تھے۔ انڈین انٹیلی جنس مطمئن ہو گئی تھی۔ یہ خالصتاً مسلمانوں کا محلہ تھا۔ آخر وہاں سے مخبر ہٹا دیئے گئے۔

اگر اس محلے میں کوئی سرگرمی تھی بھی تو وہ بند دروازوں کے پیچھے بڑی دھیمی آوازوں میں ہوتی تھی۔ ڈاکٹر رشید کے چار پانچ دوست تھے جنہوں نے صغیر کے فرار میں ڈاکٹر رشید کا ساتھ دیا تھا۔ یہ سب اکثر افسوس کا اظہار کرتے تھے کہ صغیر انہیں بتائے بغیر نکل گیا تھا۔ یہ سب صغیر کی نیّت اور عظمت کے معترف تھے۔ اسے جس گھر میں چھپا کر رکھا گیا تھا' وہاں اس نے کہہ دیا تھا کہ وہ اپنی جان قربان کر دے گا لیکن یہ برداشت نہیں کرے گا کہ یہاں کے کسی مسلمان کو اس کی خاطر سزا ملے یا کوئی اور مصیبت اس پر آن پڑے۔

پھر ڈاکٹر رشید کو انٹیلی جنس والوں نے گرفتار کر لیا۔ اس کے گھر میں صفِ ماتم بچھ گئی اور اس کی ماں' بہن اور اس کی منگیتر صبح و شام اس کی سلامتی کی دعائیں مانگنے لگیں اور یہ دعائیں ابھی تک جاری تھیں۔ رشید کی ماں ہر رات عشاء کی نماز کے بعد نفل پڑھتی اور خدا کے آگے جھولی پھیلا کر ہم کلام ہوتی تھی۔

"یا اللہ!" — ماں کی فریاد ہر رات تقریباً یہی ہوتی تھی — "میرے بیٹے نے کوئی گناہ تو نہیں کیا تھا۔ اس نے اسلام کے نام پر' تیرے قرآن کی سرزمین پاکستان کی آبرو کی خاطر ایک مسلمان کو کفّار کے چنگل سے چھڑایا ہے۔ یہ کوئی گناہ تو نہیں یا رب العالمین! اگر اس نے کوئی گناہ کیا ہے تو اس کی سزا مجھے دے دے' میرے گناہوں کی سزا اسے نہ دے۔ یا غفور الرحیم میرا لختِ جگر مجھے لوٹا دے"۔

ایسی ہی دعائیں ہر رات رشید کی بہنیں کرتی تھیں' یہ دعائیں نہیں فریادیں تھیں اور یہ ماں اور یہ بہنیں کبھی حیران بھی ہُوا کرتی تھیں کہ ان کی آہ و فریاد عرش تک کیوں نہیں پہنچتی۔

ڈاکٹر رشید کے دوستوں کی ایک سرگرمی تھی جسے انڈین انٹیلی جنس والے نہیں پکڑ سکتے تھے۔ وہ ہر روز نہیں تو جب کبھی اکٹھے بیٹھتے تو اس مسئلے پر غور کرتے تھے کہ پتہ کس طرح چلایا جائے کہ ڈاکٹر رشید کو کہاں لے گئے ہیں۔ یہ سراغ مل جائے تو اسے فرار کرانے کی سکیم بنائی جائے۔ انہوں نے ڈاکٹر رشید کو انٹیلی جنس کے چنگل سے چھڑانے کا عہد کر رکھا تھا۔ انہوں نے ہر ممکن کوشش کر ڈالی تھی لیکن پتہ نہیں چل سکا تھا کہ وہ ہے کہاں۔

اسے دِلّی لے گئے اور مینٹل ہاسپٹل میں خطرناک پاگل کی حیثیت سے سلاخوں کے پیچھے بند کر دیا تو بھی اس کے دوستوں کو پتہ نہ چل سکا۔ وہ ڈاکٹر رشید کو بھولے نہیں تھے اور جب کبھی مل بیٹھتے تو اس عہد کی تجدید کرتے اور اپنے جوش و خروش کو تر و تازہ کر کے اٹھتے تھے۔



ایک روز ایک جوان سال آدمی ڈاکٹر رشید کے محلے میں داخل ہُوا۔ لباس اور وضع قطع سے وہ کوئی معزّز اور صاحب حیثیت آدمی لگتا تھا۔ عمر تیس برس سے ایک دو سال زیادہ ہو گی۔ اس محلّے میں وہ اجنبی تھا۔ محلّے کا ایک آدمی اس کے قریب سے گزرا تو اس نے محلے کے اس آدمی کو روک لیا۔

"معافی چاہتا ہوں' آپ کو روک لیا ہے" — اجنبی نے اس سے پوچھا — "کیا ڈاکٹر عبدالرشید صاحب اسی محلے میں رہتے ہیں؟"

"جی ہاں!" — محلے کے اس آدمی نے جواب دیا — "کیا میں آپ کو ان کے گھر تک پہنچا دوں؟"

اجنبی کچھ سوچنے لگا۔ پھر اس نے محلے کے آدمی کی طرف دیکھا اور سر جھکا لیا۔ محلے کے آدمی نے اس سے پوچھا کہ وہ ڈاکٹر رشید سے ملنا چاہتا ہے یا اس کے گھر جانے کا خیال ہے!

"ملنا تو ڈاکٹر رشید صاحب سے تھا" — اجنبی نے کچھ اور ہی انداز سے کہا پھر کچھ سوچ کر پوچھا — "کیا ڈاکٹر صاحب خیریت سے ہیں؟.... کیا وہ اسی ہسپتال میں ہیں؟"

"محترم!" — محلے کے آدمی نے کہا — "آپ سوچ کیا رہے ہیں؟ آپ نے مجھ سے رہنمائی چاہی ہے تو میں فرض سمجھتا ہوں کہ آپ کی پوری رہنمائی کروں لیکن آپ تو سوچوں میں کھوئے ہوئے ہیں.... کیا آپ کا کوئی عزیز بیمار تو نہیں!"

"میں آپ کو بات بتا ہی دوں تو اچھا ہے" — اجنبی نے کہا — "کچھ لوگوں میں ایسی مشابہت ہوتی ہے کہ ان کی شناخت میں غلطی ہو جاتی ہے۔ میں آگرہ کے پاگل خانے میں ملازم ہوں۔ رہنے والا انبالہ کا ہی ہوں لیکن میرا گھر یہاں سے کچھ دور ہے۔ کوئی ایک ہفتہ ہوا آگرہ کے پاگل خانے میں ایک آدمی کو داخل کیا گیا۔ اتفاق سے میں نے

اسے دیکھا۔ دیکھ کر میں چونکا۔ اس کی شکل و صورت ڈاکٹر عبدالرشید صاحب جیسی ہے۔ میں یہاں کم و بیش ایک مہینہ ڈاکٹر صاحب کا مریض رہ چکا ہوں۔ بہت نیک آدمی ہیں۔ جس آدمی کو آگرہ کے پاگل خانے میں داخل کرایا گیا ہے' میں نے اس کے کاغذات دیکھے تو نام عبدالرشید لکھا تھا.... ہاں' یہ تو بتائیے کہ ڈاکٹر صاحب کے والد صاحب کا نام کیا ہے؟"

محلے کے آدمی نے ڈاکٹر رشید کے باپ کا نام بتایا۔

"ہاں' یہی نام لکھا تھا" — اجنبی نے کہا — "ولدیت یہی ہے۔ اگر آپ اسی محلے کے رہنے والے ہیں تو آپ کو یقیناً معلوم ہو گا کہ ڈاکٹر صاحب کسی ذہنی مرض میں مبتلا ہو گئے تھے"۔

"انہیں وہاں داخل کس نے کروایا ہے؟" — محلے کے آدمی نے پوچھا — "پہلے آپ یہ بتائیں پھر میں آپ کو کچھ بتاؤں گا"۔

"انہیں سرکاری طور پر وہاں داخل کروایا گیا ہے" — اجنبی نے کہا — "وہ یقیناً یہی ڈاکٹر رشید صاحب ہیں۔ میں ذاتی دلچسپی سے یہاں تصدیق کرنے آیا تھا۔ مجھے بہت ہی افسوس ہے کہ اتنا نیک ڈاکٹر پاگل ہو گیا ہے.... آخر وجہ کیا ہوئی؟ کوئی گھریلو مسئلہ تھا یا کوئی اور پریشانی!"

اتفاق سے محلے کا یہ آدمی ڈاکٹر رشید کے ان دوستوں میں سے تھا جنہوں نے صغیر کو ہسپتال سے فرار کروایا تھا۔ اس نے اس اجنبی سے کہا کہ وہ اسے ڈاکٹر رشید کی مزید باتیں بتائے۔ اس نے اجنبی سے یہ بھی پوچھا کہ وہ کیا ڈاکٹر رشید کے گھر جانا چاہتا ہے؟ اس نے کہا کہ وہ صرف ڈاکٹر رشید کو جانتا ہے' اس کے گھر جانے کی چنداں ضرورت نہیں۔

"پھر آپ میرے گھر چلیں" — ڈاکٹر رشید کے اس دوست نے اجنبی سے کہا۔

اجنبی اس کے ساتھ چل پڑا اور دونوں نے گھر بیٹھ کر ڈاکٹر رشید کے متعلق باتیں شروع کر دیں۔ ڈاکٹر رشید کا یہ دوست بہت محتاط ہو کر بات کرتا تھا۔ یہ اجنبی انڈین انٹیلی جنس کا آدمی ہو سکتا تھا لیکن کچھ دیر بعد اس کا یہ شک رفع ہو گیا۔ اس نے اجنبی سے کہا کہ ڈاکٹر رشید کے گھر والوں کو یہ خبر نہیں ملنی چاہئے کہ وہ آگرہ پاگل خانے میں ہے ورنہ اس کی ماں یا باپ کا یا دونوں کا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔

"آخر یہ معاملہ کیا ہے؟" — اجنبی نے پوچھا۔

ڈاکٹر رشید کے اس دوست نے سارا واقعہ سنا ڈالا کہ اس نے کس طرح ایک پاکستانی کو ہسپتال سے فرار کرایا تھا اور انٹیلی جنس نے اسے پکڑ لیا۔

"ڈاکٹر رشید ایک اچھا اور نیک ڈاکٹر ہی نہیں تھا" — دوست نے کہا — "وہ پاکستان کو قرآن کی سرزمین سمجھ کر پاکستان کا شیدائی تھا۔ یوں کہہ لیں کہ وہ مردِ مجاہد یا مردِ مومن تھا۔ انٹیلی جنس نے اس کے گھر کی تلاشی لی تھی اور اس پورے محلے کو بہت پریشان کیا تھا۔

"وہ تو ان ہندوؤں نے کرنا ہی تھا" — اجنبی نے کہا — "ان کفّار کو مسلمانوں کے خلاف ایک بہانہ اور ہلکا سا اشارہ چاہئے۔ میں اب شاید پوری بات سمجھ گیا ہوں۔ انٹیلی جنس والوں نے ڈاکٹر صاحب کو ایسے ٹارچر کا نشانہ بنایا ہو گا کہ ان کا دماغی توازن بگڑ گیا اور انہیں آگرہ کے پاگل خانے میں داخل کرا دیا۔

اس اجنبی کو معلوم نہیں تھا کہ ڈاکٹر رشید کو دِلّی کے ایک مینٹل ہاسپٹل سے آگرہ منتقل کیا گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ لاعلاج ہے اور انٹیلی جنس کے بھی کام کا نہیں رہا اس لئے اسے اس انجام کو پہنچایا کہ آگرہ بھیج دیا۔

"آپ کا ایڈریس کیا ہے؟" — ڈاکٹر رشید کے دوست نے کہا — "میں اپنے ایک دوست کے ساتھ آپ کے ہاں آنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو...."

"زحمت کیسی!" — اجنبی نے کہا — "میں دس دنوں کی چھٹی آیا ہوں' بڑے شوق سے تشریف لائیں' مجھے خوشی ہو گی"۔

اجنبی نے اپنا ایڈریس دیا اور گھر کا راستہ بھی سمجھا دیا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ کل صبح نو بجے کے لگ بھگ آ جائیں۔

اگلے روز ڈاکٹر رشید کا یہ دوست اپنے دو ہمراز دوستوں کے ساتھ اس اجنبی کے گھر چلا گیا۔ اجنبی نے اپنا نام عبدالستار بتایا تھا۔ اس کے متعلق یقین ہو گیا تھا کہ دھوکہ نہیں دے گا۔ تصدیق یوں ہوئی کہ ان کا گھر ڈھونڈتے ہوئے ایک آدمی سے پوچھا کہ عبدالستار کا گھر کونسا ہے۔ تو اس آدمی نے پوچھا کہ وہ عبدالستار صاحب جو آگرہ کے مینٹل ہاسپٹل میں ملازم ہیں؟

ڈاکٹر رشید کے ان دونوں دوستوں نے اپنی اپنی عقل اور سمجھ کے مطابق عبدالستار

سے کچھ باتیں پوچھیں پھر یہ پوچھا کہ وہ کس حیثیت سے ملازم ہے۔ اس نے بتایا تو معلوم ہُوا کہ وہاں اس کی اچھی خاصی حیثیت ہے اور وہ ہسپتال کی انتظامیہ میں افسر ہے۔

"کیا ڈاکٹر رشید کو وہاں سَیل میں بند رکھا جاتا ہے؟" — ایک دوست نے پوچھا۔

"نہیں!" — عبدالستار نے جواب دیا — "میں نے انہیں وہاں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ چونکہ مجھے یقین کی حد تک معلوم ہُوا کہ یہ انبالہ والے ڈاکٹر رشید ہیں تو میں نے بعد میں بھی انہیں دیکھا۔ انہیں سَیل میں نہیں بلکہ بارک میں رکھا گیا ہے اور دن کے وقت وہ بارک سے باہر نکل سکتے ہیں۔ میں اپنا اثر و رسوخ استعمال کر دوں گا کہ انہیں وہاں کچھ سہولتیں مل جائیں اور کسی ڈاکٹر سے کہوں گا کہ وہ ان کا علاج کرے۔ میرے ساتھ انہوں نے جو نیکی کی تھی میں تو اسی کی قیمت نہیں دے سکتا لیکن کل یہ سنا کر انہیں کسی جہاد کی سزا ملی ہے تو میں اس وقت سے سوچ رہا ہوں کہ اس عظیم شخص کے لئے میں کیا کر سکتا ہوں"۔

"یہی ہم سوچتے رہتے ہیں" — ایک دوست بولا — "یہ تو ایک اتفاق ہے کہ ہمیں پتہ چلا ہے کہ ڈاکٹر رشید کہاں ہے۔ چار مہینوں سے اس کا تو سراغ ہی نہیں مل رہا تھا۔ ہم اس کے لئے کچھ کرنا چاہتے ہیں"۔

"آپ وہاں آئیں" — عبدالستار نے کہا — "آپ ان کے لئے جو بھی چیز لائیں گے روکی نہیں جائے گی۔ کچھ اشیاء ممنوع ہوتی ہیں لیکن میری موجودگی میں کوئی چیک نہیں کرے گا"۔

"ہم ڈاکٹر رشید سے صرف ملنا نہیں چاہتے" — ایک دوست اشتیاق نے کہا "ہم کچھ اور کرنا چاہتے ہیں لیکن آپ کے اعتماد کی شدید ضرورت ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وقت پر آپ ڈر جائیں اور الگ ہو کر ہم سب کو پاگل خانے میں بند کروا دیں"۔

"آپ مجھے سمجھے نہیں" — عبدالستار نے کہا — "میں نے پہلے بتایا ہے کہ میں ڈاکٹر رشید صاحب سے کیوں متاثر تھا لیکن ان کا یہ کارنامہ سنا ہے تو میں انہیں اپنا مرشد تسلیم کرتا ہوں۔ آپ اللہ اور اس کے رسولؐ کو درمیان میں رکھ کر بات کریں۔ ہو سکتا ہے وقت پر آپ الگ ہو بیٹھیں اور میں تنہا وہ کر دیکھوں جو آپ تین حضرات کرنا چاہتے ہیں.... بات کریں، مجھے اجنبی اور غیر مسلم نہ سمجھیں"۔

تینوں دوستوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں طے کر لیا کہ بات کر ہی دینی چاہئے۔ ان تین دوستوں میں وہاب عمر میں کچھ زیادہ تھا۔ وہاب ہی عبدالستار کو اپنے محلّے میں ملا تھا۔ وہاب نے بات شروع کی۔

"عبدالستار صاحب!" — وہاب نے کہا — "ڈاکٹر رشید نے ایک زخمی پاکستانی کو اپنی جان اور اپنے خاندان کی عزت و آبرو کو داؤ پر لگا کر اللہ کے نام پر فرار کروایا ہے۔ ہم اپنی جانوں کی بازی لگا کر اللہ کے نام پر ہی ڈاکٹر رشید کو آگرہ کے پاگل خانے سے فرار کرانا چاہتے ہیں.... کوئی جلدی نہیں۔ آپ اگر ہمارا ساتھ دے سکتے ہیں تو جائزہ لے کر ہمیں بتائیں کہ یہ کام کس طرح ہو سکتا ہے یا ہو سکتا بھی ہے یا نہیں"۔

"یہ پلان جلد بازی میں نہیں بنے گا" — تیسرے دوست ظفر نے کہا — "آپ چھٹی گزار کر واپس چلے جائیں۔ ہم آگرہ آ کر آپ سے ملیں گے"۔

"زہے نصیب!" — عبدالستار نے کہا — "اتفاق کی بات ایسی ہے کہ میں اپنی بیوی بچوں کو یہاں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ وہاں اکیلا ہوں گا۔ آپ سب وہاں تشریف لائیں، آپ میرے مہمان ہوں گے اور سارا پلان وہیں بنے گا۔ مجھے امید ہے کہ میں اس جہاد میں ٹھوس اور بڑی ہی کار آمد مدد کر سکوں گا"۔

"کہنے کی ضرورت تو نہیں" — اشتیاق نے کہا — "پھر بھی عرض کئے دیتا ہوں، آپ ڈاکٹر رشید کا خیال رکھیں اور انہیں کم از کم خوراک اچھی دلواتے رہیں۔ سنا ہے پاگل خانوں میں پاگلوں کے ساتھ بہت ہی برا سلوک ہوتا ہے"۔

"آپ نے ٹھیک فرمایا ہے کہ یہ بات کہنے کی ضرورت نہیں" — عبدالستار نے کہا — "آپ نے ٹھیک سنا ہے کہ پاگلوں کو انسان سمجھا ہی نہیں جاتا۔ یہ ذمہ داری میری ہے کہ میں ڈاکٹر رشید صاحب کو انسانیت کی سطح سے نیچے نہیں آنے دوں گا اور ان کی خوراک اور دیگر سہولتوں کا پورا پورا انتظام خود کرواؤں گا"۔

"یہ بھی معلوم کرنا ہے عبدالستار صاحب!" — وہاب نے کہا — "کیا انٹیلی جنس والے ڈاکٹر رشید کو آگرہ کے پاگل خانے میں پھینک کر بھول جائیں گے یا یہ حکم ہے کہ انہیں ذہنی طور پر صحت یاب کر کے پھر انٹیلی جنس کے حوالے کر دیا جائے؟"

"وہ انہیں بے کار چیز سمجھ کر کوڑے کباڑ میں پھینک گئے ہیں" — عبدالستار نے کہا — "رشید صاحب اکیلے ہی نہیں، بے شمار مسلمانوں کو ہندوؤں نے اسی طرح پاگل

بنا کر پاگل خانوں میں پھینک رکھا ہے۔ نہ جانے کتنے مر ہی گئے ہیں پھر بھی میں جا کر ان کے کاغذات دیکھ لوں گا۔ میرا خیال ہے کہ کاغذات ہوں گے ہی نہیں سوائے ڈاکٹر صاحب کے نام اور ولدیت وغیرہ کے۔ انہیں پاگل خانے میں پھینک دینا ایک ثبوت ہے کہ انہوں نے کوئی نشاندہی نہیں کی اور انٹیلی جنس کو کچھ نہیں بتایا۔ یہ کوئی معمولی سی قربانی نہیں"۔

"یہ بات آپ نے بالکل ٹھیک کہی ہے" — اشتیاق نے کہا — "اگر وہ انٹیلی جنس کو اقبالی بیان دے دیتے تو ہم تین دوست آج آپ کے سامنے بیٹھے یہ باتیں نہ کر رہے ہوتے، ہم تین ہی نہیں ہمارے تین چار اور دوست بھی اس وقت جیلوں میں بند ہوتے۔ عبدالستار صاحب! ہم ڈاکٹر رشید کو اس ایثار کا صلہ دینا چاہتے ہیں"۔

یہ بات کہتے کہتے اشتیاق کے آنسو بہہ نکلے۔

"ہم ایک دوبار پھر ملیں گے" — عبدالستار نے کہا — "آگرہ جا کر میں آپ کو خط لکھوں گا۔ اس میں ڈاکٹر رشید کا نام نہیں ہو گا اور ہم جو پلان بنا رہے ہیں، اس کا اشارہ تک نہیں ہو گا۔ کچھ اس طرح لکھوں گا کہ یہاں بالکل خیریت ہے جس کا مطلب یہ ہو گا کہ ڈاکٹر رشید کو میں نے اپنی تحویل میں لے لیا ہے اور وہ ٹھیک ہیں اور پھر لکھوں گا کہ کبھی فرصت ہو تو آگرہ آئیں، آپ کو تاج محل دکھاؤں گا۔ پھر آپ جب بھی آ سکتے ہیں میرے پاس آ جائیں۔ میں ایڈریس دے دوں گا اور آپ میں سے کوئی صاحب اپنا ایڈریس دے دیں جس پر میں خط لکھوں گا..... میں ایک بات پوچھنا چاہوں گا۔ فرض کیا ہم نے ڈاکٹر رشید صاحب کو فرار کروا لیا ہے۔ کیا آپ نے سوچا ہے کہ باہر انہیں کہاں رکھیں گے؟..... میں انہیں اپنے گھر میں آٹھ دس روز چھپا کر رکھ سکتا ہوں"۔

"سرحد پار کروا دیں گے" — وہاب نے کہا — "ہم جانتے ہیں یہ کام ناممکن کی حد تک محال ہے، لیکن ہم ہر خطرہ مول لینے کو تیار ہیں۔ پہلے انہیں پاگل خانے سے نکلوا دیں پھر اگلا مرحلہ اسی اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیں گے جس کے نام پر ڈاکٹر رشید نے ایثار کا یہ مظاہرہ کیا ہے اور ہم کر رہے ہیں"۔

عبدالستار نے انہیں ہر پہلو سے مطمئن کر دیا کہ وہ ڈاکٹر رشید کو فرار کروا دے گا، آٹھ دس روز اپنے گھر میں چھپا کر رکھے گا اور اس کے بعد دیکھیں گے کیا ہوتا ہے۔ اور کیا کرنا ہے۔



پاکستان کی عظمت کا ایک اور شیدائی، صغیر، جو گناہوں سے توبہ کر کے کفارہ ادا کرنے کو بے تاب تھا، شملہ کی بلندی سے دور نیچے جنگل میں سنیاسیوں کے ساتھ شب و روز گزار رہا تھا۔ اس کے زخم بالکل ٹھیک ہو گئے تھے اور اب سوچ رہا تھا کہ یہاں سے کس طرح اور کس طرف نکلے۔ سنیاسیوں کا بزرگ جسے وہ لوگ مہنت کہتے تھے، صغیر کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتا تھا۔ کہتا تھا کہ بالکے، تجھے وہ گر بتائیں گے کہ شہزادے بن جاؤ گے اور ایک سے ایک بڑھ کر حسین لڑکی تمہارے اشارے پر تمہارے پیچھے آئے گی۔

صغیر ان سبز باغوں سے ابھی متاثر نہیں ہُوا تھا۔ وہ اپنے جسم میں کچھ زیادہ ہی طاقت محسوس کرنے لگا تھا۔ جوان آدمی تھا، اس میں جوانی کی طاقت بھی تھی لیکن اسے صاف طور پر محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے جسم میں کوئی نئی طاقت آ گئی ہو۔ وہ خوش تھا کہ اگلے سفر میں یہ طاقت کام آئے گی۔

ایک روز وہ ویسے ہی گھومنے پھرنے کو نکل گیا۔ یہ پہاڑی جنگل تھا، صغیر دوڑ دوڑ کر ٹیکریاں اور چٹانیں پھلانگنے لگا اور یوں لگتا تھا جیسے وہ انسان نہیں، اسی جنگل کا کوئی جانور ہو۔ برسات کا موسم تھا، بارش اچانک برسنے لگتی تھی، اب بھی یوں ہی ہُوا کہ ساتھ والی پہاڑی کی اوٹ سے سیاہ گھٹا اٹھی اور دھواں دھار مینہ برسنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پہاڑیوں اور ٹیکریوں کے درمیان سیلاب آ گیا۔

صغیر کو یہ بارش اتنی اچھی لگی جیسے اس کی روح سے اور اس کے ضمیر سے گناہوں کی سیاہی دُھل رہی ہو۔ وہ ٹیکری سے اُترا اور پانی میں شڑاپ شڑاپ کرتا چلتا گیا۔ وہ واپس گف کو جا رہا تھا۔ کچھ آگے جا کر اس نے دائیں طرف دیکھا۔ ایک سیلابی ندی بہی جا رہی تھی۔ صغیر جانتا تھا کہ یہ ہے تو ندی لیکن اس میں زیادہ سے زیادہ گھٹنوں تک گہرا پانی ہوتا ہے لیکن سیلاب کی صورت میں اس کی گہرائی اور چوڑائی میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ صغیر کو یہ بھی معلوم تھا کہ تھوڑی ہی دور آگے یہ ندی آبشار کی طرح نیچے گرتی ہے۔

صغیر اس سیلابی ندی کے بائیں کنارے کنارے جا رہا تھا۔ وہاں کنارہ تو کوئی تھا ہی نہیں، پانی ہی پانی تھا۔ اس نے دیکھا کہ کوئی آدمی ندی کے وسط میں بازو اور سر اوپر کئے بہا چلا جا رہا ہے۔ وہ آدمی تیرنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ شاید ہاتھ پاؤں مار مار کر

تھک گیا تھا اور اس نے اپنے آپ کو سیلاب کے سپرد کر دیا تھا۔

صغیر کو معلوم تھا کہ اس شخص کا انجام کیا ہو گا۔ دو تین فرلانگ آگے یہ ندی آبشار کی طرح گرتی تھی اور اس نے اس شخص کو اوپر سے نیچے پٹخ کر مار ڈالنا تھا۔

صغیر کو اچھی طرح احساس تھا کہ وہ اس شخص کو بچانے کے لئے سیلاب میں اترا تو خود بھی اسی انجام کو پہنچے گا لیکن صغیر پر یہ کیفیت ہر وقت طاری رہنے لگی تھی کہ وہ گناہوں کا کفّارہ ادا کرے گا۔ اسی جذبے کے تحت وہ مغوّیہ لڑکی کو ساتھ لے کر اس کے گاؤں کو چل پڑا تھا۔ اب اس سے برداشت نہ ہو سکا کہ اس کی آنکھوں کے سامنے ایک انسان مر جائے۔ اس کے علاوہ جسمانی لحاظ سے وہ اپنے آپ میں کچھ ایسی طاقت محسوس کرنے لگا تھا جو غیر معمولی بلکہ غیر قدرتی بھی تھی۔ اس روحانی اور جسمانی کیفیت نے اسے اٹھا کر سیلاب میں پھینک دیا۔

اپنے انجام کی پرواہ نہ کرتے ہوئے صغیر سیلاب کے ساتھ بہتا اور تیرتا اس آدمی تک پہنچ گیا اور اس کا ایک بازو پکڑ لیا۔ اب وہ واپس تیرنے لگا تو محسوس کیا کہ جہاں سے یہ سیلاب گرتا ہے وہاں تک وہ سیلاب سے نکل نہیں سکے گا۔ وہ اللہ کو مدد کے لئے پکارنے لگا۔

اللہ نے کہا ہے کہ اس کی ذاتِ باری نے انسان کو ایسی طاقت عطا کر رکھی ہے کہ وہ اسے استعمال کرے تو معجزے بھی رُونما ہو سکتے ہیں۔ صغیر نے بڑی بلند آواز سے کہا' یا اللہ' اگر میرے گناہوں کی سزا اس طرح مرنا ہے تو مجھے یہ موت قبول ہے لیکن مرنے سے پہلے میں تیرے ایک بندے کو بچانا چاہتا ہوں' اتنی سی مہلت عطا کر دے۔

صغیر نے طاقت کا آخری ذرّہ بھی استعمال کر ڈالا اور اس کے پاؤں زمین سے لگتے محسوس ہونے لگے۔ اس نے تیرنا چھوڑ دیا اور کھڑا ہو گیا۔ پانی اس کی کمر تک تھا۔ اس نے اس شخص کو موت کے منہ سے نکال لیا تھا۔ وہ بے ہوش تھا۔ اسے صغیر نے کندھے پر اٹھا لیا اور پانی سے باہر لا کر پیٹ کے بل زمین پر لٹایا۔ پھر اوپر سے اس کی پیٹھ پر دباؤ ڈالا اور پہلوؤں سے بھی ہاتھ سے دبانا شروع کیا جس کے زیر اثر اس آدمی کے پھیپھڑوں اور پیٹ میں گیا ہوا پانی منہ اور ناک کے راستے باہر آ گیا۔

صغیر باقاعدہ جاسوس اور تخریب کار تھا اور اسے دیگر ٹریننگ کے علاوہ اس قسم کی ٹریننگ بھی دی گئی تھی کہ بجلی کے جھٹکے سے کوئی بے ہوش ہو جائے تو اسے ہوش میں

کس طرح لانا ہے اور کسی ڈوبتے شخص کو پانی سے نکالا جائے تو اسے کس قسم کی فسٹ ایڈ دینی ہے اور اس کے پھیپھڑوں اور پیٹ سے کس طرح پانی نکالا جاتا ہے۔ یہ ٹریننگ اس کے کام آئی اور اس نے اس شخص کے پھیپھڑے اور پیٹ پانی سے خالی کر دیئے۔

اس کا اپنا جسم ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ ڈوبنے والا ہوش میں آ گیا اور اٹھ بیٹھا۔ تب صغیر نے دیکھا کہ یہ ان ہی سنیاسیوں میں سے ایک ہے جن کے ساتھ وہ رہ رہا تھا۔ وہ اپنے مہنت کے کہنے پر کہیں سے ایک جڑی بوٹی لانے گیا تھا۔ واپسی پر وہ سیلاب کی لپیٹ میں آ گیا اور سیدھا موت کے منہ میں جا رہا تھا۔ صغیر اسے زندہ اور سلامت واپس لے آیا۔

صغیر کا یہ معمول تھا کہ شام کا کھانا کھانے کے بعد گف سے کچھ دور جا کر کچھ دیر ٹہلتا' پھر واپس جا کر سو جاتا تھا۔ اسی شام کا ذکر ہے کہ وہ گف سے کچھ دور بیٹھا تھا کہ وہی سادھو اس کے پاس آن بیٹھا جسے اس نے سیلاب میں سے نکالا تھا۔ صغیر نے اس سے پوچھا کہ وہ اب کیسا ہے۔ وہ بالکل ٹھیک ہو گیا تھا۔

"تم نے مجھے نئی زندگی دی ہے" — سادھو نے کہا — "اس کے صِلے میں مَیں تمہیں نئی زندگی دینا چاہتا ہوں"۔

صغیر نے حیرت سے اسے دیکھا اور پوچھا کہ وہ اسے نئی زندگی کس طرح دے گا؟

"تمہاری زندگی صرف ایک مہینہ رہ گئی ہے" — سادھو نے کہا — "اس چاند کے بعد نیا چاند نکلے گا اور جب وہ ان تاریخوں میں آئے گا تو تمہاری زندگی ختم ہو جائے گی .... مجھ سے کوئی سوال نہ کرنا نہ کچھ اور سوچنا۔ میری بات اچھی طرح سن لو اور یہاں سے نکلو .... تم دیکھ رہے ہو کہ ہمارے بڑے مہنت سنیاسی تمہیں اپنے بچوں کی طرح پال رہے ہیں۔ تم اسے نیکی سمجھ رہے ہو۔ یہ لوگ آسمانوں سے اُترے ہوئے فرشتے نہیں' اوتار نہیں اور یہ پوتر لوگ بھی نہیں۔ یہ جب شہروں میں جاتے ہیں تو ہندوؤں سکھوں کی بے اولاد عورتوں کے ساتھ بدکاری کرتے ہیں اور ہندو ایسی بے غیرت قوم ہے کہ وہ خود اپنی جوان عورتیں ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ کسی کی بیٹیاں ہی پیدا ہوتی رہیں تو یہ یقین دلاتے ہیں کہ اب بیٹے ہوں گے اور اس جھانسے میں وہ عورتوں کی عزتوں کے ساتھ کھیلتے ہیں ....

"اس میں کوئی شک نہیں کہ اُن کے پاس جڑی بوٹیوں سے بنی ہوئی ایسی دوائیاں

ہیں جو مرتے ہوئے بندوں کو موت سے بچالیتی ہیں۔ میں تقریباً ایک سال سے ان کے ساتھ ہوں اور میں ان سے یہی راز لے رہا ہوں۔ میں بہت کچھ سیکھ چکا ہوں اور دو چار مہینوں بعد میں انہیں بتائے بغیر کھسک جاؤں گا اور دوائیوں کی دکان کھول کر اپنے بال بچوں کا پیٹ پالوں گا۔ تم نے مجھے نئی زندگی دی ہے اس لئے میں تمہیں خبردار کرتا ہوں کہ ایک مہینے بعد یہ لوگ تمہیں بے ہوشی والی دوائی دے کر تمہاری گردن کاٹیں گے اور یہ خون محفوظ کرلیں گے پھر تمہاری کھوپڑی میں سے دماغ نکالیں گے اور دل اور جگر بھی نکال لیں گے۔ ان چیزوں سے ایک خاص دوائی بنائیں گے۔ بڑے عرصے بعد ان کے ہاتھ تم جیسا جوان آیا ہے....

"میں نے ان پر ایسا اعتماد جما رکھا ہے کہ یہ مجھے ہر راز میں شامل کرلیتے ہیں۔ اس کے علاوہ میں چوری چھپے ان کی باتیں بھی سن لیتا ہوں۔ کیا تم محسوس نہیں کررہے کہ تمہارے جسم میں کوئی خاص طاقت آگئی!..... تمہیں معلوم نہیں کہ یہ تمہیں خاص قسم کی غذا دیتے رہے ہیں جس میں سانپ کی یخنی بھی شامل ہے۔ یہ نہ سمجھنا کہ تمہارے جسم میں زہر چلا گیا ہے۔ زہر سانپ کے سر میں ہوتا ہے۔ یہ لوگ سر کاٹ کر پھینک دیتے ہیں۔ جسم میں زہر کا نام ونشان نہیں ہوتا۔ اب انہوں نے تمہاری غذا میں کچھ اور اضافہ کردیا ہے اور کچھ دنوں بعد تم یوں محسوس کرو گے جیسے تمہارا جی چاہتا ہے کہ جنگل کے درخت اکھاڑ دوں....

"میرے اس راز کو اپنا راز سمجھنا اور اب کسی بھی روز یہاں سے نکل جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ میری بات کو بے معنی سمجھ کر یہیں بیٹھے رہو اور ایک رات تمہاری گردن پر چھری چل جائے۔ یہ بتاؤ کہ تم جانا کہاں چاہتے ہو؟ میں تمہیں راستہ بتادوں گا"۔

صغیر کو اس سادھو کی ہر بات بالکل صحیح معلوم ہو رہی تھی۔ اپنے جسم میں وہ وہی طاقت محسوس کرنے لگا تھا جس کا ذکر اس سادھو نے کیا تھا۔ اس نے سادھو کو بتایا کہ وہ پاکستان کی سرحد تک پہنچنا چاہتا ہے۔ سادھو نے اس معذوری کا اظہار کیا کہ وہ سرحد تک کبھی نہیں گیا لیکن اس سمت کو جانتا ہے اور دلّی تک کا راستہ بتا سکتا ہے۔

صغیر اس سے سننے لگا کہ وہ بچ بچا کر پا پیادہ دلّی تک کس طرح پہنچ سکتا ہے۔ صغیر نے اگلی رات نکل بھاگنے کا پکا ارادہ کرلیا۔

ایک تو یہ وجہ تھی کہ صغیر کو وہاں سے جلدی سے جلدی نکلنا تھا۔ ایک وجہ اور بھی پیدا ہوگئی تھی جو تنہائی میں صغیر نے سوچتے ہوئے محسوس کی۔ وہ یہ کہ اس نے محسوس کیا جیسے وہ اس جنگل کا ایک حصہ اور ان سنیاسیوں کے گروہ کا ایک فرد بنتا جارہا ہے۔ اس سنیاسی نے اسے خبردار کرکے کہ اس کی جان خطرے میں ہے' اسے یہ حقیقت یاد دلادی تھی کہ وہ کیا تھا' کیا بن گیا' کہاں سے کہاں آپہنچا اور اب اسے اپنی زمین پر واپس جانا ہے جو زمین اللہ کی اور اللہ کی قرآن کی ہے۔

صبح اس کی آنکھ کھلی تو سورج طلوع ہو رہا تھا۔ سنیاسی حسبِ معمول چرس کے کش لگا کر سوئے تھے اور انہیں جاگنے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ صغیر اٹھا اور قدرتی ضروریات کے لئے گف سے باہر نکل گیا۔ وہ ہر صبح گف سے کچھ دور چلا جایا کرتا تھا۔ جنگل کا یہ ماحول روح افزا تھا۔ وہ جب صبح باہر نکلتا تھا تو اپنے آپ میں روحانی سکون محسوس کیا کرتا تھا مگر اس صبح اس نے صاف طور پر محسوس کیا کہ یہ ماحول پاکیزہ اور روح افزا نہیں رہا' اس میں گناہوں کی آلودگی آگئی ہے۔

انسان نے خلا کو آلودگی سے پاک نہیں رہنے دیا۔ چاند اور ستاروں کی پُرسکون اور مقدس فضا میں بھی انسان نے راکٹوں کا دھواں پھیلا دیا ہے۔ چاند تک کو انسان نے نہیں بخشا۔ تہذیبِ جدید سے دور افتادہ جنگلوں میں رہنے والے ان سنیاسیوں کو صغیر نیک دل اور نیک نیت انسان سمجھتا رہا لیکن انسان کی درندگی ان میں بھی موجود تھی۔ صغیر کو خبردار کرنے والے سنیاسی نے یہ بھی بتایا تھا کہ یہ لوگ شہروں میں جاکر کیسے کیسے گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں۔

گف سے دور جاکر صغیر نے چڑھتے سورج اور اس کی پھیلتی ہوئی کرنوں کو دیکھا اور

دونوں ہاتھ اٹھا کر اور آسمان کی طرف دیکھ کر بلند آواز سے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اے اللہ نے ایک کافر کے ذریعے خبردار کر دیا ہے کہ میرے بندے یہاں سے نکل.... صغیر نے دل میں اس عہد کو اور زیادہ مستحکم کر لیا کہ وہ اب اللہ کے اس راستے سے بھٹکے گا نہیں اور پاک سرزمین تک پہنچ کر دشمنوں کا صفایا کرے گا۔ اس نے ایک بار پھر اللہ سے گناہوں کی معافی مانگی۔

وہ کپڑے اتار کر ندی میں اتر گیا۔ ندی کا پانی صاف شفاف نہیں تھا کیونکہ ساون کا مہینہ تھا اور ندی میں بارشوں کا گدلا پانی جاری رہتا تھا۔ چند ڈبکیاں لگا کر صغیر ندی سے نکلا۔ وہ بالکل برہنہ تھا اور دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔ وہ کچھ دیر برہنہ ہی اِدھر اُدھر چلتا پھرتا رہا۔ جب جسم سے پانی کے قطرے بہہ گئے تو اس نے کپڑے پہنے۔ واپس گف کو چلا تو ایک ہری بھری ٹیکری پر چڑھ گیا۔ وہ پہاڑیوں، چٹانوں اور ٹیکریوں کا جنگلاتی علاقہ تھا۔

وہ ٹیکریوں کے اوپر اوپر چلتا جا رہا تھا۔ ایک تو ماحول انتہائی خوبصورت اور مردہ دلوں میں بھی روح پھونکنے والا تھا، اور دوسرے یہ کہ صغیر اپنے جسم میں غیر معمولی طاقت محسوس کر رہا تھا۔ اس طاقت کی جو اصلیت تھی وہ اسے خبردار کرنے والے سنیاسی نے بتا دی تھی.... وہ جنگلوں میں رہنے والے کسی جانور کی طرح ٹیکر ہی ٹیکری سے اترتا اور دوڑتا دوسری ٹیکری پر چڑھ جاتا۔ سورج اوپر اٹھتا آ رہا تھا۔ اب دھوپ کی تپش محسوس ہونے لگی تھی۔ ساون کے بادل سورج کے سامنے سے گزرتے اس کی تپش کو روک لیتے تھے۔

وہ چلتے چلتے رک گیا اور فوراً ایک درخت کی اوٹ میں ہو کر دیکھنے لگا۔ اس وقت وہ ایک ذرا اونچی ٹیکری پر تھا۔ ایک طرف خاصی وسیع جگہ قدرے ہموار تھی۔ یعنی وہاں کوئی چٹان اور ٹیکری نہیں تھی۔ صغیر نے دیکھا کہ ادھر سے پولیس کے دس بارہ آدمی آ رہے تھے۔ وہ سب وردی میں تھے اور ان کے پاس رائفلیں بھی تھیں۔ صغیر نے دور سے ہی اندازہ کر لیا کہ جو کانسٹیبلوں کے آگے آگے آ رہا ہے وہ تھانے دار ہے۔ وہ سب انسپکٹر پنڈت سندر داس ہی ہو سکتا تھا۔ اس رات جب وہ عرشی کے ساتھ ایک چھوٹے سے گاؤں میں پولیس کے گھیرے میں آ گیا تھا تو اس نے عرشی سے اس تھانے دار کا نام پوچھا تھا اور صغیر نے اسے للکارا بھی تھا لیکن دیکھا نہیں تھا۔

صغیر کے لئے یہ سمجھنا کوئی مشکل نہیں تھا کہ پولیس سنیاسیوں کے ڈیرے کی طرف کیوں آ رہی ہے۔ اس ہندو لڑکی نے جسے صغیر واپس گھر لے جا رہا تھا، بیان دیا ہو گا کہ وہ عرشی کی قید سے بھاگ کر سنیاسیوں کے ہاں جا کر پہنچی تھی اور وہاں سے ایک جوان آدمی نے اسے اپنے ساتھ لیا اور واپس لا رہا تھا۔ تھانے دار نے سوچا ہو گا کہ یہ شخص یعنی صغیر بھی عرشی کا ساتھی ہو گا۔ بہرحال تھانے دار نے سنیاسیوں سے پوچھ گچھ ضروری سمجھی ہو گی۔

سنیاسیوں کے خلاف تو کوئی بات پولیس کو نہیں مل سکتی تھی۔ خطرہ صغیر کے لئے تھا۔ وہ عرشی کا ساتھی تھا یا نہیں، صغیر کے لئے سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ وہ ہندوستان کا شہری نہیں تھا اور انڈین انٹیلی جنس کا مفرور ایجنٹ تھا۔ اس کا پاکستانی ہونا ہی بہت بڑا جرم تھا۔ وہ اپنی اصلیت کو پولیس سے چھپا ہی نہیں سکتا تھا۔ پولیس سب سے پہلے یہ پوچھتی کہ وہ کہاں کا رہنے والا ہے۔

صغیر بیٹھ گیا۔ ٹیکری پر گھاس اونچی تھی، جھاڑیاں اور دیگر جنگلی پودے بھی تھے۔ صغیر بیٹھے بیٹھے سرکتا پیچھے کو آیا اور ٹیکری سے اتر کر اس طرف دوڑ پڑا جس طرف ندی تھی۔ وہ ہرن کی طرح اچھلتا کودتا سبزہ زار اور ٹیکریوں کی اوٹ ہی اوٹ میں پھر ندی تک پہنچا۔ ندی گہری نہیں تھی۔ پانی اس کی کمر تک تھا۔ وہ بڑی تیزی سے ندی پار کر گیا۔ وہ کسی کو نظر نہیں آ سکتا تھا۔ اس کا رخ دِلّی کی طرف تھا لیکن دِلّی شہر وہاں سے بہت ہی دور تھا۔

صغیر کا کوئی سامان تو تھا ہی نہیں جس کا اسے غم ہوتا کہ پیچھے رہ گیا ہے۔ اس کی جیب میں ایک لمبا چاقو تھا اور کچھ انڈین کرنسی تھی۔ یہ وہ نوٹ تھے جو کئی بار بھیگ چکے تھے اور ہر بار صغیر نے خشک کر لیا تھا۔



اتفاق سے سنیاسیوں کا ایک آدمی پہلے ہی جاگ اٹھا اور باہر نکلا تھا۔ اس نے پولیس کو دور سے آتے دیکھ لیا تھا۔ وہ دوڑا گیا اور گف میں اپنے بڑے مہنت سنیاسی کو جگا کر بتایا کہ پولیس آ رہی ہے۔ مہنت نے پہلی بات یہ کہی کہ فوراً اکبر کو جگاؤ اور اسے یہاں سے غائب کر دو.... صغیر نے ان سنیاسیوں کو اپنا نام اکبر بتایا تھا۔

صغیر وہاں نہیں تھا۔ مہنت نے اپنے آدمی سے کہا کہ فوراً یہاں سے نکلو اور پولیس کی نظروں سے بچتے ہوئے اکبر کو ڈھونڈو اور اسے کہو کہ باہر ہی کہیں چھپا

رہے۔ وہ آدمی گف والی چٹان سے نکلا اور پچھواڑے سے جا کر ٹیکریوں، چٹانوں اور گھنے جنگل میں گم ہو گیا۔ اس سنیاسی مہنت کو صغیر سے کوئی انسانی نوعیت کی ہمدردی نہیں تھی۔ وہ تو اسے پال رہا تھا کہ اس کے اندرونی اعضاء نکال کر کوئی آب حیات جیسی دوائی بنانی تھی۔ اس کار آمد شکار کو وہ ضائع نہیں کر سکتا تھا۔

اتنے میں پولیس آ گئی اور سیدھی گف میں داخل ہوئی۔ سنیاسیوں کا پورا ٹولہ ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ہندو ان سنیاسیوں کا بہت احترام کرتے تھے بالکل ایسے ہی جیسے مسلمان پیروں اور درویشوں کا کرتے ہیں۔ انہیں ہندو تارک الدنیا سمجھتے تھے اور یہ بھی مانتے تھے کہ ان کے پاس ایسی جڑی بوٹیاں ہوتی ہیں جن سے بنائی ہوئی دوائیاں مُردوں کو زندہ کر دیتی ہیں۔ مہنت نے تھانے دار کو بٹھایا۔ وہ پنڈت سندر داس ہی تھا۔

"پنڈت جی مہاراج!" — سب انسپکٹر سندر داس نے ہاتھ جوڑ کر التجا کے لہجے میں کہا — "گستاخی کی معافی چاہتا ہوں، آپ کو نیند سے آ جگایا ہے لیکن مہاراج! ہماری ڈیوٹی ایسی ہے کہ کبھی پاپی بھی بننا پڑ جاتا ہے"۔

"اپنی ڈیوٹی پوری کرو" — مہنت نے کہا — "ہم اگر دنیا سے ناطہ توڑ کر اس جنگل میں آ آباد ہوئے ہیں تو یہ مت سمجھو کہ تمہاری ڈیوٹی کو نہیں سمجھتے .... کہو، میاں کیوں آئے ہو!"

"یہاں ایک لڑکی آئی تھی اور ...."

"ہاں، آئی تھی" — سنیاسی مہنت نے تھانے دار کی پوری بات سنے بغیر کہا — "اگر لڑکی کو آپ ساتھ لاتے تو زیادہ اچھا ہوتا۔ وہ ہمارے سامنے بتاتی کہ یہاں اس کے ساتھ ہم نے کیسا برتاؤ کیا تھا"۔

"نہیں مہاراج!" — تھانے دار نے کہا — "لڑکی نے آپ کے کسی آدمی کے خلاف کوئی بات نہیں کی بلکہ یہ کہا ہے کہ پرماتما نے اسے ایسی پناہ دے دی تھی جہاں اس کے ساتھ سلوک بھی اچھا ہوا اور پھر ایک آدمی اسے اس کے ماں باپ کے پاس لے جانے کے لئے چل پڑا تھا .... میں اس آدمی کے لئے آیا ہوں"۔

"میں یہ نہیں پوچھوں گا کہ اس آدمی کے لئے آپ کیوں آئے ہیں" — مہنت نے کہا — "میں یہ بتا دیتا ہوں کہ وہ لڑکی کو لے گیا تھا اور ابھی تک واپس نہیں آیا۔ نہیں آ سکتا ہے نہ ہی آئے کیونکہ وہ ہم میں سے نہیں تھا۔ اسے آپ ہمارا مہمان کہہ لیں"۔

"وہ ایک بہت بڑے ڈاکو کے ساتھ تھا" — تھانے دار نے کہا — "لڑکی ہمیں اس گاؤں سے ملی ہے"۔

"ہمیں اس لڑکی کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں تھی" — مہنت نے کہا — "صرف یہ دلچسپی تھی کہ اغوا ہوئی ہے یا جس طرح بھی گھر سے نکلی ہے، اسی طرح اپنے ماں باپ کے پاس پہنچ جائے۔ پھر ہمیں اس آدمی کے ساتھ بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی جو لڑکی کو لے گیا تھا۔ میں اسے اپنا مہمان اس لئے کہہ رہا ہوں کہ وہ کوئی بھولا بھٹکا ادھر آ نکلا تھا اور زخمی تھا پھر اسے سانپ نے ڈس لیا۔ ہم انسانوں سے دلی محبت کرتے ہیں اور روگی بندوں کی پوری خدمت کرتے ہیں۔ میں نے اس کے دونوں زخم ٹھیک کر دیئے تھے اور اب اسے یہاں رکھنا بھی نہیں تھا۔ میں تو کہتا ہوں کہ اس لڑکی کے بھاگ اچھے تھے کہ یہ آدمی یہاں موجود تھا اور لڑکی کو لے گیا"۔

"میں آپ سب کو اپنے ساتھ تھانے لے جا سکتا ہوں" — تھانے دار نے کہا — "لیکن میں آپ کی اتنی توہین نہیں کروں گا حالانکہ وہ آدمی جسے آپ اپنا مہمان سمجھتے رہے ہیں، شک ہے وہ عرشی ڈاکو کا زخمی ساتھی تھا"۔

بڑے سنیاسی نے اسے کہا کہ وہ اپنے تمام آدمیوں کے ساتھ تھانے چلا جائے گا لیکن تھانے دار دراصل کسی اور خیال سے مہنت کو ڈرا رہا تھا۔ اس نے اس کے بعد جتنی باتیں کیں ان سے پتہ چلتا تھا کہ وہ ان سنیاسیوں پر احسان کر رہا ہے۔ پھر وہ اپنی اصل بات پر آ گیا۔ یہ تو وہ دیکھ ہی چکا تھا کہ جس آدمی کے پیچھے وہ آیا تھا وہ آدمی یہاں نہیں تھا۔

"ایک عرض ہے مہاراج!" — تھانے دار نے ہاتھ جوڑ کر کہا — "اسی بہانے آپ کے پاس آ گیا ہوں۔ میں اپنے جسم میں بہت کمزوری محسوس کرتا ہوں، میرا کام دیکھیں، کتنی مشقت کا کام ہے ...."

"میں آپ کو دوائی دوں گا" — سنیاسی بابا نے اس کی پوری بات سنے بغیر کہا — "ایسی طاقت دے گی کہ آپ راتوں کو سوئیں گے بھی نہیں اور کہیں گے کہ ان پہاڑوں کو جڑوں سے اکھاڑ دوں"۔

اس نے اپنے ایک آدمی سے کچھ کہا تو وہ آدمی ایک تھیلا اٹھا لایا۔ مہنت نے اس تھیلے میں سے ایک کپڑے کی تھیلی نکال کر پانچ سات پڑیاں بنائیں اور تھانے دار کو دے

کر کہا کہ ایک ایک پڑیا دو دو دنوں کے وقفے سے مکھن میں ملا کر لینی ہے۔

"بابا مہاراج!" ـــ تھانے دار نے پوچھا ـــ "کیا آپ آنے والے وقت کی ب
دے سکتے ہیں؟ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ میں کبھی ڈی ایس پی بن جاؤں گا جسے پولیس
کہتے ہیں؟"

"ہاتھ دیکھنے کی ضرورت نہیں" ـــ سنیاسی مہنت نے کہا ـــ "آپ کے ماتھے
ہے کہ آپ ترقی کریں گے لیکن ایک بات دل میں رکھ لیں۔ اگر آپ نے اس
کو اپنا اصول بنائے رکھا اور جس طرح محنت اور مشقت آپ کر رہے ہیں تو آ
ترقی نہیں ملے گی۔ لڑکی نے آپ کو بتایا کہ وہ سنیاسیوں کے ڈیرے پر جا پہنچی
آپ پیدل اتنا کٹھن سفر کر کے یہاں آ پہنچے۔ آپ یوں کرتے کہ لڑکی کے باپ
پہنچتے اور اسے کہتے کہ یہ لو لڑکی اور بیس ہزار روپیہ نکالو لیکن آپ اپنی
دیانتداری سے کر رہے ہیں۔ داروغہ جی! چکر چلاؤ اوپر والوں کی مٹھی چاپی کر
ڈرامے کھیلو۔ ترقی ہی ترقی ہے"۔

"میں برہمن ذات کا ہندو ہوں مہاراج!" ـــ سب انسپکٹر سندر داس نے کہا
"کسی کے آگے جھکا نہیں جاتا۔ اپنا کام دیانتداری سے کرتا ہوں"۔

"تو پھر چھوڑو اس نوکری کو!" ـــ سنیاسی بابا نے کہا ـــ "ہمارے پاس آ جاؤ۔
بوٹیاں چنو، دوائیاں بناؤ اور پھر عیش ہی عیش ہے" ـــ ایسی ہی کچھ اور باتیں ہوئیں
تھانے دار چلا گیا۔ اس وقت تک صغیر دور نکل گیا تھا۔ اگر وہ علاقہ میدانی ہوتا تو
پانچ چھ میل دور نکل گیا ہوتا لیکن وہ علاقہ پہاڑی اور جنگلاتی تھا۔ کوئی سیدھا را
نہیں تھا۔ صغیر دو اڑھائی میل ہی دور گیا ہو گا جو کوئی فاصلہ تو نہیں لیکن اس تک
پولیس نہیں پہنچ سکتی تھی۔

بڑے سنیاسی نے اپنے جس سنیاسی کو پولیس کے پہنچنے سے پہلے بھیجا تھا کہ
جہاں کہیں ہے اسے کہے کہ واپس ابھی نہ آئے۔ یہ سنیاسی پولیس کے چلے جانے
صغیر کو ڈھونڈتا پھرا، آخر واپس آ کر اس نے سنیاسی مہنت کو بتایا کہ صغیر اسے
نہیں ملا۔

"کہاں غائب ہو گیا ہے؟" ـــ سنیاسی مہنت نے کہا ـــ "کہیں ایسا تو نہ ہوا
اُس نے پولیس کو دیکھ لیا ہو اور بھاگ ہی نکلا ہو!.... اگر ایسا ہوا تو پھر گیا شکار ہاتھ
نکل گیا!"

○

صغیر تو پولیس کے جال سے نکل گیا تھا لیکن انبالہ کے ڈاکٹر عبدالرشید کو آگرہ کے پاگل خانے سے نکالنا کوئی آسان کام نظر نہیں آ رہا تھا۔ کام صرف پاگل خانے سے نکالنا ہی نہیں تھا بلکہ ڈاکٹر رشید کو انڈین انٹیلی جنس کے پنجے سے نکالنا تھا۔ اس کے دوست .... وہاب، اشتیاق اور ظفر.... پکا عہد کر چکے تھے کہ ڈاکٹر رشید کو جانوں کی بازی لگا کر وہاں سے نکالیں گے اور پاکستان کی سرحد میں داخل کر دیں گے۔

یہ تینوں دوست سمگلر نہیں تھے نہ یہ جرائم پیشہ افراد تھے جن کی راہ و رسم پولیس کے ساتھ ہوتی۔ وہ سرحد تک کے خفیہ راستوں سے واقف ہوتے اور پھر یہ بھی معلوم ہوتا کہ سرحد کس طرح پار کروائی جاتی ہے۔ وہ ایک ناممکن مہم کو ممکن بنانے کی کوشش میں تھے۔ ان کا مددگار اللہ ہی اللہ تھا جس کی ذاتِ باری نے عبدالستار نام کا ایک بندہ ان تک بھیج دیا تھا۔ عبدالستار نے انہیں یقین تو دلایا تھا کہ وہ ڈاکٹر رشید کو آگرہ کے پاگل خانے سے نکال سکتا ہے اور آٹھ دس روز اپنے ہاں چھپا بھی سکتا ہے لیکن اس سے آگے وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا نہ وہ اسے سرحد تک پہنچا سکتا تھا۔

عبدالستار کو پاگل خانے کی انتظامیہ میں اچھی پوزیشن حاصل تھی لیکن اس کی کمزوری یہ تھی کہ وہ مسلمان تھا اور ہندوؤں میں گھرا ہوا نوکری کر رہا تھا۔ یہ تو اس کا جذبہ تھا کہ اسلام کے رشتے سے متاثر ہو کر خطرہ مول لے رہا تھا۔ پاگل خانے کی انتظامیہ کے وہ ایسے شعبے میں تھا جس سے وہاں کے ڈاکٹروں اور دیگر عملے کا واسطہ پڑتا رہتا تھا اور وہ سب عبدالستار کے حاجت مند اور مشکور رہتے تھے۔

اسلام کے رشتے کے علاوہ عبدالستار ڈاکٹر رشید کا احسان مند تھا اور وہ اس احسان کا صلہ دینے کا تہیہ کئے ہوئے تھا۔ خود غرضی اور نفسانفسی کے موجودہ دور میں کون کسی کا احسان مانتا اور صلے دیتا ہے۔ آج کل تو بندہ بندے کے ساتھ فریب اور دھوکے کرتا پھر رہا ہے لیکن عبدالستار میں کردار کی یہ بلندی موجود تھی جو عین اسلامی تھی.... وہ دس دنوں کی چھٹی انبالہ آیا تھا اور یہ محض اتفاق تھا کہ اس کی ملاقات ڈاکٹر عبدالرشید کے ان دوستوں میں ایک دوست وہاب کے ساتھ ہو گئی جنہوں نے صغیر کو انبالہ کے فوجی ہسپتال سے فرار کرایا تھا۔ پھر تینوں دوستوں کی ملاقات عبدالستار سے ہو گئی۔ چونکہ یہ

سب اللہ پر بھروسہ کرنے والے اور اللہ کی راہ میں قربانیاں دینے والے افراد تھے اس لئے انہوں نے اس اتفاقی ملاقات کو اللہ کا اشارہ سمجھا اور اللہ کا نام لے کر ڈاکٹر رشید کو آگرہ کے پاگل خانے سے فرار کرانے کا پلان تیار کر لیا۔

دس دنوں کی چھٹی کے دوران ڈاکٹر رشید کے یہ تینوں دوست ایک بار پھر عبدالستار سے ملے اور پلان پکا کیا اور طے یہ ہُوا کہ عبدالستار آگرہ واپس جا کر خط لکھے گا اور اس خط کے مطابق وہ آگرہ پہنچ جائیں لیکن آگرہ کے اس پہلے چکر میں ہی فرار نہیں کرایا جائے گا بلکہ عبدالستار ان کی ملاقات ڈاکٹر رشید سے کرائے گا اور پھر دوسرے چکر میں فرار کے پلان پر عمل ہو گا۔ ایک دوست نے کہا کہ وہ اپنی اسی سوزوکی گاڑی میں آئیں گے جس سے انہوں نے صغیر کو ہسپتال سے فرار کرایا تھا۔

"نہیں!" — عبدالستار نے کہا — "یہ غلطی نہ کرنا۔ ایسا نہ ہو کہ یہ گاڑی پہچانی جائے۔ ابھی آپ آگرہ ریل گاڑی پر آنا پھر سوچ لیں گے"۔

عبدالستار چھٹی ختم کر کے واپس چلا گیا۔ دس بارہ دنوں بعد وہاب کے نام اس کا خط آیا جس میں اس نے لکھا کہ سب خیریت ہے اور پھر تینوں دوستوں کو ان الفاظ میں دعوت دی کہ کبھی یہاں آئیں' میں آپ کو تاج محل دکھاؤں گا۔ خط ایسے الفاظ میں لکھا گیا تھا کہ انٹیلی جنس والے پڑھ لیتے تو بھی اسے بالکل عام اور بے ضرر خط سمجھتے۔ عبدالستار نے لکھا تھا کہ وہ پہلے اسے اطلاع دے دیں کہ کس گاڑی سے آ رہے ہیں تاکہ وہ اسٹیشن پر موجود رہے۔

دوستوں نے اسی روز پروگرام طے کیا اور عبدالستار کو خط لکھ دیا کہ وہ فلاں دن فلاں گاڑی سے آگرہ پہنچ رہے ہیں .... وہ آگرہ پہنچے' عبدالستار اسٹیشن پر ان کے استقبال کے لئے موجود تھا۔ انہیں اپنے گھر لے گیا۔ عبدالستار اپنی بیوی اور بچوں کو کچھ عرصے کے لئے انبالہ گھر چھوڑ گیا تھا۔ آگرہ اس کے گھر میں ایک قابلِ اعتماد نوکر تھا۔

"میرے بھائیو!" — رات کھانے کے بعد عبدالستار نے اپنے پلان کی بات اس طرح شروع کی — "صاف معلوم ہو رہا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ ہماری مدد کر رہا ہے۔ ڈاکٹر رشید صاحب کو پاگل خانے سے نکالنا کوئی زیادہ مشکل کام نہیں۔ میں نے چھٹی سے واپس آ کر اس پہلو سے اپنی مہم کا جائزہ لیا ہے اور دل میں طے کر لیا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو یہاں سے کس طرح نکالا جائے گا۔ میں نے انبالہ میں آپ کو بتایا تھا کہ میں

ڈاکٹر صاحب کو آٹھ دس دنوں سے زیادہ نہیں رکھ سکوں گا۔ اصل مسئلہ انہیں سرحد تک پہنچانا اور سرحد پار کروانی ہے۔ بہت سوچا' کوئی ذریعہ ہی نہیں سوجھ رہا تھا۔ میں تو مایوس ہو چلا تھا لیکن ایک ذریعہ اپنے آپ ہی میرے پاس آ گیا ہے"۔

عبدالستار کے پاس جو ذریعہ آ گیا تھا' اس کی کہانی یوں ہے کہ ایک روز شام کو عبدالستار کے پاس اس کا ایک دوست آیا جو پنجاب کا رہنے والا تھا۔ اس کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر آدمی تھا جو لباس اور وضع قطع اور انداز سے صاحبِ حیثیت لگتا تھا۔ دوست نے عبدالستار کے ساتھ اس شخص کا تعارف یوں کرایا کہ وہ جالندھر کے ایک مضافاتی گاؤں کا رہنے والا امیر زمین دار تھا۔ اس کی اصل خوبی یہ تھی کہ مسلمان تھا۔ وہ عبدالستار کے اس دوست کے قریبی رشتہ داروں میں سے تھا۔ مسلمانوں کی تو وہاں کوئی نمایاں حیثیت رہ ہی نہیں گئی تھی لیکن دوست نے بتایا کہ ان چوہدری صاحب نے اپنا اثر و رسوخ بڑا اچھا بنا رکھا ہے۔ پولیس کے افسروں کے ساتھ بھی اس چوہدری کا دوستانہ تھا۔

اس کے ساتھ حادثہ یہ ہُوا کہ اس کے ایک جوان اور غیر شادی شدہ بیٹے کو آگرہ کے پاگل خانے میں بھجوا دیا گیا تھا۔ وجہ یہ ہوئی کہ اس لڑکے کو دو تین سال پہلے نہ جانے کیا ہو گیا کہ کسی کسی وقت دماغی توازن کھو بیٹھتا تھا۔ اس کیفیت میں اسے غصہ بہت آتا تھا اور لڑنے مرنے پر اتر آتا تھا۔ اپنے عزیز اور دوست تو اس کا یہ رویّہ برداشت کر لیتے تھے لیکن ایک روز اس نے ایک ہندو کے بیٹے کو پیٹ ڈالا۔

چوہدری کو پتہ چلا تو دوڑا گیا اور اس ہندو لڑکے کے باپ سے ملا۔ اس کی منت سماجت کی اور نہ جانے کیا کیا جتن کیے کہ ہندو مان گیا اور چپ ہو گیا۔ دو چار دنوں بعد چوہدری کے اس بیٹے کو پھر دورہ پڑ گیا۔ اس وقت وہ باہر تھا اور ایک ہندو نوجوان نے نہ جانے کیا کہہ دیا کہ چوہدری کا بیٹا اس پر ٹوٹ پڑا اور اسے بری طرح زخمی کر دیا۔

اب بھی اس کا باپ اس ہندو کے پاس گیا جس کا بیٹا زخمی ہُوا تھا لیکن اس ہندو نے معاف نہ کیا اور بات تھانے تک جا پہنچی۔ تھانے دار کے ساتھ چوہدری کی بڑی اچھی راہ و رسم تھی۔ اس نے بھی زخمی نوجوان کے باپ کو راضی نامے پر قائل کرنے کی بہت کوشش کی لیکن ہندو رضامند نہ ہُوا۔ اس کے دل میں مسلمانوں کے خلاف جو عناد بھرا ہوا تھا' وہ اس عناد کے ہاتھوں مجبور تھا۔ وہ چوہدری کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچانے پر تُلا

ہُوا تھا۔

کیس مجسٹریٹ کی عدالت میں گیا۔ چوہدری نے نفسیات کے ڈاکٹروں کے ذریعے ثابت کر دیا کہ اس کے ملزم بیٹے پر کبھی کبھی پاگل پن کا دورہ پڑتا ہے اور اس دورے کے دوران اسے کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ وہ کیا ہو رہا ہے۔ مجسٹریٹ ہندو تھا۔ ہندوؤں نے مل ملا کر مجسٹریٹ کو زیر اثر کر لیا اور یہ فیصلہ لیا کہ چوہدری کے بیٹے کو آگرہ کے پاگل خانے میں داخل کر دیا جائے۔ چوہدری روپے پیسے والا آدمی تھا اس نے سیشن کورٹ میں اپیل دائر کی لیکن وہاں بھی ہندو بیٹھے ہوئے تھے جنہوں نے اپیل مسترد کر دی۔ ہائی کورٹ میں اپیل دائر ہوئی تو وہاں سے بھی مسترد ہو گئی۔ اس طرح پولیس کی تحویل میں لڑکے کو آگرہ کے پاگل خانے میں بھیج دیا گیا۔

چوہدری خوش قسمت تھا کہ مشرقی پنجاب میں، سکھوں کی اکثریت تھی اور ان سکھوں میں بیشتر کاشت کار اور کچھ بڑے اچھے پائے کے زمین دار تھے۔ سکھ ہندوؤں کو اپنا دشمن سمجھتے تھے۔ چوہدری کو ان سکھوں کی حمایت حاصل تھی۔ اگر وہاں ہندو اکثریت میں ہوتے تو چوہدری کو ہی نہیں بلکہ کسی بھی مسلمان کو اتنا بڑا زمین دار نہ بننے دیتے۔ سکھ عدالت میں چوہدری کی کوئی مدد نہ کر سکے کیونکہ ان کے بس کی بات نہیں تھی۔

چوہدری کو معلوم تھا کہ اس کا ایک رشتے دار آگرہ میں کوئی دھندہ کرتا ہے۔ چوہدری جالندھر سے آگرہ اس سے ملنے گیا اور اسے بتایا کہ اس کے ساتھ کیا ظلم ہُوا ہے۔ اتفاق سے اس کا یہ رشتے دار عبدالستار کا دوست تھا۔ دوست اسے عبدالستار کے پاس لے گیا اور اس نے یہ ساری واردات عبدالستار کو بتائی۔

"عبدالستار صاحب!" — چوہدری نے کہا — "آپ تو مجھ سے بھی زیادہ بہتر جانتے ہیں کہ ایک بار کوئی پاگل خانے میں داخل ہو جائے تو پھر اس کی لاش ہی نکلتی ہے۔ کون یہاں کسی کا علاج کرتا ہے۔ سنا ہے پاگل خانے کے سنتری اور وارڈن وغیرہ پاگلوں کے ساتھ بہت ہی ظالمانہ سلوک کرتے ہیں۔ آپ مجھے یہاں کے کسی ڈاکٹر سے ملوا دیں میں اس کا باقاعدہ وظیفہ لگا دوں گا' وہ میرے بیٹے کا علاج کرے اور اسے ٹھیک کر کے یہاں سے نکلوا دے۔ وہ جتنی رقم زبان پر لائے گا میں پیش کروں گا"۔

"چوہدری صاحب!" — عبدالستار نے کہا — "اگر رقم ہی خرچ کرنی تھی تو میرے

پاس کیوں چلے آئے؟ آپ براہِ راست کسی بھی بڑے ڈاکٹر کے ساتھ بات کر سکتے ہیں لیکن میری موجودگی میں کسی کو ایک پیسہ بھی دینے کی ضرورت نہیں پیش آئے گی۔ اگر علاج والے ڈاکٹر نے کوئی ایسی دوائی لکھ دی جو باہر ہی سے مل سکتی ہو تو وہ میں بندوبست کر لیا کروں گا اور جب کبھی آپ آیا کریں گے تو آپ سے وصول کر لیا کروں گا۔ میں کل آپ کو بیٹے سے ملوا دوں گا اور ایسا انتظام کر دوں گا کہ بیٹے کو کوئی غصے سے ہاتھ بھی نہیں لگائے گا۔ اسے جتنی سہولتیں میں اپنے رسوخ سے دلوا سکتا ہوں وہ ضرور دلواں گا"۔

چوہدری مطمئن نہیں ہو رہا تھا۔ کہتا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان میں کوئی کام رشوت کے بغیر نہیں ہوتا۔ وہ ضد یہ کر رہا تھا کہ عبدالستار اس سے کچھ رقم لے کر اپنے پاس رکھ لے اور بیٹے کے علاج کے لئے اور اسے اندر سہولتیں دلوانے کے لئے متعلقہ آدمیوں کو خوش رکھے۔ عبدالستار اپنے رسوخ اور اپنے ایمان کے تحت رقم نہیں رکھنا چاہتا تھا لیکن چوہدری اور ہی زور دینے لگا۔ اسے مطمئن کرنے کے لئے عبدالستار نے یوں کیا کہ چوہدری سے کہا کہ وہ اپنے اس رشتہ دار کو رقم دے دے اور جب کبھی ضرورت پڑی تو عبدالستار اس سے لے لیا کرے گا۔ عبدالستار نے یہ یقین بھی دلایا کہ وہ بغیر رشوت کے کسی ڈاکٹر سے کہہ کر چوہدری کے بیٹے کا علاج کروائے گا۔

چوہدری کو اس کے رشتے دار کے ساتھ بھیجنے کی بجائے کہا کہ وہ اس کے پاس رہے اور علی الصبح عبدالستار اسے پاگل خانے کے اندر لے جا کر بیٹے سے ملوا دے گا۔



اگلی صبح عبدالستار چوہدری کو اپنے ساتھ پاگل خانے کے اندر لے گیا۔ ایک تو عبدالستار کی اپنی سرکاری حیثیت ایسی تھی کہ اسے کوئی نہیں روک سکتا تھا' اور دوسرے یہ کہ پاگل خانہ کوئی قید خانہ یعنی جیل نہیں تھا۔ اندر سیکیورٹی کے انتظامات تو بہت ہی سخت ہوتے ہیں لیکن ایسے بھی نہیں کہ کوئی اپنے کسی پاگل عزیز تک پہنچ ہی نہ سکے۔

چوہدری عبدالستار کا اس قدر مشکور و ممنون ہو رہا تھا کہ اس کے آگے جھکا جا رہا تھا۔ عبدالستار نے اسے کہا کہ اس ملک میں مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک ہوتا ہے وہ اچھوتوں جیسا سلوک ہے اور سب اس سے واقف ہیں۔ اگر مسلمان ایک دوسرے کی

مدد نہیں کریں گے اور ایک دوسرے کے کام نہیں آئیں گے تو اس کا نتیجہ یہی ہوگا کہ مسلمان فرداً فرداً ہندوؤں کے زیر ہو جائیں گے اور ایک دن آئے گا کہ مسلمان ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گا۔

چوہدری کے بیٹے کو اس بارک میں رکھا گیا تھا جہاں کے مریض دن بھر کھلے رہتے تھے اور ان پر سیکیورٹی کی کوئی زیادہ پابندی نہیں تھی۔ بیٹے نے باپ کو دیکھا تو دوڑا آیا اور باپ سے لپٹ کر بے تحاشا رو دیا۔ باپ کی جذباتی حالت بیٹے جیسی ہی ہو گئی۔

عبدالستار نے بیٹے کو بتایا کہ اسے قانون کے فیصلے سے بھیجا گیا ہے اور وہ اسے برداشت کرے اور اسے یہاں کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ عبدالستار نے باپ بیٹے کو الگ ایک جگہ بٹھا دیا اور خود وہاں سے چلا گیا۔ ایک ڈاکٹر کو لے کر آیا اور چوہدری سے ملا دیا۔ یہ ڈاکٹر عبدالستار کا احسان مند تھا۔

عبدالستار اپنے دفتر میں چلا گیا۔ چوہدری ڈیڑھ دو گھنٹے اپنے بیٹے کے ساتھ رہا۔ عبدالستار چوہدری کو واپس لے گیا اور گھر چھوڑ کر پھر اپنے دفتر میں آ گیا۔ شام کے کھانے کے بعد دونوں باتیں کرنے بیٹھ گئے۔

عبدالستار نے ہندوستان میں مسلمانوں کی حالتِ زار کا قصہ چھیڑ دیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس ملک میں یہاں کہیں دو مسلمان اکٹھے ہو جاتے تھے وہ ہندوؤں کے خلاف باتیں کرتے اور مسلمانوں کی مظلومیت اور بدحالی کا رونا روتے تھے۔ دوسری وجہ یہ قصہ چھیڑنے کی یہ تھی کہ عبدالستار اس چوہدری کے خیالات معلوم کرنا چاہتا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ یہ شخص جالندھر کا رہنے والا ہے اگر اس پر احسان کیا جائے کہ اس کے بیٹے کو سہولتیں دلائی جائیں اور کسی ڈاکٹر سے اس کا علاج بھی کروایا جائے تو کیا چوہدری اس کا یہ صلہ دے گا کہ ڈاکٹر رشید کو اپنے پاس جالندھر کچھ دن چھپا لے اور پھر سرحد پار کروا دے؟

بات چلی ہی تھی کہ چوہدری نے ہندوؤں کو بے طرح گالیاں دینی شروع کر دیں۔ ہندوؤں نے اس پر تازہ وار یہ کیا تھا کہ اس کے نوجوان بیٹے کو پاگل خانے بھجوا دیا۔ ہندوؤں کے خلاف زہر اگلتے اگلتے چوہدری نے اپنے مرحوم باپ کو کوسنا شروع کر دیا۔ اس نے یہاں تک کہا کہ اس کا باپ قوم کا غدار تھا۔

"عبدالستار صاحب!" — چوہدری نے کہا۔ "میں تو اپنے باپ کی قبر پر کبھی فاتحہ

پڑھنے بھی نہیں گیا۔ 1946ء — 1947ء میں جب سارے ہندوستان کے مسلمان پاکستان حاصل کرنے کے لئے جہاد کر رہے تھے' میرا باپ اس جہاد کے سخت خلاف تھا اور مسلم لیگی مسلمانوں کا دشمن بن گیا تھا۔ بڑا امیر کبیر زمین دار تھا۔ زرخیز اراضی اتنی کہ شمار میں نہیں آتی تھی۔ کم بخت یونینسٹ پارٹی میں شامل ہو گیا تھا جو انگریزوں نے بنائی تھی اور اس میں ہندو اور سکھ بھی تھے۔ میری عمر اُس وقت گیارہ بارہ سال تھی۔ میں اپنی عمر کے لڑکوں کے ساتھ پاکستان زندہ باد کے نعرے لگاتا پھرتا تھا۔ ایک روز باپ نے میرے ہاتھ میں پاکستان کا سبز جھنڈا دیکھا تو میری پٹائی کر دی اور جھنڈا جلا ڈالا....

"میرا باپ ہندوؤں کا تو زرخرید غلام بنا ہُوا تھا۔ اس نے یونینسٹ پارٹی کو ہی نہیں بلکہ کانگریس پارٹی کو بھی چندے دیئے تھے۔ اس نے گھر میں یہ حکم دے رکھا تھا کہ خبردار کوئی اس گھر میں مسلم لیگ کا اور پاکستان کا نام لے۔ اپنے مزارعوں کے لئے تو وہ فرعون بنا رہتا تھا۔ ہمارے مزارعوں میں اکثریت ایسی تھی جو مسلم لیگ میں شامل ہو گئی اور پاکستان کے نعرے لگاتی تھی۔ میرے باپ نے ان سب کو نکال دیا اور ان سے گھر بھی خالی کروا لئے۔ ان سے روزی بھی چھینی اور بے گھر بھی کیا۔ میرا باپ اکیلا غدار نہیں تھا' بے شمار جاگیردار پاکستان کے جہاد کے خلاف تھے۔ وہ کہتے تھے کہ پاکستان کا مطالبہ ایک ڈھونگ ہے اور پاکستان کبھی بن ہی نہیں سکتا....

"پھر آپ جانتے ہیں عبدالستار صاحب! کہ کیا ہُوا تھا۔ اللہ نے مسلمانوں کو پاکستان دے دیا اور سکھ اور ہندو مسلمانوں کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں پر جون 1947ء کے پہلے ہفتے میں ہی قاتلانہ حملے شروع کر دیئے تھے۔ وہ اعلان کرتے پھرتے تھے کہ مسلمان زندہ رہنا چاہتے ہیں تو پاکستان میں چلے جائیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ جون کے پہلے ہفتے میں ملک کی تقسیم کا اعلان ہو گیا تھا جس میں پنجاب کی تقسیم کا بھی اعلان تھا۔ میرا باپ سکھ لیڈروں سے ملا اور کانگریس کے ہندو لیڈروں سے بھی۔ اس نے ان لیڈروں سے کہا کہ وہ ہندوؤں اور سکھ پبلک سے کہہ دیں کہ ہم پاکستان کے خلاف تھے اور ہم یونینسٹ پارٹی کے ممبر تھے اس لئے ایسا نہ کریں کہ کبھی ہمارے ہی گھر پر حملہ کر دیں....

"اگست میں مشرقی پنجاب میں مسلمانوں پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ سکھوں نے ہندوؤں کی پشت پناہی سے اور پولیس کی مدد سے وسیع پیمانے پر مسلمانوں کا قتلِ عام'

مسلمان خواتین کا اغوا اور وسیع پیمانے پر آبرو ریزی' ان کے گھروں کی آتش زنی اور لوٹ مار شروع کر دی۔ مجھے وہ منظر کل کی بات کی طرح یاد ہے۔ ہم سب خوف زدگی کے عالم میں اپنے گھر میں چھپ گئے۔ میں دوڑا باہر نکلا کہ دیکھوں ہو کیا رہا ہے....

"ہو یہ رہا تھا کہ سکھ مسلمانوں کے گھروں پر ٹوٹ پڑے تھے اور میرا باپ دروازے کے باہر کھڑا ہندوؤں اور سکھوں سے کہہ رہا تھا کہ یہ کانگریسی مسلمان کا گھر ہے اور میں نے یونینسٹ پارٹی اور کانگریس پارٹی کو ہزار ہا روپیہ چندہ دیا ہے لیکن ہندو اور سکھ کہہ رہے تھے کہ ہمیں مسلمان کا خون اور مال چاہئے خواہ وہ کانگریسی ہو یا مسلم لیگی....

"باپ کا رعب بجھ کے رہ گیا اور اس نے ہاتھ جوڑ کر منت سماجت شروع کر دی۔ آخر ایک سرکردہ سکھ نے طنزیہ لہجے میں یہ فیصلہ سنایا کہ بھائیو' اس کے گھر کا کوئی آدمی قتل نہ کرنا' اور جو کرنا ہے کر لو اور گھر کو آگ بھی نہ لگانا اور چوہدری صاحب کا خیال رکھنا.... یہ فیصلہ سنانے کی دیر تھی کہ سکھ ہمارے گھر میں داخل ہو گئے۔ میں کھرلی میں ہرے چارے کے نیچے جا چھپا۔ میں تو آج بھی وہ ساری بات نہیں سنا سکتا۔ خون ابلتا ہے اور میں جلنے لگتا ہوں' کہ کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ یوں سمجھ لیں کہ یہ ایک بڑا ہی تیز تند بگولہ تھا جو آیا اور گزر گیا۔ مگر بگولہ گزر گیا تو میری ایک کنواری بہن جس کی عمر سترہ اٹھارہ سال تھی غائب تھی۔ تمام کے تمام ٹرنک اور قیمتی چیزیں غائب تھیں۔ کس کس چیز کا نام لوں مویشیوں والے مکان سے دودھ دینے والی دو بھینسیں اور ایک گائے غائب تھی۔ پیچھے ہم سب گھر کے افراد رہ گئے تھے جو روتے چیختے اور چلاتے بیٹھ گئے....

"میری ماں بین کرتی اور میرے باپ سے کہتی تھی کہ پاکستان کو چلے چلتے ہیں لیکن میرے باپ کی ہڈی ایسی ڈھیٹ تھی کہ وہ اب بھی پاکستان کے نام سے نفرت کرتا تھا۔ ہمارے وہ رشتہ دار اچھے تھے جو پاکستان کو چلے گئے تھے۔ ان کی عزتیں ان کے ساتھ گئی تھیں۔ ہم وہیں رہے۔ میں تو گیارہ بارہ سال کا بچہ تھا' سوائے رونے اور اکیلے میں ہندوؤں اور سکھوں کو گالیاں دینے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ وقت گزرتا گیا اور قیامت مسلمانوں کا جو حشر کر گئی اس سے آپ واقف ہیں۔ باپ نے میری بہن کی برآمدگی کی کوششیں شروع کر دیں۔ ہندوؤں اور سکھوں کے لیڈروں سے اور پولیس کے بڑے افسروں کے پیچھے مارا مارا پھرتا رہا۔ آخر چھ مہینے بعد میری بہن برآمد ہو گئی اور اسے باپ اس حالت میں گھر لایا کہ وہ ماں بننے والی تھی۔ میری بہن صرف تین دن اور زندہ رہی۔ چوتھے روز پتہ چلا کہ بہن نے گاؤں کے کنویں میں کود کر جان دے دی ہے۔ کنویں سے لاش نکالی اور جنازہ پڑھ کر دفن کر دی....

"میں آج بھی حیران ہوں کہ میرے باپ نے یہ صدمہ کس طرح برداشت کر لیا تھا۔ اس کے بعد میرا باپ بیس سال زندہ رہا۔ اس نے بیٹی کے صدمے کو اپنے وجود میں جذب کر لیا تھا۔ میں آج تک اس بہن کو نہیں بھولا۔ میری ماں اس صدمے کو برداشت نہیں کر سکی تھی۔ بہن کے اس حادثے کے ایک ہی سال بعد فوت ہو گئی تھی۔ اس وقت میری دو بڑی بہنیں تھیں اور دونوں اپنے اپنے سسرال میں تھیں۔ وہ اچھی رہیں کہ ان کے سسرال وقت سے پہلے نکل گئے تھے اور آج ان کے خاندان پاکستان میں آباد ہیں....

"میں آج تک بہن کا صدمہ برداشت نہیں کر سکا تھا کہ اب ان ہندوؤں نے میرے جوان بیٹے کو پاگل خانے میں بھیج دیا ہے۔ بہن تو میرے ذہن میں نقش ہو کر رہ گئی ہے۔ انتقام کی آگ مجھے جلا دیتی ہے۔ میں سوچتا رہا کہ اللہ معلوم نہیں کس گناہ کی سزا دے رہا ہے۔ گناہ تو باپ کا تھا لیکن سزا میری معصوم بہن کو ملی۔ مجھ پر یہ اثر ہوا کہ جب میں جوان ہو کر جائیداد کا وارث بنا تو خدا کو راضی کرنے کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ پوری کوشش کی کہ مجھ سے کوئی برائی سرزد نہ ہو۔ نوکروں اور مزارعوں کو اپنے جیسے انسان سمجھا اور ان کی عزت بھی کی اور حق سے زیادہ دیا۔ آج میری یہی شہرت ہے' مجھ جیسے بڑے زمیندار اور جاگیردار نوکروں' مزارعوں اور چھوٹی ذاتوں والوں کے لئے فرعون بنے رہتے ہیں....

"ان ہندوؤں کو تو میں اپنا بدترین دشمن سمجھتا ہوں۔ کچھ سمجھ نہیں آتی کہ ان سے انتقام کس طرح لوں۔ ایک بار ایک پاکستانی جاسوس کو اپنے گھر پناہ دی تھی ورنہ وہ پکڑا جاتا۔ سی آئی ڈی اور اس کے مخبر اسے ڈھونڈتے پھرتے تھے۔ میرے گاؤں میں بھی آتے تھے۔ اس وقت وہ پاکستانی میرے گھر میں تھا۔ سی آئی ڈی والے اگلے روز وہاں سے ٹلے تھے۔ میں نے تین دن پاکستانی جاسوس کو چھپائے رکھا اور ایک رات خود اسے ایک قابل اعتبار آدمی کے ساتھ رخصت کیا۔ اسے سرحد پار کروا دی تھی"۔

یہ بات سن کر عبدالستار کے وجود میں اطمینان اور مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے

پنے آپ سے کہا کہ یہ ایک مدد ہے جو اللہ نے اس کے گھر بھیج دی ہے۔ پھر بھی اس نے ضروری سمجھا کہ اس چوہدری کو مزید ٹھونک بجا کر دیکھا جائے۔ دیکھنا یہ تھا کہ اس کے دل میں پاکستان کی بھی کچھ محبت ہے یا نہیں۔

"چوہدری صاحب!" ــــ عبدالستار نے کہا ــــ "پاکستان کوئی ٹھیک ملک تو نہیں رہا۔ سنا ہے، وہاں وہی لوگ عیش موج کرتے ہیں جو حرام کھاتے ہیں۔ کوئی قانون نہیں، پولیس نے اپنے ڈاکو اور قاتل پال رکھے ہیں اور عوام بھوکے ننگے مر رہے ہیں"۔

"یہ سب ٹھیک ہے" ــــ چوہدری نے کہا ــــ "میں خود پاکستان گیا ہوں اور وہاں کے یہ حالات دیکھے ہیں۔ کبھی کبھار ادھر سے ہمارا کوئی رشتہ دار بھی آ جاتا ہے اور وہ پاکستان کی ایسی ہی باتیں سناتا ہے لیکن پاکستان برا ملک نہیں، پاکستانی برے ہیں۔ وہاں کے لوگوں کو پاکستان بھوک نہیں دے رہا، حکمرانوں نے انہیں بھوکا رکھا ہوا ہے۔ پاکستان کی زمین تو لوگوں کے لئے پورا اناج اگاتی اور دیتی ہے۔ یہ حکمران ہیں اور وہاں کے جاگیردار ہیں جو سارا اناج سمیٹ کر اپنے پیٹوں میں ڈال لیتے ہیں۔ اس سے پاکستان کی عظمت میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا۔ پاکستان کی عظمت اللہ کی ذات سے وابستہ ہے۔ پاکستان کا حلیہ پاکستانیوں نے بگاڑا ہے، ہمارے لئے پاکستان ایک مقدس ملک ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے ہم کسی مسجد میں کوڑا کرکٹ پھینکنا شروع کر دیں۔ کیا ہم یہ کہیں گے کہ یہ مسجد گندی ہے؟ نہیں۔ وہ مسجد ہی رہے گی اور اس کا تقدس قائم رہے گا۔ وہ لوگ ناپاک ہیں جو مسجد کی بے حرمتی کرتے ہیں، مسجد پھر بھی پاک جگہ ہوتی ہے"۔



عبدالستار کو بڑی ہی خوشگوار قسم کی حیرت ہو رہی تھی کہ اسے کس قدر کارآمد آدمی مل گیا ہے۔ اس نے چوہدری کو ہر پہلو سے یوں دیکھ اور پرکھ لیا تھا جس طرح خوردبین سے کوئی چیز دیکھی جاتی ہے۔

"چوہدری صاحب!" ــــ عبدالستار نے سوچ سوچ کر کہا ــــ "آپ اپنے بیٹے کا غم اور فکر دل سے اتار دیں۔ اسے صحت یاب کر کے یہاں سے نکلوانا میرا کام ہے۔ آپ ایک اور کام کر دیں تو یوں سمجھیں جیسے آپ نے بیٹے کا صدقہ دے دیا ہے اور اللہ اس کا آپ کو یہ اجر دے گا کہ بیٹا انشاءاللہ صحیح اور سلامت آپ تک پہنچ جائے گا۔

"میں کہتا ہوں مجھے کچھ بتائیں" ــــ چوہدری نے پرجوش آواز میں کہا ــــ "مجھ سے میرے بیٹے کی قیمت وصول کریں اور بیٹا میرے حوالے کر دیں۔ باقی رہی بات اللہ کی تو میں ہر وہ قربانی دینے کو تیار ہوں جو اللہ مانگے گا"۔

"یہ سوچ لیں چوہدری صاحب!" ــــ عبدالستار نے کہا ــــ "میں جو بات کہنے لگا ہوں اسے آپ اللہ تبارک تعالیٰ کا راز و امانت سمجھیں۔ اگر آپ نے خیانت کی تو اللہ آپ کو کبھی معاف نہیں کرے گا۔ اپنے بیٹے کی طرف دیکھ لیں"۔

چوہدری نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگائے اور ہاتھ جوڑ کر آسمان کی طرف کئے اور اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یہ آنسو ایسی امانت تھی جس پر عبدالستار نے بھروسہ کر لیا۔

"مختصر بات یوں ہے چوہدری صاحب!" ــــ عبدالستار نے کہا ــــ "اس پاگل خانے میں انبالہ کے ایک مسلمان ڈاکٹر صاحب ہیں۔ انہیں یہاں سے نکلوانا ہے"۔

"کیوں؟" ــــ چوہدری نے پوچھا ــــ "آپ انہیں پاگل خانے کی نوکری سے نکلوانا چاہتے ہیں؟"

"نہیں چوہدری صاحب!" ــــ عبدالستار نے کہا ــــ "وہ پاگل خانے کے ڈاکٹر نہیں بلکہ ہندوؤں نے پاگل کر کے انہیں پاگل خانے میں ایک بے کار چیز سمجھ کر پھینک دیا ہے.... انہیں یہاں سے نکلوانا ہے اور یہ کام میں خود کروں گا۔ دوسرا کام جو میرے لئے ناممکن ہے۔ وہ یہ ہے کہ انہیں سرحد پار کروا کے پاکستان بھیج دینا ہے"۔

"یہ کام میں کر لوں گا" ــــ چوہدری نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا ــــ "آپ انہیں میرے گھر تک پہنچا دیں.... ہندوؤں کی ان کے ساتھ کیا دشمنی تھی؟"

"میں آپ کو پوری بات سناؤں گا" ــــ عبدالستار نے کہا ــــ "انہیں عام ہندوؤں نے نہیں بلکہ انڈیا کی انٹیلی جنس والوں نے پاگل بنایا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب سے بڑھ کر اور مجاہد کون ہو گا۔ ایسی قربانی!..... آپ سنیں گے تو حیران رہ جائیں گے"۔

عبدالستار نے چوہدری کو ڈاکٹر رشید اور صغیر کی وہ پوری بات سنا دی جو اسے ڈاکٹر رشید کے دوستوں نے سنائی تھی۔ چوہدری جوں جوں روئیداد سنتا جا رہا تھا، اس کی آنکھیں غیر قدرتی طور پر کھلتی جا رہی تھیں۔ یہ حیرت کی انتہا کا اظہار تھا۔ چوہدری کے منہ سے تین چار بار بے اختیار سرگوشی نکلی ــــ "آفرین..... آفرین شیرو..... اللہ تمہیں اجر دے مجاہدو"۔

"صغیر معلوم نہیں کہاں ہے" — چوہدری نے کہا — "اللہ جانے سرحد پار کر گیا ہے یا پکڑا گیا ہے لیکن ڈاکٹر صاحب کو میں سرحد پار کرا دوں گا۔ انہیں جالندھر میرے گھر تک پہنچانا آپ کا کام ہے۔ انہیں میں بھی اپنے ساتھ لے جا سکتا ہوں لیکن میں ریل گاڑی پر آتا ہوں اس لئے اتنے لمبے سفر میں کہیں بھی ان کے پہچانے جانے کا ڈر ہے۔ اگر آپ یہ کام مجھ سے کروانا چاہتے ہیں تو میں یہ بھی کر لوں گا۔ میں کار کا انتظام کر سکتا ہوں لیکن یہ سوچ لیں کہ میں خود کار نہیں چلا سکتا۔ ڈرائیور مل جائے گا لیکن اسے اعتماد میں لینا میرا خیال ہے خطرناک ہو گا"۔

"نہیں چوہدری صاحب!" — عبدالستار نے کہا — "یہ کام ہر پہلو سے غور کر کے کرنے والا ہے۔ میں اپنے دوستوں کو یہاں بلا رہا ہوں۔ وہ آ جائیں تو میں انہیں بتاؤں گا کہ ایک اپنے جیسے جذبے والے مجاہد مل گئے ہیں۔ آپ کا ذکر کروں گا اور پھر آپ کو بتاؤں گا۔ آپ یہ بتائیں کہ پھر کب آئیں گے؟"

چوہدری نے سوچ کر بتایا کہ وہ اسی مہینے کی سولہ یا سترہ تاریخ کو آئے گا۔

عبدالستار نے وہاب' اشتیاق اور ظفر کو چوہدری کی یہ اتنی لمبی داستان سنائی تو تینوں دوست مطمئن ہو گئے اور کہا کہ یہ آدمی یقیناً ان کی بھرپور مدد کرے گا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ وہ اس مہینے کی سولہ تاریخ کو پھر یہاں آ جائیں گے' چوہدری خواہ سترہ کو آئے یا اٹھارہ کو چوہدری کو تو آنا ہی تھا کیونکہ اس کا بیٹا پاگل خانے میں تھا۔

"اب سوچنے والی بات یہ ہے" — وہاب نے کہا — "کیا انٹیلی جنس ڈاکٹر رشید کو بھول گئی ہے؟ ایسا تو نہیں کہ کسی بھی وقت انٹیلی جنس کا کوئی افسر آ جائے اور ڈاکٹر رشید کو لے جائے"۔

عبدالستار نے انہیں بتایا کہ معلوم یہی ہوتا ہے کہ انٹیلی جنس ڈاکٹر رشید کو بھول گئی ہے۔ یہ بھی بتایا کہ ڈاکٹر رشید کا علاج جس ڈاکٹر کے سپرد کیا ہے وہ عیسائی ہے۔ اس عیسائی ڈاکٹر کی بھی ایک کہانی تھی جو مختصراً یوں تھی کہ وہ بھنگی ماں باپ کا بیٹا تھا۔ اس کے ماں باپ لوگوں کے گھروں میں یہ غلیظ کام کرتے تھے۔ ہندو اس کلاس کو اچھوت سمجھتے ہیں اور انہیں نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ نئی دلی کے رہنے والے تھے۔ کوئی امریکن فیملی دلی میں رہتی تھی۔ اس فیملی کا امریکن سربراہ کسی معاہدے کے تحت نئی دلی میں چند برسوں کے لئے آیا تھا۔ کسی نے اس عیسائی ڈاکٹر کے ماں باپ کو اس کے ہاں لگوا دیا تھا۔ یہ امریکن فیملی بہت بڑی کوٹھی میں رہتی تھی۔ انہوں نے ڈاکٹر کے ماں باپ کو فیملی کوارٹر میں رکھ لیا۔

اس وقت اس ڈاکٹر کی عمر چار پانچ سال تھی۔ امریکن نے جب دیکھا کہ یہ بچہ اتنی بڑی کوٹھی کے برآمدوں میں جھاڑو دیتا ہے تو وہ بہت حیران ہوا کہ اس لڑکے کو سکول کیوں نہیں بھیجتے۔ اس نے بچے کے ماں باپ سے کہا کہ وہ اسے سکول داخل کروائیں۔ باپ اس امریکن کی سادگی اور لاعلمی پر ہنس پڑا۔ امریکن اردو بول نہیں سمجھ سکتا تھا۔ اس نے ایک ہندو پی اے رکھا ہوا تھا۔ اس سے پوچھا کہ یہ شخص کیا کہتا ہے۔

"بھنگیوں کے بچے کسی سکول میں داخل نہیں ہو سکتے" — پی اے نے امریکن کو بتایا — "ان لوگوں کا کام ایسا ہے کہ ہندو اور باقی لوگ بھی انہیں قریب نہیں بٹھاتے بلکہ انہیں دھتکار کر رکھتے ہیں"۔

امریکن حیران رہ گیا۔ اس نے پی اے سے کہا کہ وہ جانتا ہے کہ جس مہاتما گاندھی کو ہندو اپنا لیڈر نہیں بلکہ روحانی باپ کہا کرتے ہیں' وہ اپنے آپ کو اچھوتوں کا حمایتی اور محافظ کہا کرتا تھا۔ امریکن نے کہا کہ اس نے سنا ہے کہ مہاتما گاندھی ان بھنگیوں میں اٹھا بیٹھا کرتا تھا۔

"یہ سب کہنے اور سننے والی باتیں ہیں" — ہندو پی اے نے کہا — "میں بھی آخر ہندو ہوں لیکن حقیقت سے چشم پوشی نہیں کروں گا۔ مہاتما گاندھی کی یہ بات کہ بھنگیوں کو بھی انسان سمجھو اور اپنے ساتھ ملاؤ' کسی بھی ہندو نے نہیں مانی تھی۔ یہ سب پبلک میں مقبولیت حاصل کرنے کے ڈھنگ تھے۔ مہاتما گاندھی ہندوستان میں ہر مذہب کے لوگوں کا مقبول لیڈر بننا چاہتا تھا"۔

اس امریکن نے غالباً یہ سن رکھا تھا کہ ہندو اپنے مذہب کے معاملے میں کتنے کٹر ہوتے ہیں اور وہ دوسروں کو حقارت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ بہرحال امریکن نے قدرے حیرت سے اپنے اس پی اے سے کہا کہ وہ ہندو مذہب کا آدمی ہوتے ہوئے اپنے اتنے بڑے روحانی لیڈر کے خلاف باتیں کرتا ہے۔

"کہاں کا مذہب سر!" — پی اے نے لہجے میں طنز کی جھلک پیدا کرتے ہوئے کہا — "ہمارے اس ملک میں ہر مذہب برائے نام رہ گیا ہے۔ یہاں امریکہ اور یورپ کا کلچر بڑی تیزی سے مقبولیت حاصل کر رہا ہے۔ نئے دور کے لوگ خصوصاً نوجوان اس کلچر کو

ہی مذہب سمجھتے ہیں۔ مسلمانوں نے شراب پینی شروع کردی ہے۔ ہندو گوشت کو حرام سمجھتے ہیں لیکن ماڈرن ہندو گوشت کھاتے ہیں۔ سکھوں کے مذہب میں ہے کہ وہ جسم کا کوئی بال کٹوا نہیں سکتے لیکن میں نے کئی ایک سکھ دیکھے ہیں جنہوں نے ہماری طرح سر کے بال کٹوا رکھے ہیں اور باقاعدگی سے شیو کرتے ہیں۔ میں تو آپ سے درخواست کرنے والا ہوں کہ مجھے امریکہ بھجوا دیں"۔

اس امریکن کے لئے یہ سب باتیں عجیب سی اور مضحکہ خیز بھی تھیں۔ اس نے کہا کہ اسے کسی کے مذہب کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں اس کے لئے قابل برداشت نہیں کہ ایک بچہ جسے اس عمر میں سکول میں ہونا چاہئے وہ جھاڑو دیتا پھرے اور اس کا مستقبل یہی ہو۔ پھر ہُوا یوں کہ اس امریکن کی کوششوں سے اس بچے کو ایک مشنری سکول میں داخلہ مل گیا۔

انگریزوں نے ہندوستان میں آ کر عیسائیت کے فروغ کا ایک طریقہ یہ اختیار کیا تھا کہ بھنگیوں کو عیسائیت میں لے کر ان کے لئے مشنری سکول کھول دیئے تھے۔ بھنگیوں کے بچوں کو کسی اور سکول میں داخلہ نہیں مل سکتا تھا۔ ان کے لئے صرف یہ مشنری سکول تھے جن میں انہیں دیگر تعلیم کے ساتھ عیسائیت کی تعلیم دی جاتی اور پھر انہیں تبلیغ کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ آزادی کے بعد پاکستان کی طرح ہندوستان میں بھی مشنری سکول اس قدر مقبول ہو گئے کہ اپر کلاس کے بچے ان میں داخل ہونے لگے۔ وجہ صرف یہ تھی کہ ان سکولوں میں انگریزی میں تعلیم دی جاتی تھی۔ پھر حالت یہاں تک پہنچی کہ ان سکولوں میں داخلے کے لئے وزیروں تک کی سفارشیں اور ہزارہا روپوں کی رشوت چلنے لگی۔ میرٹ پر داخلہ ناممکن ہو گیا۔



آگرہ کے پاگل خانے میں اس عیسائی کی دوستی عبدالستار کے ساتھ ہو گئی۔ عبدالستار نے اس ڈاکٹر کے ایک دو رکے ہوئے کام اور کچھ پیسے نکلوا دیئے تھے۔ اس سے ان کی دوستی اور گہری ہو گئی۔ ڈاکٹر نے عبدالستار کو بتایا تھا کہ اس کے دل میں ہندوؤں کے خلاف کس قدر نفرت اور حقارت بھری ہوئی ہے۔ اب جو اسے کسی اور اچھی جگہ لگانے کی بجائے پاگل خانے میں ٹرانسفر کر دیا گیا تھا' یہ ایک ہندو ڈاکٹر نے اسے گمنامی میں پھینکنے کے لئے کیا تھا"۔

اس نے عبدالستار کو اپنی گزری ہوئی زندگی اور تعلیم کے دور کی بات یوں سنائی تھی کہ اسے مشنری سکول میں بھی کچھ مشکل سے داخلہ ملا تھا۔ کیونکہ ملک آزاد ہو گیا تھا اور اب بڑے لوگوں کے بچے اس سکول میں داخل ہوتے تھے۔ اسے اس امریکن کی سفارش سے داخلہ ملا تھا۔ اسے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اچھے نمبروں میں پاس ہوتا چلا گیا اور کالج میں جا پہنچا۔ تعلیم کے ساتھ دلچسپی کے علاوہ اسے ڈاکٹر بننے کا بہت شوق تھا۔ کالج میں اس نے اس ارادے کے مطابق سبجیکٹ لئے۔

اس نے کسی کو پتہ نہیں چلنے دیا تھا کہ وہ بھنگیوں کا بیٹا ہے لیکن ہندو طلباء کو کسی طرح پتہ چل گیا۔ اس کا نتیجہ یہ سامنے آیا کہ ہندو طلباء نے اسے دھتکارنا شروع کر دیا۔ ہندو لیکچرار اور آفیسر بھی اس سے کھچے کھچے رہنے لگے۔ مسلمان طلباء کا رویہ بڑا ہی اچھا تھا اسی لئے اس نے جو دو تین دوست بنائے وہ مسلمان تھے۔

اس نے ایف ایس سی اتنے زیادہ اچھے نمبروں میں پاس کر لی کہ میڈیکل کالج میں اس کا داخلہ روکا نہ جا سکا۔ کاغذات پر اس نے اپنی ذات کچھ اور لکھی تھی۔ میڈیکل کالج میں بھی تھوڑے ہی عرصے بعد اس کے متعلق مشہور ہو گیا کہ یہ بھنگیوں کا بیٹا ہے۔ اس نے پھر کہا کہ یہاں بھی صرف ہندو سٹوڈنٹ تھے جو اسے بھنگیوں کا بیٹا ہونے کی وجہ سے حقیر اور اچھوت سمجھتے تھے۔ مسلمان' سکھ اور عیسائی تو سوچتے بھی نہیں تھے کہ یہ کس کا بیٹا ہے اور اس کی ذات کیا ہے۔

ہندوؤں نے اسے احساس کمتری میں مبتلا کر دیا تھا۔ کبھی اسے افسوس بھی ہوتا تھا کہ وہ ایک بھنگی کے گھر پیدا ہُوا تھا۔ اب اس کا شعور پھر اسی طرح بیدار ہو چکا تھا۔ وہ ڈاکٹر بن رہا تھا۔ آخر ایک روز اس نے اپنے ایک مسلمان اور ایک عیسائی سٹوڈنٹ دوست کو اپنی اصلیت بتا دی جو انہیں پہلے ہی ہندوؤں سے معلوم ہو چکی تھی۔ اس نے اپنے ان دونوں دوستوں سے کہا کہ اس کی خود اعتمادی مجروح ہوتی جا رہی ہے۔ دونوں دوستوں نے اسے کہا کہ وہ اپنا مستقبل تباہ نہ کرے۔ اسے جو کوئی جو کچھ بھی کہتا ہے کہنے دو' کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ان دونوں دوستوں نے اسے ایسا جذباتی سہارا دیا کہ اس کی خود اعتمادی بحال ہو گئی اور وہ احساس کمتری سے نجات حاصل کرنے لگا۔

اس عیسائی ڈاکٹر نے عبدالستار کو بتایا کہ اسے ایک بار تنہائی میں یہ خیال آیا کہ وہ تو ڈاکٹری پڑھ رہا ہے جسے مسیحائی کہتے ہیں۔ ڈاکٹر کا فرض ہے دکھی انسانیت کو سکون پہنچانا

اور دکھوں سے نجات دلانا اگر اس نے اپنا ہی دل دکھی کر لیا تو وہ انسانیت کی کیا خاک خدمت کرے گا؟ .... ہندوؤں کا کیا ہے! .... یہ تو اپنے آپ کو سارے ہندوستان کا بادشاہ اور دوسرے مذہبوں کے لوگوں کو اپنے سے کمتر سمجھتے ہیں حالانکہ وہ خود قابل نفرت قوم ہیں۔

اس ڈاکٹر نے اپنے آپ کو تعمیری سوچیں دیں' دوستوں نے اسے جذباتی سہارا دیا اور اس کے ماں باپ کو خدا نے وہ دن دکھایا جب بیٹے نے ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کرلی۔ اس نے عبدالستار کو بتایا کہ وہی جانتا ہے کہ اس کے ماں باپ نے اسے ڈاکٹر بنانے کے لئے کس قدر محنت اور مشقت کی تھی اور اپنا پیٹ باندھ لیا تھا۔ میڈیکل کالج کے اخراجات اور فیس وغیرہ ایک مزدور پیشہ آدمی کے بس کی بات نہیں تھی لیکن یہ اس بھنگی کی عظمت تھی کہ اس نے خون پسینہ ایک کر کے بیٹے کی یہ تعلیم پوری کرا دی۔

ڈاکٹر نے ہاؤس جاب کیا پھر اسے ایک سرکاری ہسپتال میں ملازمت مل گئی۔ چند مہینے ہی گزرے تھے کہ اس کے ایک ہندو کلاس فیلو نے اسے ہسپتال میں دیکھا اور وہاں دوسرے ڈاکٹروں کو بتا دیا کہ یہ اچھوت ذات کا آدمی ہے اور ایک بھنگی کا بیٹا ہے۔ اس ہسپتال میں ہندو ڈاکٹروں کی اکثریت تھی۔ یہ خبر سنتے ہی ان ڈاکٹروں نے اس عیسائی ڈاکٹر سے بے رخی برتنی شروع کر دی۔ ہسپتال کے انچارج ڈاکٹر تک یہ بات پہنچی تو اس نے اس ڈاکٹر کو دور افتادہ اور پس ماندہ دیہاتی علاقے میں بھیج دیا۔

دیہاتی علاقے میں اس نے ایک سال گزارا لیکن بہت ہی خجل اور خوار ہوا کیونکہ وہاں جو سرکاری ڈسپنسری تھی' اس میں کوئی دوائی نہیں تھی نہ کوئی اور قابل ذکر سہولت میسّر تھی۔ وہاں کے لوگ اس ڈاکٹر کو بہت پریشان کرتے اور جاگیردار قسم کے لوگ آکر اس کے ساتھ بدتمیزی بھی کر جاتے تھے۔ وہ گورنمنٹ سے دوائیاں مانگتا تھا تو انتہائی معمولی دو چار دوائیاں بھیج دی جاتی تھیں۔

آخر اسے میرٹھ کے ایک سرکاری ہسپتال میں ٹرانسفر کر دیا گیا۔ وہاں اسے اور اس کے ماضی کو جاننے والا کوئی نہ تھا لیکن چھ سات مہینے گزرے تو اس ہسپتال کا ڈاکٹر انچارج ٹرانسفر ہو گیا اور اس کی جگہ جو ڈاکٹر آیا وہ اس ڈاکٹر کا پروفیسر رہ چکا تھا اور اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ اس ہندو پروفیسر ڈاکٹر نے پہلا کام یہ کیا کہ اس ڈاکٹر کو آگرہ کے

پاگل خانے میں ٹرانسفر کرا دیا۔

اس کے جب ٹرانسفر آرڈر آئے تھے تو اس نے ڈاکٹر انچارج کے دفتر میں جا کر بات کی تھی اور کہا تھا کہ اسے کسی ایک جگہ ٹکنے دیا جائے تاکہ وہ تسلی اور تحمل سے اپنا کام کر سکے۔

"دیکھو ولیم!" — ڈاکٹر انچارج نے کہا تھا — "میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ میں برہمن ہوں اور میں کسی اچھوت کی موجودگی اپنے قریب برداشت نہیں کر سکتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہاں جو مریض آتے ہیں ان میں کئی ایک برہمن ہوتے ہیں۔ میں یہ کیسے برداشت کرلوں کہ ایک برہمن کی نبض پر ایک اچھوت ہاتھ رکھے اور پھر اس اچھوت کا ہاتھ برہمن کے جسم کے دوسرے حصوں پر پڑے۔ میرے خلاف شکایت کرنی ہے تو ہیلتھ منسٹری میں درخواست دے دو لیکن یہ سن لو کہ اس ملک پر برہمن حکومت کر رہے ہیں .... جاؤ' آگرہ کے مینٹل ہسپتال سے بہتر تمہارے لئے اور کوئی جگہ نہیں"۔

یہ عیسائی ڈاکٹر یہ چوٹ بھی سہہ گیا اور آگرہ چلا گیا۔ آگرہ کے پاگل خانے میں وہ سب سے پہلے عبدالستار سے ملا کیونکہ عبدالستار انتظامیہ کے اس شعبے کا افسر تھا جس میں ڈاکٹروں کے تمام کوائف کا ریکارڈ ہوتا تھا اور ان کی تنخواہوں اور الاؤنسوں کا حساب کتاب بھی اس شعبے میں ہوتا تھا۔

سرکاری امور کے سلسلے میں اس ڈاکٹر کی دو تین ملاقاتیں عبدالستار سے ہوئیں تو وہ عبدالستار سے کچھ زیادہ ہی متاثر ہو گیا پھر ان کی ایک دو ملاقاتیں غیر سرکاری طور پر ہوئیں تو بات دوستی تک جا پہنچی۔ دوستی گہری ہوئی تو اس عیسائی ڈاکٹر نے اپنی یہ داستان عبدالستار کو سنا ڈالی۔

"عبدالستار بھائی!" — عیسائی ڈاکٹر نے اپنی روئیداد سنا کر عبدالستار سے کہا — "پیشتر اس کے کہ آپ کسی اور سے سنیں کہ یہ ڈاکٹر بھنگی کا بیٹا ہے اور پھر آپ مجھ سے دور ہٹ جائیں' میں نے بہتر سمجھا کہ آپ کو پہلے ہی اپنی اصلیت اور ذات بتا دوں"۔

"ڈاکٹر صاحب!" — عبدالستار نے کہا — "میں مسلمان ہوں۔ آپ کسی ایک مسلمان سٹوڈنٹ کی یا کسی اور مسلمان کی نشاندہی کر دیں جس نے آپ سے صرف اس

بات پر بے رخی برتی ہو کہ آپ اچھوت ذات کے آدمی ہیں"۔

"کیا میں نے آپ کو سنایا نہیں!" — ڈاکٹر نے کہا — "مسلمان دوستوں سے ہی تو مجھے جذباتی نہیں بلکہ روحانی سہارا ملتا رہا ہے"۔

"یہ اسلام کا بنیادی اصول ہے" — عبدالستار نے کہا — "اسلام میں ذات پات کی تمیز اور تفریق گناہ ہے۔ سب برابر سمجھے جاتے ہیں۔ ہمارے خلفاء ذات پات کے معیار کے مطابق یعنی آج کے معیار کے مطابق چھوٹی چھوٹی ذاتوں کے لوگ تھے۔ آج ہم جنہیں کمین ذاتیں کہتے ہیں' ان ذاتوں بلکہ پیشوں کے افراد فوجوں کے سپہ سالار بھی رہے ہیں اور مفتوح علاقوں کے امیر بھی' جنہیں آج وائسرائے یا گورنر کہا جاتا ہے۔ اسلام میں کمتری اور برتری کا پیمانہ کچھ اور ہی تھا۔ اُس وقت انسانوں کو کردار اور ایمان کے ترازو میں تولا جاتا تھا۔ میں اس اسلام کا پیروکار ہوں"۔



عبدالستار نے انبالہ سے آئے ہوئے اپنے دوستوں کو اس عیسائی ڈاکٹر کی یہ پوری بات اس لئے سنائی کہ انہیں اطمینان ہو جائے کہ ڈاکٹر پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے لیکن عبدالستار اتنا کچا آدمی نہیں تھا کہ وہ ڈاکٹر عبدالرشید کے متعلق اس عیسائی ڈاکٹر کو اصل بات سنا دیتا۔

عبدالستار کی پہلی کوشش یہ تھی کہ ڈاکٹر رشید کا اندر باقاعدہ علاج ہو اور اسے معمولی اور بے ضرر ذہنی مریضوں کی بارک میں کھلا رکھا جائے اور دن کے وقت وہ بارک سے باہر نکل کر گھوم پھر سکے۔ عبدالستار نے ڈاکٹر رشید کی ایک کہانی گھڑی جس کی بیک گراؤنڈ یہ رکھی کہ ہندوؤں نے اس ڈاکٹر کو پاگل خانے تک پہنچایا ہے اور اس پر ایسے ایسے ظلم و ستم کئے ہیں کہ پہلے روز یہ ڈاکٹر یہاں آیا تو معلوم ہوتا تھا کہ یہ پاگل پن کی آخری سٹیج تک پہنچ چکا ہے۔ عبدالستار نے ڈاکٹر رشید کے ساتھ اپنی دلچسپی یہ بتائی کہ دونوں انبالہ کے ایک ہی محلے کے رہنے والے ہیں اور ڈاکٹر رشید معزز اور مومن قسم کے باپ کا بیٹا ہے۔

اس عیسائی ڈاکٹر ولیم نے یہ ذمہ داری سنبھال لی اور ڈاکٹر رشید کا باقاعدہ علاج شروع کر دیا۔ اس کی بارک کے جو وارڈن وغیرہ تھے' انہیں بھی کچھ ہدایات دیں جن کا مطلب یہ تھا کہ اس مریض کو خطرناک مریض نہ سمجھا جائے۔

عبدالستار نے ڈاکٹر رشید کو صحت یاب کرنے کے لئے یہاں تک کیا کہ ڈاکٹر ولیم نے کوئی ایسی دوائی بتائی جو پاگل خانے میں نہیں ملتی تھی تو عبدالستار اپنی جیب سے وہ دوائی خرید لایا اور ڈاکٹر ولیم کو دے دی۔ اس طرح ڈاکٹر رشید کی ذہنی صحت بہتر ہونے لگی۔ اسے پاگل پن کے جو دورے دن میں تین تین چار چار مرتبہ پڑتے تھے وہ کم ہونے لگے۔

ڈاکٹر رشید خود بھی تو ڈاکٹر ہی تھا۔ اب وہ ہوش و حواس میں آ گیا تو اس نے ڈاکٹر ولیم کو اپنی حالت ڈاکٹری زبان اور اصطلاحوں میں بتانی شروع کر دی پھر وہ دونوں آپس میں مشورہ کر کے دوائی تجویز کرتے تھے۔ ڈاکٹر رشید کو عبدالستار کا جذباتی سہارا مل گیا تھا' اس کا بھی اس کی ذہنی صحت پر اچھا اثر پڑا۔

ایک روز ڈاکٹر رشید نے ڈاکٹر ولیم کا خلوص دیکھ کر اسے بتا دیا کہ اس نے کیا کیا تھا اور انڈین انٹیلی جنس کے قبضے میں آ گیا اور انٹیلی جنس والوں نے اس پر ایسا تشدّد کیا کہ وہ دماغی توازن کھو بیٹھا اور وہ اسے یہاں پھینک گئے۔

ڈاکٹر ولیم کو اصل بات کا پتہ چلا تو اس نے عبدالستار سے کہا کہ اچھا ہُوا اسے پتہ چل گیا ہے' اب وہ ڈاکٹر رشید کی اور زیادہ خدمت اور مدد کرے گا۔ اس نے ایسا کر کے بھی دکھا دیا۔ مسلمانوں سے ڈاکٹر ولیم تو پہلے ہی متاثر تھا۔ جب دیکھا کہ اس مسلمان ڈاکٹر کو ہندوؤں نے یہاں تک پہنچایا ہے تو اس کے دل میں ڈاکٹر رشید کی ہمدردی میں اضافہ ہو گیا۔

دو دنوں بعد پتہ چلا کہ ڈاکٹر رشید نے اچھا ہی کیا تھا کہ ڈاکٹر ولیم کو یہ سارا پس منظر بتا دیا تھا۔ عبدالستار نے وہاب' اشتیاق اور ظفر کو نئی بات سنائی جو اسے ڈاکٹر ولیم نے سنائی تھی۔

ہُوا یوں کہ ایک روز دِلّی سے انٹیلی جنس کے تین افسر آ گئے۔

وہ پاگل خانے کے انچارج ڈاکٹر سے ملے اور بتایا کہ وہ رشید نام کے ایک پاگل کو دیکھنا چاہتے ہیں جسے انٹیلی جنس نے پاگل خانے بھیجا تھا۔ انچارج ڈاکٹر خود ان کے ساتھ چل پڑا اور یہ معلوم کر کے کہ ڈاکٹر رشید کونسی بارک میں ہوتا ہے' ان افسروں کو وہاں لے گیا۔ اس وقت اتفاق سے ڈاکٹر ولیم ڈاکٹر رشید کے ساتھ بارک سے باہر بیٹھا ہُوا تھا۔ ڈاکٹر رشید نے دور سے ہی دو افسروں کو پہچان لیا۔ ایک لیفٹیننٹ کرنل تھا اور دوسرا

میجر۔ تیسرے کو وہ نہیں جانتا تھا۔ اسی کرنل اور میجر نے ڈاکٹر رشید کو تشدد اور ایذارسانی سے پاگل خانے تک پہنچایا تھا۔

ڈاکٹر رشید نے ڈاکٹر ولیم کو بتایا کہ یہ انٹیلی جنس کے افسر ہیں اور شاید اسے دیکھنے آئے ہیں کہ یہ کس حال میں ہے۔ دونوں نے فوراً طے کرلیا کہ ڈاکٹر رشید ایسی ایکٹنگ کرے جیسے بالکل ہی پاگل ہو چکا ہو اور اس کی حالت پہلے سے زیادہ بگڑ گئی ہو۔ ڈاکٹر ولیم ڈاکٹرانچارج کو دیکھ کر دوڑتا ہوا اس تک پہنچا۔ ڈاکٹرانچارج نے اس سے پوچھا کہ یہاں رشید نام کا ایک مریض ہے جو ڈاکٹر ہے۔ ڈاکٹر ولیم نے کہا کہ وہ ناموں سے تو اتنا واقف نہیں لیکن معلوم کرلے گا۔

"معلوم کرنے کی ضرورت نہیں"۔ کرنل نے کہا۔ "ہم اسے پہچانتے ہیں.... ہاں.... وہ دیکھو بیٹھا نظر آ رہا ہے"۔

ڈاکٹر رشید باہر گھاس پر بیٹھا تھا۔ ان افسروں کو دیکھ کر لیٹ گیا اور اوٹ پٹانگ سا کوئی فلمی گانا بڑی بلند آواز سے گانے لگا۔

"ہیلو ڈاکٹر رشید!"۔ کرنل نے ڈاکٹر رشید کے قریب جا کر کہا اور ہاتھ آگے بڑھایا۔ "کہو کیسے ہو؟"

ڈاکٹر رشید اچھل کر اٹھا اور کرنل کا آگے بڑھا ہوا ہاتھ پکڑ کر اپنا ہاتھ اس کی نبض پر رکھا اور پھر چہرے پر سنجیدگی کا گہرا تاثر لا کر کرنل کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔

"تمہاری نبض بند ہو گئی ہے"۔ ڈاکٹر رشید نے کہا۔ "نہیں، نہیں، چل پڑی ہے.... تمہیں ملیریا ہو گیا ہے۔ ٹھہرو میں تمہیں دوائی دیتا ہوں"۔

ڈاکٹر رشید پیچھے مڑا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا بارک کی طرف چل پڑا۔ دروازے کے قریب جا کر رک گیا پھر پیچھے مڑا اور پہلے کی طرح بڑی تیزی سے چلتا ان افسروں تک آیا۔

"تم میں مریض کون ہے؟"۔ ڈاکٹر رشید نے پوچھا اور سب کو باری باری دیکھا پھر بولا۔ "ادھر قطار میں کھڑے ہو جاؤ۔ ڈاکٹر صاحب ابھی آتے ہیں"۔

وہ پھر بارک کی طرف چل پڑا اور پہلے کی طرح دروازے میں جا کر رکا اور واپس آ گیا۔

"تم نے میری گاڑی دیکھی ہے؟"۔ ڈاکٹر رشید نے پوچھا۔

"کیا آپ یہاں ڈاکٹر ہیں؟"۔ کرنل نے پوچھا۔

"میں ڈاکٹر صاحب کا ڈرائیور ہوں"۔ ڈاکٹر رشید نے کہا۔ "نہیں نہیں، میں ڈرائیور صاحب کا ڈاکٹر ہوں۔ ٹھہرو، ڈسپنسر آکر دوائی دے گا"۔ اس نے میجر کے پیٹ پر ہاتھ پھیرا اور بولا۔ "اپنی وائف کو ایڈمیٹ کروادو۔ دیکھتے نہیں اس کا بچہ پیدا ہونے والا ہے.... یہ وائف کدھر سے لائے ہو؟"

"کیا آپ ہمیں کہیں بٹھائیں گے نہیں؟"۔ کرنل نے پوچھا اور کہا۔ "ہم آپ سے ملنے آئے ہیں"۔

ڈاکٹر رشید اُن پاگلوں کی طرف مڑا جو بارک کے لان میں اِدھر اُدھر بیٹھے یا چل پھر رہے تھے۔

"اوئے، تم سب ادھر آؤ"۔ عبدالرشید نے پاگلوں کو پکار کر کہا۔ "کرسیاں باہر رکھو اور چائے فوراً لے آؤ"۔ وہ افسروں کی طرف مڑا اور بولا۔ "آئیے، بیٹھئے، چائے ابھی آتی ہے"۔

ڈاکٹر رشید لان کی طرف چل پڑا اور افسر اس کے پیچھے پیچھے گئے۔ لان میں جا کر اس نے ان سب سے کہا کہ بیٹھ جائیں۔ وہ ابھی گھاس پر بیٹھے ہی تھے کہ دو پاگل دوڑے آئے اور جمپ کر کے ان سب کے درمیان آ بیٹھے۔ دونوں نے قوالی شروع کر دی اور تالیاں بجانے لگے۔ ڈاکٹر رشید نے اپنے کان پر ہاتھ رکھا اور بڑی لمبی اور بے سری لے منہ سے نکالی۔ پھر یہ تینوں تالیاں بجاتے ہوئے اٹھے اور ایک طرف چل پڑے۔

"کیوں ڈاکٹر صاحب!"۔ کرنل نے پاگل خانے کے انچارج ڈاکٹر سے پوچھا۔ "آپ کی رائے کیا ہے؟"

"تم بتاؤ ڈاکٹر ولیم!"۔ ڈاکٹر انچارج نے کہا۔ "اس بارک کے مریضوں کو تم ہی اچھی طرح جانتے ہو"۔

"Beyond Repair"۔ ڈاکٹر ولیم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "یہ تو ٹھیک نہیں ہو سکتا"۔

ڈاکٹر ولیم نے ڈاکٹری اصطلاحوں میں ڈاکٹر رشید کی حالت کا تجزیہ پیش کیا اور کہا کہ اس کی رائے یہی ہے کہ یہ ٹھیک نہیں ہو سکتا۔

"Should we Forget him!" — کرنل نے پوچھا۔

"For get him" — ڈاکٹر انچارج نے کہا۔

انٹیلی جنس کے تینوں افسر اور ڈاکٹر انچارج اٹھے اور چل پڑے۔

"یہ شخص پتھر کا بنا ہُوا ہے" — کرنل نے کہا — "اس کا انجام یہی ہونا تھا۔ اسے ہم Write off کر دیتے ہیں"۔

"بالکل یہی کریں" — ڈاکٹر انچارج نے تائید کی — "لکیر پھیر دیں۔ اس کے ٹھیک ہونے کا کوئی امکان نہیں"۔

ڈاکٹر ولیم نے عبدالستار کو بتایا کہ اب انٹیلی جنس والوں کے آنے کا کوئی خطرہ نہیں۔ وہ یہ دیکھنے آئے تھے کہ اس کے ٹھیک ہونے کا امکان ہو تو کبھی آ کر اسے ہم لے جائیں لیکن اب یہ فیصلہ دے گئے ہیں کہ وہ پھر کبھی نہیں آئیں گے۔



عبدالستار نے ڈاکٹر عبدالرشید کے دوستوں کو اتنی لمبی لمبی باتیں سنائیں کہ رات باتوں میں ہی گزر گئی۔ وہ بمشکل ڈیڑھ دو گھنٹے سوئے اور اگلا دن طلوع ہُوا۔

عبدالستار تینوں کو پاگل خانے لے گیا۔ یہ اب پاگلوں کی دنیا میں داخل ہوئے۔ ماحول ایسا تھا کہ سٹاف کے آدمی جو ادھر ادھر چل پھر رہے تھے وہ بھی پاگل لگتے تھے۔ ان بارکوں کے حصے میں گئے جن بارکوں میں بے ضرر قسم کے ذہنی مریض رہتے تھے۔ وہ باہر نکل رہے تھے اور ویسے ہی ادھر اُدھر گھومتے پھرتے تھے۔ عبدالستار اور اس کے مہمان جب ان کے قریب سے گزر رہے تھے تو بعض مریض انہیں لاتعلق سے ہو کر دیکھنے لگے اور کچھ ایسے تھے جن کے چہروں پر حیرت کا تاثر تھا۔ ایک دو انہیں دیکھ کر ہنسنے لگے اور ایک دوڑا آیا اور ان کے قریب رک کر انہیں دیکھا اور دیکھتے ہی دیکھتے بچوں کی طرح رو پڑا۔

ڈاکٹر رشید بارک سے نکلا۔ اس کے دوست اسے نہ پہچان سکے کیونکہ اس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی اور اس کے کپڑے بھی کچھ اور ہی قسم کے تھے۔ دوستوں نے ڈاکٹر رشید کو اس حالت میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ڈاکٹر رشید نے انہیں دیکھا اور دوڑ پڑا۔ عبدالستار نے اسے پہلے بتا دیا تھا کہ دوست آ رہے ہیں۔

ڈاکٹر رشید قریب آ کر سب سے پہلے وہاب سے بغلگیر ہُوا۔ اس نے وہاب کو بازوؤں میں ایسا جکڑا اور بھینچا کہ وہاب کی پسلیاں جیسے ٹوٹ ہی جائیں گی۔ اس کے ساتھ ہی اس کی اور وہاب کی سسکیاں سنائی دینے لگیں۔ پھر رشید، اشتیاق اور ظفر سے اسی طرح گلے لگ کر ملا۔ سب کے آنسو بہہ رہے تھے۔ یہ جذبات کی شدت تھی جو ان کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ بارک کے کئی پاگل ان کے ارد گرد اس طرح اکٹھے ہو گئے جیسے تماشا دیکھ رہے ہوں۔ ان میں کوئی ہنس رہا تھا، کسی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے اور کچھ انہیں حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

عبدالستار نے انہیں کہا کہ یہاں نہیں، اس نے ملاقات کے لئے ایک جگہ پہلے ہی دیکھ رکھی تھی۔ وہ انہیں اس طرف لے گیا۔ وہاں دو درختوں کے درمیان گھنے اور اونچے پودے تھے۔ ستار نے انہیں ان پودوں کی اوٹ میں جا بٹھایا۔

"پہلے یہ بتاؤ اب کیسے ہو؟" — وہاب نے پوچھا — "جسمانی حالت تو دیکھ لی ہے، دماغ کی بات کرو"۔

"دماغ بھی بہتر ہے" — رشید نے جواب دیا — "پہلے میرے گھر کا حال احوال بتاؤ۔ مجھے صرف امّی اور ابّو کا غم کھائے جا رہا ہے"۔

"اور انہیں تمہارا غم کھائے جا رہا ہے" — وہاب نے کہا — "یہ تو قدرتی بات ہے۔ میں کیسے کہہ سکتا ہوں کہ وہ خوش و خرم ہیں، البتہ اچھی بات یہ ہے کہ ڈیڑھ ایک مہینے سے بلکہ اس سے پہلے سے بھی انہیں پولیس یا فوج کی طرف سے کوئی پریشانی نہیں رہی اب وہاں کوئی نہیں آتا"۔

عبدالستار انہیں وہاں بٹھا کر اپنے دفتر کو چلا گیا۔ اس نے بارک کے سنتری کو پہلے ہی بتا دیا تھا کہ ان مہمانوں کو یہاں بیٹھے رہنے دیتا ہے۔

"معلوم نہیں تمہیں عبدالستار صاحب نے ساری باتیں سنائی ہیں یا نہیں" — ڈاکٹر رشید نے کہا — "انٹیلی جنس والوں کا اب یہاں بھی خطرہ نہیں رہا۔ وہ آئے تھے۔ میں نے پاگلوں جیسی ایسی ایکٹنگ کی کہ انہوں نے مجھے لاعلاج پاگل سمجھ کر میرے نام پر لکیر پھیر دی ہے"۔

"عبدالستار صاحب نے ہمیں یہ ساری باتیں سنا دی ہیں" — اشتیاق نے کہا — "میرا خیال ہے کہ ہمیں ضروری باتیں کرنی چاہئیں۔ ہم یہاں زیادہ بیٹھ نہیں سکیں گے۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ ہم تمہیں یہاں سے فرار کرا رہے ہیں؟"

"معلوم ہے" — ڈاکٹر رشید نے کہا — "لیکن جائیں گے کہاں؟"

"پاکستان" — وہاب نے کہا — "تمہیں اپنے ماں باپ اور بہن بھائی اور گھربار قربان کرنا پڑے گا۔ کیا تم اس کے لئے تیار ہو؟"

"اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں" — رشید نے جواب دیا — "میں موت سے قید سے نہیں ڈرتا۔ ایسا خیال کبھی آیا ہی نہیں کہ میں پکڑا گیا تو مجھے سزائے موت یا عمر قید دے دی جائے گی' میں صرف یہ عہد کئے ہوئے ہوں کہ ہندوؤں کی اس انٹیلی جنس کو کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔ فتح ان کی نہیں ہماری ہو گی .... البتہ ایک قربانی نہیں دے سکوں گا"۔

"وہ کیا؟"

"خالدہ!" — رشید نے کہا — "غلط نہ سمجھنا۔ تم جانتے ہو خالدہ کون ہے۔ وہ ہسپتال کی نرس .... یہ اس لئے نہیں کہ مجھے اُس سے محبت ہے اور میں اسے اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں بلکہ اس لئے پریشان ہوں کہ وہ اس ہسپتال میں رہی تو یہ خبیث ہندو ڈاکٹر اسے اپنی داشتہ بنالیں گے۔ وہ پہلے ہی اس کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ کیا تم اسے بھی میرے ساتھ فرار کروا سکتے ہو؟"

"بات کچھ مشکل نظر آتی ہے" — وہاب نے کہا۔

"یہ بھی تو دیکھنا ہو گا کہ خالدہ تمہارے ساتھ جانے پر آمادہ ہو گی بھی یا نہیں" — ظفر نے کہا — "بات اتنی سی تو نہیں جیسے ہم تمہیں انبالہ سے دِلّی لے جا رہے ہیں۔ سوچ لو' فرار ہونا ہے اور سرحد پار کرنی ہے' کیا ایک لڑکی کو ساتھ لے کر ایسا ہو سکے گا؟"

"پھر یوں کرنا" — رشید نے کہا — "میں اس پر جبر بھی تو نہیں کرنا چاہتا۔ تم میں سے کوئی اسے ہسپتال میں ملے اور پوچھ لے کہ وہ یہ خطرہ مول لینا چاہتی ہے یا نہیں۔ اگر وہ تیار ہو تو اسے ساتھ لے لینا"۔

کچھ دیر خالدہ ہی کی باتیں ہوتی رہیں۔ دوست کوئی اور بات کرتے تھے تو ڈاکٹر رشید پھر خالدہ پر آ جاتا تھا۔ ان دوستوں میں وہاب عمر میں بڑا اور عقل میں بھی بڑا تھا۔ اس نے کہا کہ خالدہ سے ہٹ کر بھی کوئی بات کی جائے۔

"میں خالدہ کے متعلق بہت جذباتی ہوں" — ڈاکٹر رشید نے کہا — "میں یہ بھی محسوس کرنے لگا ہوں کہ خالدہ کے بغیر شاید میں آگے نہ چل سکوں۔ بہرحال اس تک میرے جذبات پہنچا دینا اور کہنا کہ وہ یہ خطرہ مول لے لے"۔

"اب بتاؤ رشید!" — وہاب نے پوچھا — "تم یہاں آئے تو کیا حالت تھی اور اب بہتر ہوئے ہو یا نہیں .... میں دماغی حالت کی پوچھ رہا ہوں"۔

○

"میرا دماغی توازن بالکل ہی بگڑ گیا تھا" — ڈاکٹر رشید نے جواب دیا — "لیکن میں یہ بتا دوں کہ دماغی توازن ان کفار کی ایذا رسانی سے نہیں بگڑا تھا یا یوں کہہ لو کہ صرف ایذا رسانی سے نہیں بگڑا بلکہ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ مجھے کھانے میں یا انجکشن کے ذریعے کوئی بڑا ہی تیز ٹرانکولائزر دیتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ وہ مجھے ایل ایس ڈی دیتے رہے ہیں جو دماغ کے لئے بڑا ہی خطرناک ٹرانکولائزر ہے۔ وہاں ایک ڈاکٹر مل گیا جس کے دل میں میری ہمدردی پیدا ہو گئی۔ اس نے ایک دوائی چوری چھپے دے دی تھی۔ وہ میں کھانے کے بعد لیتا تھا۔ اس سے ٹرانکولائزر بے اثر ہو جاتا تھا اور میں ہوش و حواس میں رہتا تھا لیکن ایسی دوائیاں دماغ کے لئے نقصان دہ ہوتی ہیں۔ اس طرح ایک نقصان ٹرانکولائزر نے پہنچایا اور اس نقصان میں اضافہ ٹرانکولائزر کا اثر زائل کرنے والی دوائی نے پہنچایا۔ جسمانی اذیتیں تو مجھے ایسی ایسی دی گئیں کہ میرا زندہ رہنا ایک معجزہ ہے۔ ان کی وجہ سے میرے جسم میں قوتِ مدافعت رہی ہی نہیں تھی۔ اس کا بھی دماغی توازن پر اثر پڑنا لازمی تھا....

"بہرحال وجہ کچھ بھی ہو' میرا شعور ختم ہو گیا تھا۔ کئی ایک باتیں یاد ہی نہیں رہیں۔ مجھے بالکل معلوم نہیں کہ یہاں اس پاگل خانے میں کب اور کس طرح لایا گیا تھا اور کون لایا تھا۔ کچھ یاد آتا ہے تو یوں لگتا ہے کہ ایسا حقیقت میں نہیں ہُوا' یہ خواب تھا اور وہ بھی بہت دھندلا دھندلا سا۔ تم جانتے ہو کہ میں اللہ پر بھروسہ کرنے والا انسان ہوں اور ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کیا کرتا ہوں اور اسی کی مدد کا محتاج رہتا ہوں۔ اس اعتقاد کا کرشمہ ہے کہ یہاں عبدالستار صاحب مل گئے اور ان کے ذریعے اللہ نے ایک عیسائی ڈاکٹر کو میری نجات کے لئے بھیج دیا۔ اس ڈاکٹر کو میں فرشتہ سمجھتا ہوں یہ مجھے شعور میں واپس لے آیا اور آگے میں خود ڈاکٹر ہوں۔ ہم دونوں نے مل کر ایسی

دوائیاں تجویز کرلیں جن سے دماغی توازن واپس اپنی جگہ آنے لگا"۔

یہ تو تھی دوائیوں کی بات جن دوائیوں نے ڈاکٹر رشید کو پاگل پن سے نکال دیا تھا باقی اس کی اپنی کاوش تھی کہ وہ اب دوستوں میں بیٹھا عقل و ہوش کی باتیں کر رہا تھا۔ یہ تھا کرشمہ ان قوتوں کا جو اللہ نے ہر انسان کو عطا کی ہیں۔ ان میں ایمان اور کردار کی قوت سب سے زیادہ کار فرما تھی۔ مسلمان کو تو اللہ نے ایسا اعتقاد دیا ہے کہ وہ آتش نمرود میں کود جائے تو یہ آگ سرد ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر رشید نے دوستوں کو سنایا کہ وہ جب اس پاگل خانے میں ذرا ہوش میں آیا تو اسے یاد آنے لگا کہ اس پر کیا بیتی ہے اور یہاں تک آن پہنچا ہے جو پاگلوں کی دنیا ہے۔ اس نے کہا کہ پاگل اس لحاظ سے خوش نصیب ہیں کہ ان کے جذبات اور احساسات مارے جاتے ہیں پھر وہ کچھ بھی محسوس نہیں کرتے۔ رنج والم ان کی سوچوں سے نکل جاتا ہے اور یہ ہر رنگ میں خوش رہتے ہیں۔

ڈاکٹر رشید کی اپنی ذہنی حالت یہ تھی کہ شعور میں آجاتا تھا اور پھر اس کی آنکھوں کے آگے دنیا تاریک ہو جاتی تھی۔ اسے کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے اور کیا کہہ رہا ہے۔ یہ دورے کی کیفیت ہوتی تھی جس میں وہ اوٹ پٹانگ اور بے معنی باتیں کرتا تھا۔ تاریکی چھٹ جاتی تو وہ پھر ہوش و حواس میں آجاتا تھا۔ دوائیوں سے یہ کیفیت کم ہونے لگی تو اس نے ان پاگلوں کو یا ذہنی مریضوں کو دیکھا تو اس میں یہ احساس پیدا ہو گیا کہ یہ سب دکھی اور غموں کے مارے ہوئے لوگ ہیں۔ یہ جو قہقہے لگاتے پھرتے ہیں یہ سب سے زیادہ غموں کے ڈسے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر رشید نے ان میں دلچسپی لینی شروع کر دی اور ان میں جو ذرا ہوش و حواس میں ہوتا تھا اسے ڈاکٹر رشید الگ بٹھا لیتا اور پوچھتا کہ وہ یہاں تک کیوں پہنچایا گیا ہے۔

"ہوش میں آنے کے بعد میں نے جو محسوس کیا وہ بتاتا ہوں" ۔۔۔ ڈاکٹر رشید نے کہا ۔۔۔ "سب سے پہلے تو میں نے یہ محسوس کیا کہ میں بھی انہی جیسی حرکتیں اور باتیں کرتا رہا ہوں گا لیکن افسوس کی بجائے میں نے اپنے دل میں ان پاگلوں کی ہمدردی پیدا کرلی۔ میں اپنی ذات کے پنجرے سے نکل آیا۔ میرے دوستو! میرے سینے میں ایک غبار سا بھرا ہوا ہے۔ مجھے یہ نکال لینے دو پھر اور باتیں کر لیں گے.... اگر اپنے کسی دکھ درد سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہو تو اس کا بہترین ذریعہ ہے کہ دوسروں کے دکھ اپنے

سینے میں ڈال لو اور ان دکھوں کا مداوا بنو۔ پاگل خانے کی یہ دنیا اس دنیا کے گناہوں کا منہ بولتا ثبوت ہے جس دنیا کے لوگ باہر آزاد پھر رہے ہیں' اپنے آپ کو عقل مند اور ان اونچی اونچی دیواروں کے اندر رہنے والے لوگوں کو پاگل کہتے ہیں۔ پاگلوں کی یہ دنیا ان لوگوں نے آباد کی ہے جو اپنے آپ کو معزز سمجھتے ہیں۔ یہاں کا ہر پاگل ایک دردناک کہانی کا کردار ہے۔ اگر میں یہ ساری کہانیاں سنانے بیٹھ جاؤں تو یہ دن گزر جائے گا اور رات بھی گزر جائے گی....

"دیکھو ہوتا کیا ہے۔ تمہاری دلچسپی کے لئے میں دو پاگلوں کی بات سناتا ہوں۔ دونوں ابھی جوانی کی عمر میں ہیں اور ان کی باقی عمر اسی پاگل خانے میں گزر جائے گی۔ ایک کے پاگل پن کی وجہ یہ ہوئی کہ وہ اپنی پسند کی لڑکی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا۔ اسے محبت کہہ لیں یا صرف پسند کہہ لیں لیکن ماں باپ نے اس کی اس پسند کو صرف اس لئے ٹھکرا دیا کہ اس لڑکی کے خاندان کے ساتھ ان والدین کی کوئی چپقلش تھی۔ انہیں اپنے بیٹے کی خوشی دیکھنی چاہئے تھی لیکن انہوں نے اپنی انا کو دیکھا اور بیٹے کی یہ خواہش پوری نہ ہونے دی۔ لڑکے کی شادی کہیں اور کر دی اور جب لڑکی کی شادی کہیں اور جگہ ہوئی تو اس لڑکے کا دماغی توازن بگڑ گیا....

"یہ جوان آدمی کبھی کبھی ہوش میں آتا ہے اور اس پر جو بیتی ہے وہ سناتا ہے۔ مجھے اس نے اپنا ہمدرد سمجھ کر ساری بات بتائی تھی۔ وہ کہتا ہے کہ پاگل تو میرے ماں باپ تھے لیکن انہوں نے مجھے پاگل قرار دے کر یہاں بھیج دیا....

"اور پھر اسی عمر کا ایک اور جوان آدمی اس بارک میں موجود ہے۔ وہ اپنی پسند بلکہ محبت کی شادی کرنا چاہتا تھا۔ ماں باپ نے اس کی شادی اسی لڑکی کے ساتھ کرا دی لیکن دو اڑھائی سال بعد یہ آدمی دماغی توازن کھو بیٹھا۔ اب بتاؤ کوئی کیا کہے۔ جس کی شادی اس کی مرضی کے خلاف ہوئی وہ بھی پاگل ہو گیا اور جس کی شادی اس کی پسند کے عین مطابق ہوئی وہ بھی پاگل خانے میں آ بیٹھا"۔

"اس کی کیا وجہ ہوئی؟" ۔۔۔ ایک دوست نے پوچھا۔

"وجہ یہ ہوئی" ۔۔۔ ڈاکٹر رشید نے کہا ۔۔۔ "ہمارے ہاں شادی لڑکی اور لڑکے کی نہیں بلکہ دو خاندانوں کی شادی ہوتی ہے۔ لڑکے کے والدین کا مطالبہ یہ ہوتا ہے کہ بیٹا ہمیں خوش رکھے۔ بیوی کہتی ہے کہ صرف مجھے خوش رکھے اور ادھر بیوی کے ماں باپ

یہ توقع رکھتے ہیں کہ ان کا داماد صرف ان کے مفادات کا خیال رکھے۔ یہ ایک ایسی چپ
چل پڑتی ہے جس میں میاں بیوی پس جاتے ہیں۔ اگر بیوی خاوند کا ساتھ دے تو خاوند
اپنی نجات کا راستہ نکال لیتا ہے' اور اگر بیوی اپنے سسرال میں اپنا محاذ قائم کر لے تو پھر
خاوند نے تو پاگل ہی ہونا ہوتا ہے"۔

ڈاکٹر رشید نے ایسے ہی دو تین اور پاگلوں کے پاگل پن کی وجوہات سنائیں جو دراصل ہمارے معاشرے کی قباحتیں اور خرابیاں ہیں۔ کوئی انسان خود ہی یا اپنی کاوش سے اپنا دماغی توازن نہیں بگاڑتا۔ کچھ گھر کے افراد اور کچھ معاشرے کے افراد ایسے حالات پیدا کر دیتے ہیں کہ سب مل کر ایک آدمی کا دماغی توازن بگاڑتے اور پھر اسے ذہنی مریض قرار دیتے اور آخر پاگل خانے کی دنیا میں بھیج دیتے ہیں۔

"دوائیوں کی بات چھوڑو" ـــ رشید نے کہا۔ "میں نے اپنا علاج ایک اور ذریعے سے بھی کیا ہے۔ اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دیا۔ یوں نہیں کہ ہر وقت اللہ ہی اللہ کرتا ہوں' میں نے اتنا کیا کہ پانچوں وقت نماز باقاعدگی سے پڑھتا رہا۔ اس دوران پاگل پن کے دورے بھی پڑتے رہے لیکن ہوش میں آتے ہی دیکھا کہ میں کسی وقت کی عبادت چھوڑ تو نہیں گیا۔ میں نے رکوع و سجود پر ہی تکیہ نہیں کیا بلکہ یوں عبادت کرتا ہوں جیسے میں اللہ سے ہم کلام ہوں....

"میں وظیفے بھی کرتا ہوں۔ ذہن کے کنٹرول کے لئے اور پاگل پن کے دوروں سے بچنے کے لئے۔ میں نے دیکھا ہے کہ وظیفہ بڑی ہی کار آمد چیز ہے' بشرطیکہ وظیفہ یکسوئی سے کیا جائے۔ وہ میں نے کیا اور کر رہا ہوں اور اس کے اثرات بھی دیکھے ہیں۔ میری روحانی قوتیں بیدار ہو گئیں اور ان قوتوں نے معجزہ کر دکھایا....

"پھر یہ بھی تو دیکھو کہ اللہ نے مجھے کس طرح اجر سے نوازا ہے۔ عبدالستار صاحب کا یہاں مل جانا اور پھر ان کا انبالہ میں وہاب سے جا ملنا اور پھر ڈاکٹر ولیم کا یہاں آ جانا' اللہ کا اجر نہیں تو اور کیا ہے!.... اللہ گواہ ہے' مجھے کوئی افسوس نہیں کہ میں کتنی اچھی حیثیت کا مالک تھا اور اب پاگل خانے میں پڑا ہوں.... اس پاکستانی کو ہسپتال سے فرار کرا کے میں نے کفّار کے خلاف جہاد کیا ہے اور جہاد ہر مسلمان کے ایمان کا جزو ہے"۔

ڈاکٹر رشید کی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ عبدالستار اور ڈاکٹر ولیم آ گئے۔ عبدالستار نے کہا کہ اور زیادہ یہاں بیٹھنا ٹھیک نہیں' اب چلنا چاہئے۔ مختصراً فرار کی بات ہوئی لیکن عبدالستار نے کہا کہ کل صبح ایک ملاقات اور ہو گی' باقی باتیں کل سہی! عبدالستار تینوں دوستوں کو ساتھ لے کر چلا گیا' ڈاکٹر ولیم ڈاکٹر رشید کے پاس رک گیا۔

ڈاکٹر

ڈاکٹر عبدالرشید کو آگرہ کے پاگل خانے سے فرار کرانے کے لئے تین تو اس کے دوست تھے' چوتھا ڈاکٹر ولیئم تھا' پانچواں عبدالستار تھا اور اسے پناہ دینے کے لئے اللہ تعالیٰ نے جالندھر کا ایک اثر و رسوخ والا چوہدری بھیج دیا تھا۔ ان سب کو پوری امید تھی کہ وہ ڈاکٹر رشید کو خیر و عافیت سے سرحد پار کرا دیں گے لیکن صغیر انڈیا کے ایک جنگلاتی اور پہاڑی علاقے میں تن تنہا چلا جا رہا تھا۔ یہ اس کی ہمت تھی' جذبہ اور حوصلہ تھا کہ وہ ایسے دشوار گزار علاقے میں یہ امید لگائے چلا جا رہا تھا کہ ایک نہ ایک دن سرحد تک پہنچ جائے گا اور پھر اس کا اپنا وطن اسے گود میں لے لے گا۔

کیا اس کے لئے یہ ممکن تھا؟.... اس کا عزم ایسا تھا جو ناممکن کو ممکن بنا دیا کرتا ہے لیکن قرائن اور دیگر احوال و کوائف اس کے خلاف تھے۔ کوئی رہنما نہ تھا' فاصلہ بہت ہی زیادہ تھا' وہ پاپیادہ اُس زمین پر چلا جا رہا تھا جس زمین پر چٹانیں اور ٹیکریاں اُبھری ہوئی تھیں' کوئی راستہ نہ تھا اور اسے یہ انتہائی کٹھن مسافت پیدل طے کرنی تھی۔

وہ دن ساون کی برسات کے دن تھے۔ آسمان پر کالی گھٹاؤں اور سفید بادلوں کے ٹکڑے منڈلاتے رہتے تھے جو کسی بھی لمحے اکٹھے ہو کر موسلادھار مینہ برساتے اور سارے جنگل کو جل تھل کر دیتے تھے۔ ندی نالے چڑھ جاتے اور چھوٹے موٹے درختوں کو جڑوں سے اکھاڑ کر اپنے ساتھ بہا لے جاتے تھے۔ راستے مسدود ہو جاتے اور صغیر جیسے مسافر کو سیلاب گزر جانے کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔

سب انسپکٹر سندر داس جب صغیر کی تلاش میں سنیاسیوں کے پاس آیا اور طاقت کی دوائی لے کر چلا گیا اُس وقت صغیر وہاں سے دو اڑھائی میل دور پہنچ چکا تھا۔ اب پولیس اس تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ سنیاسیوں کے بڑے مہنت کو افسوس ہو رہا تھا کہ

بڑا موٹا شکار ہاتھ سے نکل گیا۔

صغیر ان سنیاسیوں کا ہی شکار نہیں تھا' وہ انڈین انٹیلی جنس کا بھی شکار تھا اور سب انسپکٹر سندر داس کا بھی۔ وہ سب کو جُل دے کر نکل گیا تھا مگر ابھی وہ نکل کر کہیں بھی نہیں گیا تھا۔ وہ جس زمین پر چلا جا رہا تھا وہ ہموار اور میدانی نہیں تھی۔ چھوٹی بڑی چٹانیں' ہرے بھرے ٹیلے اور سرسبز ٹیکریاں اس کا راستہ روک رہی تھیں۔ ہر چند قدموں پر اسے دائیں یا بائیں مڑنا پڑتا تھا۔ اس نے دماغ کو حاضر رکھا' وہاں خطرہ یہ تھا کہ یوں دائیں بائیں مڑتے کہیں وہ پیچھے کو یا غلط سمت کو ہی نہ چل پڑے۔ اس نے سورج کو اپنا رہنما بنا رکھا تھا۔

اب وہ جس جنگل بیابان میں جا رہا تھا وہاں دور دور تک کوئی آبادی نہیں تھی اور جنگل اس لحاظ سے خطرناک تھا کہ وہاں کچھ درندے رہتے تھے۔ ایک تو بھیڑیے تھے جو چار چار چھ چھ کے گروہ میں گھومتے پھرتے رہتے تھے۔ دوسرے ریچھ تھے جو انسانوں اور کمزور جانوروں پر حملہ آور ہوتے اور چیر پھاڑ کر کھا لیتے تھے۔ ایک اور درندہ بھی تھا جو شیر کی نسل کا تھا' اسے جاگر کہتے ہیں۔ شکل و صورت اور رنگ وغیرہ بالکل شیر جیسا لیکن شیر کی طرح انسان پر حملہ آور نہیں ہوتا تھا۔ پہلے وہ اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرتا ہے لیکن خطرے کی صورت میں وہ شیر ہی کی طرح حملہ آور ہوتا اور چیر پھاڑ شیر جیسی ہی کرتا ہے۔ اس میں ایک وصف یہ ہے کہ درختوں پر چڑھ سکتا ہے۔ اس کی آواز شیر یعنی ٹائیگر سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ خر خر کی آواز نکالتا ہے۔ بہرحال یہ ایک خطرناک درندہ ہے پھر ایک اور جانور بھی تھا جو بظاہر بے ضرر لیکن ہجوم کی صورت میں خطرناک بھی ہو سکتا تھا۔ یہ تھے بندر جو سو سو ڈیڑھ ڈیڑھ سو کے غول میں جنگلوں میں گھومتے پھرتے رہتے تھے۔ اگر کوئی انسان ان کے کسی کام میں یا ان کی محفل میں خلل انداز ہو تو پھر بتایا نہیں جا سکتا کہ ان کا ردِ عمل اور جوابی حملہ کس قدر خطرناک ہو گا۔

صغیر نے اور تو کوئی درندہ نہ دیکھا' اسے بندروں کا ایک غول نظر آ گیا۔ اسے دیکھ کر بندر ایک درخت پر چڑھ گئے لیکن وہ بڑی غصیلی آوازیں نکالتے صغیر کو دیکھ رہے تھے۔ صغیر کو معلوم تھا کہ ہندوستان میں بندر کو ہلاک کرنا بہت بڑا گناہ ہے اور ہندو یہ گناہ معاف نہیں کیا کرتے۔ آبادیوں سے دور اس جنگل میں دیکھنے والا کوئی نہ تھا کہ صغیر نے ایک دو بندروں کو ہلاک کر ڈالا ہے لیکن اسے معلوم تھا کہ یہ اتنا بڑا غول جب

دیکھے گا کہ اس کے ایک دو ساتھیوں کو مار دیا گیا ہے تو وہ حملہ کر دے گا۔ بہرحال صغیر اس حقیقت سے آگاہ تھا کہ بندر وہی اچھا لگتا ہے جو مداریوں کے پاس ہوتا ہے۔

اسے ضرورت محسوس ہوئی کہ اس کے پاس اپنے بچاؤ کے لئے کوئی ہتھیار ہونا چاہیئے۔ جیب میں ایک لمبا چاقو تھا جو بوقتِ ضرورت فوراً نہیں نکالا جا سکتا تھا۔ صغیر کو گرا ہوا ایک درخت نظر آ گیا جو خاصی حد تک سُوکھ چکا تھا۔ صغیر نے ایک لمبی اور موٹی شاخ توڑی اور چاقو سے اس سے چھوٹی چھوٹی شاخیں کاٹ پھینکیں اور ایک لاٹھی بنا لی۔ یہ اتنی موٹی تھی کہ اس کی ایک زوردار ضرب کسی انسان یا کسی حیوان کے سر پر پڑتی تو اسے کچھ دیر کے لئے حواس باختہ کر سکتی تھی۔



سورج سر پر آ گیا تھا۔ گھٹاؤں اور بادلوں کے ٹکڑے بار بار سورج کے آگے آ کر اس کی تمازت کو کم کر رہے تھے۔ ویسے بھی اس علاقے میں گرمی بہت ہی کم تھی۔ زیادہ ہوتی تو بھی صغیر کو چلنا تھا اور اس علاقے سے جس قدر جلدی ہو سکتا، نکلنا تھا۔

چلتے چلتے وہ اچانک رک گیا۔ وہ دِلّی کی طرف جا رہا تھا۔ سنیاسیوں کے جس آدمی نے اسے خبردار کیا تھا کہ اس کی جان خطرے میں ہے، اس نے صغیر کو دِلّی کا راستہ بتایا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ کسولی تک پہنچ جائے تو وہاں سے اسے ریل گاڑی مل جائے گی جو دِلّی پہنچا دے گی۔

صغیر نے یہی راستہ بہتر سمجھا تھا۔ اس نے اپنا جائزہ لیا تھا۔ اسے یقین سا ہو گیا تھا کہ اب اس کی شناخت بہت مشکل ہو گئی ہے۔ داڑھی لمبی ہو گئی تھی اور سر کے بال بھی لمبے ہو گئے تھے۔ اس نے دو روز پہلے ایک سنیاسی کے کپڑے پہنے تھے۔ ایک پاجامہ تھا اور اوپر لمبا کرتہ۔ یہ کھدر کے کپڑے تھے اور ان کا رنگ جوگیا تھا۔ اس نے مذاق سے پندرہ سولہ موٹے منکوں والی ایک مالا گلے میں ڈال لی تھی۔ منکے مختلف رنگوں کے تھے۔ ایسی مالا جوگیوں اور مسلمانوں کے ملنگوں کے گلے میں دیکھی جاتی ہے۔

صغیر کو اس خیال نے روک لیا تھا کہ وہ کسولی سے ریل گاڑی پر سوار تو ہو جائے گا اور امید تو یہی ہے کہ اسے کوئی پہچان بھی نہیں سکے گا اور ریل گاڑی اسے دِلّی بھی پہنچا دے گی لیکن دِلّی جا کر وہ کرے گا کیا؟.... دِلّی جانے کا مطلب یہ تھا کہ وہ سرحد تک اپنا سفر اور زیادہ لمبا اور پُرخطر کر رہا تھا۔ وہاں سے دِلّی بہت ہی دور تھی۔ صغیر کی منزل سرحد تھی جسے پار کر کے پاکستان میں داخل ہونا تھا۔

سفر لمبا ہونے کے علاوہ دِلّی میں خطرہ بھی تھا۔ دِلّی انڈین انٹیلی جنس کا ہیڈ کوارٹر تھا اور وہاں کئی اور ہیڈ کوارٹر تھے۔ انٹیلی جنس کے متعدد آدمی صغیر کو جانتے تھے۔ خطرہ یہ تھا کہ اسے کوئی ایسا آدمی مل سکتا تھا جو اسے اچھی طرح جانتا پہچانتا ہو، وہ شخص صغیر کو اس حلئے میں بھی پہچان سکتا تھا۔

اس کے علاوہ ایک خطرہ پہچانے جانے کا اور بھی تھا۔ صغیر سے بہتر اور کون جانتا تھا کہ ہندوستان کی انٹیلی جنس کے پاکستانی ایجنٹ پاکستانی نوجوانوں کو ورغلا کر دِلّی پہنچا دیتے تھے۔ بظاہر مقصد سیر و سیاحت ہوتا تھا لیکن انہیں سبز باغ دکھا کر ایسی برین واشنگ کی جاتی تھی کہ ان میں سے بعض انڈین انٹیلی جنس کے ایجنٹ بن جاتے تھے۔ ان کی ٹریننگ دِلّی یا ایک مضافاتی مقام پر ہوتی تھی اور ان کے ذہنوں پر قبضہ مضبوط کرنے کے لئے انہیں خوب سیر سپاٹے کرائے جاتے تھے۔ ان میں سے کوئی پاکستانی نوجوان یا ایسا ہی کوئی اور آدمی صغیر کو اس حلئے میں بھی پہچان سکتا تھا۔

ان تمام پہلوؤں کو سامنے رکھ کر صغیر نے فیصلہ کیا کہ وہ دِلّی نہیں جائے گا۔ نہ جانے اسے پہلے یہ خیال کیوں نہ آیا کہ وہاں سے جالندھر دِلّی کی نسبت قریب ہے اور پھر جالندھر سرحد کے قریب ہے۔ دِلّی جانے کے لئے صغیر جنوب کی طرف جا رہا تھا۔ یہ فیصلہ بدلا تو اس نے اپنا رخ مغرب کی طرف کر لیا جدھر جالندھر تھا اور سرحد تھی۔

صغیر کو بھوک محسوس ہو رہی تھی لیکن اس نے اپنے آپ کو کنٹرول میں رکھا۔ اس جنگل میں بھوک سے نڈھال ہو جانے کا کوئی خطرہ نہیں تھا اور پانی نہ ملنے کا تو وہاں سوال ہی نہیں تھا۔ ساون کی وجہ سے پانی گدلا ضرور تھا لیکن وہاں تو یوں سمجھیں کہ پانی ہی پانی تھا۔

کچھ اور آگے گیا تو بندروں نے اس کی پیٹ پوجا کر دی۔ بہت سے بندر ایک درخت پر چڑھے ہوئے کوئی پھل کھا رہے تھے۔ صغیر ان سے ذرا پرے پرے جا رہا تھا کہ اس نے دیکھا کہ بندر جو پھل توڑ توڑ کر کھا رہے ہیں وہ نیچے بھی گر رہا ہے۔ صغیر درخت کے نیچے چلا گیا تو اس نے دیکھا کہ وہ سیب اور ناشپاتی جیسا کوئی پھل تھا۔ اس نے ایک سیب یا ناشپاتی یا یہ جو کچھ بھی تھا، اٹھا کر تھوڑا سا کھایا تو اسے یہ سیب لگا۔ اس نے پانچ سات سیب اٹھا کر جھولی میں ڈال لئے اور چل پڑا۔ اوپر سے بندروں نے اسے دیکھ لیا

اور بڑی غصیلی چڑچڑ جیسی آوازیں نکالیں۔ صغیر تیز قدم اٹھاتا کچھ دور گیا تو اسے اپنے پیچھے آہٹ سنائی دی۔ اس نے گھوم کے دیکھا تو دس بارہ بندر اس کے پیچھے آ رہے تھے اور بڑی غصیلی آوازیں نکال رہے تھے۔ وہ شاید صغیر سے کہہ رہے تھے کہ ہمارے سیب یہیں پھینک جاؤ۔ صغیر نے دماغ حاضر رکھا اور آگے کو چل پڑا۔ اسے خیال آگیا تھا کہ ان بندروں کو پتھر مارا یا لاٹھی گھما کر انہیں ڈرایا تو ایسا نہ ہو کہ درخت سے بھی ان کے ساتھی اُتر آئیں اور اس پر ہلّہ بول دیں۔ کچھ اور آگے گیا تو ایک ٹیکری آگئی جس کی ایک طرف سے گھوم کر صغیر بندروں کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

ان سیبوں نے صغیر کے جسم میں تازگی پیدا کر دی۔



ذرا ستانے کے لئے صغیر ایک درخت کی چھاؤں میں بیٹھ گیا۔ اسے غنودگی آنے لگی لیکن اسے نیند پر قابو پانے کی ٹریننگ ملی ہوئی تھی۔ وہ منزل پر پہنچنے تک بیدار رہنے کی کوشش میں تھا۔ سورج مغرب کی طرف چلا گیا تھا۔ کچھ دیر سستا کر صغیر اٹھا اور چل پڑا۔

کچھ دور جا کر وہ رک گیا۔ اچانک اس کے دل پر گھبراہٹ سی آگئی تھی جو بڑی تیزی سے خفقان کی صورت اختیار کر گئی۔ اس کا ذہن بھی کسی اور طرف چل پڑا۔ اسے ایسے لگا جیسے ذہن میں مایوسی سی پیدا ہو رہی ہو۔ اس نے مغرب کی طرف منہ کر لیا اور دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر آسمان کی طرف پھیلا دیئے۔

"صرف تیری ذات کا آسرا ہے اے خدائے ذوالجلال!" — اس نے بلند آواز میں اللہ سے کہا — "میں کس طرح یقین کروں کی تیری ذاتِ باری نے میرے اتنے کبیرہ گناہ معاف کر دیئے ہیں۔ میں توبہ کر کے اس سفر پر چلا تھا۔ ایک بار پھر توبہ کرتا ہوں۔ اپنے وطن سے غداری سے بڑھ کر اور کوئی جرم اور کوئی گناہ گھناؤنا اور کبیرہ نہیں ہو سکتا۔ اپنا یہ گناہ بخشوانے کے لئے میں اپنی جان بھی دینے کو تیار ہوں لیکن اللہ تبارک و تعالیٰ! مجھے اتنی سی مہلت دے دے کہ میں اپنے پاک وطن پہنچ کر ان گناہوں کا کفارہ ادا کر سکوں۔ میں کچھ غداروں کو سولی پر کھڑا کرنا چاہتا ہوں۔ گناہ نہیں کروں گا۔ مجھے آزما لے میرے پیدا کرنے والے! میری مدد کو آ اے خدائے بزرگ و برتر!"

اسے یہ سارا جنگل اور کچھ دور کھڑے پہاڑ دھندلے دھندلے سے نظر آنے لگے

جیسے وہ ان کے عکس پانی میں دیکھ رہا ہو۔ تب اسے پتہ چلا کہ اس کے آنسو بہہ رہے ہیں۔ اس نے کُرتے کے دامن سے آنسو پونچھ ڈالے۔

وہ لاٹھی ٹیکتا اور کبھی لاٹھی کو گھماتا آگے کو چل پڑا۔ علاقہ پہلے سے ذرا کم دشوار گزار ہو گیا تھا۔ ٹیلے اور ٹیکریاں اور چٹانیں ایک دوسری سے کچھ دور دور ہو گئی تھیں۔ اس سے صغیر کو یہ فائدہ ہُوا کہ چلنے میں سہولت پیدا ہو گئی اور بار بار دائیں بائیں مڑنا کم ہو گیا جس سے فاصلہ بھی گھٹتا گیا۔ دن اسی طرح چلتے چلتے گزرتا جا رہا تھا اور سورج اپنا سفر طے کر رہا تھا۔

سورج دور سامنے والی پہاڑی کی چوٹی کے قریب چلا گیا جب صغیر کو باتوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں وہ رک گیا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ اس کے سامنے لمبی چٹان تھی جس پر گھاس کی ایک پتی بھی نہیں تھی کیونکہ چٹان پتھریلی تھی۔ اس کے دائیں اور بائیں سے گزرا جا سکتا تھا۔

صغیر اس چٹان تک پہنچ گیا اور چٹان کی دوسری طرف سے اٹھتی ہوئی آوازیں سننے لگا۔ ان آوازوں میں عورتوں کی آوازیں بھی تھیں۔ صغیر نے پہلے تو یہ سوچا کہ یہ اس پہاڑی علاقے کے رہنے والے مزدور پیشہ لوگ ہوں گے اور اپنے بیوی بچوں کے ساتھ تلاشِ روزگار میں شہروں کی طرف جا رہے ہوں گے۔ پہاڑی علاقوں کے رہنے والے لوگ اسی طرح نقل مکانی کرتے ہی رہتے تھے۔

صغیر کو ایک دو بچوں کی آوازیں سنائی دیں۔ اس نے سوچا کہ ان غریب اور نادار لوگوں سے اسے کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا لیکن احتیاط پھر بھی لازمی تھی۔ وہ چٹان کے ایک طرف چل پڑا اور جہاں چٹان کی ڈھلان تھی وہیں آگے جانے کو راستہ بھی تھا' صغیر ڈھلان پر لیٹ گیا اور آہستہ آہستہ اوپر کو رینگنے لگا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ کون لوگ ہیں۔

اسے بڑی اچھی طرح نظر آگیا۔ وہ خانہ بدوش تھے۔ اس چٹان سے آگے ٹیکریوں اور چٹانوں میں گھری ہوئی خاصی کشادہ جگہ تھی جس کے ایک طرف چھوٹا سا تالاب تھا۔ اس میں پانی بھرا ہُوا تھا۔ باقی جگہ ہموار تھی جہاں خانہ بدوشوں نے پانچ چھ خیمے لگا رکھے تھے۔ یہ عام خیموں کی طرح مخروطی نہیں تھے۔ ان کی ساخت کچھ اور ہی تھی۔ لمبے لمبے بانسوں کو لمبائی کے رخ کاٹ کر ہر ٹکڑے کو نیم دائرے کی شکل میں دوہرا کیا ہُوا تھا اور

هر ٹکڑے کو دونوں سروں سے زمین میں گاڑا ہُوا تھا۔ اوپر بوسیدہ سے ترپال اور موٹے کپڑے ڈال کر خیمے بنا لئے گئے تھے۔

بارہ چودہ آدمی تھے' کچھ اتنی ہی جوان اور ایک دو بوڑھی عورتیں تھیں اور کچھ بچے تھے۔ ایک طرف چھ سات گدھے بھی بندھے ہوئے تھے۔

ان لوگوں کو بے ضرر جان کر صغیر سرکتا ہُوا چٹان سے اُترا اور ایک طرف سے گزر کر آگے چلا گیا۔ خانہ بدوش اپنے اپنے کاموں میں اور گپ بازی میں لگے رہے۔

"اولک نرنجن!" — صغیر نے جوگیوں اور سادھوؤں کی طرح صدا لگائی — "رام بھلی کرے گا.... اوم اوم سچ ہے.... رام بھلی کرے گا"۔

تمام خانہ بدوشوں نے اس طرف دیکھا اور سب خاموش ہو گئے۔ صغیر نے ہاتھ اوپر اٹھایا جیسے انہیں آشیرباد دی ہو۔

"آؤ جوگی مہاراج!" — ایک خانہ بدوش نے اٹھ کر کہا — "دھنے واد.... آؤ' آؤ.... یہاں براجیو"۔

صغیر کو یہ دیکھ کر اطمینان ہُوا کہ یہ لوگ اسے جوگی اور سادھو ہی سمجھے ہیں اور انہوں نے اسے شکی نگاہوں سے نہیں دیکھا۔ صغیر کو یہ سوچ بھی آگئی کہ اسے یہ وہم ذہن سے نکال دینا چاہئے کہ اس پر کوئی شک کرے گا۔ اس کی بجائے وہ ساری توجہ اپنی ایکٹنگ پر مرکوز رکھے اور حرکتوں اور باتوں سے یہ تاثر پیدا کئے رکھے کہ وہ تارک الدنیا سادھو ہے۔

"جوگی اپنے من کی موج میں جا رہا ہے" — صغیر نے کہا — "مت روکو جوگی کو۔ ایسا نہ ہو کہ ہنومان بھی گزر جائیں اور ران کا یہ جوگی بالکا پیچھے رہ جائے.... پر دو گھونٹ پانی کے لئے جوگی ضرور رکیں گے"۔

وہ جنگلوں میں رہنے والے توہم پرست خانہ بدوش تھے' تہذیب و تمدن سے بہت دور زندگی بسر کرنے والے!.... وہ یوں اٹھ کھڑے ہوئے جیسے یہ جوگی آسمان سے اترا ہو۔ صغیر نے اپنے انداز میں ایسا تاثر پیدا کر لیا تھا جیسے اسے ان خانہ بدوشوں کے ساتھ اور اس دنیا کے ساتھ کوئی دلچسپی نہ ہو۔

دو بوڑھے خانہ بدوش اور چار پانچ آدمی صغیر کے پاس آئے اور التجائیں کرنے لگے کہ جوگی مہاراج کچھ دیر ان کے پاس بیٹھ کر ان پر کرم کریں۔

صغیر نے یوں آنکھیں چڑھا لیں جیسے اس پر خمار طاری ہو رہا ہو اور وہ یوں ان کے ساتھ چل پڑا جیسے ان کی خواہش پوری کرنا چاہتا ہو۔ خانہ بدوش اسے ایک خیمے میں لے گئے اور حقہ اس کے آگے کر دیا۔ صغیر سگریٹ تو پیا کرتا تھا لیکن بہت کم۔ وہ انڈین انٹیلی جنس کا بڑا پکا اور تجربہ کار ایجنٹ تھا۔ اسے ٹریننگ دی گئی تھی کہ کسی نشے کو عادت نہیں بنانا کیونکہ نشہ ہر جگہ نہیں مل سکتا اور بعض ایجنٹ صرف نشے کے عوض اپنا راز فاش کر دیتے ہیں۔ صغیر نے اس ٹریننگ کے مطابق سگریٹ نوشی کو عادت نہیں بنایا تھا۔ اس نے سگریٹ کا آخری کش شملہ سے فرار سے کچھ دیر پہلے لگایا تھا۔

اب حقہ اس کے سامنے آیا تو اسے تمباکو نوشی کی طلب محسوس ہوئی لیکن اس نے سر ہلا کر ہاتھ سے اشارہ کیا کہ حقہ اس کے آگے سے ہٹا لو۔ صغیر کو یہ شک ہُوا تھا کہ یہ لوگ حقے میں تھوڑی سی چرس ڈال کر پیتے ہیں اور سب لوگ جانتے ہیں کہ جوگی' سادھو اور سنیاسی بھی چرس کے عادی ہوتے ہیں۔ صغیر نے شراب بہت پی تھی لیکن چرس اور افیون جیسا نشہ کبھی نہیں کیا تھا۔ اس نے اب حقے کی طلب پر قابو پا لیا اور اپنے سامنے سے حقہ ہٹوا دیا۔ اسے پوری طرح ہوش میں رہنا تھا اور یہ جائزہ لینا تھا کہ یہ لوگ کس حد تک سادہ اور پسماندہ ہیں۔ سورج پہاڑی کے پیچھے چلا گیا تھا اور جنگل کی شام دھندلی ہوتی جا رہی تھی۔ صغیر نے ان ہی لوگوں کے ساتھ رات گذارنے کی سوچی لیکن انہیں اعتماد میں لئے بغیر ان کے ساتھ رہنا مناسب نہیں سمجھتا تھا۔

عورتیں بھی خیمے کے سامنے آ کر بیٹھ گئی تھیں اور صغیر کو اشتیاق سے دیکھ رہی تھیں۔

"جوگی مہاراج!" — خیمے کے دروازے میں بیٹھی ایک بوڑھی عورت نے کہا — "کیا آپ ہاتھ دیکھ کر آنے والے دنوں کی کوئی بات بتا سکتے ہیں؟"

"مہاراج!" — ایک بوڑھا بولا — "اس کا ایک بیٹا ایک مہینے سے لاپتہ ہے۔ اس کا کوئی کھرا کھوج ملا ہی نہیں ملا"۔

"تو نے اس کا کوئی نام تو رکھا ہو گا مائی!" — صغیر نے مخموری سی آواز میں کہا — "کب جنا تھا اُسے؟ کتنے برس ہو گئے ہیں؟"

"بھولا رام اس کا نام ہے جوگی مہاراج!" — بڑھیا نے کہا — "اس کی عمر اٹھائیس برس ہو گی"۔

"پر وہ کوئی ایسا بھولا تو نہیں" — صغیر نے کہا — "شہر کی ہوا لگ گئی ہے..... ہر بار
جاننے کے لئے ایک گھڑی ہوتی ہے۔ بھولا رام کا ستارہ رات دیر سے اوپر آئے گا۔ پر
بتاؤں گا۔ اگر تیرا دل پر چانا ہوتا تو کہہ دیتا' مائی غم نہ کر تیرا بیٹا آجائے گا..... صبح بتاؤں گا
پر یہ ہمارے من کی موج ہے کہ رات ادھر ٹھہریں گے یا نہیں"۔

اِس بڑھیا کے ساتھ کئی اور آوازیں آئیں کہ مہاراج' آج رات ادھر ہی
گذارو۔

صغیر نے دیکھا کہ اس کے سامنے ترپال کا ایک ٹکڑا پڑا تھا اور اس پر کم و بیش چھ
انچ لمبی سُوئی پڑی تھی جس کے ناکے میں موٹا دھاگہ تھا۔ ترپال کے دو ٹکڑوں کو اس
موٹی اور لمبی سُوئی سے سیا جا رہا تھا۔ صغیر کے دماغ میں ایک بات آگئی۔ اس کے پاس جو
چاقو تھا اسے اس نے مقناطیس پر اتنا زیادہ رگڑا ہُوا تھا کہ لوہے کے چھوٹے سے ٹکڑے
کو ایک دو انچ دور سے ہی کھینچ لیتا اور اپنے ساتھ چپکا لیتا تھا۔ صغیر نے یہ معلوم کرنے
کے لئے کہ یہ لوگ کس حد تک جنگلی ہیں' چاقو جیب سے نکالا اور اسے کھولا۔

"ادھر آ مائی!" — صغیر نے گمشدہ بیٹے کی ماں کو اپنے پاس بلایا۔ وہ آئی تو صغیر نے
اسے اپنے سامنے بٹھا کر کہا — "اپنے بیٹے کا نام دل میں رکھ کر دائیں ہاتھ کی دو انگلیاں
چاقو کے پھل پر پھیر"۔

اس بوڑھی عورت نے اپنے دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی اور درمیان والی انگلی
چاقو کے پھل کی چوڑائی کی طرف ایک مرتبہ پھیری اور صغیر نے چاقو پیچھے ہٹا لیا۔ پھر
اس نے اوپر دیکھا اور چاقو بلند کر کے اس کی نوک ہوا میں یوں بائیں سے دائیں پھیری
جیسے ہوا میں کچھ لکھا ہو۔

"بھولے!" — صغیر نے بلند آواز سے پوچھا — "اپنی ماں کے پاس واپس آئے گا؟
تیرے من میں ماں کا پیار ہے یا نہیں؟"

صغیر نے دیکھ لیا تھا کہ سُوئی کہاں رکھی ہے۔ اس سے ایک دو ہاتھ ہی دور تھی۔
صغیر نے اوپر دیکھتے ہوئے چاقو کو ایک دو مرتبہ دائیں بائیں ہلایا اور اپنی نظریں اوپر ہی
رکھ کر چاقو نیچے لے گیا اور اس طرح چاقو سُوئی تک جا پہنچا۔ سُوئی ٹھک کی آواز پیدا
کرتی چاقو کے پھل کے ساتھ چپک گئی۔ صغیر نے چونک کر ادھر دیکھا۔

صغیر کو یہ تو معلوم تھا کہ سُوئی چاقو کے ساتھ لگ جائے گی اس لئے اس نے سوئی

کی طرف توجہ نہ دی بلکہ ان خانہ بدوشوں کا ردِ عمل دیکھنے لگا۔ جونہی سُوئی چاقو کے پھل
کے ساتھ لگی تو اسے خانہ بدوشوں کی دبی دبی آوازیں سنائی دیں جیسے وہ سب حیرت زدہ
ہو گئے ہوں۔

"پیار ہے مائی!" — صغیر نے کہا — "نہ ہوتا تو یہ سُوئی چاقو کو اپنی ماں سمجھ کر اس
کے ساتھ نہ لگتی۔ اب یہ کل بتائیں گے کہ تیرا بیٹا کب تک آجائے گا"۔

صغیر نے ان خانہ بدوشوں کے چہروں کو خاص طور پر دیکھا جو خاصی عمر کے ہو گئے
تھے۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ یہ جنگل میں ہی پیدا ہوئے اور جنگل میں بوڑھے ہو گئے ہیں۔
انہیں مقناطیسی قوّت کا کچھ علم نہیں۔ صغیر مطمئن اور مسرور ہو گیا۔ اس کا مسئلہ صرف
یہ تھا کہ رات گذارنی تھی۔

بوڑھے خانہ بدوشوں نے صغیر سے پوچھا کہ مہاراج کھائیں گے کیا..... صغیر نے
ان سے پوچھا کہ وہ کیا کھاتے ہیں۔

"ہماری کیا پوچھتے ہیں جوگی مہاراج!" — ایک بوڑھے نے جواب دیا — "زمین پر
کوئی ہلتی جلتی رینگتی چیز نظر آئے ہم پکا کر کھا لیتے ہیں۔ سانپ مل جائے تو اس کا سر کاٹ
کر پھینک دیتے ہیں اور باقی سانپ پکا کر کھا لیتے ہیں۔ اپنا کوئی گدھا یا گدھی مرنے لگے
تو اس کی گردن کاٹ کر اور کھال اتار کر کھا لیتے ہیں۔ خرگوش اور گیدڑ تو ہماری عام غذا
ہے..... مہاراج بتائیں کیا کھانا پسند کریں گے"۔

"ہم اپنی مرضی پسند سے کچھ نہیں کھا سکتے" — صغیر نے جھومتی ڈولتی آواز میں
کہا — "جو اوپر سے حکم آتا ہے ہم وہ کھاتے ہیں..... تمہارے پاس کوئی دال ہو تو وہ پکا
دیں اور ساتھ دو روٹیاں"۔

صغیر کو حلال اور حرام کا خیال تھا۔ بھوک ستا رہی تھی اور صرف دال ہی تھی جو
حلال تھی۔ صغیر کی پسند سنتے ہی بوڑھے نے عورتوں کو حکم دیا کہ فوراً چنے کی دال بڑی
احتیاط اور محنت سے پکائیں اور ساتھ دو پراٹھے پکا دیں۔

صغیر نے جب دیکھا کہ یہ لوگ تو بالکل ہی جنگلی ہیں تو اس نے زبان کا کچھ اور جادو
چلایا۔ وہ لوگ تو صغیر کو اوتار سمجھنے لگے۔ اس نے ان خانہ بدوشوں سے کہا کہ اسے
رات یہاں رکھنا ہے تو اس کے لئے علیحدہ خیمہ ہونا چاہئے کیونکہ رات کو اسے بھی
معلوم نہیں کہ کیسی کیسی چیزیں اس کے پاس آئیں گی۔

خانہ بدوشوں کے پاس کچھ بانس الگ پڑے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے
چھوٹا سا خیمہ صغیر کے لئے تیار کر دیا۔ اس خیمے میں صغیر نے کھانا کھایا اور خانہ بدو
نے اسے بکریوں کا دودھ پلایا۔

○

سحر ابھی تاریک تھی جب صغیر کی آنکھ کھلی۔ اس نے خیمے سے نکل کر دیکھا۔
بدوش بڑی گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ انہیں جاگنے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ صغیر
سامنے بڑا لمبا اور بڑا ہی دشوار سفر تھا۔ وہ چل پڑا۔ اس کا رخ اس کے اپنے اندازے
مطابق جالندھر کی طرف تھا۔ اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ جالندھر بہت دُور ہُوا تو بھی
سو کلومیٹر سے زیادہ نہیں ہو گا لیکن پیدل تو جالندھر ڈیڑھ ہزار کلومیٹر سے بھی دور
تھا۔

دور تھا یا قریب، اسے بہرحال جالندھر پہنچنا تھا۔ اس کے ہاتھ میں لاٹھی اور ج
میں چاقو تھا۔

علم نفسیات کی آنکھ سے دیکھا جائے تو صغیر جیسے افراد بڑے دلچسپ لوگ ہو
ہیں ان کا آئی کیو (ذہانت) اوسط درجہ لوگوں سے اونچا یعنی خاصا بہتر ہوتا ہے لیکن
لوگ ذہنی طور پر نارمل نہیں ہوتے۔ اپنے آپ کو اپنے ملک اور اپنی قوم کے خلا
غداری کے لئے تیار کرنا اور پھر اپنے دین اور اپنے ملک کے دشمن کے ہاتھوں میں کھ
ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ وہ خاص قسم کے ذہن کے لوگ ہوتے ہیں جو ا
فروشی میں فخر محسوس کرتے ہیں۔

صغیر ایسا ہی ابنارمل ذہن کا آدمی تھا۔ وہ تو پکا غدار اور دشمن کا ایجنٹ اور بڑا
سرگرم ایجنٹ بنا ہُوا تھا لیکن جذباتی جھٹکا پڑا تو فوراً اپنے مقام پر واپس آ گیا اور غدار
لعنت بھیج کر اپنے آپ کو اس اذیت اور غیر یقینی صورتِ حال میں ڈال دیا جس میں
وہ گزر رہا تھا اور روح کی طاقت استعمال کر کے بھی اس صورتِ حال سے نکلنے کی کوش
کر رہا تھا۔

انبالہ میں اس نے دیکھا کہ ایک لڑکی عصمت فروشوں کے جال میں آئی
تڑپ رہی ہے اور وہ اپنی عصمت کو داغ دار ہوتا نہیں دیکھ سکتی۔ صغیر سے اس
ملاقات ہوئی۔ صغیر تو خود بہت بڑی اور خطرناک مصیبت میں پھنس گیا تھا لیکن اس

اپنے انجام کو نظرانداز کر کے اس لڑکی کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھا اور پھر اپنے آپ کو
خطرے میں ڈال کر لڑکی کو ایک باعزت ٹھکانے پر پہنچا دیا۔

اس نے یہی حرکت شملہ سے بھاگ کر جنگل میں کی کہ ایک لڑکی جو ڈاکوؤں سے
بھاگ آئی تھی، اسے ساتھ لے کر چل پڑا اور بہت بڑا خطرہ مول لے لیا۔ یہ تھی تو بہت
بڑی نیکی لیکن نارمل ذہن کے لوگ ایسی نیکی کم ہی کیا کرتے ہیں۔ جو شخص خود مصیبت
میں پھنسا ہُوا ہاتھ پاؤں مار رہا ہو، اسے تو اپنے خون کے سگے عزیزوں کی بھی ہوش نہیں
ہوتی لیکن صغیر پولیس مقابلے پر اُتر آیا اور اللہ نے اسے وہاں سے نکال دیا۔

اب جس طرح اس نے خانہ بدوشوں کو اُلّو بنایا، اس سے صغیر کی ذہانت کا اندازہ
ہوتا ہے۔ اس نے بڑے آرام سے رات بسر کر لی اور اپنے میزبانوں کی نگاہوں میں
اوتار کا رتبہ بھی حاصل کر لیا۔

وہ اپنے آئی کیو یعنی ذہانت کو نہایت عقلمندی سے استعمال کر رہا تھا لیکن یہ کوئی
معمولی کام نہیں تھا بلکہ ایک غیر معمولی کارنامہ تھا۔ دینی اور روحانی نظر سے دیکھا جائے تو
اللہ تبارک و تعالیٰ اس کی پوری پوری مدد کر رہا تھا۔ صغیر اپنی توبہ پر قائم تھا۔ اس نے
اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دیا تھا۔

○

سورج طلوع ہُوا تو وہ خانہ بدوشوں کے ڈیرے سے بہت دور جا چکا تھا۔ خانہ بدوش
جاگے تو دو تین آدمی سب سے پہلے اس چھوٹے سے خیمے میں گئے جہاں اُن کا جوگی
مہاراج سویا تھا۔ وہ انہیں نظر نہ آیا۔ انہوں نے دوسروں کو بتایا۔ خانہ بدوشوں کے
بزرگوں نے کہا کہ ابھی واپس آ جائیں گے، ندی میں اشنان کرنے گئے ہوں گے۔ بہت
وقت گزر گیا تو خانہ بدوش مایوس ہو گئے۔ ان پر مردنی طاری ہو گئی۔

ایک بوڑھے خانہ بدوش نے کہا کہ یہ جوگی واقعہ ہی اوتار تھا۔ اس کا ان کے
ڈیرے پر آنا بڑا اچھا شگون ہے۔ ان سب میں زیادہ پریشان وہ عورت تھی جس کا بیٹا
لاپتہ ہو گیا تھا۔ صغیر نے اسے کہا تھا کہ صبح بتائے گا کہ اس کا بیٹا کہاں ہے اور کب واپس
آئے گا۔ بوڑھے خانہ بدوشوں نے اس عورت سے کہا کہ جوگی مہاراج اشارہ دے گئے
ہیں کہ اس کا بیٹا واپس آ جائے گا۔ اسے نہ آنا ہوتا تو سُوئی چاقو کے ساتھ اُچھل کر نہ
چپکتی۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ بیٹا واپس آ کر ماں کے گلے لگ جائے گا۔

خانہ بدوش جب صغیر کی واپسی سے مایوس ہو کر اس کی باتیں ایک دوسرے کو سنا رہے تھے اُس وقت صغیر ان سے بہت دُور نکل گیا تھا۔ وہ جس علاقے میں جا رہا تھا وہ کچھ زیادہ ہی دشوار گذار ہو گیا تھا۔ وہاں پھر وہی خطرہ صغیر کو نظر آنے لگا کہ ایسا نہ ہو کر ٹیکریوں' ٹیلوں اور چٹانوں سے مڑتا گھومتا کہیں پیچھے کو ہی نہ چل پڑے۔ اس نے اپنا دماغ حاضر رکھا۔

بھوک پھر ستانے لگی تھی۔ ایک دو درختوں نے اس کے پیٹ کا تنور ٹھنڈا کر دیا۔ وہ ترو تازہ ہو کر چلتا گیا اور آدھا دن گزر گیا۔

کچھ اور فاصلہ طے کر لیا تو جس طرح اسے گذشتہ روز خانہ بدوشوں کی باتیں سنائی دی تھیں اسی طرح اسے ایک گھوڑے کے دوڑتے ٹاپ سنائی دینے لگے جو آگے ہی آگے بڑھتے آ رہے تھے۔ یہاں بھی صغیر کے سامنے اونچی ٹیکریاں تھیں جن پر ہری بھری گھاس کھڑی تھی اور درخت بھی تھے۔ صغیر دوڑ کر سامنے والی ٹیکری پر چڑھ گیا اور اونچی گھاس میں بیٹھ کر اُس طرف دیکھنے لگا جس طرف سے گھوڑے کے ٹاپ بڑھے آ رہے تھے۔

صغیر نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ ایک آدمی جس کے سر پر سفید پگڑی تھی اور اس نے فراک کوٹ پہن رکھا تھا' ایک گھوڑے پر سوار تھا' گھوڑا سرپٹ دوڑا آ رہا تھا اور اس کے تعاقب میں ایک ریچھ تھا۔ ریچھ کے دوڑنے کی رفتار شیر جیسی نہیں ہوتی۔ ریچھ گھوڑے جتنا تیز بھی نہیں دوڑ سکتا لیکن یہ ریچھ گھوڑے کے بالکل قریب پہنچ گیا تھا۔ سوار گھبراہٹ کے عالم میں کبھی پیچھے دیکھتا اور کبھی زور زور سے گھوڑے کی باگ ہلاتا اور ایڑ لگاتا تھا۔

ریچھ صرف اس وجہ سے گھوڑے تک پہنچ گیا تھا کہ یہ گھوڑا مریل سی قسم کا کمزور گھوڑا تھا جس سے دوڑا بھی نہیں جا رہا تھا۔ یہ تو ریچھ کا ڈر تھا کہ گھوڑا ذرا تیز دوڑ رہا تھا لیکن صاف نظر آتا تھا کہ تھوڑی ہی دور جا کر گھوڑا تھک جائے گا اور رک جائے گا پھر ریچھ اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔

یہ منظر دیکھ کر صغیر کے ابنارمل ذہن میں انسانی ہمدردی بیدار ہو گئی یا فطرت کے مطابق اس نے گھوڑے اور اس کے سوار کو ریچھ سے بچانے کا عزم کر لیا۔ عجیب بات تو یہ تھی کہ ریچھ گھوڑے کے تعاقب سے ہٹ ہی نہیں رہا تھا۔ یہ ریچھ کی فطرت کے

خلاف تھا۔ شیر اور بھیڑیئے وغیرہ شکار کے پیچھے اس طرح دوڑا کرتے ہیں کہ اسے پکڑ کر ہی دم لیتے ہیں۔ ریچھ عموماً آسان شکار میں دلچسپی رکھتا ہے۔

صغیر نے دیکھا کہ ریچھ کے پیچھے دو چھوٹے چھوٹے بچے دوڑے آ رہے تھے۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ ریچھ گھوڑی کے پیچھے کیوں لگا ہُوا ہے۔ سوار اس ریچھ کے گھر کے قریب سے گزرا ہو گا۔ بچوں والی مادہ کیسی ہی کمزور نسل کی حیوان ہو' قریب سے گزرنے والے کے لئے شیر بن جاتی ہے۔ ریچھ تو کوئی کمزور جانور نہیں تھا' درندہ بھی تھا۔ اپنے بچوں کے لئے کوئی شکار بھی مارنا چاہتا تھا۔

گھوڑے اور ریچھ کو دو چار منٹ میں آگے نکل جانا تھا پھر صغیر اپنی راہ لگ جاتا لیکن صغیر کی وہی رگ بیدار ہو گئی جو انبالہ میں بیدار ہوئی تھی اور پھر سنیاسیوں کے ہاں بیدار ہوئی۔ اس کے خون میں ابال آیا اور وہ یہ عزم کر کے اٹھ کھڑا ہُوا کہ اس سوار کو ریچھ سے بچائے گا۔ ریچھ گھوڑے تک تقریباً پہنچ گیا تھا اور کمزور سے گھوڑے کی رفتار گھٹتی جا رہی تھی۔

گھوڑے اور ریچھ کو اس ٹیکری کے قریب سے گزرنا تھا۔ صغیر دوڑتا ہُوا ٹیکری سے اترا اور ذرا آگے ہو گیا۔ سوار نے اسے دیکھ لیا۔

"ہے بھائی!" — سوار نے صغیر کو دیکھ کر آواز بلند کی — "اس ریچھ سے بچاؤ.... بھگوان تیری بھلی کرے.... بچالو بھائی تم بچالو"۔

صغیر نے لاٹھی تان لی اور ذرا آگے ہو گیا۔ چند سیکنڈ بھی نہیں گزرے ہوں گے کہ گھوڑا اس کے قریب سے گزرا اور ریچھ گھوڑے سے تین چار قدم پیچھے تھا۔ صغیر نے پوری طاقت سے لاٹھی ریچھ کے سر پر ماری۔ ریچھ تیورا کر ایک طرف مڑا اور اس کی اگلی ٹانگیں دوہری ہو گئیں۔ گھوڑا آگے نکل گیا۔

صغیر آگے بڑھا کہ ریچھ کے سر پر ایک اور لاٹھی مارے لیکن ریچھ بڑی جلدی سنبھل گیا اور اگلی ٹانگیں اٹھا کر صغیر پر حملہ کر دیا۔ صغیر کو اس کارنامے کا ذرا سا بھی تجربہ نہ تھا جو وہ کرنے پر تل گیا تھا۔ وہ ریچھ تھا کوئی آدمی نہیں تھا۔ صغیر دوسری لاٹھی ٹھیک طرح نہ چلا سکا اور ریچھ کا پنجہ بچاتے بچاتے صغیر کے کندھے پر پڑا۔ صغیر پیچھے ہٹ گیا لیکن ریچھ کے پنجے نے نہ صرف یہ کہ اس کے کُرتے کی آستین پھاڑ ڈالی تھی بلکہ اس کے بائیں بازو کی کھال بھی ادھیڑ لی۔

صغیر نے ہمت نہ ہاری۔ اب اس نے لاٹھی اچھی طرح سنبھال لی اور لاٹھی گھما کر ریچھ کی طرف گیا۔ ریچھ بھاگ نکلا۔ اس کے بچے قریب آ گئے تھے۔ بچے اس کے پیچھے دوڑے۔

صغیر نے اپنا بایاں بازو دیکھا تو خون کے فوارے پھوٹ رہے تھے۔ پھر اس نے سوار کو دیکھا جو دور جا کر گھوڑے کو پیچھے موڑ رہا تھا۔ صغیر اس کی طرف چل پڑا لیکن صغیر نے دیکھ لیا کہ گھوڑا ڈر کر ایسا بدکا ہے کہ سوار کے قابو سے نکلا جا رہا ہے۔ سوار کے اشارے پر گھوڑا مڑ تو جاتا تھا لیکن رکتا نہیں تھا۔ صغیر اس کی طرف دوڑ پڑا۔

گھوڑا ایک چکر میں آیا تو صغیر اس کے راستے میں جا کھڑا ہُوا۔ گھوڑا قریب آیا تو صغیر اس کے ساتھ دوڑا اور گھوڑے کی لگام پکڑ لی۔ اگر گھوڑا پوری طرح صحت مند اور طاقتور ہوتا تو صغیر کو ساتھ ہی گھسیٹ لے جاتا لیکن وہ گھوڑا نہیں بلکہ گھوڑی تھی اور کمزور۔ صغیر کی ہمت سے یہ مریل سی گھوڑی رک گئی اور سوار کُود کر اُترا۔ گھوڑی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ ریچھ اس منظر سے غائب ہو گیا تھا۔

سوار جو شکل و صورت' ڈیل ڈول اور لباس سے اونچی حیثیت کا آدمی لگتا تھا' صغیر کے ساتھ لپٹ گیا۔ صغیر کے بازو سے بہتے ہوئے خون نے اس شخص کے کپڑے بھی لال کر دیئے جس کی اس معزز آدمی نے پرواہ نہ کی۔ وہ تو صغیر کی بلائیں لے رہا تھا کہ اس نے اسے خونخوار ریچھ سے بچایا تھا۔

"کون ہو بھائی!" — سوار نے صغیر سے پوچھا — "کہاں کے رہنے والے ہو اور کہاں جا رہے ہو؟"

"اچھا ہُوا آپ بچ گئے" — صغیر نے مسکراتے ہوئے کہا — "گھوڑی پر ریچھ کا ہاتھ پڑ جاتا تو سب سے پہلے گھوڑی آپ کو گراتی اور پھر ریچھ کا شکار ہوتی۔ ریچھ اسے چھوڑ کر آپ پر حملہ کر سکتا تھا"۔

یہ بات تو سوار خود بھی جانتا تھا۔ اس نے صغیر کے بائیں بازو کا زخم دیکھنا شروع کر دیا۔ صغیر کی بات تو وہ جیسے سن ہی نہیں رہا تھا۔

"تم کوئی مہنت یا جوگی لگتے ہو" — سوار نے کہا — "یا شاید تم نے یہ جوگیا کپڑے اور گلے میں مالا ویسے ہی شوقیہ ڈال رکھی ہو۔ تم جو کوئی بھی ہو اور جہاں کہیں بھی جا رہے تھے' میں تمہیں اپنے گھر لے جاؤں گا اور یہ زخم ٹھیک ہونے تک گھر سے رخصت نہیں ہونے دوں گا.... چلو میری گھوڑی پر بیٹھو"۔

صغیر نے دیکھا کہ یہ کوئی جنگلی آدمی نہیں نہ خانہ بدوش ہے' یہ کسی گاؤں کا رہنے والا ہو گا۔ کیا صغیر کو یہ خطرہ مول لینا چاہئے یا نہیں لیکن اس نے جب زخم دیکھا اور پھر خون کا بہاؤ دیکھا تو اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ اس شخص کے ساتھ چلا جائے اور خون رکنے کا کوئی بندوبست ہو جائے۔ بہتے خون سے اپنے سفر کو جاری رکھنا خودکشی کے برابر تھا۔

"میرا نام پنڈت رمیش چندر ہے" — سوار نے کہا — "میں تمہیں اپنی جان کی قیمت دوں گا.... فوراً گھوڑی پر سوار ہو جاؤ"۔

پنڈت رمیش چندر نے صغیر کا زخم دیکھا۔ یہ گہری خراشیں تھیں جو کندھے سے کہنی تک چلی گئی تھیں۔ اس نے فوراً اپنی پگڑی اتاری۔

"خون بڑی تیزی سے جا رہا ہے" — پنڈت رمیش چندر نے پگڑی صغیر کے زخموں پر کس کر لپیٹتے ہوئے کہا — "ٹھیک طرح پٹی ہونے تک خون رکنا چاہئے"۔

اس نے اپنی ساری پگڑی صغیر کے زخموں پر بڑی زور سے لپیٹ دی اور صغیر گھوڑی پر سوار ہو گیا۔

جب وہ وہاں سے چلے تو پنڈت نے ایک بار پھر صغیر سے پوچھا کہ وہ کہاں کا رہنے والا ہے اور اس جنگل بیابان میں کدھر جا رہا تھا۔

"مت پوچھو پنڈت جی!" — صغیر نے کہا — "یہی سمجھو کہ بھگوان نے مجھے آپ کو اس خونخوار ریچھ سے بچانے کے لئے ادھر بھیجا تھا.... سچ پوچھتے ہو تو بتاتا ہوں کہ میں کہیں کا بھی رہنے والا نہیں۔ کچھ عرصے سے اشارے مل رہے تھے کہ انسانوں کی بستی سے نکلو اور کہیں جنگل میں جا ٹھکانہ کرو۔ وہاں تمہیں پرمیشور ملے گا۔ میں نے اپنی جوانی کو مار ڈالا ہے پنڈت جی! پرمیشور کو ڈھونڈتا پھر رہا ہوں"۔

"تمہیں پرمیشور مل گیا ہے" — پنڈت رمیش چندر نے کہا — "تم جانتے ہو یہ حکم کس کا ہے' کر بھلا سو ہو بھلا.... تم نے میری جان بچانے کے لئے اپنی جان دے دی تھی۔ عیسائیوں کا خدا ہو' مسلمانوں کا اللہ ہو یا ہمارا پرمیشور ہو' سب کا یہی حکم ہے کہ بندوں سے پیار کرو اور بندوں کا بھلا کرو"۔

پنڈت رمیش چندر پر تو ایسا تاثر طاری تھا جیسے وہ مُردوں سے اٹھا اور زندہ ہو گیا

ہو۔ اس کی گھوڑی اب امن اور اطمینان سے چل رہی تھی جیسے اس نے ریچھ کا خوف جھٹک ڈالا ہو لیکن وہ خود ابھی تک ریچھ کا خوف اپنے دل پر لئے ہوئے تھا۔

خانہ بدوشوں نے صغیر کو اوتار کا درجہ تو دیا ہی تھا' اس پنڈت نے بھی صغیر کو اوتار سمجھ لیا۔ صغیر اس کی ہر بات کا جواب ایسے انداز سے دیتا تھا جیسے اس دنیا سے نفرت ہو اور اپنی جان اور ذات کی پرواہ تک نہ ہو۔ اس کا دماغ بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ سوچ یہ پریشان کر رہی تھی کہ پولیس سے سامنا نہ ہو جائے۔



وہ تیس پینتیس گھروں کی ایک بستی تھی جہاں ایک بڑے اچھے گھر کے سامنے پنڈت رمیش چندر نے گھوڑی روک لی۔ تین چار آدمی دوڑے آئے اور اس طرح حرکتیں کرنے لگے جیسے پنڈت رمیش ان کا آقا ہو اور وہ اس کے زر خرید غلام ہوں۔ لوگوں نے جب صغیر کے کپڑے دیکھے جن پر صغیر کا خون گرا تھا تو گاؤں میں تہلکہ بپا ہو گیا۔ آنِ واحد میں گاؤں کی تمام تر آبادی وہاں اکٹھی ہو گئی۔

پنڈت رمیش صغیر کو گھوڑی سے اتار کر اندر لے گیا اور ایک صاف ستھرے کمرے میں پلنگ پر بٹھا دیا۔ گھر کی عورتیں گھبراہٹ کے عالم میں اس کمرے میں آ گئیں۔ ایک دو آدمی بھی آ گئے تھے۔

"گھبراؤ ڈرو مت!" — پنڈت نے عورتوں سے کہا — "دودھ گرم کرو اور اس میں شہد ڈال کر لے آؤ" — اس نے ان ایک دو آدمیوں سے کہا — "کھڑے منہ نہ دیکھتے رہو' دوڑ کر جاؤ اور حکیم کو ساتھ لے آؤ۔ اسے بتانا ایک زخمی کی مرہم پٹی کرنی ہے"۔

صغیر کو یہی ایک خطرہ محسوس ہو رہا تھا کہ پولیس نہ آن دھمکے۔ یہ پنڈت دیہات کے بڑے زمینداروں اور چوہدریوں جیسا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ صغیر کسی سے پوچھ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس علاقے کا تھانہ کتنی دور ہے۔ پوچھتا تو اس سے پوچھا جا سکتا تھا کہ تھانے کا پوچھ کر کیا کرو گے!

فوراً ایک بڑا پیالہ دودھ سے بھرا ہُوا آیا جس میں شہد ملا ہوا تھا۔ اُس وقت صغیر کی ضرورت یہی تھی کہ خالی پیٹ میں کچھ چلا جائے۔ دودھ اتنا زیادہ تھا کہ اس کا پیٹ اس سے بھر گیا۔

صغیر دودھ پی چکا تو کچھ ہی دیر بعد ایک ادھیڑ عمر حکیم اپنا سامان اٹھائے آ گیا۔ اس

کے چہرے پر اور حرکتوں میں گھبراہٹ نمایاں تھی جو اس لئے نہیں تھی کہ ایک آدمی زخمی تھا بلکہ اس لئے کہ اسے پنڈت رمیش چندر نے بلایا تھا۔ پنڈت کے آگے وہ غلامانہ حرکتیں کرنے لگا تو پنڈت نے صغیر کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ وہ ہے زخمی' زخم دیکھو اور ٹھیک طرح مرہم پٹی کر دو۔

پنڈت نے صغیر کے بازو پر لپٹی ہوئی پگڑی اتاری پھر اس کا کرتہ بھی اتار دیا اور زخم دھونے کے لئے پانی منگوایا۔ اس نے پوچھا تو پنڈت رمیش نے اسے بتایا کہ اسے ریچھ کے پنجے لگے ہیں۔

حکیم نے زخم دھو کر مرہم پٹی کر دی اور بتایا کہ پنجے گہرے نہیں اُترے صرف کھال کو نقصان پہنچا ہے۔ پنڈت نے پوچھا کہ یہ زخم کتنے دنوں تک ٹھیک ہو جائیں گے۔ حکیم نے بتایا کہ زیادہ سے زیادہ چار دنوں میں زخم بھر جائیں گے۔ وہ ہر صبح مرہم پٹی کرنے آیا کرے گا۔ حکیم نے صغیر کو ایک دوائی پینے کے لئے بھی دے دی تا کہ ریچھ کا پنجہ اگر کچھ زہر آلود ہو تو وہ خون میں زائل ہو جائے گا۔

"یہ سن لو بھائی!" — پنڈت رمیش نے صغیر سے کہا — "چار دن لگیں یا چالیس دن' زخم بھرنے تک میرے گھر کو اپنا گھر سمجھ کر رہو۔ جلدی جانے کی ضد کرو گے تو نہیں جانے دوں گا اور تمہارے لئے الگ مکان ہو گا"۔

"میں رک جاؤں گا" — صغیر نے کہا — "یہ خیال رکھیں کہ میں دال اور سبزی کے سوا کچھ اور نہیں کھاؤں گا"۔

اُسی روز صغیر کو چھوٹے سے ایک مکان میں منتقل کر دیا گیا جو خالی پڑا تھا اور پنڈت نے بڑی جلدی سے اسے صاف ستھرا کروا کے ایک کمرے میں پلنگ وغیرہ بچھوا دیا تھا۔ پنڈت اس کے ساتھ اس مکان تک آیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ایک ادھیڑ عمر غریب اور نادار سا آدمی وہاں آیا۔ اس کے فوراً بعد ایک جوان سی لڑکی بھی آ گئی۔ لڑکی کا رنگ سپیدی مائل گندمی تھا اور اس کے نقش تیکھے اور پُرکشش تھے۔

"یہ دونوں تمہاری خدمت کے لئے موجود رہیں گے" — پنڈت رمیش نے صغیر سے کہا — "یہ آدمی گھر سے باہر بیٹھا رہا کرے گا اور یہ لڑکی تمہارے ساتھ موجود رہے گی۔ رات اسے اپنے پاس رکھنا چاہو گے تو یہ یہیں رہے گی"۔

پنڈت رمیش اس آدمی کو اور اس لڑکی کو بڑے سخت الفاظ میں کچھ ہدایات دے کر چلا گیا۔ صغیر کی زندگی ایسے حالات میں داخل ہو گئی جو اس کے تصور میں بھی کبھی نہیں آئے تھے۔ پنڈت نے اسے بڑے اچھے دھلے دھلائے کپڑے پہنا دیئے تھے۔ پنڈت کے جانے کے بعد نوکر باہر چلا گیا اور لڑکی صغیر کی ٹانگیں دبانے کے لئے اس کے پلنگ پر چڑھ بیٹھی۔

"کیا تم پنڈت کی بیٹی یا بہو ہو؟" — صغیر نے لڑکی سے پوچھا۔

"نہیں!" — لڑکی نے دبی دبی زبان میں جواب دیا — "میں ان کی کچھ نہیں لگتی۔ نوکرانی سمجھ لو"۔

"گھبراؤ نہیں" — صغیر نے کہا — "تم ان لوگوں میں سے تو لگتی ہی نہیں ہو۔ تمہاری زبان پنجاب والی ہے۔ تم اس علاقے کی ہو ہی نہیں"۔

"تم ٹھیک کہتے ہو" — لڑکی نے ذرا جھجک سے کہا — "میں اس علاقے کی رہنے والی نہیں"۔

قدرتی سوال تھا کہ تم یہاں کس طرح آ گئی ہو جو صغیر نے پوچھا لیکن لڑکی نے کہا کہ پنڈت جی نے بڑا سخت حکم دیا ہے کہ اپنے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتانا۔

صغیر میں تجسس کی رگ بیدار ہو گئی لیکن لڑکی کھل کر بات نہیں کر رہی تھی۔ صغیر نے سوچا کہ اسے اپنے ساتھ بے تکلف کرنا ہے۔ اس علاقے کے لوگوں کی زبان پنجابی سے مختلف تھی لیکن لڑکی ٹھیٹھ پنجابی بولتی تھی۔ صغیر کے لئے ایک مشکل یہ بھی پیدا ہونے لگی تھی کہ وہ جوان تھا اور لڑکی بھی جوان اور خوبصورت تھی۔ وہ اس کی ٹانگیں دبا رہی تھیں۔ صغیر کوئی مومن' زاہد اور پارسا نہیں تھا۔ وہ محسوس کرنے لگا کہ لڑکی اسے بڑی کٹھن آزمائش میں ڈال رہی ہے۔ اس نے دھیان اللہ کی طرف کر دیا۔

اس کا ذہن پیچھے چلا گیا۔ اس نے انبالہ سے ایک لڑکی کو بچایا تھا' پھر ایک لڑکی کو ڈاکوؤں سے بچایا پھر ایک سنیاسی کو سیلاب سے نکالا اور ایک آدمی کو جو پنڈت تھا [illegible] سے بچایا تھا۔ صغیر کو خیال آیا کہ یہ سارے واقعات اتفاقیہ نہیں ہوئے بلکہ اللہ تبارک تعالیٰ نے اسے مواقع فراہم کئے ہیں کہ وہ بنی نوع انسان کی بھلائی کے لئے اپنا آپ قربان کر دے۔ ایسے خیالات اپنے آپ ہی اس کے ذہن میں آنے لگے۔ یہ بھی اسے کفار کے چنگل میں سے چھڑانے کے لئے اللہ مدد کر رہا ہے۔ جہاں کوئی مشکل پیش آتی ہے' اللہ صغیر سے کوئی ایسا کام کروا دیتا ہے کہ اسے مدد مل جاتی ہے اور انشاء اللہ وہ اسی طرح اپنی منزل پر پہنچ جائے گا۔

وہ دراصل اس دلکش لڑکی سے توجہ ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے لڑکی سے پوچھا' کیا وہ رات کو بھی اس کے پاس رہے گی؟

"ہاں!" — لڑکی نے جواب دیا — "مجھے یہی حکم ملا ہے"۔

"یہاں رہ کر کیا کرو گی؟" — صغیر نے پوچھا۔

"جو تم کہو گے" — لڑکی نے جواب دیا — "تمہارا ہر کام کروں گی اور تمہارے دل کی خوشی کے لئے بھی جو کہو گے کروں گی"۔

"کیا پنڈت رمیش نے تمہیں ایسا ہی کہا ہے؟" — صغیر نے پوچھا۔

"ہاں!" — لڑکی نے کہا — "یہاں میرا صرف یہی ایک کام ہے۔ پنڈت جی نے مجھے الگ بٹھا کر کہا تھا کہ اس مہمان نے میری جان بچائی ہے اور یہ تمہارا کام ہے کہ مہمان کو پوری پوری خوشی دینا"۔

صغیر گہری سوچ میں کھو گیا۔



صغیر کے لئے شام کا کھانا یہی لڑکی لائی اور اس کے پیچھے پیچھے پنڈت رمیش چندر بھی آ گیا۔ کھانے کے ساتھ دودھ کا بھرا ہوا پیالہ بھی تھا جس میں شہد ملا ہوا تھا۔ خالص گھی کے پراٹھوں کے ساتھ دال بھی تھی اور سبزی بھی۔ صغیر نے کھانا کھا لیا اور دودھ بھی پی لیا۔ پنڈت رمیش چندر اس کے پاس کچھ دیر بیٹھا رہا اور ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ پنڈت رمیش نے اب اس سے یہ پوچھنا چھوڑ دیا تھا کہ وہ کہاں کا رہنے والا ہے اور کہاں جا رہا تھا۔ صغیر نے اسے یہ جو بتایا تھا کہ وہ دنیا ترک کر آیا ہے' یہ پنڈت رمیش نے صحیح مان لیا تھا۔

"اچھا' میرے دوست!" — پنڈت رمیش نے اٹھ کر کہا — "میں چلتا ہوں اب صبح ملاقات ہو گی۔ اس لڑکی کو تمہارے پاس چھوڑ چلا ہوں۔ یہ تمہیں واپس اپنی دنیا میں لے آئے گی اور مجھے خوشی ہو گی کہ تم نے میرے ساتھ جو نیکی کی ہے' میں نے تمہیں اس کا صلہ دے دیا ہے..... صلہ دینا تو ابھی باقی ہے' وہ بوقت رخصت دوں گا"۔

پنڈت رمیش مسکراتا ہوا اور لڑکی کی طرف اشارہ کر کے چلا گیا۔ لڑکی پہلے ہی کھانا

کھا کر اور تیار ہو کر آئی تھی۔ پنڈت رمیش کے جانے کے بعد وہ باہر نکلی اور دروازہ اندر سے بند کر کے واپس آئی اور صغیر کے ساتھ پلنگ پر بیٹھ گئی۔ اس وقت صغیر کو خیال آیا کہ وہ پنڈت رمیش سے کہہ دیتا کہ وہ لڑکی کو ساتھ نہیں رکھے گا لیکن اس نے ایسا نہ کیا اور یہ بھی محسوس کیا کہ اس کے اندر ایک اور آدمی ہے جو لڑکی کو ساتھ رکھنا چاہتا تھا۔

صغیر تو اسی قماش کا جوان ہُوا کرتا تھا۔ اسے انڈین انٹیلی جنس کے استادوں نے اس کی اُسی دکھتی رگ کو اپنی مٹھی میں لے کر اپنا ایجنٹ بنایا تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ انہوں نے اس کی یہی کمزوری پختہ تر کر دی تھی اور اسی ذریعے اس کی برین واشنگ کی تھی۔ روپے پیسے، شراب اور عورت کے عوض ہی تو صغیر نے اپنا ایمان بیچا تھا۔ اب ایک بڑی ہی دلکش اور جوان لڑکی اس کے حوالے کر دی گئی تھی اور وہ اس کے ساتھ اس طرح لگی بیٹھی تھی کہ وہ اس کے جسم کی ہلکی ہلکی تپش محسوس کر رہا تھا۔

صغیر دو حصوں میں بٹتا گیا اور محسوس کرنے لگا کہ وہ درختوں کو جڑوں سے اکھاڑ دینے والے سیلاب کا سینہ چیر سکتا ہے۔ سنگلاخ زمین پر ننگے پاؤں چل سکتا ہے اور وہ پولیس کی پوری گارد کا مقابلہ کر سکتا ہے اور جان کو یقینی خطرے میں بھی ڈال سکتا ہے لیکن اپنی ہی ذات سے اٹھے ہوئے جذباتی طوفان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

”تمہیں اپنا مقابلہ کرنا پڑے گا“— اسے اپنی ہی آواز سنائی دی— ”جس راستے پر جا رہے ہو یہ اللہ کا راستہ ہے۔ ذرا سا بھی بھٹک گئے تو ساری نیکیاں برباد ہو جائیں گی اور اسی جنگل میں مارے مارے پھرتے حیوانوں جیسی موت مرو گے، تمہاری لاش کو گدھ اور جنگل کے درندے کھا لیں گے یا کہیں نہ کہیں پکڑے جاؤ گے اور باقی عمر اپنے دین اور ایمان اور ملک کے دشمن کی کسی جیل میں پڑے گلتے سڑتے رہو گے۔ پھر تمہارا کوئی ملک نہیں ہو گا“۔

صغیر کو اپنے خلاف بڑی ہی جان لیوا اور صبر آزما جدوجہد کرنی پڑی۔ اس نے اپنا دھیان پاکستان کی طرف کر دیا اور ذہن میں ان دھماکوں کو لے آیا جو ہندوؤں سے معاوضہ لے کر پاکستانی ایجنٹ اپنے ہی ملک میں کر رہے تھے اور جو اس نے خود بھی کئے تھے۔

اسے اپنے کئے ہوئے دھماکے یاد آئے۔ ایک دھماکے کے بعد وہ وہاں گیا تو وہ دو

کسی بچے کی دو ننھی منی ٹانگیں اسے ایک جگہ پڑی نظر آئیں۔ پولیس لوگوں کے بکھرے ہوئے اعضاء اکٹھے کر رہی تھی۔ اتنے چھوٹے بچے کے جسم کے ٹکڑے اس کے دل پر اثر کر گئے تھے لیکن رات اس نے اس درندگی کے معاوضے میں ملی ہوئی شراب پی تو دل سے تمام بے مزہ اثرات اُتر گئے لیکن اسے جب اپنا بھائی یاد آیا جو اسی کے رکھے ہوئے بم دھماکے میں اُڑ گیا تھا تو وہ تڑپ اٹھا۔ اس نے یوں تیزی سے گردن گھما کر اپنے پاس بیٹھی لڑکی کو دیکھا جیسے لڑکی نے اسے سُوئی چبھو دی ہو۔

اس نے اپنے سارے جسم میں درد سا محسوس کیا جو اینٹھن کی صورت اختیار کر رہا تھا۔ وہ نمایاں طور پر محسوس کرنے لگا جیسے پنڈت رمیش چندر کی پیش کی ہوئی اس خوبرو لڑکی نے اس کی شخصیت کے پرخچے اڑا دیئے ہوں۔

”دیکھ لڑکی!“— صغیر نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا— ”اسی کمرے میں اور اسی پلنگ پر رات گزارو لیکن مجھ سے ذرا دور ہٹ کر بیٹھو۔ میرے سامنے بیٹھ جاؤ“۔

”کیوں؟“— لڑکی نے ذرا سہمی ہوئی سی آواز میں پوچھا— ”کیا میں تمہیں اچھی نہیں لگی؟ اگر تم نے پنڈت جی سے ایسی بات کہہ دی تو وہ مجھے ماریں گے“۔

”پنڈت کا تم غم نہ کرو“— صغیر نے پیار سے کہا— ”پنڈت کو تو میں یوں کہوں گا کہ میں نے تم جیسی تمیز والی اور حسن والی لڑکی پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی ..... میرا مطلب کچھ اور ہے“۔

لڑکی صغیر کو ایسی نظروں سے دیکھنے لگی جن میں حیرت تھی اور ایک سوال بھی۔ اسے شاید پتہ نہیں چل رہا تھا کہ اس شخص سے پوچھے کہ تمہارا آخر مطلب کیا ہے۔

”تم کچھ حیران سی ہو گئی ہو“— صغیر نے مسکراتے ہوئے کہا— ”میں تمہیں اپنے ساتھ رکھوں گا۔ مجھے ایک ساتھی کی ضرورت ہے۔ تم میری باتیں سننا اور میں تمہاری سنوں گا“۔

صغیر نے اس کے ساتھ اس طرح باتیں شروع کر دیں جیسے یہ لڑکی اس کی ہمجولی ہو اور ہم راز ہو اور ان کی دوستی بچپن سے چلی آ رہی ہو۔ لڑکی کے چہرے پر جو کھچاؤ تھا وہ کم ہونا شروع ہو گیا۔ گھنٹہ ڈیڑھ اور گزر گیا تو لڑکی بھی محسوس کرنے لگی جیسے وہ صغیر کو پہلے سے جانتی ہو۔ صغیر نے اپنی باتوں میں اور انداز میں ایسا تاثر پیدا کر لیا تھا جس میں بدی اور بری نیت کا شبہ تک نہ تھا۔ رات آدھی کے قریب ہونے کو آئی تھی اور

دونوں یوں جاگ رہے تھے جیسے ابھی سورج غروب ہوا ہو۔

"کیا پنڈت جی تمہارے دوست ہیں؟" — لڑکی نے پوچھا اور جواب کا انتظار کئے بغیر خود ہی بولی — "تم ان کے دوست نہیں ہو سکتے۔ اس سے پہلے تو تم ان کے پاس کبھی نہیں آتے تھے"۔

"تمہارے پنڈت کے ساتھ یہ میری پہلی ملاقات ہے" — صغیر نے کہا — "یہ تو اس پنڈت کی زندگی کے ابھی چار دن لکھے ہوئے تھے کہ میں بروقت اس کی مدد کو پہنچ گیا ورنہ تم لوگوں کو اس شخص کی لاش بھی نہ ملتی۔ کچھ ریچھ کھا جاتا اور کچھ اس کے بچے کھا جاتے اور باقی جو کچھ بچتا وہ گدھ اور گیدڑ کھا لیتے"۔

"کتنا اچھا ہوتا" — لڑکی کے منہ سے جیسے بے اختیار نکل گیا ہو۔ اس کے چہرے پر خوف اور گھبراہٹ کا تاثر آ گیا اور ہاتھ جوڑ کر صغیر سے کہا — "پنڈت جی کو نہ بتانا کہ میں نے اس طرح کہا تھا"۔

"تم مجھے سمجھی نہیں" — صغیر نے کہا — "میں دھوکہ باز اور فریب کار نہیں ہوں۔ کیا تم ابھی تک نہیں سمجھی کہ میں نے تمہارے اتنے خوبصورت جسم کی طرف توجہ دی ہی نہیں اور نہ توجہ دوں گا۔ اس سے تو تمہیں سمجھ لینا چاہئے کہ میں کیسا آدمی ہوں"۔

"میں تمہیں نہیں سمجھ سکی" — لڑکی نے کہا — "میں نہیں سمجھ سکی کہ تم کیسے مرد ہو کہ مجھ جیسی لڑکی کو الگ بٹھا دیا ہے۔ ابھی تک تو میں نے ایسا کوئی آدمی نہیں دیکھا۔ اس پنڈت نے تو مجھے رکھا ہی اسی کام کے لئے ہے"۔

"اب اپنا نام بتا دو" — صغیر نے کہا۔

لڑکی صغیر کے منہ کی طرف دیکھنے لگی جیسے اپنا نام بتانے سے گریز کر رہی ہو۔ صغیر کو کچھ شک ہوا اس نے پھر کہا کہ اپنا نام تو بتا دو۔

"صحیح نام بتاؤں؟" — لڑکی نے کہا — "لیکن تمہارا کیا اعتبار!"

"اگر تمہیں ابھی تک مجھ پر اعتبار نہیں آیا تو میں کیا کہوں!" — صغیر نے کہا — "لیکن اب تو میں پوچھ کر ہی رہوں گا۔ یہ تو میں نے دیکھ لیا ہے کہ تم کسی مجبوری کے تحت یہاں پھنسی ہوئی ہو اور کوئی خاص بات ضرور ہے"۔

"پہلے تو اپنے بارے میں بتاؤ" — لڑکی نے کہا — "کہاں کے رہنے والے ہو، کہاں سے آ رہے ہو اور کہاں جانا ہے۔ جس طرح تم نے یہ پہچان لیا تھا کہ میں اس علاقے کی

رہنے والی نہیں اسی طرح میں نے تمہاری زبان سے معلوم کر لیا ہے کہ تم بھی اس علاقے کے رہنے والے نہیں اور تم پنجاب کے رہنے والے ہو۔ سچ بتاؤ اب کہاں جا رہے ہو"۔

"تم نے ٹھیک پہچانا ہے" — صغیر نے کہا — "میں پنجاب کا رہنے والا ہوں اور پنجاب کو ہی جا رہا ہوں.... شاید جالندھر چلا جاؤں"۔

"جالندھر؟" — لڑکی کے منہ سے بے اختیار جالندھر کا نام نکلا اور اس نے کہا — "کبھی میں بھی جالندھر رہا کرتی تھی۔ قسمت کہاں سے کہاں لے آئی ہے"۔

اب تو صغیر اس کے پیچھے ہی پڑ گیا کہ وہ اسے بتائے کہ جالندھر سے اس پنڈت تک کس طرح پہنچی ہے۔ لڑکی بات کرنے سے گھبرا رہی تھی۔ صغیر جیسے چالاک اور ہوشیار آدمی کے سامنے یہ لڑکی تو کوئی حیثیت رکھتی ہی نہیں تھی۔ صغیر نے چکنی چپڑی باتیں کہہ کر اسے اصل بات بتانے پر آمادہ کر لیا۔

"پہلے یہ بتاؤ کہ تم نے اس پنڈت کو کیسے بچایا تھا!" — لڑکی نے پوچھا۔

صغیر نے اسے سنا دیا کہ کس طرح ایک ریچھ اس پنڈت کے پیچھے دوڑا آ رہا تھا اور "لیکن صغیر بروقت پہنچ گیا اور ریچھ سے اسے بچا لیا۔ صغیر نے پوری بات سنا ڈالی۔

"اگر میں زخمی نہ ہو جاتا تو پنڈت کے ساتھ یہاں کبھی نہ آتا" — صغیر نے کہا — "یہ تو میں نے صرف انسانی ہمدردی کی خاطر کیا ہے۔ یہ تو مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ گھوڑی پر جو شخص سوار ہے یہ ہے کون۔ وہ میری نگاہ میں ایک انسان تھا جسے اس درندے سے صرف میں ہی بچا سکتا تھا"۔

"تم نے بہت برا کیا ہے" — لڑکی نے کہا — "اگر میں وہاں ہوتی تو تمہیں روک لیتی اور یہ دیکھ کر کہ ریچھ اس شخص کو چیر پھاڑ رہا ہے' میں بہت خوش ہوتی"۔

اب تو بات کھل گئی تھی۔ لڑکی اپنی نیت پر پردہ ڈال نہیں سکتی تھی۔ پنڈت کے حق میں اس کی نیت بہت ہی بُری تھی اور اس کے دل میں پنڈت کی نفرت تھی۔ اس نے صغیر سے قسمیں لیں کہ وہ پنڈت کو نہیں بتائے گا۔ صغیر نے زبان کا جادو چلا کر لڑکی کے ذہن اور دل پر قبضہ کر لیا۔



لڑکی نے اپنا نام دلجیت کور بتایا اور یہ کہ وہ سکھوں کی بیٹی ہے۔ اس کا گاؤں

جالندھر کے بالکل قریب تھا۔ اس نے بتایا کہ کم و بیش پانچ سال پہلے وہ اپنی ماں کے ساتھ ایک اور گاؤں چلی گئی۔ اس گاؤں میں ایک میلہ لگا کرتا تھا۔ اس وقت دلجیت کور کی عمر انیس بیس سال تھی۔

اس گاؤں میں ماں بیٹی اپنے قریبی رشتہ داروں کے ہاں گئی تھیں اور میلے کی خاطر ہی گئی تھیں۔ اس گاؤں میں ان کے رشتہ داروں میں ہی ایک لڑکا تھا جو اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا۔ دلجیت کور خود بھی اس لڑکے کو پسند نہیں کرتی تھی اور اس کے والدین اور بھائی بھی اس لڑکے کو اچھا نہیں جانتے تھے۔ اس کے ماں باپ نے دلجیت کور کا رشتہ مانگا تو اسے صاف جواب مل گیا۔

اس شخص کی عمر دلجیت کور سے پانچ چھ سال زیادہ تھی۔ اس کی شادی ہوئی تھی لیکن بیوی جلدی مر گئی تھی۔ اس انکار کے بعد دلجیت کور ایک بار اپنے ان ہی رشتہ داروں کے ہاں ان کے گاؤں گئی تو یہی اس کا امیدوار جسے رشتے سے انکار کر دیا گیا تھا دلجیت کور سے ملا اور اسے کہا کہ وہ مان جائے۔ دلجیت کور نے کہا کہ اس کے ماں باپ انکار کر چکے ہیں تو وہ کیسے اس کے ساتھ شادی کر سکتی ہے۔

اس سکھ نے کہا کہ دلجیت کور اس کے ساتھ گھر سے بھاگ آئے۔ دلجیت کور بھی آخر سکھوں کی بیٹی تھی۔ اس نے نہ صرف یہ کہا کہ وہ ایسی حرکت نہیں کر سکتی بلکہ اس پر طنز بھی کی کہ وہ اپنی شکل تو دیکھے، وغیرہ۔

"پھر یہ سوچ لے دلجیت!" — سکھ نے کہا — "تمہاری شادی میرے ساتھ نہ ہوئی تو پھر کسی کے بھی ساتھ نہیں ہو گی"۔

"تو کیا مجھے قتل کر دو گے؟" دلجیت کور نے حقارت سے پوچھا۔

"نہیں!" — سکھ نے کہا — "قتل کیوں کروں گا!.... زندہ ہی رہنے دوں گا لیکن تمہارا کوئی خاوند نہیں ہو گا"۔

دلجیت کور اسے گیدڑ بھبکی یا خالی دھمکی سمجھ کر ہنس پڑی اور سکھ کو ایک دو گالیاں دے کر دھتکار آئی۔

اب وہ پھر اپنی ماں کے ساتھ اس گاؤں گئی۔ اگلے روز میلہ تھا۔ دلجیت کور کی وہاں دو تین سہیلیاں بھی تھیں۔ اگلے روز وہ ان کے ساتھ میلے پر چلی گئی۔ وہاں لڑکیاں مختلف قسم کے جھولے جھولتی رہیں اور میلے سے نکل کر کچھ دور سیر سپاٹے کو

لے چلی گئیں۔

دلجیت کور نے صغیر کو سنایا کہ دو تین مرتبہ اس نے اسی سکھ کو دیکھا جسے وہ دھتکار آئی تھی۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ وہ آندھی اور بگولوں کے دن تھے۔ اچانک آندھی آ گئی۔ اس وقت لڑکیاں میلے سے کچھ دور چلی گئی تھیں جہاں کوئی اور نہیں تھا۔ سب لوگ میلے میں تھے۔

آندھی نے اس قدر گرد اُڑائی کہ اپنا آپ نظر نہیں آتا تھا۔ آندھی کی چیخیں بڑی ڈراؤنی تھیں۔ سکھوں کی بیٹیاں ڈرنے والی تو نہیں تھیں لیکن آندھی اس قدر تیز اور تند تھی کہ لڑکیاں چیختی چلاتی اِدھر اُدھر بکھر گئیں۔ دلجیت کور تو سب سے بالکل ہی الگ ہو گئی۔ آندھی کا رخ میلے کی طرف ہوتا تو لڑکیاں آندھی کے زور سے ہی میلے میں پہنچ جاتیں اور بالکل محفوظ رہتیں مگر آندھی کا رخ میلے کے خلاف تھا اس لئے دلجیت کور میلے کی طرف نہ آ سکی۔ وہ اس طرف آنے کی جتنی کوشش کرتی تھی آندھی اتنی ہی شدت سے اس کے پاؤں اکھاڑتی تھی۔

کسی آدمی نے اسے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ دوسرے آدمی نے اس کا دوپٹہ اس کے منہ اور سر کے گرد اس طرح لپیٹ دیا کہ اس کی آواز بھی نہیں نکلتی تھی۔ پھر اس دوسرے آدمی نے دلجیت کور کو ٹانگوں سے اٹھا لیا اور اس طرح یہ دونوں آدمی اسے اٹھا کر لے گئے۔

کچھ دور ایک تانگہ کھڑا تھا اس میں دلجیت کو پھینکا اور تانگہ چل پڑا۔ آندھی کے گرد و غبار میں یہ جبری اغوا کوئی دیکھ نہ سکا۔

اڑھائی تین گھنٹوں بعد تانگہ رکا اور دلجیت کور کو ایک مکان میں لے گئے۔ وہاں اس نے دیکھا کہ اسے اغوا کرنے والوں میں ایک اس کا وہی امیدوار تھا جسے دلجیت کور نے اور اس کے گھر کے ہر فرد نے دھتکار دیا تھا۔ دلجیت کور اسے گالیاں دینے لگی جس کے جواب میں اس سکھ نے اور دوسرے نے بھی اسے بہت مارا پیٹا اور پھر قتل کی دھمکی دی۔ اس کے بعد تصور میں لایا جا سکتا ہے کہ دلجیت کور کے ساتھ ان سکھوں نے کیا سلوک کیا ہو گا۔

دلجیت کور صغیر کو یہاں تک بات سنا کر بہت روئی۔ روئی بھی ایسی کہ اس کے لئے بولنا ممکن نہ رہا۔ اس وقت صغیر نے اسے اپنے قریب کر کے اپنے بازو کے گھیرے میں

لے لیا۔

دلجیت کور نے صغیر کو بڑی لمبی بات سنائی اور کہا کہ اس طرح وہ پہلے ایک آ
کے ہاتھ فروخت ہوئی اور ایک سال بعد ایک اور آدمی اسے خرید کر لے گیا جس
اسے ڈیڑھ سال داشتہ بنائے رکھا۔ پہلے آدمی کی بھی وہ داشتہ بنی رہی تھی۔ اس کے
وہ شملہ پہنچی۔ یہ تیسرا آدمی تھا جس نے اسے خریدا تھا۔ یہ کوئی کاروباری آدمی تھا۔
یہ آدمی اسے کسولی لے گیا اور وہاں سے وہ اس پنڈت کے ہاتھ چڑھ گئی۔ پنڈ
رمیش چندر نے بھی اسے خریدا تھا اور اب وہ اس کی داشتہ تھی۔

"کیا تم نے کبھی بھاگنے کی نہیں سوچی؟" — صغیر نے پوچھا۔

"نہیں!" — دلجیت کور نے جواب دیا — "من ہی مارا گیا ہے.... کیا تم مجھے ا
ساتھ جالندھر لے چلو گے؟"

"لے چلوں گا" — صغیر نے کہا — "یہ زخم ٹھیک ہونے دو"۔

"لیکن اس پنڈت کو معمولی سا آدمی نہ سمجھنا" — دلجیت کور نے کہا — "تم
ہمارے تعاقب سے نہیں ہٹے گا"۔

"یہ بھی دیکھ لیں گے" — صغیر نے کہا۔

دلجیت کور نے اپنا سر صغیر کے کندھے پر رکھ دیا۔

خطروں، ان دیکھے، ان جانے حالات میں سے گزرتی صغیر کی زندگی کی بہت ایک اور رات گزر گئی۔ دلجیت کور صغیر کے پلنگ پر سوئی ہوئی تھی۔ وہ بے خبری کی گہری نیند سوئی تھی۔ اسے ایسا غم نہیں تھا کہ یہ غیر آدمی اس کی آبرو ریزی کرے گا۔ وہ آبرو باختہ لڑکی عصمت سے دست بردار ہو چکی تھی۔

دلجیت کور تو ایک گھوڑی کی مانند تھی، مالک جسے چاہتا سواری کے لئے پیش کر دیتا تھا۔ مالک نے اسے کثیر رقم سے خریدا تھا۔ اس علاقے کے تھانے دار کو پنڈت رمیش چندر نے دلجیت کور کے ذریعے ہی اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ اسی لئے سارا گاؤں اس کا غلام بنا ہُوا تھا۔

دور افتادہ دیہات کے لئے چھوٹا اور بڑا تھانے دار، پولیس حوالدار، پٹواری یا تحصیل دار بہت ہی بڑے افسر ہوتے ہیں۔ ان پر جس کا اثر و رسوخ چل جائے وہ دیہاتیوں کے لئے بڑی ہی بارعب شخصیت بن جاتا تھا اور سب اس کے اشاروں پر ناچتے تھے۔ ایک دلجیت کور ہی نہیں بلکہ گاؤں کی کمین ذاتوں کی کسی بھی لڑکی کو رمیش چندر اپنے مفادات کے لئے استعمال کر سکتا تھا اور کرتا بھی تھا۔ دلجیت کور کو تو اس نے اپنے لئے اور بڑے افسروں کے لئے رکھا ہُوا تھا۔ صغیر تو اس کے لئے رحمت کا فرشتہ تھا جس نے اسے خونخوار ریچھ سے بچایا تھا۔

دلجیت کور نے صغیر سے کہا تھا کہ اس رمیش چندر کو معمولی آدمی نہ سمجھنا۔ حقیقت بھی یہی تھی۔ رمیش چندر کے پاس دلجیت کور اور گاؤں کی دو چار

اور لڑکیاں ہی اثر و رسوخ پیدا کرتے کے لئے نہیں تھیں بلکہ وہ روپے پیسے والا آدمی تھا۔ گاؤں سے ذرا ہی دور کچھ جگہ ہموار تھی جہاں رمیش چندر کی زرعی زمین تھی اور پھلوں کا باغ بھی تھا۔ اس جگہ سے کچھ اور آگے بھی اس کی کھیتیاں تھیں۔ کچھ کھیتیاں ایک پہاڑی کی ڈھلان پر سیڑھیوں کی طرح تھیں۔ یہ ساری کھیتیاں اور باغ رمیش چندر کے لئے سونے کی کان تھیں۔

دلجیت کور کی آنکھ کھلی تو اس نے سب سے پہلے یہ دیکھا کہ صغیر اس کے پاس پلنگ پر نہیں تھا۔ سورج اوپر آگیا تھا۔ دلجیت کور اُٹھ بیٹھی اور دیکھا کہ صغیر کمرے میں پڑی ہوئی ایک چارپائی پر سویا ہُوا تھا جس پر نہایت معمولی سا بستر بچھا ہُوا تھا۔

دلجیت کور آہستہ آہستہ اٹھی۔ اس کے انداز میں حیرت زدگی تھی۔ صغیر نے اپنی یہ بات پوری کر دکھائی تھی کہ اس لڑکی کے جسم کے ساتھ وہ ذرا بھی دلچسپی نہیں رکھے گا۔ وہ اٹھی اور صغیر کی چارپائی پر جا بیٹھی اور اس کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔ صغیر گہری نیند سویا ہُوا تھا۔ دلجیت کور نے صغیر کے بڑھے ہوئے لمبے بالوں میں انگلیاں پھیرنی شروع کر دیں۔ وہ تو اسے بالکل ہی بدلا ہُوا انسان سمجھنے لگی تھی۔ صغیر کی آنکھ کھل گئی۔ دلجیت کور کو اپنے پاس بیٹھا دیکھ کر وہ اٹھ بیٹھا۔

"تم شاید زخموں کی وجہ سے ...." — دلجیت کور نے کہا — "یا شاید تم سادھو مہنت آدمی ہو اس لئے رات مجھ سے دور ہٹ کر گزاری؟"

"نہیں!" — صغیر نے کہا — "میں نے رات تجھے کیا کہا تھا؟.... زخم معمولی ہیں جنہوں نے رات مجھے ذرا سی بھی تکلیف نہیں دی۔ باقی رہا یہ کہ میں سادھو ہوں، مہنت ہوں یا کیا ہوں، میرا تمہارے ساتھ وعدہ ہے کہ جالندھر تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا"۔

"ایک بات صاف کہہ دوں، بُرا تو نہیں مانو گے؟" — دلجیت کور نے کہا — "شک ہونے لگا ہے جیسے تم مجھے بہلا ورغلا کر اغوا کرنا چاہتے ہو۔ اگر ایسی بات ہے

تو میں اس کے لئے بھی تیار ہوں۔ مجھے یہاں سے نکالو۔ اگر تم مجھے میرے گھر تک پہنچا دو تو منہ مانگا انعام دلواؤں گی"۔

"مجھے آزمائش میں نہ ڈالو لڑکی!" — صغیر نے کہا — "میں تمہیں تمہارے ماں باپ کی امانت سمجھتا ہوں۔ یہ خیال رکھنا کہ اس پنڈت رمیش چندر کو ایسا اشارہ بھی نہ ملے کہ میں تم سے الگ سویا تھا۔ میری ذات پر کوئی شک نہ کرو"۔

"میرے حیران ہونے کی بھی آخر کوئی وجہ ہے" — دلجیت کور نے کہا — "میں نے تم جیسا آدمی پہلی بار دیکھا ہے۔ بڑے بڑے جابر آدمی مجھ جیسی لڑکی کو دیکھ کر موم ہو جایا کرتے ہیں"۔

"میں تمہاری یہ حیرت دور کر دوں گا" — صغیر نے کہا — "لیکن ابھی نہیں، یہاں سے نکل کر بات کروں گا۔ دل میں یہ اطمینان بٹھا لو کہ تم اپنے ماں باپ کے پاس جاؤ گی یا ہم دونوں موت کے منہ میں جائیں گے .... مجھ سے اور کچھ نہیں پوچھنا"

"میں جاتی ہوں" — دلجیت کور نے بڑے خوش گوار اور مطمئن لہجے میں کہا — "تمہارے لئے ناشتہ لاتی ہوں"۔

صغیر نے ابھی کوئی اور بات نہیں کی تھی کہ لڑکی تیزی سے اٹھی اور کمرے سے نکل گئی۔



دلجیت کور کے جانے کے فوراً بعد وہ آدمی آگیا جو رات بھر اس مکان کے باہر موجود رہا تھا۔ اس نے صغیر کے نہانے کا انتظام کر رکھا تھا۔ صغیر کو وہ غسل خانے تک لے گیا اور خود باہر کھڑا رہا۔

کچھ دیر بعد دلجیت کور صغیر کے لئے ناشتہ لے آئی۔ یہ دیہاتی ناشتہ تھا جس میں گھی میں تلے ہوئے پراٹھے تھے، ساتھ مکھن اور شہد اور ایک بڑا پیالہ دودھ کا بھرا ہُوا تھا۔

ناشتے کے کچھ وقت بعد پنڈت رمیش چندر آگیا اور ہندوؤں کی طرح ہاتھ

جوڑ کر صغیر کو سلام کیا۔ اسے دیکھتے ہی صغیر سادھو بن گیا اور تارک الدنیا سادھوؤں کے انداز اور لب و لہجے سے باتیں کرنے لگا۔ صغیر کے لئے یہ معلوم کرنا بہت ہی ضروری تھا کہ اس علاقے کا تھانہ کہاں ہے اور کتنی دور ہے۔ اس نے اس علاقے کے متعلق پوچھنا شروع کردیا پھر اس علاقے کے گاؤں اور آبادیاں پوچھیں۔

رمیش چندر نے اسے ہر سوال کا جواب دیا اور بتایا کہ یہاں ایک ہی بڑا گاؤں ہے اور اسی گاؤں میں علاقے کا تھانہ بھی ہے۔ وہ گاؤں وہاں سے تقریباً بیس کلومیٹر دور تھا۔ صغیر رمیش چندر سے فوراً یہ نہیں پوچھ سکتا تھا کہ اس علاقے کا تھانہ کہاں ہے ورنہ رمیش اس سے ضرور پوچھتا کہ وہ تھانے کو کیا کرے گا۔ صغیر نے اپنے اس سوال کا جواب باتوں باتوں میں لے لیا۔

"اب بتاؤ مہاراج!" — رمیش چندر نے پوچھا — "کہاں سے آئے ہو اور کہاں جا رہے ہو!"

"اس وقت تو ہردوار سے آیا ہوں" — صغیر نے کہا — "کل تمہیں بتایا تھا کہ میں پرمیشور کی تلاش میں نکلا ہوں اور اس دنیا سے تعلق توڑ لیا ہے۔ یہ تو میں بتا ہی نہیں سکتا کہ کہاں جا رہا ہوں۔ ہردوار سے اشارہ ملا اور میں چل پڑا۔ یہاں سے چل پڑوں گا تو جہاں اشارہ ملے گا وہاں رک جاؤں گا"۔

رمیش چندر کو یقین آگیا تھا کہ یہ شخص واقعی تارک الدنیا سادھو ہے، باتوں باتوں میں رمیش نے اس سے پوچھا کہ رات لڑکی نے اس کا دل خوش کردیا تھا یا نہیں؟ لڑکی نے کوئی بدتمیزی تو نہیں کی تھی؟

"یہ لڑکی سے پوچھنا" — صغیر نے کہا — "کیا لڑکی کا دل خوش ہوا ہے یا نہیں۔ ہم جسموں سے سروکار نہیں رکھتے ہم تو دوسرے کی روح کو دیکھتے ہیں اور اس کی روح میں اُتر جاتے ہیں.... اس لڑکی کے متعلق میں نے تمہیں ایک خاص بات بتانی تھی۔ یہ لڑکی تمہارے لئے بھاگوان ہے۔ اسے سنبھال کر رکھو اور احتیاط سے اسے استعمال کرو۔ تم نے میرا دل خوش کرنے کی کوشش کی ہے اور میں تمہارا دل خوش کرتا ہوں۔ ہردوار میں میں نے دنیا سے منہ موڑا تو تھوڑی سی طاقت

میرے ہاتھ میں آگئی۔ میں نے رات اس لڑکی کو سامنے بٹھا کر وہ طاقت استعمال کی ہے اور اب تم دیکھو گے کہ اس لڑکی کی جوانی کبھی نہیں ڈھلے گی اور اس کا حسن ایسا ہی رہے گا جیسا اب ہے۔ بڑھاپے میں بھی جوان رہے گی۔ یہ تو ابھی تمہارے بھاگ جگائے گی۔ میں جتنے دن یہاں ہوں اس لڑکی کو میرے پاس بھیجتے رہنا۔ یہ تو تمہیں بھی جوان کردے گی۔ یہ رمزیں ہیں اور یہ راز ہیں جو تم نہیں سمجھ سکتے۔ اگر یہ لڑکی تمہارے گھر میں نہ ہوتی تو میری تمہاری ملاقات کبھی نہ ہوتی اور آج تم زندہ نہ ہوتے۔ تمہاری چیری پھاڑی ہوئی لاش کو اب تک ریچھ اور اس کے بچے، گِدھ اور گیدڑ کھا چکے ہوتے۔ یہ اس لڑکی کا ستارہ ہے جو اپنے بُرج میں آگیا اور میرے قدم اس طرف موڑ دیئے جس طرف خونخوار ریچھ تمہارے پیچھے دوڑ رہا تھا"۔

صغیر غیر معمولی ذہانت والا آدمی تھا۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ اس کی ذہانت اور فہم و فراست اوسط درجہ ذہانت والے لوگوں سے کئی درجے اوپر تھی۔ وہ اتنا ذہین اور عیّار فطرت نہ ہوتا تو اتنا کامیاب جاسوس اور تخریب کار نہ ہوتا۔ انڈین انٹیلی جنس اسے کسی قیمت پر ضائع کرنے پر آمادہ نہیں تھی۔

وہ انسانی فطرت کی کمزوریوں اور دکھتی رگوں کو، خصوصاً ہندوؤں کی ذہنیت اور توہم پرستی کو خوب سمجھتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ہندو ہر اُس واقعہ یا قدرت کے مظاہرے کو جو اس کی سمجھ سے بالا ہو، کسی دیوتا یا دیوی کا انعام یا عتاب مان لیتا ہے۔

پنڈت رمیش چندر اپنے علاقے اور خصوصاً اپنے گاؤں کا دیوتا بنا ہُوا تھا لیکن صغیر کی نگاہ میں اس پنڈت کی حیثیت سدھائے ہوئے بندر سے بہتر نہیں تھی۔ اگر صغیر دلجیت کور کے متعلق ایسی دو چار باتیں اور کرتا تو رمیش چندر اس لڑکی کی پوجا شروع کردیتا۔

صغیر کو سکھوں کی اس لڑکی کے ساتھ ایک دلچسپی تو یہ تھی کہ اپنی فطرت کی ایک خوبی یا خامی کے زیر اثر اسے اس ذلیل ماحول سے اور رمیش چندر کے ظالمانہ

چنگل سے آزاد کرانا چاہتا تھا۔ ایک دلچسپی یہ بھی تھی کہ اس نے لڑکی سے سناتھا کہ وہ جالندھر کے ایک مضافاتی گاؤں کی رہنے والی ہے اور اغوا ہوئی تھی تو صغیر کے تیز دماغ نے سوچ لیا کہ وہ بھی جالندھر جارہا ہے۔ اگر وہ اس لڑکی کو ساتھ لے جائے اور اس کے ماں باپ کے حوالے کردے تو وہ بہت خوش ہوں گے۔ تب وہ انہیں کہے گا کہ اسے اپنی پناہ میں رکھ لیں اور سرحد پار کرادیں۔ سرحد پار کرنا اس کے لئے کوئی مشکل کام نہیں تھا' وہ راہ راستے جانتا تھا۔ اسے دو تین دن رات پناہ کی ضرورت تھی۔

صغیر نے یہ تو سوچا ہی نہیں تھا کہ سکھوں کا کچھ پتہ نہیں چل سکتا کہ اس کا ردّعمل کیا ہوگا۔ سکھ اگر خوش ہو جائے تو اپنی جان بھی دینے پر آجاتا ہے اور اگر اسی خوش ہونے والی بات پر بگڑ جائے تو دوسرے کی جان لینے پر آجاتا ہے۔ دلجیت کور کا باپ یا اس کا بھائی کہہ سکتے تھے کہ اس لڑکی کو تم ہی اغوا کر کے لے گئے تھے اور اب واپس لے آئے ہو۔ اس صورت میں صغیر کے ساتھ لڑکی کی بھی خیر نہیں تھی۔

ایک جواں سال اور خوبصورت لڑکی کو ساتھ لئے پاپیادہ جالندھر پہنچنا بھی تو ایک مسئلہ تھا۔ بہرحال صغیر نے جو سوچ لیا تھا اس پر عمل کرنے کا وہ پختہ عزم کر چکا تھا۔

پنڈت رمیش چندر نے دلجیت کور کے متعلق یہ باتیں سنیں تو صغیر کا تیر ٹھکانے پر لگا۔ اس ہندو کی تو باچھیں ہی کھل گئیں۔

"تمہارا اپنا مال ہے سادھو مہاراج" — رمیش چندر نے کہا — "تمہاری ایک ایک بات پتھر پر لکیر ہے۔ لڑکی کو دن رات اپنے پاس رکھو۔ یہ کرپا کرو گے جو کہہ رہے ہو تو جو مانگو گے وہ تمہارے قدموں رکھ دوں گا"۔

رمیش کو سب سے زیادہ خوشی تو یہ سن کر ہوئی تھی کہ لڑکی اسے جوان کردے گی۔ کوئی مرد بوڑھا نہیں ہونا چاہتا۔ پاکستان اور بھارت کے لوگوں کی دو ہی خواہشات ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ ہاضمہ ٹھیک رہے اور دوسری یہ کہ جوانی سدا قائم

رہے۔

اس شام حکیم نے آکر صغیر کی پٹی کھولی اور زخم دیکھ کر کہا کہ چار پانچ دنوں تک زخم بھر جائیں گے۔ یہ لمبی خراشیں تھیں جو کندھے سے شروع ہوئیں اور کہنی سے نیچے تک چلی گئی تھیں۔ حکیم مرہم پٹی کر کے چلا گیا۔ رات کھانے کے بعد دلجیت کور صغیر کے پاس آگئی۔

○

لاہور بریگیڈ ہیڈ کوارٹر میں بریگیڈیر نے میجر عثمان کو اپنے دفتر میں بلایا اور اسے کہا کہ وہ فوراً راولپنڈی کے لئے روانہ ہو جائے' اسے آئی ایس آئی کے میجر جنرل نے فوری طور پر بلایا ہے۔ بریگیڈیئر کو پوری تفصیل سے معلوم تھا کہ میجر عثمان نے انڈیا کے کچھ جاسوسوں کے ٹھکانوں کی نشاندہی کی تھی اور کچھ انڈین ایجنٹ پکڑوائے ہیں۔ اس نے میجر عثمان کو خراجِ تحسین پیش کیا۔

بریگیڈیر کو یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ میجر عثمان خود دشمن کی انٹیلی جنس کے کسی رِنگ کا آدمی ہے۔ یہ صرف آئی ایس آئی والوں کو معلوم تھا۔

"میجر عثمان!" — بریگیڈیر نے کہا — "تم نے بہت بڑا جہاد کیا ہے۔ انڈیا کی "را" پاکستان میں اتنی دور اندر تک گئی ہوئی جیسے جسم میں وائرس شامل ہو گیا ہو اور جسم کے خون میں سر سے پاؤں تک گردش کرتا رہتا ہو"۔

"ایک نہیں سر!" — میجر عثمان نے کہا — "کئی مہلک امراض کے وائرس ہماری قوم اور ملکی رگوں میں اُترے ہوئے ہیں"۔

"تم خود آرمی آفیسر ہو عثمان!" — بریگیڈیئر نے کہا — "سب جانتے ہیں۔ لاکھوں کی نفری اور جدید اسلحہ بارود' ہزارہا فوج اور لڑاکا بمبار طیارے سے اور ایٹم بم بھی دشمن کے صرف ایک جاسوس کے سامنے بے کار ہو جاتے ہیں۔ تم نے دشمن کا ایک رِنگ توڑ دیا ہے تو سمجھو کہ دشمن کے سر پر تم نے ایک کاری ضرب لگائی ہے۔ یاد کرو ان مجاہدین اسلام کو جنہوں نے ایران اور روم کی جنگی طاقتوں کو خاک میں ملا دیا تھا۔ افسوس ہوتا ہے کہ ہم انہیں بھول گئے ہیں"۔

"افسوس تو ہوتا ہی ہے سر!" — میجر عثمان نے کہا — "وہ ایمان والے تھے اور ان کا کردار ایمان کے سانچے میں ڈھلا ہُوا تھا۔ اب تو اُس کردار کی ایک جھلک بھی نظر نہیں آتی"۔

"جھلک کہاں سے نظر آئے میجر عثمان!" — بریگیڈیئر نے کہا — "انڈین فلموں کے ذوق شوق نے ہماری ابھرتی نسل کے خون سے اپنی درخشاں اور قابلِ فخر روایات، خصوصاً عسکری روایات نکال کر جنسیات اور ہندوؤں کی محبت پیدا کر دی ہے۔ اس نسل کو ہندو کا اصل روپ کون دکھائے۔ یہ تو وہ روپ دیکھ رہے ہیں جو انہیں فلموں میں دکھایا جاتا ہے۔ وہ نہیں جانتے کہ یہ بہروپ ہے۔ یہ ہندو جب ہمارے نوجوانوں کو عورت اور روپے پیسے کی جھلک دکھاتا ہے تو وہ سود و زیاں کی پرواہ کئے بغیر اس کے ایجنٹ بن جاتے ہیں"۔

"کیا یہ علماء دین کا کام نہیں سر؟" — میجر عثمان نے کہا — "یہ علماء دین کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی قوم کے نوجوانوں کو اسلام کے راستے پر لائیں"۔

"علماء دین!" — بریگیڈیئر نے کہا اور اس کے ہونٹوں پر طنزیہ سی مسکراہٹ آگئی۔ کہنے لگا — "علماء دین نہ کہا کرو۔ صرف علماء کہنا کافی ہے، دین کو انہوں نے کہیں گم کر دیا ہے۔ انہوں نے قوم کو فرقہ بندی کے سوا دیا ہی کیا ہے؟.... قوم کے اتحاد کے پرخچے اڑا دیئے ہیں۔ صرف اتحاد ہی پارہ پارہ نہیں کیا بلکہ بھائی کو بھائی کا جانی دشمن بنا دیا ہے۔ قوم کو فرقوں میں بانٹ کر آپس میں خونی دشمنیاں پیدا کر دی ہیں۔ کیا تم نہیں سمجھ سکتے کہ ہماری آپس کی اس عداوت سے دشمن کو کتنا اور کیسا فائدہ پہنچ رہا ہے۔ بہرحال میجر عثمان، تم نے یہ جہاد کر کے جنّت میں اپنا گھر بنا لیا ہے"۔

بریگیڈیئر کو بتانے والا کوئی نہ تھا کہ وہ ایک ایسے شخص کے ساتھ بات کر رہا ہے جو خود انڈیا کی را کا بڑا سرگرم ایجنٹ ہے۔ میجر عثمان غریب بھی نہیں تھا کہ اسے روپے پیسے کا لالچ ہوتا۔ وہ روپے پیسے والے خاندان کا چشم و چراغ تھا اور ملک و مِلّت کا چراغ گُل کرنے کی خفیہ کوششوں میں مصروف تھا۔ میجر عثمان کا

خاندان پسماندہ یا اَن پڑھ بھی نہیں تھا۔ عثمان حسین لڑکیوں اور شراب کے نشے میں گم ہو گیا تھا اور اس کا بریگیڈیئر اسے خراجِ تحسین پیش کر رہا تھا۔

بریگیڈیئر نے میجر عثمان سے کہا کہ وہ ابھی روانہ ہو جائے اور رات راولپنڈی میں گزارے تاکہ علی الصبح آئی ایس آئی کے آفس میں موجود ہو۔ بریگیڈیئر نے اس سے ہاتھ ملایا اور میجر عثمان سیلوٹ کر کے اس کے دفتر سے نکل آیا۔

○

اگلی صبح میجر عثمان آئی۔ ایس۔ آئی کے ہیڈ کوارٹر راولپنڈی میں داخل ہوا۔ سب سے پہلے اس سے آئی ایس آئی کی لاہور برانچ کے میجر امتیاز کو دیکھا۔ اس سے عثمان نے پوچھا کہ وہ کب راولپنڈی آیا ہے اور پھر یہ پوچھا کہ اسے میجر جنرل نے کیوں بلایا ہے۔ میجر امتیاز نے کہا کہ وہ اپنی ایک ڈیوٹی کے سلسلے میں آیا ہے اور اسے یہ معلوم نہیں کہ اسے یعنی میجر عثمان کو کیوں بلایا گیا ہے۔

میجر امتیاز اسے ایک کرنل کے آفس میں لے گیا۔ اس نے کرنل سے بھی پوچھا کہ جنرل صاحب نے اسے کیوں بلایا ہے۔ کرنل نے جواب دیا کہ یہ جنرل ہی بتائیں گے۔ کرنل جنرل کے آفس میں چلا گیا اور فوراً ہی واپس آکر میجر عثمان سے کہا کہ وہ اندر چلا جائے۔

میجر عثمان جنرل کے دفتر میں داخل ہُوا اور سیلوٹ کیا۔ وہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میجر جنرل کرسی سے اٹھا اور آگے آکر میجر عثمان سے ہاتھ ملایا۔ وہ سمجھا کہ یہ جرنیل اس کے کارنامے پر اسے تعظیم دے رہا ہے۔ جرنیل نے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود اپنی کرسی پر جا بیٹھا۔

"میجر عثمان!" — جنرل نے کہا — "تمہاری نشاندہی پر بڑے ہی خطرناک جاسوس اور تخریب کار پکڑے گئے ہیں۔ ان کے ذریعے ہم اس رِنگ کے ہر ممبر کو پکڑ لیں گے۔ تم داد و تحسین کے مستحق ہو۔ یہ میں تمہیں پیش کرتا ہوں لیکن تھوڑی سی کسر رہ گئی ہے"۔

میجر عثمان نے سوالیہ نگاہوں سے جنرل کو دیکھا جیسے پوچھنا چاہتا ہو کہ کون کسر

رہ گئی ہے۔

"اب اپنی نشاندہی بھی کر دو"۔۔ جنرل نے کہا۔۔ "بس یہی ذرا سی کسر رہ
ہے"۔

میجر عثمان کو بجلی کے جھٹکے جیسا دھچکا لگا۔ اس کی آنکھیں کچھ زیادہ ہی کھ
گئیں اور چہرے پر حیرت کا تاثر آگیا لیکن آدمی ذہنی طور پر ہوشیار بلکہ
تھا' اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔

"میں کچھ سمجھا نہیں سر!"۔۔ میجر عثمان نے انجان بنتے ہوئے کہا۔

"تم سب سمجھتے ہو میجر عثمان!"۔۔ جنرل نے طنزیہ سی مسکراہٹ سے کہا۔
"پہلے تو یہ دیکھو کہ میں نے تمہاری کتنی عزت افزائی کی ہے۔ میں نے تمہیں س
سے آخر میں دیکھنا تھا۔ پہلے کسی میجر نے تم سے انٹیروگیشن کرنی تھی پھر ا
کرنل کی باری آنی تھی اور اس کے بعد وہ ضرورت سمجھتے تو تمہیں میرے سام
لاتے اور میں تمہارے ساتھ رسمی سی ایک آدھ بات کرتا لیکن تمہیں سب
پہلے میرے سامنے لایا گیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنی اس عزت افزائی کی کچھ ق
کرو۔ اب ایکٹنگ نہیں چلے گی۔ تمہارا کھیل ختم ہے میجر عثمان' تم ایک مع
خاندان کے فرد ہو۔ میں تمہارے خاندان کی عزت کو محفوظ رکھنا چاہتا ہوں۔
بولو' میں تمہاری مدد کروں گا"۔

"سر!"۔۔ میجر عثمان نے دبی دبی سی آواز میں کہا۔۔ "معلوم ہوتا
میرے کسی دشمن نے مجھ پر یہ اوچھا وار کیا ہے۔ میں آپ سے درخواست ک
ہوں کہ میرے خلاف آپ کے ذہن میں کوئی بات ڈالی گئی ہے تو اسے ایک غ
فہمی سمجھ کر ذہن سے نکال دیں"۔

"غلط فہمی نہیں میجر عثمان!"۔۔ آئی ایس آئی کے میجر جنرل نے ہونٹوں
لطیف سا تبسم لا کر کہا۔۔ "میں تمہاری خوش فہمی کی بات کر رہا ہوں۔ خوش فہمیو
کی عمر لمبی نہیں ہُوا کرتی عثمان!..... خوش فہمی جتنی حسین اور دل کش ہوتی
اس کی عمر اتنی ہی کم ہوتی ہے اور خطرہ یہ کہ یہ جب مرتی ہے تو بندے کو بھی سا

لے ڈوبتی ہے"۔

"معافی چاہتا ہوں سر!"۔۔ میجر عثمان نے کہا۔۔ "کیا آپ مجھے اصل بات
ناپسند کریں گے؟ میں ابھی تک کچھ نہیں سمجھا"۔

"میجر عثمان!"۔۔ اب کے جنرل نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔۔ "میں پہلے ہی کہہ
کا ہوں کہ تم سب سمجھتے ہو۔ اب یہ بتاتا ہوں کہ تمہارے خلاف ہمارے پاس
ہادت اتنی کافی اور قابل اعتماد ہے کہ تمہارے لئے نکل بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں
ہا۔ خود تمہاری اپنی آواز تمہارے خلاف بول رہی ہے..... اگر نہیں مانو گے تو ٹیلی
ن کی ایک ٹیپ سنا دوں گا۔ ایسی متعدد ٹیپیں میرے پاس پہنچ چکی ہیں۔ تم خود
پنے خلاف شہادت دے رہے ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم خود بول پڑو' اقبال جرم
رلو اور پھر میں دیکھوں گا کہ تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں لیکن تم مدد اور تعاون نہیں
رو گے تو اس کے جواب میں تمہارے لئے اذیت اور ایذا کے سوا کچھ بھی
یں"۔

آئی ایس آئی کے اس میجر جنرل کو قطعاً توقع نہیں تھی کہ میجر عثمان اس
ریختہ پتھر نکلے گا۔ میجر عثمان کے ڈھیٹ پن کو یہ خیال تقویت دے رہا تھا کہ
لیس مشتبہ پر کوئی الزام عائد کر کے اس انداز سے بات کرتی ہے جیسے اس کے
ن مکمل شہادت اکٹھی ہو گئی ہو پھر تھانے دار مشتبہ پر یہی دباؤ ڈالتا ہے کہ وہ
ال جرم کر لے۔ یہ تو اسے معلوم ہی تھا کہ جنرل اس پر کوئی جھوٹا الزام عائد
یں کر رہا لیکن اسے کچھ یقین سا تھا جیسے جنرل محض شک میں بات کر رہا ہو۔

صغیر کی طرح عثمان بھی اپنی قوم کا غدار تھا۔ اس کی نفسیات میں بھی وہ غیر
معمولی اوصاف پائے جاتے تھے جو کسی بھی انسان کو ایمان فروشی اور ملک فروشی پر
آمادہ کر لیا کرتے ہیں۔ ایسے آدمی اتنی آسانی سے ہتھیار نہیں ڈالا کرتے۔ عثمان
نے اپنے چہرے پر معصومیت اور مظلومیت کا ایسا تاثر پیدا کر لیا جیسے ابھی رو پڑے
گا۔

"میرے پاس اتنا وقت نہیں عثمان!"۔۔ جنرل نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔

"میں زیادہ دیر تک تمہاری میزبانی نہیں کرسکوں گا۔ فوراً بول پڑو"۔

"کوئی بات تو بتائیں سر!"۔۔۔ میجر عثمان نے کہا۔

"میں تمہاری یہ فرمائش بھی پوری کردیتا ہوں"۔۔۔ جنرل نے کہا۔۔۔ "بات ایک نہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ تم انڈین انٹیلی جنس کے بڑے سرگرم ایجنٹ ہو۔ اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش ہی نہیں کہ تم بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کے آفیسر ہو اور تم نے دشمن کو ایسے راز اور کاغذات دیئے ہیں جو ملک کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ تم نے اپنے رِنگ کے سرکردہ افراد کو پہلے ہی سے خبردار کردیا تھا کہ مکان خالی کرکے غائب ہو جاؤ...."۔

"سر!"۔۔۔ اب کے میجر عثمان نے پُرزور احتجاج کے لہجے میں کہا۔۔۔ "اگر آپ مجھے سزا ہی دلوانا چاہتے ہیں تو مجھے تھوڑی سی مہلت دے دیں تاکہ میں خودکُشی کرلوں"۔

"اب تم خودکشی نہیں کرسکو گے عثمان!"۔۔۔ جنرل نے جنرلوں کے دبدبے سے کہا۔۔۔ "تمہیں فوجی قانون کے مطابق سزا ملے گی۔ اگر صرف تم ایک ہی ملزم ہوتے تو مجھے اتنی باتیں کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی کیونکہ میرے پاس تمہارے خلاف مکمل شہادت موجود ہے لیکن تم سے تمہارے پورے رِنگ کی نشاندہی کروانی ہے۔ تم اپنے رنگ کے ایک ایک ممبر کو گرفتار کرواؤ گے۔ یہ نشاندہیاں تم نہیں کرو گے تو تم جانتے ہو ہم کس طرح ملزموں سے منوایا کرتے ہیں"۔

"میں آپ کو کس طرح یقین دلاؤں سر!"۔۔۔ میجر عثمان نے کہا۔۔۔ "مجھے معلوم نہیں کہ میرے خلاف کونسی شہادت آپ کے پاس پہنچی ہے"۔

"ایک بات غور سے سن لو عثمان!"۔۔۔ جنرل نے کہا۔۔۔ "یہ آئی ایس آئی ہیڈ کوارٹر ہے' اسے تھانہ نہ سمجھ لینا۔ میں اس ہیڈ کوارٹر کا ڈائریکٹر جنرل ہوں تھانے دار نہیں ہوں اور یہاں تھانوں والا مُک مکا نہیں چلے گا۔ میں تمہیں بڑی ہمدردی کے ساتھ نصیحت کرتا ہوں کہ یہاں کی انٹیروگیشن سے بچو۔ دو دنوں بعد

اپنے لئے اجنبی ہو جاؤ گے۔ اپنے آپ کو پہچان نہیں سکو گے اور پھر خود ہی اپنے جرم کی داستان سنا دو گے۔ اب میں تمہیں ایک سیکنڈ بھی وقت نہیں دوں

"میری ایک درخواست مان لیں سر!"۔۔۔ میجر عثمان نے کہا۔۔۔ "مجھے اس شہادت کی جھلک ہی دکھا دیں جو آپ کے پاس پہنچی ہے۔ ہو سکتا ہے یہ محض غلط فہمی ہو"۔

"میں نے کبھی کسی کی ایسی درخواست نہیں مانی تھی"۔۔۔ جنرل نے کہا۔۔۔ "تمہاری مان لیتا ہوں"۔

"کرنل کریم!"۔۔۔ میجر جنرل نے انٹر کام پر کہا۔۔۔ "وہ ٹیپیں لے آئیں"۔

کرنل کریم تو جیسے دروازے کے باہر ہی منتظر کھڑا تھا۔ جونہی جنرل نے یہ دیا' ایک دراز قد کرنل آفس میں داخل ہُوا۔

"میجر عثمان کو نمبر4 ٹیپ سنا دیں"۔۔۔ جنرل نے کرنل کریم سے کہا۔

چونکہ یہ ٹیپیں کورٹ مارشل میں میجر عثمان کے خلاف شہادت کے طور پر ا کرنی تھیں اس لئے ہر ٹیپ کو ایک نمبر الاٹ کردیا گیا تھا۔ کرنل کریم ٹیپ نے کا انتظام اپنے ساتھ لایا تھا۔ اس نے ایک ٹیپ لگا دی اور ایک ٹیلی فون پر نے والی گفتگو سنائی دینے لگی۔ یہ وہ گفتگو تھی جو جگ موہن کے گھر کسی نے نا کر کے جگ موہن کے نوکر کے ساتھ کی تھی۔ اس گفتگو کا پہلے ذکر آچکا ہے۔ ا فون کرنے والے نے دو تین مرتبہ میجر عثمان کا نام لیا تھا لیکن کوئی زیادہ بات بں کی تھی۔

"اب بتاؤ میجر عثمان!"۔۔۔ جنرل نے ٹیپ رکوا کر عثمان سے پوچھا۔۔۔ "اس گفتگو میں تمہارا نام کیسے آگیا ہے؟.... کیا اس میں کوئی شک باقی رہ گیا ہے کہ ان لوگوں کے ساتھ تمہارے اچھے خاصے تعلقات ہیں؟"

میجر عثمان اگر جنرل سے زیادہ نہیں تو اس جتنا ہی دماغ ضرور رکھتا تھا۔ اس کی یار ذہانت پوری طرح بیدار تھی۔ جنرل کا سوال سن کر وہ طنزیہ سی ہنسی ہنس پڑا۔

"سر! خود بھی کچھ سمجھنے کی کوشش کریں"۔۔۔ میجر عثمان نے کہا۔۔۔ "کیا آ
نہیں جانتے کہ انڈین انٹیلی جنس کس قدر تیز ہے اور انڈیا کی را ہمارے ملک ا
ہماری انتظامیہ کی رگوں میں اُتری ہوئی ہے؟ یہ نشاندہی میں نے کی تھی۔ ہم
سے ہی کسی نے انڈین انٹیلی جنس کے متعلقہ رِنگ لیڈر کو خبردار کر دیا اور اسے
نام بتایا ہوگا۔ اس ٹیلی فون کی گفتگو سے صاف ظاہر ہے کہ فون کرنے والا پوچھ
تھا کہ میجر عثمان تو نہیں آیا"۔

جنرل نے اپنے سامنے رکھی ہوئی ایک فائل کھولی اور تھوڑی سی ور
گردانی کرکے ایک صفحے پر پڑھنے لگا۔

"کرنل کریم!"۔۔۔ جنرل نے اس صفحے پر ہاتھ مار کر کہا۔۔۔ "ٹیپ نمبر گیارہ ا
بارہ لگاؤ"۔

کرنل کریم نے پہلے گیارہ نمبر ٹیپ لگائی پھر بارہ نمبر لگا دی۔ یہ وہ ٹیلی فو
گفتگو تھی جو عثمان کے گھر کے فون پر کسی نے کی تھی۔ ایک ٹیپ میں ایک لڑ
بول رہی تھی اور دوسری میں کوئی آدمی بات کر رہا تھا۔ جاسوس اتنے کچے ا
کم عقل نہیں ہُوا کرتے کہ وہ واضح الفاظ میں بات کریں' وہ اشاروں رمزوں
بات کیا کرتے ہیں۔ اس قسم کی گفتگو انٹیلی جنس کے لوگ ہی سمجھ سکتے ہیں۔

"سر!"۔۔۔ کرنل کریم نے کہا۔۔۔ "بارہ نمبر فون کراچی سے میجر عثمان کے گ
آیا تھا"۔

"میں اور زیادہ وقت ضائع نہیں کروں گا میجر عثمان!"۔۔۔ جنرل نے کہا۔
"تم انڈین انٹیلی جنس کے ایجنٹ ہو..... کہو ہاں یا نہیں!"

میجر عثمان نے ایک دو سیکنڈ سر جھکا کر سوچا اور پھر سر اٹھا کر اس طرح دا
اور بائیں ہلایا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اس الزام کو تسلیم نہیں کرتا۔ جنرل
کرنل کریم کو سر سے ہلکا سا اشارہ کیا۔

"آؤ میجر عثمان!"۔۔۔ کرنل کریم نے عثمان کو اٹھا لیا۔

کرنل کریم اور میجر عثمان جنرل کو سیلوٹ کر کے کمرے سے نکل گئے۔ آ

آئی لاہور برانچ کا میجر امتیاز باہر حکم کا منتظر کھڑا تھا۔ کرنل کریم میجر عثمان کو اس
کے پاس لے گیا۔

"میجر امتیاز!"۔۔۔ کرنل کریم نے کہا۔۔۔ "چیف نے حکم دے دیا کہ
انٹیروگیشن شروع کر دو لیکن میں تھوڑا سا رِسک لے لیتا ہوں۔ میجر عثمان کو الگ
بٹھاؤ اور اسے کچھ سمجھاؤ۔ کیا ہمارے لئے یہ کوئی اچھی بات ہے ہوگی کہ ہم اپنے
ایک اتنے عقل مند آفیسر کے ساتھ وہ سلوک کریں جو تھرڈ ریٹ ملزموں کے
ساتھ کیا کرتے ہیں؟"

"آپ کے آفس میں ہی نہ بیٹھ جائیں؟"۔۔۔ میجر امتیاز نے کہا۔۔۔ "آپ
بھی ہمارے ساتھ بیٹھیں"۔

کرنل کریم دونوں کو اپنے آفس میں لے گیا۔ میجر عثمان پر کچھ اور ہی قسم
کی خاموشی طاری تھی۔ تینوں آفس میں جا کر بیٹھ گئے اور وہ دونوں میجر عثمان کو
اقبال جرم پر آمادہ کرنے لگے لیکن میجر عثمان ابھی تک کسی خوش فہمی میں مبتلا تھا۔

"مجھے لاہور جانے دیں"۔۔۔ میجر عثمان نے کہا۔۔۔ "میں سوچ کر جواب دوں گا
اور خود یہاں آ کر بات کروں گا"۔

"میجر عثمان!"۔۔۔ کرنل کریم نے کہا۔۔۔ "تم شاید ابھی تک اس صورتِ حال
کو نہیں سمجھے جو تم نے خود ہی اپنے لئے پیدا کر لی ہے۔ میں بات صاف کر دیتا
ہوں۔ تم زیرِ حراست ہو۔ لاہور کی بات کرتے ہو' تم اب اس ہیڈکوارٹر سے بھی
باہر قدم نہیں رکھ سکتے۔ اپنے آپ پر رحم کرو۔ تمہارے نکلنے اور بچنے کی کوئی
صورت نہیں"۔

میجر عثمان نے کسی کے بتائے بغیر ہی دیکھ لیا تھا کہ وہ اب پکڑا گیا ہے اور اس
کے ٹیلی فون ٹیپ ہوتے رہے ہیں اور اب وہ نکل نہیں سکے گا لیکن اس کی فطرت
میں ایسا ڈھیٹ پن تھا کہ وہ پھر بھی اقبال جرم کی طرف نہیں آ رہا تھا۔ شاید اسے یہ
توقع تھی کہ اس کا رِنگ لیڈر مہندر جو ایم اے خان بنا ہُوا تھا' اپنے اثر و رسوخ سے
اسے چھڑا لے گا۔ اصل بات یہ تھی کہ عثمان اُن لوگوں میں سے تھا جو سمجھتے ہیں

کہ وہ اللہ کو بھی دھوکہ دے سکتے ہیں اور وہ کبھی بھی نہیں پکڑے جائیں گ
کرنل کریم باہر نکل گیا۔ دو آدمی کرنل کریم کے آفس میں آئے
عثمان کو اٹھا کر اپنے ساتھ لے گئے۔ یہ سب سویلین کپڑوں میں تھے لیکن
فوجی۔ پتہ نہیں چلتا تھا کہ ان کے عہدے کیا ہیں۔ یہ دونوں آدمی کوئی
بغیر میجر عثمان کو ہیڈ کوارٹر کے ایک ایسے حصے میں لے گئے جو کسی پہلو
ستھرا نہیں تھا۔

ایک نیم تاریک راہداری میں داخل ہوئے جس کے دونوں طرف
والے دروازے تھے۔ یہ ملزموں کے لئے سیل تھے۔ میجر عثمان کو ایک
دروازے پر روک لیا گیا۔ ایک آدمی نے تالا کھولا اور عثمان کو اندر داخ
دروازہ بند کر دیا اور تالا لگا دیا۔ اس سیل سے بدبو سی اٹھ رہی تھی اور فرش
بھی اور کچھ غلاظت سی بھی تھی۔ میجر عثمان فرش پر بیٹھ گیا اور پیٹھ دیوار
لگا کر سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

O

جالندھر کا وہ چوہدری جس کے بیٹے کو ہندوؤں کی سازش کے تحت
پاگل خانے میں بھجوا دیا گیا تھا' ایک بار پھر آگرہ اپنے بیٹے کو دیکھنے کے لئے
تھا۔ وہ عبدالستار کا مہمان تھا۔ اس کی حیثیت عبدالستار کی نگاہوں میں م
نہیں رہی تھی بلکہ ہمراز دوستوں جیسی ہو گئی تھی۔ عبدالستار نے اسے ا
پلان میں شامل کر لیا تھا جس پلان کے تحت ڈاکٹر عبدالرشید کو آگرہ کے پا
سے فرار کرانا تھا۔

اس چوہدری کا نام معراج دین تھا۔ اس چوہدری کو عبدالستار آسمان
ہوا فرشتہ سمجھ رہا تھا۔ پلان یہ تھا کہ ڈاکٹر عبدالرشید کو سرحد پار کروا
بھیجنا تھا لیکن عبدالستار اور ڈاکٹر رشید کے دوستوں کے پاس ایسا کوئی انتظا
کہ ڈاکٹر رشید کو سرحد کے قریب کہیں پناہ مل جائے۔ معراج دین اپنا
لے کر عبدالستار کے ایک دوست کی معرفت آ گیا۔

عبدالستار کو پتہ چلا کہ چوہدری معراج جالندھر کا رہنے والا ہے تو اسے اعتماد
لے کر اپنے پلان میں شامل کر لیا۔ چوہدری معراج کا صرف ایک مسئلہ تھا کہ
اس کے بیٹے کا علاج ہو جائے ورنہ وہ باقی عمر پاگل خانے میں ہی گلتا سڑتا مرجائے
گا۔ یہ ذمہ داری عبدالستار نے اپنے کندھوں پر لے لی تھی اور وعدہ کیا تھا کہ
چوہدری کا بیٹا صحیح ہو کر یہاں سے نکلے گا۔

چوہدری معراج دین نے عبدالستار سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ڈاکٹر رشید کو چند
دنوں کی نہیں بلکہ کئی مہینوں کی پناہ دے سکتا ہے اور پوری حفاظت سے اسے
پاکستان پہنچا دے گا۔ اس کی اس نے وجہ یہ بتائی تھی کہ 1947ء میں اس کی چھوٹی
بہن سکھوں نے اغوا کر لی تھی اور اب ہندوؤں نے اس کے بیٹے کو عدالت سے
پاگل قرار دلوا کر پاگل خانے میں بھجوا دیا تھا۔

اب چوہدری معراج بیس بائیس دنوں بعد دوسری مرتبہ اپنے بیٹے کو دیکھنے
آیا تھا۔ عبدالستار نے اس کے بیٹے کو ڈاکٹر ولیم نام کے ایک عیسائی ڈاکٹر کے
حوالے کر دیا تھا جو ڈاکٹر عبدالرشید کا بھی علاج کر رہا تھا۔ ڈاکٹر ولیم بھی دل میں
ہندوؤں کی نفرت لئے ہوا تھا۔ پاگلوں کی اس بارک کے قریب خاصا کشادہ حصہ تھا
جس میں درخت بھی تھے' بعض درختوں پر بیلیں بھی چڑھی ہوئی تھیں اور پودے
بھی تھے۔ یہ لوگ ایک ایسی جگہ جا بیٹھے جہاں انہیں کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ پاگل
خانے کا ڈاکٹر انچارج اپنی روزمرہ راؤنڈ پوری کر کے چلا گیا تھا۔ یہ راؤنڈ محض ایک
رسم تھی۔ وہاں اسے ہی نہیں بلکہ کسی بھی ڈاکٹر کو کسی ذہنی مریض کے ساتھ
دلچسپی نہیں تھی۔ اگر کسی کے ساتھ دلچسپی تھی تو یہ محض کاروبار تھا۔ ایسے خوش
قسمت ذہنی مریضوں کے لواحقین ڈاکٹروں کو باقاعدہ نقد رقمیں دیتے تھے جو
رشوت تھی لیکن ڈاکٹر اسے فیس کہتے تھے۔

ڈاکٹر رشید بھی آ گیا تھا۔ وہ ذہنی طور پر پہلے سے بہتر معلوم ہوتا تھا۔ ظاہری
طور پر محسوس ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ ذہنی مریض ہے۔ عبدالستار نے اس سے پوچھا
کہ وہ فرار کے لئے اور جالندھر تک سفر کے لئے تیار ہے؟

"بالکل تیار ہوں" — ڈاکٹر عبدالرشید نے کہا — "ایمرجنسی میں اور کسی اچانک آ جانے والی مصیبت میں انسان کی تمام ڈھکی چھپی قوتیں اور صلاحیتیں از خود ہی بیدار ہو جایا کرتی ہیں۔ میں تو ڈاکٹر ہوں۔ یعنی قوتوں کو بیدار کرنا اور بیدار رکھنا جانتا ہوں۔ ڈاکٹر ولیم نے مجھ پر بہت محنت کی ہے اور میں نے خود بھی اپنی روحانی قوت کو ابھارنے کی بہت کوشش کی ہے اور اللہ کے حضور رکوع و سجود کرتا رہتا ہوں۔ یہاں سے نکالنا آپ کا کام ہے۔ جالندھر تک بیداری کی حالت میں پہنچنا میری ذمہ داری ہے"۔

"لیکن ڈاکٹر صاحب!" — عبدالستار نے مسکراتے ہوئے کہا — "آپ نے اپنے لئے یہ مشکل پیدا کرلی ہے کہ نرس خالدہ کو بھی ساتھ لے جائیں گے۔ مرد تو مشکل برداشت کرسکتا ہے' میں ڈرتا ہوں کہ ایسی صورت پیدا نہ ہو جائے جس میں ایک لڑکی پاؤں کی زنجیر بن جائے"۔

"آنے دیں عبدالستار صاحب!" — چوہدری معراج دین نے کہا — "یہ لوگ اپنی گاڑی میں میرے گاؤں تک آئیں گے۔ انہیں پیدل تو نہیں آنا کہ لڑکی چل نہیں سکے گی۔ آگے سنبھالنا اور لڑکی کو محفوظ رکھنا میری ذمہ داری ہے"۔

"ایک بات بتائیں ڈاکٹر صاحب!" — عبدالستار نے ڈاکٹر رشید سے پوچھا — "اگر لڑکی نہ آسکی تو پھر آپ کیا کریں گے؟"۔

"یہاں سے نکلوں گا" — ڈاکٹر رشید نے جواب دیا — "اس پاگل خانے میں بالکل ہی پاگل ہو جانے کے لئے تو نہیں رکا رہوں گا.... میں اس لڑکی سے یہ توقع رکھتا ہی نہیں کہ اپنے ماں باپ کو صدمہ پہنچائے لیکن مجھے کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ وہ آجائے گی۔ میں جانتا ہوں کہ اس کے دل میں میری کتنی محبت ہے۔ محبت کے علاوہ اسے یہ بھی معلوم ہے کہ وہ اسی ہسپتال میں رہی تو میری غیر موجودگی میں ہندو ڈاکٹر اسے آبرو باختہ بنا ڈالیں گے۔ اس نے مجھے دو ڈاکٹروں کا رویہ بتایا بھی تھا۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں اسے صرف محبت کی خاطر اپنے ساتھ لے جانا چاہتا

ہوں بلکہ اس کی عزت و آبرو صرف اس طرح محفوظ رہ سکتی ہے کہ وہ میرے ساتھ چلی چلے۔ میں نے اپنے دوستوں کو یہ ساری بات بتا دی تھی"۔

عبدالستار' ڈاکٹر رشید اور چوہدری معراج نے کچھ دیر کے بحث مباحثے اور تبادلہ خیالات کے بعد فرار کا پلان تیار کرلیا اور اسے آخری شکل دے دی۔ چوہدری معراج نے ایک بار پھر کہا کہ اسے یہاں آنے کی ضرورت نہیں یہ تو ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ اسے یہ بتایا جاتا کہ ڈاکٹر رشید اس کے پاس جالندھر فلاں اور فلاں دن وقت پہنچے گا۔

"کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی" — چوہدری معراج نے کہا — "میں عبدالستار صاحب کو کاغذ پر بالکل صحیح آسان راستہ بتا دوں گا ذرا سی بھی پیچیدگی نہیں ہوگی۔ اگر لڑکی ساتھ آگئی تو بھی کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوگا"۔

"میں آج ہی وہاب صاحب کو خط لکھ دوں گا" — عبدالستار نے کہا — "لڑکی کے متعلق اس طرح لکھوں گا کہ ہمشیرہ ساتھ آنا چاہے تو بے فکر ہو کر آجائے۔ باقی تحریر بھی ایسی لکھوں گا کہ خط غلط ہاتھوں میں چلا گیا تو کسی کو ذرا سا بھی شک نہیں ہوگا.... چوہدری صاحب! اب ہمیں چلنا چاہئے' بہت دیر ہوگئی ہے"۔



ڈاکٹر عبدالرشید کے دوست' وہاب' اشتیاق اور ظفر آگرہ آئے اور عبدالستار کے ذریعے ڈاکٹر عبدالرشید سے مل کر واپس انبالہ گئے تھے تو وہاب خالدہ سے ملا تھا۔ ڈاکٹر رشید نے اپنے دوستوں سے بڑے ہی جذباتی انداز میں کہا تھا کہ وہ خالدہ کے بغیر نہیں جائے گا۔

اگر یہ معاملہ صرف جذبات کا ہوتا تو ڈاکٹر رشید کے دوست اسے یہی مشورہ دیتے کہ وہ ایک لڑکی کے پیچھے اپنی زندگی تباہ نہ کرے۔ وہ جانتے تھے کہ ڈاکٹر رشید پکڑا گیا تو اس کی باقی عمر جیل میں گزرے گی۔ انڈین انٹیلی جنس والوں نے اپنا مقصد پورا کرلیا تھا۔ وہ خوش تھے کہ ڈاکٹر رشید اس حد تک پاگل ہو گیا ہے جس حد

سے کبھی واپس نہیں آتا۔ یہاں معاملہ خالدہ کی عزت و آبرو کا تھا۔ خالدہ نے ڈاکٹر رشید کو بتایا تھا کہ اس فوجی ہسپتال کا میجر ڈاکٹر جس کے ماتحت خالدہ نرس تھی اسے دن میں ایک دو مرتبہ اپنے آفس میں بلا کر گود میں بٹھا لیتا ہے اور بڑی معیوب سی حرکت کرتا ہے۔ خالدہ اس جاب سے دست بردار ہو جاتی تو اس کی عزت محفوظ رہ جاتی لیکن وہ اپنی بیمار ماں کی خاطر اور اپنے چھوٹے بھائیوں کو تعلیم دلوانے کی خاطر اس ذریعہ آمدنی سے دست بردار نہیں ہو سکتی تھی۔ والد کی پنشن سے تو دال روٹی بھی بڑی مشکل سے پوری ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ والدہ دمے کی مریض تھیں۔ ڈاکٹر رشید نے خالدہ کے ساتھ شادی کا جو فیصلہ کیا تھا اس کی وجہ یہی تھی۔ وہ خالدہ کو اپنی پناہ میں لینا چاہتا تھا۔

ڈاکٹر رشید کے اس فیصلے کے پیچھے محبت تو تھی ہی لیکن زیادہ تر ایک مسلمان کا جذبہ کارفرما تھا جس کے تحت وہ ایک مسلمان لڑکی کی عزت و آبرو ہندوؤں سے بچانے کا تہیہ کر چکا تھا۔ یہ تھی بنیاد ڈاکٹر رشید اور خالدہ کی محبت کی۔

ڈاکٹر رشید کا کوئی دوست کبھی خالدہ سے نہیں ملا تھا نہ کسی دوست نے کبھی ایسے اشتیاق کا اظہار کیا تھا۔ کہ جسے ڈاکٹر رشید اتنا چاہتا ہے اس لڑکی کو ایک نظر دیکھ تو لے۔ اب یہ دوست ڈاکٹر رشید کو آگرہ کے پاگل خانے میں مل آئے اور خالدہ کے متعلق اس کے جذبات دیکھے تو انہوں نے شدید ضرورت محسوس کی کہ خالدہ سے ملا جائے۔ ان میں وہاب عمر میں بڑا اور عقل میں بھی بڑا تھا۔ یہ کام اس نے اپنے ذمے لے لیا۔

آگرہ سے واپس آنے کے اگلے ہی روز وہاب فوجی ہسپتال چلا گیا۔ ایک نرس سے خالدہ کا پوچھا اور اس طرح اسے خالدہ مل گئی لیکن وہ ڈری اور سہمی ہوئی تھی کیونکہ وہاب اس کے لئے اجنبی تھا۔ اس نے وہاب سے پوچھا کہ وہ کون ہے اور کیوں آیا ہے۔

"میں ڈاکٹر رشید کا دوست ہوں" ۔۔۔ وہاب نے کہا ۔۔۔ "اس کا ایک پیغام لایا ہوں"۔

"معاف کیجئے، میں کسی ڈاکٹر رشید کو نہیں جانتی" ۔۔۔ خالدہ نے رندھی ہوئی آواز میں کہا اور واپس مڑی

"خالدہ!" ۔۔۔ وہاب نے اسے روک لیا ۔۔۔ "تمہارا فوری ردعمل یہی ہونا چاہئے تھا لیکن مجھ پر بھروسہ کرو۔ مجھ سے غلطی ہوئی کہ رشید سے تحریری پیغام نہیں لایا یا کسی قسم کی کوئی نشانی ہی لے آتا۔ میں خوش ہوں کہ تم نے فوراً ہی مجھ پر اعتماد نہیں کر لیا"۔

"کہاں ہے وہ؟" ۔۔۔ خالدہ نے بے رخی کے سے لہجے میں پوچھا اور خود ہی اپنے سوال کا جواب دیا ۔۔۔ "وہ عمر قید بھگتنے کے لئے جیل میں قید ہو گیا ہے' یہ معلوم نہیں کون سے شہر میں.... آپ اسے کس جیل میں ملے تھے؟"

"وہ کسی جیل میں نہیں خالدہ بہن!" ۔۔۔ وہاب نے کہا ۔۔۔ "آگرہ کے پاس پاگل خانے میں ہے"۔

خالدہ کے جسم کو ایسا جھٹکا لگا جیسے وہاب نے اس کے جسم کے ساتھ بجلی کے ننگے تار لگا دیئے ہوں۔ اس جھٹکے کا تاثر اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا۔

"پاگل خانے میں؟" ۔۔۔ خالدہ نے یوں کہا جیسے اس کے ہونٹوں سے سسکی پھسل گئی ہو ۔۔۔ "وہ کیوں؟" ۔۔۔ خالدہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"اتنی لمبی بات یہاں تو نہیں بتا سکتا" ۔۔۔ وہاب نے کہا ۔۔۔ "مجھے کہیں باہر ملنے کا وقت دے دو تو میں ساری بات اور تمہارے متعلق اس کے جذبات سناؤں ....تم مجھے کیا سمجھی ہو؟"۔

"میں تو بات کرتے بھی ڈرتی ہوں" ۔۔۔ خالدہ نے کہا ۔۔۔ "ڈاکٹر رشید پکڑا گیا تو ادھر میری مصیبت شروع ہو گئی۔ انٹیلی جنس کے آفیسر کبھی مجھے اپنے دفتر میں بلا لیتے اور سارا سارا دن بٹھائے رکھتے اور کچھ وقت یوں صرف کرتے کہ مجھ سے ڈاکٹر رشید کے متعلق معلوم کرنے کی کوشش کرتے۔ وہ مجھے بڑے ہی برے بلکہ شرمناک نتائج کی دھمکیاں دیتے تھے۔ کہتے تھے کہ تم نے ڈاکٹر رشید کے ساتھ مل کر ایک زخمی پاکستانی کو ہسپتال سے فرار کروایا ہے۔ میں ہی جانتی ہوں کہ میں نے

ان لوگوں سے کس طرح نجات حاصل کی تھی؟ وہ بات ختم ہوگئی ہے لیکن خوف اور خطرہ ابھی تک میرے ذہن اور دل پر آسیب کی طرح سوار ہے۔ میں آپ کو بھی انٹیلی جنس کا آدمی سمجھتی ہوں"۔

"میرے پاس تمہارے دل میں اپنا اعتماد پیدا کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں"۔ وہاب نے کہا۔۔۔"زیادہ سے زیادہ میں یہی کرسکتا ہوں کہ جاکر قرآن لے آؤں اور ہاتھ میں رکھ کر تمہارے ساتھ بات کروں لیکن تم کہہ سکتی ہو کہ قرآن تو ہندو بھی ہاتھوں میں لے کر جھوٹ بول سکتے ہیں .... یا میں یہ کرسکتا ہوں کہ تمہیں اپنے گھر کا ایڈریس بتا دوں اور تم میرے گھر جاکر میری والدہ اور بچوں سے ملو۔ میرا گھر ڈاکٹر رشید کے محلے میں ہی ہے۔ ڈاکٹر رشید کے دو اور دوست بھی ہیں۔ ہم تینوں ڈاکٹر رشید سے آگرہ پاگل خانے میں مل آئے ہیں۔ ان دونوں دوستوں کے گھروں کے بھی ایڈریس بتا دوں گا اور جس شخصیت نے ہماری ملاقات ڈاکٹر رشید سے کرائی اس کے گھر کا ایڈریس بھی بتا دیتا ہوں"۔

خالدہ اور وہاب کے درمیان کچھ دیر اور باتیں ہوئیں۔ خالدہ کچھ کچھ قائل ہوتی نظر آئی۔ اس کے دل میں ڈاکٹر رشید کی جو محبت تھی وہ اس کی کمزوری بن گئی اور آخر اس نے وہاب سے ملنے پر رضامندی کا اظہار کردیا۔ اُس روز غروب آفتاب سے پہلے انہوں نے ملاقات کا وقت مقرر کرلیا اور ملاقات کی جگہ انبالہ کینٹ کے باغ کی طے ہوئی۔

خالدہ وقت پر پہنچ گئی۔ وہاب وہاں پہلے موجود تھا۔ خالدہ کے چہرے پر اب بھی ایسا تاثر تھا جیسے وہ ڈری ہوئی ہو۔

"خالدہ!"۔۔۔ وہاب نے اسے ایک بینچ پر بٹھا کر کہا۔۔۔"اب دل میں سے ہر طرح کا خوف نکال دو اور میری بات غور سے سنو"۔

"نہیں بھائی جان!"۔۔۔ خالدہ نے جذباتی انداز میں کہا۔۔۔"آپ کو بعد میں سنوں گی پہلے مجھے رشید کے متعلق بتائیں کہ وہ کہاں ہے اور کیسا ہے اور اگر وہ واقعہ یہ آگرہ کے پاگل خانے میں ہے تو وہاں تک کس طرح پہنچا ہے"۔

وہاب نے اسے پوری پوری تفصیلات سنا دیں پھر یہ بتایا کہ اللہ نے کیا سبب بنایا کہ تین دوست آگرہ جا پہنچے اور ڈاکٹر رشید سے ملے۔

"دیکھو خالدہ!"۔۔۔ وہاب نے یہ ساری روئیداد سنا کر کہا۔۔۔"اللہ اپنے نیک بندوں کی مدد کرنے پر آتا ہے تو معجزے رونما ہو جایا کرتے ہیں۔ پاگل خانے میں ایک عیسائی ڈاکٹر مل گیا جو ہندوؤں کے ہاتھوں کا ستایا ہُوا تھا۔ اس نے ڈاکٹر رشید کی ساری بات بلکہ آپ بیتی سنی تو اس ڈاکٹر نے باقاعدہ علاج شروع کردیا۔ پھر اللہ نے جالندھر سے ایک آدمی کو بھیج دیا۔ اس کے ساتھ عبدالستار صاحب کی بات ہوئی تو اس نے کہا ڈاکٹر صاحب کو جالندھر اس کے پاس بھیج دیا جائے اور وہ انہیں پاکستان میں داخل کردے گا"۔

"میری ابھی تسلی نہیں ہوئی بھائی جان"۔۔۔ خالدہ نے کہا۔۔۔"یہ بتائیں کہ رشید اب ذہنی طور پر ٹھیک بھی ہُوا ہے یا نہیں"۔

"یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے"۔۔۔ وہاب نے خالدہ کو بتایا۔۔۔"انٹیلی جنس کے آفیسر وہاں گئے تھے اور ڈاکٹر رشید نے پاگلوں جیسی ایکٹنگ شروع کردی اور پاگل خانے کے ڈاکٹر انچارج نے فیصلہ دے دیا کہ یہ شخص لاعلاج حد تک پاگل ہوچکا ہے۔ انٹیلی جنس کے افسر بہت خوش ہوئے کہ یہ شخص عمر بھر کے لئے بے کار ہوگیا ہے اور اسے پوری سزا ملی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر رشید کچھ عیسائی ڈاکٹر کے علاج سے اور باقی اپنی کوششوں سے اور اللہ کی عبادت اور وظائف سے ٹھیک ہوگیا ہے۔ ہمیں وہاں بتایا گیا تھا کہ ڈاکٹر انچارج راؤنڈ پر جاتا ہے تو ڈاکٹر رشید پاگلوں جیسی حرکتیں کرتا ہے۔ ویسے وہ ٹھیک رہتا ہے"۔

پاگل خانے سے رشید کو فرار کرانے کے متعلق وہاب نے خالدہ کو پوری بات سنائی یہ بھی کہ ڈاکٹر رشید فرار کے لئے تیار بھی ہے اور اس کی ذہنی صحت بھی اس قابل ہوگئی ہے کہ بلا خوف و خطر فرار ہوسکے گا۔

"لیکن خالدہ بہن!"۔۔۔ وہاب نے کہا۔۔۔"ڈاکٹر رشید نے کہا ہے کہ وہ خالدہ کو یہاں چھوڑ کر پاکستان نہیں جائے گا۔ اس کی اس نے ایک وجہ تو یہ بتائی ہے کہ

یہ اس کا اور خالدہ کا جذباتی معاملہ ہے اور دوسری وجہ یہ کہ وہ تمہیں چھوڑ کر چلا گیا
تو تمہارے ساتھ ہسپتال کے یہ فوجی ڈاکٹر بہت برا سلوک روا رکھیں گے"۔

"اس نے ٹھیک سوچا ہے" — خالدہ نے پوری بات سنے بغیر کہا— "جذباتی
معاملہ تو اپنی جگہ ہے ہی لیکن دوسری وجہ میرے لئے روز بروز بد سے بدتر ہوتی جا
رہی ہے۔ یہاں تک کہ میرے وارڈ کا انچارج میجر ڈاکٹر پہلے ہی مجھے اپنی داشتہ
بنانے کی کوششوں میں لگا ہُوا تھا۔ مجھے اپنے آفس میں بلا کر بڑی گھٹیا سی رومانی
حرکتیں اور باتیں کرتا تھا لیکن اب اس نے مجھے صاف کہہ دیا ہے کہ میں ہندو ہو
جاؤں اور اس کے ساتھ شادی کرلوں۔ میں نے انکار بھی نہیں کیا اور رضامند بھی
نہیں ہوئی جو میں کبھی نہیں ہوں گی لیکن اس خبیث میجر نے کہا ہے کہ تم جاب
چھوڑ کر چلی جاؤں گی تو میں تمہیں اغوا کر کے زبردستی ہندو بناؤں گا اور تمہارے
ساتھ بیاہ رچاؤں گا۔ اب بتائیں بھائی جان' میں کیا کروں!"

"وہی کرو جو ڈاکٹر رشید کہہ رہا ہے" — وہاب نے کہا— "ہم تمہیں آگرہ
تک لے جائیں گے اور عبدالستار صاحب کے گھر رکھیں گے۔ پھر رشید کو باہر نکالا
جائے گا اور تم دونوں کو جالندھر پہنچا دیا جائے گا۔ مجھے اللہ کی درگاہ میں پوری امید
ہے کہ ہمارا یہ پلان کامیاب ہو گا۔ اللہ خود ہی اسباب اور ذرائع پیدا کرتا چلا جاتا
ہے.... کیا تم تیار ہو؟"

"بالکل تیار ہوں" — خالدہ نے دو ٹوک لہجے میں کہا— "میں رشید کو نیک
آدمی کہا کرتی تھی لیکن اب اسے فرشتہ کہوں گی۔ رشید امیر باپ کا بیٹا ہے اور میں
ایک غریب خاندان کی لڑکی ہوں لیکن رشید میرا محافظ بن گیا۔ شاید آپ بھی
جانتے ہوں' مجھے تو اچھی طرح معلوم ہے کہ اس کے لئے امیر گھرانوں کی
خوبصورت لڑکیوں کے رشتے پیش کئے جا رہے تھے لیکن میری خاطر اس نے سب
رشتے ٹھکرا دیئے۔ وہ کہا کرتا تھا کہ میں شادی کے بعد تمہیں جاب سے ہٹا دوں
اور تمہارے گھر کے اخراجات اپنے ذمے لے لوں گا....

"پھر دیکھئے بھائی جان رشید نے اس پاکستانی زخمی کو کس قدر خطرہ مول لے

کر فرار کروایا تھا اور پھر یہ ذمہ داری بھی اپنے سر لے لی تھی کہ اس پاکستانی کو زندہ
و سلامت سرحد پار کرائے گا۔ آپ کو تو ہر بات معلوم ہے۔ آپ یہ بھی جانتے
ہوں گے کہ اس نے انٹیلی جنس والوں کی حراست میں کتنا اور کس قسم کا ٹارچر
برداشت کیا ہو گا اور اس ٹارچر نے اس کا ذہنی توازن ہی تباہ کر دیا۔ اس طرح وہ
پاگل خانے تک پہنچ گیا۔ اب آپ کی زبان سے معلوم ہُوا ہے کہ آپ نہیں چار
دوست بھی اس کے ساتھ تھے۔ یہاں سے میں نے رشید کو فرشتہ سمجھنا شروع
کر دیا۔ اگر وہ میری رفاقت چاہتا ہے تو میں اس کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دے
دوں گی۔ میں اس لئے بھی یہاں سے بھاگ جانا چاہتی ہوں کہ یہاں رہی تو وہ
ابلیس پھر مجھے زبردستی ہندو بنا دے گا۔ میں اسلام سے اپنے آپ کو خارج کرنے
کی بجائے خودکشی کر لینا بہتر سمجھوں گی.... البتہ ایک غم مجھے کھاتا رہے گا۔ سوچتی
ہوں اباجان' امی اور میرے چھوٹے بھائیوں کا کیا بنے گا اور انہیں کس کے حوالے
کر کے جاؤں!"

"اللہ کے حوالے" — وہاب نے کہا— "ہم تینوں دوست ڈاکٹر رشید کے
ساتھ یہ بات طے کر چکے ہیں۔ ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ تمہارے اباجان کی مالی
اعانت ہم دوست باقاعدگی سے کرتے رہا کریں گے۔ اس کے ساتھ ہی ہم یہ
کوشش بھی کرتے رہیں گے کہ تمہاری اس فیملی کو پاکستان پہنچا دیں۔ یہ تو دور کی
بات ہے' انہیں ہم کسی پریشانی اور تنگ دستی میں مبتلا نہیں ہونے دیں گے"۔

"بھائی جان!" — خالدہ نے آہ بھر کر کہا— "میری عمر دیکھیں آج نہیں تو
چند مہینوں یا ایک سال بعد مجھے پرائے گھر چلے جانا ہے۔ میرا خاوند یا سسرال والے
تو میرے والدین اور بھائیوں کی مالی اعانت نہیں کریں گے۔ تو پھر کیوں نہ میں اس
آدمی کے ساتھ چلی جاؤں جو میری رفاقت چاہتا ہے اور جس کا صحیح حق ہے کہ میں
اس کی یہ خواہش پوری کروں۔ آپ نے ٹھیک کہا ہے کہ انہیں اللہ کے حوالے
کر دوں"۔

وہاب نے اس کی حوصلہ افزائی کی اور مزید یقین دلایا کہ اس کے والدین اور

بھائیوں کو وہ تنہا نہیں چھوڑیں گے۔ اس کے بھائیوں کی تعلیم مکمل کروائی جائے
گی اور پھر بڑے لڑکے کو کہیں نہ کہیں نوکری بھی دلوا دیں گے۔"

اب خالدہ کے دل پر وہاب کا جو ڈر تھا وہ صاف ہو گیا تھا۔ وہاب نے اسے
آخری بات یہ بتائی کہ وہ عبدالستار کے خط کا انتظار کر رہا ہے۔ عبدالستار نے اگر
لکھا کہ وہ آگرہ آ جائیں تو خالدہ ان کے ساتھ جائے گی.... ہمیشہ کے لئے!

خالدہ نے فیصلہ کر لیا کہ وہ جونہی وہاب سے اشارہ پائے گی' اس کے ساتھ
چل پڑے گی۔



صغیر کو پنڈت رمیش چندر کے ہاں چھ دن گزر گئے تھے۔ حکیم نے پانچویں
روز مرہم پٹی کی چھٹی کرادی تھیں خراشوں میں دو خراشیں گہری تھیں۔ وہ بھی
مل گئی تھیں چھٹے روز حکیم نے ویسے ہی ایک دوائی ان خراشوں پر مل دی تھی۔
صغیر خود بھی محسوس کر رہا تھا کہ اس کے زخم بالکل ٹھیک ہو گئے ہیں۔ اب وہ وہاں
سے نکلنے کی سوچ رہا تھا۔

اسے اگر اکیلے نکلنا ہوتا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ کسی بھی رات وہ اٹھ کر
نکل جاتا اور جالندھر کی طرف رخ کر کے چل پڑتا۔ رمیش چندر کے جاگتے تک وہ
بڑی دور تک پہنچ چکا ہوتا لیکن اس نے اپنے ذمے یہ مسئلہ لے لیا تھا کہ دلجیت
کور کو بھی اپنے ساتھ لے جانا ہے۔ دلجیت کور سکھوں کی بیٹی تھی جو فطری طور پر
جفاکش ہوتے ہیں۔ وہ خوبصورت اور بڑے اچھے قد کاٹھ کی لڑکی تھی لیکن وہ
روایتی نازک اندام لڑکیوں جیسی نہیں تھی۔ اس نے صغیر کو یقین دلایا تھا کہ وہ
گھوڑے کی چال چلے گی اور اس پر کسی قسم کا بوجھ نہیں بنے گی۔ اس کے باوجود یہ
مسئلہ اپنی جگہ موجود تھا کہ وہ دل کش لڑکی تھی۔ راستے میں اسے ڈاکو یا کوئی غنڈہ
بدمعاش یا جرائم پیشہ آدمی مل سکتے تھے۔ بہرحال صغیر نے عہد کر لیا تھا کہ دلجیت
کور کو اپنے ساتھ لے جائے گا۔

اس خوبصورت لڑکی نے صغیر کے لئے ایک اور ہی قسم کی مشکل پیدا کر دی

تھی۔ وہ دل کش لڑکی تھی' رات کی تنہائی میں اس کے پاس رہتی تھی اور اس
مقصد کو اس لڑکی نے قبول کر رکھا تھا جس مقصد کے لئے رمیش چندر نے اسے
صغیر کی خدمت پر مامور کیا تھا۔ وہ تو حیران ہوتی تھی کہ صغیر اس کے اتنے اشتعال
انگیز جسم کے ساتھ دلچسپی کیوں نہیں رکھتا۔

یہ لڑکی انسانی نفسیات کی سُوجھ بُوجھ نہیں رکھتی تھی۔ وہ تو اَن پڑھ اجڈ لڑکی
تھی جس کے ذہن پر نقش ہو چکا تھا عورت مرد کا کھلونا ہوتی ہے اور اسے مرد کی
تفریح طبع کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ صغیر کو اس کے اس عہد
نے کس جہنم میں ڈال رکھا ہے کہ وہ اس لڑکی کو تفریح کا ذریعہ نہیں بنائے گا۔ صغیر
کو اپنے خلاف بڑی ہی زبردست جنگ لڑنی پڑتی تھی۔ صغیر کوئی صوفی یا ولی نہیں
تھا' وہ تو گناہوں کی دنیا کا باسی تھا۔

پہلے دو راتیں تو صغیر اپنے اندر کی کشمکش سے اس قدر بے حال ہو گیا کہ اس
نے دو تین مرتبہ ہتھیار تقریباً ڈال ہی دیئے تھے لیکن اسے خیال آ گیا کہ اب تک
اللہ کی ذات باری اس کی مدد کر رہی ہے اور اگر وہ پھسل گیا تو نہ جانے اس کا انجام
کیا ہو۔ اس نے آخر دلجیت کور کو بتا ہی دیا کہ وہ اس کے اندر اشتعال کی آگ
بھڑکا دیتی ہے اور وہ اس آگ میں جلتا رہتا ہے۔

دلجیت کور کے پاس بڑا سیدھا اور واضح جواب تھا کہ میں ساری رات
تمہارے پاس رہتی ہوں تو تم اپنے آپ کو نہ جلایا کرو' جذبات کی بھٹی کو سرد کر لیا
کرو لیکن صغیر نے اسے کہا کہ وہ اس کے ساتھ عورتوں جیسی باتیں اور حرکتیں کیا
ہی نہیں کرے۔

"یہ بات ہے تو پھر میرے دل کی بات سن لو" — دلجیت کور نے سکھوں کی
مخصوص بے تکلفی سے کہا — "میرے دل میں مردوں کی نفرت بھری ہوئی ہے۔
رمیش چندر جب مجھے کسی آدمی کو تحفے کے طور پر پیش کرتا ہے تو میرا جی چاہتا ہے
کہ اس شخص کے منہ پر تھوک دوں۔ میں نے پہلی رات تمہیں دیکھا تو دل سے
نفرت کا طوفان اٹھا اور میرے دل سے یہ آواز اٹھی کہ تیرے زخموں میں پیپ پڑ

جائے اور تُو تڑپ تڑپ کر مرے۔ یہ تو دو راتیں تمہارے ساتھ گزار کر پتہ چلا کہ تم کسی اور ہی مخلوق میں سے ہو"۔

"اپنے دل میں میرے لئے نفرت ہی رکھو" — صغیر نے کہا۔ "اس سے مجھے یہ فائدہ ہو گا کہ یہ یقین آجائے گا کہ جس لڑکی کو میں رات بھر کے لئے اپنی لونڈی یا ملکیت سمجھتا ہوں وہ تو میرے منہ پر تھوکنے کو تیار رہتی ہے۔ اپنے آپ کو عورت سمجھنا چھوڑ دو یا مجھے مرد نہ سمجھو"۔

"میں تم سے نفرت نہیں کر سکتی" — دلجیت کور نے کہا۔ "لیکن تمہاری بات سمجھ گئی ہوں۔ اب ایسی کوئی حرکت یا بات نہیں کروں گی جس سے تمہیں یہ خیال آئے کہ میں تمہارا دل پرچا رہی ہوں"۔

صرف صغیر ہی اس کشمکش میں مبتلا نہیں تھا' یہ تو ہر مرد کی کمزوری ہے۔ اسے مرد کی فطرت کہیں یا جو کچھ بھی کہیں' زاہد اور پارسا بھی اس صورت حال سے پھسل جایا کرتے ہیں لیکن صغیر کا معاملہ کچھ مختلف تھا۔ یہ اس کی اپنی کوشش کا نتیجہ تھا۔ اس نے اللہ کو ذہن میں رکھ لیا تھا جو قدم قدم پر اس کی مدد کر رہا تھا۔ اس سے اس پر یہ انکشاف ہُوا کہ اس میں صرف جسمانی قوت ہی نہیں بلکہ اس کی ذات میں کوئی قوت موجود ہے جو اس بھٹکنے سے روک رہی ہے۔ اس انکشاف نے اسے چوتھی یا پانچویں رات اس کشمکش سے آزاد کر دیا تھا۔

یہ بھی تو انسان کی فطرت میں ایک وصف اللہ نے رکھ دیا ہے کہ وہ جو ارادہ کرے اور عہد کرے کہ اس ارادے کو پایہ تکمیل تک پہنچائے گا' وہ اس میں کامیاب ہو جاتا ہے' کمزوری یہ ہے کہ انسانی ذہن بدی کی طرف بڑی آسانی سے مائل ہو جاتا ہے اور نتائج کی بھی پروا نہیں کرتا' اور جو راہِ راست پر چلنے کا عزم کر لیتے ہیں اور اپنی تمام فطری قوتیں اس پر مرکوز کر لیتے ہیں' وہ کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔

ایک طرف میجر عثمان تھا جو پکڑے جانے کے باوجود اور شہادت اپنے سامنے دیکھ بھی جھوٹ بول رہا تھا اور اپنے جرائم کو تسلیم نہیں کرتا تھا۔ دوسری طرف

صغیر تھا جس نے اپنے گناہوں کو تسلیم کر لیا تھا اور یہ عزم کر لیا کہ وہ ان گناہوں کا کفارہ ادا کرے گا.... اللہ عثمان کے ساتھ نہیں صغیر کے ساتھ تھا۔

دلجیت کور صغیر کی بات اور اس کی نیت سمجھ گئی تھی اور اپنا رویہ اس کے مطابق کر لیا تھا۔ اس سے صغیر کو بہت مدد اور روحانی تقویت ملی۔



ساتویں رات ابھی نصف کو نہیں پہنچی تھی۔ دیہات کے لوگ سر شام ہی کھا پی کر گہری نیند سو جایا کرتے تھے۔ دلجیت کور شام کے بعد صغیر کے پاس آگئی تھی۔ روز مرہ کے معمول کے مطابق رمیش چندر بھی صغیر کے پاس آیا اور کچھ دیر باتیں کہہ سن کر چلا گیا۔ اسے تو یقین ہو گیا تھا کہ صغیر ہندو ہے اور سادھو ہے یہ بھی کہ اس کے ہاتھ میں کچھ نہ کچھ روحانی طاقت بھی ہے۔ صغیر اس وقت تک اس اداکاری میں خاصا ماہر ہو گیا تھا۔

رمیش چندر اپنے گھر چلا گیا اور کچھ دیر شراب نوشی کر کے سو گیا۔ صغیر والے مکان کے باہر وہ آدمی بھی سو گیا تھا جیسے رمیش چندر نے صغیر کی خدمت کے لئے وہیں رہنے کو کہا تھا۔ صغیر اور دلجیت کور ابھی نہیں سوئے تھے اور انہیں سونا بھی نہیں تھا۔ اس رات انہیں کچھ زیادہ ہی بیدار رہنا تھا۔ یہ وہ رات تھی جو صغیر نے فرار کے لئے مقرر کی تھی۔

وہ لاٹھی جو صغیر نے ایک درخت کی شاخ توڑ کر بنائی تھی وہ جنگل میں ہی رہ گئی تھی۔ ان چھ سات دنوں میں صغیر نے رمیش چندر سے کہہ کر ایک لاٹھی لے لی تھی۔ اپنی اداکاری اور چرب زبانی سے صغیر نے اس لاٹھی کو بھی متبرک بنا دیا تھا۔ رمیش نے اسے لاٹھی جو دی تھی وہ وزنی بھی تھی اور خوبصورت بھی۔ صغیر نے یہ لاٹھی اپنے اگلے سفر کے لئے رکھی تھی۔ اس کے پاس دوسرا ہتھیار یا چاقو نہیں تھا۔

رات کا پہلا پہر گزر گیا تو یوں لگتا تھا جیسے سارے گاؤں کے لوگ مر گئے ہوں۔ ہر سو موت کی خاموشی تھی۔ اگر کوئی آواز آتی تھی تو وہ گیدڑوں کی چیخوں

کی آواز تھی یا کہیں کوئی بھیڑیا لمبی ہوئی آواز نکالتا اور پھر رات خاموش ہو جا
کوئی کتا بھونکتا اور پھر سو جاتا۔ صغیر نے دلجیت کور سے کہا' اٹھ لڑکی اللہ بیلی۔

اس مکان کا ایک دروازہ تو سامنے تھا جس کے ساتھ ہی باہر کی طرف ریز
کا آدمی سویا ہوا تھا۔ ایک دروازہ پہلو کی طرف بھی تھا جس کی ہر وقت زنجیر چڑ
رہتی تھی۔ صغیر اور دلجیت کور اس دروازے سے نکلے۔ یہ تو دونوں کو معلوم
کہ جالندھر کس سمت کو ہے لیکن صغیر کو معلوم نہیں تھا کہ آگے علاقہ کیسا
اور کوئی باقاعدہ پگڈنڈی یا راستہ ہے یا نہیں۔ اس علاقے سے دلجیت کور کچھ د
تک واقف تھی۔ اس نے صغیر کو بتایا کہ ڈیڑھ ایک میل آگے ندی ہے جس
لکڑی کا چھوٹا سا پُل بنا ہوا ہے۔

گاؤں سے وہ دائیں بائیں آگے پیچھے دیکھتے ہوئے دبے پاؤں نکلے۔ وہا
سے نکلتے ہی ایسا علاقہ شروع ہو گیا جس نے دونوں کو گاؤں سے اور ان کی نظر
سے گاؤں کو اوجھل کر دیا۔ رات تاریک تھی۔ چاند آدھی رات کے بعد اوپر
کرتا تھا اب دونوں بہت ہی تیز چلنے لگے۔ ایسی تاریک رات میں انہیں تھوڑ
تھوڑے وقفے بعد بجلی چمک کر راستہ دکھا دیتی تھی۔ ساون کے آخری دن
لیکن اس علاقے میں ساون کا مہینہ ختم ہو جاتا تھا تو بھی بارش اچانک برسنے لگتی ا
ہر طرف جل تھل ہو جاتا تھا۔ افق سے گھٹا اٹھ رہی تھی اور بجلی رہ رہ کر چمکتی ا
اس کے دھماکے سنائی دیتے تھے۔

"اور تیز چلو دلجیت کور!" — صغیر نے کہا — "تم بتاتی ہو کہ آگے ایک
ندی ہے۔ سیلاب آگیا تو تو ہم یہیں رکے رہیں گے اور رمیش چند رپورے گاؤں
ساتھ لئے ہمارے تعاقب میں آن پہنچے گا"۔

دلجیت کور اس طرح چلی کہ صغیر سے بھی آگے نکل گئی۔ اس نے پیچھے
دیکھا اور ہنس کر صغیر سے کہا کہ آؤ مجھ تک پہنچو۔ صغیر نے اپنے رفتار تیز کر لی ا
لڑکی تک جا پہنچا۔

"اب مجھے عورت ذات سمجھنا چھوڑ دو" — دلجیت کور نے کہا — "یہاں

ھے جبراً لایا گیا تھا' اب میں آزاد ہو کر اپنی مرضی سے جا رہی ہوں۔ اب میری
ار اور پھرتی دیکھتے چلو"۔

صغیر کو دلجیت کور کی یہ بات اتنی اچھی لگی کہ اس نے اپنے حوصلے میں کچھ
ہی تازگی محسوس کی اور یہ بھی کہ اس کے جسم میں جیسے کوئی اضافی طاقت بیدار
ئی ہو۔ اس نے بے اختیار چاہا کہ دلجیت کور کو اپنے ساتھ لگا لے جو خراج
ین کا ایک انداز تھا لیکن صغیر نے فوراً محسوس کر لیا کہ دلجیت کور عورت ہے
ساتھ لگانے سے وہ طاقت بیدار ہو جائے گی جو اللہ کی دی ہوئی ساری قوّتوں کو
کار کر دے گی۔

"تمہارے پاس کچھ پیسے ہیں" — دلجیت کور نے صغیر سے پوچھا۔

"کیوں؟" — صغیر نے پوچھا — "کیا کہیں پیسوں کی بھی ضرورت آ پڑے
؟"

"ہاں' ضرورت پڑے گی" — دلجیت کور نے کہا — "ہم پیدل تو جالندھر
نہیں جائیں گے۔ جہاں سڑک آئے گی وہاں بسیں بھی جاتی نظر آئیں گی۔
کی بس پر کچھ سفر طے کر لیں گے۔ اگر تمہارے پاس پیسے نہیں تو فکر والی کوئی
نہیں۔ میں بہت پیسے لے آئی ہوں.... میں تو پنڈت کا خزانہ اٹھا لائی ہوں"۔

چلتے چلتے دلجیت کور نے شلوار میں اڑسی ہوئی تھیلی نکالی اور صغیر کے ہاتھ
دے دی۔ یہ خاصی وزنی تھیلی تھی۔ صغیر نے تھیلی کو باہر سے ہی ٹٹول کر
وس کر لیا تھا کہ اس میں زیورات ہیں اور نوٹوں کی دو گڈیاں بھی ہیں۔

"یہ تم نے کیا کیا!" — صغیر نے قدرے غصیلی آواز میں پوچھا۔

"اپنی کچھ تو قیمت وصول کرنی ہی تھی" — دلجیت کور نے جواب دیا —
مجھے معلوم تھا کہ زیورات کہاں رکھے ہیں۔ ان پیسوں کا بھی مجھے علم تھا۔ میں
نے کل دن کو موقع دیکھ کر زیورات نکال لئے اور یہ نوٹ بھی وہاں پڑے تھے۔ یہ
ی تھیلی میں ڈال لئے"۔

"یہ تم نے اچھا نہیں کیا" — صغیر نے کہا — "میں اگر اتنا پاپی ہوتا تو

تمہارے ساتھ یہ پاک اور صاف ستھرا رویّہ نہ رکھتا جو میں نے رکھا۔ یہ تو چوری سے بڑا گناہ ہے جو تم نے کیا ہے''۔

''اور وہ جو میرے ساتھ ہوتا رہا ہے'' — دلجیت کور نے کہا۔ ''کیا وہ کرگناہ نہیں تھا؟ کیا وہ پنڈت رمیش میرے ساتھ نیکی کرتا رہا ہے؟ میں پھر کہتی ہوں کہ میری قیمت بہت زیادہ بنتی تھی' یہ تو تھوڑی سی قیمت وصول کی ہے.... معلوم ہوتا ہے تم نے اپنے دل کو بالکل ہی مُردہ کر دیا ہے۔ مجھ جیسی لڑکی تمہارے دل میں جان نہیں ڈال سکی اور اب اتنا قیمتی زیور اور رقم دیکھ کر تم خوش ہونے کی بجائے ناراض ہو رہے ہو۔ ہندو تو روپے پیسے پر اپنی عزتیں بھی قربان کر دیا کرتے ہیں۔ تم کیسے ہندو ہو؟''

''تمہیں کس نے بتایا کہ میں ہندو ہوں!'' — صغیر نے کہا۔ ''میں ہندو نہیں ہوں دلجیت کور' میں سادھو بھی نہیں' میں مسلمان ہوں.... اب یہ خیال رکھنا تمہارا کام ہے کہ جس طرح میں نے تمہاری آبرو کو اپنی آبرو سمجھا تھا اسی طرح تم میرے راز کو اپنا راز سمجھنا''۔

''تمہاری خاطر اپنا خون بہا دوں گی'' — دلجیت کور نے سکھوں کے انداز سے کہا۔ ''دوسری بات یہ کہ یہ سن کر مجھے خوشی ہوئی ہے کہ تم ہندو نہیں اور مسلمان ہو۔ میں اپنے گھر جانے کی خوشی میں تمہارے ساتھ چل تو پڑی تھی لیکن دل میں یہ خطرہ موجود رہا کہ یہ ہندو نہ جانے مجھے کیا دھوکہ دے گا۔ اب خطرہ دل سے نکل گیا ہے.... اب یہ بتاؤ تم اس جنگل بیابان میں مارے مارے کیوں پھر رہے ہو؟ تم نے یہ حلیہ کیوں بنا رکھا ہے؟.... معلوم ہوتا ہے تم مولوی ہو''۔

صغیر نے اسے اپنا نام اکبر بتایا پھر یہ بتایا کہ وہ پاکستانی مسلمان ہے اور ویزے کی معیاد ختم ہو گئی تھی اس لئے پولیس اس کے پیچھے پھر رہی تھی اور وہ بھاگا بھاگا پھر رہا ہے۔ اس نے کہا کہ اب وہ چوری چھپے سرحد پار کر کے اپنے ملک میں جانے کی کوشش کرے گا۔

''ایک بات بتاؤں دلجیت کور!'' — صغیر نے پوچھا۔ ''اگر میں تمہیں

تمہارے ماں باپ کے حوالے کردوں تو کیا وہ مجھے سرحد پار کرادیں گے؟''

''تم میرے باپ اور بھائیوں کو نہیں جانتے'' — دلجیت کور نے کہا۔ ''وہ جب مجھے دیکھیں گے اور میری زبانی یہ سنیں گے کہ تم نے کس طرح مجھے پاک دامانی رکھا اور پھر تم خطرہ مول لے کر مجھے یہاں لے آئے ہو' تو وہ تمہیں اپنے کندھوں پر بٹھا کر پاکستان میں داخل کر آئیں گے''۔

وہ چلتے جا رہے تھے۔ زیورات والی تھیلی ابھی صغیر کے ہاتھ میں تھی جو اس نے کھول کر دیکھی ہی نہیں تھی۔ اس نے تھیلی دلجیت کور کی طرف بڑھائی اور کہا کہ اسے اسی طرح شلوار میں اڑس لے جس طرح پہلے اڑسی ہوئی تھی۔ دلجیت کور نے تھیلی لینے سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ یہ تمہارا مال ہے لیکن صغیر نے یہ قبول نہ کیا اور لڑکی سے کہا یہ اپنے پاس ہی رکھے۔ بہرحال یہ تھیلی دلجیت کور نے شلوار میں اڑس لی اور اچھی طرح باندھ لی کہ چلتے چلتے کہیں گر نہ پڑے۔

بجلی نے ایک بار پھر چمک کر انہیں ندی کا پُل دکھا دیا۔ وہ پل سے گزر رہے تھے تو صغیر نے کہا کہ سیلاب آ رہا ہے اور پانی پُل تک پہنچ چکا ہے۔ پل سے کچھ ہی دور آگے گئے تھے کہ بڑی تیز بارش شروع ہو گئی۔ دلجیت کور نے کہا کہ کہیں رک جانا چاہئے لیکن صغیر نے کہا کہ ایک سیکنڈ بھی کہیں نہیں رکنا۔

''صبح ہوتے ہی ہمارا تعاقب شروع ہو جائے گا'' — صغیر نے کہا۔ ''ہم دونوں کو وہاں نہ دیکھ کر تو وہ ہمیں ڈھونڈے گا ہی لیکن اسے یہ پتہ چل گیا کہ زیورات اور رقم بھی غائب ہے تو وہ گاؤں کے لوگوں کو ساتھ لے کر ہمارے پیچھے آئے گا۔ تمہارے متعلق تو اسے معلوم ہی ہے کہ تم جالندھر کی رہنے والی ہو' میں نے اسے بتایا تھا کہ میں جالندھر کو جاؤں گا۔ وہ سیدھا ہمارے پیچھے آئے گا۔ اگر ہم کہیں رک گئے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم نے رمیش چندر کے لئے فاصلہ کم کر دیا ہے۔ بارش ہے یا طوفان آ جائے' رکیں گے نہیں''۔

بارش تیز اور ان دونوں کی رفتار کم ہوتی گئی۔ بارش سامنے سے ترچھی آ رہی تھی۔ آنکھیں کھول کر چلنا محال ہو رہا تھا۔ پاؤں بار بار پھسلتے تھے اور خطرہ یہ

بھی تھا کہ کسی ایسے نالے میں ہی نہ چلے جائیں جس کے کنارے پانی میں ڈوبے ہوئے ہوں۔ ان کے نیچے سے پگڈنڈی نکل گئی تھی۔ یہ ان کا اندازہ تھا کہ جالندھر کی سمت ہی جا رہے ہیں۔

دلجیت کور دو تین بار پھسل کر گری اور ہر بار صغیر نے اسے اٹھایا۔ اس نے اپنا ایک بازو صغیر کے کندھوں پر رکھ دیا اور اس کے سہارے چلنے لگی۔ صغیر نے اپنا بازو اس کی کمر میں ڈال لیا اور اس کے جسم کا کچھ وزن اپنے بازو پر لے لیا۔ صغیر کے ہاتھ میں لاٹھی تھی۔ اس لاٹھی کا سہارا اس کے لئے مددگار ثابت ہو رہا تھا۔

"میں نے تمہارے جسم کے ساتھ لگ کر عجیب سا سکون محسوس کیا ہے"۔ دلجیت کور نے موسلا دھار بارش کے شور میں بلند آواز سے کہا۔۔۔ "میرا وجود نہ جانے کتنے مردوں کے جسموں سے لگ چکا ہے۔ ہر جسم سے مجھے یوں لگا جیسے تنور میں پھینک دی گئی ہوں اور میرا وجود جل رہا ہے۔ تم تو ہر بات سمجھتے ہو لیکن اتنے دنوں میں یہ پہلا موقع ہے کہ میں تمہارے جسم کے ساتھ لگی ہوں۔ مجھے پوری امید ہے کہ تم میرے وجود کو ایک جوان لڑکی کا وجود نہیں سمجھو گے۔ میرے دل میں کوئی برا خیال یا ارادہ بھی نہیں۔ اب اپنے آپ کو مرد اور مجھے عورت نہ سمجھنا اور مجھے اپنے آپ سے الگ نہ ہونے دینا"۔

اس وقت صغیر کے دماغ پر صرف یہ مسئلہ غالب تھا کہ صبح تک بہت دور نکل جائیں گے۔ ویسے بھی اس نے دلجیت کور سے توجہ ہٹا رکھی تھی۔ اسے وہ ہم سفر بھی سمجھ رہا تھا اور امانت بھی۔

بارش جس طرح اچانک اور تیزی سے آئی تھی اسی طرح آگے نکل گئی۔ یہ ساون کی گھٹائیں تھیں جو اڑتی آتیں اور اڑتی آگے نکل جاتی تھیں۔ موسلا دھار بارش نے پھوار کی صورت اختیار کر لی۔ اگر موسم ٹھیک ہوتا تو وہ بہت دور نکل گئے ہوتے لیکن بارش نے انہیں اس فاصلے کا چوتھائی بھی طے کرنے نہیں دیا۔ جونہی بارش تھمی صغیر نے دلجیت کور سے اپنا بازو ہٹا لیا اور اسے کہا کہ اب اپنے سہارے پر چلے اور تیز چلنے کی کوشش کرے۔

چاند افق سے اوپر آ گیا تھا لیکن گھٹاؤں نے آگے آ کر چاندنی کو روک رکھا تھا۔ زمین ہموار نہیں تھی۔ ٹیلے اور ٹیکریاں تھیں جو سیدھا چلنے ہی نہیں دیتی تھیں۔ وہ چلتے ہی گئے اور کچھ اور فاصلہ طے کر لیا۔

ڈیڑھ دو میل اور آگے نکل گئے تو ایک عمودی ٹیلے کے دامن میں کشادہ گف بنی ہوئی تھی۔ زمین سے ذرا سی اونچی ہونے کی وجہ سے اس میں پانی نہیں گیا تھا۔ چاندنی میں یہ صاف نظر آئی اور اسے دیکھ کر دلجیت کور کے قدم رک گئے۔

"ذرا دم نہ لے لیں؟" ۔۔۔ دلجیت کور نے کہا۔۔۔ "سونا نہیں، ٹانگیں تھک گئی ہیں"۔

صغیر بھی محسوس کر رہا تھا کہ بارش کی ٹھنڈ نے جسم کی گرمی بہت کم کر دی ہے اور اس سے تھکن کا احساس زیادہ ہو گیا ہے۔ وہ دلجیت کور کے ساتھ گف کے اندر چلا گیا۔ گف کی چھت اونچی تھی اور اس کی لمبائی چوڑائی بھی ذرا زیادہ تھی۔ دونوں اس میں جا کر بیٹھ گئے اور اپنی اپنی پیٹھ دیواروں سے لگا لی۔ وہ آمنے سامنے بیٹھے تھے۔



دونوں کو محسوس ہی نہ ہوا کہ ان کے جسم اتنے زیادہ تھک گئے ہیں کہ وہ خوابوں کی دنیا میں جا پہنچے ہیں۔ دونوں جوان تھے اور جوانی پر قابو پانا ناممکن ہوتا ہے۔

صغیر کی آنکھ کھلی تو اس نے سب سے پہلی جو چیز دیکھی وہ روشنی تھی۔ یہ چاندنی نہیں تھی بلکہ صبح کی شفاف روشنی تھی۔ پھر اس نے اپنا جائزہ لیا تو وہ ایک پہلو کے بل گف کے فرش پر لیٹا ہوا تھا۔ ہڑبڑا کر اٹھا اور باہر دیکھا۔ باہر کی دنیا کو سورج نے روشن کر رکھا تھا۔

اس نے دلجیت کور کو پکارا۔ وہ بھی پہلو کے بل لیٹی گہری نیند سو رہی تھی۔ پہلی آواز پر اس کی آنکھ کھلی تو صغیر نے لپک کر جھنجھوڑا اور کہا کہ وہی ہوا جس کا اسے ڈر تھا۔

"اٹھو اور باہر دیکھو" — صغیر نے کہا — "ہمیں کم از کم آج کی رات رکنے کی غلطی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ اب یہ نہ کہنا کہ بھوک لگی ہے۔ اب یہاں سے بھاگنا پڑے گا"۔

"میں بہت تیز بھاگنے کے لئے تیار ہوں" — دلجیت کور نے بڑی تیزی سے اٹھتے ہوئے کہا — "چلو نکلو یہاں سے"۔

دونوں گف سے باہر نکلے اور تیزی سے چلنے لگے۔



پنڈت رمیش اتنی جلدی جاگنے کا عادی نہیں تھا۔ وہ تو اپنے علاقے کا مہاراجہ بنا ہُوا تھا۔ اس کی بیوی عبادت کرنے والی شریف عورت تھی۔ رمیش نے اپنی ایک شاہانہ دنیا بنا رکھی تھی۔ پنڈت یعنی برہمن شراب نہیں پیا کرتے تھے لیکن وہ شراب پیتا تھا۔ ایک تو اس نے دلجیت کور کو باقاعدہ داشتہ بنا کر گھر میں رکھا ہُوا تھا اور پھر دوسرے چوتھے روز کوئی نئی لڑکی ان کے گھر رات گزارنے کے لئے آتی تھی۔ رمیش کی بیوی نے اپنا دھیان گیان اپنے پرمیشور اور دیوی دیوتاؤں کی طرف رکھا تھا۔ وہ رمیش کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتی تھی۔ صبح ابھی تاریک ہی ہوتی تو وہ اٹھ کر عبادت شروع کر دیتی تھی۔

اس صبح اٹھی تو اس نے شاید کپڑے تبدیل کرنے کے لئے وہ ٹرنک کھولا جس میں زیورات اور رقم والی تھیلی رکھی ہوئی تھی۔ اس نے دیکھا کہ تھیلی وہاں نہیں ہے۔ ٹرنک سے سارے کپڑے لتّے نکال پھینکے لیکن تھیلی کا نام و نشان نہیں تھا۔

یہ تو اس عورت کی جمع پونجی تھی۔ وہ دوڑتی اس کمرے میں گئی جس میں رمیش سویا ہُوا تھا۔ اسے جگایا اور بتایا کہ زیورات اور پیسوں والی تھیلی کہاں ہے۔ رمیش نے اسے ڈانٹ کر کہا کہ خود ہی کہیں اِدھر اُدھر رکھ دی ہوگی اور اسے اس نے بے وقت جگا دیا ہے۔

بیوی کو یقین تھا کہ تھیلی اسی ٹرنک میں اور اسی جگہ رکھی رہتی تھی اور اس تھیلی کو کئی دنوں سے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ اس نے رونا شروع کر دیا کہ اتنے زیادہ زیورات غائب ہیں۔ رمیش چندر غصے سے اٹھا اور خود جا کر ٹرنک دیکھا۔

اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ اتنی سویرے اس کے دروازے پر کوئی شخص دستک دینے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ رمیش بڑبڑاتا ہوا باہر نکلا کہ اس وقت کون بدبخت آگیا ہے اور اسے سونے کیوں نہیں دیا جاتا۔ بڑے غصے سے دروازہ کھولا۔ دیکھا وہ آدمی باہر کھڑا تھا جسے رمیش نے صغیر کی خدمت کے لئے اس مکان میں چھوڑ رکھا تھا۔

"اس وقت کیا لینے آئے ہو؟" — رمیش نے غصے سے گرجتے ہوئے پوچھا۔

"معاف کر دینا مہاراج!" — اس آدمی نے ہاتھ جوڑ کر غلاموں کی سی آواز میں کہا — "وہ دونوں وہاں نہیں ہیں۔ دوسرا دروزاہ کھلا دیکھا تو میں اندر چلا گیا۔ نہ آپ کا مہمان وہاں ہے نہ ہی لڑکی"۔

رمیش چندر یہ سن کر صغیر والے مکان کی طرف دوڑا گیا۔ اندر جا کر دیکھا' صغیر اور دلجیت کور وہاں نہیں تھے۔ رمیش کو پہلا خیال یہ آیا کہ زیورات اور رقم کی تھیلی دلجیت کور نے نکالی ہے اور وہ دونوں بھاگ گئے ہیں۔ رمیش وہاں سے دوڑ پڑا۔ یہ آدمی بھی اس کے پیچھے گیا۔ اس آدمی کو رمیش نے پانچ سات نام بتا کر کہا کہ ان سب یہاں لے آؤ۔

جونہی اس کے بلائے ہوئے آدمی ایک ایک دو دو آتے رہے' رمیش ہر ایک کو ایک دو آدمیوں کے نام بتایا کر کہتا رہا کہ تم اسے ساتھ لے آؤ اور تم فلاں کو ساتھ لے آؤ۔ پھر خود اس نے اپنی گھوڑی پر زین کسی' اپنے گھر سے دو نالی بندوق نکالی' اس میں دو کارتوس ڈالے اور کارتوسوں والی بیلٹ اپنی کمر سے باندھ لی۔

تھوڑی ہی دیر میں اس کے گھر کے سامنے بیس بائیس آدمی اکٹھے ہو چکے تھے۔ رمیش کی ہدایات کے مطابق کوئی لاٹھی سے' کوئی کلہاڑی سے اور کوئی تلوار

سے مسلح تھا۔ سب پوچھ رہے تھے کہ ہُوا کیا ہے۔ رمیش چندر نے سب کو بتادیا کہ وہ آدمی جسے اس نے اس لئے مہمان رکھا تھا کہ اس نے اس کی ریچھ سے جان بچائی تھی‘ وہ دلجیت کور کو ساتھ لے گیا بھاگ گیا ہے اور گھر سے زیورات اور کچھ رقم بھی چوری ہوگئی ہے۔ یہ چوری یقیناً دلجیت کور نے کی ہوگی۔

"وہ یقیناً آدھی رات کے وقت یہاں سے نکلے ہوں گے"۔۔۔ پنڈت رمیش چندر نے ان لوگوں سے کہا۔۔۔ "رات بہت بارش ہوتی رہی ہے وہ دور نہیں جاسکے ہوں گے۔ ندی نالوں نے چڑھ کر انہیں روک لیا ہوگا۔ تم سب نے ان دونوں کو دیکھا ہُوا ہے۔ آسانی سے پہچان لوگے‘ میں گھوڑی پر سوار ہوں گا۔ میرے پاس یہ دونالی بندوق ہوگی۔ تم سب کو دوڑنا ہے‘ چلنا نہیں جہاں وہ نظر آئیں انہیں پکڑو اگر بھاگیں تو بے شک مار ڈالو۔ اکٹھے نہیں جانا بکھر بکھر کر آگے نکلنا ہے۔ اب وقت ضائع نہ کرو اور میرے پیچھے آؤ"۔

ان لوگوں نے رمیش چندر کو خوش کرنے کے لئے صغیر اور دلجیت کور کو گالیاں دیں اور "قتل کردیں گے"..... "ٹانگیں توڑ دیں گے" اور اس قسم کے کچھ اور جوشیلے اور اشتعال انگیز نعرے لگائے۔ رمیش چندر اپنی گھوڑی پر سوار ہُوا اور گھوڑی ایک طرف کو دوڑادی۔ یہ بیس بائیس آدمی اس کے پیچھے دوڑنے لگے۔ ابھی پوہ پھٹ رہی تھی۔ اس وقت صغیر اور دلجیت کور گف میں گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھ اس وقت کھلی تھی جب سورج اوپر آگیا تھا۔

○

صغیر اور دلجیت کور چلے تو جارہے تھے لیکن رات کی بارش نے جو کیچڑ اور دلدل پیچھے چھوڑی تھی‘ یہ انہیں کھل کر چلنے نہیں دے رہی تھی۔ زمین کی اس حالت میں اس علاقے کے کسان وغیرہ پوری رفتار سے چلتے سکتے تھے۔ رمیش چندر کے آدمی دوڑتے آرہے تھے۔ رمیش کی گھوڑی ان سب سے خاصی آگے تھی۔

صغیر شدید خطرہ محسوس کررہا تھا کہ رمیش تعاقب میں ضرور آئے گا۔ اس نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ سارے گاؤں پر رمیش کی حکومت چلتی ہے۔ رمیش اکیلا

نہیں ہوگا‘ ہوسکتا ہے کہ گاؤں کی آدھی آبادی اس کے ساتھ ہو۔ یہ خطرہ محسوس کرکر کے صغیر تھوڑا تھوڑا فاصلہ چل کر کسی ایسی ٹیکری پر چڑھ جاتا جہاں چھپنے کی جگہ ہوتی۔ جھاڑیوں یا اونچی گھاس میں بیٹھ کے پیچھے دیکھتا کہ کوئی آ تو نہیں رہا۔

کچھ اور آگے گئے تو زمین اوپر کو اٹھ رہی تھی یعنی وہاں سے کچھ چڑھائی شروع ہوجاتی تھی۔ ایک ایسی ٹیکری نظر آئی جس کے اوپر ایک ڈھیری سی بنی ہوئی تھی جو اونچی گھاس میں ڈھکی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی تین چار اکٹھے درخت تھے اور ہری بھری جھاڑیاں بھی تھیں۔

صغیر اس ٹیکری کے قریب رک گیا۔ دلجیت کور نے اس سے کہا کہ وہ اپنا سفر ٹیکریوں پر چڑھ چڑھ کر بڑھا رہا ہے اور وقت بھی ضائع ہو رہا ہے وہ سیدھا چلتا چلے۔

دلجیت کور کچھ اور کہنے میں لگی تھی کہ گھوڑے کے ہلکے ہلکے ٹاپ سنائی دینے لگے اور اس کے ساتھ کچھ آدمیوں کی آوازیں بھی آنے لگیں۔ صغیر نے دلجیت کور کا بازو پکڑا اور اسے کھینچتا ہُوا جھکا جھکا دوڑتا اس ٹیکری پر چڑھ گیا اور ٹیکری کے اوپر جو قدرتی ڈھیری سی بنی ہوئی تھی اس کے پیچھے جا بیٹھا اور دلجیت کور کو بھی بٹھالیا۔

"میں ذرا اٹھ کر دیکھتا ہوں"۔۔۔ صغیر نے کہا۔۔۔ "یہ انہی کی آوازیں ہیں وہ آرہے ہیں"۔

اس نے جیب سے ایک چاقو نکالا اور کھول کر دلجیت کور کو دیتے ہوئے کہا ۔۔۔ "میں لاٹھی اپنے پاس رکھوں گا۔ تم لاٹھی نہیں چلاسکوگی۔ کوئی قریب آئے تو یہ چاقو اس کے پیٹ میں گھونپ دینا۔ ڈرنا نہیں اور مجھ سے الگ بھی نہ ہونا"۔

صغیر ایک درخت کے تنے کی اوٹ میں ہو کر اٹھا۔ اس کے بالکل قریب اور سامنے گھاس میں ڈھکی ہوئی ڈھیری تھی اور ساتھ ہی ایک اونچی جھاڑی تھی۔ یہ ایک اوٹ تھی جس کے پیچھے صغیر کسی کو نظر نہیں آسکتا تھا۔ صغیر کو سب سے پہلے

رمیش چندر نظر آیا۔ پھر اس نے دائیں بائیں دیکھا تو دوسرے لوگ بھی اسے نظر آنے لگے جو ایک دوسرے سے دور دور پھیلے ہوئے تھے اور بے ترتیب تھے۔ کوئی پیچھے رہ گیا تھا، کوئی آگے تھا اور کوئی دوسروں سے دائیں یا بائیں بہت ہی دور تھا۔ وہ ابھی دو اڑھائی سو قدم دور تھے۔

صغیر نے دلجیت کور کو بتایا کہ وہ کیا دیکھ رہا ہے۔ اور اسے کہا کہ وہ چھپی رہے۔ اس نے یہ طریقہ سوچا کہ اسی جگہ چھپے رہیں اور جب یہ لوگ آگے نکل جائیں گے تو یہ دونوں دائیں طرف یا بائیں طرف چلے جائیں گے۔

ہُوا یوں کہ رمیش چندر نے بڑی بلند آواز سے اپنے آدمیوں سے کہا کہ وہ اور زیادہ پھیل جائیں اور وہ خود سیدھا اس ٹیکری کی طرف آیا جس ٹیکری پر یہ دونوں چھپے ہوئے تھے۔

صغیر کا دماغ بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ رمیش تو سیدھا آ رہا ہے لیکن اس کے ساتھ جو دو آدمی تھے وہ ایک طرف کو دوڑے گئے اور رمیش اکیلا رہ گیا۔ وہاں اور بھی ٹیکریاں تھیں اور ٹیلے بھی تھے۔ یہ سب آدمی ان ٹیکریوں اور ٹیلوں کے پیچھے ہو گئے اور رمیش ٹیکری کے قریب آ گیا۔

رمیش کی گھوڑی ذرا آگے نکلی تو صغیر نے اٹھ کر ٹیکری کی ڈھلان سے رمیش پر ایسی ڈائیو ماری کہ صغیر کا ایک بازو رمیش کی گردن کے گرد لپٹ گیا۔ صغیر کا ارادہ کچھ اور تھا لیکن اسے فوراً نظر آ گیا کہ رمیش گھوڑے سے گرا تو اس کا ایک پاؤں رکاب سے نکلنے کی بجائے آگے جا کر رکاب میں پھنس گیا۔ صغیر نے پیچھے دیکھا۔ دلجیت کور اس کی پیٹھ کے تقریباً ساتھ لگی ہوئی تھی۔ رمیش نیچے گر پڑا تھا۔

"دلجیت!" — صغیر نے کہا — "گھوڑی کے پیچھے زور سے چاقو مارو"۔

دلجیت کور دوڑ کر ٹیکری سے نیچے آئی اور گھوڑی کی پیٹھ پر پوری طاقت سے چاقو مارا۔ گھوڑی بدک کر یک لخت تیز دوڑی پڑی اور صغیر نے رمیش چندر کو چھوڑ دیا۔ آگے ایک اور ٹیکری نے گھوڑی کا راستہ روکا لیکن گھوڑی رکنے والی

نہیں تھی۔ ایک طرف مڑی اور سرپٹ دوڑتی گئی۔ گھوڑی رمیش کو اپنے ساتھ گھسیٹتی لے جا رہی تھی کیونکہ رمیش کا ایک پاؤں رکاب میں پھنسا ہُوا تھا۔

رمیش نے بڑی ہی بلند آواز سے چلانا شروع کر دیا — "جلدی پہنچو.... مجھے بچاؤ.... جلدی اوئے جلدی"۔

اس کی آوازیں دبتی جا رہی تھیں۔ اس کے ایک آدمی نے دیکھ لیا۔ اب یہ آدمی شور مچانے لگا۔

ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے آدمی کو پتہ چلتا گیا اور سب رک کر پیچھے مڑے اور جس جس نے دیکھا کہ گھوڑی ان کے پنڈت کو گھسیٹ کر لے جا رہی ہے وہ گھوڑی کے پیچھے دوڑ پڑا۔

اب صغیر اور دلجیت کور ٹیکری پر کھڑے ہو کر دیکھنے لگے۔ گھوڑی نے گاؤں کا رخ کر لیا تھا۔ تمام آدمی گھوڑی کے پیچھے دوڑے جا رہے تھے۔ رمیش کا زندہ رہنا ممکن نہیں تھا۔

گھوڑی کو روکنے کا صحیح طریقہ یہ تھا کہ اس کے آگے کچھ آدمی آ جاتے اور اس کی لگام پکڑ لیتے لیکن وہ جاہل لوگ گھوڑی کے پیچھے دوڑ رہے تھے اور گھوڑی اور زیادہ بدک اور ڈر کر تیز دوڑ رہی تھی۔

تھوڑی ہی دیر بعد گھوڑی بھی اور رمیش کے آدمی بھی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ دلجیت کور نے صغیر کو دیکھا صغیر ہنس رہا تھا۔ دلجیت کور بے اختیار صغیر کے سامنے آ کر اس کے ساتھ لپٹ گئی۔

وہ جب ٹیکری سے اترنے لگے تو دلجیت کور کو رمیش چندر کی بندوق نیچے پڑی نظر آئی۔ وہ دوڑتی نیچے گئی اور بندوق اٹھا لی۔

"یہ بندوق اب ہمارے کام آئے گی" — دلجیت کور نے کہا — "یہ ساتھ لے چلتے ہیں"۔

صغیر نے نیچے جا کر بندوق دلجیت کور کے ہاتھ سے لے لی اور زور سے گھما کر پھینکی۔ بندوق ہوا میں جاتی نظر آئی اور کچھ دور جا گری۔

"یہ بندوق ہمارے کام نہیں آئے گی" — صغیر نے کہا — "بلکہ ہمارے لئے خطرہ بنے گی۔ بغیر لائسنس بندوق پاس رکھنا جرم ہے .... چلو آگے۔ میرے اللہ نے ہمیں بچالیا ہے"۔

وہ آگے کو چل پڑے۔ اس کے فوراً بعد رمیش چندر کی گھوڑی اس کی لہولہان لاش کو گھسیٹتی ہوئی اس کے گاؤں میں داخل ہوئی۔ تمام آدمی جو رمیش کے ساتھ تھے دوڑتے ہوئے گھوڑی کے پیچھے گئے۔ گھوڑی اپنے گھر کے سامنے جا رکی۔

کا رمیش چندر کے گھر جا پہنچنا کوئی عجوبہ نہ تھا۔ یہ کُتے، بلّی اور گھوڑے کی گھوڑی فطرت ہے کہ انہیں اپنے مالک کے گھر سے کتنی ہی دور لے جا کر چھوڑ دیں تو یہ واپس اپنے مالک کے گھر واپس آجائیں گے۔

رمیش کی گھوڑی جب گاؤں میں داخل ہوئی تھی تو لوگوں نے دیکھا کہ ایک آدمی کا ایک پاؤں رکاب میں پھنسا ہُوا ہے اور گھوڑی اسے گھسیٹتی اور اچھالتی لا رہی ہے۔ یہ آدمی پہچانا نہیں جا سکتا تھا کیونکہ اس کے کپڑے چیتھڑے بن چکے تھے اور سر سے پاؤں تک یہ بدقسمت شخص خون سے لال تھا۔ گھوڑی جب پنڈت رمیش چندر کے گھر کے سامنے رکی تھی تو لوگ اکٹھے ہو گئے تھے۔ وہ حیران تھے کہ یہ کون ہے جسے گھوڑی نے اس بے دردی سے مار ڈالا ہے کہ اس کے چہرے پر ناک بھی نہیں اور ہونٹ کٹ کر ایک طرف لٹکے رہے تھے۔

وہ آدمی آن پہنچے جو پنڈت رمیش کے ساتھ صغیر اور دلجیت کور کو پکڑنے گئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ یہ پنڈت جی مہاراج ہیں۔

گھوڑی رمیش کو جس زمین پر گھسیٹتی لائی تھی وہ زمین ہموار نہیں تھی۔ وہ پتھریلی زمین تھی جس میں خاردار جھاڑیاں بھی تھیں اور چھوٹے بڑے پتھر اور چھوٹے بڑے کنکر بھی تھے۔ اگر رمیش کا ایک پاؤں رکاب میں پھنسا رہتا تو اس کا کمر سے اوپر والا دھڑ زمین پر گھسیٹا جاتا لیکن اللہ اس بدکار شخص کو بہت بُری سزا دینے پر آگیا تھا۔ ہُوا یوں کہ گھوڑی نے ابھی تھوڑا سا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ اس کی زین ڈھیلی ہو گئی اور نیچے کو لٹک آئی۔ اس سے رمیش کی پوزیشن ویسی ہی ہو گئی جیسے کسی کے ہاتھوں یا پاؤں کے ساتھ رسّہ باندھ کر گھوڑے کے پیچھے باندھ دیا جاتا ہے اور پھر گھوڑے کو بھگا دیتے ہیں۔

رمیش کا پورا جسم زمین پر تھا اور گھوڑی ڈری ہوئی حالت میں تیز سے تیز تر بھاگی جا رہی تھی۔ کہیں بڑا پتھر آ جاتا یا تو رمیش کا جسم اوپر کو اچھلتا اور پیٹھ کے بل یا پیٹ کے بل یا کسی کروٹ کو گرتا اور گھوڑی ڈر کر اور زیادہ تیز دوڑنے لگتی۔ گھوڑی کو جہاں دلجیت کور نے چاقو مارا تھا وہاں سے خون بہہ رہا تھا۔

رمیش کے ساتھ گئے ہوئے آدمی نہ بتاتے کہ یہ پنڈت رمیش چندر کی لاش ہے تو اسے کوئی بھی نہ پہچان سکتا۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ خون کا بنا ہُوا بُت ہے اور خون پگھل پگھل کر بہہ رہا ہے۔ لوگوں پر خوف و ہراس طاری ہُوا جا رہا تھا۔

خون میں نہایا ہُوا یہ رمیش تو بڑا ہی جابر آدمی ہُوا کرتا تھا۔ گاؤں میں گزرتا تو سامنے آنے والے ایک طرف ہٹ کر جھکتے اور پھر ہاتھ جوڑ کر اسے پرنام کیا کرتے تھے۔ یہ شخص ایک رعب اور ایک خوف بن کر سارے گاؤں پر غالب آیا رہتا تھا۔ اب اس کا یہ انجام دیکھ کر لوگ کھُسر پھُسر اور چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔

"اسے تو دنیا میں ہی سزا مل گئی ہے"۔

"اسے اتنی بھلی اور شریف بیوی کی آہ پڑی ہے"۔

"جوان لڑکی بن بیاہی گھر میں رکھی ہوئی تھی"۔

"پاپی تھا.... پکا پاپی تھا"۔

"کانوں کو ہاتھ لگاؤ بھائیو' ایک دوسرے کو ایک جیسا انسان سمجھو"۔

یہی لوگ تھے جو پنڈت رمیش چندر کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اس کے آگے سجدے کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے مگر اب جس کسی کے منہ میں جو بھی آتی وہ کہہ رہا تھا۔

گاؤں میں ایک مندر تھا اور اس مندر میں ایک پنڈت بھی تھا' وہ بھی آ گیا تھا۔ اس نے رمیش چندر کی لاش دیکھی تو ہاتھ جوڑ کر منہ آسمان کی طرف کر لیا۔ پھر وہ وہاں سے پیچھے ہٹ آیا اور کچھ آدمی اس کے اردگرد کھڑے ہو گئے۔ وہ سننا چاہتے تھے کہ پنڈت کیا رائے دیتا ہے۔

"دیکھ لی پاپی کی آخر؟" — پنڈت نے کہا — "یہ شخص اپنے آپ کو پرمیشور' بھگوان اور خدا سمجھتا تھا۔ مندر میں آ کر مجھ پر حکم چلاتا تھا۔ پرارتھنا کے لئے کبھی مندر میں نہیں آیا تھا"۔

یہی پنڈت تھا جو مندر میں رکھے ہوئے بُتوں کی پُوجا کم اور رمیش چندر کی پُوجا زیادہ کیا کرتا تھا۔ رمیش چندر سے اس پنڈت کو کپڑے ملا کرتے تھے اور نقد نارائن بھی۔



شام کو جب سورج اپنی کرنیں سمیٹتا ہُوا افق پر پہنچ گیا تھا رمیش چندر کی چِتا کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ بے بس اور مجبور لوگوں کو جلانے والا خود جل رہا تھا۔ اس کی بیوی نے جس طرح جلتے کڑھتے' چپ چاپ زندگی گزاری تھی' اسی طرح گھر میں چپ چاپ بیٹھی نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔

اُس وقت صغیر اور دلجیت کور اس جگہ سے کم و بیش دس میل دور نکل گئے تھے جس جگہ سے انہوں نے رمیش چندر کا پاؤں رکاب میں پھنسا کر گھوڑی کو بھگایا تھا۔ وہ چلے جا رہے تھے اور سورج پہاڑوں کے پیچھے غائب ہو گیا تھا۔ شام کا دھندلکا جنگل پر پھیلتا جا رہا تھا۔

"اب نہ کہنا کہ رات کہیں رکنا نہیں" — دلجیت کور نے کہا — "میں اور زیادہ نہیں چل سکوں گی۔ ایک رات آرام کرنا بہت ضروری ہے۔ پھر دیکھنا میں کس طرح چلتی ہوں"۔

"میں خود بھی تو تھک گیا ہوں" — صغیر نے کہا — "کہیں کوئی گُف یا کوئی کھوہ ڈھونڈنی پڑے گی۔ بارش کا کوئی بھروسہ نہیں"۔

"وہ مردود پنڈت زندہ ہی نہ رہ گیا ہو" — دلجیت کور نے کہا — "اگر زندہ رہا تو پولیس کو ہمارے پیچھے ڈال دے گا۔ میں نے اس کا مال چوری کیا ہے۔ مال تھوڑا بھی تو نہیں!"

"اس کے زندہ رہنے کی تو سوچو ہی نہیں" — صغیر نے کہا — "گھوڑی سو ڈیڑھ سو قدم دور گئی ہو گی کہ یہ شخص مر گیا ہو گا' ہم نے اتنا زیادہ فاصلہ طے کر لیا ہے کہ اس علاقے کے تھانے کی حدود سے بہت دور نکل آئے ہیں۔ امید نہیں کہ پولیس ہمارے تعاقب میں آئے گی۔ میں اس ملک کی پولیس کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ ہمارے پاکستان کی پولیس بھی ایسی ہی ہے"۔

ان دونوں کو معلوم نہیں تھا کہ پولیس پنڈت رمیش چندر کے گاؤں گئی تھی۔ رمیش کے کسی رشتہ دار نے تھانے جا اطلاع دی تھی۔ اطلاع یہ تھی کہ رمیش چندر کے

گھر چوری ہو گئی ہے' تمام زیورات اور اچھی خاصی رقم نکل گئی ہے۔ یہ بھی اطلاع میں شامل تھا کہ ایک سادھو قسم کا آدمی رمیش کا مہمان تھا اور ایک لڑکی کو اس نے گھر میں رکھا ہوا تھا۔ دونوں رات کو ہی غائب ہو گئے تھے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ زیورات اور رقم وہی لئے گئے ہیں۔

اس علاقے کا تھانہ اس گاؤں سے خاصا دور تھا۔ تھانیدار دلجیت کور کو جانتا تھا اور رمیش چندر دو تین مرتبہ دلجیت کور کو تھانیدار کے پاس بھیج چکا تھا۔ دلجیت کور نے اس تھانیدار کو رمیش چندر کا ممنون و مشکور بنا دیا تھا.... اس تھانے دار کے پاس گھوڑی تھی۔ چاہتا تو اطلاع ملتے ہی گاؤں میں آن پہنچتا لیکن وہ تین گھنٹوں بعد تھانے سے چلا اور گاؤں میں اس وقت پہنچا جب رمیش کی لاش جلانے کے لئے اٹھانے لگے تھے۔

تھانیدار کو یہ بھی بتایا گیا کہ وہ دونوں جالندھر کی طرف گئے ہیں۔ رمیش اور چند آدمی ان کے تعاقب میں گئے تھے کہ رمیش چندر کا پاؤں کسی وجہ سے رکاب کے اندر چلا گیا اور گھوڑی نہ جانے کیوں بدک اور ڈر کر بھاگ اٹھی۔ تھانیدار نے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ وہ جالندھر کی طرف تو ان کے تعاقب میں نہیں جا سکتا۔

''مجھے اپنے خاوند کے مرنے کا کوئی افسوس نہیں'' — رمیش کی بیوی نے تھانیدار سے کہا — ''میں اس گھر میں صرف رہتی تھی۔ خاوند کے ساتھ میرا میاں بیوی والا تعلق تھا ہی نہیں۔ مجھے اپنے زیورات اور رقم چاہئے''۔

''خاوند کو دل سے اتار دیا ہے تو زیورات اور رقم کو بھی دل سے اتار دیں'' — تھانیدار نے کہا — ''اگر میں نے یہ کیس لکھ کر آگے کر دیا تو ہمارے بڑے افسروں کو یہ پتہ چل جائے گا کہ لڑکی اغوا کی ہوئی تھی اور اسے زبردستی گھر میں رمیش نے رکھا ہوا تھا۔ لڑکی کو موقع ملا اور وہ اپنی قیمت وصول کر کے ایک آدمی کے ساتھ چلی گئی ہے''۔

دراصل تھانیدار کوئی بھی کارروائی کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس نے اپنے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ اب یہاں سے کیا ملنا ہے۔ کیوں نہ یہ کہہ کر یہاں سے چلیں کہ ہم ان دونوں کے پیچھے جالندھر کی طرف سپاہی بھیجیں گے ..... یہ وہی تھانیدار تھا جو رمیش کے ہاں آتا رہتا تھا اور رمیش اسے عیش و عشرت اور تفریح کراتا تھا اور وقتاً فوقتاً کچھ نقد بھی پیش کیا کرتا تھا۔ تھانیدار تو رمیش کا جگری یار بنا ہوا تھا لیکن رمیش مر گیا تو تھانیدار نے آنکھیں پھیر لیں۔ اس نے کیس رجسٹرڈ ہی نہ کیا اور رمیش کی بیوی کو

جھوٹی تسلیاں دے کر واپس چلا گیا۔

○

صغیر اور دلجیت کور کوئی گُف، غار یا کھوہ ڈھونڈ رہے تھے جہاں رات گزاری جا سکتی لیکن کہیں بھی کوئی اوٹ اور کوئی گُف جیسی پناہ نظر نہ آئی۔ شام خاصی گہری ہو گئی تھی اور رات کا اندھیرا بڑی تیزی سے پھیلنے لگا تھا۔ رمیش کی گھوڑی کو بھگا کر وہ دونوں بہت تیز چل پڑے تھے۔ صغیر کی کوشش یہ تھی کہ بہت جلدی خطرے سے دور نکل جائے۔ شام تک ان کی ٹانگیں شل ہو چکی تھیں۔ وہاں بھیڑیوں اور ریچھوں کا خطرہ بھی تھا۔ بھیڑیے تو اچھی خاصی تعداد میں تھے' ریچھ کم تعداد میں پائے جاتے تھے۔ شیر کی نسل کا ایک درندہ بھی اس جنگل میں رہتا تھا جو شیر جیسا خطرناک تو نہیں تھا لیکن اس کی خصلتیں اور درندگی شیروں جیسی ہی ہوتی تھی۔ یہ شیر کی طرح حملہ نہیں کرتا تھا لیکن اس پر بھروسہ بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ درندہ بھوکا ہو تو پھر وہ بہت ہی دلیر اور خونخوار ہو جاتا ہے۔

صغیر کو ایک ایسی ٹیکری نظر آئی جو بہت اونچی نہیں تھی' اوپر سے یہ ہموار اور چپٹی تھی۔ ایک جگہ چار پانچ درخت بالکل قریب قریب تھے اور ان کے ساتھ ہی خودرو پودے اور جھاڑیاں تھیں۔ صغیر کو رات گزارنے کے لئے یہ جگہ موزوں نظر آئی۔ اس کا خیال تھا کہ درخت اوپر جا کر ایک دوسرے سے مل گئے ہیں اس لئے بارش سے کچھ بچت ہو جائے گی۔

دونوں اوپر چلے گئے۔ ان کے پاس چادر بھی نہیں تھی' کمبل بھی نہیں تھا' ان کے پاس وہی کپڑے تھے جو انہوں نے پہن رکھے تھے۔ گھاس اوس کی وجہ سے گیلی تھی لیکن درختوں کے نیچے جو گھاس تھی اس پر اوس نہیں پڑی تھی کیونکہ اوپر درختوں کا چھاتہ تھا۔ صغیر نے دلجیت کور سے کہا کہ وہ لیٹ جائے۔ وہ لیٹ گئی تو صغیر اس سے پانچ سات قدم دور جا لیٹا۔ وہ دلجیت کور سے دور رہنا بہتر سمجھتا تھا۔ اس پر ایک سے بڑھ کر ایک خوف ناک مصیبت اور مشکل آ پڑی تھی اور اس نے ہر مشکل اور ہر خطرے کا سامنا اور مقابلہ کیا اور سرخرو نکلا تھا لیکن دلجیت کور کا ساتھ اور یہ تنہائی ایسا کڑا امتحان تھا جو صبر آزما بھی تھا اور حوصلہ شکن بھی۔

اس کے لئے مسئلہ یہ پیدا ہو گیا تھا کہ جب بھی کوئی خطرہ اس کا راستہ روک لیتا یا

اس کی جان کے ہی درپے ہو جاتا تو صغیر کی تمام تر قوتیں اور دماغی صلاحیتیں ابھر کر سامنے آجاتی تھیں اور وہ خطرے پر فتح حاصل کر لیتا تھا لیکن دلجیت کور ایسا خطرہ تھا جسے دیکھ کر صغیر کی قوتیں نہیں بلکہ کمزوریاں ابھر آتیں اور وہ اپنے خلاف لڑنا شروع کر دیتا کہ وہ پھسل نہ جائے۔ اسی لئے رات کو اس نے اپنے اور دلجیت کور کے درمیان چھ سات قدموں کا فاصلہ رکھا تھا۔

پنڈت رمیش چندر تو اس کے لئے بڑا ہی خوف ناک خطرہ بن کر آ گیا تھا۔ اگر دونوں پکڑے جاتے تو رمیش اسے قتل بھی کروا سکتا تھا اور چاہتا تو پولیس کے حوالے کر دیتا۔ پھر صغیر کی باقی عمر انڈیا کے قید خانوں میں گزرنی تھی لیکن اللہ نے اس کی نیت کا پھل اسے دیا اور اس خطرے سے نکال لیا مگر دلجیت کور کا حُسن اور اس کی جوانی ایک ایسا خطرہ تھا جو اس کے ایمان اور اخلاق کے لئے چیلنج بنا ہُوا تھا۔

وہ دونوں اتنے تھکے ہوئے تھے کہ لیٹے اور سو گئے۔ دونوں جوان تھے اور جوانی کی نیند ان کے قابو سے باہر تھی.... ان دنوں چاند آدھی رات کے لگ بھگ افق سے اوپر آتا تھا اور چاند تقریباً پورا تھا۔ جنگل کی بھیگی رات کی فضا میں ذرا سی بھی کثافت نہیں تھی اس لئے چاندنی بہت ہی شفاف تھی۔

دلجیت کور کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کی لیکن اُس کا ذہن بیدار ہو گیا۔ ایسا شاید اس لئے ہوا کہ وہ زمین پر پڑی تھی۔ اس کے نیچے نہ پلنگ تھا نہ نرم گداز بستر۔ پہلے تو اسے افسوس سا ہُوا کہ وہ زمین پر پڑی ہے لیکن یہ سوچ کر کہ وہ اپنے گھر کو جا رہی ہے، مسرّت کی ایک لہر اس کے وجود میں دوڑ گئی۔ اسے اس پلنگ اور نرم گداز بستر سے گھن آنے لگی جس پر اس کی جوانی گزر رہی تھی۔ اس آرام دہ بستر سے یہ زمین اچھی لگنے لگی۔

اس نے آنکھیں بند کر لیں اور سونے کی کوشش کرنے لگی لیکن اس کا ذہن اور ہی زیادہ بیدار ہو گیا۔ اس پر جو بیتی تھی وہ اس کی آنکھوں کے سامنے ایک فلم کی طرح آکر گزرنے لگی۔ وہ کہاں سے اغوا ہوئی اور پھر اسے کہاں کہاں لے جایا گیا۔ اس کے پلنگ اور بستر بدلتے رہے۔ وہ ہر رات سہاگن ہوتی تھی۔ اور صبح کو بیوہ ہو جاتی تھی اس نے اس زندگی کو قبول کر لیا تھا۔ قبول کر لینا ہی اس کے لئے بہتر تھا کیونکہ یہاں سے نکل بھاگنے کا کوئی ذریعہ اور کوئی راستہ ہی نہ تھا۔

دلجیت کور اس غلیظ اور روح کُش ماضی میں کچھ دور پیچھے تک چلی گئی، اسے جیسے احساس ہی نہ رہا کہ صغیر اس کے ساتھ ہے اور اب وہ اس غلاظت سے نکل آئی ہے۔ یادیں تلخ ہوتی چلی گئیں، یہاں تک کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے .... وہ اس طرح ایک پہلو کے بل لیٹی ہوئی تھی کہ اس کی پیٹھ صغیر کی طرف تھی۔ ان تلخ اور شرمناک یادوں سے تنگ آکر اس نے کروٹ بدل لی۔ چاند نے رات کو روشن کر دیا تھا۔ ایسی شفاف چاندنی میں اسے صغیر سویا ہُوا نظر آیا تو وہ اس طرح ایک جھٹکے سے اپنے ماضی سے نکل آئی جیسے صغیر نے اسے اوپر ہی اوپر اٹھتے ہوئے اور پھیلتے ہوئے شعلوں میں سے نکال لیا ہو۔ اس کا حوصلہ مستحکم ہو گیا اور مسرّت کی ایک لہر نے تلخ یادوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا اور اُڑا دیا۔ وہ اٹھ بیٹھی اور صغیر کو دیکھنے لگی۔ وہ تو بہت ہی گہری نیند سویا ہُوا تھا۔

"یہ شخص ہمارے گوروؤں جیسا گورو معلوم ہوتا ہے" — دلجیت کور کو خیال آیا — "مسلمان ایسے آدمی کو فرشتہ کہا کرتے ہیں۔ گورو ہے، فرشتہ ہے یا دیوتا ہے، یہ ہم جیسے انسانوں جیسا انسان لگتا ہی نہیں۔ بے چارا مارا مارا پھر رہا ہے۔ اسے پیار اور دل جوئی کی تو بہت ہی ضرورت ہوگی۔ یہ مجھے جلتے ہوئے تنور میں سے نکال لایا ہے۔ اگر یہ دوسرے مردوں کی طرح بدنیّت ہوتا تو میں نے پانچ چھ راتیں اس کے ساتھ گزاری ہیں، یہ اپنی نیّت پوری کر چکا ہوتا لیکن آخر مرد ہے، مرد عورت کے بغیر نہیں رہ سکتا.... میں اس کے لئے کیا کر سکتی ہوں!"

وہ کچھ دیر دور بیٹھی صغیر کو دیکھتی رہی اور چاند اوپر اٹھتا آیا۔ یہ لڑکی دیہاتی سکھوں کی بیٹی تھی۔ سکھ معاشرے میں مرد عورتوں میں بیٹھے ہوئے ننگی گالیوں کی زبان میں باتیں کیا کرتے ہیں۔ ان میں حیوانی جذبہ کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے۔ دلجیت کور کو تو تصوّر ہی یہی دیا گیا تھا کہ عورت کو مرد کی تفریح کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔

صغیر کے متعلق سوچتے سوچتے دلجیت کور کا ذہن اُس مقام پر جا پہنچا جہاں اس نے بڑی شدت سے محسوس کیا کہ صغیر کو اس کی نہیں بلکہ اسے صغیر کی ضرورت ہے۔ اس کے حیوانی جذبات بیدار ہو گئے اور بڑی تیزی سے اس کے دل پر اور عقل پر غالب آ گئے۔

وہ اٹھی اور صغیر کے پاس جا لیٹی۔ صغیر چت لیٹا ہُوا تھا۔ دلجیت کور نے اپنا بازو

صغیر کے سینے پر اور ایک ٹانگ اس کی ٹانگوں پر رکھ دی۔ صغیر گہری نیند میں نہ جانے کیا خواب دیکھ رہا تھا کہ اس نے دلجیت کور کی طرف کروٹ بدل لی اور ایک بازو دلجیت کور پر رکھ دیا۔

ان کی سانسیں آپس میں ٹکرانے لگیں اور دلجیت کور نے صغیر کے بالوں میں انگلیاں الجھا کر انگلیاں بالوں میں پھیرنی شروع کر دیں.... یکایک صغیر کی آنکھ کھل گئی۔ وہ چونک کر اٹھ بیٹھا۔ دلجیت کور نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بازو اس کے گلے میں ڈال دیئے۔ اُس وقت اس سکھ لڑکی پر جذبات کا طلسم طاری تھا۔

"کیوں!" — دلجیت کور اس کے ساتھ لگ کر مخمور سی آواز میں بولی — "ڈر گئے مجھ سے؟ تم سمجھے ہو گے پولیس آ گئی ہے"۔

"میں تم سے دور آ کر لیٹا تھا" — صغیر نے بڑی سنجیدگی سے کہا — "تم اس وقت میرے پاس کیوں چلی آئی ہو؟"

"کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے؟" — دلجیت کور نے کہا — "خود تمہارے پاس آئی ہوں۔ تم مجھے زبردستی گھسیٹ کر تو اپنے پاس نہیں لائے۔ تم نے مجھ پر کوئی معمولی سا احسان نہیں کیا۔ میں تمہیں اس کا کچھ صلہ تو دوں"۔

"میں نے جو زنجیریں توڑ دی تھیں تم مجھے انہی زنجیروں میں باندھ رہی ہو۔ میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا' یہ تو اللہ کا ڈر ہے کہ میں تم سے الگ الگ اور دور دور رہتا ہوں"۔

"تمہارا اللہ تمہیں صلہ دے گا ہی" — دلجیت کور نے کہا — "میں اپنی مرضی سے تمہیں صلہ دینا چاہتی ہوں۔ یہ اتنے زیادہ زیورات تمہیں دیئے تو تم نے قبول نہ کئے' رقم تمہارے حوالے کرنا چاہی تو تم نے یہ بھی قبول نہ کی اور کہا کہ یہ چوری کا مال ہے۔ اب میں تمہیں اپنا آپ' اپنا وجود پیش کرتی ہوں۔ میں جانتی ہوں تمہیں کتنی ہمدردی اور پیار کی ضرورت ہے"۔

"جا دلجیتے!" — صغیر نے دلجیت کور کے کندھے پر ہلکی سی تھپکی دے کر اس طرح کہا جس طرح بچے سے بات کی جاتی ہے — "جا اپنی جگہ پر جا کے سو جا۔ ہمارے سامنے بڑا لمبا اور کٹھن سفر ہے"۔

"تم میرا دل توڑ رہے ہو!" — دلجیت کور نے پہلے سے زیادہ خمار اور وارفتگی سے

کہا — "میری ایک دو باتیں سن لو پھر جو جی میں آئے کرنا.... میں کوئی بچی نہیں۔ میں جانتی ہوں کہ مرد عورت پر مرتا ہے' فاحشہ عورت اور طوائف پر دولت لٹا دیتا ہے۔ آباؤ اجداد کی جائیدادیں بیچ کر عورت پر ضائع کر دیتا ہے۔ قتل کرتا ہے اور قتل ہو جاتا ہے۔ میں کیسے مان لوں کہ تمہیں عورت کی ضرورت ہے۔ اپنے دل پر اتنا وزنی پتھر نہ رکھو اور اپنے آپ پر ظلم نہ کرو"۔

دلجیت کور صغیر سے الگ لیٹنے کی بجائے ایسی حرکتیں کر رہی تھی جیسے اپنا وجود اس کے وجود میں تحلیل کر دینا چاہتی ہو.... وہ جنگل کی رات تھی' تنہائی تھی' دور دور تک کسی انسان کا نام و نشان نہ تھا۔ ساون کی وہ رات خنک تھیں۔ دلجیت کور کا پر شباب اور پر کشش چہرہ چاند کی طرف تھا۔ چاندنی میں اس کے حسن میں طلسماتی سا تاثر پیدا ہو گیا تھا۔

صغیر فرشتہ نہ تھا۔ وہ شراب پیتا رہا تھا۔ بدکاری تو اس کی ہابی تھی۔ غداری سے بڑا جرم اور گناہ اور کیا ہو گا۔ وہ اپنے مقدس وطن کا غدار تھا۔ وہ تو گناہوں کی دنیا میں گم ہو گیا تھا۔ اس نے اپنا راستہ بدل لیا تھا اور منزل کا تعین بھی کر لیا تھا۔ وہ گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کا عزم کر چکا تھا لیکن یہ حسین و جمیل لڑکی اس کے پاؤں کی زنجیر بن گئی اور اسے راہ سے بے راہ کرنے لگی۔ سکھوں کی یہ لڑکی تو سراپا انگیخت اور اشتعال تھی۔ دلجیت کور میں حیوانیت بیدار ہو گئی تھی یا وہ صغیر کے کردار سے اس قدر متاثر اور مرعوب ہو گئی تھی کہ وہ اس کی لونڈی بن جانے کو بے تاب ہوئی جا رہی تھی۔

صغیر کی ذات میں ایک خونریز معرکہ شروع ہو گیا۔ ایک طرف وہ صغیر تھا جس نے شراب' عورت اور دولت کی خاطر اپنے آپ کو اپنے ملک کے دشمن کا آلۂ کار بنا دیا تھا۔ دوسری طرف وہ صغیر جو اس گناہ کا کفارہ ادا کرنے کا عزم کر چکا تھا۔ ایک وہ صغیر جو مقدس وطن کا دشمن بن گیا تھا' دوسرا وہ صغیر جو مقدس وطن کے دشمنوں کو پکڑوا کر پھانسی چڑھوانے جا رہا تھا۔

ایسی زبردست کشمکش کے محب وطن صغیر کے پاؤں اکھڑنے لگے۔ ایک بڑی حسین لڑکی اس صغیر کا ساتھ دے رہی تھی جو اپنے وطن کے دشمنوں کا دوست بن گیا تھا۔ یہ لڑکی اس صغیر کو بھڑکا رہی تھی۔

محب وطن صغیر کی مدد کرنے والا صرف اللہ تھا۔ وہ بری طرح ہار رہا تھا۔ اس نے

دلجیت کور کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اسے اپنے اور قریب کر لیا تھا' اتنا قریب کہ دونوں کے جسموں کی تپش ایک ہو گئی تھی۔

شکست کھانے والے صغیر نے آخری کوشش یہ کی کہ دل ہی دل میں اللہ کو پکارا اور اللہ کی مدد مانگی .... غدار صغیر جیت رہا تھا اور ایمان دار صغیر گھٹنے ٹیکنے پر آگیا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو دلجیت کور کے تقریباً حوالے کر ہی دیا تھا۔

کچھ دیر پہلے ہوا ذرا تیز چل رہی تھی لیکن اب ہوا بالکل ہی رک گئی اور درختوں کی ٹہنیاں اور پتّے خاموش اور ساکن ہو گئے۔ فضا بالکل چپ ہو گئی۔ اچانک ہوا پھر تیز ہو گئی اور اس کے فوراً بعد ہوا اس قدر تیز و تند ہو گئی کہ درختوں میں گزرنے والے جھکڑ چیخنے لگے۔ اس کے ساتھ ہی مینہ برسنے لگا اور ہوا نے طوفانی صورت اختیار کر لی۔

تند و تیز طوفان باد و باراں شروع ہو چکا تھا اور تیز سے تیز ہوتا جا رہا تھا۔ بارش کے قطرے جسم پر اس طرح پڑتے تھے جیسے کنکریوں کی بوچھاڑیں آ رہی ہوں۔ طوفان کے زناٹے اور چیخیں ایسی جیسے چڑیلیں ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑی ہوں اور ایک دوسرے کو چیر پھاڑ دینے کے لئے چیخ چلّا رہی ہوں۔ درختوں کے مضبوط ٹُہن بھی طوفان کے آگے بے بس ہو کر تنکے بن گئے تھے۔

وہ دونوں جن درختوں کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے ان درختوں میں سے ایک درخت کا ایک ٹُہن ٹوٹنے لگا اور اس کے ٹوٹنے کی آواز اس قدر خوفناک تھی کہ دلجیت کور خوف زدہ بچے کی طرح صغیر سے لپٹ گئی لیکن اب وہ جواں سال لڑکی نہیں بلکہ دہشت زدہ بچّی تھی۔ اس کے حیوانی جذبات طوفان باد و باراں کے ساتھ خس و خاشاک کی طرح اُڑ گئے۔

پھر ایک اور درخت کا ٹُہن ٹوٹا۔ ٹوٹنے کی کڑ کڑ کی آواز ایسی تھی جیسے مشین گن سے فائر ہوتی ہے۔ درختوں میں گزرنے سے طوفان کا شور ایسا جیسے ہوائی جہاز سر کے اوپر سے گزرتے جا رہے ہوں۔ اتنے مضبوط درخت کہ جھک کر دوہرے ہوئے جا رہے تھے۔

"دلجیت کور!" — صغیر نے دلجیت کور کے ایک کان کے ساتھ منہ لگا کر اور چلّا کر کہا — "ذہن سے گناہ کا خیال نکال دو' اگر کسی خدا کو مانتی ہو تو اس سے مدد اور معافی مانگو"۔

"اللہ تیرا شکر!" — صغیر نے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف کر کے بلند آواز سے کہا۔ "اللہ تیرا سو سو شکر' تیری ذاتِ باری نے میری مدد کی ہے۔ تیری اس بارش نے میری نیّت سے گناہ دھو ڈالے ہیں"۔

گھٹاؤں نے چاند کو اپنے پیچھے چھپا لیا تھا۔ بجلی چمکتی تھی تو کچھ نظر آتا تھا۔ درختوں کے اس جھنڈ میں ایک درخت بڑا پرانا تھا جس کا تنا خاصا چوڑا تھا اور اوپر سے یہ درخت گھنا تھا۔ صغیر نے دلجیت کور کو اٹھایا اور اس درخت کے تنے کی اوٹ میں لے لیا۔ دونوں وہاں بیٹھ گئے۔ اس درخت نے دونوں کو طوفان کی تیزی و تندی سے محفوظ کر لیا۔ درخت کے پتّوں سے بارش کے قطرے بارش کی طرح ہی گر رہے تھے لیکن وہ دونوں اس خطرے سے محفوظ ہو گئے تھے کہ کھڑے ہو جاتے تو یہ طوفان ان کے پاؤں اکھاڑ کر نہ جانے کہاں سے کہاں تک پہنچا دیتا۔

صغیر پر دلجیت کور کے اشتعال انگیز روّیے سے جو احساس غالب آگیا تھا' وہ بالکل ہی مر گیا۔ صغیر کی تمام جسمانی اور روحانی قوّتیں بیدار ہو گئیں اور وہ نہ صرف یہ کہ سکون محسوس کرنے لگا بلکہ اپنے آپ کو اتنا طاقتور سمجھنے لگا جیسے اس طوفان کے مقابلے میں کھڑا ہو جائے گا۔ محبِ وطن اور ایمان دار صغیر نے غدار صغیر کو لہولہان کر کے طوفان باد و باراں کے آگے پھینک دیا تھا۔

صغیر کو معلوم نہیں تھا' اور دلجیت کور کو تو بالکل ہی علم نہیں تھا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے قرآن میں وعدہ فرمایا ہے کہ ایمان والوں کو اللہ اسی طرح اپنی نشانیاں دکھایا کرتا ہے اور یہ کہ تم ابلیسی قوّتوں کے مقابلے میں ثابت قدم ہو جاؤ تو اللہ تمہاری مدد کے لئے فرشتے اتار دے گا۔

صغیر اتنا سمجھ گیا کہ یہ طوفان باد و باراں ویسے ہی نہیں آگیا' یہ اللہ کی خاص مدد تھی۔

صغیر اور دلجیت کور درخت کے تنے کے ساتھ پیٹھ لگائے بیٹھے رہے اور بیٹھے بیٹھے ہی سو گئے۔ وہ طوفان سے لاتعلق اور بے فکر ہو گئے تھے۔

○

ڈاکٹر عبدالرشید کے دوست .... وہاب' اشتیاق اور ظفر.... جب آگرہ گئے تھے تو انہوں نے ڈاکٹر رشید کو فرار کرانے کا پلان تیار کر لیا تھا۔ عبدالستار نے انہیں کہا تھا کہ

وہ چلے جائیں اور وہ انہیں خط لکھ کر بلالے گا۔ وہاب نے عبدالستار کو احتیاط کے طور پر
اپنے گھر کا نہیں بلکہ کوئی اور ایڈریس دیا تھا۔

ایک روز انبالہ کے اس ایڈریس پر وہاب کو ایک خط ملا۔ اس پر عبدالستار نے
اپنے نام کی جگہ کوئی اور نام لکھا تھا جو انہوں نے آگرہ میں طے کرلیا تھا۔ عبدالستار نے
لکھا تھا:

"آپ کے بھائی صاحب بالکل خیریت سے ہیں اور آپ کو بہت یاد کرتے ہیں۔
پہلی فرصت میں ہی آجائیں۔ ملے بہت عرصہ ہو گیا ہے۔ اگر آپ کی ہمشیرہ بھی ساتھ
آجائیں تو میری بیوی کا بڑا پرانا شکوہ ختم ہو جائے گا۔ انہیں تاج محل دکھائیں گے۔ میں
نے آپ کی سیرو تفریح کے لئے پروگرام طے کرلیا ہے۔ اگر آپ اپنی گاڑی پر آئیں تو
یہاں سیرو تفریح میں سہولت رہے گی ورنہ ٹیکسیوں پر ہی بے شمار پیسے نکل جائیں گے۔
کوشش کریں کہ آپ جلدی پہنچ جائیں"۔

وہاب سمجھ گیا کہ یہ عبدالستار کا خط ہے اور ڈاکٹر رشید کے فرار کے پلان پر عمل
کرنے کا فیصلہ کرلیا گیا ہے۔ وہاب نے یہ خط اپنے دونوں دوستوں کو دکھایا اور انہوں
نے طے کرلیا کہ فوراً آگرہ کو روانہ ہو جائیں۔

تینوں نے گھر والوں کو بتایا کہ وہ سیر سپاٹے کے لئے دلّی جا رہے ہیں اور وہاں سے
دو تین دنوں کے لئے شملہ جائیں گے اور دس بارہ دنوں میں واپس آجائیں گے۔ انہیں
یقین تھا کہ سات آٹھ دنوں بعد واپس آجائیں گے۔ انبالہ سے انہیں آگرہ جانا تھا پھر
آگرہ سے جالندھر۔

انہوں نے وہی گاڑی لے لی جس گاڑی سے صغیر کو ہسپتال سے فرار کروایا تھا۔
اس وقت گاڑی کے ساتھ نمبر پلیٹیں نہیں تھیں۔ اب یہ گاڑی نمبر پلیٹوں کے ساتھ
جا رہی تھی۔ ایسی شناخت ناممکن تھی کہ اسی گاڑی پر صغیر کو فرار کرایا گیا تھا۔ سفید رنگ
کی سوزوکی گاڑیاں اس ملک میں بے انداز تھیں۔

اگر ان تین دوستوں کو ہی جانا ہوتا تو کوئی مشکل نہیں تھی۔ مسئلہ یہ پیدا ہو گیا تھا
کہ خالدہ کو ساتھ لے جانا تھا۔ عبدالستار نے یہ جو لکھا تھا کہ ہمشیرہ کو ساتھ لے آئیں
اس کا مطلب یہ تھا کہ ڈاکٹر رشید خالدہ کے بغیر فرار نہیں ہو گا۔ اب خالدہ کو تیار کرانا
وہاب کا کام تھا۔ اس سلسلے میں وہ خالدہ سے مل چکا تھا اور خالدہ تو پہلے ہی جیسے تیار بیٹھی

تھی۔ اگلے روز وہاب اس ہسپتال میں گیا جہاں خالدہ کام کرتی تھی۔ وہاب اسے مریض
کی حیثیت سے ملا اور سرگوشی کی کہ آج شام پچھلی ملاقات کے وقت اور اُسی جگہ آ
جائے۔ خالدہ نے کہا وہ ضرور آئے گی۔

○

خالدہ وقت پر اُس باغ میں پہنچ گئی جہاں وہ پچھلی بار وہاب سے ملی تھی۔ وہاب نے
اسے بتایا کہ وہ ڈاکٹر رشید کو فرار کروانے کے لئے آگرہ جا رہے ہیں اور اگر وہ ساتھ چلنے
کے لئے تیار ہے تو اسے لے جائیں گے۔

"میں ابھی اور اسی وقت چلنے کو تیار ہوں" — خالدہ نے پُر عزم لہجے میں کہا —
"لیکن یہ ضرور پوچھنا چاہوں گی کہ یہ فرار کہاں تک محفوظ ہو گا یا ایسا تو نہیں کہ آپ
سوچے بغیر یہ قدم اٹھا رہے ہوں؟"

وہاب نے پچھلی ملاقات میں خالدہ کو فرار اور پناہ کے متعلق ساری بات سنا دی
تھی۔ اب ایک بار پھر اس نے بتایا کہ ڈاکٹر رشید کو پاگل خانے سے نکال کر کہاں لے
جائیں گے اور انہیں کون پناہ دے گا۔

"میں اپنے فیصلے اور ارادے پر قائم ہوں" — خالدہ نے کہا — "رشید کے ساتھ
میں بڑے سے بڑے خطرے میں کود جاؤں گی۔ یہ تو ہوئی بات جذبات کی۔ میں نے یہ
بات جذباتی طور پر کہی ہے لیکن سوچتی یہ ہوں کہ ہم پکڑے گئے تو رشید اور آپ مرد
ہیں، آپ کو پولیس نے پریشان کیا اور ٹارچر کیا تو آپ برداشت کرلیں گے، میرے ساتھ
پولیس کا اور ہر کسی کا رویّہ اور برتاؤ کچھ اور ہی ہو گا.... میری عمر دیکھیں اور میرا چہرہ مہرہ
دیکھیں، آپ میری بات سمجھ گئے ہوں گے"۔

"دیکھو خالدہ!" — وہاب نے کہا — "آپ صرف جذبات سے مغلوب ہو کر گھر
سے بھاگ نہیں رہیں۔ آپ کا کردار ایک مسلمان عورت والا کردار ہے۔ ڈاکٹر رشید
رانجھے یا مجنوں والا ڈرامہ نہیں کھیل رہا۔ وہ تمہیں گھر سے بھگا لے جانے کے لئے آگرہ
سے فرار نہیں ہو رہا۔ اس شخص کی عظمت دیکھو۔ وہ تو ہمارے دین کے دشمن کے
خلاف جہاد کر رہا ہے۔ اس نے اپنا مستقبل تاریک کر دیا ہے اور اپنے ماں باپ اور بہن
بھائیوں کو اسلام کے نام پر ایسی اذیّت میں ڈال دیا ہے جو کبھی ختم نہیں ہو گی۔ یہ میرا

عقیدہ اور ایمان ہے کہ اللہ ہماری اور رشید کی مدد کرے گا۔ تمہیں جانا ہی ہے تو اللہ پر
چھوڑو اور تیار ہو جاؤ"۔

"اس پر پہلے ہم بہت باتیں کر چکے ہیں"۔ خالدہ نے کہا۔ "میں اپنے والدین کو
یہ صدمہ نہیں دینا چاہتی تھی لیکن ان کا خیال کرتی ہوں تو اپنا مستقبل انتہائی غلیظ نظر
آتا ہے۔ میں اسلام سے دست بردار نہیں ہو سکتی اور کسی ہندو کی بیوی بننے کی بجائے
خودکشی کو بہتر سمجھتی ہوں"۔

وہاب نے خالدہ سے پوچھا کہ وہ اگر کل ہی روانہ ہونا چاہیں تو کیا وہ تیار ہو جائے
گی؟.... خالدہ میں خود اعتمادی بھی تھی اور اخلاقی جرأت بھی۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ ہندو
افسروں کے ہاتھوں میں کھیلنے میں خوشی محسوس کرتی۔ اس نے وہاب کو جواب دیا کہ کل
وہ دو بجے ڈیوٹی سے آف ہو گی۔ صبح ہسپتال جاتے ہوئے بیگ میں دو جوڑے کپڑوں
کے اور ایک جوڑا جوتیوں کا ڈال کر لے جائے گی اور دو بجے وہاب اسے کوئی جگہ بتادے'
وہ پہنچ جائے گی۔

وہاب نے اسے بتایا کہ کل دو بجے ہسپتال سے چھٹی کر کے وہ سیدھی یہیں
آجائے' وہاب اپنے دوستوں کے ساتھ یہاں موجود ہو گا.... یہ طے کر کے وہ اٹھے اور
اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔



رات خالدہ جب سونے کے لئے لیٹی تو اس کے گھر کے کسی فرد کے تصور میں بھی
نہیں آسکتا تھا کہ خالدہ کی یہ رات اس گھر میں آخری رات ہے۔ سارا گھر معمول کے
مطابق لیٹ گیا تھا۔ ان میں سے کسی کو معلوم نہیں تھا کہ یہ رات اور ان کا یہ گھر خاموش
تو ہو گیا ہے لیکن خالدہ نے اپنے سینے میں ایک طوفان کو روک رکھا ہے اور یہ طوفان اس
گھر کے امن سکون کو اپنے ساتھ اڑا لے جائے گا اور پھر خالدہ انہیں کبھی نظر نہیں
آئے گی۔

گھر والے حسب معمول سو گئے مگر خالدہ کو نیند نہیں آرہی تھی۔ اس کا ذہن تو
بیدار ہی ہوتا چلا جارہا تھا۔ اس کے ذہن میں ڈاکٹر رشید گھوم پھر رہا تھا۔ رشید کو وہ صرف
چاہنے والے ایک آدمی کی صورت میں نہیں دیکھ رہی تھی بلکہ وہ رشید کو اس کردار اور
ایمان کے رنگ میں دیکھ رہی تھی جس کا اس نے مظاہرہ کیا تھا۔ اسے رشید کی ایک ایک

بات یاد آرہی تھی۔

صغیر کو ہسپتال سے فرار کرانے سے پہلے خالدہ ڈاکٹر رشید کو اس لئے عظیم انسان
سمجھتی تھی کہ اس نے خالدہ کی خاطر امیر کبیر گھروں کی لڑکیوں کے رشتے ٹھکرا دیئے تھے
اور یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ خالدہ کو ہسپتال کی نوکری سے ہٹا دے گا اور اس کے گھر کی
ضروریات اپنے ذمے لے لے گا لیکن خالدہ نے سوچا بھی نہ تھا کہ رشید اس سے بڑی'
بہت ہی بڑی قربانی دے سکتا ہے۔ اس کا ایمان کمزور ہوتا تو وہ صغیر کو فرار کرانے کا خطرہ
مول ہی نہ لیتا۔ اگر جذبات میں آکر ایسا کام کر بھی دیتا تو جونہی پکڑا گیا تھا' اپنے دوستوں
کو گرفتار کروا کے خود محفوظ ہو جاتا لیکن اس کی عظمت کی یہ انتہا تھی کہ اتنا ٹارچر
برداشت کیا کہ اس کا دماغ ہی ماؤف ہو گیا اور اسے پاگل قرار دے کر آگرہ کے پاگل
خانے میں پھینک دیا گیا۔

اب اس نے کہا کہ وہ خالدہ کے بغیر کہیں نہیں جائے گا تو خالدہ نے عہد کر لیا تھا
کہ اب اس کا جینا اور مرنا رشید کے ساتھ ہی ہو گا۔

رات آدھی گزر گئی تو خالدہ کا ذہن اور ہی زیادہ بیدار ہو گیا۔ گھر کے تمام افراد پر
گہری نیند کا غلبہ تھا۔ وہ اٹھی اور ننگے پاؤں چلتی اپنے باپ کی چارپائی کے قریب جا رکی۔
ایک روزن سے ہلکی ہلکی چاندنی اندر آرہی تھی جس میں خالدہ کو اپنے باپ کا چہرہ دھندلا
دھندلا سا نظر آرہا تھا۔ اس کا باپ دمے کا مریض تھا اور خالدہ بڑی محنت سے اس کا علاج
کروا رہی تھی۔ وہ کچھ دیر سوئے ہوئے باپ کو دیکھتی رہی۔

خالدہ کے دل پر ایک بوجھ آپڑا۔ اسے یہ اذیت ناک احساس ہونے لگا کہ وہ
اپنے بیمار باپ کو دھوکا دے کر گھر سے بھاگ رہی ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو
آگئے۔ اس پر ایسی کیفیت طاری ہو گئی جس نے اس کے ارادے ہی متزلزل کر دیئے
لیکن اسے یاد آیا کہ وہاب نے اسے یقین دلایا تھا کہ وہ اور اس کے دوست اس کے
باپ کا علاج کروانے کے علاوہ اس کے گھر کی مالی اعانت کرتے رہیں گے۔

خالدہ کو اپنے باپ سے بہت ہی محبت تھی اور اس سے زیادہ محبت اسے اپنے
چھوٹے بھائیوں سے تھی جن کی تعلیم کی خاطر وہ نوکری کر رہی تھی۔ اس کی ماں بھی بیمار
تھی۔ خالدہ نے اپنے آپ کو بڑی ہی مشکل سے اپنے باپ کی چارپائی سے ہٹایا جیسے اپنے
آپ کو دھکیل اور گھسیٹ کر وہاں سے ہٹایا ہو۔ اس کے بھائی برآمدے میں سوئے

ہوئے تھے۔ دونوں کی چارپائیوں کے درمیان جارہی۔ صحن میں چاندنی بکھری ہوئی تھی جس کی روشنی میں اسے دونوں بھائی اچھی طرح نظر آرہے تھے۔ خالدہ بے تاب ہوگئی کہ دونوں چھوٹے بھائیوں کے منہ چوم لے' پھر کبھی ان سے ملاقات ہو یا نہ ہو لیکن بھائی گھبرا کر جاگ اٹھتے اور پریشان ہوجاتے کہ ان کی باجی کو ہو کیا گیا ہے۔ خالدہ نے اپنے آپ کو وہاں سے بھی دھکیلا اور سوئی ہوئی ماں کو جاکر دیکھنے لگی۔

وہ دو حصوں میں کٹ گئی۔ اب تو اس پر ایسا احساس غالب آنے لگا کہ بیمار ماں' دمے کے مریض باپ اور اپنے مستقبل کی خاطر سکولوں میں پڑھتے دونوں بھائیوں کو چھوڑ کر خالدہ نہ جائے۔ وہ جوان تھی' خوبصورت بھی تھی' افسر اسے دوست بھی بنانا چاہتے تھے' اس طرح وہ دولت بٹور سکتی تھی۔ اپنے کردار میں صرف یہ تبدیلی پیدا کرنی تھی کہ عزت و غیرت کو الگ پھینک کر فریب کاری سے کام لینا تھا۔

خالدہ قدم گھسیٹتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی اور چارپائی پر گر پڑی۔ وہ آنسو تو بہا ہی رہی تھی مگر اب بے اختیار سسکیاں نکلنے لگیں۔ اُس نے تصوّر میں اپنے آپ کو ایک سوسائٹی گرل کے روپ میں دیکھا جسے عام فہم زبان میں فاحشہ عورت کہتے ہیں۔ اس تصور میں رشید آن کھڑا ہوا۔ خالدہ کچھ شرمندگی سی محسوس کرنے لگی اور اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس کا جسم اینٹھن کی حد تک ٹینشن میں آگیا ہے۔ اس اذّیت ناک کیفیت میں اس کا دھیان اللہ کی طرف چلا گیا۔

وہ اس طرح چارپائی سے اچھل کر اٹھی جیسے چارپائی جل رہی ہو۔ غسل خانے میں جاکر وضو کیا' کمرے میں آکر مصلّٰی بچھایا اور خشوع و خضوع کے ساتھ دو رکعت نفل پڑھے۔ یہ نفل اس نے سسکیوں اور ہچکیوں کی زبان میں پڑھے تھے۔ اس نے دونوں ہاتھ پھیلا کر اللہ سے التجا کی کہ وہ اگر غلط راستے پر جارہی ہے تو اللہ اسے روک لے۔ اس نے ذرا اونچی آواز میں کہا' یا اللہ' میں کچھ نہیں سمجھتی' تیرا ہی آسرا ہے اور تیری ہی ذات باری سے فیصلہ مانگتی ہوں۔ میری نیّت بدی کے راستے پر نہیں جارہی۔ ایک طرف میرا یہ گھرانہ ہے جس کی کفیل صرف میں ہی ہوں اور دوسری طرف میرا کردار اور ایمان ہے۔ یہاں رُکی رہتی ہوں تو یہ کفّار مجھے تیرے عظیم دین سے محروم کر کے کفر میں لے جائیں گے پھر میں تیرے دین کے دشمن پیدا کرتی رہوں گی۔ یا اللہ اپنے دین اور میرے ایمان کی لاج رکھ لے اور مجھ اپنی روشنی عطا فرما۔

خالدہ نے نمایاں طور پر سکون اور اطمینان محسوس کیا جیسے اس کے وجود میں کوئی اور ہی طاقت پیدا ہوگئی ہو۔ اس کی روحانی قوّتیں بیدار ہوگئی تھیں۔ اللہ نے اس کے آنسوؤں' سسکیوں اور ہچکیوں کی لاج رکھ لی تھی۔

وہ اٹھی' مصلّٰی احتیاط سے تہہ کرکے رکھ دیا اور ایک بیگ نکالا پھر اپنے دو جوڑے کپڑے اور ایک سینڈل نکال کر بیگ میں رکھ لی۔ ایسے ہی دو تین ضرورت کی چھوٹی چھوٹی اشیاء رکھ کر بیگ بند کیا اور الگ رکھ لیا۔ اب وہ لیٹی تو اسے نیند آگئی۔

صبح اٹھی اور حسب معمول ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر ڈیوٹی پر جانے کے لئے تیار ہوئی اور گھر والوں کو خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گئی۔ گلی کے موڑ پر رکی' پیچھے دیکھا اور ایک بار پھر اس کے دل پر ایک بوجھ آن پڑا لیکن وہ فوراً چل پڑی اور گلی کا موڑ مڑ گئی۔



وہاب' اشتیاق اور ظفر پورے دو بجے گاڑی میں اس جگہ جا رکے جہاں خالدہ کو آنا تھا۔ وہ اپنا ضروری سامان ساتھ لے آئے تھے۔ خالدہ کو ساتھ لے کر انہیں وہیں سے آگرہ روانہ ہو جانا تھا۔ خالدہ کو وہ انبالہ میں کہیں چھپا کر نہیں رکھنا چاہتے تھے۔

بیس پچیس منٹ بعد خالدہ بھی آگئی۔ اسے پچھلی سیٹ پر بٹھا لیا گیا اور وہاب نے گاڑی چلا دی۔ وہاب نے خالدہ سے کہا کہ وہ اپنا سر نیچے رکھے تاکہ شہر میں کوئی اسے پہچان نہ لے۔ گاڑی شہر سے نکل گئی۔ ان کے سامنے چار سو کلو میٹر سے کچھ زیادہ مسافت تھی۔ گاڑی بہت اچھی حالت میں تھی۔ وہاب نے اس کی رفتار ایک سو کلو میٹر سے زیادہ نہ رکھی تاکہ انجن زیادہ گرم نہ ہوجائے۔

راستے میں ایسا کوئی خطرہ نہیں تھا کہ کہیں چیکنگ ہوگی اور خالدہ کے متعلق کوئی پوچھے گا کہ یہ لڑکی کون ہے اور اسے کہاں لے جایا جارہا ہے۔ چار بجے سے چند منٹ بعد گاڑی ایک بڑے قصبے سے گزر رہی تھی تو ایک دوست نے کہا کہ چائے کے لئے رک جاتے ہیں۔ تب خالدہ نے کہا کہ اس نے دوپہر کا کھانا کھایا ہی نہیں تھا۔ وہاب نے درمیانے سے ایک ہوٹل کے سامنے جا گاڑی روکی۔ خالدہ کو کھانا کھلایا گیا اور پھر سب نے چائے پی اور پھر سب منزل کی طرف چل پڑے۔

شام ساڑھے چھ سے ذرا بعد گاڑی آگرہ میں داخل ہوئی اور کچھ دیر بعد وہ آگرہ کے پاگل خانے کے قریب عبدالستار کے سرکاری کوارٹر کے سامنے جا رکے۔ یہ کوارٹر بڑا

اچھا اور کشادہ مکان تھا جس میں گاڑی کے لئے گیراج بھی تھا۔ اس طرح گاڑی مکان میں چھپ گئی۔

ڈاکٹر رشید کے ان دوستوں نے عبدالستار کو اپنے آنے کی اطلاع دی ہی نہیں تھی۔ یہ اس لئے کہ وہ زیادہ خط وکتابت کو ٹھیک نہیں سمجھتے تھے اور دوسرے اس لئے کہ انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ ایک آدھ دن ہی تیاری میں صرف کریں گے اور اگلے روز چل پڑیں گے۔ ضروری نہیں تھا کہ خط اتنی جلدی پہنچ جاتا۔ پاکستان کی طرح انڈیا کا ڈاک کا نظام بھی کچھ ایسا ویسا ہی تھا۔ بہرحال یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ عبدالستار گھر ہی تھا اور ان لوگوں کو کوئی پریشانی نہ ہوئی۔

عبدالستار نے انہیں بتایا کہ جالندھر والا چوہدری معراج دین آیا تھا اور اس کے ساتھ آخری بات طے کرلی گئی ہے۔ عبدالستار نے انہیں سارا پلان سنایا جو چوہدری معراج کے ساتھ بنایا تھا۔

پھر عبدالستار نے انہیں وہ کاغذ دکھایا جس پر چوہدری معراج نے جالندھر سے اپنے گاؤں تک کا نقشہ بنا کر دیا تھا۔ چوہدری نے کہا تھا کہ اس کے گھر پہنچنے کے لئے کوئی پیچیدگی نہیں ہوگی اور اگر وہ گھر نہ ہُوا تو بھی فرق نہیں پڑے گا اور ایسا انتظام کردے گا کہ ڈاکٹر رشید اور اس کے دوست وہاں پہنچیں گے تو گھر والے سمجھ جائیں گے کہ یہ کون لوگ ہیں۔ مطلب یہ کہ چوہدری کے گھر والے ان لوگوں کو خاص مہمان سمجھیں گے۔

خالدہ ان سب کے ساتھ بیٹھی یہ باتیں سن رہی تھی۔ اسے انبالہ میں ہی وہاب کی باتوں سے یقین آگیا تھا کہ اس کے ساتھ کوئی دھوکہ اور فریب نہیں ہو رہا لیکن آگرہ پہنچنے تک اسے کئی بار یہ خیال آیا تھا کہ ڈاکٹر رشید کے ان تینوں دوستوں کو بالکل ہی نہیں جانتی اور اس کے سامنے کوئی ایسا ثبوت بھی نہیں کہ یہ واقعی ڈاکٹر رشید کے دوست ہیں۔ ان کی صرف باتیں تھیں جن پر وہ اللہ کے بھروسے اعتماد کئے ہوئے تھی۔ اب وہ عبدالستار کے گھر آگرہ پہنچی‘ ان کی باتیں سنیں تو اس کی یہ خلش بھی رفع ہوگئی۔ اسے پوری طرح یقین ہوگیا کہ یہ کوئی دھوکا نہیں۔ خالدہ نے ڈاکٹر رشید کی خاطر اور اپنی عزت و آبرو بچانے کے لئے یہ خطرہ مول لیا اور ان تین اجنبی آدمیوں کے ساتھ آگئی تھی۔

عبدالستار نے خالدہ کو خراجِ تحسین پیش کیا کہ وہ بہت بڑی قربانی دے رہی ہے اور پھر اس کی حوصلہ افزائی کی۔ اس کا اثر خالدہ پر یہ ہُوا کہ اس پر جذباتیت طاری ہوگئی اور اس کے آنسو نکل آئے۔

"مجھے معلوم ہے خالدہ!" — عبدالستار نے کہا — "یہ دوست مجھے بتا چکے ہیں کہ تمہارے چلے جانے سے پیچھے تمہارے گھر کا حال کیا ہوگا۔ ایک تو تمہارے والدین اور چھوٹے چھوٹے بھائی تمہاری گمشدگی پر پریشان ہوں گے اور تمہارے گھر میں صفِ ماتم بچھ جائے گی۔ دوسرا بڑا اور اصل مسئلہ یہ پیدا ہوگا کہ گھر والوں کی کفالت کیسے ہوگی۔ وہاب صاحب نے تمہیں شاید بتایا ہی ہوگا کہ تمہارے گھر کی کفالت ہم اپنے ذمے لے لیں گے۔ ابھی تو یہ دعا کریں کہ ڈاکٹر رشید صاحب کو ہم اندر سے نکال لیں اور پھر آپ سب جالندھر خیر و عافیت سے پہنچ جائیں۔ تمہارے والد صاحب کو کچھ نہ کچھ پنشن تو ملتی ہی ہے‘ ایسی صورتِ حال تو نہیں کہ کوئی اور ذریعہ آمدن ہی نہ ہو۔ ہم انہیں انشاءاللہ تنگدستی کا احساس نہیں ہونے دیں گے"۔

"لیکن کب تک!" — خالدہ نے کہا — "یہ ایک دو دنوں کیا ایک دو مہینوں کا مسئلہ تو نہیں ہوگا‘ یہ تو کئی سالوں پر پھیلا ہُوا مسئلہ ہے"۔

"یہی کچھ سوچ سوچ کر پریشان نہ ہوتی رہو خالدہ!" — وہاب نے کہا — "تمہارا ایک بھائی اس وقت دسویں جماعت میں پڑھتا ہے۔ ہم اسے بی اے کروالیں گے اور پھر دیکھیں گے کہ اسے کس لائن پر ڈالا جائے۔ میں نے پہلے تمہیں یہ بات نہیں بتائی تھی‘ اب بتاتا ہوں‘ اب تم جانتی ہو کہ ہم مسلمان یہاں کس طرح خوف و ہراس اور بدبختی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ڈاکٹر رشید کے اس جہاد اور قربانی کو بہت سے مسلمان جانتے ہیں۔ ان کے اپنے محلّے کے تو سب لوگوں کو معلوم ہے اور یہ سب لوگ رشید کو مجاہد اور قابلِ تحسین کہتے ہیں۔ سب بہت خوش ہیں کہ کسی مسلمان نے تو اس ہندو حکومت کو ضرب لگائی ہے۔ انہیں جب ہم بتائیں گے کہ اب کیا صورتِ حال پیدا ہوگئی ہے تو یہ لوگ ہماری بے دریغ مالی اعانت کریں گے۔ یہ سارا معاملہ اللہ کے سپرد کرو اور دل سے یہ غم نکال دو"۔

"آپ نے ایک اور پہلو پر ابھی سوچا ہی نہیں" — خالدہ نے کہا — "اس وقت میرے گھر میں قیامت کا منظر بنا ہُوا ہوگا۔ میں جس وقت آپ کے پاس پہنچی تھی اس

وقت میں گھر پہنچ جایا کرتی تھی۔ اب رات ہوگئی ہے اور میں گھر سے اتنی دور بیٹھی
ہوں۔ میرے بھائی ہسپتال جاکر پوچھتے پھرتے ہوں گے کہ ہماری بہن کہاں ہے۔ امّی ا
ابّا جان الگ پریشان ہوں گے اور مجھے یہ غم کھا رہا ہے کہ ذرا سا جذباتی جھٹکا ابّا جان کے
لئے دمے کے دورے کا باعث بن جاتا ہے انہیں کون سنبھالے گا"۔

"کیا ان کے ساتھ فون پر بات ہوسکتی؟" — عبدالستار نے خالدہ سے پوچھا۔
"آپ کے گھر کے قریب کسی گھر میں فون ہے؟"

"جی ہاں ہے" — خالدہ نے جواب دیا — "ہمارے گھر کے بالمقابل گھر میں فو
ہے اور مجھے کبھی ہسپتال سے بات کرنی ہوتی ہے تو اسی فون پر کیا کرتی ہوں۔ بڑے اچھے
لوگ ہیں لیکن یہاں سے کیسے بات ہوسکتی ہے؟"

آگرہ کے پاگل خانے کی انتظامیہ میں عبدالستار جس پوسٹ پر تھا' وہ خاصی ا
اور اونچی پوسٹ تھی۔ پاگل خانے کی طرف سے عبدالستار کے گھر میں فون لگا ہُوا تھا۔
عبدالستار نے خالدہ کو بتایا کہ یہ ساتھ والے کمرے میں فون موجود ہے اور وہ انبالہ بات
کرلے۔ خالدہ یہ سن کر بہت خوش ہوئی۔ سوال یہ پیدا ہوگیا کہ خالدہ بات کیا کرے۔
یہ تو اسے کہنا ہی تھا کہ وہ گھر واپس نہیں آئے گی لیکن کیا بتائے کہ وہ کہاں ہے۔
عبدالستار ڈاکٹر رشید کے دوستوں نے اس مسئلے پر غور اور بحث و مباحثہ شروع کردیا۔
اس کے سوا اور کوئی شک ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ خالدہ اپنے کسی چاہنے والے کے ساتھ
نکل گئی ہے۔ سب کا خیال تھا کہ یہ تاثر نہ دیا جائے..... کچھ دیر کی بحث و تمحیص کے بعد
بات طے کرلی گئی اور خالدہ سے کہا گیا کہ وہ اس طرح بات کرے۔ عبدالستار خالدہ
ساتھ والے کمرے میں لے گیا اور انبالہ کے اس گھر کا فون نمبر ملایا جس گھر کے فون
بات کرنی تھی۔

"یہ لیں" — عبدالستار نے فون خالدہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا — "رنگ
جارہی ہے"۔

"ہیلو..... کون بول رہا ہے؟" — خالدہ نے پوچھا — "کون؟..... ثمینہ؟..... السلا
علیکم..... ثمینہ ذرا ابّا جان اور امّی کو بلالو"۔

"تم کہاں ہو خالدہ!" — ثمینہ نے پوچھا — "تمہاری امی اور ابا جان تو بہت پریشان
ہیں۔ تمہارے بھائی ہسپتال سے ہو آئے ہیں اور تین بار میں نے ہسپتال فون کیا ہے
کہاں غائب ہوگئی ہو؟"

"یہی انہیں بتانا ہے" — خالدہ نے کہا — "پلیز انہیں جلدی بلوا دو"۔

ثمینہ ریسیور رکھ کر دوڑتی باہر نکلی اور خالدہ کے گھر جا پہنچی۔ بڑی خوشی کے لہجے
ں اس نے خالدہ کے ماں باپ سے کہا کہ خالدہ کا فون ہے۔ وہ دونوں پریشان حال
پلنگوں بیٹھے تھے۔ دونوں مریض تھے۔ اتنی سی بات پر کہ خالدہ کا فون ہے' دونوں اٹھے
ر باہر کو دوڑے جیسے اچانک جوان ہوگئے ہوں..... خالدہ کے دونوں بھائی بھی ان کے
چھے چلے گئے۔

"ہیلو خالدہ بیٹی!" — باپ نے کانپتے ہوئے ہاتھوں اور لرزتے الفاظ میں کہا —
لیکم السلام..... پہلے ہی فون کردیا ہوتا کہ تم دیر سے آؤ گی..... اب کیا ہُوا!؟"

"ابّا جان" — خالدہ نے کہا — "پہلے یہ وعدہ کریں کہ میری بات سن کر آپ
شان نہیں ہوں گے..... میں انبالہ سے بہت دور سے بول رہی ہوں۔ اس غلط فہمی میں
پڑ جائیں کہ میں کسی آدمی کے ساتھ گھر سے بھاگ آئی ہوں۔ یہ بھی میں چند دنوں
بعد بتاؤں گی کہ میں کہاں ہوں اور یہاں کیوں آگئی ہوں۔ میں نے اللہ اور رسول
صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم سے رہنمائی حاصل کی ہے۔ میرا یہ قدم اپنی اور آپ سب
بہتری کے لئے اٹھا ہے۔ آپ کو ذرا سی بھی مالی پریشانی نہیں ہوگی۔ میرے متعلق
ل بے غم ہوجائیں۔ اپنی دوائیاں باقاعدگی سے لیتے رہیں اور امّی کو بھی دوائیاں دیتے
ں۔ آپ کو ذرا سی بھی مالی تنگدستی نہیں ہوگی۔ میں جانتی ہوں کہ میری اتنی سی بات
پ کی پریشانی کم نہیں کرسکے گی لیکن میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ پریشانی سے
ں۔ میں جہاں بھی ہوں' محفوظ ہوں اور میری عزت و آبرو محفوظ ہے..... نہیں ابّا
ان میں آپ کو ابھی فون نمبر نہیں دے سکتی..... کچھ دنوں بعد میں آپ کو ایک تفصیلی
لکھوں گی جس سے آپ مطمئن ہوجائیں گے۔ فون پہ اتنی لمبی بات نہیں ہوسکتی۔
ب سے زیادہ ضروری بات جو میں آپ کو کہنا چاہتی ہوں وہ یہ ہے کہ کوئی صاحب
پ کے پاس آئیں گے۔ ہو سکتا ہے وہ دو یا تین آدمی ہوں۔ وہ آپ کو بتائیں گے
میں کہاں ہوں..... ہاں ابّا جان! وہ مسلمان ہیں اور زیادہ کیا بتاؤں' یہی کہوں گی کہ
معنوں میں مسلمان ہیں۔ کسی پر ایسا شک نہ کرنا ابّا جان کہ وہ مجھے گھر سے ورغلا کر یا
ستی اغوا کر کے کہیں لے گئے ہیں۔ اب امّی سے بات کرا دیں' بات لمبی ہو رہی

ہے"۔

خالدہ نے اپنی امّی سے بات کی پھر دونوں بھائیوں سے بھی بات کی۔ بھائیوں کو اس نے بڑے پیار سے کہا کہ وہ اس کی غیر حاضری میں پڑھنے لکھنے سے منہ نہ موڑلیں اور پہلے سے زیادہ محنت کریں۔ خالدہ کی امّی رو رہی تھی۔ خالدہ نے اس کے ساتھ وہی باتیں کیں جو اپنے باپ کے ساتھ کی تھیں۔ اس نے پوری کوشش کی تھی کہ ماں باپ کو مطمئن کردے لیکن اس کی بات ادھوری تھی جب تک وہ ماں باپ کو یہ نہ بتاتی کہ وہ کہاں ہے اور کس کے ساتھ ہے اور انہیں اطلاع دیئے بغیر کیوں گئی ہے' انہیں اطمینان ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ باپ کو یہ خطرہ بھی محسوس ہو رہا تھا کہ ہندوؤں نے خالدہ کو اغوا کرلیا ہے اور وہ اس سے قتل کی دھمکی سے فون پر بات کروا رہے ہیں۔ خالدہ کا لب ولہجہ ایسا تھا تو نہیں لیکن مسلمانوں کے لئے انڈیا کے حالات کچھ ایسے ہی تھے۔

ماں سے اس نے یہ بات کہی کہ ایک نہ ایک دن اسے ان سے جدا ہونا ہی تھا۔ یہی سمجھیں کہ اس کی شادی ہوگئی ہے اور اب وہ انہیں کبھی کبھار ہی ملے گی لیکن ماں کو یہ غم لگ گیا تھا کہ خالدہ جوان ہے اور خوبصورت بھی ہے اور یہی چیز اس کے لئے خطرہ بن گئی ہے۔ بہرحال خالدہ نے ماں باپ کو مطمئن کرنے کی پوری کوشش کی اور فون بند کردیا۔ ماں باپ کو اتنا سا اطمینان ہوگیا کہ ان کی بیٹی زندہ وسلامت ہے۔

○

اگلے روز عبدالستار ڈاکٹر رشید کے تینوں دوستوں کو پاگل خانے کے اندر لے گیا اور ڈاکٹر رشید سے ملاقات ہوئی۔ ڈاکٹر رشید نے پہلی بات یہ پوچھی کہ خالدہ آئی ہے یا نہیں۔ اس نے جب سنا کہ وہ آگئی ہے تو اس کے چہرے پر رونق آگئی۔ اس نے کہا کہ اسے بھی ساتھ لے آنا تھا۔

"ڈاکٹر صاحب!" — عبدالستار نے کہا — "آپ ہیں تو ڈاکٹر لیکن دنیا والوں کو ٹھیک طرح نہیں سمجھتے۔ ہم اندر آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں' کوئی دیکھتا ہی نہیں کہ کون آیا اور کون چلا گیا ہے لیکن ایک جوان اور اچھی شکل صورت والی لڑکی اندر آجائے تو ہر کسی کی نگاہیں اس کی طرف اٹھنے لگتی ہیں۔ دیکھنے والے یہ بھی دیکھیں گے کہ اس کے ساتھ کون ہے اور وہ کیوں اندر آئی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ عورت کو مینٹل ہاسپٹل کے اندر آنے کی اجازت ہی نہیں"۔

"یہ تو میں سمجھ سکتا ہوں" — ڈاکٹر رشید نے کہا — "کوئی بھی پاگل اس پر حملہ کرسکتا ہے"۔

"میری سوچ کو سمجھیں" — عبدالستار نے کہا — "میری کوشش یہ ہوتی ہے کہ کسی کی توجہ ہماری طرف ہو ہی نہیں"۔

عبدالستار نے ڈاکٹر رشید کو اس جگہ جاکر بیٹھنے کو کہا جہاں پہلے ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ مطلب یہ تھا کہ ڈاکٹر رشید اکیلا ہی اس جگہ جائے تاکہ کسی کو یہ معلوم نہ ہوسکے کہ اسے کوئی ملنے آیا ہے۔ وہ جگہ اونچے پودوں اور درختوں پر چڑھی ہوئی بیلوں میں چھپی ہوئی تھی۔

ڈاکٹر رشید اس طرح اس طرف چلا جیسے چہل قدمی کررہا ہو اور کسی خاص کام سے نہ جا رہا ہو۔ اب تو اور زیادہ احتیاط کرنی تھی کیونکہ ایک دو دنوں بعد ڈاکٹر رشید کو یہاں سے نکالنا تھا۔

ڈاکٹر رشید آہستہ آہستہ ٹہلتا ہوا وہاں تک پہنچا اور بیٹھ گیا۔ عبدالستار تینوں دوستوں کو کسی اور طرف سے ادھر لے گیا اور سب ڈاکٹر رشید کے پاس جا بیٹھے۔ قدرتی طور پر پہلا سوال یہ تھا کہ ڈاکٹر رشید ذہنی طور پر اب کیسا ہے۔

"سنبھل گیا ہوں" — ڈاکٹر رشید نے جواب دیا — "اب اگر کچھ دنوں کے لئے دوائی چھوڑ دوں تو بھی ذہن ٹھیک ہی رہے گا۔ مجھے اپنے آپ پر یہ اعتماد حاصل ہوگیا ہے کہ ایمرجنسی کی صورت میں بالکل نارمل رہوں گا۔ بہرحال فرار کے لئے بالکل تیار ہوں"۔

ڈاکٹر رشید کے چہرے سے اور باتوں سے پتہ چل رہا تھا کہ یہ شخص اب ذہنی طور پر صحت یاب ہوچکا ہے۔ اب مسئلہ اسے وہاں سے نکالنے کا تھا۔ اس کا حلیہ یہ تھا کہ داڑھی لمبی ہوگئی تھی اور کچھ بے ترتیب سی تھی۔ سر کے بال بھی خاصے بڑھ آئے تھے۔ اس نے جو کپڑے پہن رکھے تھے وہ میلے کچیلے ہوچکے تھے۔ پہلے عبدالستار اس کے کپڑے بدلواتا رہتا تھا۔ کپڑے بدلتا تو وہ خود تھا' عبدالستار دھلے دھلائے کپڑے لاکر اسے دے دیتا تھا لیکن جب سے فرار کا پلان بنا تھا' عبدالستار نے اس خیال سے اس کے کپڑے نہیں بدلوائے تھے کہ وہ خاصا میلا کچیلا لگے۔ ایک بار اس کے سر کے بال بھی ترشوا دیئے تھے لیکن وہ پھر چھوڑ دیئے۔ اس کے پیچھے عبدالستار کی دانش مندی تھی۔

ایک تو اس وجہ سے سر کے بال اور داڑھی بڑھنے دی گئی کہ اس کا حلیہ یہی رہے، دوسری وجہ یہ تھی کہ حجام کو پاگل خانے کے اندر اپنے اوزار لے کر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ کوئی بھی پاگل اس سے استرا چھین کر اپنا گلا یا کسی اور کا گلا کاٹ سکتا تھا۔ عبدالستار ایک حجام کو چوری چھپے اندر لے گیا اور چوری چھپے ڈاکٹر رشید کے بال چھوٹے کروائے تھے۔

ڈاکٹر رشید نے اپنے گھر والوں کے متعلق پوچھا کہ وہ کیسے ہیں۔

"تم خود سمجھ سکتے ہو" — وہاب نے کہا — "ہم نے انہیں یہ نہیں بتایا کہ تم یہاں ہو۔ یہ سن کر انہیں اور ہی زیادہ دکھ ہوتا۔ ایک جوان اور ڈاکٹر بیٹے کا پاگل ہو جانا ماں باپ کو ذہنی مریض بنا دینے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ ہم نے یہ بھی سوچا کہ تمہیں یہاں رہنے ہی نہیں دیں گے تو پھر تمہارے گھر والوں کو نہ ہی بتائیں تو اچھا ہے۔ عبدالستار صاحب انہیں یہاں لاکر تم سے ملوا سکتے ہیں لیکن انہیں ہم اس صدمے سے بچانا چاہتے ہیں۔ ہیں تو وہ اب بھی صدمے کی حالت میں ہی لیکن جب تم سرحد پار کر جاؤ گے تو ہم انہیں بتائیں گے کہ تم صحیح سلامت پاکستان پہنچ گئے ہو"۔

اس کے بعد فرار کی باتیں ہونے لگیں۔ ڈاکٹر رشید نے اپنے دوستوں سے کہا کہ وہ ایک بار پھر سوچ لیں۔ وہ تو شکنجے میں آیا ہی ہُوا ہے، کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ وہ تینوں بھی کسی مشکل میں پھنس جائیں۔

"اب ایسی بات منہ سے نہ نکالو" — اشتیاق نے کہا — "ہم اس مقصد کے لئے آئے ہیں اور یہ مقصد پورا کر کے ہی جائیں گے"۔

عبدالستار نے ڈاکٹر رشید کو بتایا کہ اسے کس حلئے میں یہاں سے نکالا جائے گا۔ اسے اگلے روز نکالنا تھا۔ یہ سارے انتظامات عبدالستار کو کرنے تھے۔

"میں اب چلتا ہوں" — عبدالستار نے کہا — "میرے جانے کے دس بارہ منٹ بعد آپ بھی یہاں سے آہستہ آہستہ چلتے نکلیں اور میرے گھر پہنچ جائیں"۔

عبدالستار کے چلے جانے کے بعد رشید کے تینوں دوست اٹھے اور جس راستے سے آئے تھے اسی راستے سے باہر چل پڑے۔

○

اگلے روز جب انچارج ڈاکٹر کا راؤنڈ ختم ہو گیا تو عبدالستار، وہاب، اشتیاق اور ظفر کو ساتھ لئے پاگل خانے میں داخل ہُوا۔ ڈاکٹر رشید کو جیسے ایک روز پہلے بتایا گیا تھا وہ ان کے انتظار میں ایک جگہ کھڑا تھا۔ اس نے دور سے انہیں آتے دیکھا تو وہ اس جگہ کی طرف چل پڑا جو اسے بتادی گئی تھی۔

ڈاکٹر رشید کے تینوں دوستوں نے پلاسٹک کا ایک ایک تھیلا اٹھا رکھا تھا۔ تھیلوں میں ڈاکٹر رشید کے لئے کپڑے لے جائے جا رہے تھے۔ ایک تھیلے میں پاجامہ اور کرتا، دوسرے میں شیروانی اور تیسرے میں جناح کیپ تھی۔ یہ چاروں اس طرح ٹہلتے ٹہلتے اس جگہ تک گئے جیسے سیر سپاٹے کے لئے آئے ہوں۔ ڈاکٹر رشید کو وہاں کھڑا پایا۔

عبدالستار نے اپنی جیب سے حجاموں جیسی ایک قینچی نکالی اور ڈاکٹر رشید کو بٹھالیا۔ پہلے اس کے سر کے بال جو شانوں تک بڑھ آئے تھے قینچی سے کاٹ دیئے اور پھر ان بالوں کو تراش تراش کر ذرا بہتر شکل بنادی۔ پھر اس کی داڑھی کی لمبائی اسی قینچی سے کم کردی اور داڑھی کو تراش تراش کر چھوٹا کر دیا۔ اتنی چھوٹی داڑھی ڈاکٹر رشید کے چہرے پر اچھی لگتی تھی۔

عبدالستار حجام کو ساتھ لاکر یہ کام کروا سکتا تھا لیکن اب جس پلان پر عمل شروع ہوگیا تھا اس میں ایک حجام کو اعتماد میں لینا خطرناک تھا۔ حجام یہ کام کرتا تو داڑھی اور زیادہ اچھی لگتی لیکن عبدالستار نے قینچی سے ہی سے یہ کام کرلیا۔ پھر اس کے میلے کپڑے اُتروا کر صاف ستھرا استری کیا ہوا پاجامہ اور کرتا پہنایا گیا۔ یہ دونوں کپڑے دھوبی سے دھلوائے گئے تھے جو عبدالستار نے کچھ دن پہلے دھلوا لئے تھے۔ ڈاکٹر رشید کو شیروانی پہنائی گئی اور سر پر جناح کیپ رکھ دی گئی۔ پھر عبدالستار نے جیب سے رنگ دار چشمہ نکال ڈاکٹر رشید کو دیا جو اس نے اپنی آنکھوں پر رکھ لیا۔ اسے ہلکی پھلکی بڑی خوبصورت جوتی پہنائی گئی۔

اگر ڈاکٹر رشید قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑا ہو جاتا تو اپنے آپ کو پہچان نہ سکتا۔ وہ اب پاگل رشید نہیں تھا بلکہ ایک معزز آدمی تھا جو پاگل خانے میں کسی مریض سے ملنے آیا تھا۔ اس کے کٹے ہوئے بال اور اتارے ہوئے کپڑے اکٹھے کر کے ایک گھنی جھاڑی میں چھپا دیئے گئے تھے۔ پاگل خانے کا یہ حصہ کچھ ویران سا تھا۔ ادھر کم ہی کوئی جاتا ہوگا۔ بہرحال عبدالستار اپنے لئے بہت بڑا خطرہ مول لے رہا تھا۔ پکڑے جانے کی صورت میں اسے صرف اتنی اعلیٰ ملازمت سے ہی سبکدوش نہیں ہونا تھا بلکہ

اس کے خلاف مقدمہ درج ہوتا اور دو چار سال سزائے قید ملنی تھی۔

عبدالستار ڈاکٹر رشید سے صرف اس لئے متاثر ہُوا تھا کہ ایک بار اسے ڈاکٹر کی حیثیت میں ملا تھا اور اپنا کچھ دن علاج کروایا تھا لیکن اس کے عوض جو عبدالستار ڈاکٹر رشید کے لئے کر رہا تھا وہ بہت ہی زیادہ خطرناک تھا۔ احسان کا بدلہ چکانے کے لئے اتنا ہی کافی تھا کہ عبدالستار ڈاکٹر رشید کے گھر والوں کو بتا دیتا کہ ڈاکٹر رشید آگرہ کے پاگل خانے میں ہے اور وہ اس کا خیال رکھے گا لیکن وہ تو اپنے آپ اور اپنے خاندان کے مستقبل کو بھی ڈاکٹر رشید پر قربان کر رہا تھا۔

یہ ایسا رشتہ تھا جو روحوں میں اُترا ہُوا تھا۔ یہ اسلام کا رشتہ تھا۔ اس شخص کا کردار اسلام کے سانچے میں ڈھلا ہُوا تھا۔ یہ اسلامی اخوت کا رشتہ تھا۔ ڈاکٹر رشید نے جو قربانی صغیر کے لئے دی تھی عبدالستار اس سے زیادہ قربانی ڈاکٹر رشید کے لئے دینے کا عزم کئے ہوئے تھا۔

کچھ اور گہرائی میں جائیں تو اللہ کی آواز سنائی دیتی ہے کہ اے اہلِ اسلام 'لوگ جب تمہیں کفّار سے یہ کہہ کر ڈراتے ہیں کہ ان کے پاس تو بہت لشکر ہیں اور وہ تم سے طاقت ور ہیں تو تم اگر ایمان کے پکّے ہوئے تو تمہارا ایمان اور زیادہ پختہ ہو جائے گا اور کہو گے کہ ہمیں اللہ کافی ہے' وہی بہترین ساز گار ہے۔

پھر یہ بھی اللہ کی ہی آواز ہے — "شیطان تمہیں اپنے دوستوں یعنی کفار سے ڈراتا ہے۔ ان سے مت ڈرو' اگر تم ایمان والے ہو تو مجھ سے ڈرو' میری راہ میں جہاد کرو اور میں تمہیں مدد دوں گا"۔

تو پھر بات یہاں پر آن پہنچتی ہے کہ عبدالستار کو اللہ تعالیٰ نے ڈاکٹر رشید کی نجات کا ایک ذریعہ اور سبب بنا دیا تھا۔ عبدالستار ڈاکٹر رشید اور اس کے دوستوں کو وہیں چھوڑ کر وہاں سے چلا گیا۔ ڈاکٹر رشید اور اس کے دوست جانتے تھے کہ اب انہیں کیا کرنا ہے۔ وہ بھی چل پڑے۔ وہ بھاگ نہیں رہے تھے بلکہ اس طرح آہستہ آہستہ چلے جا رہے تھے جیسے پاگل خانے کے دورے پر آئے ہوں۔ ڈاکٹر رشید ان میں سب سے زیادہ معزز اور صاحبِ حیثیت لگتا تھا۔ وہ اسی طرح آہستہ آہستہ چلتے پاگل خانے کے بڑے گیٹ سے نکل گئے۔

عبدالستار کا گھر دور نہیں تھا۔ ڈاکٹر رشید کے دوست اسے عبدالستار کے گھر لے گئے جہاں خالدہ بے تابی سے اس کی منتظر تھی۔ دوستوں نے گھر کے اندر جا کر یوں نہ کیا کہ اٹھے بیٹھ جاتے بلکہ ڈاکٹر رشید کو اشارہ کر کے تینوں ایک اور کمرے میں چلے گئے۔ رشید اور خالدہ کو تنہا چھوڑ دینا چاہتے تھے۔ خالدہ رشید کو ایک کمرے میں لے گئی اور دروازہ بند کر لیا۔ ان کی ملاقات بڑی ہی جذباتی تھی۔ خاصی دیر تو ان کی زبان پر کوئی بات نہ آ سکی۔ خالدہ کی سسکیاں بڑھتی جا رہی تھیں اور رشید کے آنسو بہہ رہے تھے۔ رشید تو صحیح معنوں میں جہنّم سے نکل کر آیا تھا اور اس کے سامنے ایسا سفر اور ایسی منزل تھی جس کے متعلق وہ جانتا تو تھا لیکن اجنبیت اور بے یقینی غالب تھی۔ وہ آخر ایک انسان تھا۔ خالدہ کو اپنے جسم سے لگا دیکھ کر اسے صغیر کے فرار سے پہلے کے دن یاد آ گئے تھے۔

اسے جیسے اچانک یاد آ گیا ہو کہ وہ مرد ہے اور ایسی صورتِ حال میں الجھ گیا ہے جس میں مکمل ذہنی اور جسمانی بیداری کی ضرورت ہے۔ اس نے خالدہ کو اپنے آپ سے الگ کیا اور بٹھا دیا۔ بڑی تیزی سے اس نے آستین سے اپنے آنسو پونچھے اور خالدہ کو دلاسا دینے لگا۔

"معلوم نہیں تم کیا محسوس کر رہے ہو" — خالدہ نے کہا — "مجھے تو یوں لگ رہا ہے جیسے خواب دیکھ رہی ہوں۔ ایسی باتیں اور ملاقاتیں خواب ہی ہُوا کرتی ہیں"۔

"اب اس خواب سے بیدار ہو جاؤ خالدہ!" — ڈاکٹر رشید نے کہا — "ہم اُس مقام تک پہنچ گئے ہیں جہاں سے واپسی ناممکن ہے۔ اب پیچھے نہ دیکھو۔ یہ میرا ایمان ہے کہ اللہ ہمارے ساتھ ہے"۔

"مجھے امّی' ابّا جان اور بھائیوں کا خیال آ رہا ہے" — خالدہ نے کہا۔

"انہیں صرف یہ فرق پڑے گا کہ تم ان سے جدا ہو گئی ہو" — ڈاکٹر رشید نے کہا — "اس کے سوا ان کے لئے گھر میں کوئی اور مسئلہ پیدا نہیں ہو گا۔ میرے دوستوں نے سب کچھ طے کر لیا ہے"۔

ڈاکٹر رشید نے خالدہ کو وہی باتیں کہیں جو رشید کے دوست اس سے کر چکے تھے۔

"اب مجھے اپنے دوستوں کے پاس جانا چاہئے" — ڈاکٹر رشید نے کہا — "ہمیں الگ بیٹھے بہت دیر ہو گئی ہے.... تم بھی ساتھ آ جاؤ"۔

دونوں اٹھے اور اس کمرے میں چلے گئے جہاں باقی سب بیٹھے ہوئے تھے۔ ان

میں عبدالستار نہیں تھا۔ اسے شام چار بجے واپس آنا تھا۔ ان کے سامنے یہی ایک موضوع اور مسئلہ تھا کہ اب کیا کریں گے۔ ڈاکٹر رشید پہلے بھی چند مرتبہ پوچھ چکا تھا کہ یہ چوہدری معراج کیسا آدمی ہے۔ اب اس نے پھر یہی بات پوچھی۔

"ان چوہدریوں کا کچھ بھروسہ نہیں ہوتا" — رشید نے کہا — "ان کے باپ دادا انگریز کے درباری خوشامدی بنے رہے ہیں اور یہ ہندوؤں کو انگریزوں کی طرح ان داتا اور دیوتا مانتے ہیں۔ ہم تو اللہ کی خوشنودی کے لئے اس خطرے میں کود گئے ہیں لیکن ان چوہدریوں کو ہندو کی خوشنودی درکار رہتی ہے۔ ہمیں پکڑوا کر یہ چوہدری ہندوؤں کو خوش کر سکتا ہے"۔

"نہیں رشید!" — رشید کے دوست ظفر نے کہا — "تم جانتے ہو کہ اس چوہدری کے بیٹے کو ہندوؤں نے ایک سازش اور مسلم دشمنی کے تحت اس پاگل خانے بھجوایا ہے۔ عبدالستار صاحب نے اس لڑکے کو اپنی ذمہ داری میں لے لیا ہے"۔

"تم جانتے ہو رشید!" — وہاب نے کہا — "پاگل خانے میں تمہیں اس چوہدری کی ساری کہانی سنائی تھی۔ اس کے دل میں ہندوؤں کی نفرت بھری ہوئی ہے۔ باقی باتوں کو چھوڑو، چوہدری معراج اپنے بیٹے کی خاطر عبدالستار کو ناراض کرنے کا خطرہ مول نہیں لے گا"۔

"وہمی نہ بنو رشید!" — اشتیاق بولا — "احتیاط اچھی چیز ہے لیکن وہم سے بچو.... تم ہم سب سے زیادہ عقل اور دانش والے ہو رشید! بات کرنی ہے تو ایک اور مسئلے پر غور کرو۔ اللہ کرے ہم منزل پر تمہیں پہنچا دیں اور واپس انبالہ چلے جائیں۔ وہاں مسئلہ یہ کھڑا ہو گا کہ خالدہ کے والدین سے ہم ملیں گے اور بتائیں گے کہ خالدہ کہاں ہے پھر انہیں یقین دلائیں گے کہ ان کی مالی اعانت باقاعدگی سے ہوتی رہے گی اور ان کے دیگر گھریلو مسائل اور امور پر بھی نظر رکھی جائے گی۔ ہم سب اندازہ کر سکتے ہیں کہ خالدہ کے ابّا جان کس قدر غم اور صدمے کی حالت میں ہوں گے۔ اس ذہنی کیفیت میں وہ ہمارے خلاف پولیس سٹیشن جا کر رپورٹ لکھوا دیں گے کہ ہم نے ان کی بیٹی کو اغوا کیا ہے اور فلاں جگہ پہنچا دیا ہے۔ اب یہ سوچنے اور کہنے کی ضرورت ہی نہیں کہ ہم تینوں اور تم بھی پکڑے جاؤ گے اور پھر اپنا انجام سوچ لو"۔

"میرے ابّا جان ایسی کارروائی کبھی نہیں کریں گے" — خالدہ نے کہا — "آپ

نہیں جانتے کہ وہ سینے میں کیسے زخم لئے پھرتے ہیں۔ یہ تو ایک مجبوری تھی کہ وہ 1947ء میں یہاں سے نکل نہیں سکے تھے۔ یوں کہیں کہ ہم لوگ یہاں مجبوری کے تحت رہ رہے ہیں۔ میں آپ کو بتاتی ہوں کہ آزادی کے وقت ابا جان کے خاندان پر کیا گزری تھی....

"اس وقت کو ابّا جان ابھی تک بھولے نہیں۔ کبھی کبھار وہ بھیانک واقعات سنانے شروع کر دیتے ہیں تو امّی انہیں روکتی ہے کہ بچوں کو نہ ڈرائیں لیکن ان کے اندر جو غم و غصے اور صدموں کا غبار بھرا ہوا ہے، وہ انہیں پریشان کرتا رہتا ہے۔ انہیں دمے کا مرض لاحق ہو گیا جس کا باعث یہی غم و غصہ ہے۔ آپ نے بھی سنا ہو گا کہ انبالہ میں ہندوؤں نے اس طرح بے دردی سے مسلمانوں کا قتل عام کیا اور ان کے گھر جلائے اور مسلمان لڑکیوں کی اجتماعی آبروریزی کی تھی....

"ہم میں سے اس وقت کوئی بھی پیدا نہیں ہوا تھا لیکن جن پر بیتی تھی وہ تو نہیں بھول سکتے۔ میرے ایک چچا ہندوؤں کے ہاتھوں شہید ہوئے اور ان کی تیرہ چودہ سال عمر کی ایک بیٹی کی برہنہ اور چچوڑی ہوئی لاش باہر ایک میدان میں پڑی ملی تھی۔ اس لڑکی کا چھوٹا بھائی ایسا لاپتہ ہوا کہ آج تک اس کا سراغ نہیں ملا۔ گھر جلا تو نہیں لیکن لوٹ مار ایسی ہوئی کہ چند ایک کپڑے گھر میں رہ گئے....

"پھر بات کریں میری امّی کی۔ اُس وقت امّی نوجوانی کی عمر میں تھی۔ ہندوؤں نے چار پانچ دن انہیں اپنے پاس رکھا تھا اور پھر امّی بے ہوشی کی حالت میں ایک خالی مکان میں پڑی ملی تھی۔ ان کے خاندان کے کچھ افراد شہید ہو گئے، کچھ بھاگ گئے اور امّی اس بُری حالت میں اکیلی رہ گئیں۔ میرے دادا جان انہیں اپنے گھر لے آئے اور میرے ابّا جان کے ساتھ شادی کر دی....

"یہ ہیں میرے والدین جن کے دلوں میں ہندوؤں کی ایسی نفرت بھری ہوئی ہے کہ ان کا بس چلے تو اس ملک میں نہیں تو کم از کم انبالہ شہر کے کسی ہندو کو زندہ نہ چھوڑیں۔ وہ تو اکثر پاکستان کی باتیں کرتے رہتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ اب بھی کوئی صورت ہو جائے تو وہ یہاں سے پاکستان ہجرت کر جائیں.... آپ انہیں صاف الفاظ میں بتانا کہ ڈاکٹر رشید کے چلے جانے کے بعد میرے لئے ہسپتال میں کیسے کیسے خطرے پیدا ہو گئے تھے۔ یہ بھی بتانا کہ ایک ہندو فوجی ڈاکٹر نے تو مجھے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ مجھے

ہندو بنا کر میرے ساتھ شادی کرے گا۔ میں نے یہ باتیں کبھی بھی اپنے ابّا جان یا امّی کو نہیں بتائی تھیں۔ آپ انہیں بتانا کہ آپ کی بیٹی کی عزت و آبرو کو محفوظ کرنے کے لئے اور اسے اپنے مذہب میں ہی رکھنے کے لئے پاکستان بھجوا دیا ہے۔ ڈاکٹر رشید کی ساری بات انہیں بتانا جو میں پہلے انہیں بتا چکی ہوں۔ ان کے سارے غم ختم ہو جائیں گے لیکن یہ آپ کا کام ہو گا کہ آپ میں سے کوئی نہ کوئی ایک دو دنوں بعد انہیں ملتا رہے اور انہیں تسلّی دیتا رہے۔ میں اگر پاکستان میں زندہ اور سلامت پہنچ گئی تو انہیں تفصیلی خط لکھوں گی"۔

اس محفل پر کچھ دیر کے لئے سنّاٹا طاری رہا۔ خالدہ نے یہ بات اس طرح سنائی تھی کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہے جا رہے تھے اور آواز میں غم اور درد بھرا ہُوا تھا۔ ہندوستان کا اگر ہر مسلمان نہیں تو ہر تیسرا مسلمان ایسی ہی خونچکاں اور دردناک کہانی کا کردار ہے۔ ڈاکٹر رشید کو تو پہلے ہی خالدہ نے اپنے خاندان کی ٹریجیڈی سنا رکھی تھی، رشید کے دوستوں کے لئے یہ ایک نئی بات تھی۔ یہ ایک یہ کہانی نہیں سنی تھی، یہ تو انہوں نے سینکڑوں سنی تھیں لیکن خالدہ کے ساتھ ان کا ایک ایسا تعلق ہو گیا تھا جس میں تقدس بھی تھا اور جذبات کی تپش بھی۔ رشید کے دوستوں پر ایسا تاثر طاری ہو گیا کہ وہ جو مہم سر کرنے نکلے تھے، یہ مہم ان کے لئے ایک چیلنج بن گئی اور انہوں نے دل ہی دل میں ایک بار پھر یہ عہد کیا کہ رشید اور خالدہ کو جان کی بازی لگا کر سرحد پار کرائیں گے۔

"دکھ والی بات تو صرف ایک ہے" — ڈاکٹر رشید نے کہا — "پاکستان کے متعلق ہماری جو سوچ ہے اور پاکستان کی عظمت جو ہماری آنکھوں میں ہے، پاکستان میں اس کا نام و نشان بھی نہیں ملتا سوائے اس کے کہ یہ ایک اسلامی ملک ہے۔ پاکستان کے لیڈروں میں ذرا سی بھی قومی غیرت ہوتی تو پاکستان ہندوؤں کے ہاتھوں یوں آدھا نہ رہ جاتا۔ ہندوؤں کی لیڈرشپ نے پاکستان کو ایک کمزور ملک بنا کر کمزور ملکوں کے کوڑا کباڑ میں پھینک دیا ہے۔ میں صرف اس لئے پاکستان جا رہا ہوں کہ یہ اسلامی ملک ہے اور وہاں ہندوؤں کا خطرہ نہیں ہو گا"۔

"پاکستان کو سب سے بڑا خطرہ اپنی لیڈرشپ سے ہے" — اشتیاق نے کہا — "ہمارے کچھ عزیز ہجرت کر گئے تھے۔ ان میں سے کوئی نہ کوئی تین چار سال بعد ملنے

آ جاتا ہے۔ ان عزیزوں سے پاکستان کے احوال و کوائف سنتے ہیں تو بہت ہی افسوس ہوتا ہے۔ میرے والد بتایا کرتے تھے کہ قائداعظم نے کہا تھا کہ پاکستان دارالاسلام ہو گا اور برصغیر کے تمام مسلمانوں کے لئے دارالامان ہو گا لیکن سنا ہے وہاں پاکستانی دوسرے ملکوں میں بھاگے جا رہے ہیں"۔

"یہ بالکل صحیح ہے" — وہاب نے کہا — "پاکستان کے سبز پرچم میں ہمارے خون کی لالی رچی بسی ہوئی ہے۔ ہمارے باپ دادا جانتے تھے کہ ہمارا علاقہ پاکستان میں نہیں آئے گا پھر بھی انہوں نے اسلام کے نام پر ایک نئی اسلامی مملکت کے قیام کے لئے قربانیاں دیں اور کفّار نے انہیں جو سزا دی، وہ ہم اپنے والدین سے سنتے ہی رہتے ہیں اور اب خالدہ سے بھی سن لیا ہے"۔

"پھر بھی میرا خیال کچھ اور ہے" — ڈاکٹر رشید نے کہا — "خرابی قباحت پاکستان میں نہیں بلکہ یہ اس قیادت کا گناہ ہے جس نے پاکستان کو اپنے باپ دادا کی جاگیر سمجھ کر اسے پٹیالہ اور نابھہ جیسی ریاست بنا لیا ہے۔ یہ ہماری اور پاکستان کے عوام کی ذمہ داری ہے کہ اس قیادت سے اپنے ملک کو آزاد کرائیں پھر اسے وہ طاقت بنائیں جس نے قیصرِ روم اور کسریٰ ایران کو تاریخ میں عبرت کے نشان بنا دیا تھا۔ یہ طاقت ایمان کی پختگی سے پیدا ہوتی ہے"۔

"ایمان کی پختگی قوم میں علماء دین پیدا کیا کرتے ہیں اور پھر اسے زندہ و بیدار رکھتے ہیں" — ظفر نے کہا — "لیکن جہاں علماء دین بھی سیاسی لیڈر بن جائیں وہاں سے ایمان بھی اور رحمت کے فرشتے بھی رخصت ہو جایا کرتے ہیں"۔

"یہی ہماری یعنی انڈیا کی ٹریجیڈی ہے" — ڈاکٹر رشید نے کہا — "پاکستان کمزور ہوتا ہے تو ادھر ہندو انڈیا کے مسلمانوں پر شیر ہو جاتے ہیں۔ جہاں ہندو قیادت کو اور ہندو عوام کو ذرا سا بھی شک ہو جاتا ہے کہ پاکستان جنگی طاقت کا کوئی مظاہرہ کرنے والا ہے تو یہاں کے ہندو مسلمان کو ہاتھ جوڑ کر پرنام کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ پاکستان کی اصل ٹریجیڈی یہ ہے کہ وہاں کی قیادت نے اپنی عیش و عشرت کی خاطر امریکہ کی غلامی قبول کر لی ہے۔ اب تو پاکستان غیر ملکی اور غیر مسلم عالمی ساہوکاروں کے قرضوں کی زنجیروں میں جکڑا گیا ہے"۔

"اس کے باوجود میرے دوستو!" — ایک اور دوست نے کہا — "ہمیں مایوس

نہیں ہونا چاہئے۔ ایک تو مایوسی گناہ ہے اور دوسرے یہ کہ پاکستان اللہ کی زمین ہے۔ اللہ نے جس طرح قرآن کی حفاظت اپنے ذمے لے رکھی ہے اسی طرح پاکستان کا دفاع بھی اللہ نے اپنے ہاتھوں میں رکھا ہُوا ہے۔ اس کی صاف نشانی یہ ہے کہ پاکستان کی قیادت تو کبھی کی پاکستان کا سودا کر چکی ہے اور اس نے ایسے حالات پیدا کر دیئے ہیں جن حالات میں کوئی طاقت ور ملک بھی زندہ نہیں رہ سکتا لیکن پاکستان زندہ ہے اور انشاء اللہ زندہ رہے گا۔ یہ شہیدوں کی سرزمین ہے۔ شہیدوں کا حساب سیّد احمد شہید کے وقتوں سے شروع کریں اور اب تک حساب کر لیں۔ پاکستان کی زمین کا ایک ایک انچ شہیدوں کے لہو سے منوّر ہے۔ ان شہیدوں کے صدقے اللہ نے پاکستان کو زندہ رکھا ہُوا ہے اور یہ ملک تاابد زندہ رہے گا"۔

"یہ تو اللہ کا فرمان ہے" — ڈاکٹر رشید نے کہا — "ظلم جب انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو مظلوم ایک طاقت بن کر اُٹھتے ہیں اور اللہ ان کا ساتھ دیتا ہے.... پاکستان کے مظلوم بھی اٹھیں گے' انہیں اللہ اٹھائے گا اور پھر اللہ ان کے ساتھ ہو جائے گا"۔

ایسی گفتگو اکثر محفلوں میں ہُوا کرتی ہے۔ سب کا انداز جذباتی ہوتا ہے اور ہر کسی کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ زیادہ پُراثر اور خوبصورت الفاظ استعمال کرے اور جب محفل برخاست ہوتی ہے تو اس میں سب کہا سنا ذہنوں سے اتر جاتا ہے لیکن آگرہ کی اس محفل کا انداز حقیقت پسندانہ تھا اور اس میں بولنے والے سب لوگ عملاً کچھ کرنے کا تہیّہ کئے ہوئے تھے۔

باتوں باتوں میں وقت اتنی تیزی سے گزرا کہ پچھلے پہر کے چار بج گئے اور عبدالستار آ گیا۔

"رشید کے نکل آنے کا کسی کو پتہ تو نہیں چلا؟" — وہاب نے عبدالستار سے پوچھا۔

"ابھی نہیں!" — عبدالستار نے جواب دیا — "شام کو گنتی کے وقت پتہ چلے گا اور پھر کچھ شور شرابہ اٹھے گا"۔

○

شام کو جب پاگلوں کی گنتی ہوئی تو ایک بارک میں ایک پاگل کم تھا۔ وارڈن اور دیگر ملازم گم شدہ پاگل کو اِدھر اُدھر ڈھونڈنے کے لئے بکھر گئے۔ بارک کے قریب وہ نہ

ملا تو جھاڑیوں میں ڈھکی چھپی جگہوں پر جا کر دیکھنے لگے۔ وہ کہیں نظر نہ آیا۔

جھاڑیوں اور گھنے اور اونچے پودوں میں اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے ایک جھاڑی میں سے کپڑے گرے۔ انہیں کھول کر دیکھا گیا تو ان میں لمبے اور چھوٹے بال لپٹے ہوئے تھے۔ یہ سمجھنا کوئی مشکل نہیں تھا کہ یہ کپڑے کسی پاگل کے ہیں اور اس پاگل کے بال کاٹے گئے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ اسی گم شدہ پاگل کے ہوں۔

وارڈن یہ کپڑے اور بال اٹھائے اُس روز کے ڈیوٹی آفیسر کے پاس گئے اور رپورٹ دی کہ ایک پاگل غائب ہے اور جھاڑی سے یہ کپڑے اور بال ملے ہیں۔ ڈیوٹی آفیسر یہ رپورٹ سن کر پریشان ہو گیا۔

"یہ تو پولیس کا کیس ہے" — ڈیوٹی آفیسر نے کہا — "اگر یہ کپڑے اور بال اسی گم شدہ پاگل کے ہیں تو صاف پتہ چلتا ہے کہ اسے یہاں سے نکالا گیا ہے۔ اس کا حلیہ بدلنے کے لئے اس کے لمبے بال کاٹے گئے ہیں اور دوسرے کے کپڑے پہنا کر اسے فرار کرایا گیا ہے .... یہ کپڑے اسی بارک میں لے جاؤ اور جو پاگل ذرا ہوش و حواس میں رہنے والے ہیں' ان سے معلوم کرو کہ غائب ہو جانے والے پاگل نے یہی کپڑے پہن رکھے تھے یا یہ کسی اور کے ہیں!"

وارڈن اس بارک میں گئے اور تین چار پاگلوں کو بلا کر کپڑے دکھائے اور پوچھا کہ جو غائب ہے' کیا یہ اس کے کپڑے ہیں؟.... اس بارک میں ان پاگلوں کو رکھا گیا تھا جو ہنگامہ اور دنگا فساد نہیں کرتے تھے' آرام سے ایک جگہ بیٹھے رہتے یا لیٹ جاتے یا ویسے ہی گھومتے پھرتے رہتے تھے۔ ان سے عقل کی کسی بات کی توقع نہیں رکھی جا سکتی تھی۔

"مجھے دکھاؤ یہ کپڑے" — ایک پاگل نے کہا۔

وارڈن نے کپڑے اسے دکھائے تو اس پاگل نے چہرے پر عجیب سا تاثر پیدا کر کے کپڑوں کو کھول کر بڑے غور سے دیکھا اور پھر یہ کپڑے اوپر کو اچھال کر کہا — "وہ جو گیا' وہ بس چلا گیا ہے"۔

ایک اور پاگل نے کپڑے اٹھا کر وارڈن کو دیئے اور بولا — "یہ کپڑے اسے دے دو اور اسے میری طرف سے یہ کہنا' اے حرام زادے' تم ننگے ہی باہر آ گئے ہو' یہ لو کپڑے پہن لو"۔

اس پاگل نے بڑی زور سے قہقہہ لگایا تو بارک کے کئی اور پاگل دوڑے آئے اور

وارڈن کے اردگرد کھڑے ہو کر کچھ نہ کچھ بولنے اور زور زور سے ہنسنے لگے۔ وارڈن کے لئے وہاں سے نکلنا مشکل ہوگیا۔ وہ نکل تو آیا لیکن گم شدہ پاگل کے کپڑے بارک میں ہی چھوڑ آیا۔

"اوسنتری!" — ایک پاگل کپڑے اٹھائے ہوئے وارڈن کے پیچھے دوڑا آیا اور بولا — "اس کے کپڑے لے لو اور اس تک پہنچادو وہ ننگا پھر رہا ہو گا"۔

وارڈن دوڑتا ہوا ڈیوٹی آفیسر کے پاس پہنچا اور نے بتایا کہ پاگلوں نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ ڈیوٹی آفیسر اس وجہ سے گھبرایا ہُوا تھا کہ اس کی ڈیوٹی کے دن ایک پاگل کم ہوگیا تھا۔ اسے کسی پاگل کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ اس کے لئے یہ مسئلہ پیدا ہوگیا تھا کہ اس سے باز پُرس ہوگی اور یہ بھی پوچھا جائے گا کہ اس نے کیا کارروائی کی تھی۔ وہ وارڈنوں اور دیگر ذمہ دار سٹاف پر برس رہا تھا۔

"یہ پاگل ہمارے قیدی نہیں" — اس نے کہا — "لیکن یہ مت بھولو کہ ان کے لواحقین انہیں ہماری ذمہ داری میں یہاں چھوڑ گئے ہیں۔ کل کوئی اس گم شدہ پاگل کا وارث آگیا اور اسے ہم نے یہ بتایا کہ تمہارا مریض غائب ہوگیا ہے تو وہ سیدھا پولیس کے پاس جاکر ہمارے خلاف مقدمہ درج کروادے گا۔ ذرا سوچو، تم اسے کہاں سے لاؤ گے .... جاؤ اور اسے ڈھونڈو"۔

پاگل خانہ بہت ہی وسیع و عریض تھا۔ عملے کے کئی آدمی پھر دوڑے گئے۔ اب اندھیرا پھیل گیا تھا۔ بتیّاں جل رہی تھیں لیکن تاریک جگہیں بھی کم نہیں تھیں۔ روشنی کے مختلف انتظامات کر کے عملے کے آدمی گم شدہ پاگل کو ڈھونڈتے پھرے۔ انہیں کون بتاتا کہ گم شدہ پاگل پاگل خانے کے قریب ہی ایک مکان میں موجود ہے اور وہ پاگل نہیں، ہوش و حواس کی باتیں کہہ اور سن رہا ہے۔

عبدالستار جب چار بجے گھر پہنچا تھا تو اس نے سب سے پہلے یہ دیکھا کہ ڈاکٹر رشید کے بال جلد بازی میں چھوٹے کئے گئے تھے اور داڑھی بھی بڑی عجلت میں تراشی گئی تھی۔ اس نے بہتر سمجھا کہ یہ ذرا اچھی شکل میں تراشے جائیں۔ کسی حجام کو بلانا محفوظ نہیں تھا کیونکہ بات نکل سکتی تھی کہ یہ حجام عبدالستار کے گھر ایک آدمی کے عجیب طرح سے کٹے ہوئے بال سلیقے سے تراشنے کے لئے گیا تھا۔ اس کا یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ عبدالستار نے خود ہی قینچی اور کنگھی سے رشید کے بال بہتر طریقے سے تراش لئے اور

...ھی کی بھی اچھی شکل و صورت بنا دی۔ شیو نہیں کی جاسکتی تھی کیونکہ شناخت کا ...رہ تھا۔

جس وقت ڈیوٹی آفیسر کی ڈانٹ ڈپٹ کے بعد اندر کا عملہ ایک بار پھر ٹارچیں اور ...ین لے کر ڈاکٹر رشید کو پاگل خانے کے تاریک گوشوں میں ڈھونڈ رہا تھا، اُس وقت ان ...شدہ پاگل اچھی طرح نہا دھو کر کھانے پر بیٹھا ہُوا تھا۔ اب عملے کے آدمی بارکوں کی ...چھتوں پر بھی جا چڑھے تھے جو ہموار اور سیدھی تھیں یعنی سلیٹوں والی مخروطی چھتیں ...نہیں۔ گم شدہ پاگل کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔



رات گزر گئی۔ صبح پاگل خانے کا ڈاکٹر انچارج آیا تو ڈیوٹی آفیسر نے رپورٹ دی ...فلاں بارک سے ایک پاگل گزشتہ شام لاپتہ ہوگیا ہے۔ اس نے گم شدہ پاگل کے ...ے اور بال ڈاکٹر انچارج کی میز پر رکھ دیئے۔ ڈاکٹر انچارج نے ایک ہی سانس میں کئی ...پوچھ ڈالے۔ اس پاگل کا نام عبدالرشید لکھا ہُوا تھا۔

"کیا یہ وہ ڈاکٹر نہیں تھا؟" — یہ نام سن کر ڈاکٹر انچارج نے چونک کر پوچھا — ...م کرو کہ یہ وہ انبالے والا پاگل تو نہیں تھا جسے انٹیلی جنس والے یہاں داخل ...ئے تھے"۔

فوراً رجسٹر منگوایا گیا تو پتہ چلا کہ یہ وہی پاگل ہے جو انبالہ کے ملٹری ہسپتال میں ...ہُوا کرتا تھا۔ ڈاکٹر انچارج کو یاد آگیا کہ دِلّی سے انٹیلی جنس کے تین چار افسر اسے ...آئے تھے اور ڈاکٹر انچارج نے خود ہی اس کی حرکتیں دیکھ کر اور باتیں سن کر فیصلہ ...کہ اس پاگل کی صحت یابی کا کوئی امکان نہیں اور اسے اب یہیں مرنا ہو گا۔ انٹیلی ...کے افسروں نے بھی رائے دی تھی کی اب اسے لاعلاج پاگل ہی سمجھیں گے۔ ان ...انے ایسا تاثر دیا تھا جیسے اب وہ اسے دیکھنے کبھی نہیں آئیں گے۔ اتنے مہینے گزر ...کے بعد بھی وہ نہیں آئے تھے۔

...ڈاکٹر انچارج نے ڈیوٹی آفیسر کی پوری رپورٹ سن کر اسے فارغ کر دیا اور اس کے ...کے بعد اس بارک کے ڈاکٹر انچارج کو بلایا۔ وہ عیسائی ڈاکٹر ولیم تھا۔ فوراً آن پہنچا ...ڈاکٹر انچارج نے اسے بٹھا لیا۔ پہلی بات یہ پوچھی کہ وہ انبالے والا پاگل ڈاکٹر اب ...حوالا میں تھا۔

"برے ہی حال میں تھا سر!" — ڈاکٹر ولیئم نے بتایا — "وہ تو لاعلاج حد تک پ
ہُوا تھا۔ ابھی ابھی پتہ چلا ہے کہ وہ گزشتہ شام سے لاپتہ ہے۔ میرے لئے کیا حکم
سر!"

"حکم نہیں ولیئم!" — ڈاکٹر انچارج نے کہا — "مجھے تمہارے تعاون کی ضرور
ہے۔ میں کسی لمبی چوڑی کارروائی میں نہیں الجھنا چاہتا۔ جتنے مریض اس مینٹل ہاسپ
میں ہیں وہ ہمارے قیدی نہیں' مریض ہیں۔ اگر کسی مریض کے عزیز اسے ملنے آ
ہیں اور نظر بچا کر اسے کسی طرح یا گیٹ کے سنتری سے مل کر ساتھ ہی لے جاتے ہیں
ہم کیا کر سکتے ہیں۔ اس مریض کے متعلق میں اس لئے کچھ پریشان ہو گیا ہوں کہ ا
جنس کی طرف سے یہاں سے داخل کیا گیا تھا۔ کہیں وہ آ کر اس کی نہ پوچھ لیں!"

"شاید ایسا کبھی نہ ہو سر" — ڈاکٹر ولیئم نے کہا — "وہ تو صاف فیصلہ سنا گئے
کہ اس شخص کو اب بھول جائیں۔ مجھے یقین ہے کہ اپنے ریکارڈ سے انہوں نے ا
پاگل کو رائٹ آف کر دیا ہو گا۔ مجھ سے بہتر اور کون جانتا ہو گا۔ میں اسے ہر روز د
ہوں۔ اس کی حالت بگڑی ہے سنبھلی نہیں' میری نظر اس پر صرف اس لئے جاتی ہے
جو کچھ بھی اس کا جرم تھا' وہ ڈاکٹر تھا۔ ڈاکٹری کے رشتے سے میں اسے دیکھتا تھا اور کر
نہیں سکتا تھا"۔

"کیا اس کے رشتے دار اسے دیکھنے آتے ہیں؟" — ڈاکٹر انچارج نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کوئی نہیں آتا" — ڈاکٹر ولیئم نے جواب دیا — "گیٹ کے ر
میں دیکھ لیتے ہیں.... اسے دیکھنے میرا خیال ہے' کوئی نہیں آتا۔ شاید اس کے گھر وا
کو معلوم ہی نہ ہو کہ وہ یہاں ہے۔ یہ انٹیلی جنس کا ملزم تھا"۔

"میرا بھی یہی خیال ہے" — ڈاکٹر انچارج نے کہا — "انٹیلی جنس نے اسے ا
لئے بے کار سمجھ کر یہاں ڈھپ کر دیا تھا۔ ویسے بھی بدبخت مسلمان ہے۔ ہمیں ذاتی ط
پر اس کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں رکھنی چاہئے۔ اگر کہیں بھاگ گیا ہے تو جانے د
سڑکوں پر گھومتا پھرتا کسی گاڑی کی ٹکر سے اگلے جہان پہنچ جائے گا لیکن ڈاکٹر ولیئم ہم
اپنے ریکارڈ کا پیٹ بھرنا ہے۔ آپ اپنی رپورٹ میں لکھ دیں کہ یہ لاعلاج تھا اور اب ا
کی ذہنی حالت یہ ہو گئی تھی کہ وہ بارک سے دور نکل جاتا اور اسے واپس لانا پڑتا تھا۔
یہ آپ جانتے ہیں کہ کیا لکھنا ہے۔ اِدھر اُدھر کی رپورٹیں لکھوا کر اسے اپنے ریکارڈ

رہے ہیں"۔

"آپ جیسے کہیں گے ویسے ہی ہو جائے گا" — ڈاکٹر ولیم نے کہا — "اسے ہم
میں دفن کر دیں گے"۔

ڈاکٹر انچارج ہندو تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ ڈاکٹر رشید تقریباً نارمل ہو گیا تھا اور
ڈاکٹر ولیئم کی کوششوں اور ہمدردی کا نتیجہ تھا۔ ڈاکٹر ولیئم کو یہ بھی معلوم تھا کہ عبدالستار
ڈاکٹر رشید کو فرار کروائے گا۔ یہ کام ہو گیا۔ ڈاکٹر ولیئم خوش تھا۔ وہ بھی یہی چاہتا تھا کہ
رشید یہاں سے نکل جائے۔ وہ خود ہندوؤں کا ستایا ہُوا آدمی تھا۔ ڈاکٹر انچارج نے تو
اس کو عیسائی سمجھ کر بڑی بے تکلفی سے کہہ دیا تھا کہ گم شدہ پاگل بدبخت مسلمان تھا
ڈاکٹر انچارج کو معلوم نہ تھا کہ ڈاکٹر ولیئم صبح عبدالستار کے گھر ڈاکٹر رشید یعنی گم شدہ
سے مل آیا اور اسے مبارک باد بھی کہہ آیا تھا۔

ڈاکٹر ولیئم نے وہ تمام کاغذات خود تیار کئے جو ڈاکٹر انچارج نے اسے تیار کرنے کو
تھا اور پھر یہ کاغذات ریکارڈ میں رکھ دیئے گئے.... اس طرح ڈاکٹر رشید آگرہ کے
خانے کے ریکارڈ سے غائب ہو گیا۔

میجر عثمان راولپنڈی میں آئی ایس آئی کے انٹیروگیشن کے ایک سیل میں پڑا ہُوا تھا۔ اسے اس سیل میں سات آٹھ دن گزر گئے تھے۔ وہ تو ایک شہزادہ تھا۔ وہ جن کا ایجنٹ بنا ہُوا تھا وہ اسے باہر کی شراب پلاتے اور ایک نہ ایک ایسی حسین لڑکی اسے دیئے رکھتے تھے جو ناز و انداز میں اور سحر طاری کرنے میں مہارت رکھتی تھی۔ میجر عثمان کو اپنی اس کامیابی پر بھی بہت خوشی حاصل تھی کہ اس نے اپنی بیوی کو دھوکے میں رکھا ہُوا تھا' اور دنیا اسے شریف آدمی سمجھنے لگی تھی۔

وہ شہزادہ ایک چھوٹے سے سیل میں بند تھا جس کا فرش بھی ناہموار تھا۔ وہ فرش پر سوتا اور انتہائی غلیظ اور بدبو دار غسل خانہ استعمال کرتا تھا۔ اس کے لئے یہی ٹارچر کافی تھا لیکن آدمی پتھر جیسا ڈھیٹ تھا۔ اقبالِ جرم سے مسلسل انکار کرتا چلا آرہا تھا۔ فائیو سٹار ہوٹلوں میں کھانا کھانے والے کو اس سیل میں سلور کی ٹیڑھی میڑھی پلیٹ میں پتلی دال اور دو روٹیاں دی جاتی تھیں اور ایسے ہی ایک مگ میں اسے پانی ملتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ پلیٹ اور مگ کسی کوڑے کرکٹ کے ڈھیر سے اٹھا کر لائے ہوں۔ دو تین دن تو اس نے کچھ کھایا ہی نہیں لیکن بھوک نے پریشان کیا تو اس نے دل پر پتھر رکھ کر چند نوالے منہ میں ڈالنے شروع کر دیئے تھے۔

رات کو اسے سونے نہیں دیا جاتا تھا۔ وہ فرش پر لیٹ جاتا اور جونہی اس کی آنکھ لگتی اسے جگا کر ایک کمرے میں لے جاتے اور سٹول پر بٹھا دیتے تھے۔ اس سے پہلی بات یہ پوچھی جاتی تھی کہ وہ اقبالی بیان دے گا یا نہیں۔ اس نے پہلے ہی اعلان کر دیا تھا کہ وہ اقبالی بیان نہیں دے گا نہ اس نے کوئی جرم کیا ہے۔ دوسری بات یہ کہتا تھا کہ اس کے خلاف ان کے پاس جو شہادت اور ثبوت ہے' وہ لے آئیں اور اس

کا کورٹ مارشل کریں۔

تفتیش کرنے والوں کو صرف اقبالی بیان کے ساتھ دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تو انہوں نے کرا ہی لینا تھا' وہ دراصل یہ چاہتے تھے کہ میجر عثمان اپنے رنگ کے تمام افراد کی نشاندہی کر کے انہیں گرفتار کروا دے۔ میجر عثمان تو اس مشینری کا چھوٹا سا کل پرزہ تھا۔ ایک پُرزہ خراب یا ضائع ہو گیا تو دوسرا ڈال کر مشینری چلا لی۔ یہاں ضرورت پوری مشینری کی تھی جسے توڑ پھوڑ کر پھینک دینا تھا۔

میجر عثمان اقبالِ جرم بھی نہیں کر رہا تھا اور اپنے رنگ کے لیڈر اور کسی ایک بھی فرد کی نشاندہی نہیں کرتا تھا۔ کہتا تھا کہ اسے کچھ معلوم نہیں نہ وہ کسی انڈین ایجنٹ کو جانتا ہے۔ اسے یہ لالچ بھی دیا گیا کہ وہ چند ایک آدمیوں کو پکڑوا دے تو اسے وعدہ معاف گواہ بنا لیا جائے گا۔ اسے یہ بھی بتایا گیا کہ اس طرح وہ سزا سے بھی بچ جائے گا اور فوج سے نکالا بھی نہیں جائے گا۔ وہ اس لالچ میں بھی نہیں آرہا تھا۔ آئی ایس آئی کے افسروں نے اسے بار بار کہا کہ وہ اپنے رینک اور اپنی عزت کو بچا لے اور اس کا ایک ہی طریقہ ہے کہ جو انفارمیشن اس کے سینے میں بند ہے وہ اگل دے۔

میجر عثمان کو غالباً یہ امید تھی کہ انڈین انٹیلی جنس کے ہاتھ اتنے لمبے ہیں کہ حکومتِ پاکستان اور ڈیفنس فورسز کی ہائی کمانڈ کو بھی انہوں نے اپنی زد میں لے رکھا ہے اور اس کا رِنگ لیڈر اسے بچا لے گا۔ ان سات آٹھ دنوں میں اسے ہلکے پھلکے ٹارچر کے عمل میں ڈالا گیا تھا۔ اسے رات رات بھر جگائے رکھتے تھے۔ تفتیش کم ہی ہوتی تھی' اسے صرف ایک کرسی پر بٹھا دیا جاتا اور اسے کہا جاتا کہ ابھی تفتیش شروع کرتے ہیں۔ اس طرح اسے رات بھر بٹھا کر انتظار کی اذیّت میں رکھا جاتا تھا۔ دوسرا ٹارچر الگ تھا۔

ان آٹھ دنوں میں میجر عثمان کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ اسے اس کے اپنے بچے دیکھتے تو وہ بھی نہ پہچان سکتے۔ اسے ایک اذیّت اور دی جا رہی تھی۔ وہ سگریٹ اور شراب نوشی کا عادی تھا۔ ان آٹھ دنوں میں اسے سگریٹ کا ایک کش اور شراب کا ایک گھونٹ بھی نہ ملا۔ وہ نشے سے ٹوٹا ہُوا تھا جس کا اثر اس کی مزاجی کیفیت پر بہت برا پڑ رہا تھا۔ اس کا مزاج چڑچڑا اور غصیلا ہو گیا تھا۔ دو تین مرتبہ تفتیش کے دوران اس نے تفتیش کرنے والے افسر کے ساتھ بڑے تلخ لہجے میں بات کی اور طنزیہ بھی کچھ

کہا۔ اس کی کرسی کے پیچھے ایک صوبیدار کھڑا رہتا تھا۔ جونہی میجر عثمان نے کوئی بدتمیز
کی تو صوبیدار نے پیچھے سے پوری طاقت سے اس کے منہ پر تھپڑ مارا۔ ایک بار تھپڑ کھا کر
وہ اٹھا اور صوبیدار کو کوئی بے ہودہ لفظ کہہ دیا۔ صوبیدار تنومند آدمی تھا۔ اُس نے میجر
عثمان کی گردن سامنے سے اپنے دائیں ہاتھ میں جکڑی اور اسے اوپر اٹھا کر پیٹھ کے بل
فرش پر پٹخ دیا۔ تین چار منٹ تک تو عثمان اٹھ کر بیٹھ بھی نہ سکا۔ صوبیدار نے اس کے
سر کے بال مٹھی میں جکڑ کر اوپر کو جھٹکا دیا۔ میجر عثمان اٹھ کر اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔
"یہاں بیٹھ اور سامنے دیکھ" — صوبیدار نے کہا — "یہاں تو میجر نہیں،
اپنے ملک کا غدار ہے"۔



میجر امتیاز جو آئی ایس آئی کی لاہور برانچ کا انچارج تھا واپس لاہور چلا گیا۔ لو
کے متعلق انکوائری میں اس نے بہت کام کیا تھا۔ لاہور جاتے ہی اس نے میجر عثمان کے
دوستوں .... میجر سمیع اور کیپٹن آصف .... کو فون کیا اور انہیں کہا کہ آج شام اسے
ملیں۔ وقت طے کر لیا گیا اور ملاقات کی جگہ میجر امتیاز نے اپنے گھر ہی بتائی۔ دونوں شام
کو اس کے گھر پہنچ گئے۔
"میجر عثمان کہاں غائب ہو گیا ہے؟" — میجر سمیع نے میجر امتیاز کے گھر بیٹھتے ہی
پوچھا — "اس کی بیوی تین مرتبہ مجھ سے فون پر پوچھ چکی ہے لیکن وہ بغیر بتائے چلا گیا
ہے۔ مجھے اتنا ہی پتہ چلا کہ وہ راولپنڈی گیا ہے لیکن یہ پتہ ...."۔
"میں نے تمہیں یہی بتانے کے لئے یہاں بلایا ہے" — میجر امتیاز نے میجر سمیع کی
بات کاٹ کر کہا — "ابھی مجھے بتانا تو نہیں چاہئے لیکن تم اس کے دوست ہو اس لئے بتا
رہا ہوں اور تم سے توقع یہ رکھوں گا کہ اسے ابھی راز ہی سمجھو گے .... عثمان کو راولپنڈی
آئی ایس آئی کے ہیڈ کوارٹر میں بلایا گیا تھا۔ مجھے بھی بلایا گیا۔ میں ایک روز پہلے وہاں
پہنچا تھا۔ عثمان اس توقع پر وہاں گیا کہ اسے خراج تحسین پیش کیا جائے گا کہ اس نے
ایک دو انڈین ایجنٹوں کی نشاندہی کی تھی لیکن اسے بلانے کا مقصد کچھ اور ہی تھا۔ وہ اب
آئی ایس آئی کے انٹیروگیشن سنٹر کے ایک سیل میں پڑا ہے۔ اس کے خلاف اتنی
شہادت اکٹھی ہو گئی ہے جو اسے سزا دلانے کے لئے کافی ہے۔ ڈائریکٹر جنرل نے اسے
ذاتی طور پر موقع دیا اور کہا کہ وہ اقبال جرم کر لے تاکہ اسے کچھ سہولت دی جا سکے لیکن

صاف انکار کر رہا ہے اور یہ جانتے ہوئے کہ اسے چھوڑا نہیں جائے گا' وہ اپنے انکار
ہوا ہے۔
میجر سمیع اور کیپٹن آصف پر تو جیسے سکتہ طاری ہو گیا ہو۔ انہوں نے سر آہستہ
گھما کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر میجر امتیاز کو دیکھنے لگے۔
"یہ سب کیسے ہو گیا؟" — میجر سمیع نے پوچھا اور جواب کا انتظار کئے بغیر کہا —
تو ہمیں بھی تھا۔ اس کی بیوی اور بچوں کے ساتھ اس کا سندھ ایریا میں اغوا! اور پھر
اچھا خاصا شک پیدا کرتی تھی لیکن ہمیں یہ خیال بھی آ جاتا تھا کہ میجر عثمان اور سب
ہو سکتا ہے دشمن کا ایجنٹ نہیں ہو سکتا۔ ہم یہ بھی جانتے تھے کہ لوسی نام کی لڑکی
مشکوک ہی نہیں بلکہ ہے ہی ہندو"۔
"میں تمہیں ابھی یہ نہیں بتا سکتا کہ وہ کون سی ٹھوس شہادت ہے جس نے عثمان
رفتار کروایا ہے" — میجر امتیاز نے کہا — "صرف یہ بتا دیتا ہوں کہ اسے ٹیلی فون کی
ونے پھنسایا ہے۔ میں تم دونوں کے ساتھ اپنے طور پر بات کرنا چاہتا ہوں کہ تم
میرے ساتھ راولپنڈی چلو اور عثمان کو راضی کرو کہ وہ اپنے رِنگ کے تمام ممبروں
ناندہی کر دے جن کے ایڈریس اور فون نمبر اسے معلوم ہیں۔ تم اس میں شاید قومی
بیدار کر سکو .... تم جانتے ہو کہ ہمارے پاس یہی ایک طریقہ نہیں کہ ملزم کو اس
دستوں کے ذریعے اقبالی کرائیں۔ آئی ایس آئی کے پاس ایسے ایسے طریقے موجود
لہ چٹانوں کے دل بھی کٹ جاتے ہیں اور چٹانوں سے دودھ کی نہریں نکل آتی
مجھے دوستی کا خیال آ رہا ہے"۔
"ایک بات بتائیں سر!" — کیپٹن آصف نے پوچھا — "کیا ہم میجر عثمان کی مسز کو
یا کہ عثمان گرفتار ہو چکا ہے؟ .... وہ ہم سے کئی بار پوچھ چکی ہے اور کہتی ہے کہ وہ
سے گیا ہے اس نے فون پر بھی بات نہیں کی"۔
میجر امتیاز سوچ میں پڑ گیا۔ دو چار سیکنڈ بعد اس نے کہا کہ وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ
باہر کسی کو معلوم نہ ہو۔
"یہ احتیاط بہت ضروری ہے" — میجر امتیاز نے کہا — "مجھے یقین ہے کہ عثمان
رِنگ کو ابھی پتہ نہیں چلا کہ وہ گرفتار ہو گیا ہے اور راولپنڈی میں اس سے
گیشن ہو رہی ہے۔ اگر یہ خبر باہر نکل گئی تو دشمن کے ایجنٹوں تک پہنچ جائے گی"۔

"پھر وہ کیا کرلیں گے؟" — میجر سمیع نے پوچھا۔

"میجر سمیع!" — میجر امتیاز نے جواب دیا — "میں بتاؤں گا تو تم یقین نہیں کرو گے۔ ہماری حکومت میں اور فورسز میں ایسی شخصیتیں موجود ہیں جو پاکستان کے دشمن کی ایجنٹ ہیں۔ میں زیادہ بات نہیں کھولوں گا' یہی کہہ دینا کافی سمجھوں گا کہ پاکستانی غدار ناممکن کو ممکن کر دکھایا کرتے ہیں۔ اگر تم عثمان کی مسز پر اعتماد رکھتے ہو کہ وہ یہ بات باہر نہیں نکالے گی تو اسے بتا دو۔ ساتھ یہ بھی بتا دینا کہ وہ عثمان کو چھڑانے کے لئے بھاگ دوڑ شروع نہ کردے۔ اگر اس نے ایسا کیا تو عثمان کو اس سے ذرا سا بھی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ وہ ایسے شکنجے میں آگیا ہے جہاں سے نکل نہیں سکے گا.... بہرحال میرا اصل مقصد یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کسی وقت میں تم دونوں کو راولپنڈی لے جاکر عثمان سے ملوا دوں۔ تم اسے قائل کرنے کی کوشش کرنا کہ وہ اقبالی بیان دے دے اور رِنگ کی نشاندہی کردے اور اسے وعدہ معاف گواہ بنالیا جائے گا"۔



مجیر سمیع اور کیپٹن آصف وہاں سے اٹھے اور میجر عثمان کے گھر چلے گئے۔ میجر عثمان کی بیوی تو انہیں دیکھ کر بہت ہی خوش ہوئی۔ اس نے پہلی بات یہ پوچھی کہ عثمان کا کچھ پتہ نہیں کہ وہ کہاں ہے کیسی ڈیوٹی پر گیا ہے۔ اس نے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر سے بھی فون پر معلوم کروایا تھا۔ وہاں سے اسے یہ جواب ملا تھا کہ عثمان جس ڈیوٹی پر گیا ہے وہ فون پر کسی کو بتائی نہیں جاسکتی۔

دراصل بریگیڈ کمانڈر کو آئی ایس آئی سے فون پر یہ اطلاع دے دی گئی تھی کہ میجر عثمان آئی ایس آئی کے زیرِ حراست ہے۔ بریگیڈ کمانڈر کو یہ بھی کہہ دیا گیا تھا کہ اسے راز میں رکھے۔

"بھابی جان!" — میجر سمیع نے کہا — "ہم آپ کو یہی بتانے آئے ہیں.... خبر اچھی نہیں لیکن آپ کو بتانا ضروری ہے...."۔

"کیا خبر ہے؟" — میجر عثمان کی بیوی نے سخت گھبراہٹ کے عالم میں پوچھا — "فوراً بتائیں بھائی جان!"

"میجر عثمان کو آئی ایس آئی نے باقاعدہ گرفتار کرلیا ہے" — میجر سمیع نے کہا — "ابھی یہ خبر آپ اپنے بھائیوں کو بھی نہ بتائیں۔ یہ ایک فوجی راز ہے جو آپ کو ابھی

نہیں بتانا تھا لیکن ہم سے رہا نہ گیا"۔

"کیا آئی ایس آئی کے پاس کوئی پکّی شہادت اور ثبوت موجود ہیں؟" — میجر عثمان کی بیوی نے پوچھا۔

"شہادت اور ثبوت اکٹھے کر کے اسے گرفتار کیا گیا ہے" — میجر سمیع نے جواب دیا — "ابھی ہمیں یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ شہادت کیا ہے لیکن بھابی جان ہم پہلے ہی جانتے تھے کہ یہ شخص اپنے ملک کے خلاف غداری کر رہا ہے"۔

"اور میں سمجھتی رہی کہ عثمان واپس اپنی دنیا میں آگیا ہے" — میجر عثمان کی بیوی نے کہا — "لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ مجھے دھوکہ دیتا رہا ہے"۔

"بہرحال بھابی جان!" — کیپٹن آصف نے کہا — "ہمیں بہت ہی افسوس ہے کہ یہ بُری خبر ہم آپ کو سنا رہے ہیں"۔

"خبر بُری ہی سہی" — میجر عثمان کی بیوی نے کہا — "اگر عثمان قوم اور ملک کا غدار ہے تو میں اس خبر کو بُرا نہیں سمجھتی۔ وہ پاکستان کا دشمن ہے تو میرا بھی دشمن ہے.... میرا خیال ہے کہ میں آئی ایس آئی کو عثمان کے خلاف کچھ اور شہادت دے سکتی ہوں۔ جس لڑکی نے ہمیں سندھ کے ڈاکوؤں کی قید سے رہائی دلوائی تھی' اس کے دو فون آچکے ہیں۔ وہ یوں بات کرتی تھی جیسے اسے مجھ سے بہت پیار ہے اور میری خیریت ہی معلوم کرنے کو فون کیا ہو۔ عثمان کے متعلق وہ رسمی طور پر پوچھتی ہے....

"لیکن میں آپ کو یہ بتا دیتی ہوں کہ مجھے اس لڑکی پر کوئی شک نہیں تھا۔ کراچی میں عثمان نے اسے میری پکّی دوست بلکہ مخلص دوست بنا دیا تھا۔ ہم یہاں آگئے تو اس کے فون صرف میرے لئے آتے رہتے تھے۔ اب پتہ چلا ہے کہ عثمان اور یہ لڑکی مجھے دھوکے میں رکھے ہوئے تھے۔ میرے ساتھ عثمان کا رویّہ بالکل ہی بدل گیا تھا۔ اس سے مجھے وہی خلوص اور پیار ملنے لگا تھا جس سے اس نے مجھے محروم کردیا تھا۔ اب خیال آتا ہے کہ عثمان بہت ہی خوش رہنے لگا تھا....

"اب ایک مزے کی بات سنیں۔ پرسوں اس لڑکی لوسی کا فون آیا۔ میرے ساتھ اسی دوستانہ بے تکلفی کی باتیں اور ایک دو اپنے رونے اور پھر یہ کہ تمہیں ملنے کو بہت ہی جی چاہتا ہے۔ میں نے اسے کہا کہ آج تک میں نے تم سے تمہارا فون نمبر نہیں پوچھا۔ اب بتا دو۔ عثمان واپس آئے گا تو تمہیں فون کروں گی اور عثمان سے بات کرا دوں گی۔

اس نے مجھے اپنا نمبر لکھوا دیا۔ یہ کراچی کا نمبر ہے"۔

"لائیں بھابی جان!" —— میجر سمیع نے کہا —— "وہ نمبر کہاں ہے؟"۔

عثمان کی بیوی ٹیلی فون والے کمرے میں گئی اور ایک چٹ لے آئی جس پر لوسی کا بتایا ہُوا نمبر لکھا تھا۔ میجر سمیع نے اس سے کہا کہ وہ ابھی اس نمبر پر کراچی فون کرے۔
عثمان کی بیوی نے کراچی کا کوڈ ڈائل کر کے نمبر ملایا اور کسی نے ریسیور اٹھایا۔

"ہیلو!" —— عثمان کی بیوی نے پوچھا —— "کون بول رہا ہے؟.... میں لاہور سے مسز میجر عثمان بول رہی ہوں.... مس لوسی سے بات کرنی ہے.... ہیلو لوسی میری خوش قسمتی کہ تم مل گئی ہو۔ عثمان کے بغیر دل کچھ زیادہ ہی اداس ہو گیا تھا۔ سوچا تمہارے ساتھ ہی بات کر لوں.... کل عثمان کا فون آیا تھا لیکن اس نے اپنا کوئی نمبر نہیں دیا کیونکہ فیلڈ سے بول رہا تھا۔ وہ کوئی ایکسرسائز ہے جس میں عثمان کو خاص طور پر بلایا گیا تھا.... ہاں کہتا تھا کہ تین چار دن اور رہنا پڑے گا...."۔

میجر عثمان کی بیوی لوسی کے ساتھ پانچ سات منٹ باتیں کرتی رہی۔ یہ پیار کی اور بے تکلفی کی باتیں تھیں اور کچھ ہنسی مذاق تھا۔ آخر فون ختم ہُوا تو میجر عثمان کی بیوی نے میجر سمیع اور کیپٹن آصف کی طرف دیکھا۔

"اب بتائیں" —— میجر عثمان کی بیوی نے کہا —— "کیا یہ فون نمبر آئی ایس آئی کے کام نہیں آئے گا؟"

"کیوں نہیں آئے گا!" —— میجر سمیع نے کہا —— "کراچی ٹیلی فون ایکسچینج سے اس نمبر کا ایڈریس مل جائے گا اور اسی کو نشاندہی کرنا کہتے ہیں۔ چھاپہ پڑے گا اور شکار جال میں آ جائے گا.... یہ نمبر مجھے لکھوا دیں' یہ میں میجر امتیاز کو دے دوں گا۔ یہ لوسی تو اس رِنگ کی خاص لڑکی ہے۔ یہ جہاں رہتی ہے وہاں سے اس رِنگ کے اور بھی آدمی پکڑے جا سکتے ہیں"۔

"بھائی جان" —— میجر عثمان کی بیوی نے کہا —— "اب یہ ذہن سے اتار دیں کہ عثمان میرا خاوند ہے۔ یہ شخص اب میرا دشمن ہے کیونکہ یہ میری قوم اور ملک کا دشمن ہے.... مجھے پاکستان عزیز ہے"۔

"لیکن بھابی" —— میجر سمیع نے کہا —— "ہم عثمان کو بچانے کی صورت پیدا کر رہے ہیں۔ میں اور آصف آپ کے جذبات کی اور قومی جذبے کی قدر کرتے ہیں اور اسے اچھی

طرح سمجھتے ہیں لیکن بھابی!...."

"بھائی جان! قطع کلامی معاف!" —— عثمان کی بیوی واجدہ نے میجر سمیع کی بات کاٹتے ہوئے کہا —— "بے شک میرے جذبات اُمڈ آئے ہیں لیکن میرے سامنے ایک بہت بڑی حقیقت ہے۔ میں صرف جذباتی نہیں ہو رہی۔ آپ یہ بتائیں کہ اسے آپ کس طرح بچا لیں گے؟"

"ایک ہی طریقہ ہے بھابی!" —— میجر سمیع نے جواب دیا —— "اگر عثمان اقبالی بیان دے دیتا ہے اور پھر اپنے رِنگ اور دوسرے ممبروں کی نشاندہی کر دیتا ہے تو اسے وعدہ معاف گواہ بنا لیا جائے گا اور اُسے معافی مل جائے گی"۔

"نشاندہی تو میں نے کر دی ہے" —— واجدہ نے کہا —— "اس لڑکی لوسی کے فون نمبر کے ایڈریس پر چھاپہ پڑے گا تو یہ پکڑی جائے گی اور دو چار آدمی بھی پکڑے جائیں گے۔ ان کے ذریعے رِنگ کے دوسرے اور آدمی بھی گرفتار کیے جا سکیں گے"۔

"لیکن بھابی!" —— کیپٹن آصف نے کہا —— "اس طرح میجر عثمان کو پوری سزا ملے گی"۔

"جو اسے ملنی چاہئے" —— واجدہ نے کہا —— "آپ دونوں آرمی آفیسر ہیں۔ اپنے مورال اور اپنے جذبے کو سامنے رکھ کر اس مسئلے پر بات کریں۔ کیا آپ پسند کریں گے کہ ایسے آرمی آفیسر کو سزا سے معافی مل جائے جو اپنے وطن اور اللہ کے عظیم مذہب کے خلاف جاسوسی کرتا رہا ہے؟ عثمان بریگیڈ ہیڈ کوارٹر میں تھا۔ نہ جانے کیسی قیمتی انفارمیشن دشمن کو دیتا رہا ہے۔ وطنِ عزیز تو آرمی کے پاس ایک مقدس امانت ہے۔ اس کے دفاع اور تحفظ کی ذمہ داری صرف فوج کی ہوتی ہے۔ اگر ایک فوجی اور وہ بھی میجر رینک کا افسر اس امانت کو دشمن کی جھولی میں ڈالنے کی سازش میں لگا ہُوا ہو تو کیا آپ اسے گولی نہیں مار دیں گے؟"

"بھابی!" —— کیپٹن آصف نے کہا —— "ہمیں آپ کے بچوں کا خیال آ رہا ہے۔ یہ سوچ کر کوئی فیصلہ کریں کہ آپ کے بچوں کے باپ کو کم از کم چودہ سال سزائے قید ہو گی اور سزائے موت بھی ہو سکتی ہے"۔

"میں نے سب کچھ سوچ لیا ہے" —— واجدہ نے پُراعتماد لہجے میں جواب دیا۔

"یہ بچے باپ کے جیتے جی یتیم ہو جائیں گے" —— میجر سمیع نے کہا —— "یہ پہلو

بھی سامنے رکھیں کہ ان بچوں کے لئے یہ طعنہ بن جائے گا کہ ان کا باپ انڈیا کا جاسوس تھا۔ یہ بچے جوں جوں بڑے ہوتے جائیں گے نفسیاتی مریض بنتے چلے جائیں گے"۔

"میرے پاس ان طعنوں کا جواب موجود ہے"۔۔۔۔ واجدہ نے کہا۔۔۔۔ "میں انہیں بتاؤں گی کہ میں نے ان کے جاسوس اور غدار باپ کو خود سزا دلوائی تھی اور اپنا سہاگ قربان کردیا تھا۔ میں ان میں ایک فخر پیدا کردوں گی"۔



بولتے بولتے واجدہ کو ہلکی سی ہچکی آئی اور وہ چپ ہوگئی۔ اس کا سر جھک گیا اور جب دو چار سیکنڈ بعد اس نے سر اٹھایا تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ اس نے دوپٹے کے پلّو سے آنکھیں پونچھ ڈالیں اور اس طرح میجر سمیع اور پھر کیپٹن آصف کی طرف دیکھا جیسے انہیں پہلی بار دیکھ رہی ہو اور کچھ حیران بھی ہو رہی ہو۔ اسے غالباً توقع نہیں تھی کہ وہ اچانک اتنی جذباتی ہو جائے گی۔

"عثمان مجھے پیار سے وینا کہا کرتا تھا"۔۔۔۔ واجدہ نے جذباتی سے لہجے میں کہا۔۔۔۔ "مجھے یہ اچھا لگتا تھا۔ اتنا اچھا کہ میں اپنا نام واجدہ بھول ہی چلی تھی لیکن آج میں نے وینا کا گلا گھونٹ کر اسے مار ڈالا ہے۔ میں اب واجدہ ہوں۔ وہ وینا تھی جو ایک غدار اور جاسوس کی بیوی تھی۔ یہ واجدہ ہے جو آپ کے سامنے بیٹھی ہے' یہ اپنے وطن کی دلہن ہے۔ سبز پرچم میرے عروسی جوڑے کا دوپٹہ ہے۔ وینا ایک جاسوس کی داشتہ تھی"۔۔۔۔ واجدہ نے لمبی آہ لی اور اس کے ہونٹوں سے سرگوشی پھسلی۔۔۔۔ "واجدہ.... وینا.... وطن"۔

"رہ رہ کر آپ کے بچوں کا ہی خیال آتا ہے"۔۔۔۔ کیپٹن آصف نے کہا۔

"آپ کو میرے بچوں کا خیال آرہا ہے"۔۔۔۔ واجدہ نے کہا۔۔۔۔ "اور مجھے وہ بچے یاد آرہے ہیں جنہیں 1947ء میں ہندوؤں اور سکھوں نے سرحد پار برچھیوں اور کرپانوں سے کاٹ کر پھینک دیا تھا' اور پھر وہ بچے یاد آرہے ہیں جو پاپیادہ اپنے گھروں سے پاکستان کو چلے تھے۔ نہ جانے کتنے ہزار بچے بھوکے پیاسے راستے میں گرتے اور مرتے رہے تھے۔ میں اس وقت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ ابّو اور امّی بتایا کرتے ہیں کہ دودھ پیتے ننھے منے بچوں کو ان کفار نے برچھیوں کی انیوں میں اُڑس کر جلوس نکالے اور پاگلوں جیسے قہقہے لگائے تھے....

"وہ سناتے ہیں کہ گڑھ مکتیشر میں ہندوؤں نے حاملہ مسلمان عورتوں کے پیٹ چاک کرکے بچے نکالے اور انہیں برچھیوں کی انیوں پر اٹھا کر یہی وحشیانہ کھیل کھیلا تھا.... میں ان ایک لاکھ سے زیادہ قوم کی بیٹیوں کو کیسے بھول سکتی ہوں جو 1947ء میں اغوا ہو گئی تھیں اور وہ جن کی برہنہ لاشیں کھیتوں میں گل سڑ کر ہڈیاں بن گئی تھیں.... یہ دشمنی انتہا سے بھی آگے نکل گئی ہے۔ ان ہندوؤں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف نفرت کچھ ایسی بھری ہوئی ہے کہ جب کبھی انہیں موقع ملتا ہے جو وہ پیدا کرلیتے ہیں سب سے پہلے مسلمانوں کے بچوں اور عورتوں پر حملہ آور ہوتے ہیں"۔

"یہ بہیمانہ سلسلہ انڈیا میں ابھی تک چل رہا ہے"۔۔۔۔ میجر سمیع نے کہا۔۔۔۔ "وہاں کسی مسلمان کی عزت اور آبرو محفوظ نہیں"۔

"عثمان کو اس پس منظر میں دیکھیں"۔۔۔۔ واجدہ نے کہا۔۔۔۔ "عثمان اس دشمن کا ایجنٹ بنا ہوا تھا۔ میں تو اسے اسلام سے ہی خارج سمجھتی ہوں پھر اسے اپنا خاوند کس طرح تسلیم کرسکتی ہوں!.... ستمبر 1965ء کی جنگ مجھے یاد ہے پھر پاکستان کو آدھا ہوتے دیکھا.. ہمارا ملک آدھا کس نے کیا ہے؟ ہندوؤں نے!.... غیر بنگالی لڑکیاں کلکتہ کے بازاروں میں نیلام ہوئیں۔ کیا آپ عثمان کو اپنی قوم کی آستین میں پلتا ہوا سانپ نہیں سمجھیں گے؟ یہ تو بچھو ہے جو سامنے آنے والی ہر چیز کو ڈنک مارتا ہے"۔

واجدہ بولتی چلی گئی اور اس کے بولنے کا انداز جذباتی ہی ہوتا چلا گیا اور یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس خاتون کا ذہن ابنارمل کیفیت میں داخل ہوچکا ہے۔ میجر سمیع اور کیپٹن آصف نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں جیسے ایک دوسرے سے کہا ہو کہ واجدہ کو اصل بات پر لانا کسی پہلو ممکن نہیں رہا۔

"بھابی!"۔۔۔۔ میجر سمیع نے ذرا ہمت کرکے کہا۔۔۔۔ "ہم تو یہ امید لے کر آئے تھے کہ آپ عثمان سے ملیں اور اسے کہیں کہ وہ اقبال جرم کرلے اور وعدہ معاف گواہ بن کر سزا سے بچ جائے"۔

"ایک اور بات بھی ذہن میں رکھ لیں بھابی!"۔۔۔۔ کیپٹن آصف نے کہا۔۔۔۔ "جب لڑکی کا فون نمبر آئی ایس آئی کو دیا جائے گا تو لازماً آپ سے اس کی تصدیق کروائی جائے گی اور آپ سے پوچھا جائے گا کہ آپ کی اس لڑکی کے ساتھ کیا باتیں ہوئی تھیں۔ اس طرح آپ اس کیس میں اہم گواہ بن جائیں گی پھر آپ کو کورٹ مارشل میں یا جس

کورٹ میں یہ کیس چلے گا، عثمان کے خلاف گواہی دینی پڑے گی"۔

"میں گواہی دوں گی" ـــــ واجدہ نے کہا ـــــ "میں عثمان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر حقیقت بیان کروں گی.... آپ ابھی تک اپنے دوست کو سزا سے بچانے کی سوچ رہے ہیں"۔

"ہاں بھابی!" ـــــ میجر سمیع نے کہا ـــــ "ہم اپنے دوست کو بھی اور آپ کے سہاگ کو بھی بچانے کی کوشش میں ہیں"۔

"پھر میں ایسی بات کہوں گی جو شاید آپ کو اچھی نہ لگے" ـــــ واجدہ نے کہا ـــــ "آپ کی وفاداری اپنے مقدس وطن کے ساتھ نہیں بلکہ اپنے اس دوست کے ساتھ ہے جو آپ کے وطن کے دشمن کا بڑا ہی سرگرم ایجنٹ ہے"۔

"بھابی!" ـــــ کیپٹن آصف نے کہا ـــــ "آپ نے ابھی ایک اور پہلو پر غور نہیں کیا۔ آپ عثمان کے خلاف گواہی دیں گی تو آپ کا سسر اور اس کے بیٹے آپ کے جان کے دشمن بن جائیں گے۔ سنا ہے وہ کچھ اور ہی ذہنیت کے لوگ ہیں اور انتقامی کارروائی میں خطرناک حد تک پہنچ سکتے ہیں"۔

"میں نے یہ پہلو بھی سوچ لیا ہے" ـــــ واجدہ نے کہا ـــــ "وطن کے دفاع کی خاطر خطرات تو مول لینے ہی پڑتے ہیں۔ میں اب ہر صورتِ حال اور بڑے سے بڑے خطرے کا سامنا کرنے کے لئے تیار ہوں.... ایک حدیث ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ میری بیٹی فاطمہؓ اگر چوری کی مرتکب ہوتی تو میں اسے بھی شرعی قانون کے مطابق سزا دلواتا.... اب سوچیں کہ عثمان کون ہے؟ کیا ہے؟ اس نے چھوٹی موٹی چوری نہیں کی بلکہ اپنے اسلامی وطن کی جڑیں کاٹتے پکڑا گیا ہے اور دین کے دشمن کا آلۂ کار بنا رہا ہے۔ پھر اسے سزا سے کیوں بچایا جائے؟.... آپ لوسی کا فون نمبر آئی ایس آئی تک پہنچا دیں"۔

میجر سمیع اور کیپٹن آصف کے پاس الفاظ کا ذخیرہ ختم ہو چکا تھا اور استدلال کی ترکش میں ایک بھی تیر نہیں رہا تھا۔ کیپٹن آصف نے آہستگی سے میجر سمیع سے کہا کہ وہ میجر امتیاز کو ابھی فون کر دے۔ میجر سمیع اٹھا اور فون پر میجر امتیاز کے گھر کا نمبر ڈائل کیا۔

اُدھر سے فون میجر امتیاز نے ہی اٹھایا اور جب میجر سمیع نے بات کی تو میجر امتیاز نے پوچھا کہ کوئی خاص بات ہے؟

"ہاں!" ـــــ میجر سمیع نے کہا ـــــ "بہت ہی خاص بات، ہم ابھی آ رہے ہیں"۔

"فوراً آؤ" ـــــ میجر امتیاز نے کہا

○

میجر امتیاز ان دونوں کا بے تابی سے منتظر تھا۔ یہ دونوں پہنچے تو انہیں اندر لے گیا اور پوچھا کہ یہ دونوں کیا نئی خبر لائے ہیں۔

"یقین نہیں آتا کہ دشمن کا کوئی ایجنٹ اتنا غیر محتاط ہو سکتا ہے" ـــــ میجر سمیع نے کہا ـــــ "اس لڑکی لوسی سے تو تم ناواقف نہیں ہو، اس کا کراچی کا فون نمبر مل گیا ہے"۔

"یہ نمبر غلط ہوگا" ـــــ میجر امتیاز نے کہا۔

"غلط لگتا نہیں" ـــــ میجر سمیع نے کہا ـــــ "مسز عثمان نے ہمارے سامنے اسی نمبر پر بات کی ہے"۔

میجر سمیع اور کیپٹن آصف نے میجر امتیاز کو وہ ساری گفتگو سنائی جو واجدہ نے لوسی کے ساتھ کی تھی پھر اسے وہ ساری باتیں سنائیں جو واجدہ نے عثمان کے متعلق ان دونوں کے ساتھ کی تھیں۔ یہ بھی بتایا کہ اس پر کیسی جذباتی کیفیت طاری ہو گئی تھی اور اس نے یہ تہیہ کر لیا ہے کہ وہ عثمان کو سزا سے بچنے نہیں دے گی، یہاں تک کہ وہ عثمان کے خلاف گواہی دینے اور شہادت پیش کرنے کے لئے کورٹ مارشل میں بھی جائے گی"۔

"میجر عثمان کی فریب کاری پر حیرت ہوتی ہے" ـــــ کیپٹن آصف نے کہا ـــــ "اس نے اس ہندو لڑکی کو ساتھ ملا کر اپنی بیوی کو کس طرح بے وقوف بنا رکھا ہے"۔

"کس دنیا میں بستے ہو آصف!" ـــــ میجر امتیاز نے کہا ـــــ "یہ تو ایک عام ذہن کا بے وفا خاوند بھی کیا کرتا ہے۔ عثمان بیوی کو یہ بتاتا رہا کہ لوسی کو گرفتار کروانا ہے اور لوسی کو بیوی کی دوست بنا دیا اور اسے کہا کہ بیوی میری کو اپنے جال میں رکھنا۔ اسے یہ بھی کہا ہوگا کہ اسے اس طرح اپنا گرویدہ بنا لو کہ ہمارے راستے کی رکاوٹ نہ بنے۔ جاسوسوں کی ترکیبیں اور فریب کاریاں ہم سے سنو۔ تم آرمی آفیسر بنے پھرتے ہو، ان کی بعض فریب کاریوں کو تم پُرخلوص باتیں یا حرکتیں کہو گے"۔

"اب بتاؤ تم کیا کرو گے!" ـــــ میجر سمیع نے میجر امتیاز سے پوچھا ـــــ "کیا فون کر کے راولپنڈی والوں کو یہ خبر بتاؤ گے؟"

"نہیں!" ـــــ میجر امتیاز نے جواب دیا ـــــ "ایسی باتیں فون پر نہیں کی جاتیں۔ کل

علیٰ الصبح نکل جاؤں گا اور راولپنڈی جاکر زبانی یہ نمبر دوں گا"۔

"عثمان کو وعدہ معاف گواہ بنانے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی"—— کیپٹن آصف نے کہا—— "ہم دوستی کا حق ادا کرنا چاہتے تھے۔ ہم نے تو یہ سوچا تھا کہ ہم دونوں مسز عثمان کو ساتھ لے کر راولپنڈی جائیں گے اور عثمان کو اقبالِ جرم اور نشاندہیوں کے لئے تیار کریں گے لیکن مسز عثمان کا رویّہ بالکل الٹ ہو گیا ہے"۔

"میں تمہیں یہ بھی بتا دیتا ہوں"—— میجر امتیاز نے کہا—— "لوسی کا فون نمبر مل جانے سے میجر عثمان کی بحث کا امکان ختم ہو جائے گا۔ کراچی جا کر اس فون نمبر کا ایڈریس معلوم کر لیا جائے گا اور وہاں چھاپہ مارا جائے گا۔ کوئی نہ کوئی تو گرفتار ہو گا ہی..... بہرحال یہ آئی ایس آئی کی زمین دوز کارروائیاں ہوں گی جن کا ذکر نہ کیا جائے تو بہتر ہے"۔

میجر امتیاز نے ان دونوں سے کہا کہ وہ واجدہ سے کہہ دیں کہ ایک دو دنوں کے وقفے سے لوسی کے ساتھ اس نمبر پر بات کرتی رہا کرے اور بات اس انداز سے کرے جیسے وہ عثمان اور اس کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی اور اُلو بنی ہوئی ہے اور کچھ بھی نہیں سمجھتی بلکہ بہت ہی خوش ہے کہ لوسی کے ساتھ عثمان کے ذریعے اس کی دوستی ہو گئی ہے"۔

میجر سمیع نے واجدہ کے جذبے اور اس جذباتی رویّے پر حیرت کا اظہار کیا۔ کیپٹن آصف نے کہا کہ اسے تو بالکل توقع ہی نہیں تھی کہ کسی پاکستانی میں اور خصوصاً اس کلاس میں جس کلاس کی مسز عثمان ہے' ایسا جذبہ زندہ رہ گیا ہے۔

"چلو مان لیتے ہیں کہ اس عورت میں اتنا شدید جذبہ موجود ہے"—— میجر سمیع نے کہا—— "میں دوسرا پہلو دیکھ رہا ہوں۔ مسز عثمان اپنے سسرال کو اپنا دشمن بنا رہی ہے۔ احوال اور قرائن بتا رہے ہیں کہ عثمان سزا سے بچ نہیں سکے گا۔ اس صورت میں مسز عثمان کو عثمان کے لواحقین کی دشمنی مول نہیں لینی چاہئے"۔

"یہ مجھ سے سنو"—— میجر امتیاز نے کہا—— "آئی ایس آئی اپنے طریقہ تفتیش کے مطابق عثمان اور مسز عثمان کے خاندانوں کے متعلق پوری تحقیقات کر چکی ہے۔ مسز عثمان کو اپنے سسرال کی دشمنی مہنگی پڑے گی۔ عثمان کا باپ اور بھائی اونچے درجے کے زمیندار ہیں جنہیں عام پاکستانی اصطلاح کے مطابق جاگیردار کہا جاتا ہے۔ ان کے پاس روپے پیسے کی فراوانی بھی ہے اور غنڈہ گردی کی اور حکومت میں اثر و رسوخ کی طاقت بھی۔ یہ لوگ اپنے آپ کو اللہ کے بندوں کا خدا اور پاکستان کو اپنے باپ کی جاگیر سمجھتے

ہیں۔ باپ دادا انگریزوں کے حاشیہ بردار تھے اور اب پاکستان میں کوئی بھی حکومت آتی ہے یہ اس کے قدموں میں بیٹھ جاتے اور اپنی طاقت میں اضافہ کرتے ہیں۔ عثمان کو باپ نے ملک کے دفاع کے لئے فوج میں نہیں بھیجا تھا بلکہ کرنیل اور جرنیل بنانے کے لئے سفارشی کمیشن دلوائی تھی۔ یہ تو تم دونوں نے عثمان کے کریکٹر اور عادات سے دیکھ لیا ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں اور تحقیقات میں بھی یہ بات سامنے آئی ہے کہ عثمان میں کچھ خوبیاں بھی ہیں"۔

"میں نے اور کیپٹن آصف نے یہی خوبیاں دیکھی تھیں"—— میجر سمیع نے کہا—— "اور انہی خوبیوں سے متاثر ہو کر اس کے دوست بنے تھے"۔

"اب مسز عثمان کے خاندان کی بات سنو"—— میجر امتیاز نے کہا—— "یہ لوگ بھی عثمان کے خاندان کی سطح کے زمیندار ہیں لیکن ان کا شمار شرفا میں ہوتا ہے۔ انہیں تم محبِّ وطن کہہ سکتے ہو۔ ہمارے کسی ایک بھی مخبر نے ان کے خلاف کوئی ذرا سی بات بھی نہیں کی۔ انہوں نے اگر پاکستان کو کچھ دیا نہیں تو پاکستان سے کچھ وصول بھی نہیں کیا۔ غنڈہ گردی کی طاقت ان میں بھی ہے لیکن اسے وہ غنڈوں کی طرح استعمال نہیں کرتے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ لوگ ہمارے ساتھ تعاون کرتے ہیں یا اپنے داماد کو بچانے کی کوشش کریں گے۔ میرا خیال ہے کہ اپنی بیٹی کو عثمان کے خلاف گواہی نہیں دینے دیں گے"۔

"لیکن امتیاز!"—— میجر سمیع نے کہا—— "اگر مسز عثمان کا یہ موڈ قائم رہا جو ہم دیکھ کر آئے ہیں تو وہ اپنے باپ کی بھی نہیں مانے گی۔ عثمان کے خلاف ضرور گواہی دے گی"۔

"ابھی تو ابتدا ہے سمیع بھائی!"—— میجر امتیاز نے کہا—— "آگے آگے دیکھئے کیا ہوتا ہے!..... اگر اس فون نمبر پر ہمارا چھاپہ کامیاب ہو گیا تو مسز عثمان کی گواہی کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی"۔

"کبھی تو مجھے بھی شک ہو جاتا ہے"—— کیپٹن آصف نے کہا—— "لوسی نے نمبر تو ٹھیک دیا ہے اور وہ اس نمبر پر بولی تھی لیکن اس کے اصل فون نمبر کا ایڈریس کوئی اور ہو گا۔ انڈیا کے جاسوس اتنے کچے نہیں ہو سکتے"۔

"تم مسلمان ہو آصف!"—— میجر امتیاز نے کہا—— "اس مسئلے کو ایک مسلمان کی

حیثیت سے دیکھو۔ اگر پاکستان کو ہم اللہ کی سرزمین مانتے ہیں تو اللہ کی ذاتِ باری کو نہ
بھولو۔ اللہ کی گرفت حرکت میں آتی ہے تو اللہ کے دین کے دشمنوں کی عقل سربسر
ہوجاتی ہے۔ دشمن اپنے ہی لگائے ہوئے پھندے میں پھنس جاتے ہیں' اپنے کھودے
ہوئے گڑھے میں خود ہی آگرتے ہیں۔ جاسوس اور تخریب کار انڈیا کے ہوں یا کسی اور
ملک' وہ ہم جیسے انسان ہی ہوتے ہیں' آسمان سے اُتری ہوئی مخلوق نہیں ہوتے۔ عثمان
اور لوسی اپنے ہی لگائے ہوئے پھندے میں آگئے ہیں۔ اللہ نے انہیں جو مہلت دی تھی
وہ ختم ہوگئی ہے"۔

"لیکن سر!" ـــــ کیپٹن آصف نے کہا ـــــ "سب پکڑے تو نہیں جاتے۔ انڈیا کے
ہزارہا جاسوس ہمارے ملک میں سرگرم ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے انہیں پکڑنے والا
ہمارا نظام اتنا سرگرم نہیں جتنا یہ انڈین ایجنٹ سرگرم ہیں"۔

"یہ کوئی معمّہ نہیں جو حل ہی نہ ہوسکے" ـــــ میجر سمیع نے کہا ـــــ "دشمن صرف
اس ملک میں جاسوسی اور تخریب کاری میں کامیاب ہوتا ہے جس ملک میں اسے غدار مل
جاتے ہیں۔ اگر پاکستانی خود ہی دشمن کے جاسوسوں کو اپنے گھروں میں صرف پناہ ہی نہ
دیں بلکہ اپنے ملک کی جڑیں کاٹنے کے لئے ان کے ساتھ مل جائیں تو انہیں کیسے پکڑا جا
سکتا ہے!.... پھر بھی اللہ کی گرفت سے کوئی دور نہیں"۔

ایسی ہی کچھ اور باتیں ہوئیں اور میجر سمیع اور کیپٹن آصف رخصت ہونے کے لئے
اٹھے۔ میجر امتیاز نے انہیں بتایا کہ وہ کل صبح راولپنڈی کے لئے روانہ ہوجائے گا۔



اُدھر جالندھر سے دور ایک جنگل اور بیابان میں جس میں سے کم ہی لوگوں کا گزر ہوا
کرتا تھا' صغیر اور دلجیت کور نے طوفانی رات ایک درخت کے تنے کی اوٹ میں بیٹھے
گزار دی۔ بجلیاں رہ رہ کر کوندتی رہیں اور ان کے دھماکے زمین و آسمان پر لرزا طاری
کرتے رہے' طوفانِ بادوباراں چیختا چلّاتا رہا اور بارش ایسی موسلادھار جیسے ساری زمین
کو سمندر بنا ڈالے گی۔ طوفان کی تیزی و تندی ایسی جیسے جنگل میں کوئی درخت کھڑا نہیں
رہ سکے گا۔

صغیر اور دلجیت کور گھنے درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے اس لئے اتنی تیز اور
طوفانی بارش کی براہِ راست زد سے بچے رہے لیکن درخت کے پتّوں سے گرنے والے

ش کے پانی سے محفوظ نہ رہ سکے۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ لگے بیٹھے رہے۔
یت کور دلیر اور جرأت مند لڑکی تھی مگر آخر عورت تھی' صغیر کے ساتھ یوں لپٹ
جاتی تھی جیسے اس کے وجود میں پناہ لینے اور سما جانے کی کوشش میں ہو۔ اس نے دو
بار صغیر سے پوچھا کہ یہ طوفان کب تھمے گا یا تھمے گا بھی یا نہیں۔

"جب تمہارے دل سے شیطان نکل جائے گا" ـــــ صغیر نے آخر کہا ـــــ "پھر
دل میں ایسا خیال نہ آنے دینا اور مجھے میرے خدا کی راہ سے گمراہ نہ کرنا ورنہ ہم
وں پر بجلی گرے گی اور ہم جل کر راکھ ہوجائیں گے"۔

دلجیت کور نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگا کر ہندوآنہ انداز میں توبہ توبہ کی اس کی آواز
سے کانپ رہی تھی۔

"اب یقین آگیا ہے" ـــــ دلجیت کور نے کہا۔

"کیا یقین؟"

"کہ تم خدا کے کوئی خاص بندے ہو" ـــــ دلجیت کور نے کہا ـــــ "میں نے
ہیں ناپاک کرنے کی کوشش کی تھی۔ مجھے معاف کردینا"۔

"معافی میرے خدا سے مانگو" ـــــ صغیر نے کہا ـــــ "اس کا طریقہ صرف یہ ہے کہ
اپنے آپ کو جوان عورت اور مجھے جوان مرد سمجھنا چھوڑ دو"۔

حقیقت یہ تھی کہ صغیر بھی خوف زدہ تھا لیکن مرد تھا اس لئے ایک عورت پر یہ ظاہر
ہونے دے رہا تھا کہ وہ بھی اس کی طرح ڈرا ہوا ہے۔

طوفان کا زور رات کے آخر میں ٹوٹنا شروع ہوگیا اور صبح طلوع ہونے تک طوفان
ہی ختم ہوگیا اور بارش بھی تھم گئی تھی۔ صبح کا اجالا نکھرنے لگا تو دونوں اٹھے۔ وہ
ٹیکری پر تھے اس لئے انہیں کچھ دور تک نظر آتا تھا۔ زمین سمندر بن گئی تھی۔
کو معلوم تھا کہ یہ پہاڑی علاقہ ہے جس میں پانی کسی ایک جگہ زیادہ دیر تک نہیں
گا اور آدھا دن گزرنے تک بہہ جائے گا۔

"اسی درخت کے پیچھے چلی جاؤ" ـــــ صغیر نے دلجیت کور سے کہا ـــــ "کپڑے
کر نچوڑ لو اور پھر پہن لو"۔

دلجیت کور تنے کی دوسری طرف چلی گئی اور اس طرح دونوں نے کپڑے اتار کر
لئے اور پھر پہن لئے۔ دلجیت کور نے صغیر کو نوٹوں کی گٹھیاں دکھائیں جو پنڈت

رمیش چندر کے گھر سے چرا کر لائی تھی۔ یہ تمام نوٹ اس طرح بھیگ گئے تھے جیسے پانی میں سے نکالے گئے ہوں۔ صغیر نے اسے بتایا کہ یہ خراب نہیں ہوئے، کھول کر دھوپ میں رکھیں گے تو خشک ہو جائیں گے"۔

وہ ٹیکری سے اتر گئے۔ چلتے چلتے دلجیت کور نے کہا کہ بھوک نے زیادہ تنگ کیا تو کیا کریں گے؟.... صغیر نے کہا کہ جس خدا نے ہمیں رات کو شیطان سے بچایا تھا وہ کچھ کھانے کے لئے بھی دے دے گا۔

"پہلے اس سمندر کو دیکھو" ـــــ صغیر نے کہا ـــــ "ہمیں اس میں سے گزرنا ہے ندی نالے چڑھے ہوئے ہیں۔ ہم ان کے اترنے کا انتظار نہیں کر سکتے"۔

"کیا پولیس اب بھی ہم تک پہنچ جائے گی؟" ـــــ دلجیت کور نے پوچھا۔

"نہیں!" ـــــ صغیر نے کہا ـــــ "اب نہیں، ہم بہت دور نکل آئے ہیں اور اس ملک کی پولیس اتنی تیز اور دلیر نہیں کہ ایسی طوفانی رات کو بھی ہمارے تعاقب میں رہی ہو نہ ہی رمیش کا کوئی آدمی اتنی جرأت کرے گا، پھر بھی ہمیں جلدی نکل جانا چاہئے"۔

اب ان کا سفر پانی میں داخل ہو گیا تھا۔ وہ پانی سے بچ بچ کر چل رہے تھے، اس طرح وہ سیدھے نہیں جا سکتے تھے۔ پانی کہیں ٹخنوں تک اور کہیں گھٹنوں تک آ جاتا تھا۔ وہ قدم پھونک پھونک کر رکھتے تھے کیونکہ خطرہ تھا کہ پاؤں کسی بڑے کھڈ میں نہ جا پڑے۔ وہاں تو کھڈ اور چھوٹی چھوٹی بلندیاں پانی میں ڈوب گئی تھیں۔ ان دونوں کی رفتار بہت ہی ست تھی۔

دھوپ چمکنے لگی تھی۔ بادلوں کے ٹکڑے ایک دوسرے کے پیچھے سورج کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ سورج اوپر ہی اوپر اٹھتا آ رہا تھا۔ جب سورج سر پر آ گیا تو ایک سیلابی نالے نے ان کا راستہ روک لیا۔ سیلاب خاصا تیز تھا۔

صغیر دلجیت کور کو اس نالے کے کنارے کنارے ایک طرف لے گیا۔ وہ ایسی جگہ دیکھنے چلا تھا جہاں نالے کا پاٹ چوڑا ہوتا۔ تھوڑی ہی دور گئے تو نالے کا پاٹ اتنا چوڑا ہو گیا کہ وہاں سیلاب پھیل گیا تھا اور اس کا زور و شور ختم ہو گیا تھا۔ صغیر نے دلجیت کور کو ساتھ لیا اور نالے میں اتر گیا۔

پہاڑی علاقوں کے ندی نالوں کا بہاؤ بہت ہی تیز ہوتا ہے۔ پانی گہرا نہ ہو تو بھی پاؤں اکھاڑ دیتا ہے۔ دونوں نالے کے وسط میں گئے تو دلجیت کور کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ گر

وہاں گہرائی بمشکل کمر تک تھی لیکن دلجیت کور سنبھل نہ سکی۔ صغیر اس کے گیا اور اسے پکڑ کر اٹھایا۔ اس طرح اسے اپنے بازوؤں میں جکڑ کر نالے کے پار لے

○

دن کا پچھلا پہر شروع ہو چکا تھا۔ وہ ایسے علاقے میں پہنچ چکے تھے جو ذرا زیادہ پتھریلا تھوڑا بلند تھا۔ اس وجہ سے وہاں پانی رکا نہیں تھا۔ اب ان کا سفر ذرا سہل ہو گیا۔ صغیر دیکھا تو اسے محسوس ہوا کہ وہ ایسے راستے پر جا رہا ہے جو مستقل راستہ معلوم ہوتا صاف پتہ چلتا تھا کہ لوگ اس راستے پر آتے جاتے ہیں۔

ذرا ہی آگے گئے تھے تو دور سے انہیں ایک آدمی آتا نظر آیا جو گھوڑے پر سوار اس آدمی نے بھی انہیں دیکھ لیا تھا۔ صغیر فیصلہ نہ کر سکا کہ اس آدمی سے بچنے کے راستہ بدل لیا جائے یا سیدھے چلتے چلیں۔ اسے خیال آ گیا کہ اس آدمی سے اسے خطرہ ہی کیا ہو سکتا ہے۔

"وہ دیکھو" ـــــ دلجیت کور نے ذرا گھبراہٹ سے کہا ـــــ "کوئی آ رہا ہے"۔

"آنے دو" ـــــ صغیر نے کہا ـــــ "اس کے سامنے ڈرنا نہ شروع کر دینا۔ ضرورت تو ہم یہ ظاہر کریں گے کہ ہم میاں بیوی ہیں"۔

جوں جوں وہ گھوڑ سوار قریب آتا جا رہا تھا، صغیر اس کے حال چلنے سے اندازہ لگاتا جا تھا کہ یہ آدمی کس حیثیت کا ہے۔ اس کی حیثیت تو گھوڑے سے ہی معلوم ہو رہی یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس گھوڑی کو کئی دنوں سے کھانے کو کچھ نہیں ملا۔ دبلی پتلی سی گھوڑی تھی جو آہستہ آہستہ چلی آ رہی تھی۔ اس کے سوار کے کپڑے اور چہرہ بتا تھا کہ نہایت معمولی سا دیہاتی ہے اور کسی کام سے جا رہا ہے۔ اس سے ڈرنے کا کوئی نہیں تھا۔

وہ قریب آیا تو اس نے ہندوؤں کی طرح دونوں ہاتھ جوڑ کر سلام کیا لیکن نہ رام کہا نہ نمستے اور نہ ہی اسلام علیکم۔ پتہ نہیں چلتا تھا کہ یہ ہندو ہے عیسائی ہے یا مسلمان۔ اس کے سر پر کُلّے کی پگڑی لپٹی ہوئی تھی جو عموماً مسلمان باندھا کرتے تھے۔ ہندو بھی اس طرح پگڑی لپیٹ لیتے تھے۔ یہ شخص صغیر اور دلجیت کور کو غور سے رہا تھا۔ صغیر کی جاسوسی والی رگ بیدار ہو گئی اور اس کے دماغ نے ایک بات سوچ

لی۔

"ہم جالندھر کے قریب کے ایک گاؤں کو جارہے ہیں"۔۔۔ صغیر نے کہا۔۔۔ "کیا تم بتاسکتے ہو کہ ہم ٹھیک راستے پر جارہے ہیں یا...."

"پیدل کیوں جارہے ہو؟"۔۔۔ گھوڑسوار نے پوچھا۔۔۔ "اور تم اس جنگل بیابان سے کیوں گزر رہے ہو؟ تھوڑا پرے جاتے تو تمہیں پکّا راستہ مل جاتا"۔

اس شخص نے گھوڑی روک لی تھی اور صغیر کو کوئی درویش یا سادھو منت سمجھ کر گھوڑی سے اتر آیا۔

"معلوم نہیں تمہارا مذہب کیا ہے"۔۔۔ صغیر نے کہا۔

"میں مسلمان ہوں"۔۔۔ سوار نے کہا۔

"پھر تم میری بات سمجھ سکو گے"۔۔۔ صغیر نے کہا۔۔۔ "ہم میاں بیوی ہیں۔ رہنے والے تو اس علاقے کے ہیں لیکن ہمارے پیرو مرشد جالندھر کے ایک گاؤں میں رہتے ہیں جہاں ہم جارہے ہیں۔ ہماری شادی ہوئے سات سال ہوگئے ہیں اور ابھی تک بے اولاد ہیں۔ کوئی ایک سال ہُوا کسی نے ہمیں اس پیر صاحب کے آستانے کا راستہ دکھایا تھا۔ ہم دونوں وہاں گئے اور پیر صاحب کے مرید بن گئے۔ اپنی مراد پیش کی تو انہوں نے دعا بھی کی اور تعویذ بھی دیئے لیکن کچھ اثر نہ ہُوا....

"ایک بار پھر گئے تو پیر صاحب نے پھر دعا کی اور تعویذ بھی دیئے لیکن ایک سال گزر جانے کے بعد بھی ہماری مراد پوری نہیں ہوئی۔ اس گاؤں کے ایک بزرگ نے بتایا تھا کہ تم خواہ ہندوستان کے کتنے ہی دور دراز گوشے کے رہنے والے ہو' ایک بار وہاں سے تم دونوں پیدل پیر صاحب کے دربار میں پہنچو تو تمہاری مراد پوری ہوجائے گی۔ اب ہم دونوں دو دن سے سفر میں ہیں اور پیدل پیر صاحب کے گاؤں تک پہنچنا ہے۔ معلوم نہیں ہم سیدھے راستے پر جارہے ہیں یا بھٹک گئے ہیں"۔

"تمہارا پیر کامل ہے"۔۔۔ سوار نے کہا۔۔۔ "ورنہ اس جنگل بیابان میں شاید ہی کوئی آدمی راستے سے نہ بھٹک جاتا ہو۔ کیا تم گزشتہ رات سفر میں ہی تھے؟"

"ہاں بھائی!"۔۔۔ صغیر نے جواب دیا۔۔۔ "ہم نے رات اس طوفان میں آسمان تلے بیٹھ کر گزاری ہے۔ ہم تو سمجھ گئے تھے کہ یہ ہماری زندگی کی آخری رات ہے۔ درختوں کے ٹہن ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے"۔

"پھر تمہاری مراد اسی پیر کے دربار میں پوری ہوگی"۔۔۔ سوار نے کہا۔۔۔ "اس بیابان میں کوئی انسان زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ میں نے پیچھے ایک مرا ہُوا ریچھ اور پانچ چھ مرے ہوئے بندر دیکھے ہیں۔ یہ رات کے طوفان میں مرے ہیں۔ تم دونوں اس لئے بچ رہے کہ تمہارا پیر پہنچ والا ہے.... تم بالکل سیدھے راستے پر جارہے ہو۔ دس بارہ میل اور جاؤ گے تو تمہیں پکّی سڑک مل جائے گی۔ اگر باقی سفر بس پر کرنا چاہو تو اس سڑک پر بسیں آتی جاتی رہتی ہیں۔ اگر پیدل ہی جانا ہو تو سڑک پر نہ چل پڑنا' لمبا چکر پڑ جائے گا۔ سڑک پار کرکے ناک کی سیدھ میں پیدل چلتے جانا۔ تمہاری ہمت ہے کہ اتنا لمبا سفر پاپیادہ طے کر رہے ہو۔ ہمت تو تمہاری اس گھر والی کی ہے جو عورت ذات ہوکر مردوں کی طرح تمہارے ساتھ یہ کٹھن مسافت طے کر رہی ہے۔ میں تو تمہیں سادھو سنت سمجھا تھا"۔

"میری داڑھی اور سر کے لمبے بالوں سے یہی شک ہوتا ہے"۔۔۔ صغیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔۔۔ "ایک اور بزرگ کے کہنے پر یہ منت مانی تھی کہ ایک سال تک داڑھی مونڈنا نہ سر کے بال کٹوانا اور اسی حلیے میں پیر صاحب کے ہاں حاضری دینا"۔

صغیر بول بھی رہا تھا اور اس شخص کی زین کا جائزہ بھی لے رہا تھا جس کے ساتھ دو تھیلے بندھے ہوئے تھے۔ صغیر کو خیال آیا کہ اس کے پاس کھانے کو کچھ ضرور ہوگا۔

"صرف ایک مشکل پیش آرہی ہے"۔۔۔ صغیر نے کہا۔۔۔ "کھانے کا بندوبست ساتھ لائے تھے لیکن رات کے طوفان میں وہ پوٹلی کہیں گری اور بہہ گئی ہے۔ مجھے اپنا تو کوئی غم نہیں' بھوک برداشت کر رہا ہوں لیکن اس سے بھوک برداشت نہیں ہوتی' پھر بھی اور اپنے آپ کو یہ تسلّی دیتا ہوں کہ جس پیر کے دربار میں حاضری دینے جارہے ہیں وہ کھانے کے لئے بھی کچھ بھیج دے گا"۔

"کھانے کے لئے مجھ سے لے لو"۔۔۔ سوار نے گھوڑی کی زین کے ساتھ بندھے ہوئے ایک تھیلے میں ہاتھ ڈال کر کہا۔۔۔ "میں تمہیں روٹی یا پراٹھے تو نہیں کھلا سکتا' بھنے ہوئے چنے اور گُڑ ہے' تمہارا سفر لمبا ہے' تھیلی ہی ساتھ لے جاؤ"۔

اس نے تھیلے میں سے ایک تھیلی نکال کر صغیر کو دی۔ صغیر نے تھیلی کھولی تو اس میں کم و بیش آدھا کلو بھُنے ہوئے سُوکھے چنے تھے اور گُڑ کی چند چھوٹی ڈھیلیاں بھی تھیں۔ سوار نے بتایا کہ اس کی بیٹی دور کے گاؤں میں بیاہی ہوئی ہے۔ وہ بیٹی سے ملنے جا

رہا تھا۔ کہتا تھا کہ وہ چنے اور گڑ ساتھ لے لیتا ہے‘ کوئی ضرورت تو نہیں ہوتی لیکن موسم بگڑ جائے تو راستے میں رکنا پڑتا ہے اس لئے وہ کچھ چنے اور گڑ ساتھ لے لیتا ہے۔

”تمہارے پاس تو گھوڑی ہے“ ___ صغیر نے سوار سے کہا ___ ”تم اپنی منزل پر جلدی پہنچ جاؤ گے‘ ہماری منزل تو بہت دور ہے‘ بہتر ہے ہم چل پڑیں“۔

”ہاں بھائی!“ ___ سوار نے کہا ___ ”تم چل پڑو‘ اللہ تمہارا نگہبان ہو..... میرا ایک کام کر دینا۔ اپنے پیر صاحب سے کہنا کہ تمہیں ایک بچہ دے دے اور میری طرف سے کہنا کہ اس شخص کے لئے دعا کریں کہ اس کی بیوی کوئی اور بچہ پیدا نہ کرے۔ میرے آٹھ بچے ہیں اور نواں بچہ تین مہینوں بعد آرہا ہے۔ میری بیوی ہر ڈیڑھ سال بعد ایک بچہ پیدا کرتی ہے۔ پیر صاحب سے کہنا کہ میرے حصے کا بچہ تمہیں دے دیں..... یہ دعا ضرور کروانا“۔

سوار ہنستے ہنستے گھوڑی پر سوار ہوا اور لگام کو جھٹکا دیا۔ گھوڑی اپنے راستے پر اور صغیر اور دلجیت کور اپنے راستے پر چل پڑے۔

”دیکھا دلجیت کور!“ ___ صغیر نے کہا ___ ”میں نے کہا نہیں تھا کہ جب خدا نے ہمیں شیطان سے بچایا ہے تو وہ کھانے کا بندوبست بھی کر دے گا..... اور جلدی چلو اور چنے کھاتی چلو“۔

گڑ اور چنوں نے ان کے پیٹ تو بھر دیئے اور یوں بھوک کا مسئلہ حل ہو گیا لیکن چنوں نے پیاس بھڑکائی تو پینے کا پانی نہیں تھا۔ وہاں پانی کی کوئی کمی نہیں تھی۔ جگہ جگہ پانی رکا ہوا تھا لیکن وہ اس قدر گدلا تھا کہ پیا نہیں جا سکتا تھا۔ درختوں اور پودوں کے پتّوں پر ابھی تک بارش کے قطرے رکے ہوئے تھے۔ دونوں نے ان پتّوں کو چوس چوس کر پیاس کی آگ بجھائی۔ وہاں دور دور چار گھروں کا گاؤں بھی نظر نہیں آتا تھا۔

چلتے چلتے ایک اور رات آگئی۔ یہ علاقہ ایسا تھا جس میں کوئی غار یا گُف نہیں مل سکتی تھی۔ وہ کھلے آسمان کے تلے بیٹھ گئے اور وہیں لیٹے اور تھکے ہوئے اتنے تھے کہ فوراً ہی گہری نیند میں چلے گئے۔

○

یہ رات خیریت سے گزر گئی۔ موسم کو بھی ان پر رحم آگیا تھا۔ صبح اُس وقت آنکھ کھلی جب سورج درختوں کے اوپر آگیا تھا۔ وہ اٹھے اور چل پڑے۔

یہ علاقہ کسی پہلو دشوار گزار نہیں تھا۔ چھوٹی موٹی ٹیکریاں تھیں لیکن خاصی دور تھیں۔ درختوں کی بہتات تھی اور برسات کے موسم کی وجہ سے ہر سُو ہریالی ہی ہریالی تھی۔

”ایک بات بتاؤ!“ ___ دلجیت کور نے صغیر سے پوچھا ___ ”جالندھر پہنچ کر بال کٹواؤ گے؟ داڑھی بھی چھوٹی کرالینا بلکہ صاف ہی کرا دینا..... ہمارے حلیئے تو بالکل بگڑ گئے ہیں“۔

”تمہارا یہ وہم ہے“ ___ صغیر نے کہا ___ ”تمہارا حلیہ اب ٹھیک ہوا ہے۔ حلیہ تو تمہارا اس بدبخت رمیش چندر نے بگاڑا تھا۔ تمہیں بنا سنوار کر رکھتا تھا۔ اب اپنا چہرہ اور اپنی حالت دیکھنا۔ یہ تمہارا قدرتی روپ ہے۔ اب تم زیادہ خوبصورت لگتی ہو۔ تمہارے بال بارش میں دھل کر نکھر آئے ہیں۔ انسان کا اصل روپ یہی ہوتا ہے“۔

”کیا میں تمہیں اچھی لگتی ہوں؟“ ___ دلجیت کور نے پوچھا۔

”ہاں‘ کیوں نہیں!“ ___ صغیر نے جواب دیا۔

”میری ایک بات مانو گے؟“ ___ دلجیت کور نے کہا ___ ”ایسے لگتا ہے جیسے میں اب تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکوں گی۔ زندہ رہوں گی تو زندگی مایوسی اور اداسی میں گزرے گی۔ مجھے اپنے ساتھ پاکستان لے چلنا اور وہاں جا کر میں مسلمان ہو جاؤں گی پھر میرے ساتھ شادی کر لینا۔ میں ٹھیک طرح بیان نہیں کر سکتی کہ تمہاری ذات میں کوئی جادو ہے جس کا مجھ پر اثر ہو گیا ہے۔ میں نے اپنی ذات تمہارے حوالے کر دی ہے“۔

”دیکھو دلجیت کور!“ ___ صغیر نے کہا ___ ”میں نے کہا ہے کہ تم اچھی لگتی ہو‘ یہ نہیں کہا میں تمہاری محبت میں گرفتار ہو گیا ہوں۔ اسے انسانی ہمدردی یا نیکی سمجھو کہ میں تمہیں جہنم سے نکال کر تمہارے گھر لے جا رہا ہوں۔ تم نے دیکھ لیا ہے کہ تمہارے اس حسین چہرے اور اتنے دل کش جسم کے ساتھ میں نے ذرا سی بھی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ ہمارے راستے جدا ہیں۔ یہ میری ذمہ داری ہے کہ تمہیں تمہاری منزل تک پہنچاؤں“۔

دلجیت کور صغیر کے ساتھ چلتی جا رہی تھی۔ صغیر کی بات سن کر اس نے کچھ بھی نہ کہا۔ چند قدم آگے جا کر صغیر نے دلجیت کور کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اب صغیر نے آگے ہو کر اسے روک لیا۔

"کیوں دلجیت کورا!" ____ صغیر نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام کر اوپر کیا اور ... ____ "یہ آنسو کیوں؟ کیا تم پھر اسی بات پر آ گئی ہو؟"

"نہیں!" ____ دلجیت کور نے اپنے سر کو دائیں بائیں جھٹک کر کہا ____ "مجھے اس وقت جسم نہ سمجھو۔ تم نے میرے جسم کو مار ڈالا اور میری روح کو زندہ کر دیا ہے۔ سوچتی ہوں مجھے کس گناہ کی سزا ملی ہے۔ مجھے جن لوگوں سے نفرت تھی وہ میرے ساتھ کھُل کھیلتے رہے اور جس کی محبت دل میں پیدا ہوئی ہے وہ مجھے اپنے قریب بھی نہیں آنے دیتا"۔

صغیر نے اپنے بازو پھیلا کر دلجیت کور کے گرد لپیٹ دیئے اور اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

"میں کسی اور دنیا کا بندہ ہوں دلجیت کورا!" ____ صغیر نے کہا ____ "یہ نہ سمجھنا کہ میں تمہیں اس وجہ سے قبول نہیں کر رہا کہ نہ جانے تم کتنے مردوں کے پاس رہی ہو۔ میں خود ایک ناپاک اور گناہ گار بندہ ہوں۔ میں کسی کو گناہ گار کہہ ہی نہیں سکتا۔ تمہیں تمہارے گھر پہنچا دوں گا تو تمہارے سارے دکھ درد ختم ہو جائیں گے"۔

ایک دھماکے نے دونوں کو چونکا دیا بلکہ وہ بدک کر ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ یہ دھماکہ کچھ دُور ہُوا تھا اور یہ رائفل یا شکاری بندوق کا تھا۔ فوراً بعد ایسا ہی ایک اور دھماکہ ہُوا۔ دلجیت کور نے سوالیہ نگاہوں سے صغیر کو دیکھا تو صغیر نے اسے بتایا کہ رائفل فائر ہوئی ہے۔ یہ بھی کہا کہ ہو سکتا ہے کوئی شخص شکار کھیل رہا ہو۔ بہرحال کچھ خطرہ بھی ہو سکتا تھا۔

○

یہ معلوم کرنا ممکن نہیں تھا کہ یہ دھماکے کہاں ہوئے ہیں۔ کچھ دور آگے ٹیکریاں ذرا اونچی اور قریب قریب ہو گئی تھیں اور درخت زیادہ تھے۔ سرکنڈوں جیسی لمبی گھاس بھی تھی۔ صغیر دلجیت کور کو ساتھ لے کر آگے کو چل پڑا۔

"یاد رکھنا دلجیت کورا!" ____ صغیر نے کہا ____ "یہ نہ بھولنا کہ اپنے آپ کو میری بیوی ظاہر کرنا۔ کوئی اور جھوٹ بولنا پڑا تو وہ میں بول لوں گا۔ تم بالکل خاموش رہنا جیسے بیویاں خاوندوں کی موجودگی میں چپ رہتی ہیں۔ ڈرنے اور گھبرانے کی کوئی بات نہیں"۔

دونوں چلتے گئے۔ اب کے رائفل فائر ہوئی تو پتہ چلتا تھا کہ زیادہ دور نہیں۔ کچھ اور آگے گئے تو ایک اونچی ٹیکری راستے میں آ گئی۔ اس کے دامن کے ساتھ چلتے چلتے جہاں ٹیکری ختم ہوئی وہاں سے مُڑے اور سیدھا راستہ چلنے لگے۔

اس سے آگے کا علاقہ تو بہت ہی خوبصورت اور دلنشیں تھا۔ وہاں سبزہ تو تھا لیکن درخت بالکل مختلف اقسام کے تھے جو بڑے اچھے لگتے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ انسانی ہاتھوں کی بنی ہوئی پکنک سپاٹ ہو۔ ایک ٹیکری بائیں طرف تھی جو کچھ دور تک چلی گئی تھی۔ اس کے دامن میں ہاتھی گھاس تھی جو خاصی اونچی ہوتی ہے۔

صغیر اور دلجیت کور آگے بڑھتے چلے گئے۔ وہ ذرا ہی آگے گئے ہوں گے کہ بائیں طرف والی ٹیکری کے پیچھے پھر رائفل یا بندوق فائر ہوئی اور جس درخت کے نیچے سے صغیر اور دلجیت کور گزر رہے تھے اس درخت میں سے ایک جنگلی کبوتر ان کے سامنے گرا۔ دونوں تڑپتے ہوئے کبوتر کے قریب سے گزر گئے اور کچھ آگے جا کر بائیں طرف دیکھا۔ ایک خوبرو نوجوان ہاتھ میں دونالی بندوق لئے کبوتر اٹھانے آ رہا تھا۔

صغیر نے اس کی طرف دیکھا ذرا سا مسکرایا اور اپنے دھیان آگے کو چلتا گیا۔ اس کا اور دلجیت کور کا حلیہ ایسا تھا جیسے کسی دور دراز دیہات کے رہنے والے اور بڑی ہی گھٹیا ذات کے لوگ ہوں۔ کیچڑ اور گدلے پانی میں سے گزرنے کی وجہ سے ان کے کپڑوں کا اصلی رنگ رہا ہی نہیں تھا۔ صغیر کے لمبے بالوں اور داڑھی کا حال حلیہ بھی ایسا لگتا تھا جیسے کوئی مزدور پیشہ اور بہت ہی غریب آدمی ہو۔ دلجیت کور کا کپڑوں کے لحاظ سے تو حلیہ بڑا ہی گیا گزرا تھا لیکن اس کا جسم اور اس کا چہرہ اپنی جاذبیت اور کشش کو چھپا نہیں سکتا تھا۔

"دوڑ کر آؤ اوئے لڑکو!" ____ بندوق والے لڑکے نے بلند آواز سے کہا ____ "آؤ تمہیں ہرنی دکھاؤں"۔

تین لڑکے جو نہ جانے کہاں بیٹھے تھے' دوڑتے آئے اور بندوق والے لڑکے کے پاس جا پہنچے۔ وہ سب نوجوان تھے۔ ان کی عمریں سترہ اٹھارہ سے بیس سال تک ہوں گی اور سب امیرزادے لگتے تھے۔

بندوق والے لڑکے نے دلجیت کور کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ وہ دیکھو کتنی پیاری ہرنی جا رہی ہے۔ چاروں صغیر اور دلجیت کور کی طرف چل پڑے۔ ایک اور لڑکے کے

پاس ایک نالی کی شکاری بندوق تھی۔

صغیر نے دیکھا کہ ذرا ہی پرے ایک جیپ کھڑی تھی۔ اس سے اسے اندازہ ہوا کہ یہ لڑکے امیر کبیر خاندانوں کے ہیں اور یہ یقیناً" مسلمان ہوں گے۔ ہندو اتنے زندہ دل اور عیش پرست نہیں ہو سکتے تھے۔ صغیر جان گیا کہ یہ لڑکے دلجیت کور کے پیچھے پڑ گئے ہیں اور یہ انہیں تنگ کریں گے۔ اتنی سی بات تو وہ سمجھتا تھا کہ یہ لڑکے اسے غریب اور کم ذات آدمی سمجھ بیٹھے ہیں جو ان کا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ اسے یہ بھی خطرہ نظر آ رہا تھا کہ یہ امیرزادے اسے گولی مار کر یہیں کہیں زمین میں دبا دیں گے اور انہیں کوئی بھی نہیں پوچھے گا۔ کسی کو پتہ ہی نہیں چلے گا اور پھر دلجیت کور کو خراب کر کے جنگل میں بھٹکتا چھوڑ دیں گے۔ صغیر نے ڈرنے کی بجائے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ انہیں کس طرح سنبھالے گا۔ اس نے یہ دیکھ لیا تھا کہ یہ چاروں نوجوان ہیں اور ان کے پاس دو بندوقیں ہیں۔

دلجیت کور نے صغیر سے کہا کہ تیز چلو' یہ کم بخت لڑکے ہمارے پیچھے آ رہے ہیں صغیر نے اسے کہا کہ وہ بندوقوں سے نہ ڈرے' قریب آئے تو پہلا حملہ وہ خود کرے گا اور پھر دلجیت کور لڑکوں پر ٹوٹ پڑے۔ اس طرح صغیر نے سرگوشیوں میں دلجیت کور کو ضروری ہدایات دے دیں۔

"بڑی خوبصورت ہرنی ہے"۔۔۔۔ ایک لڑکے نے قریب آ کر کہا۔

"نہیں یار' یہ تو مورنی ہے"۔۔۔۔ دوسرے نے دلجیت کور کے پہلو میں آ کر کہا۔

"سائیں بادشاہ!"۔۔۔۔ دو نالی بندوق والے نے صغیر کے بالکل قریب آ کر کہا۔۔۔۔ "اس ہرنی کا کیا لو گے؟"

"نقد لے لو"۔۔۔۔ ایک نالی بندوق والا لڑکا صغیر کے پہلو کے ساتھ چلتے ہوئے بولا ۔۔۔۔"آؤ بڑا زبردست کھانا کھلائیں گے"۔

صغیر یہی چاہتا تھا کہ بندوقوں والے لڑکے اس کے قریب آ جائیں۔ اس کی خواہش کے عین مطابق ایک دائیں پہلو اور دوسرا بائیں پہلو پر آ گیا۔ صغیر نے بائیں ہاتھ کا مکہ نالی بندوق والے کے منہ پر پوری طاقت سے مارا اور ایک آدھ سیکنڈ کا بھی انتظار نہ کیا پلک جھپکتے دائیں ہاتھ کا ایسا ہی "مکہ" بائیں طرف والے لڑکے کے منہ پر مارا۔ دونوں کی بندوقیں ان کے ہاتھوں سے چھوٹ گئیں اور دونوں کئی قدم پیچھے کو پیٹھ کے بل گرے۔

صغیر نے ایک ہی جست میں دو نالی بندوق اٹھا لی۔ ادھر دیکھا ایک اور لڑکا ایک نالی بندوق اٹھانے کو جھکا۔ صغیر نے گرج کر کہا' بندوق کو ہاتھ نہ لگانا' گولی مار دوں گا۔ وہ لڑکا فوراً" سیدھا ہو گیا۔

"وہ بندوق اٹھا لو دلجیت کور!"۔۔۔۔ صغیر نے کہا۔۔۔۔"ان میں سے کوئی بھی ہلے یا بولے اسے گولی مار دو"۔

"مکے کھا کر گرنے والے دونوں لڑکے اٹھے۔ ایک نے صغیر پر رعب گانٹھنے کی کوشش کی اور کہا کہ وہ بندوق اس کے حوالے کر دے۔ وہ کسی بڑے آدمی کا بیٹا لگتا تھا اور غالباً" اسے یہ توقع تھی کہ جنگل میں بھی اس کے باپ کا رعب چلے گا۔ وہ ابھی محسوس نہیں کر سکا تھا کہ صغیر اب جنگل میں جنگل ہی کا قانون چلا رہا تھا۔

صغیر نے اس قسم کی لڑائی کی ٹریننگ لی ہوئی تھی۔ رعب گانٹھنے والا لڑکا بڑے رعب سے اس کے قریب آیا تو صغیر نے بندوق کے بٹ کے پیچھے کہنی رکھ کر بٹ بڑی زور سے اس کے منہ پر مارا۔ لڑکا پھر تین چار قدم پیچھے ہٹتا ہٹتا گر پڑا اور منہ پر وہاں ہاتھ رکھ لیا جہاں بٹ کی ضرب پڑی تھی۔ ایسی ضرب طاقتور آدمی بھی برداشت نہیں کر سکتا' وہ تو نئے دور کا لاغر سا لڑکا تھا۔

"صغیر نے دونوں بندوقیں کھول کر دیکھیں۔ دو نالی بندوق کی ایک نالی میں کارتوس پڑا تھا اور دوسری نالی والا کارتوس فائر ہو چکا تھا۔ اس لڑکے نے اسی کارتوس سے کبوتر مارا تھا۔ ایک نالی بندوق میں بھی کارتوس تھا۔ صغیر نے ایک بندوق اپنی ایک بغل اور دوسری دوسرے بغل میں رکھ لی' انگلیاں ٹریگروں میں رکھیں اور نالیاں لڑکوں کی طرف کر دیں۔

"سب میرے سامنے کھڑے ہو جاؤ"۔۔۔۔ صغیر نے بڑی بارعب آواز میں کہا۔۔۔۔ "میں چاروں کو مار ڈالوں گا اور جیپ لے کر یہاں سے غائب ہو جاؤں گا۔ تمہیں ابھی معلوم نہیں میں کون ہوں"۔

خوفزدگی کا بڑا گہرا تاثر ایک ہی جیسا چاروں لڑکوں کے چہروں پر آ گیا۔ جس لڑکے کے منہ پر صغیر نے گھونسہ مارا تھا اس کے چہرے پر نیلا ابھار ظاہر ہونے لگا تھا۔ ایک نالی بندوق والے لڑکے کے منہ پر صغیر نے گھونسہ بھی مارا اور بعد میں بندوق کا بٹ بھی مارا تھا' اس کے چہرے پر نیلے رنگ کی سوجن صاف ابھر آئی تھی اور ابھی اسے اور زیادہ

ابھرتا تھا۔ اس کے درد کی شدت کا اندازہ اس کے آنسوؤں سے ہو رہا تھا جو اس کی آنکھوں سے بے اختیار بہے جا رہے تھے۔

"وہاں چلو جہاں تم بیٹھے تھے" —— صغیر نے کہا —— "اور وہ کھانا مجھے دکھاؤ جو تم کہتے تھے کہ مجھے دو گے"۔

لڑکے سدھائے ہوئے بندروں کی طرح اس طرف چل پڑے۔ صغیر اور دلجیت کور ان کے پیچھے پیچھے گئے۔ ذرا ہی پرے جا کر وہ رکے۔ وہ تو اور ہی زیادہ خوبصورت جگہ تھی۔ چھوٹا سا ایک چشمہ بھی تھا جس کا پانی شفاف تھا۔ وہاں انہوں نے دری بچھا رکھی تھی۔

لڑکوں نے بڑی تیزی سے کھانا دری پر رکھ دیا۔ دو تھرماس بوتلیں تھیں جن میں چائے تھی۔

جب انہوں نے کھانا کھولا تو صغیر حیران تو نہ ہُوا لیکن یہ اندازہ ہو گیا کہ یہ کتنے امیر خاندانوں کے لڑکے ہیں۔ ایک تو روسٹ مرغی تھی اور دوسرا سالن بھنے ہوئے گوشت کا تھا۔ روٹیاں بھی تھیں۔

صغیر نے دلجیت کور کو ساتھ بٹھا لیا اور کہا کہ کھانا کھا لے۔ دونوں بھوکے تھے۔ کھانے لگے تو کھاتے ہی چلے گئے لیکن اتنا زیادہ کھانا وہ ختم نہیں کر سکتے تھے۔

"کیا اپنے متعلق آپ کچھ بتانا گوارا کریں گے؟" —— ایک لڑکے نے ڈری ڈری سی آواز میں کہا —— "آپ یقیناً" وہ نہیں ہیں جو ہم سمجھے تھے۔ میں اپنے ان دوستوں کی طرف سے آپ سے معافی مانگتا ہوں"۔

صغیر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی اور جواب دینے کی بجائے وہ کھانے میں لگا رہا۔

"گستاخی معاف!" —— ایک اور لڑکا بولا —— "اگر آپ مجھے معاف کر دیں تو میں کہنا چاہوں گا کہ آپ اس علاقے کے کوئی مشہور ڈاکو تو نہیں؟.... یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ جس طرح آپ نے اس قدر تیزی سے ہم دو جوانوں کے ہاتھوں سے بندوقیں لے لی ہیں اور ہم سب پر غالب آ گئے ہیں، یہ کسی عام آدمی کے بس کی بات نہیں ہو سکتی۔ آپ معمولی آدمی نہیں لگتے"۔

"میں ڈاکو نہیں" —— صغیر نے کہا —— "میں ڈاکوؤں کو پکڑنے والا ہوں۔ میں سی آئی ڈی انسپکٹر ہوں اور یہ زنانہ پولیس میں اے ایس آئی ہے"۔

"پھر آپ اس حلیے میں کیوں؟" —— ایک لڑکے نے پوچھا —— "اور آپ پیدل جا رہے ہیں!"

"یہاں سے دور آگے ایک ڈاکو کا کھوج لگانا تھا" —— صغیر نے بتایا —— "اس کا سراغ نہیں ملتا تھا۔ پولیس کو اطلاع ملتی تھی کہ اس وقت فلاں جگہ موجود ہے لیکن پولیس وہاں پہنچتی تھی تو وہ غائب ہو چکا ہوتا تھا۔ مجھے اور اس لڑکی کو ایسے ڈاکوؤں کی کھوج لگانے کی خاص مہارت حاصل ہے۔ ہم دونوں اس بھیس میں گئے تھے اور اس ڈاکو کو جا پکڑا۔ پولیس سفید کپڑوں میں گاؤں سے باہر موجود تھی۔ میرے اشارے پر گاؤں میں آ دھمکی اور ڈاکو کو پکڑ لیا"۔

"وہ کس طرح؟" —— ایک اور لڑکے نے پوچھا۔

"یہ نہیں بتاؤں گا" —— صغیر نے کہا —— "یہ میرا ایک راز ہے، میں نے اس طریقے سے چار اور ڈاکو پکڑے تھے۔ یہ طریقہ کسی اور کو نہیں بتا سکتا۔ اتنا بتا دیتا ہوں کہ میں سادھو مہنت بن کر اس تک جا پہنچا اور اس کا ہاتھ دیکھ کر اسے یہ خوشخبری سنائی کہ اسے پولیس کبھی گرفتار نہیں کر سکے گی"۔

"اور آپ پیدل کیوں گئے تھے؟"

"اس میں بھی ایک راز تھا" —— صغیر نے کہا —— "میں جیپ میں آتا تو جیپ دور دور کے لوگوں کو نظر آ جاتی پھر ڈاکو کو بھی اطلاع مل جاتی کہ ایک جیپ اس علاقے میں آئی ہے۔ وہ سمجھ جاتا کہ یہ جیپ پولیس کی ہی ہو سکتی ہے۔ پھر وہاں سے نکل بھاگتا"۔

صغیر اور دلجیت کور نے سیر ہو کر کھانا کھا لیا تھا۔ صغیر کا یہ داؤ اور یہ جھوٹ کھرے سکّے کی طرح چل گیا تھا۔ ایک لڑکے نے ایک تھرماس میں سے چائے دو پیالیوں میں ڈالی اور صغیر اور دلجیت کور کو پیش کی۔ صغیر نے ان سے پوچھا کہ وہ کہاں کے رہنے والے ہیں۔ انہوں نے ایک قصبے کا نام لیا جو وہاں سے کوئی بیس میل دور تھا۔

"اب یوں کرو لڑکو!" —— صغیر نے کہا —— "تم میں جیپ کون چلاتا ہے.... ہم دونوں کو سڑک تک پہنچا دو لیکن یہ سن لو۔ جیپ میں خود چلا سکتا ہوں لیکن سڑک سے جیپ واپس کون لائے گا؟ جیپ چلانے والا لڑکا ہمارے ساتھ جائے گا اور یہ دونوں بندوقیں بھی ساتھ جائیں گی۔ باقی لڑکے یہیں بیٹھے رہیں۔ ہم دونوں سڑک پر اتر جائیں گے اور جیپ اور بندوقیں تمہارے پاس واپس آ جائیں گی۔ کوئی گڑبڑ نہ ہو ورنہ تم سب

کو اسی جیپ میں جالندھر لے جاؤں گا اور وہاں کی پولیس کے حوالے کر دوں گا“۔

جیپ چلانے والا لڑکا فوراً“ اٹھا اور جیپ کی طرف چل پڑا۔ صغیر نے دونوں بندوقیں اٹھالیں اور دلجیت کور کو ساتھ لے کر جیپ تک پہنچا اور پھر اس میں سوار ہوئے اور جیپ چل پڑی۔

پکی سڑک وہاں سے آٹھ نو میل دُور تھی۔ جیپ پہلے ایک پگڈنڈی پر چلی پھر سڑک پر پہنچ گئی۔ صغیر اور دلجیت کور جیپ سے اترے، دونوں بندوقیں لڑکے کے حوالے کیں اور اسے کہا کہ وہ چلا جائے۔

صغیر کو اس گھوڑ سوار نے جو انہیں جنگل میں ملا تھا“ بتایا تھا کہ یہ سڑک سیدھی جالندھر نہیں جاتی۔ یہ چھوٹی سڑک تھی جو چار قصبوں سے گزر کر اور دور آگے سے مڑ کر جالندھر جاتی تھی۔ جالندھر جانے والی سڑک وہاں سے خاصی دور تھی.... وہ کسی بس کے انتظار میں سڑک کنارے کھڑے ہو گئے۔

○

اس سڑک پر ٹریفک بہت ہی کم تھی۔ اِکا دُکا کار زناٹے سے گزر جاتی تھی۔ دو تین ٹرک گزر گئے اور کچھ دیر بعد ایک بس آتی نظر آئی۔ صغیر نے ذرا آگے ہو کر ہاتھ دیا لیکن بس رکی نہیں۔ معلوم نہیں کیسی بس تھی ورنہ پاکستان کی طرح کوئی بس کسی مسافر کو یوں چھوڑ کر نہیں جاتی۔ بس کے اندر کھڑے ہونے کی بھی جگہ نہ ہو تو مسافروں کو چھت پر چڑھا دیتے ہیں۔

پھر ایک سفید سوزوکی کار آتی نظر آئی۔ صغیر ایسا خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا کہ کسی کار کو روک کر لفٹ لے لیتا۔ ایک تو وہ مفرور ملزم تھا اور دوسرے یہ کہ اس کا حلیہ ایسا تھا کہ اسے کوئی بھی لفٹ نہ دیتا۔ اب وہ جنگل سے نکل کر آبادی میں آگیا تھا اس لئے اسے کچھ زیادہ ہی محتاط رہنا تھا۔ اس حلئے میں اسے پہچان تو کوئی نہیں سکتا لیکن پولیس اور انٹیلی جنس والوں کی نظریں بڑی تیز اور گہری ہوتی ہیں۔

سفید سوزوکی صغیر اور دلجیت کور سے تھوڑی ہی دور رہ گئی تھی کہ صغیر نے دیکھ لیا کہ اس گاڑی کا اگلا بایاں ٹائر بیٹھ گیا تھا۔ صغیر کو ادھر سے منہ پھیر لینا چاہئے تھا کہ اسے کوئی پہچان نہ لے لیکن انسانیت کے عین مطابق یہ حرکت کی کہ ڈرائیور کو اشارہ کیا اور پھر ٹائر کی طرف انگلی کی۔ ڈرائیور کو غالباً پہلے ہی پتہ چل گیا تھا کہ ایک ٹائر پنکچر ہو گیا ہے۔

گاڑی کی رفتار کم ہو گئی تھی۔ رکتے رکتے گاڑی صغیر سے دس بارہ قدم آگے جا رکی۔ اس میں سے چار جوان سال آدمی باہر نکلے۔ وہ آدمی جو گاڑی چلا رہا تھا وہ صغیر کی طرف آیا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ مسلمان ہے۔ اس کی چھوٹی سی سلیقے سے تراشی ہوئی داڑھی تھی، سر پر جناح کیپ تھی اور اس نے شیروانی پہن رکھی تھی۔ وہ کوئی بڑا ہی شائستہ اور بااخلاق آدمی معلوم ہوتا تھا۔ شاید اسے پہلے پتہ چل چکا ہو گا کہ اس کا ایک ٹائر پنکچر ہو گیا ہے لیکن صغیر نے اسے اشارہ کیا تھا اس لئے وہ اخلاقاً“ صغیر کا شکریہ ادا کرنے آ رہا تھا۔ صغیر اپنے طور پر چوکس ہو گیا کہ یہ شخص کسی شک کی بنا پر اس کی طرف آ رہا ہو گا۔

”آپ کا بہت بہت شکریہ!“ —— اس معزز شخص نے صغیر سے کہا —— ”آپ اشارہ نہ کرتے تو میں خاصا آگے نکل گیا ہوتا“۔

”شکریہ ادا کرنے کی بھلا کیا ضرورت تھی“ —— صغیر نے کہا —— ”میں نے آپ پر کوئی اتنا بڑا احسان تو نہیں کیا“۔

گاڑی والا معزز آدمی صغیر کے ساتھ ہاتھ ملا کر مسکراتا ہوا اپنی گاڑی کی طرف چلا گیا۔ وہ کوئی بہت ہی بااخلاق آدمی تھا ورنہ صغیر کے حلئے جیسے آدمی کا کون شکریہ ادا کرتا ہے۔ کوئی اور ہوتا تو صغیر سے کہتا کہ چلو گاڑی سے ٹائر نکال کر نیچے رکھو اور جیک لگاؤ، پانچ روپے مل جائیں گے۔

وہ معزز آدمی شکریہ ادا کر کے تو چلا گیا مگر صغیر پر ایک وہم طاری ہو گیا۔ اس نے یوں محسوس کیا جیسے یہ چہرہ اس نے کہیں دیکھا ہے۔ اس کی آواز بھی صغیر کو مانوس لگی۔ صغیر ذہن میں اس چہرے کو لا کر غور کرنے لگا، آخر اپنے آپ کو یوں تسلی دی کہ یہ اس کا اپنا وہم ہے۔ اسے تو ہر چہرے سے یہی شک ہونا چاہئے تھا کہ وہ پہچان لیا گیا ہے۔

گاڑی میں سے جو آدمی نکلے تھے انہوں نے گاڑی سے وہیل اور جیک نکالا اور جیک گاڑی کے نیچے لگانے لگے۔ صغیر ان سے دس بارہ قدم دور تھا۔ اسے دو چہرے تو خاص طور پر ایسے لگے جیسے وہ انہیں جانتا ہو۔ اس نے جب تیسرے آدمی کا چہرہ دیکھا تو پردے اٹھنے لگے۔ اس شخص کو تو صغیر جانتا اور بلاشبہ پہچانتا تھا۔ اسے یہ بھی یاد آگیا کہ یہ چہرہ اس نے انبالہ ملٹری ہسپتال سے فرار ہو کر دیکھا تھا۔

دلجیت کور اس وقت صغیر سے کہہ رہی تھی کہ وہ ان گاڑی والوں سے پوچھے کہ وہ

کہاں جا رہے ہیں۔ اگر جالندھر کی طرف جا رہے ہیں تو ہمیں گاڑی میں بٹھالیں لیکن صغیر پہلے یہ فیصلہ کرچکا تھا کہ کسی سے لفٹ نہیں لینی۔ اس وقت صغیر دلجیت کور کی بات کم ہی سن رہا تھا' اس کا تمام تر دھیان ان جواں سال چہروں پر مرکوز تھا جو گاڑی کا ٹائر بدل رہے تھے۔ اس کے لئے یہ فیصلہ کرنا محال ہو گیا کہ وہ ان کے پاس جائے یا نہ جائے۔

وہ اس کے دشمن نہیں تھے لیکن اسے کسی پر بھروسہ بھی نہیں کرنا چاہئے تھا۔ وہ ایک ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔ اسے یہ خیال بھی آتا تھا کہ اکثر انسانوں کی شکلیں ملتی جلتی ہیں اور انہیں دیکھ کر غلط فہمی ہو جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے یہاں بھی معاملہ کچھ ایسی ہی مشابہت کا ہو.... اچانک صغیر کے دماغ میں ایک روشنی چمکی جیسے افق پر بجلی چمکی ہو۔ نہ جانے وہ کیسی قوّت تھی جس نے اسے ان چار آدمیوں کی طرف دھکیلا اور وہ یوں ان تک جا پہنچا جیسے خود چل کر نہ گیا ہو بلکہ اسے لے جایا گیا ہو۔ ان چہروں کے ساتھ اس کی وابستگی ہی کچھ ایسی تھی وہ اپنے آپ کو قابو میں نہ رکھ سکا۔

"آیئے!" --- گاڑی چلانے والے معزز شخص نے صغیر سے کہا --- "کیا آپ کہیں آگے جانا چاہتے ہیں؟ کچھ دور تک ہم آپ کو ساتھ لے چلیں گے"۔

اس معزز شخص کی یہ پیشکش سن کر اس کے تینوں ساتھیوں نے بیک وقت صغیر کی طرف دیکھا۔ صغیر نے تو جیسے اس شخص کی بات سنی ہی نہ ہو۔ ان تینوں آدمیوں نے جب اس کی طرف دیکھا تو اس نے تینوں کے چہروں کو بڑی غور سے دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر تبسّم سا آگیا۔

"آپ غالباً" وہاب صاحب ہیں!" --- صغیر نے زمین پر بیٹھے ہوئے تینوں آدمیوں میں سے ایک سے کہا --- "اگر مجھے غلطی لگی ہے تو معذرت خواہ ہوں" --- پھر اس نے ایک اور آدمی کو مخاطب ہو کر کہا --- "آپ غالباً" اشتیاق صاحب ہیں"۔

تینوں آدمی اٹھ کھڑے ہوئے اور کوئی جواب دیئے بغیر صغیر کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگے۔ صغیر نے ان کی طرف سے نظریں ہٹا کر اس معزز باخلاق آدمی کی طرف دیکھا جو اس کا شکریہ ادا کرنے گیا تھا۔ صغیر کچھ دیر اس کے چہرے پر نظریں جمائے دیکھتا ہی رہا۔

"آپ ڈاکٹر رشید صاحب ہیں!" --- صغیر نے کہا۔

وہ واقعی ڈاکٹر رشید تھا اور اس کے ساتھ تینوں دوست.... وہاب' اشتیاق اور ظفر

تھے۔ وہ ڈاکٹر رشید کے فرار کے پلان کے مطابق آگرہ سے نکل آئے تھے اور بخیرو عافیت یہاں تک پہنچ گئے تھے۔ صغیر نے جب چاروں کو صحیح پہچان لیا تو ان کے چہروں پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ انہیں یہ پوچھنے کی ہوش ہی نہ رہی کہ تم کون ہو۔ اس حال حلئے کے آدمی کا ان کے ساتھ تعلق ہی کیا ہو سکتا تھا۔ یہ شخص پولیس کا مخبر ہو سکتا تھا۔

"محترم!" --- آخر وہاب نے صغیر سے پوچھا --- "آپ یہ تو بتادیں کہ آپ کون ہیں۔ تعارف تو ہو جائے!"۔

"صغیر!" --- صغیر نے آگے ہو کر وہاب کے کان میں سرگوشی کی تاکہ دلجیت کور اس کا اصلی نام نہ سن سکے۔ صغیر نے کہا --- "آپ کا مفرور"۔

صغیر کی یہ سرگوشی چاروں نے سن لی تھی۔ دلجیت کور پیچھے ذرا ہٹ کر کھڑی تھی۔ صغیر نے اپنا تعارف کرایا تو ان چاروں کے چہروں پر اطمینان اور سکون کی رونق عود کر آئی۔ چاروں باری باری صغیر کے ساتھ بغلگیر ہوئے اور اپنے جذبات کا اظہار بڑی بے تابی اور شدت سے کیا۔

"یہ کون ہے؟" --- ڈاکٹر رشید نے صغیر سے سرگوشی میں پوچھا۔

"اسے میرا پاگل پن کہہ لیں" --- صغیر نے سرگوشی میں ہی جواب دیا --- "یہ کوئی محبت کا ڈرامہ نہیں' پھر سناؤں گا۔ اسے میرا پاگل پن سمجھ لیں لیکن اس کی بدولت شاید مجھے سرحد پار کرانے کا بندوبست ہو جائے.... اس کی موجودگی میں کوئی بات نہیں کرنی چاہئے۔ سکھوں کی لڑکی ہے اور ہم دونوں جالندھر جا رہے ہیں"۔

"ہم بھی جالندھر جا رہے ہیں" --- وہاب نے کہا --- "جالندھر کے قریب ہی ایک گاؤں ہے"۔

"آپ جالندھر کیوں جا رہے ہیں؟" --- صغیر نے پوچھا۔

"سرحد پار کرنے کے لئے" --- وہاب نے جواب دیا --- "ہم سب نہیں' ڈاکٹر رشید کو پاکستان میں داخل کرنا ہے۔ آپ کو فرار کرا دیا تو ڈاکٹر رشید پر' اس کے خاندان پر اور پھر سارے محلے پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی"۔

"یہیں رہنے دو" --- صغیر نے آہستہ سے کہا --- "زیادہ بات نہ کرو۔ یہ لڑکی نہ سن لے"۔

"باہر آجاؤ خالدہ" --- ڈاکٹر رشید نے گاڑی کے قریب جا کر کہا --- "آؤ تمہیں

عجوبہ دکھاؤں"۔

صغیر نے گاڑی کی طرف دیکھا۔ گاڑی کے اندر ایک لڑکی کا سر ابھرا اور دوسرے ہی لمحے وہ گاڑی سے باہر آگئی۔ وہ گاڑی میں چھپی بیٹھی تھی۔

"اوہو! یہ تو وہ نرس خالدہ ہے"۔۔۔۔ صغیر نے حیرت زدگی کے لہجے میں کہا۔

"انہیں پہچانو خالدہ!"۔۔۔ ڈاکٹر رشید نے کہا۔۔۔ "یہ ہیں وہ مریض صغیر جنہیں ہم نے فرار کروایا تھا"۔

ڈاکٹر رشید نے خالدہ سے انگریزی میں کہا کہ وہ کوئی ایسی ویسی بات نہ کرے کیونکہ ساتھ ایک اجنبی اور غیر مذہب کی لڑکی ہے۔

"دلجیت کور!"۔۔۔ صغیر نے دلجیت کور کی طرف دیکھ کر کہا۔۔۔ "تم گاڑی میں بیٹھ جاؤ' یہ ہمیں اپنے ساتھ لے چلیں گے"۔

دلجیت کور گاڑی میں بیٹھ گئی۔ وہیل بدل کر وہ چاروں بھی صغیر کے ساتھ گاڑی سے کچھ الگ بیٹھ گئے تو حیرت کا اظہار کرنے لگے کہ کہاں ملاقات ہوگئی ہے۔ صغیر کے پاس انہیں سنانے کو بڑی لمبی کہانی تھی۔ ایسے ہی ڈاکٹر رشید اور اس کے دوستوں کی سنانے کو جو کہانی تھی وہ بھی کچھ کم لمبی نہیں تھیں۔ یہ تو کہیں آرام اطمینان سے بیٹھ کر سنی اور سنائی جاسکتی تھی۔ بہرحال یہ سب ایک ہی منزل کے مسافر تھے اور یہاں ان کی ملاقات ہوگئی تھی۔

"میں عالم فاضل نہیں ہوں"۔۔۔ صغیر نے کہا۔۔۔ "میں تو یہ سمجھا ہوں کہ انسان گناہوں سے توبہ کرلے اور اللہ کے راستے پر چل پڑے تو معجزے رُونما ہوجاتے ہیں۔ مجھ سے بڑا گناہ گار اور کون ہوگا۔ میں اپنے ملک کا غدار تھا لیکن جب یہ عہد کرلیا کہ واپس جاکر ملک کے غداروں کو گرفتار کرواؤں گا اور اپنی جان اپنے ملک پر قربان کردوں گا تو بلاشک و شبہ میری زندگی میں معجزے رُونما ہوئے۔ مجھ سے ایسی ایسی نیکیاں سرزد ہوئیں کہ میں خود حیران رہ گیا اور اللہ مجھے اس کا صلہ دیتا چلا آیا۔ یہ سکھ لڑکی میرے لئے ایک بڑا ہی سخت امتحان بن کر میرے راستے میں آئی۔ میں اس صبر آزما امتحان سے بھی کامیاب نکلا۔ اب یہ معجزہ نہیں تو اور کیا ہے کہ آپ مجھے مل گئے ہیں"۔

یہ تو لمبی باتیں تھیں جو انہیں ایک دوسرے سے کرنی تھیں' ان کے سامنے ایک اور مسئلہ آگیا تھا جسے طے کرلینا انہوں نے بہتر سمجھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ صغیر دلجیت کور کو

اس کے گھر لے جا رہا تھا اور اس کا گھر جس گاؤں میں تھا وہ جالندھر سے دور تو نہیں تھا لیکن چوہدری معراج کے گاؤں سے تین چار میل دور تھا۔ ڈاکٹر رشید اور اس کے دوستوں کو چوہدری معراج کے گاؤں جانا تھا۔ سوال یہ پیدا ہُوا کہ دلجیت کور اس کے گاؤں لے جاکر اس کے گھر والوں کے حوالے کردیا جائے اور صغیر ڈاکٹر رشید کی پارٹی کے ساتھ چوہدری معراج کے گاؤں چلا جائے۔

صغیر نے کہا اس طرح دلجیت کور کو چھوڑ کر آگے نکل گئے تو اس کے گھر والے اس سے پوچھیں گے کہ کس کے ساتھ واپس آئی ہو۔ اگر یہ سب لوگ دلجیت کور کے باپ وغیرہ سے مل کر آگے جائیں تو اس کا باپ اور بھائی وغیرہ انہیں روک سکتے ہیں یہ نہ معلوم ہو کہ تم کون لوگ ہو۔ اس طرح ہنگامہ بپا ہو جائے گا اور ان سب لوگوں کے پکڑے جانے کا خطرہ پیدا ہو جائے گا۔ یہ تو طے شدہ بات تھی کہ صغیر بھی ڈاکٹر رشید کے ساتھ چوہدری معراج کے گھر جائے گا اور ڈاکٹر رشید اور خالدہ کے ساتھ سرحد پار کرنے کی کوشش کرے گا.... آخر طے یہ ہُوا کہ پہلے صغیر اور دلجیت کور کو اس کے گاؤں کے باہر ڈراپ کریں گے پھر گاڑی چوہدری معراج کے گاؤں چلی جائے گی اور صغیر دلجیت کور کو اس کے گھر والوں کے سپرد کرکے اور انہیں ساری بات سنا کر کہ وہ اسے کہاں سے لایا ہے' اگلے روز چوہدری معراج کے گاؤں پہنچ جائے گا۔ اسے چوہدری معراج کے گاؤں کا نام بتا دیا گیا۔

دن کا پہلا پہر تھا۔ ان سب کی خواہش اور کوشش یہ تھی کہ منزل پر رات کے وقت پہنچیں یہ اتفاق تھا یا انہوں نے وقت کا حساب کچھ ایسا رکھا تھا کہ گاڑی کو اب رات کے دوران ہی کسی وقت منزل پر پہنچنا تھا۔ ٹائر تبدیل ہو چکا تھا۔ سب گاڑی میں بیٹھ گئے اور ڈاکٹر رشید نے گاڑی چلا دی۔

"صغیر صاحب!"۔۔۔ وہاب نے صغیر کے کان میں کہا۔۔۔ "یہ وہی گاڑی ہے جس سے آپ کو ہسپتال سے فرار کرایا گیا تھا"۔

"پھر یہ تو بابرکت گاڑی ہے"۔۔۔ صغیر نے کہا۔۔۔ "انشاء اللہ یہ اب بھی بابرکت ثابت ہوگی"۔

ڈاکٹر رشید نے گاڑی کی رفتار اور تیز کردی۔

میجر سمیع اور کیپٹن آصف نے میجر امتیاز کے گھر جا کر اسے وہ فون نمبر دیا جو لوسی نے واجدہ کو لکھوایا تھا اور واجدہ کی جذباتی کیفیت بھی اسی تفصیل سے سنائی اور پھر رخصت ہو گئے۔

میجر امتیاز آئی ایس آئی کا افسر تھا اور خاصا تجربہ حاصل کر چکا تھا۔ اس کے برعکس میجر سمیع اور کیپٹن آصف عثمان کے دوست تھے اور انہیں آئی ایس آئی کی تفتیش کے متعلق ذرا سا بھی تجربہ نہیں تھا۔ میجر امتیاز نے سوچا کہ یہ دونوں واجدہ کے جذبات سے متاثر ہو کر آئے ہیں اور یقینی سمجھ بیٹھے ہیں کہ واجدہ عملاً بھی عثمان کے خلاف یہی کرے گی جو اس نے کہا ہے۔ کہنے اور کرنے میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔

میجر امتیاز کو یہ خیال بھی آیا کہ جب کورٹ مارشل میں گواہی دینے کا وقت آیا تو عزیز رشتہ دار واجدہ کو گواہی دینے سے روک دیں گے اور واجدہ ان کی بات مان بھی لے گی۔ دراصل میجر امتیاز کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ کوئی بیوی اپنے خاوند کے اس قدر خلاف ہو سکتی ہے کہ اسے عمر قید یا سزائے موت تک دلوا دے گی۔ پھر یہ بھی قابل یقین نہیں لگتا تھا کہ کسی اَپر کلاس اور جاگیردار کلاس میں کوئی ایسا فرد بھی ہے جو اس قسم کا قومی جذبہ رکھتا ہو۔ شاید ہی کوئی عورت ہو گی جو ملک پر اپنا سہاگ قربان کر دے گی۔ ذاتی طور پر واجدہ کو غصہ آ گیا ہو گا کہ اس کے خاوند نے اسے دھوکے میں رکھا تھا اور ایک خوبصورت لڑکی کے ساتھ تعلقات استوار کر رکھے تھے۔

میجر امتیاز کے لئے ضروری ہو گیا تھا کہ وہ خود واجدہ سے ملے اور خود اندازہ کرے کہ واجدہ صرف جذباتی ہے یا اس کے جذبات کے پیچھے کوئی قومی جذبہ اور عزم بھی ہے یا نہیں۔ میجر امتیاز کو راولپنڈی جا کر آئی ایس آئی کے بالائی افسروں کو یہ رپورٹ دینی تھی۔ ان بڑے افسروں نے اس سے پوچھنا ہی تھا کہ وہ اس خاتون سے خود بھی ملا ہے یا نہیں یا دوسروں کی زبانی سن کر آ گیا ہے.... میجر امتیاز کے پاس میجر عثمان کے گھر کا فون نمبر لکھا ہوا تھا۔ اس نے یہ نمبر ملایا اور ادھر سے واجدہ نے ہیلو کہا۔ اس سے پہلے دو تین مرتبہ رسمی طور پر میجر امتیاز واجدہ سے مل چکا تھا او یہ ملاقاتیں سلام دعا اور خیریت پوچھنے تک ہی محدود رہی تھیں۔

"معافی چاہتا ہو مسز عثمان!" ——— میجر امتیاز نے کہا ——— "آپ کو اس وقت ڈسٹرب کیا ہے۔ میجر امتیاز بول رہا ہوں۔ ابھی ابھی میجر سمیع اور کیپٹن آصف میرے پاس آئے

تھے اور ساری بات سنا گئے ہیں اور وہ فون نمبر بھی مجھے دے گئے ہیں۔ بات یہ ہے مسز عثمان! میرا تعلق آئی ایس آئی کے ساتھ ہے اور میں تفتیش کرنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ مجھے اجازت دیں گی کہ میں ابھی آپ کے پاس آ جاؤں؟ کچھ باتیں ذرا صاف کرنی ہیں"۔

"اجازت کی کیا ضرورت ہے میجر امتیاز صاحب!" ——— واجدہ نے کہا ——— "آپ سے مل کر تو مجھے دلی خوشی ہو گی۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ آ جائیں"۔

میجر امتیاز اسی وقت روانہ ہو گیا۔ جیپ نے اسے بڑی جلدی عثمان کے گھر پہنچا دیا۔ واجدہ اس کی منتظر تھی۔

"مسز عثمان!" ——— میجر امتیاز نے کاغذ کا چھوٹا سا ایک پُرزہ واجدہ کو دکھا کر پوچھا ——— "کیا یہ فون نمبر آپ کو لوسی نے لکھوایا تھا؟"

"بالکل اسی نے لکھوایا تھا" ——— واجدہ نے جواب دیا ——— "یہ نمبر تو مجھے زبانی یاد ہو گیا ہے"۔

میجر سمیع اور کیپٹن آصف نے میجر امتیاز کو واجدہ کی جو باتیں سنائی تھیں، ان کے مطابق میجر امتیاز واجدہ سے پوچھتا رہا اور واجدہ ہر واجدہ بات کی تصدیق کرتی چلی گئی۔ واجدہ کی آنکھیں صاف بتا رہی تھیں کہ وہ روتی رہی ہے۔ میجر امتیاز نے تمام باتوں کی تصدیق کر لی۔

"آپ کی حبُ الوطنی اور جذبۂ ایثار کی میں جتنی بھی تعریف کروں کم ہے مسز عثمان!" ——— میجر امتیاز نے کہا ——— "آپ نے اسلام کی عسکری روایات کو زندہ کر دیا ہے پھر بھی میں ایک بات کہنا چاہوں گا۔ کیا ایسا ٹھیک نہیں رہے گا کہ میں آپ کو راولپنڈی لے چلوں اور آپ عثمان کو اقبالِ جرم پر قائل کریں اور اسے کہیں کہ سارے رنگ کی نشاندہی کر دے"۔

"پھر کیا ہو گا؟" ——— واجدہ نے طنزیہ سے انداز سے پوچھا۔

"میجر عثمان کو سزا سے معافی مل جائے گی" ——— میجر امتیاز نے کہا ——— "یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ سروس میں ہی رہے"۔

"اور میں انڈیا کے ایک جاسوس کی بیوی بنی رہوں اور اس کی عزت کہلاتی رہوں!" ——— واجدہ نے طنزیہ لہجے میں کہا ——— "اور پاک آرمی اپنی آستین میں ایک سانپ کو پالتی رہے.... کیا میجر سمیع اور کیپٹن آصف نے آپ کو بتایا نہیں میں اپنا فیصلہ سنا چکی

ہوں میجر امتیاز صاحب! میں جو کہہ چکی ہوں اس پر قائم رہوں گی۔ یہ میرا فیصلہ نہیں، یہ میرے جذبے کا عزم ہے۔ میں کورٹ مارشل میں گواہی دوں گی اور عثمان کے خلاف یہ جرم ثابت کرنے کی پوری کوشش کروں گی"۔

میجر امتیاز نے گھڑی دیکھی۔ ایک گھنٹہ گزر گیا تھا۔ اس نے واجدہ سے ہر وہ بات پوچھ لی تھی جو وہ پوچھنا ضروری سمجھتا تھا۔ اس نے محسوس کرلیا تھا کہ یہ عورت جو کہہ رہی ہے اس سے ٹلے گی نہیں لیکن اس نے ضروری سمجھا کہ واجدہ کو قانون کی ایک جھلک دکھا دے۔

"مسز عثمان!"—— میجر امتیاز نے کہا —— "میں آپ کو بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ نے اس کے دوران کسی بھی مقام پر یہ فیصلہ کرلیا کہ آپ عثمان کے خلاف نہیں بولیں گی اور کورٹ مارشل میں گواہی نہیں دیں گی یا حقائق کو چھپا کر غلط باتیں زبان سے نکالیں گیں تو یہ ایک جرم ہوگا۔ جرم یہ کہ آپ شہادت کو چھپا کر قانون کو دھوکہ دے رہی ہیں۔ یہ ذہن میں رکھیں کہ کیس جاسوسی اور تخریب کاری کا ہے۔ یہ کوئی عام سی چوری چکاری یا جیب تراشی کی واردات نہیں کہ اس کے ملزم عدم ثبوت کی بنا پر بری ہو بھی گئے تو کوئی قیامت نہیں آجائے گی۔ یہ بھی ذہن میں رکھ لیں کہ آپ کے الفاظ آپ کے ہی خلاف استعمال ہو سکتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کورٹ مارشل کے وقت آپ کو آپ کے بزرگ اور دیگر رشتہ دار گواہی دینے سے روک دیں اور آپ ان کی یہ بات مان لیں کہ آپ گواہی دیں گی اور سچ چھپا کر رکھیں گی"۔

واجدہ نے فوری طور پر کچھ بھی نہ کہا۔ اس کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ آگئی جس میں مسرّت کی بجائے تلخی کا زہر صاف نظر آرہا تھا۔

"آپ مطمئن رہیں!"—— واجدہ نے کہا اور آہ لے کر بولی —— "میں آپ کے قانون کی پابند نہیں، میں اللہ کے آگے جواب دہ ہوں۔ آپ انکوائری جاری رکھیں اور جہاں میری ضرورت محسوس ہو مجھے بلائیں، فوراً پہنچوں گی اور پورا تعاون کروں گی"۔

میجر امتیاز واجدہ کا شکریہ ادا کرکے رخصت ہوگیا۔

○

اگلے روز میجر امتیاز راولپنڈی آئی ایس آئی کے ہیڈ کوارٹر میں بریگیڈیر کے آفس میں بیٹھا یہ ساری رپورٹ دے رہا تھا۔ اس نے میجر سمیع اور کیپٹن آصف کا ذکر خاص

طور پر کیا تھا اور کہا تھا کہ اس نے میجر عثمان کی گرفتاری کی اطلاع انہیں دے دی تھی جو نہیں دینی چاہئے تھی لیکن اس نے یہ سوچ کر یہ راز انہیں دے دیا تھا کہ ان سے کام کی کوئی بات معلوم ہوجائے گی۔ یہ خطرہ مول لینے کا نتیجہ اچھا ہی نکلا۔

بریگیڈیر بہت خوش تھا کہ لوسی کا فون نمبر مل گیا ہے لیکن اس میں اس نے شک کا اظہار کیا کہ انڈیا کے جاسوس اور ان کے رِنگ لیڈر اتنے کچے نہیں ہوتے کہ اپنے ٹھکانے کا فون نمبر دے دیں۔ بہر حال اس نمبر کے ایڈریس کو چیک کرنا ہی تھا۔

"یہ شک مجھے بھی ہے سر!"—— میجر امتیاز نے کہا —— "لیکن لوسی نے واجدہ کے ساتھ اس نمبر پر بات کی ہے.... میں ایک اور پہلو دیکھ رہا ہوں سر! لوسی نے اگر بالکل صحیح فون نمبر دیا ہے تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عثمان بڑا ہی دانشمند اور تجربہ کار جاسوس تھا۔ اس نے اپنی بیوی کو ایسی استادی سے بیوقوف بنا رکھا تھا کہ اسے بیوی کی طرف سے کسی رکاوٹ کا ذرا سا بھی خطرہ نہیں رہا تھا۔ اُدھر اپنے رِنگ لیڈر پر عثمان نے ایسا اعتماد قائم کر رکھا تھا کہ اس نے لوسی کو اجازت دے دی ہوگی کہ وہ عثمان کی بیوی کو اپنا فون نمبر دے دے۔ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ میجر عثمان اس رِنگ کا ایک اہم اور قابلِ اعتماد ممبر تھا"۔

بریگیڈیر نے میجر جنرل کو اس کے آفس میں جاکر رپورٹ دی اور تھوڑی دیر بعد میجر جنرل نے میجر امتیاز کو بلا لیا۔ میجر امتیاز کو یہ ساری کہانی ایک بار پھر سنانی پڑی۔ میجر جنرل نے اپنی جرح کی اور کچھ شکوک رفع کرلئے۔ فیصلہ ہُوا کہ کراچی جاکر اس فون نمبر کا ایڈریس معلوم کیا جائے۔ اگر یہ کسی گھر کا نمبر ہے تو وہاں اپنے انفارمر مقرر کئے جائیں جو رات دن دیکھیں اور صحیح رپورٹ دیں کہ وہاں کون رہتا ہے، رہنے والے کس قسم کے لوگ ہیں وغیرہ۔ یہ آئی ایس آئی کی سراغ رسانی کا معاملہ تھا جس کے کچھ خفیہ طور طریقے تھے۔

سوال یہ پیدا ہُوا کہ لوسی کی شناخت کس طرح ہوگی۔ یہ گھر مشکوک ہونے کی صورت میں وہاں چھاپہ تو مارنا ہی تھا اور اس کے اندر موجود افراد کو پکڑنا اور تفتیش کرنی تھی لیکن یہ معلوم کرنا ضروری تھا کہ کوئی جواں سال لڑکی یا لڑکیاں پکڑی جائیں تو کون بتائے گا کہ ان میں لوسی کون ہے۔ لوسی کو واجدہ نے دیکھا تھا اور کراچی اس سے ملتی ملاتی رہتی تھی۔ وہی لوسی کی شناخت کرسکتی تھی لیکن سوچنا یہ تھا کہ واجدہ کو کراچی لے

جایا جائے یا نہیں۔

میجر امتیاز کو معلوم تھا کہ واجدہ کے دو بھائیوں نے لوسی کو اغوا کیا تھا۔ انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ جس لڑکی کو انہوں نے اغوا کیا ہے وہ لوسی ہے یا اس کا نام کچھ اور تھا۔ لوسی کے اغوا میں میجر سمیع اور کیپٹن آصف نے بھی رول ادا کیا تھا۔ لوسی نے قید میں اپنا جادو چلایا اور واجدہ کے بھائیوں کے نوکر کو ورغلا کر فرار ہو گئی اور نوکر کو قتل کروا دیا تھا۔ یہ تو کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ نوکر کو لوسی نے قتل کروا دیا تھا' یہ امر یقینی تھا کہ واجدہ اور اس کے بھائی اس لڑکی کو پہچانتے ہیں۔

میجر امتیاز نے میجر جنرل کو یہ بات بتائی تو میجر جنرل نے یہ کام میجر امتیاز کو ہی سونپ دیا کہ لاہور جا کر معلوم کرے کہ واجدہ کے بھائی لوسی کو پہچانتے ہیں یا نہیں۔ اگر وہ اسے پہچانتے ہیں تو دونوں کو کراچی لے جایا جائے اور سرکاری اخراجات پر انہیں وہاں رکھا جائے اور اگر چھاپے میں لوسی پکڑی جاتی ہے تو دونوں بھائی تصدیق کر دیں کہ یہی لوسی ہے یا یہ کہہ دیں کہ یہ وہ لڑکی نہیں۔ لوسی کی جھلک تو میجر سمیع اور کیپٹن آصف نے بھی دیکھی تھی۔

میجر جنرل نے اسی وقت بریگیڈیر کے ساتھ مشورہ کر کے ایک پارٹی ترتیب دے دی۔ اس میں ایک کرنل' ایک میجر اور چھ افراد چھوٹے عہدوں کے تھے۔ ضرورت کے تحت اس پارٹی کو کراچی سے مدد لینی تھی۔

میجر امتیاز کو معلوم تھا کہ اسے کراچی کہاں پہنچنا ہے۔

○

بہن بھائیوں میں تو قدرتی طور پر محبت ہوتی ہے لیکن واجدہ کے ساتھ دونوں بھائیوں کی محبت کچھ زیادہ ہی تھی۔ واجدہ تو بھائیوں پر اپنی جان بھی نثار کرنے پر تیار رہتی تھی۔ میجر سمیع اور کیپٹن آصف نے واجدہ کو عثمان کی گرفتاری کی خبر سنا کر کہا تھا کہ ابھی وہ کسی اور کو نہ بتائے لیکن واجدہ سے رہا نہ گیا۔ وہ اس صورتِ حال میں اپنے آپ کو تنہا سمجھنے لگی تھی۔ بار بار اس کا دھیان بھائیوں کی طرف جاتا تھا۔ رات میجر امتیاز اس کے پاس آیا' ساری باتیں ہوئیں اور جب میجر امتیاز چلا گیا تو واجدہ سونے کے لئے لیٹ گئی لیکن اس نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ سو نہیں سکے گی۔ کبھی تو اس کے آنسو بہہ نکلتے اور کبھی وہ اپنے خون میں جوش سا محسوس کرتی اور اٹھ کر بیٹھ جاتی۔

وہ آخر انسان تھی اور عورت تھی' بیوی بھی تھی ماں بھی تھی۔ بچے ابھی بہت ٹے تھے۔ اسے رہ رہ عثمان کا خیال آتا اور یہ بھی یاد آتا کہ اس شخص کو اس نے روح ہرائیوں سے چاہا تھا۔ ابتدا میں عثمان نے بھی واجدہ کو بھرپور محبت دی تھی اور اس کا یار یوں کیا کہ اسے واجدہ کی بجائے وینا کہا کرتا تھا۔ اس رات واجدہ کو عثمان کا خیال آتا س کا سینہ یوں پھٹنے پر آ جاتا تھا جیسے آتش فشاں پہاڑ کے اندر لاوا بہہ نکلنے کے لئے اُبل ہو۔ پلنگ پر لیٹے لیٹے اسے یوں لگا جیسے کسی نے اٹھا کر اسے کانٹوں پر پھینک دیا ہو۔ وہ اٹھ ڑی ہوئی اور ساتھ والے پلنگ پر سوئے ہوئے دونوں بچوں کو دیکھنے لگی۔

دیکھتے دیکھتے اس کا صبر اور حوصلہ یوں ہل گیا جیسے زلزلے کا شدید جھٹکا آیا ہو۔ بچوں کے متعلق اسے کچھ منفی خیال آنے لگے۔ انسان کا جب ذہن اور دل تھک کر شل ہو جاتے ہیں تو مدافعت کی ساری قوّت جواب دے جاتی ہے۔ ایسے میں ذہن میں صرف فی خیال ہی آتے ہیں۔ عثمان کے بغیر اس کے بچوں کا مستقبل تاریک نہیں ہو سکتا تھا' وہ امیر کبیر خاندان کی بیٹی تھی لیکن اسے یقین ہو چلا تھا کہ عثمان نہ ہُوا تو اس کے بچے تباہ ہو جائیں گے۔ واجدہ کا قومی جذبہ تو اپنی جگہ تھا ہی مگر اس کے جذبات میں جو زلزلے آ رہے تھے' ان کے سامنے وہ بے بس اور مجبور ہوئی جا رہی تھی۔ عثمان نے اپنے ملک اور اپنی قوم کے ساتھ یہ غداری نہیں کی تھی بلکہ اس نے واجدہ کے جذبات کو کُند چھری سے ذبح کر دیا تھا۔

پھر وہ ایک اور ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو گئی۔ اس کے ذہن میں یہ سوال اٹھا کہ وہ مان سے ذاتی سطح پر انتقام لینا چاہتی ہے یا اسے قوم کا دشمن سمجھ کر کیفر کردار تک پہنچانا ہتی ہے۔ وہ اس کشمکش میں الجھ گئی اور کچھ دیر بعد یوں محسوس کرنے لگی جیسے وہ سیلابی ریا میں بہتے بہتے بھنور میں آ گئی ہو اور ایک ہی جگہ لٹو کی طرح گھوم رہی ہو۔ رات کا آخری پہر تھا جب وہ کچھ سوچنے سے بھی معذور ہو گئی۔ کچھ دیر نیند آ جاتی تو دماغ میں زتی آ جاتی لیکن وہاں نیند کی بجائے زہرناک تلخیاں تھیں جو اس کی برداشت سے باہر گئی تھیں۔

اسے کی فجر اذان سنائی دی۔ وہ تھوڑی ہی دیر پہلے پلنگ پر بیٹھی اور کچھ دیر بعد لیٹ ئی تھی' اذان کی مقدس صدا پر تیزی سے اٹھی اور باتھ روم میں چلی گئی۔ نہا کر کپڑے لے اور مصلّے پر کھڑی ہو گئی۔ آنسوؤں کی روانی میں اللہ کے حضور رکوع و سجود کئے اور

جب دعا کے لئے ہاتھ پھیلائے تو بار بار یہی الفاظ منہ سے نکلے 'یا اللہ' میری رہنمائی کر اور مجھے ہمت و استقلال دے' میرے دماغ کو اپنے نور سے منّور کردے کہ میں کوئی غلط اقدام نہ کر بیٹھوں۔

خدا خدا کر کے رات گزر گئی اور سورج طلوع ہُوا۔ واجدہ کے بچے جاگ اٹھے تھے۔ ان کے لئے ناشتہ تیار کرنے سے پہلے اس نے بڑے بھائی کو فون کیا۔ بھائی بولا تو واجدہ نے کہا کہ دونوں بھائی جلدی اس کے پاس آجائیں۔ بھائی پوچھ رہا تھا کہ کوئی خاص بات ہوگئی ہے' واجدہ اسے اصل بات فون پر بتانا نہیں چاہتی تھی' اتنا ہی کہا کہ یہاں آئیں تو بتاؤں گی.... دونوں بھائی گاڑی میں تھوڑی ہی دیر بعد آن پہنچے۔

"عثمان کو آئی ایس آئی نے گرفتار کرلیا ہے"۔۔۔۔ واجدہ نے بھائیوں سے کہا۔۔۔۔ "وہ راولپنڈی آئی ایس آئی کے سیل میں بند ہے۔ مجھے یہ اطلاع سرکاری طور پر نہیں دی گئی بلکہ میجر سمیع اور کیپٹن آصف بتانے آئے تھے اور انہوں نے خاص طور پر کہا تھا کہ یہ خبر ابھی کسی اور تک نہ پہنچے لیکن میں نے آپ دونوں کو بتانا ضروری سمجھا۔ آپ ابھی امّی اور ابّا جان کو نہ بتائیں"۔

"ایسی فریب کاری؟"۔۔۔۔ بڑے بھائی نے حیرت زدگی کے لہجے میں کہا۔۔۔۔ "ہم تو خوش تھے کہ وہ واپس شریفانہ زندگی میں آگیا ہے"۔

"اس نے تو ہم سب کو اُلّو بنائے رکھا ہے"۔۔۔۔ دوسرے بھائی نے کہا۔۔۔۔ "اب ہمیں یہ سوچنا ہے کہ ہمارا رویّہ کیا ہو اور ہم پر کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے"۔

"میں یہ فیصلہ کرچکی ہوں"۔۔۔۔ واجدہ نے کہا۔۔۔۔ "یہ میں آپ کو بتادینا ضروری سمجھتی ہوں۔ میں عثمان کو زیادہ سے زیادہ سزا دلواؤں گی"۔

واجدہ نے وہی باتیں بھائیوں کے ساتھ کیں جو وہ گزشتہ رات میجر سمیع' کیپٹن آصف اور پھر میجر امتیاز کے ساتھ کرچکی تھی۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اسے لوسی کا فون نمبر مل گیا تھا جو اس نے میجر امتیاز تک پہنچادیا ہے۔

"سوچ لو واجدہ!"۔۔۔۔ بڑے بھائی نے کہا۔۔۔۔ "رشتہ داری دیکھ لو کیسی نازک ہے' پھر یہ دیکھو لو کہ عثمان کا باپ اور اس کے بھائی کوئی شریف لوگ نہیں' وہ بدمعاشی پر اتر سکتے ہیں۔ تم نے عثمان کے خلاف زبان کھولی تو وہ کبھی تمہیں معاف نہیں کریں گے کوئی نہ کوئی انتقامی کارروائی ضرور کریں گے"۔

"کیا آپ ان کا مقابلہ نہیں کرسکتے؟"۔۔۔۔ واجدہ نے پوچھا۔

"کیوں نہیں کرسکتے!"۔۔۔۔ دوسرے بھائی نے کہا۔۔۔۔ "اگر تم ثابت قدم رہو تو ہم پورا مقابلہ کریں گے"۔

دونوں بھائیوں کے سوچنے کا انداز اور جذبہ ویسا ہی تھا جیسا واجدہ کا تھا لیکن بھائی ذرا محتاط رہنے کی بات کرتے تھے۔ وہ کوئی گئے گزرے آدمی نہیں تھے۔ انہوں نے تو لوسی کو ایک بار اغوا کرلیا تھا۔

"اس شخص کو اب جیل میں ہی گلنا سڑنا چاہئے"۔۔۔۔ چھوٹے بھائی نے کہا۔۔۔۔ "ہم جہاں تک برداشت کرسکتے تھے کرتے رہے۔ ہم خاموش تماشائی تو بن نہیں سکتے"۔

واجدہ اور اس کے بھائیوں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ سرکاری طور پر اطلاع ملنے تک خاموش رہیں۔

وہ دن گزر گیا پھر اگلا دن بھی گزر گیا اور رات کو واجدہ کے بڑے بھائی کو میجر امتیاز کا فون ملا۔ میجر امتیاز اسے ملنا چاہتا تھا۔ واجدہ کے بھائی نے اسے اسی وقت بلا لیا۔ امتیاز فوراً وہاں پہنچا اور جب اس نے یہ خبر سنائی کہ میجر عثمان گرفتار کرلیا گیا ہے تو واجدہ کے بھائیوں نے یہ خبر یوں سنی جیسے پہلی بار سن رہے ہوں۔ میجر امتیاز نے کہا کہ وہ انہیں اپنے ساتھ کراچی لے جانا چاہتا ہے تاکہ لوسی گرفتار ہو جائے تو کوئی یہ تصدیق کرنے والا کہ یہی وہ لڑکی ہے جس نے میجر عثمان کو اپنے جال میں لے رکھا تھا۔

دونوں بھائیوں نے ذرا سی بھی پس و پیش نہ کی اور کراچی جانے کے لئے تیار ہوگئے۔ میجر امتیاز نے انہیں کہا کہ انہیں سرکاری اخراجات پر لے جایا جائے گا اور وہاں وہ سرکاری اخراجات پر ہی قیام کریں گے۔

"نہیں میجر امتیاز صاحب!"۔۔۔۔ واجدہ کے بڑے بھائی نے کہا۔۔۔۔ "ہم اپنے اخراجات پر ہی جائیں گے اور وہاں جتنے دن بھی قیام کرنا پڑا' اپنی جیب سے خرچ کریں گے۔ یہ ملک ہمارا اپنا ہے اور سوال ملک کی سلامتی اور دفاع کا ہے"۔

سفید سوزوکی بڑی تیز رفتاری سے جالندھر کی طرف جانے والی سڑک پر دوڑی جا رہی تھی۔ اس گاڑی کے مسافر سوائے دلجیت کور کے ایک ہی منزل کے مسافر تھے۔ ان کی سوچیں ایک اور ان کا عزم ایک تھا۔ ان کے خیالات مجاہدانہ تھے اور وہ اللہ کی راہ پر بہت بڑا خطرہ مول لینے جا رہے تھے۔ وہ نتائج سے بے خبر نہیں تھے۔

وہ تھے تو مسلمان اور ان کا ایمان تھا کہ جب اللہ چاہتا ہے فلاں کام ہو جائے تو اس کی ذاتِ باری حکم دیتی ہے' ہو جا اور وہ کام ہو جاتا ہے لیکن سوزوکی کے یہ سب مسافر اپنے اپنے طور پر حیران ہوئے جا رہے تھے کہ اللہ نے انہیں کس طرح اور کہاں آن ملایا ہے بچھڑے ہوئے راہی ایک دوراہے پر مل گئے تھے۔ یہ اللہ کی منظوری کے بغیر ممکن نہیں تھا۔

ان کے لئے بدمزگی یہ پیدا ہو گئی تھی کہ دلجیت کور کی موجودگی میں وہ آپس میں وہ باتیں کر ہی نہیں سکتے تھے جو کرنے اور سننے کے لئے سب بُری طرح بے تاب ہوئے جا رہے تھے۔

”سادھو مہاراج!“ — اشتیاق نے صغیر سے پوچھا — ”کہاں سے آ رہے ہو اور کہاں کا ارادہ ہے“۔

صغیر نے انگریزی میں کہا — ”جہنّم سے نکل کر آ رہا ہوں اور اپنی جنّت کی طرف جا رہا ہوں .... بہتر ہے اور کچھ نہ پوچھیں' اگر کوئی خاص بات کرنی اور پوچھنی ہے تو انگریزی میں پوچھ لینا۔ یہ لڑکی بالکل ان پڑھ ہے۔ یہ بھی خیال رکھنا کہ اپنے ملک کا نام زبان پر نہ آئے“۔

”کوئی اور بات کرو بھائیو“ — ڈاکٹر شبیر نے انگریزی میں کہا — ”چوہدری معراج

کے گھر پہنچ جائیں تو ان سے ان کی کہانی سنیں گے اور پھر انہیں اپنی سنائیں گے“۔

دلجیت کور کی ان لوگوں کی طرف توجہ تھی ہی نہیں۔ خالدہ اس کی تقریباً ہم عمر ہی تھی' یہ قدرتی امر تھا کہ وہ خالدہ کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گئی تھی۔ خالدہ بڑی شگفتگی اور اپنائیت سے اس کے ساتھ ہمکلام تھی۔ دونوں لڑکیاں اپنے اپنے متعلق جھوٹ بول رہی تھیں۔ دلجیت کور کے منہ سے اپنے متعلق یہ سچ نکل گیا تھا کہ وہ سکھ ہے۔ خالدہ نے صغیر کی طرف اشارہ کر کے کہ پوچھا کہ یہ اس کا کچھ لگتا ہے یا کسی اور وجہ سے اس کے ساتھ جا رہی ہے!.... دلجیت کور نے جواب دیا کہ یہ اس کا خاوند ہے۔

خالدہ نے کہا کہ ان کا حلیہ سکھوں والا تو ہے ہی نہیں۔ بال بے شک لمبے ہیں لیکن پوری طرح لمبے نہیں اور سر پر سکھوں کی طرح پگڑی بھی نہیں' ان کی داڑھی بھی پوری طرح لمبی نہیں.... دلجیت کور نے حاضر دماغی کا نہایت اچھا مظاہرہ کیا۔

اس نے کہا کہ اس کے خاوند کو کوئی ایسی نامراد بیماری لگ گئی تھی کہ سر اور داڑھی کے بال جھڑ ہی گئے تھے۔ بہت علاج کروایا لیکن ذرا سا فائدہ نہیں ہو رہا تھا۔ آخر اس علاقے کے ایک حکیم کی شہرت سنی تو اس کے پاس چلے آئے۔

دلجیت کور نے اس علاقے کے کسی گاؤں کا نام لے کر کہا کہ سات آٹھ مہینے گزرے اس حکیم کے پاس آئے تھے اور اس کے علاج کا خاطر خواہ اثر ہوا اور بال اُگنے شروع ہو گئے۔ اس نے کہا کہ حکیم نے سختی سے منع کر رکھا ہے کہ ابھی کچھ عرصہ اور یہ پگڑی نہ باندھے اور بال کھلے رہنے دے۔ اب وہ دونوں پھر حکیم کے پاس آئے تھے اور حکیم نے کہا ہے کہ اب دوائی کی ضرورت نہیں' پرہیز لازمی ہے۔

”ناراض نہ ہونا“ — خالدہ نے کہا — ”میں تم سے کوئی بھید لینے کی کوشش نہیں کر رہی نہ مجھے تم دونوں پر کوئی شک ہے' ویسے ہی اپنی دلچسپی کی خاطر پوچھ رہی ہوں۔ انہوں نے جو کپڑے پہن رکھے ہیں یہ سادھوؤں جیسے ہیں اور گلے میں جو مالا ہے یہ بھی سادھوؤں کے گلے میں ہوتی ہے“۔

”اس میں ناراضگی کی اور شک شبے کی کوئی بات نہیں“ — دلجیت کور نے کہا — ”اپنے ایک گرنتھی بابا نے انہیں کہا تھا کہ اپنا حلیہ ہندو سادھوؤں جیسا یا مسلمان فقیروں جیسا کر لو اور ایسی سادگی میں رہو کہ پرمیشور تم پر راضی رہے۔ یہ بے چارے اس بیماری سے اتنے تنگ آ گئے تھے کہ اپنا یہ حلیہ بنا لیا جو تھوڑا عرصہ اور چلے گا“ — دلجیت کور

نے ہنستے ہوئے کہا۔۔۔"میں نے انہیں کہا تھا کہ آؤ مسلمان ہو جاتے ہیں اور داڑھی اور سر کے اتنے لمبے لمبے بالوں سے چھٹکارا مل جائے گا"۔

"سکھ تم دونوں کو مسلمان ہوتے ہی قتل کر دیں گے" ۔۔۔ خالدہ نے کہا۔

"یہ تو میں نے انہیں مذاق کے رنگ میں کہا تھا"۔۔۔ دلجیت کور نے کہا۔۔۔"یہ تو مجھے بھی معلوم ہے کہ سکھ ہم دونوں کو کبھی زندہ نہ چھوڑیں گے"۔

صغیر نے ان ساتھیوں سے انگریزی میں پوچھا کہ جالندھر کو بڑی سڑک جاتی ہے، وہ اس چھوٹی سڑک پر کیوں آ گئے ہیں؟.... اسے بتایا گیا کہ یہ ایک احتیاط کی ہے کیونکہ بڑی سڑک پر کسی کی نظر میں آنے کا خطرہ تھا۔

○

اپنی خواہش اور کوشش کے عین مطابق گاڑی رات ساڑھے آٹھ اور نو بجے کے درمیان جالندھر کے مضافات میں داخل ہوئی۔ صغیر ڈاکٹر رشید کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے پیچھے مُڑ کر دلجیت کور سے کہا کہ اپنے گاؤں کا راستہ بتاؤ، یہ صاحب ہمیں وہاں تک پہنچا دیں گے۔

اس بات پر دلجیت کور کھسیانی سی ہو گئی لیکن لڑکی کا دماغ حاضر تھا، کہنے لگی ۔۔۔ "اگر تم اپنے گاؤں کا راستہ بھول گئے ہو تو میں ہی بتا دیتی ہوں"۔

صغیر بھی کچھ کم ذہین نہ تھا۔ وہ ہنس پڑا اور سوچ یہ آئی کہ دلجیت کور نے خالدہ کو اپنے متعلق کچھ اور ہی بتایا ہو گا۔ اس سوچ سے صغیر چپ رہا۔ دلجیت کور نے راستہ بتا دیا اور اس کے مطابق ڈاکٹر رشید نے گاڑی شہر کے اندر لے جانے کی بجائے بائیں طرف یعنی دیہاتی علاقے کی طرف موڑ لی۔ وہ تھی تو سڑک ہی لیکن ایسی خستہ حال کہ سوزوکی کار اچھلنے کودنے لگی۔

یوں ہی اچھلتے کودتے اور دلجیت کور کی رہنمائی میں دائیں بائیں مُڑتے گاڑی ایسے مقام پر پہنچ گئی جہاں دلجیت کور نے کہا کہ وہ سامنے ہمارا گاؤں ہے.... رات تاریک تھی لیکن گاؤں کا ہیولہ نظر آتا تھا۔ صغیر نے گاڑی وہیں رکوا لی کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے ساتھی بھی گاؤں تک جائیں ورنہ دلجیت کور کے گھر والے ضرور پوچھتے کہ یہ اتنے زیادہ لوگ کون ہیں جو دلجیت کور کو ساتھ لائے ہیں۔ ڈاکٹر رشید اور اس کے دوستوں کے لئے بہت بڑا خطرہ پیدا ہو سکتا تھا۔

صغیر نے دلجیت کور کو گاڑی سے اتارا اور پھر اس نے ڈاکٹر رشید اور اس کے دوستوں کا شکریہ بڑے پُر تکلف انداز میں کیا اور سادھوؤں کی طرح کہا ۔۔۔"جا بچے، تیری ہر مشکل آسان ہو گی اور سیلاب تجھے راستہ دیں گے، تیری یہ گاڑی ہوائی جہاز کی طرح اُڑے گی"۔

صغیر اور دلجیت کور تو گاؤں کی طرف چل پڑے اور ڈاکٹر رشید نے گاڑی پیچھے موڑ لی اور گاڑی اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئی۔

"یہ تو کوئی بڑے ہی اچھے لوگ تھے"۔۔۔ دلجیت کور نے کہا۔۔۔"مسلمان ہوتے ہی اچھے ہیں۔ ہمیں گاڑی میں نہ بٹھاتے تو ہم ان کا کیا بگاڑ سکتے تھے۔ یہ تو ہمیں گھر چھوڑ گئے ہیں اور اپنا سفر لمبا کر لیا ہے.... میں ویسے ہی تو نہیں کہتی کہ مجھے مسلمان اچھے لگتے ہیں۔ تم بھی تو مسلمان ہی ہو۔ میری بات کیوں نہیں مانتے کہ مجھے اپنے ساتھ پاکستان لے چلو"۔

"پھر وہی بات!"۔۔۔ صغیر نے رک رک کر کہا۔۔۔"سب سے پہلے اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں سے ملو"۔

صغیر نے یہ بات رک رک کر کہی تھی۔ دلجیت کور نے بے اختیار اپنے بازو صغیر کے گلے میں ڈال دیئے اور اسے اپنے ساتھ لگا کر اپنا گال اس کے ایک گال سے ملنے اور دبانے لگی۔ جذبات کو قابو میں رکھنا اس کے لئے ممکن نہیں رہا تھا۔ اس کی سسکیاں نکلنے لگیں۔ صغیر نے بڑی مشکل سے اسے الگ کیا۔

"ماں باپ اور سب تو مل جائیں گے"۔۔۔ دلجیت کور نے کہا۔۔۔"باقی عمر انہی کے ساتھ گزرے گی لیکن تم پھر کبھی نہیں ملو گے"۔

صغیر اس کے جذبات کو سمجھتا تھا۔ پہلے وہ اسے بہت کچھ کہہ چکا تھا جو ایک بار پھر کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ صغیر کچھ کہے بغیر چل پڑا اور دلجیت کور اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگی پھر اس کے ایک پہلو کے ساتھ ہو گئی اور صغیر کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ دلجیت کور صغیر کا ہاتھ پکڑے ہوئے گاؤں کی ایک گلی میں داخل ہوئی۔ نو بجے کے بعد کا وقت تھا۔ یہ کسانوں اور اسی کلاس کے لوگوں کا گاؤں تھا جو شام کا کھانا کھانے کے فوراً بعد سو جایا کرتے تھے۔ گاؤں پر خاموشی طاری تھی اور تھوڑے تھوڑے وقفے بعد کوئی ایک کُتا بھونکتا تو دو تین اور کُتے جہاں جہاں تھے، بھونکنے

لگتے تھے اور رات پھر خاموش ہو جاتی تھی۔

دلجیت کور دو تین گلیاں مڑی اور ایک مکان کے بند دروازے کے سامنے جا رکی۔ اس طرف گلی کشادہ تھی اور ایسی ہی کشادہ گلی مکان کے پچھواڑے سے گزرتی تھی۔ دلجیت کور نے دروازے پر زور سے ہاتھ مارا۔

ذرا ہی دیر بعد اندر سے کوئی آدمی یہ کہتا ہوا آ رہا تھا' کون ہے بھائی' تجھے کون سا وقت ملا ہے' اتنی گہری نیند سے جگا دیا ہے.... دروازہ کھلا تو اس نے پوچھا کون ہو بھائی!

"دلجیت ہوں بھائیا!" ——دلجیت کور نے کہا۔

"دلجیت کور؟" ——دلجیت کور کے بڑے بھائی نے حیرت زدگی کے لہجے میں پوچھا —— "کیا تو مر نہیں گئی تھی؟ کہاں سے آ گئی ہو؟"

دلجیت کور بے تابی سے اپنے بڑے بھائی کے گلے لگ گئی اور بھائی نے اسے اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا۔ اندر سے کسی عورت کی آواز آئی کہ یہ کون ہے۔ دلجیت کور کے بھائی نے بڑی ہی بلند آواز سے جواب دیا کہ دلجیت کور آ گئی ہے۔

اندر سے دوڑتے قدموں کی آہٹیں سنائی دینے لگیں اور ساتھ یہ آوازیں—

"دلجیت کور؟.... خواب تو نہیں دیکھ رہے؟.... کوئی اور ہو گی' دلجیت نہیں ہو سکتی... دلجیت کور.... دلجیت"۔

گھر کے بچے جوان اور بوڑھے باہر نکل آئے۔ دلجیت ایک کے بازوؤں سے نکلتی تھی تو کسی اور کے بازوؤں کے شکنجے میں آ جاتی تھی۔ دلجیت کا یوں آ نکلنا خلاف توقع تھا بلکہ ایک معجزہ تھا۔ موسم گرمی کا تھا اس لئے لوگ چھتوں پر یا صحنوں میں سوئے ہوئے تھے۔ دلجیت کور کے لواحقین کی آوازیں اتنی بلند تھیں کہ پڑوسی بھی جاگ اٹھے اور دیکھتے ہی دیکھتے دلجیت کور کے دروازے پر ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا جو بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

دو اڑھائی سال پہلے دلجیت کور کی گمشدگی نے اس گاؤں میں کئی ایک کہانیوں کو جنم دیا تھا۔ دلجیت کور چلبلی' شوخ' ذہین اور خاص طور پر خوبصورت لڑکی تھی۔ سکھوں میں تو ویسے بھی کردار اور گفتار میں ذرا سا بھی تکلف نہیں برتا جاتا تھا۔ بے حجابی اور جو منہ میں آئے کہہ گزرنا سکھوں کے دو نمایاں اوصاف تھے۔ دلجیت کور کے چاہنے والوں اور اس پر ڈورے ڈالنے والوں کی کمی نہیں تھی لیکن دلجیت کور کسی کو پلے نہیں باندھتی تھی بلکہ بعض کا وہ مذاق اڑایا کرتی تھی۔

ایک روز گاؤں کو اس خبر نے زلزلے کی طرح ہلا ڈالا کہ دلجیت کور لاپتہ ہو گئی تقریباً" ہر کسی کی زبان پر سب سے پہلے یہ بات آئی کہ اپنے کسی خفیہ یار کے ساتھ ل گئی ہے۔ اس کے بعد جس کا دماغ جس طرف چل نکلا اس نے اپنی ہی ایک کہانی گھڑ اور اس کی تصدیق دو تین آدمیوں یا ایک دو عورتوں کے حوالے سے کر دی۔ گاؤں ے تو کوئی جواں سال سکھ غیر حاضر نہیں تھا اس لئے لوگوں میں اس پر اتفاق رائے ہو گیا ہ دلجیت جس کے ساتھ گئی ہے وہ کسی دوسرے گاؤں کا رہنے والا ہے اور یہ لڑکی اب وقت سامنے آئے گی جب اس کے ایک دو بچے پیدا ہو چکے ہوں گے۔

اب رات کے وقت گاؤں میں یہ آواز اٹھی کہ دلجیت کور آ گئی ہے تو لوگ اس ے گھر کی طرف ہمدردی اور خوشی کے اظہار کے لئے نہیں بلکہ بھید لینے کے لئے اٹھ ڑے کہ وہ آخر گئی کہاں تھی اور واپس کس حال میں آئی ہے۔ انہیں یہ توقع تھی کہ دو بچے بھی اس کے ساتھ ہوں گے۔ بہر حال گاؤں بھر کی آبادی دلجیت کور کے گھر گلی میں اکٹھی ہو گئی۔



یہ تو کسی نے دیکھا ہی نہیں کہ دلجیت کور کے ساتھ ایک سادھو منت سا بھی آیا بڑے بھائی نے دلجیت کور کو دیکھا تو دلجیت کور اس کے ساتھ لپٹ گئی تھی پھر گھر مرد' عورتیں اور بچے نکل آئے اور فوراً" بعد پڑوسی آن دھمکے اور صغیر کی طرف انے دھیان ہی نہ دیا۔ صغیر تیزی سے بڑھتے ہوئے ہجوم میں سے پیچھے ہٹتا آیا۔ کسی اسے دیکھا بھی تو ایک تماشائی سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔ سب کی دلچسپیاں' اچھی یا بری' ت کور کے ساتھ تھیں اور تماشے کا مرکز اسی کی ذات تھی۔

سفر کے دوران صغیر نے دلجیت کور سے اس خطرے کا اظہار کیا تھا کہ اس کے بھائی واس پر شک کریں گے کہ وہی دلجیت کور کو لے گیا تھا اور اب واپس لایا ہے اور پھر نے ان سکھوں کا ردِعمل کیا ہو۔ صغیر کو معلوم تھا کہ سکھوں کی شہرت یہ ہے کہ پہلے یا حرکت کر گزرتے ہیں اور اس کے بعد سوچتے ہیں کہ انہیں ایسا کرنا چاہئے تھا یا ۔

صغیر کے دل پر یہ ڈر سوار ہی رہا کہ ایسا ہو سکتا ہے کہ دلجیت کور کے بھائی صغیر کو ل کر دیں یا مارنا پیٹنا شروع کر دیں اور بعد میں یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ یہ

سادھو کون ہے اور دلجیت کور کو کس طرح اور کیوں لایا ہے۔ صغیر اپنے طور پر سوچتا ہی رہا تھا کہ دلجیت کے گھر کیا بات کرے گا اور کس طرح کرے گا کہ انہیں اس پر شک نہ ہو۔ اس کا یہ مسئلہ اللہ تبارک تعالیٰ نے حل کر دیا۔ وہ اس طرح کہ کسی نے اس کی طرف ذرا سی بھی توجہ نہ دی اور لوگوں نے دلجیت کور کے ہوش ہی ٹھکانے نہیں رہنے دیئے تھے کہ وہ سب کو بتاتی کہ سادھو مہنت اسے خطرہ مول لے کر واپس گھر لایا ہے۔

صغیر نے یہ صورتِ حال دیکھی تو اس کے دماغ میں ایک سکیم آ گئی۔ وہ آہستہ آہستہ ہجوم میں سے راستہ بناتا پیچھے ہی پیچھے ہٹتا آیا اور مکان کے پچھواڑے والی گلی تک پہنچ گیا۔ اس گلی میں لوگ ابھی تک آ رہے تھے۔ صغیر کسی سے ڈرے بغیر اور لوگوں کی طرف توجہ دیئے بغیر سیدھا چلنے لگا اور اس گلی میں سے گزر کر ایک دو گلیاں مُڑا اور اس نے دیکھا کہ وہ گاؤں سے باہر پہنچ گیا ہے۔ وہ اس خطرے سے نکل آیا تھا جو اسے پریشان کیے ہوئے تھا۔ یہ سوچنے کی اور فکر مند ہونے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی کہ دلجیت کور جب یہ بتائے گی کہ ایک سادھو اسے گھر لایا ہے تو سب اس سادھو کو لاپتہ پائیں گے تو دلجیت کور پر کوئی اور ہی شک کریں گے۔ صغیر نے فرض ادا کر دیا تھا اور اس نے بڑی کامیابی سے شیطان کو شکست دے کر بھگایا تھا۔ صغیر کی قماش کا کوئی شخص دلجیت کور جیسی جوان اور خوبصورت لڑکی کے ساتھ ہوس کاری سے باز رہ ہی نہیں سکتا تھا لیکن صغیر نے یہ کمال کر دکھایا اور بلاشک و شبہ اللہ تعالیٰ اسے صلہ دے رہا تھا۔

اب اس نے سوچا کہ اسے فوراً یہاں سے دور چلے جانا چاہئے کیونکہ خطرہ یہ تھا کہ جونہی دلجیت کور ایک سادھو کا نام لے گی تو سادھو ڈھونڈے سے بھی نہیں ملے گا اور ایسا نہ ہو کہ کچھ لوگ کہہ ڈالیں کہ انہوں نے ایک سادھو کو دیکھا تھا اور وہ پچھلی گلی میں جا رہا تھا۔ اس صورت میں اس کا تعاقب ہو سکتا تھا۔

دلجیت کور کو یہ تو معلوم ہی نہیں تھا کہ اسے گھر چھوڑ کر خود صغیر ایک اور گاؤں میں چلا جائے گا اور وہاں سے وہ کسی ذریعے سے سرحد پار کرے گا۔ دلجیت کور کو صغیر نے اتنا ہی بتایا تھا کہ وہ پاکستانی ہے اور بغیر ویزے کے اس ملک میں پھنس گیا ہے اور اب پولیس سے چھپتا چھپاتا پھر رہا ہے اور سرحد پار کرے گا۔ دلجیت کور کو ذرا سا بھی شک نہیں ہوا تھا کہ جو لوگ اسے اور صغیر کو گاڑی میں لائے تھے وہ اللہ کا خاص کرم بلکہ معجزہ تھا کہ انہیں صغیر مل گیا تھا اور ان کا آپس میں ایک روحانی تعلق ہے۔ اسے معلوم نہیں

تھا کہ یہ سب ایک اور گاؤں جا رہے ہیں جہاں وہ چوہدری معراج دین کے نام کے ایک بااثر شخص کے مہمان ہوں گے اور صغیر بھی وہیں ان سے جا ملے گا۔ دلجیت کور اور اس کے لواحقین کے لئے صغیر کو ڈھونڈنا ناممکن نہیں تھا۔

ڈاکٹر رشید نے صغیر کو چوہدری معراج کے گاؤں کا محلِ وقوع اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔ ڈاکٹر رشید اور اس کے دوست اس علاقے میں بالکل اجنبی تھے۔ آگرہ میں عبدالستار نے انہیں چوہدری معراج کے گاؤں کا راستہ اور محلِ وقوع کاغذ پر بنا کر دے دیا تھا۔ صغیر کے لئے وہاں تک پہنچنا کوئی مشکل نہ تھا۔ دلجیت کور کے گاؤں سے چوہدری معراج کے گاؤں کا فاصلہ چار میل سے ذرا کم یا ذرا زیادہ تھا۔ صغیر کو یہ فاصلہ پیدل طے کرنا تھا جو اس کے لئے کوئی مسئلہ نہ تھا۔

صغیر نے اس گاؤں سے کچھ دور جا کر اپنی عقل سے چوہدری معراج کے گاؤں کی سمت متعین کی اور اُس طرف چل پڑا۔ صغیر اس علاقے میں اجنبی نہیں تھا۔ وہ انڈین انٹیلی جنس کا بڑا ہی سرگرم اور تجربہ کار ایجنٹ رہ چکا تھا۔ سرحدی شہروں اور ارد گرد کے علاقوں سے واقف تھا۔ جالندھر شہر میں وہ تین مرتبہ آ چکا تھا۔

جالندھر سرحد سے ایک سو کلو میٹر کے لگ بھگ دور تھا۔ یہ تو کوئی فاصلہ ہی نہ تھا۔ سرحدی شہر ہونے کی وجہ سے اس علاقے میں انڈین انٹیلی جنس کے کارندے اور انفارمر ہمہ وقت سرگرم رہتے تھے۔ انٹیلی جنس کے لحاظ سے جالندھر اور اس کے گرد و نواح کا دور دور تک کا علاقہ حساس علاقہ سمجھا جاتا تھا۔ اب صغیر کو زیادہ محتاط ہو کر رہنا تھا۔ اس کے لئے چھپا رہنا ہی بہتر تھا۔

وہ چلتا گیا۔ اس کے دل میں اللہ کا نام تھا اور وہ اللہ کی مدد کا طلب گار تھا۔ آخر وہ چوہدری معراج کے گاؤں میں داخل ہُوا۔ یہ ضلع جالندھر کا ایک بڑا گاؤں تھا۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے جب وہ اس گاؤں میں داخل ہُوا۔ وہ زیادہ تر خطرہ ہندوؤں سے محسوس کر رہا تھا۔ اعتبار تو سکھوں پر بھی نہیں کرنا چاہئے تھے لیکن اُن دنوں سکھ خالصتان کے مطالبے کے سلسلے میں اتنے زیادہ سرگرم ہو گئے تھے کہ ہندوؤں اور سکھوں کے درمیان خون خرابے کی وارداتیں بھی ہو رہی تھیں اور سکھوں نے پاکستان کی حمایت کھلم کھلا شروع کر دی تھی۔ یہ بھی مشہور ہو گیا تھا کہ پاکستان کی طرف سے سکھوں کو اسلحہ بارود مل رہا ہے۔ اس میں صداقت تھی یا نہیں، یہ ایک الگ بات تھی لیکن اس

میں کوئی شک نہیں رہ گیا تھا کہ سکھ پاکستان کی طرف مدد کے لئے دیکھ رہے تھے اور انڈیا کی حکومت پاکستان پر الزام عائد کر رہی تھی کہ وہ سکھوں کی مدد کر رہا ہے۔ بہرحال خالصتان کا مطالبہ یا تحریک' ایک بغاوت کی صورت اختیار کر گئی تھی۔

چوہدری معراج کے گاؤں کی گلیاں خالی پڑی تھیں۔ رات کو ہندو اور سکھ کم ہی باہر نکلتے تھے کیونکہ قتل کا خطرہ ہر لمحہ سر پر منڈلاتا رہتا تھا۔ آخر صغیر کو ایک بوڑھا سا سکھ سامنے سے آتا نظر آگیا جو آہستہ آہستہ چلا آرہا تھا۔ صغیر نے رک کر اس سے سادھو کے انداز سے بولتے ہوئے چوہدری معراج کا گھر پوچھا۔

مسلمانوں کے گھر اتنے تھوڑے تھے کہ انگلیوں پر گنے جاسکتے تھے۔ چوہدری معراج تو بڑا خوشحال زمیندار تھا اور ملنسار اتنا کہ اتنے بڑے گاؤں کے چھوٹے بڑے اسے اچھی طرح جانتے پہچانتے تھے۔ گاؤں کے غنڈے بدمعاش بھی اس کی چوہدراہٹ کو مانتے تھے اور چوہدری معراج ان غنڈوں بدمعاشوں کو اپنی ضرورت کے تحت استعمال بھی کر لیا کرتا تھا.... اس بوڑھے سکھ نے صغیر کو وہیں کھڑے کھڑے چوہدری معراج کے گھر کا راستہ بتادیا۔

دس بارہ منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ صغیر ایک وسیع و عریض حویلی کے سامنے کھڑے چوکیدار کو بتا رہا تھا کہ وہ معراج دین سے ملنا چاہتا ہے اور چوکیدار اس کا حلیہ دیکھ کر ٹالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ صغیر نے اسے بتایا کہ آج ایک سفید سوزوکی گاڑی پر چوہدری کے چار مہمان آئے ہیں جن کے ساتھ ایک عورت بھی تھی۔ وہ دراصل ان مہمانوں کے پاس آیا ہے۔ چوہدری ملے نہ ملے' ان مہمانوں کو اطلاع مل جائے کہ ان کا ایک دوست آیا ہے۔

کوئی دو گھنٹے پہلے انبالہ کے یہ مہمان اس حویلی میں پہنچے تھے۔ چوہدری معراج نے ان کی آؤ بھگت اور خاطر تواضع میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ پہلے تفصیل سے بتایا جا چکا ہے کہ چوہدری معراج ظاہری طور پر ہندوؤں کا وفادار اور سکھوں کا دوست بنا ہوا تھا لیکن اس کی ذات میں انتقام کی چنگاریاں سلگتی رہتی تھیں۔ یہ جانتے ہوئے کہ پاکستان کیسی سیاسی' معاشی اور معاشرتی تباہی میں جا پڑا ہے اس کے دل میں پاکستان کی محبت موجزن تھی۔ ایک تو وہ اگست 1947ء میں مسلمانوں کے قتل عام اور مسلمان لڑکیوں کے اغوا اور اجتماعی آبروریزی کو نہیں بھولا تھا اور اب ہندوؤں کی طرف سے اس پر یہ چوٹ

پڑی تھی کہ اس کے اچھے بھلے جوان بیٹے کو ہندوؤں نے آگرہ کے پاگل خانے تک پہنچا دیا تھا۔

ایک طرف وہ ہر مسلمان اور ہر پاکستانی کی مدد کے لئے تیار رہتا اور خطرے بھی مول لینے پر آجاتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس طرح وہ اپنے اللہ کی خوشنودی حاصل کر رہا تھا اور دوسری طرف وہ آگرہ کے پاگل خانے کے افسر عبدالستار کو بھی خوش کر رہا تھا تاکہ وہاں اس کے بیٹے کا خیال رکھے اور بجائے اس کے کہ اس کا بیٹا پاگل خانے میں رہ کر لاعلاج پاگل بن جائے' اس کا علاج ہو جائے اور پھر وہ پاگل خانے سے نکل آئے۔

جب صغیر باہر کھڑا چوکیدار سے کہہ رہا تھا کہ وہ اندر اطلاع دے دے کہ ایک مہمان آیا ہے اُس وقت چوہدری معراج انبالہ کے مہمانوں میں بیٹھا ان کی باتیں سن رہا تھا۔ کچھ ہی دیر پہلے وہ کھانے سے فارغ ہوئے تھے۔ اگر صغیر کسی اچھے لباس میں ہوتا تو چوکیدار فوراً" اندر اطلاع دیتا لیکن ایک سائیں یا سادھو یا ملنگ کو دیکھ کر وہ اندر جانے سے ڈرتا تھا۔ رات آدھی گزرنے والی تھی۔ چوکیدار اس ڈر سے اندر نہیں جاتا تھا کہ چوہدری معراج باہر آئے گا اور یہ شخص اسے کہے گا چوہدری صاحب بڑی دور سے آیا ہوں' روٹی کھلا دیں یا کچھ دے دیں۔ اس حلیئے اور اس کلاس کا کوئی شخص اتنے بڑے چوہدری کا مہمان نہیں ہو سکتا تھا۔ صغیر کے لئے یہ ایک مسئلہ بن گیا کہ وہ چوہدری یا ڈاکٹر رشید تک اپنی اطلاع کس طرح پہنچائے۔

وہ سب لوگ اندر جاگ رہے تھے اور چوہدری معراج کو بتایا جا چکا تھا کہ جس کی خاطر ڈاکٹر رشید آگرہ کے پاگل خانے تک پہنچایا گیا تھا وہ کس طرح راستے میں مل گیا اور یہ ساتھ لے آئے ہیں۔ چوہدری معراج نے غیر معمولی حیرت کا اظہار کر کے کہا کہ یہ ایک معجزہ ہے جس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اللہ تبارک تعالیٰ ان کی مدد کر رہا ہے۔

ان لوگوں کو ابھی تفصیلاً" معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ یہ لڑکی کون تھی جسے صغیر نے اس کے گھر پہنچانا تھا۔ چوہدری معراج نے بھی لڑکی کی بات کی طرف زیادہ دھیان نہ دیا اور یہ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہ کی کہ وہ کون تھی۔ اسے دلچسپی صرف اس بات میں تھی کہ صغیر بھی آ رہا ہے۔ صغیر کو تو وہ خاص طور پر ملنے کو بے تاب تھا۔ بہرحال ان میں سے کسی کو بھی یہ توقع نہیں تھی کہ صغیر آج ہی رات آ جائے گا۔

اتفاق سے ایک نوکر باہر نکلا تو اس نے ایک سادھو ملنگ کو کھڑے دیکھا۔ چوکیدار

نے اسے بتایا کہ یہ شخص چوہدری صاحب سے ملنا چاہتا ہے۔ نوکر نے بھی صغیر کا حلیہ دیکھ کر ٹال مٹول شروع کردی۔ آخر صغیر غصے سے بولا کہ اندر جاکر مہمانوں سے کہیں کہ صغیر آیا ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ تم دونوں اندر اطلاع نہیں دو گے تو وہ خود اندر چلا جائے گا پھر دونوں چوہدری کے جوتے کھالینا۔

اس بات سے نوکر کچھ ڈرا اور اندر جاکر چوہدری کو بتایا کہ ایک سادھو سا آیا ہے، جو اپنا نام صغیر بتاتا ہے.... وہاب نے اتنا ہی سنا تو باہر کو اٹھ دوڑا۔ واپس آیا تو صغیر اس کے ساتھ تھا۔ چوہدری معراج نے اٹھ کر اسے بازوؤں میں لے لیا اور اپنے سینے سے لگا کر بڑی زور سے بھینچا۔

"واہ اللہ کے شیر!" ——چوہدری نے اسے اپنے بازوؤں سے نکال کر کہا—— "اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کردیتا ہے اور جسے چاہتا ہے اور جب چاہتا ہے راہِ راست پر لے آتا ہے۔ تم پر اللہ نے بہت بڑا کرم کیا ہے کہ تمہیں اپنے راستے پر لے آیا ہے۔ اب دیکھنا تمہاری ہر مشکل آسان ہوگی اور تمہیں اسی دنیا میں اجر ملے گا"۔

صغیر کی ہنسی نکل گئی اور وہ کچھ دیر ہنستا ہی رہا۔ دوستوں نے اس سے پوچھا کہ وہ اتنی جلدی کس طرح آگیا ہے اور اسے ہنسی کس بات پر آئی ہے۔

صغیر نے انہیں بتایا کہ وہ ان تک بہت جلدی پہنچنا چاہتا تھا جو ممکن نظر نہیں آتا تھا کیونکہ لڑکی کے والدین نے اسے آنے ہی نہیں دینا تھا لیکن وہاں ایسی صورت پیدا ہوگئی کہ اسے وہاں سے کھسک آنے کا موقع مل گیا۔ صغیر نے انہیں بتایا کہ اسے یہ موقع کس طرح ملا تھا۔ صغیر نے یہ بھی کہا کہ یہ سکھ اسے مشکوک آدمی سمجھ کر روک بھی سکتے تھے۔

"میرے عزیزو!" ——چوہدری معراج نے صغیر کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہا—— "اب کام کی بات سن لو۔ ہوسکتا تمہیں کل پرسوں ہی سرحد پار کرا دوں اور اس میں ہفتہ دس دن بھی لگ سکتے ہیں۔ دس دنوں سے زیادہ ایک منٹ بھی نہیں لگے گا، میں کچھ انتظام کرچکا ہوں اور باقی کل سے شروع کردوں گا.... جتنے بھی دن لگیں، پریشان نہیں ہونا، میرے گھر میں کوئی تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔ تمہاری گاڑی چھپادی گئی ہے، یہ کسی کو نظر نہیں آئے گی۔ تم سب بہت تھکے ہوئے ہو، سوجاؤ، باقی باتیں کل ہوں گی" —— چوہدری نے بولتے بولتے صغیر کی طرف دیکھا اور ذرا چونکا

اور پھر بولا—— "تم صغیر، یہ کپڑے بدل ڈالو میں اپنے کپڑے دیتا ہوں اور تمہارے غسل کا بندوبست بھی کرتا ہوں"۔

"کپڑے تو میں بدل لوں گا" —— صغیر نے کہا—— "لیکن داڑھی اور سر کے بال ابھی نہیں کٹواؤں گا۔ سرحد پار کرنے تک میرا چہرہ ڈھکا ہی رہے تو اچھا ہے"۔

صغیر نے نہالیا اور جب وہ چوہدری کے کپڑے پہن کر واپس مہمانوں والے کمرے میں آیا تو اس نے بڑی ہی لمبی مدت بعد نہایت اچھا اور مرغن کھانا پڑا دیکھا، اگر وہ اکیلا ہوتا تو اس کھانے پر ٹوٹ پڑتا اور جلدی جلدی کھانا نگل کر پلیٹیں صاف کردیتا لیکن آداب اور اخلاق کی پابندی نے اسے جکڑ رکھا تھا۔ وہ کھانے پر بیٹھ گیا اور پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ چوہدری معراج دین اپنے کمرے میں جاچکا تھا۔

صغیر نے ڈاکٹر رشید اور اس کے دوستوں کو وہ رُوداد سنائی تھی جو اس پر بیتی تھی اور ان سے سنی تھی کہ ڈاکٹر رشید کس جہنم سے گزر کر یہاں تک پہنچا ہے۔

ایک دوسرے کی سنتے سناتے رات گزر گئی۔ صغیر نے بڑی شدت سے محسوس کیا کہ ڈاکٹر رشید اور اس کے ان تینوں دوستوں کے ساتھ اس کا روحانی رشتہ ہے اور صغیر کے متعلق ان چاروں نے بھی یہی محسوس کیا۔ وہ صغیر کو اور صغیر انہیں خراجِ تحسین پیش کر رہا تھا۔ انہوں نے ایک دوسرے کے لئے قربانیاں دی تھیں جو غیر معمولی ہی نہیں بلکہ بے مثال تھیں۔

○

بہت دن پہلے صغیر اور دلجیت کور جنگل میں چلے آرہے تھے اور انہیں بالکل ہی امید نہیں تھی کہ کہیں ایک جیپ مل جائے گی جو انہیں سڑک تک پہنچا دے گی اور سڑک سے انہیں ایک سوزوکی مل جائے گی جس میں اس کے اپنے ہی ساتھی ہوں گے اور یہ کار انہیں جالندھر کے اس گاؤں تک پہنچا دے گی۔

پاکستان کی انٹیلی جنس سروس آئی ایس آئی نے اس دوران ایک اور کامیابی حاصل کرلی تھی۔ آئی ایس آئی کو لُوسی کا فون نمبر واجدہ سے مل گیا تھا۔ آئی ایس آئی کے افسروں کو اس نمبر پر شک تھا کہ صحیح نہیں ہوسکتا کیونکہ انٹیلی جنس کے لوگ اتنے کچے نہیں ہوتے لیکن واجدہ نے دو مرتبہ پھر اس نمبر پر کراچی فون کیا اور اسے لُوسی مل گئی تھی۔ واجدہ نے فون سے میجر امتیاز کو بتایا تھا کہ لُوسی اسی نمبر پر ملتی ہے۔

آئی ایس آئی نے بڑی تیزی سے یہ کارروائی کی تھی کہ اپنے دو افسروں کو کراچی
بھیج دیا تھا۔ ان افسروں نے کراچی کے ہیڈ کوارٹر سے ہر طرح کی مدد حاصل کر لی تھی
فوری طور پر ٹیلی فون کے محکمے سے اس فون نمبر کا مکمل ایڈریس معلوم کر لیا تھا۔

پھر اس ایڈریس پر جا کر دیکھا تھا۔ وہ تو ایک عالی شان کوٹھی تھی۔ اس پر نظر رکھنے
کے لئے افراد مقرر کر دیئے گئے تھے جو دو دن مسلسل رپورٹیں دیتے رہے کہ انہوں
نے دن بھر کیا دیکھا ہے۔ ان رپورٹوں میں دو تین نہایت خوبصورت اور جواں سال
لڑکیوں کا خاص طور پر ذکر تھا۔ مختصر یہ کہ کوٹھی میں جو لوگ رہتے تھے وہ مشکوک لگتے
تھے۔

آخر ایک رات آئی ایس آئی نے اس کوٹھی پر اُس وقت چھاپہ مارا جب آٹھ دس
آدمی جن میں تین لڑکیاں بھی تھیں' رات کے کھانے میں مصروف تھیں اور ساتھ
شراب چل رہی تھی۔ اس چھاپے میں پولیس کو بھی استعمال کیا گیا تھا۔ پولیس کے تمام
آدمی پرائیویٹ کپڑوں میں ملبوس تھے۔ آرمی کے چند آدمی بھی تھے اور آئی ایس آئی
سٹاف چھاپہ مارنے اور دیگر کارروائیاں کرنے کا ذمہ دار تھا۔

کھانے کی میز پر بیٹھے ہوئے تمام افراد کو حراست میں لے لیا گیا۔ میجر عثمان کی بیوی
واجدہ کے دونوں بھائی بھی چھاپہ مار پارٹی کے ساتھ تھے۔ انہیں لُوسی کی شناخت کے لئے
ساتھ لے جایا گیا تھا۔ انہوں نے ان لڑکیوں کو دیکھا اور پورے وثوق اور اعتماد کے ساتھ
ایک لڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ ہے لُوسی۔ لُوسی کی وہاں موجودگی نے کوئی شک
شبہ رہنے ہی نہ دیا۔

خانساماں اور دو اور ملازم کوٹھی کے پچھلے دروازے سے نکل کر بھاگے تو انہیں
پرائیویٹ کپڑوں میں ملبوس پولیس نے پکڑ لیا۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ پولیس اور فوج
نے کوٹھی کو محاصرے میں لے رکھا ہے۔ ان کا یوں بھاگنا ایک ثبوت تھا کہ وہ اس رِنگ
کے افراد ہیں۔

کوٹھی کی تلاشی شروع ہو گئی۔ یہ تلاشی اتنی سخت تھی کہ سارے گھر کو تہہ و بالا
کر دیا گیا۔ ایک الماری سے انڈین کرنسی کے نوٹوں کی بہت ساری گٹھیاں برآمد ہوئیں۔
ان کے ساتھ پاکستانی کرنسی بھی رکھی ہوئی تھی۔ مقفّل الماریوں میں سے دو ریوالور'
میگزینوں والے پسٹل اور تین کلاشنکوفیں برآمد ہوئیں۔ ان کا ایمونیشن بھی اچھی

خاصی تعداد میں ملا۔ کوٹھی کے پیچھے سرونٹ کوارٹر تھا جو چار پانچ کمروں کا بڑا اچھا مکان
تھا۔ ان تمام کمروں کی تلاشی لی گئی اور آخر میں اُس کمرے کو کھلوایا گیا جس کے باہر تالا لگا
ہوا تھا۔ تالا کھولنے والے نے کہا کہ یہ سٹور ہے جس میں بے کار فالتو سامان ویسے ہی
پھینکا ہوا ہے۔ کمرے میں دیکھا اس میں تین چار ٹوٹی پھوٹی کرسیاں اور کباڑ خانے جیسی
کئی چیزیں پڑی تھیں جو پھینکی گئی تھیں سلیقے قرینے سے نہیں رکھی گئی تھیں۔ آئی ایس
آئی کے افسروں نے یہ سارا سامان باہر نکلوایا تو ایک فٹ چوڑا اور دو اڑھائی فٹ لمبا لکڑی
کا بکس نکلا جسے تالا لگا ہُوا تھا۔ کھول کر دیکھا تو اس میں سے وائرلیس سیٹ نکلا۔ یہ ریڈیو
ٹیلی فون بھی تھا اور آر ٹی سیٹ بھی۔ یہ اپنے قبضے میں لے لیا گیا۔

اسی سٹور سے شراب کی بوتلوں کے چار پانچ کریٹ بھی برآمد ہوئے۔ آئی ایس
آئی والے جانتے تھے کہ یہ شراب ان لوگوں نے جو کوٹھی میں رہتے تھے' صرف اپنے
لئے نہیں رکھی ہوئی بلکہ یہ رِنگ کے اُن افراد کے لئے تھی جو ان کے پاکستانی ایجنٹ تھے
اور اس کا شراب استعمال صرف ان کے اپنے افراد ہی نہیں کرتے تھے بلکہ جسے اپنے جال
میں پھنسانا ہوتا تھا' یہ اس کی خاطر تواضع میں استعمال ہوتی تھی۔ شراب' خوبصورت
عورت اور دولت انسان کی سب سے بڑی کمزوریاں ہیں۔ یہی تین چیزیں ہیں جنہوں نے
بادشاہوں کو بھکاری بنایا ہے اور ایمان فروشوں کی منڈی میں یہی چیزیں چلتی ہیں۔ ان
تین چیزوں کی چکا چوند اس قدر تیز ہوتی ہے کہ اس کے سامنے عبرت کے چراغوں کی
روشنی جیسے گل ہی ہو جاتی ہے۔

یہ کوٹھی اس رِنگ کی یا ایک سے زیادہ رِنگوں کی ہیڈ کوارٹر معلوم ہوتی تھی۔ دشمن
کا انٹیلی جنس کا نظام اور اس قسم کے ہیڈ کوارٹر دشمن کے سفیر کی زیرِ نگرانی چلتے ہیں۔
ان تین دلکش لڑکیوں کی' کرنسی اور شراب کی موجودگی ایسی شہادت تھی کہ یہ دشمن
کے جاسوسوں اور دیگر ایجنٹوں کا مرکز ہے۔

معلوم ہوتا تھا کہ ان لوگوں کو پتہ نہیں چلا کہ میجر عثمان گرفتار ہو چکا ہے اور وہ
آئی ایس آئی کے انٹیروگیشن سنٹر کے ایک سیل میں بند ہے۔ اگر انہیں پتہ چل جاتا تو یہ
سب ادھر اُدھر ہو کر غائب ہو جاتے جسے زیرِ زمین چلے جانا کہا جاتا ہے۔ پکڑے جانے
والے یہ آدمی بڑی بے نیازی اور بے فکری کے انداز سے کھانا کھا رہے تھے' شراب پی
رہے تھے اور ان کے قہقہے گونج رہے تھے۔ پھر انہوں نے گھر میں جو اسلحہ اور ایمونیشن

اور دیگر اشیاء رکھی ہوئی تھیں اس سے یہ تاثر ملتا تھا جیسے یہ یہاں کوئی خوف اور خطرہ محسوس نہیں کرتے تھے۔

یہ افراد تو جراثیم اور وائرس تھے جو پاکستان کے خون میں شامل ہو گئے تھے۔ اپنے ملک کو زندہ و پائندہ رکھنے کے لئے یہ پاکستان کی زندگی کا رس چوس رہے تھے۔ ان چند ایک ہندوؤں نے نہ جانے کتنے ہزار پاکستانیوں کا ایمان خرید رکھا تھا اور یہ پاکستانی دیمک کی طرح اپنے ہی ملک کی جڑیں چاٹ رہے تھے۔ ان میں بعض پاکستانیوں کو بعض ایسی شخصیتوں کی پشت پناہی حاصل تھی جن شخصیتوں نے پاکستان کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لے رکھی ہے۔

خانہ تلاشی مکمل کر کے اور برآمد شدہ مال ایک جگہ رکھوا کر آئی ایس آئی کے افسر اس کمرے میں گئے جہاں گرفتار ہونے والے افراد کو ایک دیوار کے ساتھ فرش پر بٹھا دیا گیا تھا اور ان پر پہرہ کھڑا تھا۔ افسر ابھی ان سے کوئی بات بھی نہ کر پائے تھے کہ ساتھ والے کمرے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ایک افسر گیا اور ریسیور اٹھایا۔

”لوسی سے بات کروائیں“۔۔۔ اس افسر کی ہیلو کے جواب میں دوسری طرف سے ایک نسوانی آواز آئی۔

”آپ کون؟“۔۔۔ افسر نے پوچھا۔۔۔ ”میں لوسی کو کیا بتاؤں؟“۔

”لاہور سے مسز میجر عثمان!“۔۔۔ اُدھر سے جواب ملا۔۔۔ ”واجدہ!“

”السلام علیکم مسز میجر عثمان!“۔۔۔ آئی ایس آئی کے اس افسر نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا۔۔۔ ”مس لوسی ہمیں مل گئی ہے لیکن آپ اس سے بات نہیں کر سکیں گی، میں آپ کے بھائی صاحب کی بات آپ سے کروا دیتا ہوں!“

”پکڑی گئی ہے وہ ڈائن؟“۔۔۔ واجدہ نے پُرمسرت لہجے میں کہا۔۔۔ ”آپ پہنچ گئے ہیں وہاں“۔

”ہاں مسز عثمان!“۔۔۔ اس افسر نے کہا۔۔۔ ”ابھی زیادہ بات کرنے کا موقع اور وقت نہیں، ذرا ہولڈ کریں، آپ کے بڑے بھائی صاحب کو بلاتا ہوں“۔

ریسیور رکھ کر افسر نے جا کے واجدہ کے بھائی کو بتایا کہ مسز عثمان کا فون ہے۔ بھائی دوڑا گیا اور ریسیور اٹھایا۔ افسر نے اسے کہہ دیا تھا کہ زیادہ بات نہ کرے۔ بھائی نے واجدہ کو مختصر الفاظ میں بتایا کہ چھاپہ پوری طرح کامیاب رہا ہے اور لوسی پکڑی گئی ہے پھر کہا کہ

ابھی وہ فون بند کر دے۔ واجدہ نے بے پناہ خوشی کا اظہار کر کے ریسیور رکھ دیا۔

○

آئی ایس آئی کے دونوں افسر.... ایک کرنل اور ایک میجر.... گرفتار ہونے والوں کے سامنے جا کھڑے ہوئے اور ہر ایک کو غور سے دیکھنے لگے۔ چھاپے کی کامیابی پر وہ اتنے مسرور تھے کہ ان کے ہونٹوں پر مسرّت تھی۔ گرفتار ہونے والوں میں ایک آدمی ادھیڑ عمر کا تھا اور وہی عمر میں ان سب سے زیادہ لگتا تھا۔ وہ وہی ایم اے خان تھا جو لاہور ایک کوٹھی میں رہتا تھا۔ اصل میں وہ ہندو تھا اور اس کا نام مہندر تھا۔ اس کے چہرے پر ذرا سا بھی ملال نہ تھا نہ ہی گھبراہٹ کا تاثر ملتا تھا۔ اس کی ظاہری شخصیت بڑی ہی پُراثر تھی اور وہ کوئی معمولی آدمی نہیں کوئی بڑا ہی خاص آدمی لگتا تھا۔ وہ اٹھا اور آئی ایس آئی کے دونوں افسروں کے پاس آیا۔

”آپ سے ایک بات کرنی ہے“۔۔۔ اُس نے نہایت دھیمی آواز میں کہا۔۔۔ ”مجھے ساتھ والے کمرے میں لے چلیں“۔

دونوں افسر اسے ساتھ والے کمرے میں لے گئے اور اس نے افسروں کو بیٹھنے کو کہا۔

”ہم پکڑے گئے ہیں“۔۔۔ مہندر نے کہا۔۔۔ ”یہ الگ بات ہے کہ ہم اقبال جرم کریں گے یا نہیں لیکن میں یہ دیکھ چکا ہوں کہ ہمارے خلاف آپ کو کچھ شہادت مل گئی ہے۔ ابھی ابھی جو فون آیا تھا وہ میں جان گیا ہوں کس کا تھا اور کس کے لئے تھا۔ ہماری اپنی لڑکی نے ہمیں مروا دیا ہے۔ اس نے یہ فون نمبر باہر دے رکھا تھا“۔

”کسے دے رکھا تھا؟“۔۔۔ کرنل نے پوچھا۔

”میجر عثمان اور اس کی بیوی کو“۔۔۔ مہندر نے جواب دیا۔

”کیا یہ میجر عثمان ابھی سروس میں ہے؟“۔۔۔ کرنل نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔۔۔ ”یا ریٹائرڈ میجر ہے“۔

”سروس میں ہے“۔۔۔ مہندر نے کہا۔۔۔ ”لاہور بریگیڈ ہیڈ کوارٹر میں ہوتا ہے“۔

دراصل کرنل یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ ان لوگوں کو یہ معلوم ہے یا نہیں کہ میجر عثمان گرفتار ہو چکا ہے یا اس پر کسی کو ایسا شک نہیں۔ کرنل نے مہندر سے ایک دو باتیں

اور پوچھیں تو مندر نے کوئی جواب نہ دیا۔

"دیکھئے صاحب!" ــــ مندر نے کہا ــــ "آپ مجھ سے وہ باتیں پوچھ رہے ہیں جو کورٹ میں جرح میں پوچھی جاتی ہیں۔ میں ابھی کسی ایسے سوال کا جواب نہیں دوں گا' مجھے کچھ اور کہنا ہے اور آپ سے درخواست ہے کہ ٹھنڈے دل سے میری بات سنیں اور غور کریں"۔

پاکستانی افسر اچھی طرح جانتے تھے کہ تفتیش کس طرح کی جاتی ہے اور کہاں کی جاتی ہے اور عدالتوں میں کیا ہوتا ہے وغیرہ۔ وہ تو یہ دیکھ رہے تھے کہ یہ شخص کتنے پانی میں ہے اور اس پتھر کو توڑنے میں کوئی دشواری پیش آئے گی یا آسانی سے ٹوٹ جائے گا۔ اس کے انداز سے وہ جان گئے کہ یہ پتھر کچھ سخت ہے اور آسانی سے توڑا نہیں جاسکے گا۔ کرنل نے اسے کہا کہ وہ جو کہنا چاہتا ہے وہ انہیں دوست سمجھ کر بے تکلفی سے کہے۔

"میں جانتا ہوں آپ کو کتنی کچھ تنخواہ ملتی ہے" ــــ مندر نے دوستانہ لہجے میں کہا ــــ "اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ہمیں گرفتار کرکے آپ کو کوئی انعام نہیں ملے گا.... میں آپ کو ایک آفر کررہا ہو۔ یہ تین لڑکیاں آپ نے دیکھی ہیں۔ انہیں اپنا سمجھیں اور جتنے دن چاہیں انہیں اپنے پاس رکھیں۔ اس کے علاوہ آپ خود بتائیں...."

"کہ ہماری ڈیمانڈ کیا ہے" ــــ کرنل نے اس کی بات کاٹ کر کہا ــــ "اور اگر ہماری ڈیمانڈ پوری ہو جائے تو ہم دونوں آپ کے رِنگ میں شامل ہو جائیں اور پھر ہمارے لئے عیش ہی عیش ہے"۔

"بالکل نہیں صاحب!" ــــ مندر نے کہا ــــ "میرا مطلب یہ نہیں۔ میں کہہ رہا ہوں کہ جتنی دولت آپ کہیں گے وہ میں دے کر آپ کو رخصت کروں گا۔ ابھی معاملہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ میں جانتا ہوں آپ بڑے آرام سے اس پر پردہ ڈال سکتے ہیں۔ اپنی ڈیمانڈ بتائیں اور مجھ سے وصول کریں.... شراب کے سب کریٹ جو یہاں سے برآمد ہوئے ہیں' لے جائیں"۔

"تم ہمارے ایمان کی قیمت نہیں دے سکتے" ــــ کرنل نے کہا ــــ "تمہاری حکومت کا پورا خزانہ بھی کافی نہیں"۔

"ایمان.... دھرم" ــــ مندر نے طنزیہ سی مسکراہٹ سے کہا ــــ "میں اگر آپ کو بتاؤں کہ ہم نے آپ کے کتنے بڑے بڑے لوگوں کا ایمان کتنے سستے داموں خریدا ہے تو

آپ حیران رہ جائیں گے۔ وہ مجھ جیسے ہی لوگ تھے جنہوں نے بڑے تھوڑے پیسے دے کر آپ کا آدھا ملک خرید لیا ہے اور بنگالیوں کو دے دیا ہے۔ ہمارے لیڈروں کا مقصد پاکستان کو آدھا کرنا تھا' وہ کردیا لیکن میں زبان پر نہیں لاؤں گا کہ آپ کے مشرقی پاکستان کی قیمت آپ کے کون کون سے لیڈر نے وصول کی تھی۔ آپ اپنی بات کریں"۔

"ہمیں ان جیسا نہ سمجھیں" ــــ کرنل نے کہا ــــ "ہر کوئی ایمان فروش نہیں ہوسکتا۔ پوری قوم کبھی غدار نہیں ہوتی۔ یہ ہم جانتے ہیں کہ غدار کوئی کوئی ہُوا کرتا ہے۔ اور ان کی تعداد کتنی ہی کم کیوں نہ ہو وہ پوری قوم کو اور پورے ملک کو لے ڈوبتے ہیں۔ ہمیں یہ فرض سونپا گیا ہے کہ ان غداروں کو پکڑ کر سزا دلوائیں.... تم ہمارا مزید وقت ضائع نہ کرو' ٹھنڈے دل سے سوچ لو' اقبال جرم کرلو گے تو فائدے میں ہی رہو گے۔ ہم تمہیں سوچنے کا وقت دے رہے ہیں"۔

"میں آپ کو سبز باغ نہیں دکھا رہا" ــــ مندر نے کہا ــــ "البتہ اپنے تجربے اور مشاہدے کی ایک بات کہوں گا.... میں انہیں بھی جانتا ہوں جو دین اور دھرم کے وعظ کیا کرتے ہیں۔ ہمارے پنڈتوں' آپ کے مولویوں' سکھوں کے گرنتھیوں اور عیسائیوں کے پادریوں میں کوئی فرق نہیں۔ ان میں سے کسی کو بھی خریدا جاسکتا ہے اور خریدے گئے ہیں' بلکہ یہ جلدی خریدے جاتے ہیں۔ آپ جنہیں علماء دین کہتے ہیں' وہ مجھ سے پوچھیں۔ ان کے پاس علم کا خزانے ہیں لیکن ان کے پاس دین ہے ہی نہیں۔ اگر ہے تو بکاؤ مال ہے۔ وہ سلطان محمود غزنوی تھا جو کہہ گیا ہے کہ مَیں بُت شکن ہوں بُت فروش نہیں۔ آزادی کے بعد آپ کے جتنے بھی سلطان ہو گزرے ہیں اور جو ہیں وہ بُت فروش ہیں...."

کرنل اُٹھ کھڑا ہُوا۔ میجر بھی اٹھا۔ مندر کو بھی اٹھا کر ملزموں والے کمرے میں لے گئے اور ان کے ساتھ فرش پر بٹھا دیا یہ پاکستان کی آئی ایس آئی کا ایک کامیاب چھاپہ تھا۔ یہ ہوسکتا تھا کہ پورا رِنگ نہ پکڑا گیا ہو لیکن ایک کامیابی خاص طور پر قابل ذکر تھی کہ تین لڑکیاں پکڑی گئی تھیں۔ یہ کلاشنکوفوں اور پستولوں سے زیادہ خطرناک ہتھیار تھیں۔ یہ تو زاہدوں اور پارساؤں پر بھی نشہ طاری کردینے والی چیزیں تھیں۔ یہ اس پاکستانی کرنل اور میجر کا کمال تھا کہ یہ لڑکیاں انہیں پیش کی جارہی تھیں اور وہ دونوں ان کی طرف دیکھ بھی نہیں رہے تھے۔ یہ ایمان اور قومی جذبے کی پختگی کا مظاہرہ تھا اور یہی وہ وصف تھا کہ

اسلام اور وطن کے دشمنوں کا اتنا بڑا گروہ پکڑا گیا تھا۔

آئی ایس آئی کا کام اس چھاپے، برآمدگیوں اور ملزموں کی گرفتاری پر ختم نہیں ہو گیا تھا۔ انہیں سزا دلوانے کے لئے شہادتیں اکٹھی کرنی تھیں جو خاصا مشکل کام تھا۔ اس کے علاوہ ان سے یہ بھی معلوم کرنا تھا کہ پاکستان میں ان کے ایجنٹ کون کون ہیں۔ ان میں سے صرف میجر عثمان پکڑا گیا تھا۔

ان سب کو ہتھکڑیاں لگائی گئیں، برآمد کیا ہوا مال قانونی کارروائی کے مطابق اکٹھا کیا گیا اور پھر کوٹھی کو سیل کر کے وہاں پہرہ کھڑا کر دیا گیا اور پھر ان سب کو آئی ایس آئی کے ہیڈ کوارٹر میں لے گئے اور وہاں سے انہیں راولپنڈی لے جانا تھا۔

○

ڈاکٹر رشید، صغیر اور ان کے تینوں دوستوں کو چوہدری معراج دین کے ہاں آئے تیسرا دن گزر رہا تھا۔ وہاب اشتیاق اور ظفر کو واپس چلے جانا چاہئے تھے۔ انہوں نے ڈاکٹر رشید کو چوہدری معراج کے گھر تک پہنچا دیا تھا۔ سرحد پار کرانا چوہدری معراج کے ذمے تھا۔ ڈاکٹر رشید کے یہ دوست یہ کام نہیں کر سکتے تھے۔ صغیر اور ڈاکٹر رشید انہیں کہہ رہے تھے کہ وہ یہاں مزید نہ رکیں اور چلے جائیں لیکن انہیں احساس تھا کہ ڈاکٹر رشید جیسا دوست اور قیمتی انسان ان سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو رہا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ ڈاکٹر رشید کو رخصت کر کے جائیں گے۔ چوہدری معراج کچھ بھی نہیں کہتا تھا۔ وہ انہیں اور زیادہ دن مہمان رکھنا چاہتا تھا۔

صغیر ان باتوں کو زیادہ بہتر سمجھتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ یہ حساس علاقہ ہے اور کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ یہ تینوں یہاں غلط لوگوں کی نظروں میں آجائیں اور سارا کھیل ہی چوپٹ ہو جائے۔

آخر فیصلہ ہوا کہ وہ چلے ہی جائیں۔ ان کا فرض کامیابی اور خوش اسلوبی سے ادا ہو گیا تھا۔ دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا تھا۔ کھانا آیا۔ سب نے مل کر کھایا اور پھر تینوں دوست اس جذباتی کیفیت میں رخصت ہوئے کہ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے اور جذبات کی شدت کا یہ عالم کہ ان کے منہ سے کوئی بات نہیں نکل رہی تھی۔ آخر وہ سوزوکی کار میں بیٹھے اور رخصت ہو گئے۔

اس سے اگلے دن کا ذکر ہے، چوہدری یہ کہہ کر گھر سے نکلا کہ ایک گاؤں میں اغوا

کی واردات ہو گئی ہے۔ ایک شادی شدہ جواں سال لڑکی اغوا ہو گئی تھی اور لڑکی کے باپ کے ساتھ چوہدری معراج کا اچھا خاصا دوستانہ تھا۔ چوہدری معراج کے لئے وہاں اظہارِ افسوس و ہمدردی کی خاطر جانا ضروری تھا۔

چوہدری پچھلے پہر واپس آیا اور اس نے ہنستے ہنستے اغوا کی یہ واردات سنائی۔ دو اڑھائی سال پہلے سکھوں کی ایک کنواری لڑکی لاپتہ ہو گئی تھی۔ چوہدری نے بتایا کہ لوگوں نے یہ مشہور کر دیا کہ اس لڑکی نے کسی دوسرے گاؤں کے کسی آدمی کے ساتھ خفیہ میل ملاقات رکھا ہوا تھا اور اس کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی ہے۔ کئی لوگوں نے کئی ایک باتیں گھڑ لی تھیں اور آہستہ آہستہ لوگ اس لڑکی کو بھول گئے۔ پھر ہوا یہ کہ چار دن پہلے ایک رات لڑکی واپس آگئی۔ گھر والوں نے اس سے پوچھا کہ وہ کہاں چلی گئی تھی۔

اس نے گھر والوں کو بتایا کہ ایک اور گاؤں کے ایک جواں سال آدمی نے جبراً اسے اغوا کر لیا تھا اور کہیں دور یا کسی اور جگہ لے جا کر دو تین آدمیوں کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ لڑکی نے بتایا کہ اغوا کرنے والا وہی آدمی تھا جو اس کے ماں باپ سے اس کا رشتہ مانگتا تھا اور ماں باپ نے انکار کر دیا تھا اور اس لڑکی نے بھی کہیں اس آدمی کو آمنے سامنے آکر کہہ دیا تھا کہ وہ اسے بالکل پسند نہیں کرتی اور اس کے ساتھ شادی نہیں کرے گی۔

وہ شخص بھی آخر سکھ تھا۔ عورتیں ایک میلے میں گئیں اور یہ لڑکی آندھی آجانے کی وجہ سے ان عورتوں سے ذرا الگ ہو گئی۔ اس کا مایوس امیدوار اس کی ٹوہ میں تھا۔ اس کے ساتھ دو آدمی تھے۔ انہیں موقع مل گیا اور لڑکی کو اٹھا کر آندھی کے پردے میں میلے سے دور لے گئے اور پھر لڑکی آگے ہی آگے لے جائی جانے لگی۔ چوہدری معراج نے بتایا کہ پھر نہ جانے لڑکی کتنے ہاتھوں میں گئی اور اسے ایک طرح کی طوائف یا داشتہ بنا لیا گیا۔

اڑھائی سال بعد لڑکی کو فرار کا موقع مل گیا اور معلوم نہیں یہ خود وہاں سے اکیلی فرار ہوئی یا اسے کسی کی مدد حاصل ہو گئی کہ وہ خجل خوار ہوتی آخر کار گھر پہنچ گئی۔

چوہدری معراج نے کہا کہ اسے ہر بات کا تو پتہ نہیں چلا، یہی موٹی موٹی باتیں معلوم ہوئی ہیں۔ اس لڑکی کو جس نے اغوا کیا تھا اس کی شادی کوئی ڈیڑھ سال پہلے ایک اور لڑکی کے ساتھ ہو گئی تھی۔ اغوا ہو کر واپس آنے والی لڑکی نے جب اپنے گھر یہ بتایا کہ اس شخص نے اسے اغوا کر کے بیچا تھا تو اس لڑکی کے بھائیوں نے اعلان کر دیا کہ جس نے ان

کی بہن کو اغوا کیا تھا اب یہ بھائی اس کی بیوی کو اغوا کر کے اسی طرح خراب اور ذلیل کریں گے۔

دیہاتی سکھوں میں یہ رواج ہے کہ وہ للکار کر واردات یا کوئی حرکت کرتے ہیں اور للکار کر ہی انتقام لیتے ہیں۔ آخر ہُوا یہ کہ اس سکھ کی بیوی جو ابھی نوجوانی کی عمر میں تھی لاپتہ ہو گئی۔ اس لڑکی کے خاوند نے پولیس میں رپورٹ درج کروائی اور شک اس لڑکی کے بھائیوں پر لکھوایا جن کی بہن کو اس نے اغوا کرایا تھا۔ پولیس نے آکر ان بھائیوں کو مشتبہ بٹھا لیا اور بھائی انکار کر رہے ہیں۔ گمشدہ لڑکی کا کوئی سراغ نہیں مل رہا۔

"اس میں تو کوئی شک ہی نہیں" ——— چوہدری معراج نے کہا ——— "کہ اس گمشدہ لڑکی کو اس لڑکی کے بھائیوں نے اغوا کیا ہے جن کی بہن دو اڑھائی سال پہلے اغوا ہوئی تھی۔ یہ انتقامی واردات ہے، دیکھتے ہیں پولیس لڑکی کو کہیں سے برآمد کر بھی سکتی ہے یا نہیں"۔

"اس لڑکی کا کیا نام ہے جو دو اڑھائی سال بعد واپس آئی ہے؟" ——— صغیر نے پوچھا۔

"یہ تو مجھے معلوم ہے" ——— چوہدری معراج نے جواب دیا ——— "اس کا نام دلجیت کور ہے"۔

صغیر ہنس پڑا اور اس نے چوہدری معراج کو بتایا کہ اس لڑکی کو اسی نے فرار کروایا تھا اور اس کے گھر چھوڑ کر ادھر آگیا تھا۔ اسے کوئی دیکھ ہی نہیں سکا تھا۔

"اس بات کو یہیں پر رہنے دو" ——— چوہدری معراج نے کہا ——— "کسی کو پتہ نہیں چلنا چاہئے کہ اس لڑکی کو واپس لانے والا یہیں موجود ہے۔ ان سکھوں میں تو اب لمبی دشمنی چلے گی اور پولیس لڑکی کو ڈھونڈنے کی بجائے دونوں طرفوں سے کھاتی پیتی رہے گی"۔

چوہدری کے گھر ڈاکٹر رشید اور صغیر ہی رہ گئے تھے۔ خالدہ گھر کی عورتوں کے ساتھ رہتی تھی اور کچھ وقت ڈاکٹر رشید اور صغیر کے پاس آبیٹھتی تھی۔ ان کا موضوع اکثر یہی ہوتا تھا کہ پاکستان کیسا ہے، وہاں کے لوگ کیسے ہیں اور وہاں کی حکومت کیسی ہے اور ان کا استقبال کس طرح ہوگا۔ صغیر انہیں ان سوالوں کے جواب دیتا رہتا تھا۔ اس نے انہیں کبھی دھوکے میں نہیں رکھا تھا۔ پاکستان کی صحیح تصویر انہیں دکھانے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔

"یہ ہے تو پاکستان" ——— ایک روز صغیر نے کہا ——— "لیکن ناپاک لوگوں کے قبضے میں آگیا ہے۔ ایک طبقہ ہے جس نے یہ فرض کر لیا ہے کہ ملک پر حکومت کرنا اسی طبقے کا حق ہے۔ یہ طبقہ آپس میں لڑ جھگڑ کر، اوچھی سیاست کی بازی گری کے کرتب دکھا کر باری باری حکمران بنتا ہے اور اس طبقے نے پاکستان میں نہ سیاست کو نہ معاشرت کو اور نہ ہی مذہب کو پاک رہنے دیا ہے"۔

"میں نے پاکستان کے متعلق یہ باتیں پہلے بھی سنی تھیں" ——— ڈاکٹر رشید نے کہا ——— "یہ باتیں سن سن کر میں اس رائے پر پہنچا ہوں کہ پاکستانیوں کو ایک اور جنگِ آزادی لڑنی پڑے گی۔ اس قوم نے پہلے انگریزوں سے آزادی حاصل کی تھی اور اب پاکستان کو اس طبقے کے قبضے سے چھڑانے کے لئے ویسی ہی ایک اور جنگِ آزادی لڑنی ہوگی"۔

"لیکن اس قوم کو بیدار کون کرے گا!" ——— صغیر نے کہا ——— "پہلی بات تو یہ ہے کہ اس قوم کو قوم رہنے ہی نہیں دیا گیا۔ وہاں کے حکمران قوم کو عوام کہتے ہیں۔ لیڈروں کے اس طبقے نے ملک میں ایسی فضا اور ایسی صورتِ حال پیدا کر دی ہے جس میں لوگ ایک دوسرے کو دھوکہ دے کر پیسہ کمانے کی کوشش کرتے ہیں اور جو سرکاری مشینری کے کل پُرزے ہیں وہ رشوت خوری، کرپشن اور حرام خوری کو جائز سمجھ بیٹھے ہیں۔ یہ تو میں بھی سوچا کرتا ہوں کہ ملک کو اس طبقے سے آزاد کرانے کے لئے اسی جذبے کی ضرورت ہے جس نے مجھ میں قومی وقار اور اسلامی غیرت پیدا کر دی ہے اور یہ وہی جذبہ ہے جس کے ہاتھوں آپ نے مجبور ہو کر میرے لئے اتنی بڑی قربانیاں دی ہیں اور جہنم کی اذیتیں برداشت کی ہیں"۔

"یوں نہ کہیں کہ جذبہ پیدا ہُوا ہے" ——— ڈاکٹر رشید نے کہا ——— "یہ جذبہ ہر مسلمان کے خون میں شامل ہے۔ جذبے دبا دیئے یا سلا دیئے جاتے ہیں، جذبے مرا نہیں کرتے۔ ایسی قیادت کی ضرورت ہے جو اس جذبے کو قوم میں بیدار کر دے"۔

"مجھے دیکھئے ڈاکٹر صاحب" ——— صغیر نے کہا ——— "میں تو پکا کافر ہو گیا تھا۔ اپنے ملک سے غداری کفر نہیں تو اور کیا ہے لیکن اللہ نے ایک جھٹکا دے کر مجھے بیدار کر دیا ہے۔ کبھی کبھی میں خود حیران ہوتا ہوں کہ میں ان مشکلات اور مصائب سے نکل کر یہاں تک پہنچا ہوں اور وہ کیا طاقت تھی جس نے مجھ میں یہ قوتِ برداشت پیدا کی.... دراصل ڈاکٹر صاحب! ہم میں غیرت نہیں رہی۔ ہم اس وقت جس علاقے میں بیٹھے ہیں، اس علاقے

میں گھروں میں جاکر دیکھیں۔ آپ کو کئی ایسی عورتیں نظر آئیں گی جو سکھوں کی بیویاں ہیں اور انہوں نے سکھ پیدا کئے ہیں۔ وہ مسلمان گھرانوں میں پیدا ہوئی تھیں اور اگست 1947ء میں جوان ہوئیں۔ انہیں سکھوں نے اغوا کیا' خراب کیا اور بعض نے ان میں سے کچھ لڑکیوں کو اپنی بیویاں بنالیا اور انہوں نے سکھ پیدا کئے۔ پاکستانی انہیں ذہن اور دل سے ہی اتار چکے ہیں"۔

یہ جذبے اپنی جگہ برحق ہی سہی لیکن انسان اپنے جذبات سے دستبردار نہیں ہوسکتا۔ یہ حالت خالدہ کی تھی۔ وہ بھی مسلمان گھرانے میں ہی پیدا ہوئی تھی اور اس میں اسلام کی محبت موجود تھی اور اسلام کی عظمت کو بھی پہچانتی تھی لیکن ڈاکٹر رشید کے ساتھ آنے میں اس کے زیادہ تر جذبات کارفرما تھے۔ اسے ڈاکٹر رشید انہی اوصاف کی وجہ سے اچھا لگا تھا۔ پھر جب ڈاکٹر رشید نے صغیر کو فرار کراکے خود اذیتیں برداشت کیں اور کسی کی نشاندہی نہ کی تو خالدہ اس پر مرمٹی۔ ابھی وہ ڈاکٹر رشید اور صغیر کی گفتگو میں اور ان کے تبادلۂ خیالات میں شامل ہوئی تھی اور اس کی باتوں سے پتہ چلتا تھا کہ اسلامی روایات اس کے خون میں زندہ و بیدار اور رواں دواں ہیں لیکن اپنے اور اپنے عزیزوں کو نہیں بھولتی تھی۔ انہیں یاد کرتی تو اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے۔ ایسے میں ڈاکٹر رشید اسے جذباتی سہارا دے کر سنبھال لیتا تھا۔

صغیر خالدہ سے ایک ہی بات کہتا تھا کہ وہ جب پاکستان میں کسی ٹھکانے پر پہنچ جائے گا تو اسے اپنے پرائے سب بھول جائیں گے لیکن سرحد پار کرنے کا ابھی کوئی انتظام نہیں ہو رہا تھا۔ کوئی ایسا پیچیدہ اور مہنگا انتظام تو نہیں کرنا تھا' صرف یہ دیکھنا تھا کہ سرحد تک کا علاقہ کب محفوظ ہوتا ہے۔

چوہدری معراج کا رابطہ ایک دو سمگلروں اور ان کے کارندوں کے ساتھ ہوا تھا۔ وہ ان سے پوچھتا رہتا تھا کہ سرحد کی فضا صاف ہے یا نہیں۔ ایسے ہی ایک سمگلر نے چوہدری کو بتایا کہ نہ جانے کیا وجہ ہوگئی ہے کہ سرحد پر مخبر کچھ زیادہ ہی پھیلا دیئے گئے ہیں۔ اس کی متعدد وجوہات ہوسکتی تھیں جن میں ایک یہ تھی کہ کسی خاص سمگلر کو پکڑنا مقصود ہوتا تھا۔ ایک وجہ یہ بھی ہُوا کرتی تھی کہ بعض اوقات پاکستان میں انڈیا کے جاسوسوں کی طرف سے انڈین انٹیلی جنس کو اطلاع ملتی تھی کہ ایک دو پاکستانی جاسوس انڈیا میں داخل ہونے والے ہیں۔ انہیں پکڑنے کے لئے سرحد پر کسانوں کے بھیس میں

مخبر پھیلا دیئے جاتے تھے۔ بہرحال چوہدری معراج نے انہیں یقین دلا رکھا تھا کہ انہیں صحیح و سلامت سرحد پار بھیج دے گا۔

○

کراچی سے پکڑے ہوئے ملزموں کو راولپنڈی پہنچا دیا گیا تھا۔ سب کو الگ الگ کوٹھڑیوں میں بند کردیا گیا تھا۔ وہاں پہنچتے ہی ان سب کو فرداً "فرداً" بتادیا گیا تھا کہ ان کے فائدے میں یہ ہے کہ وہ اقبال جرم کرلیں اور اپنے پاکستانی ایجنٹوں کی نشاندہی کردیں۔ ان میں سے کسی ایک نے بھی رضامندی کا اظہار نہ کیا۔ وہ سب یوں بے خوف اور مطمئن تھے جیسے ان کی گرفتاری کوئی بات ہی نہیں اور وہ جب چاہیں رہا ہوجائیں گے۔ وہاں تفتیش کرنے والے افسر دوسرے تھے یعنی وہ کرنل اور میجر نہیں تھے جنہوں نے کراچی ان کے ٹھکانے پر چھاپہ مارا تھا۔ تفتیشی ٹیم کا سربراہ ایک لیفٹیننٹ کرنل تھا۔ اس کرنل نے لوُسی کو الگ کرلیا اور اسے بٹھا کر بتایا کہ اس کے لئے بہتر ہے کہ اقبال جرم کرلے ورنہ چند دنوں بعد وہ جب آئینہ دیکھے گی تو کہے گی کہ یہ تو اس کی ماں یا دادی کا عکس ہے۔ کرنل نے اسے کہا کہ وہ تسلیم کرلے کہ میجر عثمان کے ساتھ اس کے تعلقات تھے اور میجر عثمان اس کے رنگ کا بڑا سرگرم ایجنٹ تھا۔

لوُسی کے ہونٹوں پر تبسّم تھا اور آنکھوں میں کچھ اور ہی نوعیت کی چمک تھی۔ اس کی تو جیسے آنکھیں بھی مسکرا رہی تھیں۔ لوُسی کو اپنے حسن و شباب پر بڑا ہی ناز تھا۔ یہ تھی بھی حقیقت کہ اس نے پتھروں سے دودھ کی دھاریں نکالی تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اس وقت ایک کرنل کے قبضے میں ہے جو اس سے کچھ پوچھ رہا ہے اور اسے اذیتیں دے دے کر اقبال کروا سکتا ہے لیکن وہ جانتی تھی کہ یہ کرنل آخر ایک انسان ہے۔ لوُسی کے ترکش میں ایک سے ایک بڑھ کر زہریلا تیر تھا۔ اُس نے یہ تیر چلانے شروع کردیئے۔ ناز و انداز کے ذریعے کسی پر طلسم طاری کرنا لوُسی کا ایک خاص کمال تھا۔ اس نے ایسے شکار بھی مارے تھے کہ اپنے رِنگ لیڈر کو حیران کردیا تھا۔ اسے غالباً" توقع تھی کہ اس کرنل کو بھی اپنے طلسم میں لے لے گی۔ کرنل اس سے میجر عثمان کے متعلق پوچھ رہا تھا۔

"میں آپ کی ملزم ہوں" ــــ لوُسی نے مخمور مسکراہٹ سے کہا ــــ "یہ باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی' ایک دو دن تو مجھے اپنا مہمان سمجھیں۔ پاکستان آرمی کے کرنل ایسے پتھر دل تو نہیں ہُوا کرتے!؟"

"لُوسی!" ـــ کرنل نے بڑے تحمّل سے کہا ـــ "تم پہلی لڑکی نہیں ہو جو میری تفتیش میں آئی ہو۔ تم سے کہیں زیادہ خوبصورت لڑکی میری تفتیش میں سے گزر چکی ہے۔ اگر اس کے ساتھ تمہارا موازنہ کروں تو یہی کہوں گا کہ وہ چاند تھی اور تم زرد پیلی روشنی دینے والا چراغ ہو..... میں تم سے پوچھ رہا ہوں کہ میجر عثمان تمہارے رنگ کا ایجنٹ تھا؟"

"میں کسی میجر عثمان کو نہیں جانتی" ـــ لُوسی نے ہونٹوں پر تبسّم قائم رکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے ابھی بتانا تو نہیں چاہئے تھا" ـــ کرنل نے کہا ـــ "لیکن بتا دیتا ہوں..... جس میجر عثمان کو تم نہیں جانتیں اُسی نے تمہاری نشاندہی کی ہے اور وہ اقبالی بیان دے چکا ہے۔ چونکہ وہ ہمارا پاکستانی آرمی آفیسر ہے اس لئے ہم اسے وعدہ معاف گواہ نہیں بنائیں گے۔ ہو سکتا ہے تمہیں ہی ہم وعدہ معاف گواہ بنالیں پھر کیس ختم ہونے کے بعد تمہیں سرکاری طور پر انڈیا واپس بھیج دیا جائے گا"۔

"میں نے جو کہہ دیا ہے اسی پر قائم رہوں گی" ـــ لُوسی نے کہا ـــ "میں نے جس شخص کو کبھی دیکھا ہی نہیں اس کے متعلق میں بتا ہی کیا سکتی ہوں"۔

"اٹھو' میرے ساتھ چلو" ـــ کرنل نے اٹھ کر لُوسی کو بازو سے پکڑتے ہوئے کہا ـــ "میں تمہیں وہ میجر عثمان دکھا دیتا ہوں۔ تم اپنے دوست سے مل کر یقیناً" خوش ہوگی"۔

کرنل لُوسی کو لے کر اس کوٹھڑی تک لے گیا جس میں عثمان بند تھا۔ اُس وقت عثمان فرش پر بیٹھا ہُوا تھا۔ اس کی پیٹھ دیوار کے ساتھ لگی ہوئی تھی اور اس کا سر جھکا ہُوا تھا۔ لوسی کو اس کوٹھڑی کی بند سلاخوں کے سامنے کھڑا کر کے کرنل نے عثمان کو پکارا۔ عثمان نے آہستہ آہستہ سر اوپر اٹھایا اور دروازے کی طرف دیکھا۔ یہ سلاخوں کا دروازہ تھا۔

لُوسی کو دیکھ کر میجر عثمان کے چہرے پر نمایاں تبدیلی آئی اور اس کی آنکھیں جو اَدھ کھُلی تھیں پوری کھل گئیں۔ یہ حیرت کا تاثر تھا۔ عثمان کا رنگ سیاہ ہو گیا تھا اور یہ بڑی پھیکی اور بھدی سی سیاہی تھی۔ اُس کا چہرہ مرجھایا اور چوسا ہُوا تھا۔ سر کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ داڑھی کچھ بڑھی ہوئی تھی۔

کرنل نے لُوسی کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر بھی حیرت اور پریشانی کا ہلکا سا تاثر تھا۔ وہ ہزار انکار کرتی لیکن اس کے چہرے کا تاثر بتا رہا تھا کہ عثمان کو اس بدبو دار کوٹھڑی میں دیکھ کر لُوسی کو افسوس ہُوا ہے اور حیرت اس لئے کہ وہ پکڑا کس طرح گیا۔ عثمان خاموش تھا لُوسی خاموش تھی اور کرنل خاموشی سے دونوں کو باری باری دیکھ رہا تھا۔ شاید ایک منٹ گزر گیا ہو گا جب کرنل نے لُوسی کا بازو پکڑا اور اسے وہاں سے لے چلا۔

"میں تمہاری بات مان لیتا ہوں لُوسی!" ـــ کرنل نے کہا ـــ "اس عثمان کو تم نہیں پہچانتیں۔ یہ تو اب اپنے آپ کو بھی نہیں پہچانتا۔ اس نے اس حالت میں پہنچ کر اقبالی بیان دیا ہے۔ اگر یہاں آتے ہی بیان دے دیتا تو اس کا حلیہ اتنا زیادہ نہ بگڑتا۔ اس نے خود ہی اپنے آپ پر ظلم کیا ہے۔ میں ایک بار پھر تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ اس حالت تک پہنچنے سے پہلے اقبالی بیان دے دو"۔

کرنل اپنے طریقہ تفتیش کے مطابق لُوسی سے غلط بیانی کر رہا تھا کہ میجر عثمان نے اقبالی بیان دے دیا ہے۔ حقیقت یہ تھی کہ عثمان نے کوئی بیان نہیں دیا تھا اور اس جرم کو ثابت کرنے والی جو شہادت اس کے آگے رکھی گئی تھی' اسے وہ تسلیم نہیں کر رہا تھا۔

لُوسی کو تو چپ ہی لگ گئی تھی۔ اس کے ناز و انداز ختم ہو چکے تھے اور ہونٹوں پر جو تبسّم تھا وہ جانے کہاں اُڑ گیا تھا۔ چمکتی آنکھوں میں اب بے چینی کا تاثر تھا۔ اسے شاید یقین نہیں آ رہا تھا کہ عثمان نہ صرف یہ کہ گرفتار ہو چکا ہے بلکہ اس کی یہ حالت ہو گئی ہے جو وہ دیکھ آئی تھی۔

کرنل چلتے چلتے ایک خالی کوٹھڑی کے سامنے رک گیا۔ اس نے ایک آدمی کو بلایا اور کوٹھڑی کھلوائی۔ اس نے لُوسی کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور آہستہ سے اسے کوٹھڑی کی طرف دھکیلا۔ لوسی نے دو قدم اٹھائے اور رک گئی۔ اس نے گردن گھما کر کرنل کی طرف دیکھا۔ اب اس کے چہرے پر گھبراہٹ اور پریشانی کا ملا جلا تاثر نمایاں ہو گیا تھا۔ کرنل نے سنتری سے کہا کہ اسے بند کر دو۔ سنتری نے آگے بڑھ کر لُوسی کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بے دردی سے دھکیلتا ہُوا کوٹھڑی تک لے گیا اور پھر پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر اندر دھکیلا اور سلاخیں اپنی طرف کھینچ کر تالا لگا دیا۔

لُوسی نے اس تنگ سی کوٹھڑی کو دیکھا۔ وہاں صرف ایک بوسیدہ اور گندہ مندہ سا کمبل پڑا تھا اور مٹی کے رنگ کی دری بھی پڑی ہوئی تھی۔ یہ چارپائیوں پر بچھانے والی

دری تھی۔ لوسی تو شہزادی تھی۔ نہ جانے کتنے دلوں پر راج کرتی تھی اور وہ اس احساس سے بیگانہ نہیں تھی کہ وہ ایک بڑی ہی قیمتی لڑکی تھی لیکن اسے کوڑے کرکٹ کی طرح ایک بدبودار کوٹھڑی میں پھینک دیا گیا تھا۔

"یہاں بیٹھو لوسی!" ـــ کرنل نے کہا ـــ "اور سوچو' میں تمہیں سوچنے کا موقع دے رہا ہوں"۔

کرنل وہاں سے چلا گیا۔ کمرے میں جا کر کرنل نے دوسری دونوں لڑکیوں کو باری باری بلایا اور ان کے ساتھ بھی ایسی ہی باتیں کیں جیسی لوسی کے ساتھ کی تھیں۔ انہیں اقبالِ جرم سے انکار کی صورت میں وہ انجام بتایا جو ان کا ہونا تھا۔ وہ دونوں بھی لوسی کی طرح ہی پُرکشش' جاذبِ نظر اور حسین و جمیل تھیں لیکن انہیں ایسی ٹریننگ دی گئی تھی کہ وہ اپنا جرم تسلیم کرتی ہی نہیں تھیں۔

کرنل نے ابھی باقاعدہ تفتیش شروع نہیں کی تھی۔ یہ تو اس نے صرف دیکھا تھا کہ یہ لڑکیاں کتنے پانی میں ہیں اور کیا یہ ہتھیار ڈالنے پر جلدی رضامند ہو جائیں گی یا نہیں اور ان لڑکیوں میں سے کس سے یا ان کے ساتھ کے آدمیوں میں سے کس سے اقبالِ جرم کروانا آسان ہو گا۔ ایک تو اس رِنگ کے دیگر افراد کی اور ان کے پاکستانی ایجنٹوں کی نشاندہیاں کروانی تھیں اور دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ شہادت کے تمام خانے پُر کرنے تھے۔ شہادت تو تھی لیکن وہ اتفاقی اور واقعاتی نوعیت کی تھی' ضرورت ٹھوس اور ایسی قابلِ اعتماد شہادت تھی جو قانون کو مطمئن کر سکتی۔ یہ جو شہادت موجود تھی اور جس پر ان سب کو گرفتار کیا گیا تھا' یہ ایک پختہ اور قابلِ یقین کی شک کی حیثیت رکھتی تھی۔ ان کے گھر سے بلا لائسنس اسلحہ برآمد ہُوا تھا۔ انہیں زیادہ سے زیادہ اس الزام میں سزا دی جا سکتی تھی کہ انہوں نے بغیر لائسنس اسلحہ گھر میں رکھا ہُوا تھا۔ اصل جرم یہ ثابت کرنا تھا کہ یہ لوگ جاسوس ہیں اور اب تک انہوں نے جاسوسی اور تخریب کاری کی کیا کیا کارروائیاں کی ہیں۔

اتنے بڑے اور ایسے خطرناک گروہ کو پکڑ لینا آئی ایس آئی کی بہت بڑی کامیابی تھی لیکن شہادت کی فراہمی اور تفتیش بڑا ہی صبر آزما اور طویل عمل تھا۔ اس میں اپنے افسروں کو عقل و دانش کا استعمال پوری یکسوئی سے کرنا تھا۔ اس کرنل نے لوسی اور میجر عثمان کا آمنا سامنا جو کرایا تھا یہ دانشمندانہ اقدام تھا۔ کرنل کے اس اقدام نے میجر عثمان

اور لوسی کے ذہن و دل میں زلزلے بپا کر دیئے تھے۔ دونوں کو غالباً" یہ توقع تھی کہ ان پاکستانیوں کے پاس کوئی شہادت نہیں کہ وہ ان کے خلاف جاسوسی کا الزام ثابت کر سکے۔ عثمان کو شاید یقین ہی نہیں آتا تھا کہ لوسی بھی گرفتار ہو سکتی ہے اور لوسی کو بھی ایسی توقع نہیں تھی کہ عثمان کبھی پکڑا بھی جائے گا۔ اب دونوں نے ایک دوسرے کو آئی ایس آئی کے جال میں پھنسا دیکھا۔

میجر عثمان کو تو اس رِنگ کے لیڈر نے یقین دلا رکھا تھا کہ اگر کبھی پکڑا بھی گیا تو اس کے ہاتھ اتنے لمبے ہیں کہ وہ عثمان کو چھڑوا لے گا۔ عثمان کو ابھی بتایا نہیں گیا تھا کہ اس کا یہ رِنگ لیڈر بھی پکڑا گیا ہے جس نے اسے گرفتاری کی صورت میں چھڑوانے کی گارنٹی دے رکھی تھی۔

اب عثمان ایک کال کوٹھڑی میں اور لوسی ایسی ہی ایک اور کال کوٹھڑی میں بیٹھی ہوئی تھی اور ان دونوں کی سوچیں اس سوال کے اردگرد ایک بھنور کی طرح گھوم رہی تھیں کہ یہ کیا ہُوا!.... دونوں یقیناً" یہی سوچ رہے تھے کہ اب ان کا رویّہ کیا ہونا چاہئے لیکن دونوں بڑے ڈھیٹ تھے اور اس مسئلے پر غور کر رہے تھے کہ اقبالِ جرم نہ کریں' شاید عدالت سے رہائی مل جائے۔ لوسی کو یہ سوچ بھی پریشان کر رہی تھی کہ کرنل نے اسے بتایا تھا کہ عثمان نے اس کی نشاندہی کی ہے اور گرفتار کروایا ہے۔ وہ سوچتی تھی کہ اس میں صداقت ہے یا نہیں!

کرنل نے ایک میجر کو بلا کر کہا کہ عثمان کو تفتیشی کمرے میں لے آئے۔ چند ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ کرنل کو اطلاع دی گئی کہ عثمان کو تفتیشی کمرے میں لے آئے ہیں۔ کرنل وہاں گیا۔ عثمان کا سر ڈول رہا تھا۔

"عثمان!" ـــ کرنل نے کہا ـــ "کیا اب بھی تم خوش فہمی میں مبتلا ہو؟.... میں ایک بار پھر اور آخری بار تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ مان جاؤ۔ مجھے تم جیسے غداروں کے ساتھ ذرا جتنی بھی ہمدردی نہیں اور ہونی بھی نہیں چاہئے لیکن عثمان' تم میری فوج کے افسر ہو اور بڑے معزّز خاندان کے چشم و چراغ ہو۔ میں دلی طور پر چاہتا ہوں کہ تمہارا یہ سٹیٹس قائم رہے۔ تم نے اپنی یہ حالت جو ہمارے ہاتھوں کروائی ہے اس کے ذمہ دار صرف تم ہو.... یہ بھی سن لو کہ یہ سب ہندو ہیں جنہیں ہم نے پکڑ لیا ہے۔ انہیں تمہارے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں۔ اب بھی پکے مسلمان بن جاؤ اور مدد مجھ سے لو۔ میں

تمہیں وعدہ معاف گواہ بنوا دوں گا"۔

عثمان کا شاید دماغ ماؤف ہو گیا تھا یا وہ ابھی تک کسی خوش فہمی میں مبتلا تھا یا وہ ان لوگوں میں سے تھا جو موت قبول کر لیتے ہیں اور مانتے نہیں۔ اس نے کرنل کی یہ بات سن کر انکار میں سر ہلا دیا۔ کرنل چپ چاپ اس کے منہ کی طرف دیکھتا رہا۔

"میرے خلاف شہادت لاؤ"۔۔۔ کچھ دیر بعد عثمان نے نحیف سی آواز میں کہا۔۔۔ "میرے خلاف جرم ثابت ہو جائے تو پوری سزا دو"۔

"یہ بھی سن لو عثمان!"۔۔۔ کرنل نے کہا۔۔۔ "تمہاری اپنی بیوی تمہارے خلاف کورٹ مارشل میں یا کورٹ میں گواہی دے گی۔ وہ مکمل شہادت پیش کرے گی"۔

عثمان یوں چونک اٹھا جیسے اسے کسی نے سوئی چبھو دی ہو اور وہ گہری نیند سے بیدار ہو گیا ہو۔

"کیا تم لوگوں نے میری بیوی کو بھی شاملِ تفتیش کر رکھا ہے؟"۔۔۔ عثمان نے جاندار اور غضبیلی آواز میں پوچھا۔۔۔ "میں جانتا ہوں کہ تم میری بیوی کو پریشان اور دہشت زدہ کر کے اپنی لائن پر لاؤ گے کہ جو تم کہلوانا چاہو گے وہ کہہ دے گی۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ اس طرح میں اقبالی بیان دے دوں گا؟..... ٹارچر مجھے کرو، اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے ہو تو ایک عورت پر ہاتھ نہ اٹھاؤ"۔

"میجر عثمان"۔۔۔ کرنل نے بڑے تحمل سے کہا۔۔۔ "میں نے تمہاری بیوی کو ابھی دیکھا ہی نہیں۔ اس کا یہاں راولپنڈی میں ہونا تو دور کی بات ہے، اسے ہمارے لاہور آفس میں بھی نہیں بلوایا گیا۔ وہ اپنے گھر میں باعزت زندگی بسر کر رہی ہے لیکن یہ معلوم ہو گیا ہے کہ وہ تمہاری گرفتاری پر خوش ہے اور کورٹ میں تمہارے خلاف بیان دے گی"۔

کرنل اٹھا اور میجر کو اشارہ کیا کہ اسے سیل میں لے جائے۔



پانچ چھ دن اور گزر گئے۔ ایک روز چوہدری معراج باہر سے آیا اور ڈاکٹر رشید اور صغیر کے کمرے میں داخل ہو کر بڑی خوشی کا اظہار کیا۔

"لو میرے بھائیو!"۔۔۔ چوہدری معراج نے پُرمسرت لہجے میں کہا۔۔۔ "آج رات آپ کی رخصتی ہے۔ بڑا اچھا انتظام ہو گیا ہے"۔

چوہدری نے انہیں تفصیل سے بتایا کہ انتظام کیا ہُوا ہے اور ایک شخص ان کے ساتھ سرحد تک جائے گا۔ دراصل سرحد کوئی دیوار تو ہوتی نہیں نہ وہاں کوئی لکیر کھینچی ہوئی ہوتی ہے، یہ محض اندازہ ہوتا ہے یا جاننے والے جانتے ہیں کہ سرحد کہاں سے شروع ہوتی ہے۔

"میرے عزیزو!"۔۔۔ چوہدری معراج نے کہا۔۔۔ "اللہ تمہیں خیریت سے پاکستان پہنچا دے، میرے لئے دعا کرنا کہ اللہ مجھے اس کارِ خیر کا صلہ عطا فرمائے کہ میرا بیٹا پاگل خانے سے رہائی پائے"۔

چوہدری جذباتی ہو گیا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ڈاکٹر رشید نے اسے یقین دلایا کہ عبدالستار اس کے بیٹے کو بالکل صحیح کروا کے پاگل خانے سے ڈسچارج بھی کروا دے گا۔ ڈاکٹر رشید کو اس عیسائی ڈاکٹر پر پورا اعتماد تھا جس نے اس کا علاج کیا تھا اور چوہدری معراج کے بیٹے کا بھی علاج کر رہا تھا۔ چوہدری معراج دراصل اسلامی جذبہ رکھنے والا مسلمان تو ضرور تھا لیکن اللہ کے ساتھ ساتھ وہ عبدالستار کو بھی خوش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے خالدہ کے متعلق فکرمندی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اسے اس لڑکی کے متعلق کچھ زیادہ پریشانی ہے۔ مرد اگر پکڑے بھی جائیں تو ہر اذیت سہہ لیتے ہیں لیکن لڑکی کا معاملہ کچھ اور ہی ہوتا ہے۔

ڈاکٹر رشید اور صغیر نے کہا کہ یہ خطرہ مول لینا ہی ہے۔ اللہ نے یہاں تک پہنچا دیا ہے تو یہ امید بھی رکھنی چاہئے کہ سرحد پار بھی چلے جائیں گے۔

"تمہارے پاس کوئی ہتھیار ہونا چاہئے"۔۔۔ چوہدری معراج نے کہا۔۔۔ "ریوالور ہوتا یا پسٹل ہوتا لیکن میں سوچتا ہوں کہ سرحد پر گولی نہ ہی چلے تو ٹھیک ہے۔ ایک گولی فائر ہو تو رینجر دوڑتے ہوئے وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ پھر بھی خنجر یا چاقو تو ضرور ہی ساتھ ہونا چاہئے"۔

صغیر نے بتایا کہ اس کے پاس ایک بڑا چاقو ہے اور ڈاکٹر رشید کے پاس بھی ایسا ہی چاقو یا خنجر ہونا چاہئے۔ چوہدری معراج نے اسی وقت ایک خنجر اندر سے لا کر ڈاکٹر رشید کو دے دیا۔ پھر وہ افسوس کرنے لگا کہ وہ ان دونوں کو کوئی تحفہ نہیں دے سکتا کیونکہ وہ ایسے سفر پر جا رہے تھے جس میں کوئی سامان ساتھ نہیں لے جایا جا سکتا تھا۔

اُس دن کا سورج غروب ہو گیا۔ انہوں نے رات کا کھانا کھایا اور وہ آدمی بھی آ گیا

جس نے انہیں اپنے ساتھ لے جانا تھا۔ روانگی کا وقت رات گیارہ بجے مقرر کیا گیا تھا۔ چوہدری نے ایک سوزوکی کار کا انتظام کرلیا تھا۔ کار یا کوئی بھی گاڑی جالندھر شہر سے سرحد کی طرف کم و بیش دس کلو میٹر دور تک جاسکتی تھی لیکن بچ بچا کر۔ پھر سرحد تک تقریباً بیس بائیس کلو میٹر کا فاصلہ رہ جاتا تھا جو پیدل طے کرنا تھا۔ صغیر نے اس آدمی سے سرحد کے اس علاقے کے متعلق کچھ باتیں پوچھیں۔ وہ دراصل اس علاقے کے خدوخال پوچھ رہا تھا۔ اس آدمی نے تفصیل سے اس زمین کے خدوخال بتا دیئے۔

"پھر کوئی مشکل نہیں" ــــ صغیر نے کہا ــــ "میں اس زمین سے بڑی اچھی طرح واقف ہوں۔ دو مرتبہ پاکستان سے آیا ہوں اور اسی راستے سے گزرا بھی ہوں۔ ایک نالہ ذرا گہرا سرحد کی طرف مڑتا ہے اور کچھ آگے جاکر سرحد کے ساتھ ہو جاتا ہے اور یہ نالہ بڑا اچھا چھپاؤ مہیا کرتا ہے۔ آج کل برسات کا موسم ہے اس لئے اس نالے میں کچھ پانی ہوگا لیکن ہم پانی میں چلنا بہتر سمجھیں گے کیونکہ دور سے کسی کو نظر نہیں آسکیں گے"۔

"پانی بہت تھوڑا ہے" ــــ اس آدمی نے کہا ــــ "زیادہ تر نالہ خشک ہے اور پھسلن تو ہوگی لیکن ریت بھی ہے۔ چلو یہ بھی اچھا ہے کہ آپ لوگ اس سے واقف ہیں"۔

رات گیارہ بجنے میں ابھی کچھ منٹ باقی تھے جب یہ لوگ گاڑی میں بیٹھ گئے۔ چوہدری معراج خود گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ ایک گھنٹے تک گاڑی اُس مقام تک پہنچ گئی۔ جہاں سے ان کا پیدل سفر شروع ہونا تھا۔ سب گاڑی سے اترے اور بڑے ہی جذباتی انداز سے رخصت ہوئے۔ چوہدری معراج نے انہیں دعاؤں اور بہتے آنسوؤں سے رخصت کیا اور خدا حافظ کہہ کر پھر کہا کہ اس کے لئے یہ دعا ضرور کریں کہ اس کا بیٹا پاگل خانے سے نکل آئے۔ ڈاکٹر رشید اور صغیر نے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر کہا کہ اللہ چوہدری کو یہ اجر ضرور دے گا۔

چوہدری معراج نے اپنے آپ کو خاصے بڑے خطرے میں ڈال دیا تھا۔ وہ اس طرح کہ جس آدمی کو اس نے ان لوگوں کے ساتھ بھیجا تھا' اسے واپس بھی آنا تھا اور پھر اسے چوہدری معراج نے واپس گھر لے جانا تھا۔ اتنی دیر چوہدری نے وہیں اس کا انتظار کرنا تھا لیکن گاڑی کو کہیں چھپانا ضروری تھا کیونکہ بارڈر سکیورٹی فورس کی گشت کے گزرنے کا خطرہ تھا اور شہری پولیس کی گشت بھی آسکتی تھی۔ یہ تو اللہ پر چھوڑ دیا گیا تھا کہ یہ آدمی خیر و عافیت سے واپس آجائے گا یا نہیں۔



پارٹی قدم قدم پھونک پھونک کر رکھتی' چھپتی چھپاتی بڑھتی چلی گئی۔ کہیں ساؤنی کی فصل کی اوٹ مل گئی اور کہیں سرکنڈوں کا جنگل آگیا اور جو جگہ بنجر اور ویران آئی' وہاں سے اللہ کے بھروسے چلتے گئے اور اس طرح انہوں نے چھ سات کلو میٹر کا فاصلہ طے کرلیا۔ ابھی ایک خطرہ سامنے نہیں آیا تھا۔ یہ تھا رات کا پچھلے پہر کا چاند جو ابھی افق سے اوپر نہیں آیا تھا اور افق پر اس کے ابھرنے کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ انہیں ضرورت گھپ اندھیرے کی تھی۔

چلتے چلتے صغیر رک گیا۔ اسے دیکھ کر باقی بھی رکے۔ صغیر نے اپنے گائیڈ سے آگے کی دو چار باتیں پوچھیں جو گائیڈ نے بڑی اچھی طرح واضح کر کے بتائیں۔

"پھر میرے بھائی!" ــــ صغیر نے اس شخص سے کہا ــــ "تم یہیں سے واپس چلے جاؤ۔ آگے کا سارا علاقہ اور سرحد تک کا صحیح راستہ مجھے معلوم ہے' میرا دیکھا بھالا ہے' میں بغیر کسی مشکل کے سرحد تک پہنچ جاؤں گا"۔

"نہیں بھائیو!" ــــ اس آدمی نے کہا ــــ "چوہدری صاحب نے مجھے کہا تھا کہ یہ لوگ سرحد سے آگے نکل جائیں تو واپس آنا۔ میں یہیں سے واپس جاکر چوہدری صاحب کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔ تم نہیں جانتے کہ مجھ پر چوہدری صاحب کے کتنے احسانات ہیں"۔

ڈاکٹر رشید تو خاموش رہا کیونکہ اسے تو اس علاقے سے ذرا سی بھی واقفیت نہیں تھی۔ صغیر ہی بہتر فیصلہ کر سکتا تھا: اس نے بڑی ہی مشکل سے اس وفادار اور دیانت دار شخص کو واپس چلے جانے پر راضی کیا۔ اب ڈاکٹر رشید' صغیر اور خالدہ رہ گئے تھے۔ صغیر نے انہیں کہا کہ اللہ کو یاد کرتے رہیں اور کوئی فکر نہ کریں' وہ انشاء اللہ سرحد پار کرا دے گا۔

"اور خالدہ بہن!" ــــ صغیر نے خالدہ سے کہا ــــ "اب اپنے آپ کو عورت سمجھنا چھوڑ دو اور مرد بن جاؤ۔ کہیں تم نے اتنی زیادہ تھکن محسوس کی کہ چلنے میں دشواری ہو تو صاف بتا دینا' میں تمہیں کندھوں پر اٹھا لوں گا"۔

خالدہ کی ہنسی نکل گئی اور یہ بڑی جاندار ہنسی تھی۔ اس کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا کہ اس کا حوصلہ اور جذبہ تر و تازہ ہے اور وہ تھکے گی نہیں۔

وہ چلتے گئے اور سرحد کے اور قریب ہوئے۔ اس وقت تک چاند افق سے اوپر آگیا تھا اور برسات کے موسم کی وجہ سے فضا اتنی صاف اور شفاف تھی کہ چاندنی مکمل طور پر اپنی چمک دے رہی تھی۔ خاصی دور تک نظر کام کرتی تھی۔ راستہ دیکھنے کے لئے تو چاندنی فائدہ مند تھی لیکن خطرہ یہ کہ یہ لوگ دور سے نظر آسکتے تھے۔ اس علاقے میں گھومتا پھرتا کوئی بھی شخص مشکوک ہی ہو سکتا تھا ورنہ رات کے وقت کسی شہری کا اس علاقے میں کوئی کام نہیں ہو سکتا تھا۔ اب علاقہ بنجر شروع ہو گیا تھا جس میں چھوٹے بڑے کھڈ بھی تھے۔ کیکر کی قسم کے کہیں کہیں درخت بھی کھڑے تھے۔ صغیر نے انہیں بتایا کہ تھوڑی ہی دور آگے سرکنڈوں کا جنگل سا آجائے گا اور اس سے تقریباً" ایک فرلانگ آگے وہ نالہ ہو گا جس میں وہ اتریں گے اور یہ نالہ انہیں سرحد پار تک پہنچا دے گا۔

وہ جوں جوں سرحد کے قریب ہوتے جا رہے تھے خطرہ بڑھتا جا رہا تھا۔ خطرہ یہ تھا کہ بارڈر سکیورٹی فورس کی گشت بعض اوقات دور بھی آجایا کرتی تھی۔ یہ ایسا خطرہ تھا جس سے صغیر کو جاسوسی کی ٹریننگ کے دوران آگاہ کیا گیا تھا اور اچھی طرح بتایا گیا تھا کہ دو سنتری کس طرح اور کہاں تک گشت کرتے ہیں اور ان سے بچنے کا طریقہ کیا ہوتا ہے۔

کچھ دیر بعد سرکنڈوں کا جنگل آگیا۔ یہ کوئی ڈیڑھ ایک ایکڑ لمبا اور کچھ اتنا ہی چوڑا تھا اور اس کے درمیان کچھ جگہ خالی بھی تھی جیسے کھیتوں کی مینڈھیں ہوتی ہیں۔ سرکنڈے ایک اوسط درجہ آدمی کے قد تک اونچے تھے۔ تینوں ایک دوسرے کے پیچھے جا رہے تھے۔ صغیر ان کے آگے تھا۔

صغیر یکلخت رک گیا اور دونوں ساتھیوں کو اشارہ کیا کہ بیٹھ جائیں۔ وہ بیٹھے تو صغیر نے سرگوشی میں کہا کہ کسی کی باتوں کی آوازیں آئی ہیں اور یہ سنتری ہی ہو سکتے ہیں.... سرحد کی رات کی آوازیں صرف صغیر ہی سن سکتا تھا۔ ڈاکٹر رشید اور خالدہ نے یہ آوازیں نہیں سنیں۔

تھوڑی دیر بعد یہ آوازیں بلند ہونے لگیں اور صاف پتہ چلتا تھا کہ قریب آرہی ہیں۔ پھر قدموں کی آہٹ بھی سنائی دینے لگی۔ فضا پُرسکون تھی، ہوا تیز نہیں تھی اور وہاں کوئی اور شور شرابا بھی نہیں تھا۔ مکمل طور پر خاموش فضا میں باتوں اور قدموں کی آوازیں صاف سنائی دینے لگیں۔ صغیر نے دونوں کو اشارہ کیا کہ سرکنڈوں کے اندر اس طرح ہو جاؤ کہ اکٹھے نہ رہنا۔ بکھر کر چھپنا ہو گا۔

صغیر اکیلا ہوتا تو ایک منٹ میں غائب ہو جاتا لیکن ڈاکٹر رشید اور خالدہ ایسی صورتِ حال سے بالکل ہی واقف نہ تھے۔ انہیں سرکنڈوں میں جاتے کچھ دیر لگ گئی۔ صغیر نے ڈاکٹر رشید کے کان میں کہا کہ وہ خنجر نکال کر ہاتھ میں رکھے۔ پھر تینوں مختلف سمتوں سے سرکنڈوں میں داخل ہو گئے۔ خشک سرکنڈوں میں یہ خرابی ہوتی ہے کہ ان کے اندر کوئی چھوٹا سا جانور بھی چلا جائے تو یہ آواز پیدا کرتے ہیں۔ یہ تو انسان تھے۔ تینوں ایک دوسرے سے دور ہو کر سرکنڈوں میں چلے گئے تھے۔

وہ سیکورٹی فورس کے دو سنتری تھے جو بہت قریب آگئے تھے۔ انہوں نے کندھوں سے رائفلیں لٹکا رکھی تھیں۔ وہ وہیں آن رکے جہاں صغیر اور اس کے ساتھی دو چار منٹ پہلے بیٹھے تھے اور پھر سرکنڈوں میں چلے گئے تھے۔ سنتریوں نے سرکنڈوں کے ہلنے کی آواز سن لی تھی۔

"جانے دے یار!" ___ ایک سنتری نے کہا ___ "کوئی گیدڑ ویدڑ ہو گا۔ ہو سکتا ہے سؤر ہی ہو۔ چل آگے چلیں"۔

"نہیں یار!" ___ دوسرے نے کہا ___ "گیدڑ یا سؤر ہوتا تو اس کا سرکنڈوں کے اندر کیا کام تھا۔ کوئی جانور ہی تھا تو گیا کہاں.... یہ کوئی انسان معلوم ہوتا ہے جو اندر جا کر دبک گیا ہے۔ جانور ہوتا تو کسی طرف سے نکلنے کے لئے چل رہا ہوتا اور سرکنڈے زور زور سے ہلتے"۔

دوسرے سنتری نے ایک پتھر اٹھایا اور سرکنڈوں کے اندر پھینکا لیکن اندر سے کوئی حرکت نہ ہوئی۔ ایک سنتری کہتا تھا کہ یار یہ ہمارا وہم ہے اور یہاں رکنا بے معنی ہے لیکن دوسرا اس ضد میں آگیا تھا کہ اندر چل کے دیکھیں گے' یہ کوئی بندہ معلوم ہوتا ہے۔

"پھر تم ہی اندر جا کر دیکھ لو" ___ دوسرے سنتری نے کہا ___ "میں یہاں کھڑا ہوں تاکہ وہ نکل بھاگے تو مجھے نظر آجائے پھر تو میں بغیر پوچھے اور دیکھے گولی مار دوں گا"۔

سنتری نے رائفل دونوں ہاتھوں میں لے کر آگے کو تان لی۔ رائفل کے آگے سنگین لگی ہوئی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ سرکنڈوں میں جانے لگا۔ اس طرف صغیر چھپا ہوا تھا۔ چاند کچھ اوپر تو آگیا تھا لیکن اس کے راستے میں کیکر کے دو درخت کھڑے تھے سرکنڈوں پر ان کا سایہ پڑ رہا تھا اور سرکنڈوں کا اپنا سایہ بھی تھا اس لئے سرکنڈوں کے

اندر ٹھیک طرح نظر نہیں آتا تھا۔ صغیر نے پہلے ہی چاقو نکال کر ہاتھ میں لے رکھا تھا۔

"سنبھل کر یار!" ——باہر کھڑے سنتری نے کہا—— "تم تو خواہ مخواہ اندر جا رہے ہو"۔

سنتری اُسی طرف آہستہ آہستہ آگے جا رہا تھا جس طرف چند ہی قدم آگے صغیر چھپا بیٹھا تھا۔ صغیر نے ایک ڈھیلا اٹھایا اور ذرا پرے کی طرف پھینکا ڈھیلا سنتری کے بائیں طرف گرا۔ سنتری رک گیا اور اس طرف چلنے لگا۔ اب صغیر نے ذرا سر اوپر کر کے دیکھا۔ اسے سنتری کا سر نظر آیا۔ یہ سنتری اس سے چار پانچ قدم دور کھڑا تھا۔ سنتری چلتا تھا تو سرکنڈے آواز پیدا کرتے تھے۔ صغیر نے یہ استادی کھیلی کہ جب سنتری ایک قدم چلتا تو صغیر بھی اس کی طرف سرک جاتا۔ اس طرح سنتری کو پتہ بھی نہ چل سکا کہ کوئی اس کے پیچھے سرکتا آ رہا ہے۔

اچانک سنتری کے عقب میں ذرا سی سرسراہٹ ہوئی اور سنتری پیچھے کو دیکھنے ہی لگا تھا کہ اس کی گردن ایک بازو کے شکنجے میں آگئی۔ صغیر نے عقب سے اپنا بازو اس کی گردن کے گرد لپیٹ دیا تھا۔

صغیر کا چاقو والا ہاتھ اوپر اٹھا اور بڑی تیزی سے نیچے اور سنتری کے آگے آیا۔ چاقو سنتری کے دل میں اتر گیا۔ سنتری کی آواز نہیں نکل سکتی تھی کیونکہ صغیر نے اُس کی گردن بازو کے گھیرے میں جکڑ کر پیچھے کو کھینچ رکھی تھی۔ صغیر نے ایک بار پھر چاقو اس کے سینے میں مارا۔ صغیر کو معلوم تھا کہ دل کس مقام پر ہوتا ہے۔ ایک آدھ منٹ بعد صغیر نے سنتری کی گردن چھوڑ دی اور سنتری گر پڑا۔

"نکل بھی آ یار!" ——باہر کھڑے سنتری نے کہا—— "کچھ نہیں ملا تو واپس آجا"۔

جس وقت صغیر نے سنتری کی گردن بازو میں دبوچ کر ہاتھ اوپر اٹھایا تھا اُس وقت باہر والا سنتری کسی اور طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ ادھر دیکھ رہا ہوتا تو اسے اپنے ساتھی اور صغیر کے سر نظر آجاتے اور اوپر اٹھا ہُوا ہاتھ تو صاف نظر آتا۔ ایک سنتری تو مارا گیا تھا اور صغیر سوچنے لگا کہ دوسرے کو کس طرح قابو کیا جائے۔ وہ دبکا بیٹھا رہا۔

باہر والے سنتری نے دو تین مرتبہ اپنے ساتھی کو پکارا تو اسے کوئی جواب نہ ملا۔ صغیر کو یہ تو معلوم تھا کہ دونوں سنتری ہندو ہوں گے اور ہندو اتنے دلیر نہیں ہوتے کہ ایسا خطرہ مول لیں جو ایک سنتری لے چکا تھا۔ اپنے ساتھی کا جواب نہ پا کر باہر والے سنتری

کی گھبراہٹ کچھ بڑھ گئی۔ وہ سرکنڈوں کے اندر آنے سے گھبرا رہا تھا۔ پھر وہ سوچنے لگا کیا کرے۔ کبھی ایک قدم سرکنڈوں کے اندر رکھتا اور پھر اٹھا ہُوا قدم پیچھے کرتا اور ایک طرف چل پڑتا۔

صغیر نے سر ذرا سا اوپر کر کے دیکھا سنتری آہستہ آہستہ دوسری طرف جا رہا تھا۔ وہ رکا اور پھر پیچھے کو چلنے لگا اور اس نے ایک بار پھر اپنے ساتھی کو پکارا۔ اسے کوئی جواب نہ ملا۔ وہ دو تین قدم اور اس طرف آیا پھر رک گیا۔ صغیر اسے دیکھتا رہا۔

صغیر کو اُس طرف سرکنڈوں میں حرکت کی سرسراہٹ سنائی دی جس طرف ڈاکٹر رشید اور خالدہ سرکنڈوں کے میں گئے تھے۔ صغیر سخت پریشان ہُوا۔ اسے خطرہ بھی نظر آیا کہ ڈاکٹر رشید بے احتیاطی کر رہا ہے اور وہ شاید خالدہ کے قریب ہونا چاہتا ہے تاکہ لڑکی اکیلی ڈر نہ جائے۔ صغیر نے یہ خطرہ محسوس کیا کہ اس آواز پر سنتری ادھر دیکھے گا اور گولی چلا دے گا۔

اپنے ساتھیوں کی خاطر صغیر نے اپنی جان کو خطرے میں ڈال دیا اور اُٹھ کھڑا ہُوا۔ یہی نہیں بلکہ سرکنڈوں میں سے نکلنے لگا۔ سرکنڈوں نے آواز پیدا کی تو سنتری نے اُس طرف دیکھا۔ صغیر رک گیا اور سر نیچے کر لیا۔ سنتری دو تین قدم چل کر پھر رک گیا۔ ذرا ہی دیر بعد صغیر نے پھر سر ذرا سا اوپر اٹھایا تو اسے ایک عجیب منظر نظر آیا۔ منظر یہ تھا کہ ڈاکٹر رشید سنتری کے بالکل پیچھے پہنچ گیا تھا اور فاصلہ پورا قدم بھی نہیں تھا۔ ڈاکٹر رشید نے صغیر کی ہی طرح سنتری کی گردن کے گرد بازو لپیٹ کر شکنجہ سخت کر دیا اور اس کا دایاں ہاتھ اوپر اٹھا۔ صغیر سیدھا ہو کر بڑی تیزی سے باہر نکلا۔ وہ ڈاکٹر رشید کی مدد کو پہنچنا چاہتا تھا لیکن اس کے پہنچنے سے پہلے ہی ڈاکٹر رشید کا خنجر اس سنتری کے پیٹ میں اتر چکا تھا۔ صغیر بہت تیز دوڑا اور اپنا چاقو اس سنتری کے دل کے مقام پر اتار دیا۔

"ڈاکٹر صاحب!" ——صغیر نے ازراہِ مذاق کہا—— "دل یہاں ذرا بائیں کو ہوتا ہے۔ اب اس بیچارے کو چھوڑ دیں"۔

ڈاکٹر رشید نے سنتری کو چھوڑا تو وہ گر پڑا۔ ذرا تڑپا اور بے حس و حرکت ہو گیا۔

صغیر نے اس کی ایک ٹانگ ٹخنے سے پکڑی اور ڈاکٹر سے کہا کہ وہ اس کی دوسری ٹانگ پکڑ لے اور لاش سرکنڈوں کے اندر چھپا دیتے ہیں۔ دونوں نے لاش گھسیٹ کر سرکنڈوں میں چھپا دی۔ سنتری کی رائفل باہر پڑی تھی۔ باہر آکر صغیر نے اس کی

رائفل اٹھائی اور سرکنڈوں کے اندر پھینک دی۔

"اب ذرا تیز چلیں" ــــ صغیر نے کہا ــــ "خالدہ باہر آجاؤ"۔

"ڈاکٹر صاحب" ــــ صغیر نے کہا ــــ "مجھے بالکل ہی توقع نہیں تھی کہ آپ اسے یوں ماریں گے"۔

"میں نے ایک انگریزی فلم میں یہ سین دیکھا تھا" ــــ ڈاکٹر رشید نے کہا ــــ "ایک کمانڈو دشمن کے علاقے میں ایک سنتری کو اسی طرح پیچھے سے دبوچ لیتا اور فوراً خنجر اس کے پیٹ میں مار دیتا ہے۔ مجھے وہ سین یاد آگیا تھا۔ یہ سنتری جس وقت اس طرف چلا اس وقت میں سر ذرا اوپر کرکے دیکھ رہا تھا۔ اللہ نے میری مدد کی اور میں کامیاب رہا"۔

خالدہ حیران و پریشان کبھی ڈاکٹر کو اور کبھی صغیر کو دیکھتی تھی۔ صغیر کے کہنے پر وہ اس کے ساتھ چل پڑے۔

○

کیا یہ کوئی آسان کام تھا کہ سنتریوں کی آوازیں قریب آتے ہی یہ تینوں سرکنڈوں کے اندر چلے گئے اور پھر انہوں نے دونوں سنتریوں کو مار بھی ڈالا؟.... یہ کام اتنے آسان نہیں تھے جتنی آسانی سے لکھ دیئے گئے ہیں۔ اس کے لئے حاضر دماغی کی ضرورت تھی اور پھر حوصلہ قائم رکھنا تھا اور پھر سوچ کر فوری طور پر فیصلہ کرنا تھا کہ اب کیا کیا جائے اور یہ بھی کہ اب سنتریوں کی اگلی حرکت کیا ہوگی۔ یہ صحیح ہے کہ خطرے کے وقت انسان کی ساری کی ساری جسمانی توانائی مرکوز ہو جاتی ہے لیکن اس کے ساتھ دماغ کا صحیح استعمال نہ کیا جائے تو آدمی بری طرح پٹ جاتا ہے۔ عام طور پر ایسے کارناموں کو اگر ناممکن نہیں تو اتنا دشوار ضرور سمجھا جاتا ہے کہ کوئی اوسط درجہ ذہن کا آدمی ایسا خطرہ مول لیتا ہی نہیں۔

مسلمان کی حیثیت سے یہ عقیدہ بہت مدد کرتا ہے کہ جذبہ اسلامی ہو اور نیت صاف ہو تو اللہ کی مدد فوراً پہنچتی ہے۔ ان تینوں کو اللہ کی مدد حاصل تھی۔

صغیر نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اب تیز چلنا ہوگا کیونکہ بارڈر سکیورٹی فورس کا ڈیوٹی افسر گشت پر آگیا تو دونوں سنتریوں کو گشت سے غیر حاضر دیکھ کر ہنگامہ بپا کردے گا اور یہاں سکیورٹی فورس کے بے شمار آدمی اکٹھے ہو جائیں گے۔ یہ خطرہ بھی تھا کہ یہ

دونوں سنتری اپنی ڈیوٹی پوری کرکے واپس جارہے ہوں گے اور ان کی جگہ دوسرے دو آرہے ہوں گے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ انہیں پتہ چل جائے کہ ان کے پہلے دو سنتریوں کی لاشیں سرکنڈوں میں پڑی ہیں۔

صغیر نے ڈاکٹر رشید اور خالدہ کو خاصا تیز چلایا اور انہیں تسلّی دی کہ نالہ قریب آرہا ہے پھر انہیں کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ اصل پریشانی خالدہ کی تھی کہ وہ تھک گئی ہوگی لیکن اس کی باتوں سے پتہ چلتا تھا کہ وہ بالکل نہیں تھکی بلکہ وہ مطمئن ہے کہ سرحد قریب آگئی ہے۔ اسے یہ تو معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ سرحد کے جتنی قریب ہوتے جارہے ہیں' خطرے اتنے ہی بڑھتے جارہے ہیں۔

اللہ کا خاص کرم تھا کہ صغیر اس راستے سے اور اس زمین سے واقف تھا۔ ڈیڑھ کلو میٹر اور گئے تو نالہ آگیا۔ اس کے کنارے دیواروں کی طرح اونچے تھے اور نالہ کئی جگہوں سے دائیں بائیں مڑتا تھا۔ صغیر نے ایک جگہ دیکھ لی جہاں ڈھلان تھی اور وہاں سے نالے میں اترا جاسکتا تھا۔ صغیر کے کہنے پر ڈاکٹر رشید نے خالدہ کو اپنے بازو میں لپیٹ لیا کیونکہ ڈھلان اترتے اس کے گرنے کا خطرہ تھا۔

نہایت آہستہ آہستہ وہ ڈھلان اتر گئے اور جہاں اترے وہاں پانی جمع تھا لیکن ٹخنوں سے اوپر تک گہرا تھا۔ صغیر نے انہیں کہا کہ وہ اس طرح چلیں کہ پاؤں کی شڑاپ شڑاپ جیسی آواز نہ اٹھے۔ چاند اور اوپر آگیا تھا اور اب تاریکی کا پردہ اٹھ جانے سے دور سے نظر آجانے کا خطرہ تھا۔ خطرے سے بچنے کا ایک ذریعہ یہ تھا کہ ایک طرف کا کنارہ ذرا زیادہ اونچا تھا اور چاند اسی طرف سے اوپر آرہا تھا۔ اس کنارے کا سایہ ابھی کچھ لمبا تھا جو انہیں بوقتِ ضرورت چھپا سکتا تھا۔

تینوں نالے میں چلتے گئے اور پانی ایک طرف ہوگیا۔ وہ کنارے کے ساتھ ہوگئے جہاں پانی تو نہیں تھا لیکن کیچڑ تھا یا زمین اتنی نرم تھی کہ پاؤں اس میں دھنستے تھے۔ اس سے جلدی تھک جانے کا اندیشہ تھا۔ پھر بھی وہ چلتے گئے اور جس طرف نالہ مُڑتا تھا اُدھر کو مُڑتے گئے۔ انہیں ایک بار پھر باتوں کی آوازیں آنے لگیں۔ اتفاق سے وہاں کنارہ ذرا اونچا تھا اور اوپر جاکر یہ دیوار سی آگے کو ہوگئی تھی۔ یعنی نالے میں جھکی ہوئی تھی۔ اس کے نیچے مٹی کی ایک اونچی اور کچھ لمبی ڈھیری تھی جس سے صاف پتہ چلتا تھا کہ یہ بہت بڑا تودا تھا جو کنارے سے کٹ کر نیچے گرا تھا۔ تینوں اس کنارے اور اس گرے ہوئے

تودے کے درمیان چلے گئے۔ وہاں کنارے کا سایہ تھا اور چھپنے کی بھی نہایت اچھی جگہ تھی۔

"کیا بکواس کرتے ہو" ـــ کنارے کے اوپر سے آواز آئی ـــ "کیا اُن دونوں کو جن بھوت اٹھا لے گئے ہیں؟ اچھی طرح دیکھنا تھا کہیں سو گئے ہوں گے" ـــ یہ یقیناً" کسی افسر کی آواز تھی جس میں افسری کا رعب بھی تھا' غصہ بھی اور حکم بھی۔ اس نے دو تین ننگی گالیاں دے کر کہا ـــ "کہیں سو گئے ہیں اور بھول گئے ہیں کہ ان کی ڈیوٹی ختم ہو چکی ہے اور واپس رپورٹ کرنی ہے۔ چلو اور انہیں ڈھونڈو"۔

وہ یقیناً" ان دونوں سنتریوں کو ڈھونڈ رہے تھے جنہیں ڈاکٹر رشید اور صغیر نے مار ڈالا تھا۔ پتہ چل رہا تھا کہ کنارے کے اوپر ایک دو نہیں بلکہ پانچ سات آدمی ہیں۔ وہ وہیں رکے رہے اور اپنے آفیسر کی ڈانٹ ڈپٹ اور گالیاں سنتے رہے۔ خاصی دیر بعد وہ وہاں سے ٹلے اور صغیر نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اب آگے بڑھو۔

وہ اونچے کنارے کے سائے میں آگے ہی آگے بڑھتے گئے۔ تقریباً" نصف گھنٹہ بعد صغیر نے انہیں بتایا کہ اب آگے آخری موڑ آئے گا اور ہم نالے سے نکل جائیں گے۔

نالہ خشک نہیں تھا' کہیں پانی تھا اور جہاں پانی نہیں تھا وہاں دلدل تھی اور کہیں کہیں ریت تھی لیکن اس پر چلنا محال ہو رہا تھا۔ چاند اور اوپر آ جانے کی وجہ سے دور سے نظر آنے کا خطرہ بڑھ گیا تھا لیکن اللہ نے ایسی مدد کی کہ وہ اس جگہ تک پہنچ گئے جہاں سے نالے سے نکلنا تھا۔ وہاں ایسا موڑ تھا جو سرحد کی الٹی طرف جاتا تھا۔ صغیر نے ایک ڈھلان دیکھ تو لی لیکن وہاں سے چڑھنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ صغیر نے ڈاکٹر رشید کو اپنے کندھوں پر بٹھایا پھر اسے کہا کہ وہ کنارے کو پکڑ کر اس کے کندھے پر کھڑا ہو جائے اور اوپر چلا جائے۔ ڈاکٹر رشید اس طرح اوپر چلا گیا اور پیٹ کے بل لیٹ کر بازو نیچے لٹکایا۔ صغیر نے خالدہ کو اٹھا کر اپنے کندھے پر بٹھایا پھر اسے کہا کہ وہ کندھے پر کھڑے ہو کر ڈاکٹر رشید کا ہاتھ پکڑ لے۔ اس طرح خالدہ بھی اوپر چلی گئی۔

صغیر نے اِدھر اُدھر دیکھ کر سیدھے کھڑے کنارے میں پاؤں رکھنے کی جگہ دیکھ لی اور وہاں پاؤں رکھا اور اوپر کہیں ہاتھ ٹکایا اور اس طرح اتنا اوپر ہو گیا جہاں ڈاکٹر رشید کا ہاتھ پہنچ گیا۔ صغیر نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا لیکن اوپر زمین شاید ڈھلانی سی تھی کہ رشید کا جسم آگے کو سرکنے لگا۔ ڈاکٹر رشید نے خالدہ سے کہا کہ وہ اس کے ٹخنے پکڑ کر پیچھے کو

کھینچے۔ خالدہ نے ایسے ہی کیا اور ادھر صغیر نے ڈاکٹر رشید کے دونوں بازو پکڑے کچھ پاؤں کنارے کے ساتھ ٹکائے تاکہ اس کا سارا وزن ڈاکٹر رشید کو نہ اٹھانا پڑے۔ آخر وہ اوپر چلا گیا۔ خالدہ پسینے سے نہا گئی تھی۔ سب سے زیادہ طاقت اسے صرف کرنی پڑی تھی کیونکہ اس نے ڈاکٹر رشید کو پیچھے کھینچ رکھا تھا ورنہ ڈاکٹر رشید صغیر کے وزن سے پھر واپس نالے میں جا گرتا۔

"اب سمجھو پہنچ گئے" ـــ صغیر نے کہا ـــ "میرے ساتھ آؤ"۔

○

وہ نصف گھنٹے سے زیادہ چلے ہوں گے کہ انہیں کھیت نظر آنے لگے جن میں اس موسم کا فصل کھڑا تھا۔ وہ دو کھیتوں کے درمیان سے گزر رہے تھے جب بڑی زور سے آواز آئی ـــ "ہالٹ"۔

"فرینڈ" ـــ صغیر نے بلند آواز سے کہا ـــ "آگے آ جاؤ بھائی' اپنے ہی آدمی ہیں"۔

دو رینجر کے سپاہی رائفلیں ان کی طرف کئے مینڈھ پر نمودار ہوئے اور ان کی طرف چلے۔ صغیر نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ہاتھ اوپر اٹھا لیں۔ ان تینوں نے ہاتھ اوپر اٹھا لئے اور ان دونوں گشتی سنتریوں کی طرف چل پڑے۔ سنتری اتنے کچے تو نہیں تھے کہ ان پر فوراً" اعتبار کر لیتے۔ قریب آ کر انہوں نے پھر پوچھا کہ وہ کون ہیں۔

"ہم پاکستانی ہیں" ـــ صغیر نے کہا ـــ "ہمیں چوکی تک لے چلو' اصل بات وہاں بتائیں گے۔ ہماری جامہ تلاشی لے لو"۔

دونوں سنتریوں نے خالدہ کو دیکھا تو وہ مذاق کے موڈ میں آ گئے۔

"بکواس بند کرو" ـــ صغیر نے بارعب آواز میں کہا ـــ "ہم انٹیلی جنس کے آدمی ہیں۔ تمہاری اس بدتمیزی کی رپورٹ اگر کر دیں تو جانتے ہو تمہاری سزا کیا ہو گی؟ فوراً" ہمارے ساتھ چوکی تک چلو۔ نہیں جانتے تو ہمیں معلوم ہے چوکی کہاں ہے"۔

انٹیلی جنس کا نام سن کر سنتری دبک گئے۔ صغیر آگے آگے چل پڑا اور سنتریوں سے کہا کہ وہ ان تینوں کے پیچھے پیچھے آئیں۔ صغیر کو معلوم تھا کہ اس علاقے کی چوکی کہاں ہے۔ وہ چھوٹا سا ایک گاؤں تھا جس میں رینجرز کی ایک پوسٹ بنی ہوئی تھی۔

"تم لوگ سمجھتے ہو کہ جو کوئی اس علاقے میں گھومتا پھرتا ہے وہ کوئی سمگلر ہی ہو گا"

صغیر نے دونوں سنتریوں سے افسروں کے انداز سے کہا ــــ "اب کے تو میں تمہیں معاف کر دیتا ہوں' آئندہ ایسی بدتمیزی کسی کے ساتھ بھی نہ ہو"۔

دونوں سنتری ایسے مرعوب ہوئے کہ انہوں نے صغیر کو انٹیلی جنس کا کوئی بڑا آفیسر سمجھ کر معافی مانگی۔

جب وہ پوسٹ والے گاؤں میں داخل ہوئے تو فجر کی اذان کی آواز بلند ہوئی۔ صغیر رک گیا اور دونوں ہاتھ آسمان کی طرف پھیلا کر کہا ــــ "تیری آواز مکے اور مدینے!"۔

"اللہ نے ہمارا جہاد قبول کر لیا ہے" ــــ ڈاکٹر رشید نے کہا ــــ "پاکستان میں ہمارا استقبال اللہ کی مقدس آواز سے ہُوا ہے۔ ہمارا مستقبل انشاء اللہ درخشاں ہو گا"۔

چوکی پر پہنچ کر صغیر نے کہا کہ چوکی کے انچارج کو فوراً" جگا دیں۔ وہ انسپکٹری کے عہدے کا افسر تھا جو پوسٹ کے باہر کہیں سویا ہُوا تھا۔ دونوں سنتری واپس چلے گئے۔ انسپکٹر غصے کی سی حالت میں پوسٹ میں آیا اور ان تینوں کو گھور کر دیکھا۔

"کون ہو تم لوگ!" ــــ اس نے پوچھا۔

"جناب عالی!" ــــ صغیر نے کہا ــــ "ڈویژن ہیڈ کوارٹر میں ہمارے آنے کی اطلاع دیں یا آئی ایس آئی کو فون کریں"۔

انسپکٹر اتنی آسانی سے اور اتنی جلدی ان پر اعتبار کرنے والا نہیں تھا۔ اس نے کہا کہ پہلے اپنی شناخت کروائیں اور بتائیں کہ ہیں کون اور وہ کس مِشن پر ہیں۔

صغیر نے اسے انتہائی مختصر الفاظ میں بتایا اور کہا کہ وہ فوراً" آئی ایس آئی یا ڈویژن ہیڈ کوارٹر کو فون کرے۔ پھر اس نے انسپکٹر سے کہا کہ وہ چائے وغیرہ کا انتظام کرے کیونکہ وہ ساری رات پیدل چلتے رہے ہیں۔

انہیں وہاں ناشتہ مل گیا پھر ٹیلی فون وغیرہ کا سلسلہ شروع ہو گیا اور گیارہ بجے کے لگ بھگ انسپکٹر کو حکم ملا کہ وہ تینوں کو ڈویژن ہیڈ کوارٹر لے آئے۔

تقریباً" آدھے گھنٹے بعد صغیر ڈویژن کمانڈر کو اپنی کہانی سنا رہا تھا۔

کوئی چھوٹی سی بات نہیں تھی جو ڈویژن کمانڈر سن لیتا اور کوئی فیصلہ صادر کر دیتا۔ یہ تو الف لیلہ کی داستانوں جیسی داستان تھی' بہت ہی طویل اور کسی حد تک ناقابل یقین۔ اس میجر جنرل نے تھوڑی سی سنی تو وہ اس سوچ میں پڑ گیا کہ ان تینوں نے غیر قانونی طور پر سرحد پار کی ہے۔ انہیں گرفتار کر کے ان کے بیان لینے ہیں لیکن یہ کام فوج کا نہیں بلکہ سول پولیس کا ہے۔ یہ ڈویژن کمانڈر کی سر دردی نہیں تھی۔ یہ تو اس لئے اس نے انہیں اپنے پاس بٹھا لیا تھا کہ یہ ان کی درخواست تھی کہ وہ ڈویژن کمانڈر سے ملنا چاہتے ہیں اور ان کا تعلق آئی ایس آئی کے ساتھ ہے۔

میجر جنرل کو اس پر بھی شک ہُوا کہ یہ دو جوان آدمی ہیں اور ان کے ساتھ ایک خوبصورت اور نوجوان لڑکی ہے۔ یہ جاسوس ہی ہو سکتے ہیں اور جو بیان دے رہے ہیں یہ محض دھوکہ اور فریب ہو سکتا ہے لیکن صغیر کہہ رہا تھا کہ وہ انڈیا کا جاسوس تھا' سرحد پار کرتے وہ زخمی ہُوا تھا اور اس کے ساتھی ڈاکٹر رشید نے اسے انبالہ کے ملٹری ہسپتال سے فرار کروایا ہے اور اب وہ پاکستان میں انڈیا کے جاسوسوں کو گرفتار کروائے۔

یہ تینوں کتنے ہی جذباتی لہجے اپنی بات کیوں نہ سناتے' خواہ قرآن پر ہاتھ رکھ کر بیان دیتے پھر بھی میجر جنرل نے ان پر اعتماد نہیں کرنا تھا' البتہ جنرل نے یہ محسوس کر لیا کہ انہیں ابھی پولیس کے حوالے نہ کیا جائے بلکہ آئی ایس آئی ان کے بیان لے اور اپنے طریقہ کار کے مطابق انہیں ٹھونک بجا کر دیکھ لے۔ دو ہی صورتیں تھیں۔ ایک یہ کہ یہ جو کہہ رہے ہیں وہ صحیح ہے اور دوسری یہ کہ ایک ڈرامہ کھیل کر پاکستان میں داخلہ چاہتے ہیں۔

میجر جنرل نے انہیں باہر یہ کہہ کر بٹھادیا کہ یہ زیرِ حراست ہیں اور اگلے حکم تک انہیں نگرانی میں رکھا جائے۔ میجر انہیں باہر لے گیا تو میجر جنرل نے آئی ایس آئی کو فون کیا۔ وہاں کے کرنل انچارج کو انتہائی مختصر الفاظ میں بتایا کہ دو آدمی ایک لڑکی کے ساتھ سرحد پار کرکے آئے ہیں اور وہ اپنا تعلق آئی ایس آئی کے ساتھ بتاتے ہیں لیکن معاملہ کچھ مشکوک ہے، بہتر ہے کہ انہیں آئی ایس آئی ہی اپنی کسوٹی پر پرکھے اور پھر فیصلہ کرے کہ انہیں پولیس کے حوالے کرنا ہے یا کیا کرنا چاہئے۔

زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ آئی ایس آئی کا کرنل ایک میجر کے ساتھ آگیا۔ یہ میجر امتیاز تھا۔ ڈویژن کمانڈر کو چاہئے تھا کہ ڈاکٹر رشید، صغیر اور خالدہ کو ان دونوں کے حوالے کردیتا لیکن نہ جانے اسے کیا سُوجھی کہ اس نے انہیں کہا کہ وہ بھی ان کی پوری داستان سننا چاہتا ہے اور دیکھے گا کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ غیر قانونی طور پر سرحد پار کرنے کے واقعات ہوتے ہی رہتے تھے اور ہوتے ہی چلے جائیں گے لیکن اس قسم کا واقعہ ڈویژن کمانڈر کے سامنے پہلی بار آیا تھا۔ اسے یہ اتنا دلچسپ لگا کہ تینوں کو اپنے دفتر میں بٹھا کر تفتیش شروع کرادی۔ صحیح تفتیش تو آئی ایس آئی کو اپنے طریقے اور تجربے کے مطابق اپنے ہاں جاکر کرنی تھی، یہاں صرف یہ دیکھنا تھا کہ یہ تینوں کہتے کیا ہیں۔ کرنل اور میجر امتیاز سمجھ گئے تھے کہ ڈویژن کمانڈر اپنی دلچسپی کی خاطر یہ کہانی سننا چاہتا ہے۔

ڈاکٹر رشید اور خالدہ کو دوسرے کمرے میں بٹھادیا گیا اور صغیر سے کہا کہ وہ اپنے متعلق مختصراً" بتائے۔

"آپ کا حکم ہے کہ بات مختصر کروں" ــــ صغیر نے ایسے پختہ لہجے میں کہا جس میں خود اعتمادی کی جھلک غالب تھی ــــ "میں خود بھی یہی چاہتا ہوں کہ یہاں بات مختصر کی جائے۔ میں آپ کو یہ نہیں بتاؤں گا کہ میں نے یہاں انڈیا کے ایک ایجنٹ کی حیثیت سے کیا کیا وارداتیں کی ہیں، کون کون میرے ساتھ تھا اور کس کا کیا رول تھا۔ یہ ساری باتیں آئی ایس آئی کے ڈائریکٹر جنرل کو بتاؤں گا اور اپنے رنگ کی نشاندہی کرکے سب کو گرفتار کرواؤں گا"۔

صغیر نے بتایا کہ وہ کہاں کا رہنے والا ہے اور کس طرح انڈیا کی انٹیلی جنس کا ایجنٹ بنا تھا، کتنی بار انڈیا گیا اور وہ ہوش میں اس وقت آیا جب اس کے کئے ہوئے دھماکے میں اُس کا اپنا ایک سگا بھائی مارا گیا۔ پھر اس نے بتایا کہ اسے کس طرح انڈیا لے گئے تھے

اور سرحد پار کرتے اسے ٹانگ میں گولی لگی اور انبالہ ملٹری ہسپتال میں پہنچادیا گیا پھر ڈاکٹر رشید نے اسے کس طرح بیدار کیا اور کس طرح ہسپتال سے فرار کروایا۔ اس کے بعد صغیر نے جو سفر طے کیا تھا وہ انتہائی مختصر کرکے سنادیا اور پھر جس طرح جالندھر کے راستے میں ڈاکٹر رشید اور خالدہ کے ساتھ معجزہ نما ملاقات ہوگئی، وہ سنائی اور سرحد پار کرنے کا طریقہ بھی بتادیا۔ اس نے کہا کہ رینجرز کے گشتی سنتری نہ مل جاتے پھر بھی وہ رینجرز کی پوسٹ پر پہنچ جاتا۔

اس کے بعد ڈاکٹر رشید کو بلایا گیا اور صغیر کو الگ بھیج دیا گیا۔ ڈاکٹر رشید نے بھی حکم کے مطابق مختصر بیان دیا جس میں اس نے بتایا کہ صغیر کے ساتھ انبالہ کے ملٹری ہسپتال میں اس کی ملاقات کس طرح ہوئی اور کس طرح تعارف ہُوا تھا۔ اس نے بتایا کہ صغیر کو کون سا ٹرانکولائز دیا جارہا تھا جو اس نے خطرہ مول لے کر روک دیا اور اس طرح صغیر بیدار ہوگیا۔ بیدار بھی ایسا ہُوا کہ مردِ مومن بن گیا۔ ڈاکٹر رشید نے اسے فرار کرانے کا جو خطرہ مول لیا تھا وہ بھی سنایا اور اس کا جو انجام ڈاکٹر رشید اور اس کے گھر والوں کا ہُوا وہ بھی سنایا اور پھر جس طرح اسے ٹارچر کرکے پاگل خانے تک پہنچایا گیا اور پھر اللہ نے عبدالستار کی شکل میں ایک فرشتہ بھیجا جس نے اسے پاگل خانے سے فرار کرادیا۔ ڈاکٹر رشید نے بھی بتایا کہ صغیر کے ساتھ جالندھر کے راستے میں کس طرح غیر متوقع طور پر ملاقات ہوگئی اور پھر وہ کس طرح جالندھر سے چلے اور سرحد پار کی۔

خالدہ کو بلایا گیا۔ اُس نے اپنا بیان سسکیوں اور ہچکیوں کی زبان میں آنسوؤں کی روانی میں دیا۔ اس نے کہا کہ اپنی عصمت کی خاطر اس نے اپنا گھر اور اپنے عزیزوں کو قربان کردیا ہے۔ اگر وہ اپنی عصمت ہندو افسروں کے حوالے کردیتی تو اس کے لئے عیش ہی عیش تھی لیکن اسلام کی بیٹی کی یہی ایک متاع ہوتی ہے جس کے تقدس کو پامال کرنے پر وہ اپنے آپ کو آمادہ نہیں کرسکتی تھی۔ ڈاکٹر رشید نے اس کے لئے قربانی دی تھی اور وہ اسے اپنے ساتھ لے آیا۔ صغیر کے متعلق بھی اس نے وہ باتیں سنائیں جن سے یہ پتہ چلتا تھا کہ صغیر کس طرح صراطِ مستقیم پر آیا یا لایا گیا۔

خالدہ کو بھی دوسرے کمرے میں بھیج دیا گیا۔ اس دوران ملٹری پولیس کے ایک حوالدار اور تین جوانوں کو بلالیا گیا تھا۔ انہیں بہرحال زیرِ حراست رکھنا تھا۔

"صحیح انویسٹی گیشن تو آپ ہی کریں گے" ـــــ میجر جنرل نے کہا ـــــ "میری رائے یہ ہے کہ تینوں بچے معلوم ہوتے ہیں۔ میں اپنی رائے یہ سن کر دے رہا ہوں کہ یہ سرحد پار کرتے پکڑے نہیں گئے بلکہ خود رینجرز کی پوسٹ پر پہنچے اور پوسٹ کے انچارج سے کہا کہ ڈویژن ہیڈ کوارٹر یا آئی ایس آئی کو فون کریں یا انہیں وہاں تک پہنچا دیں۔ پھر میں نے اس لڑکی کا رونا دیکھا"۔

"آپ نے ٹھیک فرمایا ہے سر!" ـــــ آئی ایس آئی کے کرنل نے کہا ـــــ "صحیح انویسٹی گیشن تو ہم ہی کریں گے اور یہ ایک دو دنوں کا کام نہیں۔ لمبی داڑھی والے نے جو اپنا نام صفیر بتاتا ہے' اپنا پاکستان کا ایڈریس دے دیا ہے۔ یہ ہمارے لئے کافی نہیں۔ باقی رہا لڑکی کا رونا تو وہ میں عرض کروں گا سر! انسانی فطرت بڑی آسانی سے عیار ہو جایا کرتی ہے اور پھر سو بھیس بدل لیتی ہے۔ ایسے بعض عیار مظلومیت کا اظہار اور اداکاری ایسے طریقے اور مہارت سے کرتے ہیں کہ پتھروں کے آنسو نکال لیتے ہیں"۔

"میری عرض یہ ہے سر!" ـــــ میجر امتیاز نے کہا ـــــ "آپ نے یہ بھی ٹھیک فرمایا ہے کہ جاسوس اس طرح نہیں آیا کرتے بلکہ وہ قانونی طریقے سے آتے ہیں۔ اپنے سفارت خانے کے ملازم بنا کر لائے جاتے ہیں۔ یہ عام طور پر ہندو ہوتے ہیں۔ پھر اپنے رشتہ داروں سے ملنے کے لئے باقاعدہ پاسپورٹ اور ویزے پر آتے ہیں۔ غیر قانونی طور پر سرحد پار بھی کر آتے ہیں اور پکڑے نہیں جاتے۔ سمگلروں نے سرحد کے پاسبانوں کے ساتھ گٹھ جوڑ کر رکھا ہوتا ہے۔ بعض جاسوس ان سمگلروں کے ساتھ آتے بھی ہیں اور چلے بھی جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم بعض سمگلروں کو اپنے زیر اثر رکھتے ہیں.... یہ تو ذرا لمبی اور گہری باتیں ہیں.... ایک اخباری خبر یاد آ گئی ہے۔ ڈیڑھ پونے دو سال پہلے اخباروں میں خبر آئی تھی کہ گزشتہ سات آٹھ سالوں میں کتنے ہزار ہندو اور بھارتی مسلمان چند دنوں کے یا ایک مہینے کے ویزوں پر آئے اور ان میں سے کم و بیش ساڑھے چار ہزار واپس ہی نہیں گئے"۔

"یہ خبر بالکل صحیح ہے" ـــــ ڈویژن کمانڈر نے کہا ـــــ "لیکن ان ساڑھے چار ہزار آدمیوں کو پاکستان میں ڈھونڈنا اور پکڑنا فوج کا کام نہیں نہ یہ آئی ایس آئی کا کام ہے۔ اس کے لئے باقاعدہ محکمہ موجود ہے اور یہ اس محکمے کی کوتاہی ہے"۔

"سرحد پر کوئی دیوار تو ہے نہیں سر!" ـــــ کرنل نے کہا ـــــ "یہ جو انہوں نے

سمجھوتہ ایکسپریس چلا رکھی ہے اور پھر دوسرے ملکوں کے ساتھ انڈیا کی جو تجارت چلتی ہے ان کا مال پاکستان میں سے گزرتا ہے۔ نہ مال چیک ہوتا ہے اور نہ مال لانے لے جانے والوں کی چیکنگ ہوتی ہے۔ آپ یہ بھی جانتے ہیں سر' ہماری حکومت میں سے بھی کبھی یہ آواز اٹھتی ہے کہ بھارت اور پاکستان کے مابین ویزہ کی پابندیاں ختم کرنے پر غور کیا جا رہا ہے۔ بھارت تو ایسی فرمائشیں بھی کر چکا ہے"۔

"آپ یہ بھی جانتے ہوں گے سر!" ـــــ میجر امتیاز نے کہا ـــــ "انڈیا کا سفارت خانہ اس ملک کے جاسوسوں اور تخریب کاروں کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ پاکستانیوں کو یہیں سے انڈیا کے ایجنٹ بن جانے کی ترغیب اور دولت کی پیش کش ملتی ہے"۔

"کیا ہمارے سفیر دلی جا کر یہ کام نہیں کرتے؟" ـــــ میجر جنرل نے پوچھا۔

"ہمارے ملک میں سفیر انعام کے طور پر بنایا جاتا ہے" ـــــ کرنل نے کہا ـــــ "انڈیا کے سفیر دوسرے ملکوں کو بھیجے جاتے ہیں تو انہیں ایسی ٹریننگ اور ایسی بریفنگ دی جاتی ہے کہ وہ اپنے ملک کی برتری اور بڑھائی کے لئے کام کرتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں ہمارے سفیر خوشامد کے انعام کے طور پر جاتے ہیں اس لئے وہ پوری عیش و عشرت کرتے ہیں۔ صحیح رائے ان پاکستانیوں سے لیں جو دوسرے ملکوں میں مقیم ہیں"۔

"کیا آئی ایس آئی کچھ کمزور نہیں ہو گئی؟" ـــــ ڈویژن کمانڈر نے پوچھا۔

"کمزور تو ہونا ہی ہے سر!" ـــــ کرنل نے جواب دیا ـــــ "ایک وقت تھا جب آئی ایس آئی انڈیا کی انٹیلی جنس کے لئے دہشت بنی ہوئی تھی۔ ہماری انٹیلی جنس وہاں سے کمزور ہونا شروع ہوئی جہاں سے ہمارے اقتدار کے ہوس کار حکمرانوں نے اسے سیاسی عمل میں استعمال کرنا شروع کر دیا۔ اپنے اقتدار کے تحفظ کے لئے اور اپوزیشن کو دبائے رکھنے کے لئے ان سیاسی لیڈروں نے آئی ایس آئی کو استعمال کرنا شروع کر دیا۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ جو نیا سیاسی لیڈر پاور میں آتا ہے وہ سب سے پہلے آئی ایس آئی کے ڈائریکٹر جنرل کو ہٹا کر یہ عہدہ اور یہ اتنا نازک اور اہم محکمہ اپنی مرضی اور پسند کے ڈائریکٹر جنرل کے حوالے کر دیتا ہے۔ دراصل خرابی یہ ہے سر! ہمارے سیاسی لیڈر عسکری امور نہیں سمجھتے۔ ان کے ذہنوں پر اقتدار غالب رہتا ہے۔ خوابوں میں بھی یہ لوگ اپنے آپ کو کرسی پر بیٹھا ہوا دیکھتے ہیں۔ ہمارے حکمران محسوس ہی نہیں کرتے کہ ان کی ایسی کارروائیاں اپنے ہی ملک کے خلاف دشمن کے ہاتھ مضبوط کر رہی ہیں۔ انہوں نے

آدھے ملک کو سیاست کی بھٹی میں پھینک کر بھی عبرت حاصل نہیں کی"۔

"اور یہ جو اپنے آپ کو ایم بی بی ایس ڈاکٹر بتا رہا ہے!" ـــــ میجر جنرل نے کہا۔

"اس کا امتحان لینا تو کوئی مشکل نہیں۔ میں ابھی سی ایم ایچ کے کمانڈنٹ کو بلوا لیتا ہوں وہ اپنے ساتھ ایک دو سینئر ڈاکٹروں کو لے آئے گا۔ اسے ہم ان ڈاکٹروں کے حوالے کر دیں گے اور وہ پانچ منٹ میں ہی تصدیق یا تردید کر دیں گے کہ یہ ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہے یا نہیں"۔

"اسے ہم پھر بھی مشکوک ہی سمجھیں گے سر!" ـــــ کرنل نے کہا ـــــ "اسے اگر ہم نے اس لڑکی کے ساتھ پاکستان میں رہنے کی اجازت دے دی اور اسے پاکستان کی شہریت بھی مل گئی تو یہ پرائیویٹ کلینک کھول کر بیٹھ جائے گا اور جاسوسی بڑی کامیابی سے کرے گا" ـــــ کرنل مسکرایا اور ذرا آہستگی سے بولا ـــــ "ہم انبالہ اور آگرہ سے بھی معلوم کروا سکتے ہیں سر! .... آئی ایس آئی کے ہاتھ بڑے لمبے ہیں .... ہم نے آپ کا بہت وقت ضائع کر دیا ہے سر! یہ انویسٹی گیشن ہمارا کام ہے سر!"

"میں اپنا وقت ضائع نہ کرتا" ـــــ میجر جنرل نے کہا ـــــ "مجھے ذاتی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ آپ انہیں لے جائیں میں دو منٹ اور لوں گا۔ ان کے ساتھ ایک بات کر لوں"۔

میجر جنرل نے اپنے ایک آفیسر کو بلا کر کہا کہ ان تینوں کو لے آئے۔ تینوں آ گئے۔

"آپ نے بارڈر کراس کر کے مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی" ـــــ میجر جنرل نے کہا ـــــ "دیکھ لو، میں نے آپ کو کتنا وقت دیا ہے۔ آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ابھی آپ زیر حراست رہیں گے۔ آپ جانتے ہیں کہ انٹیلی جنس والے اتنی جلدی کسی پر اعتماد نہیں کر سکتے۔ آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہو گی لیکن آپ کے متعلق تصدیق لازمی ہے۔ اب آپ آئی ایس آئی کے ان کرنل صاحب اور میجر صاحب کے ساتھ چلے جائیں"۔

"صرف ایک درخواست ہے سر!" ـــــ ڈاکٹر رشید نے کہا ـــــ "اس لڑکی کا خاص خیال رکھا جائے۔ میں اسے پاکستان کا بڑا ہی خوبصورت تصوّر دے کر لایا ہوں اور یہ خود بھی دل میں اشتیاق لئے پھرتی تھی کہ ایک بار پاکستان دیکھ لے"۔

"ایک بات اور ہے سر!" ـــــ صغیر نے مسکراتے ہوئے کہا ـــــ "ہم نے سرحد پار

کی ہی تھی اور ہمارے پہلے قدم اپنی سرزمین پر پڑے تھے کہ ایک مسجد سے ہمیں اذان کی آواز سنائی دی۔ میں کہتا ہوں کہ پاکستان نے ہمارا استقبال اذان سے کیا ہے اور ہم انشاء اللہ پاکستان اور اذان کے تقدس کا خیال رکھیں گے اور ایک عرض یہ بھی کروں گا کہ میں تو ہوں ہی پاکستانی، یہ دونوں پہلی بار اس سرزمین پر آئے ہیں۔ ان کی عزت و آبرو کا خاص خیال رکھا جانا چاہئے"۔

"آپ میں سے کسی کو بھی سیل میں بند نہیں کیا جائے گا" ـــــ آئی ایس آئی کے کرنل نے کہا ـــــ "یہ لڑکی ہر وقت آپ کے ساتھ اور آپ کی نظروں میں رہے گی۔ آپ کو ہم غسل کی سہولت دیں گے، کپڑوں کی ضرورت ہوئی تو وہ بھی مل جائیں گے اور کھانا اچھا پیش کریں گے لیکن ہم انویسٹی گیشن پوری پوری کریں گے"۔

کرنل اور میجر امتیاز تینوں کو ساتھ لے گئے۔



پاکستان میں کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی خواہ یہ کوئی سرکاری راز ہی کیوں نہ ہو۔ میجر عثمان کی گرفتاری کو پوشیدہ رکھا گیا تھا لیکن یہ بھی پوشیدہ نہ رہ سکی۔ اس کا علم میجر عثمان کی بیوی واجدہ کو تھا، واجدہ کے دونوں بھائیوں اختر اور امجد کو معلوم تھا یا پھر میجر سمیع اور کیپٹن آصف جانتے تھے کہ میجر عثمان اس وقت کہاں ہے۔ یہ خبر میجر عثمان کے باپ کو بھی کسی خفیہ ذریعے سے مل گئی۔

اس دوران میجر عثمان کا باپ واجدہ کے ہاں دو مرتبہ گیا تھا۔ واجدہ ابھی اسی آفیسرز کوارٹر میں رہتی تھی جو میجر عثمان کو فوج کی طرف سے ملا ہوا تھا۔ مقدمے کے فیصلے تک وہ وہاں رہ سکتی تھی۔ اس کے رہنے کا ٹھکانہ بڑا ہی باعزت تھا اور یہ اس کے والدین کا گھر تھا لیکن واجدہ نے کچھ ایسے ارادے کر رکھے تھے کہ وہ ابھی سرکاری کوارٹر میں رہنا چاہتی تھی۔

واجدہ نے عثمان کے باپ کو یہی بتا رکھا تھا کہ عثمان باہر کہیں ڈیوٹی پر گیا ہوا ہے لیکن وہ کسی چھاؤنی میں نہیں بلکہ باہر فیلڈ کی ڈیوٹی پر ہے۔ اب تیسری بار عثمان کا باپ واجدہ کے ہاں گیا اور وہ کچھ پریشان اور متفکر سا لگتا تھا۔

"واجدہ بیٹی!" ـــــ میجر عثمان کے باپ نے کہا ـــــ "تم کہہ رہی ہو کہ عثمان کسی ڈیوٹی پر گیا ہوا ہے لیکن مجھے کوئی اور ہی خبر ملی ہے .... پتہ چلا ہے کہ عثمان کو فوج نے

گرفتار کر لیا ہے اور وہ انٹیلی جنس والوں کی قید میں ہے"۔

واجدہ نے کسی ایسے ردِعمل کا اظہار نہ کیا جو اتنا نمایاں ہوتا کہ عثمان کے باپ کو بھی پتہ چل جاتا۔ اس نے بڑے تحمّل سے پوچھا کہ آپ کو سرکاری اطلاع ملی ہے؟

"نہیں!" ـــــ عثمان کے باپ نے جواب دیا ـــــ "سرکار کیسی! .... ہم خود ہی تو سرکار ہیں۔ مجھے اندر کے سارے حالات معلوم ہوتے رہتے ہیں"۔

"تو پھر یہ خبر غلط ہے" ـــــ واجدہ نے کہا ـــــ "آپ کو کسی نے غلط بتایا ہے یا آپ نے غلط سنا ہے"۔

"او واجدہ بیٹی!" ـــــ عثمان کے باپ نے ایسے لہجے میں کہا جس میں ہلکی سی طنز اور کچھ تکبّر کی جھلک بھی تھی ـــــ "تمہیں شاید ابھی تک پتہ نہیں چلا کہ میرا اثر ورسوخ کہاں تک پہنچا ہُوا ہے۔ چار گاؤں ہیں جن کے سارے کے سارے ووٹ میری مٹھی میں ہیں۔ اس حلقے کا ایک ایم این اے اور ایک ایم پی اے میرے ووٹوں سے کامیاب ہوئے ہیں۔ صوبے کا وزیرِ اعلیٰ اور ملک کا وزیرِ اعظم' یہ دونوں میری اس مٹھی میں بند ہیں۔ میرے ساتھ جھوٹ بول کر کسی نے اپنے آپ کو کیا مصیبت میں ڈالنا ہے؟ .... فوج میں بھی میرے مخبر موجود ہیں مجھے صرف یہ پتہ چل جائے کہ عثمان کو کس جرم میں گرفتار کیا گیا ہے۔ میں اسے اس طرح نکال لاؤں گا جس طرح مکھن سے بال نکالا جاتا ہے"۔

"لیکن چچا جان!" ـــــ واجدہ نے کہا ـــــ "آپ تک یہ خبر پہنچانے والے نے یہ بھی تو بتایا ہو گا کہ عثمان کا جرم کیا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ جرم کا آپ کو پتہ ہی نہیں"۔

"یہ بھی مجھے پتہ چل گیا ہے" ـــــ عثمان کے باپ نے کہا ـــــ "لیکن میں اپنا شک رفع کرنے سے پہلے تمہیں بتانا نہیں چاہتا تھا۔ اب بتا دیتا ہوں۔ معلوم یہ ہُوا ہے کہ عثمان کو جاسوسی کے جرم میں گرفتار کیا گیا ہے۔ میں یہ نہیں مان سکتا۔ اگر کوئی کہے کہ میرے بیٹے نے دس بندے قتل کر ڈالے ہیں تو میں فوراً مان لوں گا لیکن میرا بیٹا غدار نہیں ہو سکتا"۔

واجدہ کا دماغ بڑی تیزی سے سوچنے لگا۔ وہ پریشان ہی ہوتی چلی گئی۔ اس کی پریشانی یہ تھی کہ عثمان کے باپ کو اگر یہ خبر مل گئی ہے کہ عثمان کو آئی ایس آئی نے جاسوسی کے جرم میں گرفتار کر لیا ہے تو یہ شخص اپنے اثر ورسوخ سے اسے چھڑا لے گا۔ واجدہ نے

اللہ اور اللہ کی سرزمین پاکستان کے نام پر عہد کر رکھا تھا کہ وہ ایک جاسوس کی بیوی نہیں کہلائے گی اور اپنے وطن کے غدار کو سزا دلوا کر ہی رہے گی۔ اس نے اپنا یہ عزم میجر عثمان کے دوستوں' میجر سمیع اور کیپٹن آصف کو اور پھر لاہور کی آئی ایس آئی کے میجر امتیاز کو بھی بتا دیا تھا اور اس کا یہ عزم اور عہد آئی ایس آئی کے راولپنڈی ہیڈ کوارٹر تک بھی پہنچ گیا تھا۔ عثمان کے باپ کی باتیں سن کر وہ اس سوچ میں ڈوب گئی کہ اس بوڑھے کو کس طرح چکر دیا جائے .... نیّت نیک اور ایمان پختہ ہو تو اللہ کی ذاتِ باری راستہ دکھا ہی دیتی ہے۔

"چچا جان!" ـــــ واجدہ نے میجر عثمان کے باپ سے کہا ـــــ "اب میری بات تحمّل سے سنیں اور پھر اس پر غور کریں اور اپنی زبان بالکل بند رکھیں .... کیا آپ نے دیکھا نہیں کہ اپنے خاوند کی گرفتاری کی خبر سن کر مجھ پر ذرا سا بھی اثر نہیں ہُوا۔ کسی بیوی کو یہ خبر سنائیں کہ اس کے خاوند کو گرفتار کر لیا گیا ہے اور وہ بھی جاسوسی کے جرم میں تو اس بیوی کا اگر ہارٹ فیل نہ ہُوا تو وہ تڑپنے لگے گی لیکن میں ٹس سے مس نہ ہوئی"۔

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں کچھ نہ کچھ ضرور معلوم ہے" ـــــ عثمان کے باپ نے کہا۔

"کچھ نہ کچھ نہیں چچا جان!" ـــــ واجدہ نے بڑے تحمّل اور اطمینان سے کہا ـــــ "مجھے سب کچھ معلوم ہے۔ عثمان کو گرفتار نہیں کیا گیا نہ ہی وہ آئی ایس آئی کی حراست میں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ آئی ایس آئی کی حفاظت میں ہے۔ اسی کی بھلائی کے لئے بلکہ اس کی سلامتی کے لئے' آئی ایس آئی نے اسے اپنے پاس رکھ لیا ہے۔ اصل بات یہ ہے چچا جان' عثمان نے جاسوسوں کا ایک گروہ گرفتار کروایا ہے۔ کیا ہم نے آپ کو بتایا نہیں تھا کہ ہمیں کراچی جاتے ہوئے سندھ کے علاقے میں اغوا کر لیا گیا تھا اور اللہ نے ہماری رہائی کا ایک غیب پیدا کر دیا تھا؟ .... عثمان اُسی دن سے ہندوستان کے جاسوسوں کی ٹوہ میں لگ گیا تھا' آخر ایک گروہ کا کھُرا کھوج مل گیا اور عثمان کی نشاندہی پر اس گروہ کے کئی افراد پکڑ لئے گئے"۔

"اچھا .... اچھا!" ـــــ عثمان کے باپ نے کہا اور واجدہ اس کے چہرے پر اطمینان کی جھلک دیکھنے لگی جو نمایاں طور پر نظر آ رہی تھی۔

"مجھے آئی ایس آئی کے افسروں نے کچھ باتیں کہی تھیں" ـــــ واجدہ نے کہا ـــــ

"ان میں سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ جو جاسوس گرفتار کر لئے گئے ہیں ان کے کچھ ساتھی ابھی آزاد پھر رہے ہیں۔ اگر عثمان باہر آ جائے تو ان آزاد جاسوسوں اور تخریب کاروں میں سے کوئی بھی کہیں موقع پا کر عثمان کو گولی مار سکتا ہے۔ مجھے بھی کہا گیا ہے کہ میں اپنے آپ کو بچا کر رکھوں اور یہ بھی کہا گیا کہ میں ہر کسی کو یہی بتاؤں کہ میجر عثمان کہیں باہر ڈیوٹی پر چلا گیا ہے اور نہ جانے کب واپس آئے گا۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں کہ عثمان قاتل ہو سکتا ہے غدار نہیں ہو سکتا"۔

عثمان کا باپ مطمئن بھی ہو گیا اور صاف پتہ چلتا تھا کہ ڈر بھی گیا ہے۔ واجدہ نے اسے مزید ڈرانے کی خاطر کہا کہ وہ کسی کے ساتھ بات نہ کرے۔

عثمان کا باپ کچھ دیر اور بیٹھا اور چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی واجدہ نے میجر امتیاز کو فون کیا۔ میجر امتیاز اسے مل گیا۔ واجدہ نے کچھ اکھڑی ہوئی جذباتی کیفیت میں کہا کہ عثمان کے باپ کو کس طرح اس کی گرفتاری کی خبر مل گئی ہے۔ میجر امتیاز بھی کچھ پریشان ہوا لیکن جلدی سنبھل گیا۔

"مسز عثمان!" ــــ میجر امتیاز نے کہا ــــ "ہمارے درمیان ایسے پاکستانی موجود ہیں جو نادانستہ طور پر ملک سے غداری کرتے رہتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں میں سے کوئی ہو گا جس نے عثمان کے باپ کو یہ خبر دے دی۔ آپ پریشان نہ ہوں' عثمان کو اس کا باپ کم از کم اس سٹیج پر چھڑا نہیں سکتا۔ میں ابھی راولپنڈی فون کر کے وہاں بتا دیتا ہوں کہ عثمان کی گرفتاری کی خبر اس کے باپ تک پہنچ گئی ہے اور دیکھا جائے کہ خبر باہر کس طرح نکلی ہے"۔

واجدہ نے میجر امتیاز کو یہ بھی بتایا کہ اس نے عثمان کے باپ کو کیا کہہ کر مطمئن کر دیا ہے۔

واجدہ پاکستان کے متعلق کچھ زیادہ ہی حساس اور جذباتی ہو گئی تھی اور اس کیفیت میں شدت ہی آتی چلی جا رہی تھی۔ ملک سے ہٹ کر اس کی اپنی ذات کی بھی کچھ اہمیت تھی۔ عثمان نے اسے دھوکے پر دھوکے دیئے تھے۔ اس کی جوانی اور خوبصورتی کے ساتھ عثمان ایک اپنا ہی کھیل کھیلتا رہا تھا۔ واجدہ کو جب لوسی یاد آتی تھی تو وہ جل اٹھتی تھی۔ اس ہندو لڑکی نے صرف واجدہ کو ہی نہیں جلایا تھا بلکہ وہ واجدہ کے وطن کی جڑوں میں اُتر کر جڑیں کھا رہی تھی۔ واجدہ کی ازدواجی زندگی دو چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ

اسی عمر میں تباہ ہو گئی تھی۔ اس کیفیت نے اس میں ذاتی طور پر بھی انتقام کے شعلے بھڑکا دیئے تھے۔ واجدہ کسی قیمت پر عثمان کو بخشنے پر آمادہ نہیں ہو سکتی تھی۔

واجدہ اخبار باقاعدگی سے پڑھتی تھی اور ٹی وی سے خبریں بھی سنا کرتی تھی۔ وہ مقبوضہ کشمیر میں کشمیریوں پر بھارت کے غیر انسانی مظالم کی خبریں تفصیل سے پڑھتی تھی۔ اس میں کشمیری خواتین کی اجتماعی آبروریزی کی خبریں بھی ہوتی تھیں اور یہ بھی کہ کس طرح بھارتی فوجی کشمیریوں کے بچوں تک کو نہیں بخشتے اور ان کے گھروں کو نذرِ آتش کرتے رہتے ہیں۔ اب تو بھارتی فوج نے آزاد کشمیر کے دیہات پر گولہ باری شروع کر دی تھی۔ پھر بھارت میں کہیں نہ کہیں مسلم فسادات کی خبریں بھی آتی رہتی تھیں اور ان میں یہ بھی ہوتا تھا کہ ہندوؤں نے فلاں جگہ پر ایک مسجد کی بے حرمتی کی ہے۔ پاکستان کے خلاف بھارتی لیڈروں کے دھمکی آمیز اور توہین آمیز بیان بھی واجدہ اخباروں میں پڑھا کرتی تھی۔

ہندوؤں کی یہ مسلم کشی اور اسلام دشمنی واجدہ کو آگ بگولہ کئے رکھتی تھی۔ اس کے ذہن و دل میں یہ خیال نقش ہو کر رہ گیا تھا کہ وہ شخص پاکستانی کیا مسلمان بھی نہیں کہلا سکتا جو اپنے وطن کے خلاف اس درندہ صفت اور بے اصول دشمن کے پاس جاسوسی کر رہا ہو۔ واجدہ نے از خود ہی یہ فتویٰ دے دیا تھا کہ عثمان وطن کا ہی نہیں بلکہ اسلام کا غدار ہے اور وہ مسلمان ہے ہی نہیں لہٰذا عثمان کے ساتھ اس کا نکاح منسوخ ہو چکا ہے۔ وہ کسی غیر مسلم کی بیوی نہیں رہنا چاہتی تھی۔

○

ڈاکٹر رشید' صغیر اور خالدہ کو ملٹری پولیس کے ساتھ فوجی گاڑی میں راولپنڈی پہنچا دیا گیا تھا۔ ان کے ساتھ آئی ایس آئی کے لاہور آفس کا انچارج کرنل گیا تھا۔ اس کرنل نے اپنے بالائی افسروں کو پوری رپورٹ دی تھی کہ یہ تینوں کیا کہتے ہیں اور اس کی اپنی رائے کیا ہے۔ اگر یہ تینوں سرحد پر پکڑے گئے ہوتے تو پکے ملزم ہوتے اور انہیں کوٹھڑیوں میں بند کر دیا جاتا یا سول پولیس کے حوالے کر دیتے اور آئی ایس آئی ان سے لاتعلق رہتی لیکن یوں معلوم ہوتا تھا جیسے آئی ایس آئی کے یہ افسران سے خاصی حد تک متاثر ہو گئے تھے اور ابھی انہیں ملزم قرار دینے کی بجائے مُشتبہ سمجھ رہے تھے۔
انہیں الگ کمروں میں رکھنے کا حکم دیا گیا۔ یہ کمرے فوج کے رہائشی کمرے تھے قید

والی کوٹھڑیاں نہیں تھیں۔ ان کمروں کے باہر تالہ بھی نہیں لگاتا تھا۔ یہ ایک قسم کی نظر بندی تھی۔ باہر ملٹری پولیس کا پہرہ کھڑا کر دیا گیا تھا۔

آئی ایس آئی نے ان کا یہاں تک خیال رکھا کہ انہیں ایک ایک اچھے کپڑے کی شلوار قمیض دے دی تھی اور خالدہ کو زنانہ کپڑے مہیا کر دیئے تھے۔ اس کے علاوہ کمروں میں رہنے کے لئے ذاتی ضروریات کی اشیاء بھی دے دی گئیں۔ کپڑوں اور حلیے کے لحاظ سے سب سے زیادہ بری حالت صغیر کی تھی۔ اس کے کپڑے تو کیچڑ جیسے ہو گئے تھے کیونکہ اس کا سفر ہی کچھ ایسا تھا۔ جالندھر کے قریبی گاؤں میں چوہدری معراج نے اسے اپنی شلوار قمیض دے دی تھی لیکن اس نے داڑھی اور سر کے بال نہیں کٹوائے تھے۔ آئی ایس آئی کے پاس راولپنڈی پہنچ کر اس نے کلین شیو کر لی اور سر کے بال بھی کٹوا لئے۔ اب وہ صحیح اور اصلی صغیر نظر آتا تھا۔

خالدہ صرف ایک ہی رات الگ کمرے میں رہی۔ صبح اس نے ملٹری پولیس کے باہر کھڑے سنتری سے کہا کہ وہ اپنے ساتھیوں سے ملنا چاہتی ہے۔ سنتری نے آئی ایس آئی کے ایک افسر کو بتایا تو افسر وہاں آ گیا۔ خالدہ نے اسے کہا کہ وہ اکیلی نہیں رہ سکتی' اسے ڈاکٹر رشید کے ساتھ رکھا جائے۔ ڈاکٹر رشید نے بھی یہی درخواست کی اور جواز یہ پیش کیا کہ یہ شریف گھرانے کی لڑکی ہے اور کبھی اس طرح تنہا نہیں رہی۔

آئی ایس آئی نے ان کے ساتھ اپنا رویّہ نرم اور ہمدردی والا رکھا کہ خالدہ کو ڈاکٹر رشید کے ساتھ رہنے کی اجازت دے دی۔ اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ آئی ایس آئی کے ذمہ دار افسران تینوں کو صحیح اور سچّا سمجھنے لگے تھے۔ تفتیش تو ابھی شروع ہی نہیں ہوئی تھی۔ راولپنڈی پہنچنے کے دو دن بعد تفتیش شروع ہوئی۔

تفتیش میجر جنرل کے عہدے کا افسر جو آئی ایس آئی کا ڈائریکٹر تھا' نہیں کیا کرتا۔ صغیر نے خاص طور پر کہا کہ وہ پورا بیان ڈائریکٹر جنرل کو دے گا اور اس کے ساتھ جتنے بھی آفیسر چاہیں بٹھا دیں۔ وہ کہتا تھا کہ اسے کچھ نشاندہیاں کرنی ہیں اور کچھ ایسے پاکستانیوں کے نام بتانے ہیں جن کے متعلق کسی کو وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا کہ یہ اپنے ملک کے دشمن اور ایجنٹ ہوں گے۔ صغیر کی یہ درخواست ڈائریکٹر جنرل تک پہنچائی گئی تو اس نے کہا کہ اسے اس کے پاس لایا جائے اور اس کے سامنے تفتیش کی جائے۔ اس حکم کے تحت ایک کرنل اور ایک میجر کو تفتیشی ٹیم میں شامل کیا گیا اور یہ دونوں افسر صغیر کو میجر

جنرل کے آفس میں لے گئے۔

ڈاکٹر رشید کو ان تین سینئر رینک کے فوجی ڈاکٹروں کے حوالے کر دیا گیا جنہیں اسی مقصد کے لئے بلوایا گیا تھا۔ ان ڈاکٹروں نے صرف یہ دیکھنا تھا کہ رشید واقعی ایم۔ بی۔ بی۔ ایس ڈاکٹر ہے یا نہیں۔ ان ڈاکٹروں نے ڈاکٹر رشید کے ساتھ انتہائی باریک اور پیچیدہ اصطلاحوں میں باتیں کرنی تھیں اور اس کا امتحان لینا تھا۔

خالدہ سے تفتیش کے لئے ایک میجر کو مقرر کیا گیا جو تفتیش میں خصوصی تجربہ اور مہارت رکھتا تھا۔

"سر! میں چھوٹا سا آدمی ہوں" ــــ صغیر نے اپنا بیان ان الفاظ سے شروع کیا ــــ "میں صحیح معنوں میں سورج کو چراغ دکھانا چاہتا ہوں۔ تجربہ اور مشاہدہ جو آپ کا ہے وہ میرا نہیں ہو سکتا پھر بھی مجھے اجازت دیں کہ میں اپنا فرض ادا کر دوں.... میں مان نہیں سکتا کہ آپ کو معلوم نہ ہو کہ وہ کون سے عوامل اور عناصر ہیں جو ہمارے ملک کے نوجوانوں کو اپنے ملک سے بے زار کر رہے ہیں اور وہ دشمن کا بڑا ہی آسان شکار بن رہے ہیں۔ ہم نے اپنے کلچر کو خود ہی تباہ و برباد کر کے سمندر پار کا کلچر اپنا لیا ہے۔ ضرورت یہ تھی کہ نوجوانوں میں قومی جذبہ بیدار کیا جاتا اور انہیں بتایا جاتا کہ یہ پاکستان کس طرح حاصل کیا گیا تھا اور اس کی تمام تر ذمہ داریاں اور اس کی پاسبانی نوجوانوں کے فرائض میں شامل ہے۔ ایک طرف ہمارے دشمن ملک کی فحش فلمیں ہیں اور دوسری طرف اپنے ملک کے ٹی وی کے پاپ اور ڈسکو ناچ گانے ہیں۔ ہماری نوجوان نسل تو مسلمان رہی ہی نہیں۔ یہ نسل کیا پاکستانی بنے گی"۔

"کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ پہلے تم اپنی بات کرو" ــــ میجر جنرل نے کہا ــــ "تم ہندوستانیوں کے جال میں کس طرح آئے تھے اور تمہاری خفیہ سرگرمیاں کیا تھیں اور پھر تم بیدار کس طرح ہو گئے اور پھر یہ بتاؤ کہ اب تم کیا کرنا چاہتے ہو"۔

صغیر نے اپنے بیان کی ابتداء لڑکپن کے اُس دور سے کی جب انڈین فلموں نے اس کے ذہن پر بڑا ہی حسین آسیب طاری کر دیا تھا۔ اس کا باپ' اسکی ماں اور دو جوان بہنیں انڈین فلموں کی اتنی شیدائی تھیں کہ اس پوری فیملی نے اپنے تفریح کا ذریعہ صرف فلم بینی کو ہی بنا رکھا تھا۔ وی سی آر گھر میں موجود تھا اور آئے دن ویڈیو کیسٹ لانے کے لئے پیسے بھی موجود تھے اور روک اور رکاوٹ نہیں تھی۔ انڈین فلموں کی ایکٹریسوں کے

مختلف پوز اکٹھے کر کے البم میں لگاتے رہنا صغیر کی ہابی بن گئی تھی۔

اسی عمر میں صغیر کے ذہن پر بمبئی سوار ہو گیا تھا اور انڈیا کو وہ طلسم ہو شربا جیسا ملک سمجھنے لگا تھا۔ آوارگی پیدا کرنے والے دیگر عناصر بھی کار فرما تھے' بنیادی عنصر فرار کا تھا۔ حقیقت سے نظریں چرا کر فرار کے دلکش اور حسین ذرائع اختیار کرنا صغیر کی فطرت ثانی بننا شروع ہو گئی تھی۔ صغیر نے اپنے بیان میں اپنی آوارگی کی تفصیلات سنائیں اور پھر سنایا کہ وہ کس طرح نوجوانی میں جا کر کسی کی باتوں میں آ گیا اور اسے اُس وقت اصل بات معلوم ہوئی جب اسے ذہنی طور پر جاسوس بنایا جا چکا تھا۔ اس عمل سے اسے دلّی میں گزارا گیا تھا۔ اس کی برین واشنگ ایسی مہارت سے کی گئی تھی کہ وہ محسوس ہی نہ کر سکا کہ وہ اپنے اسلامی ملک کے خلاف ایک کافر ملک کے حق میں غداری کر رہا ہے۔ وہ تو یوں مسرور اور مطمئن ہو گیا تھا جیسے جہنّم سے جنّت میں پہنچا دیا گیا ہو۔

اس کی باتوں سے صاف پتہ چل رہا تھا کہ اس نے جاسوسی اور تخریب کاری میں بڑی جلدی مہارت حاصل کر لی تھی اور دل و جان سے اپنے وطن کی جڑیں کاٹنے میں سرگرم ہو گیا تھا۔ اس کے ہندو آقاؤں نے دیکھ لیا تھا کہ یہ تو بڑے کام کا ایجنٹ مل گیا ہے۔ انہوں نے اسے کچھ اونچا درجہ دے دیا اور اس سے بڑی بڑی وارداتیں کروائیں اور انہوں نے اسے جو عیش و عشرت کروائی وہ کوئی عام آدمی خواب میں بھی نہیں دیکھ سکتا۔

"کیا تم ایک بات بتا سکتے ہو؟" ––– آئی ایس آئی کے ڈائریکٹر جنرل نے پوچھا ––– "اتنی زیادہ عیش و عشرت چھوڑ کر تم اپنی اصلیت میں کس طرح آ گئے ہو؟ تمہیں کس طرح خیال آ گیا کہ تم مسلمان ہو اور پاکستانی ہو اور ہندو تمہارے دین اور تمہارے وطن کا دشمن ہے؟"

"ہاں سر!" ––– صغیر نے جواب دیا ––– "میں کوئی فلسفہ پیش نہیں کروں گا۔ میری واپسی کی وجہ یہ ہوئی کہ میرے کئے ہوئے ایک دھماکے میں میرا اپنا سگا بھائی مارا گیا۔ میں نے اس کی لاش کے ٹکڑے اکٹھے کئے تھے۔ اپنی ماں اور اپنی بہنوں کی چیخیں مجھے یوں لگ رہی تھیں جیسے میرے جسم سے تیر پار ہو رہے ہوں۔ مجھے خیال آیا کہ ہندوستانی تخریب کار پاکستان میں جو دھماکے کرتے ہیں ان میں میرے بھائی جیسے نوجوان مارے جاتے ہیں اور ان کی مائیں اور ان کی بہنیں اسی طرح چیختی اور چلّاتی ہیں اور کیا اس آہ و بکا سے عرش میں بھونچال نہیں آ جاتا ہو گا؟"

صغیر نے تفصیل سے بتایا کہ اس نے اپنے رِنگ لیڈر سے کہہ دیا کہ وہ اب ان سے الگ ہونے کا فیصلہ کر چکا ہے۔ پھر جس طرح رِنگ لیڈر نے اسے ٹرانکولائز دینے کا سلسلہ شروع کیا اور پھر ایک بڑی ہی حسین و جمیل اور نوجوان لڑکی نے صغیر کو اپنے شیشے میں اُتارا وہ سنایا اور سریش کمار کا نام لیا جو اس کا دلی ہمدرد بن گیا تھا۔ صغیر نے بتایا کہ وہ محسوس ہی نہ کر سکا کہ اسے کھانے میں ٹرانکولائزر دیئے جا رہے ہیں اور یہ حسین و جمیل لڑکی اور اس کا ساتھی اس کی برین واشنگ کر رہے ہیں بلکہ ہُوا یہ کہ صغیر انڈیا جانے کے لئے بے تاب ہو گیا۔ پھر سرحد پار کرتے اسے گولی لگ گئی اور اسے انبالہ کے ملٹری ہسپتال میں پہنچا دیا گیا۔

ڈاکٹر رشید اور خالدہ کے متعلق تو اس نے بڑی ہی لمبی بات کی اور بتایا کہ انہوں نے خصوصاً" ڈاکٹر رشید نے کس طرح اسے ٹرانکولائزر انجکشنوں سے بچایا اور فرار کرایا۔ اس نے اپنے فرار کی ساری داستان سنائی جو سن کر میجر جنرل' کرنل اور میجر حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

"میں نے روح کی گہرائیوں سے اپنے گناہوں اور غداری جیسے کبیرہ گناہ سے توبہ کر لی تھی" ––– صغیر نے کہا ––– "اپنے آپ ہی میرے وجود میں ایک مردِ مومن اور سچّا پاکستانی بیدار ہو گیا اور میں نے عملاً" دیکھ لیا کہ جو کوئی سچّے دل سے گناہوں سے توبہ کرتا ہے' اللہ تعالیٰ اس کا ہاتھ تھام لیتا ہے اور اسے صراطِ مستقیم پر ڈال دیتا ہے"۔

"کیا تم اپنے رِنگ کو بے نقاب کرو گے؟" ––– میجر جنرل نے پوچھا۔

"ہاں سر!" ––– صغیر نے کہا ––– "اپنے رِنگ کو میں صرف آپ کے سامنے بے نقاب کرنا چاہتا تھا۔ اسی لئے میں نے یہاں آتے ہی کہہ دیا تھا کہ میں صرف ڈائریکٹر جنرل صاحب کو پورا بیان دوں گا"۔

"صرف میرے آگے کیوں؟" ––– میجر جنرل نے پوچھا۔

"یہ اس لئے سر!" ––– صغیر نے کہا ––– "میں چند ایسے چہروں سے نقاب اٹھاؤں گا جن پر کوئی میجر جنرل ہی ہاتھ ڈال سکتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ کے افسر اپنے فرائض میں بددیانتی کریں گے لیکن نیچے والی سطح سے بات باہر نکل جاتی ہے اور اثر و رسوخ اپنا رنگ دکھا جاتا ہے"۔

میجر جنرل کے کہنے پر صغیر نے تین نام لئے۔ آئی ایس آئی کے تینوں افسر چونک

اٹھے اور حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

"سوچ سمجھ کر بات کرو صغیر!" ــــ میجر جنرل نے کہا ــــ "ایسا نہ ہو کہ تمہیں لینے کے دینے پڑ جائیں"۔

"یہی تو پاکستان کی اصل خرابی ہے" ــــ صغیر نے کہا ــــ "یہاں سچ بولنے والے کو لینے کے دینے ہی پڑا کرتے ہیں .... ثبوت فراہم کرنا اور مخبروں کے ذریعے ان کی در پردہ سرگرمیوں کی رپورٹ لینا آپ کا کام ہے۔ میں نے جو کہا ہے یہ غلط نہیں"۔

صغیر نے بتایا کہ اس نے تین مختلف مقامات پر بم دھماکے کئے تھے۔ یہ بھی بتایا کہ بم کہاں سے ملتے تھے اور اب بھی وہیں سے ملتے ہوں گے۔ اس نے اس جگہ کی نشاندہی کر دی۔

"تمہارا رنگ لیڈر کون تھا؟" ــــ میجر جنرل نے پوچھا۔

"مہندر پال آہوجا!" ــــ صغیر نے جواب دیا ــــ "عام طور پر مہندر آہوجا کہلاتا ہے۔ لاہور میں ایک اعلیٰ قسم کی کوٹھی میں رہتا ہے جس کے باہر اس کا نام ایم اے خان لکھا ہے۔ اب معلوم نہیں وہیں رہتا ہے یا کہیں اور شفٹ ہو گیا ہے"۔

"کیا تم ایک پاکستانی میجر عثمان کو جانتے ہو؟" ــــ میجر جنرل نے پوچھا۔

"شاید نہیں!" ــــ صغیر نے کچھ سوچ کر جواب دیا ــــ "اسے دیکھوں تو شاید پہچان لوں۔ اس کوٹھی میں پاکستانی ایجنٹ آتے رہتے تھے۔ میں تو وہاں نہیں رہتا تھا' آنا جانا لگا رہتا تھا۔ اس طرح میں کئی چہروں کو دیکھ کر پہچان سکتا ہوں"۔

میجر جنرل نے کرنل اور میجر سے کہا کہ وہ صغیر سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں تو پوچھ لیں۔ ان دونوں افسروں نے کئی ایک باتیں نوٹ کر لی تھیں جو وہ صغیر سے باری باری پوچھنے لگے۔ وہ تو بات کی کھال اتار رہے تھے۔ صغیر کے کسی جواب سے ہی بات نکال کر اس پر جرح کرتے اور اپنے شکوک رفع کرتے جا رہے تھے۔ صغیر بغیر گھبرائے خود اعتمادی سے جواب دیتا جا رہا تھا۔

آخر تفتیش ختم ہوئی اور ملٹری پولیس کے حوالدار کو بلا کر صغیر کو اس حکم سے اس کے حوالے کر دیا گیا کہ اسے باہر موجود رکھے۔ اس کے جانے کے بعد میجر جنرل نے ڈاکٹروں کو بلوایا جو ڈاکٹر رشید کا انٹرویو لے رہے تھے اور اس میجر کو بھی بلا لیا جسے خالدہ سے پوچھ گچھ کرنی تھی۔ ان سب نے آپس میں تبادلۂ خیالات کیا۔ ڈاکٹروں نے وثوق

سے کہا کہ رشید واقعی ڈاکٹر ہے لیکن یہ دیکھنا ابھی باقی ہے کہ کس نیّت اور کس ارادے سے پاکستان میں داخل ہُوا ہے۔

خالدہ سے تفتیش کرنے والے میجر نے خالدہ کے متعلق ٹھیک رپورٹ دی اور کہا کہ یہ لڑکی شکوک و شبہات سے پاک معلوم ہوتی ہے۔ خالدہ نے ڈاکٹر رشید اور اس کے خاندان کے متعلق بھی تمام باتیں بتا دی تھیں۔ اس سے صغیر کے بیان کی تصدیق ہو گئی۔

بہت دیر کے بحث مباحثے کے بعد یہ افسر اس حتمی رائے پر پہنچے کہ ان تینوں نے اپنے متعلق تمام شکوک رفع کر دیئے ہیں۔ ڈاکٹروں کو فارغ کر دیا گیا کیونکہ ان کا اب وہاں کوئی کام نہیں تھا۔ میجر جنرل نے حکم دیا کہ صغیر کو پھر اندر بلایا جائے۔ دو تین منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ صغیر پھر ان افسروں کے سامنے بیٹھا تھا۔

○

"لو صغیر!" ــــ آئی ایس آئی کے ڈائریکٹر جنرل نے کہا ــــ "اب ہم تمہیں ایک خبر سناتے ہیں .... تمہارا رنگ لیڈر مہندر آہوجا ہمارے ایک سیل میں بند ہے۔ کچھ اور آدمی بھی پکڑے ہیں اور تین لڑکیاں بھی ہیں۔ تمہیں ان کے سامنے سے گزاریں گے اور تم بتانا کہ ان میں سے کس کس کو پہچانتے ہو اور ان کی سرگرمیوں کے متعلق جو کچھ جانتے ہو ہمیں بتانا"۔

آئی ایس آئی کے ان افسروں کو ابھی صغیر کی مجرمانہ ذہانت کا پتہ نہیں چلا تھا۔ میجر جنرل کی بات سن کر وہ گہری سوچ میں کھو گیا اور چند سیکنڈ بعد اس نے میجر جنرل کی طرف دیکھا۔

"میں آپ کی عقل و دانش اور تجربے تک نہیں پہنچ سکتا" ــــ صغیر نے کہا ــــ "میں ایک تجویز پیش کرتا ہوں' اگر اس پر غور کریں تو میرا خیال ہے کہ یہ بہتر طریقہ ہو گا"۔

میجر جنرل نے اس سے پوچھا کہ اس کی تجویز کیا ہے۔ اس نے بتایا کہ اسے اگر ٹھیک ٹھاک حالت میں ان کے سامنے سے گزارا گیا تو انہیں شک ہو جائے گا کہ وہ وعدہ معاف گواہ بنا لیا گیا ہے یا وہ آئی ایس آئی کا انفارمر بن گیا ہے۔ اس نے یہ طریقہ سوچ کر پیش کیا کہ وہ ایسے حلئے میں ان کے سامنے سے گزارا جائے جیسے اسے بھی گرفتار کیا گیا ہے

اور اسے ٹارچر بھی کیا گیا ہے۔

اُس وقت صغیر نے جو شلوار قمیض پہن رکھی تھی وہ صاف ستھری تھی اور اس نے شیو کر رکھی تھی اور بالوں میں کنگھی کی ہوئی تھی۔ وہ بالکل تازہ دم لگتا تھا۔ میجر جنرل کے کہنے پر ایک میجر دوڑا گیا اور کچھ دیر بعد وہ کسی اردلی کی پرانی سی خاکی پتلون اور میلی کچیلی سی بنیان لے آیا۔ صغیر نے یہ پتلون اور بنیان پہن لی۔ پھر باہر سے تھوڑی سی مٹی منگوا کر صغیر نے اپنے بالوں میں ڈال کر سر کی اچھی طرح مالش کی جس سے اس کے بالوں کی چمک ختم ہو گئی اور بال بکھر گئے۔ اپنے یہی ہاتھ اس نے منہ پر مل لئے اور کہا کہ اسے ہتھکڑی لگائی جائے اور ملٹری پولیس کا ایک حولدار ہتھکڑی پکڑ لے اور پولیس کا ایک جوان پیچھے پیچھے چلے۔

صغیر کے ہاتھوں کو ہتھکڑی بھی لگ گئی اور ملٹری پولیس کے حولدار اور جوان سے کہا گیا کہ اسے ان کوٹھڑیوں کے سامنے سے اس طرح گزارا جائے جیسے یہ قیدی ہے اور اسے تفتیش کرنے میں بہت ٹارچر کیا گیا ہے۔ انہیں بتا دیا گیا کہ یہ ٹھیک طرح نہیں چلے گا اور کوٹھڑیوں کے سامنے اس طرح رکے گا جیسے اس میں چلنے کی سکت ہی نہ رہی ہو۔ حولدار اسے آگے کو کھینچے گا اور اس کے ساتھ اس طرح بات کرے گا جس طرح یہاں مشتبہ اور ملزموں کے ساتھ کی جاتی ہے۔

صغیر کو حولدار اور جوان ڈائریکٹر جنرل کے کمرے سے لے چلے تو وہ اس طرح قدم گھسیٹ کر چلا جیسے اگلے قدم پر گر پڑے گا۔ سب کی ہنسی نکل گئی اور انہیں یہ اندازہ بھی ہو گیا کہ صغیر اپنے مجرمانہ فن میں کتنا استاد ہے۔ باہر لے جا کر اسے اس طرف لے گئے جہاں بہت سے سیل تھے اور ان میں ملزم اور مشتبہ بند تھے۔ صغیر پہلی کوٹھڑی کے سامنے رک گیا اور ہتھکڑی میں بندھے ہوئے دونوں ہاتھ اس کوٹھڑی کی سلاخوں پر رکھ دیئے جیسے وہ گرنے لگا ہو۔ حولدار نے ہتھکڑی کو ہلکا سا جھٹکا دے کر صغیر کو ڈانٹا اور آگے چلنے کو کہا۔ صغیر نے سر سلاخوں کے ساتھ لگا کر اندر دیکھا۔ وہاں فرش پر میجر عثمان بیٹھا تھا۔

"او ظالمو!" —— صغیر نے کراہتے ہوئے کہا —— "مجھے جان سے ہی کیوں نہیں مار ڈالتے۔ ذرا دم لے لینے دو"۔

حولدار اور اس کے ساتھ کا جوان صغیر کو گھسیٹنے لگے۔ صغیر میجر عثمان کو اچھی طرح دیکھ چکا تو آگے چلا۔ اسی طرح اسے دوسری کوٹھڑیوں کے سامنے سے گزارا گیا۔ وہ ہر

قیدی کا چہرہ غور سے دیکھتا گیا۔

آگے ایک کوٹھڑی میں اس کا رنگ لیڈر مہندر آہوجا فرش پر بیٹھا نظر آیا۔ اسے دیکھتے ہی صغیر نے اپنی ایکٹنگ شروع کر دی اور اپنا جسم سلاخوں پر پھینک دیا اور گھٹنوں کو ایسا خم دیا جیسے کھڑا نہیں رہ سکے گا۔

"او مہندر کافر!" —— صغیر نے اس طرح کراہتے ہوئے کہا جیسے بڑی ہی مشکل سے بول رہا ہو۔ وہ تین گالیاں دے کر بولا —— "تو نے ہی میری نشاندہی کر کے مجھے پکڑا دیا ہے ورنہ میں ان لوگوں کے ہاتھ کبھی نہ آتا اور سرحد پار کر جاتا"۔

مہندر نے تو ابھی تک اقبالی بیان دیا ہی نہیں تھا نہ ہی مان رہا تھا پاکستان میں وہ جاسوسی کر رہا ہے۔ صغیر کی یہ بات اور گالیاں سن کر اس کا منہ کھل گیا اور آنکھیں تو ایسے کھلیں جیسے ڈھیلے باہر آ جائیں گے۔ صغیر نے حولدار کی طرف دیکھ کر آنکھ سے اشارہ کیا۔ حوالدار نے اسے بڑی گرج دار آواز میں ڈانٹ کر بازو سے پکڑا اور اپنی طرف گھسیٹا۔

"چل اوئے آگے چل!" —— حوالدار نے اسے گھسیٹتے ہوئے کہا —— "تجھے مرنے بھی نہیں دیں گے اور تو زندہ بھی نہیں رہے گا"۔

پیچھے سے ملٹری پولیس کے سپاہی نے دھکا دیا اور صغیر اگلی کوٹھڑیوں میں جھانکتا گیا۔ اسے کچھ اجنبی چہرے نظر آئے اور ایک کوٹھڑی کے سامنے اس نے وہی ایکٹنگ کی جو مہندر آہوجا کی کوٹھڑی کے سامنے کی تھی۔ اس چہرے کو تو وہ بہت ہی اچھی طرح پہچانتا تھا۔ اسے صغیر نے سریش کمار کہہ کر دو تین گالیاں دیں اور اسے بھی کہا کہ تُو نے ہی مجھے پکڑوایا ہے ورنہ میں کسی کے ہاتھ آنے والا نہیں تھا۔ وہ ایک ہندو سریش کمار تھا۔ جوان آدمی تھا' تیزی سے اٹھا اور سلاخوں تک آ گیا۔

"میں نے تمہیں نہیں پکڑوایا بھائی!" —— سریش کمار نے کہا —— "میں تو تمہیں جانتا پہچانتا ہی نہیں۔ یہ جانتا ہوں کہ تمہیں ان لوگوں نے اتنا ٹارچر کیا ہے کہ تمہارا دماغ ماؤف ہو گیا ہے اور تم اپنے پرائے کو پہچانتے نہیں"۔

صغیر کے اشارے پر حوالدار اور جوان اسے وہاں سے لے گئے اور ان کوٹھڑیوں کے سامنے سے گزرنے لگے جہاں تین لڑکیاں بند تھیں۔ صغیر نے تینوں کو غور سے دیکھا لیکن رکا نہیں۔ اس نے اپنے چلنے کی رفتار اس طرح کر لی تھی جیسے قدم اٹھانے کے قابل نہیں رہا۔ اس نے تینوں چہرے بڑی غور سے دیکھ لئے اور آگے نکل گیا۔ کچھ اور

آگے جا کر اس نے حوالدار سے کہا کہ اب ہتھکڑی کھول دے۔ ہتھکڑی کھل گئی اور وہ اپنی قدرتی اور ٹھیک ٹھاک چال چلنے لگا اور ڈائریکٹر جنرل کے دفتر میں جا پہنچا۔

"کہو بھائی!" ـــــ میجر جنرل نے پوچھا۔ "کیا دیکھ آئے!"

"آئی ایس آئی زندہ باد!" ـــــ صغیر نے کہا ـــــ "آپ نے بڑے ہی زہریلے سانپ کو پکڑ لیا ہے۔ یہی ہے مہندر پال آہوجا۔ کراچی تک اس کا کنٹرول ہے۔ پہلے سیل والے کو میں نے اس کوٹھی میں چند مرتبہ دیکھا ہے۔ آپ نے جس میجر عثمان کا پوچھا تھا وہ یہی لگتا ہے.... کیا یہ میجر عثمان ہے؟"

اسے بتایا گیا کہ یہی میجر عثمان ہے۔ صغیر نے پورے وثوق سے بتایا کہ یہ اسی رِنگ کا آدمی ہے اور جو لڑکیاں بند ہیں ان میں ایک لوسی کہلاتی تھی اور میجر عثمان کو اس لڑکی کے حوالے کر رکھا تھا۔ اس لڑکی کا آپ نے حسن اور جسم دیکھا ہے' اس کا جادو چلتا نہیں دیکھا۔ گستاخی معاف سر! اگر اسے آپ کے پاس تنہائی میں بٹھا دیا جائے تو آپ کو بھی اپنے طلسم میں گرفتار کر لے گی"۔

صغیر نے لوسی کو تو پہچان لیا تھا لیکن اس نے ان لڑکیوں میں سے ایک لڑکی کی گرفتاری پر دلی خوشی کا اظہار کیا۔ یہ تھی منی۔ اس لڑکی کا اصل نام تو کچھ اور ہی ہو گا لیکن صغیر کی مجرمانہ اور غدارانہ زندگی میں وہ منی کے نام سے داخل ہوئی تھی۔ اس کے بعد صغیر کو اس شخص کو سلاخوں کے پیچھے دیکھ کر خوشی ہوئی جسے اس نے سریش کمار کے نام سے مخاطب کیا اور گالیاں دی تھیں۔

سریش اور منی کا پہلے تفصیلی ذکر آ چکا ہے۔ صغیر نے آئی ایس آئی کے افسروں کو بتایا کہ اس نے جب اس رنگ سے اور جاسوسی سے علیحدگی کا اعلان کیا تھا تو مہندر آہوجا نے اس لڑکی اور اس سریش کمار کو صغیر کے پیچھے ڈال دیا تھا۔

"گناہگار تو میں خود ہی ہوں سر!" ـــــ صغیر نے کہا ـــــ "میں خود اپنے وطن کے ان دشمنوں سے جا ملا تھا۔ اسے میری کمزوری کہہ لیں' بددیانتی اور غداری کہہ لیں لیکن ایک بات ضرور سن لیں۔ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ ان سے الگ ہو جاؤں گا اور اللہ سے گناہ معاف کرواؤں گا لیکن اس لڑکی منی نے مجھ پر اپنا طلسم ایسے انداز سے طاری کیا کہ میں اپنا عہد ہی نہیں بلکہ اپنی ذات کو بھی بھول گیا۔ یہ تو انبالہ کے ہسپتال میں ڈاکٹر رشید نے مجھے بتایا تھا کہ میرے ذہن کو ان لوگوں نے ٹرانکولائزر دوائیوں کے ذریعے اپنے قبضے

میں کئے رکھا تھا۔ میں نے کبھی بھی محسوس نہ کیا کہ میں نشے میں ہوں۔ منی مجھ پر اپنی محبت کا نشہ طاری کئے رکھتی تھی۔ مجھے یقین آ گیا تھا کہ یہ حسین و جمیل لڑکی مجھ پر مرمٹی ہے۔ اس کے کپڑوں سے یا شاید جسم سے ایسی خوشبو آتی تھی جو میرے لئے بالکل ہی انوکھی اور روح افزا تھی۔ اس لڑکی کی محبت بالکل ننگی تھی۔ سریش کمار میری دوستی کا دم بھرتا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے مجھ پر اپنی جان بھی قربان کر دینا چاہتا ہو.... زیادہ تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں' آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ میں کیسے پھندے میں آ گیا تھا"۔

صغیر کو اتنا زیادہ آزمایا جا چکا تھا کہ اب اس کے خلاف کوئی شک نہیں رہ گیا تھا۔ صغیر نے ڈاکٹر رشید اور خالدہ کو بھی شکوک و شبہات سے پاک کر دیا تھا۔ آئی ایس آئی کے افسروں نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ صغیر غیر معمولی ذہانت کا مالک ہے۔

اب ان افسروں کے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ جن افراد کو انہوں نے گرفتار کر کے کوٹھڑیوں میں بند کر رکھا تھا' ان میں سے کوئی ایک بھی اقبالی بیان نہیں دے رہا تھا۔ اس میں تو کوئی شک نہیں رہ گیا تھا کہ یہ جاسوسوں کا گروہ ہے لیکن ان کی زبان سے کچھ وارداتیں سننا ضروری تھا اور پھر ان سے نشاندہیاں بھی کرانی تھیں۔ صغیر پر ان افسروں کو اتنا اعتبار آ گیا تھا کہ ایک افسر نے صغیر سے کہا کہ وہ اس مسئلے میں کیا مدد کر سکتا ہے۔

صغیر سے مدد لینے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ آئی ایس آئی کا ڈائریکٹر جنرل' کرنل اور دوسرے افسر اناڑی تھے اور بے بس اور مجبور ہو گئے تھے۔ ان کے پاس عقل بھی تھی' تجربہ بھی اور وہ زبانیں کھلوانا بھی جانتے تھے لیکن یہ ازراہ مذاق تھا یا یہ افسر تفتیش کا راستہ چھوٹا کرنا چاہتے تھے کہ انہوں نے صغیر کی موجودگی میں اس مسئلے پر بات کی۔

"سر! میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی ہے" ـــــ کرنل نے کہا ـــــ "آپ سن لیں' اگر ٹھیک لگے تو اس پر عمل کر لیتے ہیں.... میرا خیال ہے کہ صغیر کو ان ملزموں نے دیکھ لیا ہے اور انہیں یقین آ گیا ہو گا کہ صغیر بھی گرفتار ہو گیا ہے.... کیوں صغیر؟"

"ہاں سر!" ـــــ صغیر نے کہا ـــــ "میں نے ایکٹنگ میں کوئی کسر تو نہیں رہنے دی' میرا بھی یہی خیال ہے کہ میرے رِنگ کے ان افراد کو یقین آ گیا ہے کہ میں بھی پکڑا گیا ہوں"۔

"آپ کی ترکیب کیا ہے؟" ـــــ میجر جنرل نے پوچھا۔

"وہ اس طرح ہے سر!" ـــــ کرنل نے کہا ـــــ "صغیر کو ہم اسی حلئے میں انویسٹی

گیشن روم میں بٹھا دیتے ہیں۔ باہر سنتری کھڑا کر دیں گے۔ پہلے رنگ لیڈر کو اسی کمرے میں لے جا کر بٹھا دیں گے اور ہمارا کوئی میجر انہیں ڈانٹ کر حکم دے گا کہ آپس میں کوئی بات نہیں کرنی' میں تھوڑی دیر کے لئے باہر جا رہا ہوں۔ میجر باہر نکل کر دروازے کی چٹخنی باہر سے چڑھا دے گا جس کی آواز کمرے کی اندر سنی جائے گی۔ صغیر ایکٹنگ کرتے ہوئے رنگ لیڈر کے ساتھ باتیں شروع کر دے گا"۔

"میں شاید آپ کا مطلب سمجھ گیا ہوں" —— میجر جنرل نے کہا —— "وہاں کہیں مائیک چھپا کر رکھا جائے گا اور ٹیپ ریکارڈر بھی کہیں پوشیدہ موجود ہو گا"۔

"یس سر!" —— کرنل نے کہا —— "مائیک اور ٹیپ ریکارڈر کو چھپا کر رکھنے کا اہتمام کیا جائے گا۔ صغیر کو ہم بتا دیں گے کہ یہ کیا باتیں کرے۔ رنگ لیڈر کے بعد اس لڑکی اور پھر سریش کمار کو اور پھر کسی اور کو صغیر کے پاس بٹھا دیں گے۔ ان ملزموں میں سے کسی کو بھی پتہ نہیں چل سکے گا کہ انہیں باری باری صغیر کے پاس بٹھایا جا رہا ہے"۔

"میں آپ کا مطلب سمجھ گیا ہوں سر!" —— صغیر نے کہا —— "مجھے بریفنگ دے دیں اور میں خود بھی ان کے ساتھ ایسی باتیں کروں گا کہ ان کے پردے اٹھ جائیں گے"۔

میجر جنرل نے گھڑی دیکھی۔ پورا دن گزر گیا تھا۔ میجر جنرل نے یہ فیصلہ دیا کہ ڈاکٹر رشید اور خالدہ کے خلاف اب کوئی شک نہیں رہا لیکن ابھی انہیں اسی طرح الگ کمرے میں رکھا جائے گا۔

اس نئی تجویز پر عمل اگلی صبح تک ملتوی کر دیا گیا۔

○

اگلی صبح صغیر آئی ایس آئی کے ہیڈ کوارٹر کے کمرے میں کرسی پر بیٹھا تھا۔ یہ کرسی ایک بڑی میز کے ساتھ رکھی ہوئی تھی۔ صغیر کا حلیہ ایسا تھا جیسے کئی دنوں سے نہایا نہیں اور اس نے منہ ہاتھ نہیں دھویا اور سر کے بال تو بری طرح بکھرے ہوئے اور مٹی آلود سے تھے لیکن یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ ان بالوں پر مٹی ڈالی گئی ہے۔ اس کے چہرے پر نیلے سے نشان ایسے لگائے گئے تھے جیسے یہاں اسے گھونسے یا کسی اور چیز سے ضربیں لگائی گئی ہوں۔ وہ میلی کچیلی سی خاکی پتلون اور ایسی ہی گندی سی بنیان میں ملبوس تھا۔ اس کی پیٹھ پر اس طرح لکیریں پینٹ کی گئی تھیں جیسے اسے بید مارے گئے ہوں۔ اسے دو افسروں

نے بڑی اچھی طرح بریفنگ دے دی تھی اور دو چار ایسی باتیں بھی بتا دی تھیں جن کا صغیر کو پہلے علم نہیں تھا۔

میجر عثمان کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ کچھ باتیں اس کے متعلق بھی بتا دی گئیں۔ مہندر' سریش کمار اور مُنی کے ساتھ تو اسے خود ہی باتیں کرنی تھیں۔ وہ خود بھی سمجھتا تھا کہ اس سارے ناٹک کا مطلب کیا ہے۔

کچھ دیر بعد ایک میجر کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ مُنی تھی۔ اس میز کے ساتھ ایک اور کرسی پڑی تھی۔ میجر نے مُنی کو اس کرسی پر بٹھا دیا۔

"اوئے!" —— میجر نے صغیر سے بڑے رعب سے پوچھا —— "اس لڑکی کو تُو جانتا ہے؟"

"نہیں سر!" —— صغیر نے خوفزدگی کے لہجے میں کہا اور ہاتھ جوڑ کر بولا —— "میں اسے نہیں جانتا سر جی! اسے پہلی بار دیکھ رہا ہوں"۔

"تم دونوں کان کھول کر سن لو" —— میجر نے ڈانٹ ڈپٹ کے لہجے میں کہا —— "مجھے ایک اور حکم مل گیا ہے۔ میں اُدھر جا رہا ہوں۔ اتنی دیر یہاں چپ کر کے بیٹھے رہنا' آپس میں کوئی بات نہیں کرنی۔ سنتری باہر کھڑا ہے۔ اس نے سن لیا تو میں اسے کہہ چلا ہوں کہ تم دونوں کو مرغا بنا کر تمہاری چھترول کر دے گا"۔

"نہیں سر جی!" —— صغیر نے پھر ہاتھ جوڑ دیئے اور روتی ہوئی آواز میں کہا —— "میں اس کے ساتھ کوئی بات نہیں کروں گا۔ مجھے تو معلوم ہی نہیں یہ ہے کون!"

"اب بک بک بند کرو" —— میجر نے کہا اور باہر کو چل پڑا۔

میجر نے باہر نکل کر باہر والا بولٹ چڑھا دیا جس کی آواز کمرے میں صغیر اور مُنی کو سنائی دی۔ صغیر نے مُنی کی طرف دیکھا اور سرگوشی میں کہا' دفع ہو گیا ہے۔

"اتنی جلدی واپس نہیں آئے گا" —— صغیر نے مُنی کی طرف جھک کر سرگوشی میں کہا ——

"اسے میری موجودگی میں حکم ملا تھا.... جلدی جلدی بتاؤ تم سب لوگ پکڑے کس طرح گئے ہو!"

"پہلے تم بتاؤ" —— مُنی نے پوچھا —— "تم اس پھندے میں کس طرح آ گئے ہو؟ تم تو انڈیا چلے گئے تھے"۔

"میں ابھی سرحد میں داخل ہی ہوا تھا" — صغیر نے کراہتی ہوئی نحیف سی آواز میں جواب دیا — "ذرا سا بھی اشارہ مل جاتا تو میں اس طرف کا رخ نہ کرتا۔ سرحد پار کر لی تھی کہ پاکستانی رینجر نے پکڑ لیا اور اسی رات یہاں لے آئے۔ معلوم ہوتا ہے کسی نے ہمارے رِنگ کے ساتھ غداری کی ہے"۔

"اپنے کسی ممبر نے غداری نہیں کی" — منی نے کہا — "یہ لُوسی اور میجر عثمان کی بے احتیاطی کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ اُڑتی اُڑتی سنی تھی کہ لُوسی نے میجر عثمان کی بیوی کو اپنا کراچی کا فون نمبر دے دیا تھا۔ یہ تو مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ عثمان اپنی بیوی کو بیوقوف بناتا رہا ہے اور اس میں لُوسی بھی شامل تھی۔ لُوسی عثمان کی بیوی کو فون کرتی رہتی تھی۔ پھر کیا ہُوا؟.... یہ ہم میں سے کوئی بھی نہیں جانتا.... کیا تم نے اقبال جرم تو نہیں کر لیا؟"

"اقبال جرم کر لیتا تو کیا میری یہ حالت ہوتی؟" — صغیر نے اور زیادہ کراہتی ہوئی سرگوشی میں کہا — "یہ تو میری ہمت اور برداشت ہے کہ میں بیٹھا باتیں کر رہا ہوں' کوئی اور ہوتا تو وہ بے ہوش پڑا ہوتا۔ انہوں نے میرا جو ٹارچر کیا ہے اور ابھی اور کریں گے' یہ شاید ہی کوئی انسان برداشت کر سکتا ہو۔ میں جان دے دوں گا اقبالی بیان نہیں دوں گا"۔

"معلوم ہوتا ہے ہم میں سے کسی نے بھی ابھی اقبالی بیان نہیں دیا" — مُنی نے کہا — "ابھی ہمیں اقبالی بیان دینے پر زبانی اکسایا جا رہا ہے' اس کے بعد ہمارا بھی ٹارچر کر دیں گے"۔

"وہ تو ہو گا ہی!" — صغیر نے کہا — "یہ بتاؤ کہ اپنا کام کچھ آگے بڑھا تھا یا نہیں۔ تمہاری قربانیوں کا کچھ صِلہ بھی ملا ہے یا نہیں"۔

منی نے اپنے رِنگ کی کامیاب وارداتیں مختصراً سنانی شروع کر دیں۔ اسے معلوم نہ تھا کہ اس کا ایک ایک لفظ ریکارڈ ہو رہا ہے۔ صغیر ان کا گھر بھیدی تھا۔ اس نے اہم وارداتیں اور کامیابیاں مُنی کو یاد دلا کر پوچھا۔ مُنی سرگوشیوں میں جواب دیتی رہی۔

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد میجر واپس آ گیا۔ باہر سے دروازے کا بولٹ کھلنے کی آواز کمرے میں آئی تو دونوں ایک دوسرے سے ہٹ گئے اور صغیر نے سر میز پر رکھ کر کراہنا شروع کر دیا۔ میجر نے اندر آ کر مُنی کو پکارا اور کہا کہ وہ اس کے ساتھ چلے۔ مُنی فوراً

اٹھی اور میجر کی طرف چل پڑی۔ میجر اسے لے گیا اور دروازہ پھر باہر سے بند ہو گیا۔

کچھ دیر بعد یہ میجر پھر کمرے میں آیا۔ اب اس رِنگ کا لیڈر مہندر آہوجا اس کے ساتھ تھا۔ میجر نے اس ہندو رِنگ لیڈر کو اسی کرسی پر بٹھا دیا جس پر مُنی کو بٹھایا تھا پھر صغیر اور مہندر کو ڈانٹ ڈپٹ کے لہجے میں وہی باتیں کہیں جو اس نے مُنی کو یہاں بٹھا کر کہیں تھیں۔

"سر جی!" — صغیر نے ہانپی کانپتی آواز میں بڑی ہی مشکل سے کہا — "میرے لئے تو سانس لینا بھی دشوار ہو رہا ہے اور آپ کہتے ہیں کہ آپس میں کوئی بات نہ کرنا"۔

اتنا کہہ کر صغیر اس طرح ہانپنے لگا جیسے اس کی سانسیں تہہ و بالا ہو گئی ہوں اور وہ مشکل سے ہی سنبھلے گا۔ میجر نے اسے ڈانٹ دیا اور کمرے سے نکل گیا۔ باہر سے بولٹ چڑھنے کی آواز آئی تو صغیر نے مہندر کی طرف دیکھا اور ایسی حالت بنالی جیسے وہ بولنا چاہتا ہے لیکن بولنے کی طاقت نہیں۔

"تم کس طرح اور کہاں سے پکڑے گئے ہو؟" — مہندر نے صغیر سے پوچھا — "تم انڈیا سے کب آئے تھے؟ مجھے تمہارے آنے کی اطلاع بھی نہیں ملی"۔

"میں سرحد پار کرتے ہی پکڑا گیا تھا" — صغیر نے اکھڑی ہوئی سانسوں کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے سرگوشی میں جواب دیا — "کیا آپ کو گرفتار ہونے سے پہلے اتنی مہلت نہیں ملی تھی کہ دِلّی اطلاع دے دیتے؟ کم از کم میں وہیں رکا رہتا۔ اب تو میں بہت بڑا مشن لے کر آیا تھا.... یہ گرفتاریاں ہوئیں کیسے؟"

مہندر پال آہوجا جو منجھا ہُوا اور بڑا ہی تجربہ کار رِنگ کا لیڈر تھا' صغیر کی باتوں میں آ گیا۔ صغیر نے اس کے ساتھ ایسی باتیں کیں اور پوچھیں جو آئی ایس آئی کے افسر معلوم کرنا چاہتے تھے۔ مہندر سرگوشیوں میں بے خوف و خطر ہر بات کا جواب دیتا چلا گیا۔

"پکڑے جانے کا افسوس نہیں" — مہندر نے کہا — "ایک نہ ایک دن تو پکڑے ہی جانا تھا' افسوس یہ ہے کہ جو کام شروع کیا تھا وہ ادھورا رہ گیا ہے۔ جس طرح مشرقی پاکستان میں ہمارے لوگوں نے خانہ جنگی کرا دی تھی اسی طرح ہم نے اِدھر بھی شروع کر دی تھی۔ تم تو جانتے ہی ہو صغیر بھائی! ہم پکڑے گئے تو ہمارا کوئی اور رِنگ یہ کام کر لے گا لیکن میں یہ مشن اپنے ہاتھوں پورا کرنا چاہتا تھا"۔

صغیر نے اپنی استادی کھیل کر اس کے منہ سے کچھ اور باتیں بھی اگلوا لیں جو ریکارڈ

ہوتی چلی جارہی تھیں۔

"میں نے ایک سیل میں پاکستان آرمی کے ایک افسر کو بند دیکھا ہے" ـــــ صغیر نے کہا ـــــ "اسے آپ کے ہاں چند مرتبہ دیکھا تھا"۔

"میجر عثمان!" ـــــ مہندر نے کہا ـــــ "یہ تو ہمارا بڑا ہی قیمتی ممبر تھا۔ اسے لُوسی ہمارے رنگ میں لائی تھی"۔

"مجھے اس سے خطرہ محسوس ہو رہا ہے" ـــــ صغیر نے بدستور ہانپتی کانپتی اور کراہتی آواز میں کہا ـــــ "یہ وعدہ معاف گواہ نہ بن جائے۔ مجھ سے بہتر تو اسے آپ ہی جانتے ہیں"۔

"مجھے ایسی امید تو نہیں" ـــــ مہندر نے کہا ـــــ "اس شخص نے ہمیں انتہائی قیمتی انفارمیشن دی ہے اور دیتا ہی رہا ہے۔ دِلّی والوں نے خاص طور پر خراجِ تحسین بھیجا تھا۔ اس نے پاکستان کے جو فوجی راز دیئے ہیں وہ شاید کوئی اور نہیں دے سکتا"۔

صغیر بڑی کامیابی سے مہندر کی زبان سے میجر عثمان کی غداری کے واقعات اگلوا رہا تھا۔ مہندر نے یہ بھی کہا کہ میجر عثمان اس قدر مضبوط دِل گُردے اور اعصاب والا آدمی ہے کہ اقبالی بیان نہیں دے گا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ انڈین انٹیلی جنس نے اسے اتنے انعام و کرام دیئے ہیں کہ اس کی جھولی لبریز کر دی ہے۔

میجر مقررہ وقت پر کمرے میں داخل ہُوا اور مہندر کو اٹھا کر لے گیا۔ اسے سیل میں بند کر کے واپس آیا اور صغیر کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے صغیر سے پوچھا کہ یہ طریقہ کار کہاں تک کامیاب رہا ہے!

"ٹیپ سن لیں" ـــــ صغیر نے کہا ـــــ "کامیابی ناکامی کا اندازہ ٹیپ سے ہو گا"۔

"آؤ پھر چلتے ہیں" ـــــ میجر نے کہا ـــــ "میں ٹیپ لے آتا ہوں"۔

میجر ٹیپ لے آیا اور دونوں ڈائریکٹر جنرل کے آفس میں چلے گئے۔ اس کرنل اور میجر کو بھی بلوا لیا گیا جو پہلے تفتیش میں شامل تھے۔ ٹیپ ریکارڈر منگوا کر اس میں ٹیپ ڈالی گئی اور پھر سب نے سنی۔ صغیر کی ذہانت کی دھاک بیٹھ گئی اور اگر اس پر تھوڑا سا کوئی شک شبہ رہ گیا تھا وہ بھی رفع ہو گیا۔ اس نے بڑی کامیابی سے یہ رول ادا کیا تھا۔

ان افسروں کو بس اتنا ہی اشارہ کافی تھا جو انہیں ٹیپ سے مل گیا اور تھوڑی سی تصدیق کی ضرورت تھی، وہ بھی ہو گئی۔ میجر عثمان کے متعلق تو ساری بات ہی واضح ہو

گئی۔ میجر جنرل نے کہا کہ اب مزید کسی ملزم سے اس طریقے سے بات اگلوانے کی ضرورت نہیں۔ یہ اب ان افسروں کا کام تھا کہ شہادت اکٹھی کرنی تھی اور ان ملزموں کے خلاف کیس تیار کرنا تھا۔

○

صغیر نے جب دیکھا کہ اس کا اعتماد جم گیا ہے تو اس نے کرنل سے الگ ہو کر درخواست کی کہ اسے انہوں نے اعتماد میں لے لیا ہے تو ڈاکٹر رشید اور خالدہ کو بھی مشتبہ سمجھنا چھوڑ دیں۔ اس نے کہا کہ وہ ان کی یہ قربانی ساری عمر نہیں بھولے گا اور انہیں اجر تو اللہ ہی دے گا۔

کرنل نے اپنے میجر جنرل سے بات کی تو جنرل نے اس درخواست کو مانتے ہوئے ڈاکٹر رشید اور خالدہ کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ میجر جنرل نے اس دوران جب صغیر سے مُنی اور مہندر کو ملوایا جا رہا تھا' ڈاکٹر رشید کا خود انٹرویو لیا اور اس پر بہت جرح کی تھی۔ وہ دراصل پہلے سے قائل ہو چکا تھا کہ ڈاکٹر رشید صاف آدمی ہے اور اس نے پاکستان کے نام پر بہت بڑی قربانی دی ہے۔ میجر جنرل نے کرنل سے کہا کہ وہ وزیر اعظم سے ملے گا اور ڈاکٹر رشید کو یہاں آباد کرنے کے سرکاری انتظامات کروا دے گا۔ یہ اطلاع ڈاکٹر رشید اور خالدہ کو دے دی گئی اور ان کے کمرے سے سنتری ہٹا دیا گیا۔ انہیں یہ بھی بتا دیا گیا کہ اب وہ بالکل آزاد ہیں اور مستقل رہائش کا انتظام ہونے تک اسی کمرے میں رہیں گے۔

صغیر کو آئی ایس آئی کی مدد کے لئے ساتھ ہی رکھ لیا گیا۔ اس کی رہائش کا انتظام بھی اسی کمرے میں رہنے دیا گیا جس میں اسے نظر بند رکھا گیا تھا۔

○

اب آئی ایس آئی اپنے طریقہ کار کے مطابق تفتیش میں مصروف ہو گئی۔ جن ملزموں کو گرفتار کیا گیا تھا ان کے خلاف مقدمہ کسی بھی وقت تیار کر کے عدالت میں بھیجا جا سکتا تھا لیکن ابھی ان سے ان کے مزید ساتھیوں کی نشاندہی کروانی تھی۔ آئی ایس آئی کے پاس یہ معلومات لینے کے لئے اور ملزموں کی زبانیں کھلوانے کے لئے طریقے موجود تھے۔ صغیر کو تو صرف یہ معلوم کرنے کے لئے استعمال کیا گیا تھا کہ ملزموں میں کون کیا ہے اور کتنے پانی میں ہے۔

صغیر کو جب یہ بتا دیا گیا کہ اس کے خلاف اب کوئی شک اور شبہ نہیں رہا تو اس نے

تین پاکستانیوں کے نام اور ایڈریس بتائے جو اس رِنگ کے باقاعدہ ممبر تھے اور دھماکوں کی وارداتوں میں شامل تھے۔ اگلے تین چار دنوں کے دوران آئی ایس آئی نے سول پولیس کو ساتھ لے کر تینوں کے گھروں پر چھاپے مار کر تینوں کو گرفتار کر لیا۔

کراچی اور لاہور سے پکڑے ہوئے ہندوؤں اور تینوں لڑکیوں کو تفتیش کی "چکی" میں پیسا جانے لگا۔ آئی ایس آئی کے پاس ایک سے بڑھ کر ایک تجربہ کار اور عقل مند تفتیشی افسر موجود تھا اور کچھ طریقے بھی تھے لیکن ملزموں میں سے کوئی ایک بھی بیان دینے پر آمادہ نہیں ہو رہا تھا۔ میجر عثمان پہلے روز ہی کی طرح پتھر بنا رہا۔ ان سب کی گرفتاری کی خبر کسی اخبار کو نہ دی گئی نہ باہر کسی کو پتہ چلنے دیا گیا کہ یہ لوگ گرفتار کئے جا چکے ہیں۔ انہیں غیر معینہ مدت تک حراست میں رکھا جا سکتا تھا۔

یہ پولیس کا طریقۂ کار ہوتا ہے کہ کسی ایک ملزم کو پکڑ لے تو اس کی خبر تمام اخباروں میں چھپوائی جاتی ہے۔ مقصد صرف تشہیر ہوتا ہے اور اس طرح پولیس اپنی بداعمالیوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتی ہے لیکن آئی ایس آئی کو اپنی تشہیر کی ضرورت نہیں تھی بلکہ اس محکمے کے کارندوں کے پیش نظر اپنے وطن کا دفاع اور اس کی سلامتی تھی۔ نہ کسی تمغے کا لالچ تھا نہ نقد انعام و اکرام کا۔

وہ جو ہندو ملزم زیرِ حراست تھے، انہیں اپنی حکومت سے معاوضہ ملتا ہو گا اور ان کی حکومت ان کے تمام اخراجات بھی ادا کرتی ہو گی لیکن یہ سب ہندو تھے اور پاکستان کی جڑیں کاٹنے کو اپنا مذہبی فریضہ سمجھتے تھے۔ ان سب کی پوری پوری کوشش تھی کہ اپنے کسی اور ساتھی کی نشاندہی نہ کریں۔ ان تینوں ہندو لڑکیوں کا بھی رویّہ یہی تھا لیکن ان کی بدقسمتی یہ تھی کہ ان کے رِنگ کے تین پاکستانی ممبر بھی پکڑے گئے تھے۔ یہ تینوں اپنے ملک کے غدار اور ایمان فروش تھے۔ ان ہندوؤں نے اس پہلو کو نظر انداز کر دیا تھا کہ غدار اور ایمان فروش کا ضمیر ہوتا ہی نہیں۔ وہ جس کے ہاتھ چڑھ جائے اسی کا ہو کے رہ جاتا ہے۔ جس کا کوئی ایمان نہیں ہوتا اس کا کوئی اصول نہیں ہوتا اور اس کی کوئی ذات بھی نہیں ہوتی۔

یہ پاکستان کی خوش قسمتی تھی کہ تین پاکستانی بھی پکڑے گئے۔ ان تینوں کو الگ الگ جب آئی ایس آئی کے تفتیشی افسروں نے آنکھیں دکھائیں تو تینوں نے وعدہ معاف گواہ بننے کی درخواست کر دی۔ تینوں کو معافی کا لالچ دے کر ان کے بیان لے لئے گئے لیکن

ان میں سے کوئی ایک بھی کسی اور کی نشاندہی نہ کر سکا۔ ان غداروں کو معلوم نہیں تھا کہ ہندوؤں نے انہیں روپیہ پیسہ دے کر اور کچھ عیاشیاں کروا کے ان کی برین واشنگ کر رکھی ہے اور انہیں اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتے رہے ہیں اور اپنے رِنگ کا کوئی ایک بھی راز ان تک نہیں پہنچنے دیا۔ ہندوؤں نے انہیں ظاہری طور پر اپنے دوست بنائے رکھا مگر انہیں اپنے دشمن ہی سمجھتے رہے کیونکہ یہ مسلمان تھے اور پاکستانی۔ پاکستان میں جو دھماکے ہوتے ہیں اور فائرنگ کی جو وارداتیں ہوتی ہیں جن میں بے گناہ مارے جاتے ہیں، یہ ہندو اپنے پاکستانی ایجنٹوں سے ہی کرواتے ہیں تاکہ پکڑے جائیں تو پاکستانی پکڑے جائیں اور مارے جائیں تو یہی مارے جائیں۔

ایک مہینہ بھی نہیں گزرا تھا کہ آئی ایس آئی نے تفتیش میں خاصی کامیابیاں حاصل کر لیں۔ ہندو ملزموں پر تو ابھی بہت کام کرنا تھا، ان سے کئی ایک نشاندہیاں کروانی تھیں لیکن ابھی تک ان میں سے کسی نے اپنے جرم کو تسلیم ہی نہیں کیا تھا، البتہ میجر عثمان کے خلاف اتنی شہادت اکٹھی ہو گئی کہ اسے قانون کے سامنے کھڑا کیا جا سکتا تھا۔ اس کے خلاف پیش کئے جانے والے گواہوں میں اس کی اپنی بیوی واجدہ بھی شامل تھی۔

جب سے میجر عثمان گرفتار ہوا تھا واجدہ چار پانچ مرتبہ میجر عثمان کے دوستوں، میجر سمیع، کیپٹن آصف اور میجر امتیاز کو فون پر کہہ چکی تھی کہ وہ ہر صورت میں میجر عثمان کے خلاف عدالت میں گواہی دے گی۔ اس کی یہ پیش کش آئی ایس آئی کے ڈائریکٹر جنرل تک پہنچ گئی تھی۔

انہی دنوں ڈائریکٹر جنرل لاہور اپنے محکمے کے کسی کام کے سلسلے میں لاہور گیا اور میجر امتیاز سے کہا کہ وہ واجدہ کے ساتھ فون پر اس کی بات کرا دے.... بات ہوئی تو ڈائریکٹر جنرل نے واجدہ سے کہا کہ وہ اسے ملنا چاہتا ہے۔ کیا وہ اس کے آفس میں آنا پسند کرے گی یا وہ اس کے گھر آ جائے۔ واجدہ نے آئی ایس آئی آفس میں جانا زیادہ بہتر سمجھا۔

واجدہ وہاں گئی اور ڈائریکٹر جنرل سے ملی۔ ڈائریکٹر جنرل نے اس سے پوچھا کہ وہ کیا جانتی ہے اور اس کا ارادہ کیا ہے۔ واجدہ نے اس کے ساتھ وہی باتیں کیں جو وہ میجر سمیع، کیپٹن آصف اور آئی ایس آئی کے میجر امتیاز کے ساتھ تین چار مرتبہ کر چکی تھی۔ اس کی جذباتی کیفیت بالکل وہی تھی جو عثمان کی گرفتاری کی خبر سن کر ہوئی تھی۔

آئی ایس آئی کے اس جنرل نے واجدہ سے اس کے اور عثمان کے اغوا کا پورا واقعہ

سنا اور پھر ان کی رہائی کی تفصیلات بھی سنیں۔ اس میجر جنرل کو میجر امتیاز نے واجدہ کی تمام باتیں سنا رکھی تھیں لیکن جنرل اپنے طور پر تصدیق اور اپنی تسلّی کرنا اور واجدہ کو کچھ خطروں سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔

"ایک بار پھر سوچ لیں مسز عثمان!" ——— میجر جنرل نے کہا ——— "یہ نہ سمجھیں کہ آپ کورٹ میں جو سچ بولیں گی وہ سچ ہی تسلیم کرلیا جائے گا' عثمان کے صفائی کے وکیل ایسی جرح کریں گے کہ آپ کے لئے ثابت قدم رہنا محال ہو جائے گا۔ وہ تو بال کی کھال اتارا کرتے ہیں اور اکثر سچے گواہ عدالت میں جھوٹے ثابت ہو جاتے ہیں"۔

"مجھے اپنے آپ پر اعتماد ہے جنرل صاحب!" ——— واجدہ نے کہا ——— "میں نے جو چوٹیں کھائی ہیں وہ میری زبان سے سچ ہی کہلوائیں گی البتہ شہادت اور ثبوت پیش کرنا آپ کا کام ہے۔ میری تو دو حیثیتیں ہیں۔ ایک یہ کہ میں پاکستانی ہوں اور دوسرے یہ کہ میں بیوی ہوں۔ عثمان اور اس ہندو لڑکی نے مجھے ان دونوں حیثیتوں میں دھوکے دیئے ہیں"۔

"میں سمجھتا ہوں مسز عثمان!" ——— میجر جنرل نے کہا ——— "مجھے میجر امتیاز بتا چکا ہے کہ آپ کتنی زیادتی جذباتی ہیں لیکن جب معاملہ کورٹ میں جاتا ہے تو وہاں جذبات اکثر معاملہ الٹ دیتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ آپ کی جذباتیت عدالت کو متاثر کرلے .... اصل بات یہ ہے مسز عثمان! میں ڈرتا ہوں عدالت میں ہمارا کیس ناکام نہ ہو جائے"۔

"میرے بھائی بھی گواہ ہیں جنرل صاحب!" ——— واجدہ نے کہا ——— "وہ بھی تو عدالت میں پیش ہوں گے"۔

"وہ ہمارے گواہ تو ہیں" ——— میجر جنرل نے کہا ——— "وہ گواہی دیں گے کہ لوسی کو وہ اچھی طرح پہچانتے ہیں اور اسے کراچی کی فلاں نمبر کوٹھی سے گرفتار کیا گیا تھا اور اس کے ساتھ کون کون گرفتار ہوا تھا"۔

"لیکن جنرل صاحب!" ——— واجدہ نے کہا ——— "کیا یہ سوال نہیں اٹھے گا کہ میرے بھائی لوسی کو کس طرح جانتے پہچانتے ہیں؟ .... بھائیوں کو بتانا پڑے گا کہ انہوں نے میجر سمیع اور کیپٹن آصف کو ساتھ ملا کر لوسی کو اس وقت اغوا کیا تھا جس وقت وہ عثمان کے ساتھ اس کی گاڑی میں جا رہی تھی"۔

"مجھے وہ واقعہ نہ سنائیں مسز عثمان!" ——— آئی ایس آئی کے اس میجر جنرل نے کہا

——— "وہ میں پورا سن چکا ہوں لیکن میں یہ واقعہ شاید عدالت میں بیان نہ ہونے دوں۔ کوئی ثبوت نہیں۔ ہمارے کیس پر اس کا الٹا اثر ہو سکتا ہے۔ صفائی کے وکیل اس واقعہ کو جھٹلا بھی سکتے ہیں"۔

"جنرل صاحب!" ——— واجدہ نے سٹپٹا کر کہا ——— "میں حیران ہوں یہ کیسا قانون ہے جو سچی بات کو قبول نہیں کرے گا اس لڑکی کی استادی اور چالاکی دیکھیں کہ میرے بھائیوں نے اسے دو تالوں میں بند کر دیا تھا لیکن وہ ان کے ایک نوکر کو ساتھ لے کر فرار ہو گئی اور نوکر کا آج تک سراغ نہیں ملا۔ معلوم نہیں اسے ان کافروں نے کہاں غائب کر دیا ہے"۔

یہ تو کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ اس نوکر کو مہندر آہوجا نے قتل کروا کے لاش نہر میں بہا دی تھی۔

"آپ گواہی ضرور دیں مسز عثمان!" ——— میجر جنرل نے کہا ——— "لیکن ایک اور پہلو پر بھی غور کر لیں۔ میں اسی معاشرے کا فرد ہوں اور اس معاشرے کی سیاست بازی کو بڑی اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ آپ اپنے خاوند کے خلاف گواہی دیں گی تو آپ کے سسرال آپ کے دشمن ہو جائیں گے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ وہ کوئی شریف لوگ نہیں' غنڈہ گردی بھی کر سکتے ہیں اور ان کا اثر و رسوخ بھی ہے۔ وہ آپ کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے آپ کے بھائی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے"۔

"عثمان میرا خاوند نہیں رہا" ——— واجدہ نے کہا ——— "عثمان اپنے وطن کا غدار اور اپنے وطن اور دین کے دشمنوں کا مددگار ہے۔ اسے میں مسلمان سمجھتی ہی نہیں اور میں کسی غیر مسلم کی بیوی نہیں بن سکتی۔ اگر اس کے ماں باپ اور بھائی وغیرہ مجھے اپنا دشمن سمجھیں گے تو میں انہیں بھی غیر مسلم کہوں گی۔ میں عثمان کے خلاف عدالت میں ضرور پیش ہوں گی"۔

میجر جنرل نے دیکھ لیا کہ واجدہ بہت جذباتی عورت ہے۔ یہ تو اسے یقین تھا کہ واجدہ جو کہہ رہی ہے بالکل سچ ہے لیکن اس کے سچ کو صحیح ثابت کرنے کے لئے ٹھوس شہادت اور ثبوت کی ضرورت تھی۔

"اچھا مسز عثمان!" ——— میجر جنرل نے کہا ——— "آپ گھر چلی جائیں اور میری اطلاع کا انتظار کریں۔ میں ایک دو دنوں میں آپ کے دونوں بھائیوں کو اور آپ کو بھی

راولپنڈی آنے کی زحمت دوں گا۔ وہاں آپ کو بتاؤں گا کہ ہمیں کیسی اور کتنی گواہی کی ضرورت ہے اور کچھ ضروری باتیں بھی آپ کے گوش گزار کروں گا“۔

○

تین چار دنوں بعد واجدہ اور اس کے دونوں بھائی کو آئی ایس آئی کے اس میجر جنرل کے آفس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ میجر سمیع اور کیپٹن آصف بھی وہاں موجود تھے۔ انہیں بھی لاہور سے بلایا گیا تھا اور آئی ایس آئی کی لاہور برانچ کا میجر امتیاز بھی وہیں تھا۔ آئی ایس آئی کا ایک کرنل اور ایک میجر بھی وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔

میجر جنرل نے کال بیل بجائی تو اردلی دوڑا آیا۔ میجر جنرل نے کہا اسے لے آؤ۔ اردلی کے باہر نکلتے ہی لُوسی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ساتھ آئی ایس آئی کا ایک عہدیدار تھا۔ میجر جنرل نے لُوسی کو شفقت اور عزت سے کہا کہ وہ اس کرسی پر بیٹھ جائے اور دل سے ہر خوف اور گھبراہٹ نکال دے۔

”ان سب کو اچھی طرح دیکھ لو لُوسی!“ —— میجر جنرل نے کہا —— ”کوئی ایک بھی چہرہ تمہارے لئے اجنبی نہیں۔ تم ان سب کو جانتی ہو اور یہ تمہیں جانتے اور پہچانتے ہیں۔ سب سے پہلے یہ بتاؤ کہ تم اتنے دنوں سے ہمارے سیل میں قید ہو جس کا مطلب یہ ہے کہ تم ہمارے قبضے میں ہو۔ کیا اس وقت تک تمہارے ساتھ کسی نے کوئی بدتمیزی یا بداخلاقی کی ہے؟“

”نہیں!“ —— لُوسی نے جواب دیا —— ”لیکن میں ہر وقت بدتمیزی اور بداخلاقی کی توقع رکھتی ہوں‘ میں آخر ملزم ہوں“۔

”یہ تمہارے اپنے اختیار میں ہے“ —— میجر جنرل نے کہا —— ”اگر تم میرے تفتیشی افسروں کے ساتھ تعاون نہیں کرو گی اور انہیں پریشان کرو گی تو اس کے جواب میں یہ تمہیں پریشان کریں گے .... یہ بھی دیکھو کہ میں اپنے محکمے کا ڈائریکٹر جنرل اور میجر جنرل ہوں۔ تفتیش کرنا میرا کام نہیں۔ یہ میرے جونیئر آفیسر کیا کرتے ہیں لیکن تمہیں میں خصوصی احترام دے رہا ہوں‘ اب دیکھنا یہ ہے کہ تم اس احترام کا کتنا کچھ احترام کرتی ہو“۔

لُوسی کا انداز یہ تھا کہ جب بھی اسے اقبالی بیان دینے کے لئے کہتے تھے تو وہ طنزیہ انداز سے انکار کر دیتی تھی۔ ایک بار اس نے یہ بھی کہا تھا کہ اسے صرف اس لئے گرفتار

کیا گیا ہے کہ وہ ہندو ہے لیکن اب اس نے سر جھکا لیا پھر سر اٹھا کر سب کو باری باری دیکھا اور آخر اس کی نظریں میجر جنرل کے چہرے پر جا رکیں۔ اس کے چہرے پر کچھ اور ہی تاثر آ گیا تھا۔ انٹیلی جنس والوں کی نگاہوں میں یہ تاثر امید افزا تھا۔

”میں تمہیں یہ بھی بتا دیتا ہوں لُوسی!“ —— میجر جنرل نے کہا —— ”میجر عثمان کو اس کے بیوی بچوں سمیت سندھ میں اغوا کیا گیا تھا اور تم نے اپنے ایک ساتھی کے ساتھ انہیں رہائی دلوائی تھی۔ وہ شخص جس نے انہیں اغوا کروایا تھا اور اغوا کرنے والوں میں سے دو آدمی ہمارے پاس موجود ہیں لیکن کسی مصلحت کے پیش نظر انہیں یہاں تمہارے سامنے نہیں بٹھایا گیا۔ اب اگر تم اقبالی بیان نہیں دو گی تو بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا تمہارے خلاف شہادت مکمل طور پر اکٹھی ہو گئی ہے“۔

”تو پھر آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟“ —— لُوسی نے سنجیدہ سے لہجے میں پوچھا۔

”اپنے پورے رِنگ کا پردہ اٹھا دو“ —— میجر جنرل نے کہا —— ”میجر عثمان کی حد تک کیس بالکل صاف ہے۔ تم کچھ نہ بتاؤ تو بھی ہم جانتے ہیں“۔

”اگر میں آپ کی بات مان لوں تو مجھے کیا ملے گا؟“ —— لُوسی نے پوچھا۔

”رہائی!“ —— میجر جنرل نے جواب دیا —— ”تمہیں معافی ملے گی اور ہم تمہیں پاکستان سے نکال دیں گے اور ضرورت محسوس ہوئی تو تمہارے ملک کے سفیر کو اطلاع دے دیں گے“۔

”اور اگر میں اپنے رِنگ کے خلاف زبان کھولنے سے انکار کر دوں تو؟“ —— لُوسی نے پوچھا۔

”لُوسی!“ —— میجر جنرل نے کچھ زیادہ ہی سنجیدہ لہجے میں کہا —— ”تم اس طرح بات کر رہی ہو جیسے ہم کسی عام سے مسئلے پر مذاکرات کر رہے ہیں اور کسی نتیجے یا تصفیے تک نہ پہنچے تو کوئی قیامت نہیں آ جائے گی۔ میں تمہیں اب اتنی زیادہ مہلت نہیں دے سکتا۔ ہمارے اتنے نرم رویّے سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کرو“۔

”میں آج کسی نتیجے پر ہی پہنچنا چاہتی ہوں“ —— لُوسی نے کہا —— ”میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ میں تعاون نہ کروں تو میرے ساتھ کیا سلوک ہو گا“۔

”معاف رکھنا سر!“ —— کرنل نے میجر جنرل کہا اور لُوسی سے مخاطب ہُوا —— ”یہ بتاؤ لڑکی‘ اگر تمہارے ملک میں کوئی تم جیسی مسلمان لڑکی گرفتار کر لی جائے تو اس

کے ساتھ کیا سلوک ہو گا؟.... تم ضرور جانتی ہو گی"۔

"ہاں، میں جانتی ہوں" ---- لُوسی نے جواب دیا ---- "کسی مسلمان لڑکی کو ہماری پولیس یا فوج گرفتار کرلے تو سب سے پہلے اس کی اجتماعی آبروریزی ہو گی پھر دیکھیں گے کہ اسے کیوں گرفتار کیا ہے"۔

کرنل نے اپنے میجر جنرل کی طرف دیکھا۔ میجر جنرل کے ہونٹوں پر طنزیہ سا تبسّم آ گیا۔

"لیکن ہمارے ہاں تمہارے ساتھ یا کسی بھی ملزمہ کے ساتھ ایسا ذلیل سلوک نہیں ہو گا نہ کبھی ہُوا ہے" ---- میجر جنرل نے کہا ---- "تم ہمارے ساتھ تعاون کرو یا صاف انکار کر دو تمہارے ساتھ وہی سلوک ہو گا جو مردوں کے ساتھ ہوتا ہے.... ہم مسلمان ہیں۔ ہم اپنی حکومت کے آگے جوابدہ تو ہیں لیکن اصل میں ہم اپنے اللہ کے آگے جوابدہ ہیں۔ میں نے پہلے کہا ہے کہ ہمارے ساتھ تعاون کرو گی تو معافی دلا دیں گے اور پھر اپنے ملک سے باعزت طریقے سے رخصت کر دیں گے۔ ایسا نہیں ہو گا کہ تمہیں دھوکہ دے کر اپنا کام نکلوا لیں گے اور پھر تمہیں اپنی ہوس کاری کے لئے اُڑا لیں گے.... اب میں اِس بحث کو زیادہ طول نہیں دوں گا۔ تمہارے خلاف اور میجر عثمان کے خلاف ہمارے پاس تم دونوں کو انتہائی سزا دلوانے کے لئے شہادت کافی ہے۔ تمہارے رنگ کے اور آدمی بھی ہمارے پاس ہیں اور تمہارے ساتھ کی دو لڑکیاں بھی ہیں۔ ان دونوں میں سے ایک لڑکی اقبالی بیان دینے پر آمادہ نظر آتی ہے لیکن ہم صرف تمہیں اس لئے کہہ رہے ہیں کہ تم زیادہ ذہین اور عقل و دانش والی ہو۔ ابھی اور گرفتاریاں ہو رہی ہیں"۔

"معاف رکھنا سر!" ---- کرنل نے جنرل سے کہا پھر لُوسی سے مخاطب ہُوا ---- "تصوّر میں لاؤ کہ اس عمر میں ہی جیل میں چلی جاؤ گی تو تمہارا کیسا برا حال ہو گا۔ تم دو چار سال کے لئے نہیں بلکہ تمام عمر کے لئے جیل جاؤ گی۔ جاسوسی کے علاوہ تمہارے کھاتے میں قتل بھی لکھا ہُوا ہے"۔

لُوسی کے چہرے پر پہلے ہی کچھ ایسا تاثر آگیا تھا جیسے وہ تعاون پر اپنے آپ کو آمادہ کر رہی ہو لیکن کرنل نے جب اس کے مستقبل کی بھیانک تصویر پیش کی تو اس کے چہرے پر نمایاں طور پر تبدیلی آگئی اور یہ تاثر گہرا ہی ہوتا چلا گیا۔ کرنل نے یہ بھی کہا کہ جیل میں جیل کے افسر اور وارڈن وغیرہ اسے اپنی داشتہ بنا لیں گے اور اس کی کہیں بھی شنوائی

نہیں ہو گی۔ ایسے آدمی اسے ہوس کاری کا نشانہ بنائے رکھیں گے جن کے منہ سے چرس اور گانجے کی بدبو اور غلیظ جسموں سے ناقابلِ برداشت بدبو آئے گی۔ وہ اپنے اس زندگی کے شب و روز یاد کرے جو فائیو سٹار ہوٹلوں میں، کاروں اور ہوائی جہازوں میں اور محلات جیسی کوٹھیوں میں گزرے ہیں مگر جیل میں ایک بھنگن کی کچھ آبرو ہو گی اس کی کوئی عزت اور کوئی آبرو نہیں ہو گی۔

آئی ایس آئی کے میجر جنرل نے لُوسی سے کہا تھا کہ میجر عثمان اور اس کے بیوی بچوں کو اغوا کرنے والے بھی پکڑے گئے ہیں تو لُوسی نے غالباً" اس جھوٹ کو بھی سچ مان لیا تھا۔ لُوسی غیر معمولی طور پر ذہین اور عیّار لڑکی تھی۔ یقیناً" جانتی تھی کہ وہ اقبالِ جرم نہیں کرے گی تو اس کے ساتھ کی کوئی اور لڑکی کرلے گی یا رنگ کا کوئی اور ملزم آئی ایس آئی کے آگے ہتھیار ڈال دے گا.... کرنل کی بات سن کر لوسی کا سر جھک گیا۔ کمرے میں سکوت طاری ہو گیا۔ سب کی نظریں لُوسی پر مرکوز تھیں۔



لوسی نے سر اٹھایا تو اس کے گورے گلابی گالوں پر آنسوؤں کے قطرے بہے جا رہے تھے۔ اس نے گلاب کے پھولوں جیسے ہاتھوں سے یہ قطرے پونچھ ڈالے اور میجر جنرل کی طرف دیکھا۔ اب اس چہرے پر ایسا تاثر تھا جیسے وہ رحم کی طلب گار ہو۔ وہ آخر انسان تھی اور لڑکی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کوئی غیبی طاقت یا جادو نہیں تھا جو ہر مرد کو اس کے آگے جھکا دیتا اور وہ ہر صورت حال میں من مانی ہی کرتی۔ وہ انتہا درجے کی عیّار اور مکّار ہی کیوں نہ تھی، اس نے اس مجرمانہ کیریئر میں پتھروں کو موم کر لیا تھا لیکن نہیں جانتی تھی کہ ایک مقام ایسا آ جاتا ہے جہاں انسانی فطرت کی کمزوریاں ریت کے گھروندے کی طرح انسان کو بٹھا دیتی ہیں اور وہ اپنے آپ کو بے بسی اور کسمپرسی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا پاتا ہے.... لُوسی اُس مقام پر پہنچ گئی تھی۔

"میں اس عورت جیسی بیوی بننے کے خواب دیکھا کرتی تھی" ---- لُوسی نے اچانک واجدہ کی طرف اشارہ کر کے کہا ---- "میں نے یہ خواب تیرہ چودہ سال کی عمر میں ہی دیکھنے شروع کر دیئے تھے۔ مجھ میں یہ احساس کہ میں بہت ہی خوبصورت ہوں، اسی عمر میں پیدا ہو گیا تھا۔ لڑکوں نے مجھ پر ڈورے ڈالنے شروع کر دیئے تھے لیکن میں کہتی تھی کہ اپنے جیسے کسی حسین آدمی کے ساتھ شادی کروں گی۔ مجھ میں روپے پیسے کا اور عیش

و عشرت کا ذرا جتنا بھی لالچ نہ تھا لیکن اپنے باپ کے متعلق جانتے ہوئے کہ یہ پیسے کے پیچھے مرتا ہے' میں اندازہ نہ کر سکی کہ اسے پیسے سے اتنا پیار ہے کہ مجھے بھی بیچ کر پیسہ کما لے گا....

"میری عمر ابھی سولہ سال نہیں ہوئی تھی کہ باپ نے مجھے ایک ایسے شخص کے ساتھ بیاہ دیا جس کی عمر چالیس سال سے تین چار سال زیادہ تھی۔ میرے خواب چکنا چُور ہو گئے۔ اس کی بیوی مر گئی تھی' دو بیٹیاں تھیں۔ دونوں کو اس نے کمسنی میں ہی بیاہ دیا تھا۔ بیٹا ایک بھی نہیں تھا۔ بڑا ہی مالدار تاجر تھا۔ دولت کی تو کمی نہیں تھی لیکن یہ شخص بھینسے کی طرح بھدا اور بدصورت تھا اور اس کا جسم بھی بھینسے کی طرح ہی سُوجا اور پھولا ہُوا تھا۔ میں جس قدر نفاست چاہتی تھی وہ اتنا ہی بدبودار اور بداخلاق تھا۔ مجھے تو وہ کھلونا سمجھتا تھا جو کسی وقت ٹوٹ بھی گیا تو دوسرا آ جائے گا۔ مختصر بات یہ ہے کہ اس نے بڑی کامیابی سے اور بہت ہی جلدی میرے دل میں اپنی نفرت پیدا کر دی....

"میں تو پاکیزہ اور خوش باش ازدواجی زندگی گزارنا چاہتی تھی اور کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ مجھے کوئی دولت مند خاوند ملے لیکن یہ بھی کبھی تصوّر میں نہیں آیا تھا کہ مجھے اس قابلِ نفرت آدمی کے حوالے کر دیا جائے گا۔ میں نے تین چار مہینے برداشت سے کام لیا لیکن دل ہی دل میں سوچتی رہی کہ اس سے کس طرح نجات حاصل کی جا سکتی ہے۔ کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا....

"اس شخص کے پاس میرے لئے نہ جسمانی تسکین تھی نہ جذباتی آسودگی۔ میرے اندر احتجاج اور انتقام بڑھتا چلا گیا۔ اس کا پہلا مظاہرہ یہ ہُوا کہ میں نے کسی اپنی پسند کے دوست کو دیکھنا شروع کر دیا۔ میرا خاوند صبح گھر سے نکلتا اور شام کو واپس آتا تھا۔ میں دن بھر گھر میں اکیلی رہتی تھی۔ آخر ایک دوست مل گیا اور میں نے اپنا آپ اس کے حوالے کر دیا۔ خاوند کی طرف سے مجھ پر ایسی کوئی پابندی نہیں تھی کہ میں گھر میں ہی قید رہا کروں۔ میں نے اس آزادی سے پُورا پُورا فائدہ اٹھایا۔ اس خطرے کے پیشِ نظر کہ خاوند مجھ پر شک نہ کرے' میں نے اس کے ساتھ ایسا سلوک شروع کر دیا جیسے میں اس پر مرمٹی ہوں اور سارا دن اس کی جدائی برداشت نہیں کر سکتی۔ اس طرح اسے خوب اُلّو بنایا اور وہ بہت خوش رہنے لگا....

"میں جوں جوں اپنے دوست میں الجھتی جا رہی تھی' میرے دل میں خاوند کی نفرت

بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ مجھ میں عیّاری اور فریب کاری اسی عمر میں پیدا ہو گئی تھی اور اس سے مجھے دلی سکون حاصل ہوتا تھا....

"میرا یہ دوست کوئی شریف آدمی نہیں تھا۔ پکّا فریب کار اور خوش مزاج تھا۔ اس نے فریب کاری اور مکاری میں مجھے بھی ماہر بنا دیا تھا۔ میں نے ایک روز اسے کہا کہ اس طرح چھپ چھپ کر ملنے اور پاپ کرتے چلے جانے سے عارضی سا سکون ملتا ہے' اس کے بعد پھر وہی روحانی بے چینی شروع ہو جاتی ہے' کیوں نہ ہم باقاعدہ میاں بیوی بن جائیں لیکن اس خاوند سے کس طرح رہائی حاصل کی جائے۔ ہم دونوں طریقے سوچنے لگے اور ایک طریقے پر ہم متفق ہو گئے۔ وہ یہ تھا کہ میں اپنے خاوند کو زہر دے دوں....

"میرا یہ دوست ایک دن ایسا زہر لے آیا جو نہایت آہستہ آہستہ اثر کرتا تھا اور اس کی تھوڑی تھوڑی مقدار ہر روز دینی تھی۔ میں نے خاوند کو دودھ میں ہر رات یہ زہر دینا شروع کر دیا۔ چھٹے ساتویں روز وہ جسمانی کمزوری اور سردرد محسوس کرنے لگا۔ اس نے ایک ڈاکٹر سے معائنہ کروایا اور ڈاکٹر نے دوائیاں لکھ دیں۔ میں اسے اپنی "دوائی" دودھ میں دیتی رہی اور سولہ سترہ دنوں بعد خاوند ایسا بیمار پڑا کہ بستر سے اٹھنے کے قابل نہ رہا....

"ایک سے بڑھ کر ایک ماہر سپیشلسٹ ڈاکٹر اسے گھر دیکھنے آیا۔ ہر ایک نے اپنا اپنا نسخہ آزمایا اور ایک روز خاوند آخری سانس لے کر اس دنیا سے اٹھ گیا اور مجھے رہائی مل گئی....

"مجھے رہائی مل گئی لیکن میں نے یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ ہندو لڑکی بیوہ ہو جائے تو اسے منحوس اور قابلِ نفرت سمجھا جاتا ہے اور کوئی شخص اس کے ساتھ شادی نہیں کرتا۔ میں نے خاوند کے گھر سے سارے زیورات اور جتنی رقم ہاتھ لگی سمیٹی اور اپنے ماں باپ کے گھر آ بیٹھی۔ مجھے بہت ہی سادہ بلکہ غریبانہ سے کپڑے پہنا دیئے گئے' میرا زیور اتروا لیا گیا اور چوڑیاں توڑ دی گئیں۔ گھر والوں نے مجھے دھتکار کر الگ بٹھا دیا۔ آپ جانتے ہیں کہ ہندوؤں کے ہاں عورت کی کوئی حیثیت اور کوئی قدر و منزلت نہیں ہوتی۔ باپ نے مجھے کمسنی میں ایک بوڑھے کے حوالے کر دیا اور پیسے کما لئے تھے۔ ہندوؤں میں ایسا اکثر ہوتا ہے۔ مجھ جیسی بیٹیوں کو دشمن کے حوالے کر کے دشمن کو نقصان پہنچایا جاتا ہے۔ اب میں پکڑی گئی ہوں تو مجھے چھڑانے کوئی ہندو نہیں آئے گا....

"ان باتوں کو الگ رکھیں کہ مجھ پر کیا بیتی، میں آپ کو کچھ اور سنانا چاہتی ہوں .... خاوند کے گھر مجھے جو آزادی حاصل تھی وہ اپنے ماں باپ کے گھر آکر ختم ہو گئی۔ اس پر غور کریں کہ میری عمر بمشکل سترہ سال ہوئی تھی۔ عمر تو میری سترہ سال ہی ہوئی تھی لیکن میں نے اپنے آپ میں ستر سال کی عمر کی عورتوں جیسی ذہنی پختگی اور چالاکی پیدا کرلی تھی ....

"میں نے اپنے ماں باپ کی قید سے کچھ دیر کی رہائی کا انتظام کرلیا۔ یہ میری فریب کاری کا نتیجہ تھا۔ میں نے اس فنکاری میں بہت مہارت حاصل کرلی تھی۔ میرے دل میں اب کسی کا کوئی خوف اور خطرہ نہیں رہا تھا۔ اپنے دوست سے ملی تو اس نے شادی سے تو انکار کر دیا لیکن پہلے کی طرح ناجائز دوستی جاری رکھنے پر زور دیا۔ میں نے اسے دھتکار دیا ....

"ایک دو مہینوں بعد ایک عیسائی سے دوستی لگالی۔ بڑا اچھا خوبرو جوان تھا اور عقل بھی رکھتا تھا۔ اس نے کہا کہ میں اس کا مذہب قبول کرلوں تو میرے ساتھ شادی کرلے گا۔ میں نے اسے کہا کہ میرا کوئی مذہب نہیں اور میں اس کا مذہب قبول کرلوں گی۔ میں اسے ملنے ملانے لگی اور چھ سات مہینے دوستی چلی۔ ایک بار وہ مجھے شملہ لے گیا۔ میں واپس آئی تو باپ نے مجھے مارا پیٹا کہ میں کہاں چلی گئی تھی۔ میں نے کہا کہ میں کسی روز ہمیشہ کے لئے چلی جاؤں گی ....

"ایک روز میرے عیسائی دوست نے کہا کہ وہ مجھے ہمیشہ کے لئے دِلی لے جانا چاہتا ہے۔ میں تو پہلے ہی تیار بیٹھی تھی۔ گھر سے زیورات اور خاصی رقم اُڑالی اور ایک رات دوست کے ساتھ دِلی چلی گئی۔ وہاں ہم ایک بہت بڑے ہوٹل میں ٹھہرے اور خوب عیش و عشرت کی ....

"ایک روز میرے دوست نے میرا تعارف دو آدمیوں سے کروایا۔ اگلے روز میرا دوست لاپتہ ہو گیا اور یہ دونوں آدمی آگئے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ میرا دوست اب کبھی واپس نہیں آئے گا اور میں ان کے ساتھ چلی چلوں۔ میرے زیورات اور نقدی دوست اُڑا لے گیا تھا اور میرے لئے اب کوئی پناہ نہیں تھی لیکن ان دونوں آدمیوں نے ایسے پیارے طریقے سے مجھے حقیقت حال سے آگاہ کیا کہ میں ان کے ساتھ چل پڑی ....

"انہوں نے بتایا کہ وہ انٹیلی جنس کے آدمی ہیں اور انہیں میری ضرورت ہے۔

انہوں نے مجھے سبز باغ دکھائے اور میں ان کی ہو کے رہ گئی۔ مجھے ان کے افسروں سے ملوایا گیا اور ان افسروں نے مجھے سمجھایا کہ انہیں میری ضرورت ہے اور ضرورت کیا ہے۔ یہاں مجھے کوئی تفصیل بیان کرنے کی ضرورت نہیں، آپ سمجھتے ہیں کہ میں کس طرح اپنے ملک کی انٹیلی جنس میں داخل ہوئی تھی اور میرے ساتھ کیا کیا باتیں ہوئی ہوں گی۔ میری باقاعدہ ٹریننگ شروع کردی گئی۔ عیّاری اور فریب کاری تو پہلے ہی میری فطرت میں داخل ہو چکی تھی اور جو کسر رہ گئی تھی وہ اس محکمے نے پوری کردی....

"میں آپ کو صحیح اور بالکل سچی بات کہہ رہی ہوں کہ میرے دل میں اپنے ملک کی کوئی محبت نہیں نہ پاکستان کو میں اپنا دشمن ملک سمجھتی ہوں۔ میں ان شیطانی کارروائیوں میں خوش رہتی ہوں اور کسی کو بیوقوف بنا کر، اس کے جذبات کے ساتھ کھیل کر اور اسے اپنے مفاد کے لئے استعمال کر کے مجھے روحانی سکون ملتا ہے لیکن اب آپ کی باتیں سنی ہیں تو میں محسوس کرنے لگی ہوں کہ مجھ میں انسانیت مری نہیں اور انسان کے جو صحیح جذبات ہوتے ہیں وہ بھی مجھ میں زندہ ہیں اور میرا بھی حق ہے کہ باعزت زندگی بسر کروں .... میں پورا بیان دوں گی اور جو کچھ بھی جانتی ہوں بتاؤں گی، آپ کی راہنمائی کروں گی لیکن اس درخواست کے ساتھ کہ مجھے واپس انڈیا نہ بھیجا جائے۔ یہاں کوئی ایسا آدمی مل جائے جو مجھے مسلمان بنا کر اپنی بیوی بنا لے اور میں ساری عمر اس کے قدموں میں گزار دوں گی"۔

"یہ بعد کی بات ہے لُوسی!" ــــ میجر جنرل نے کہا ــــ "تمہاری اس درخواست کو نظرانداز نہیں کیا جائے گا، پہلے ہماری ضرورت پوری کردو تاکہ تم اس چکر سے نکل سکو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں ذلیل و خوار ہونے کے لئے اکیلا نہیں چھوڑوں گا"۔

اگلے روز لُوسی اقبالی بیان دے رہی تھی۔ بیان لینے والوں میں ایک کرنل تھا اور ایک میجر۔ طلسماتی حسن والی یہ فریب کار حسینہ ہلکے پھلکے اور پُر اعتماد لہجے میں اپنی گزری ہوئی مجرمانہ زندگی سے پردے اٹھا رہی تھی۔

واجدہ اور اس کے بھائیوں کو، میجر سمیع اور کیپٹن آصف کو آئی ایس آئی کے ڈائریکٹر جنرل نے واپس لاہور جانے کی اجازت دے دی تھی اور کہا تھا کہ وہ لاہور میں موجود رہیں، کسی بھی وقت انہیں راولپنڈی طلب کیا جاسکتا ہے۔

لُوسی نے جس طرح میجر عثمان کو اپنے طلسم میں گرفتار کر کے رکھا ہُوا تھا اور جس طرح اس کی برین واشنگ کی گئی تھی، وہ لُوسی نے تفصیل سے سنایا اور پھر عثمان کی خفیہ ملک دشمن سرگرمیوں کی تفصیلات بیان کیں۔ عثمان نے انڈیا کی انٹیلی جنس کو جو فوجی راز دیئے تھے، وہ سنائے اور اس کا جو معاوضہ عثمان کو ملتا رہا وہ بتایا۔ مختصر یہ کہ لُوسی نے میجر عثمان کو بے نقاب کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔

کراچی جاتے ہوئے میجر عثمان اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ جو اغوا ہوا تھا، اس کے ساتھ لُوسی کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ لُوسی نے اپنے بیان میں کہا کہ یہ سندھ کے ڈاکوؤں کا کام تھا اور یہ ڈاکو انڈیا کے ایجنٹوں کی ہدایتکاری کے مطابق اغوا اور قتل کی وارداتیں کرتے تھے۔ لُوسی اتفاقیہ اُدھر چلی گئی تھی۔ وہ سیر کے لئے گئی تھی۔ اس نے کہا کہ سندھ میں انڈین انٹیلی جنس کی بادشاہی ہے۔ یہ اچھا اتفاق تھا کہ لُوسی کو پتہ چل گیا کہ ایک پنجابی فیملی کو اغوا کیا گیا ہے۔ لُوسی نے دیکھا تو وہ میجر عثمان تھا۔ لُوسی اور اس کے ساتھی کے حکم سے انہیں رہا کر دیا گیا۔

لُوسی نے اپنے اغوا کی واردات بھی سنائی جو واجدہ کے دونوں بھائیوں نے کی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کے اغوا میں میجر سمیع اور کیپٹن آصف نے کیا رول ادا کیا تھا۔

پھر لُوسی نے کہا کہ وہ کس طرح ان کی قید سے رہا ہوئی تھی۔ اس نے واضح الفاظ میں بتایا کہ رات کو جو نوکر اس کے لئے کھانا لاتا اور باہر پہرے پر رہتا تھا، اسے اپنے حُسن اور نسوانیت کے شیشے میں اتارا اور اسے ساتھ لے کر بھاگ نکلی۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ رِنگ لیڈر مہندر آہوجا نے نوکر کو قتل کرا دیا اور پھر اس کی لاش نہر میں بہا دی تھی.... اس بیان سے ایک قتل مہندر آہوجا کے کھاتے میں لکھا گیا۔

ایک میجر عثمان کو ہی نہیں، لُوسی نے دو تین اور پاکستانی شخصیتوں کو بھی بے نقاب کیا۔

”مجھ جیسی لڑکیوں کو ایک خاص بات ذہن نشین کرائی جاتی ہے“ —— لُوسی نے اپنا بیان دیتے ہوئے کہا —— ”وہ یہ کہ کوئی مرد کتنا ہی پتھر کیوں نہ ہو، حسین عورت اور دولت اس کی ایسی کمزوری ہوتی ہے جو اس انتہائی مضبوط پتھر کو ریزہ ریزہ کر دیتی ہے۔ انڈین انٹیلی جنس کے پاکستانی ایجنٹ اس وجہ سے ایجنٹ نہیں بنے تھے یا نہیں بنتے کہ ان کے دلوں میں انڈیا کی محبت اور پاکستان کی دشمنی ہے بلکہ یہ محض مفاد پرستی ہے اور یہ عورت، شراب اور دولت کا نشہ ہے جو دماغ کو چڑھ جائے تو دوست اور دشمن کی پہچان ختم ہو جاتی ہے۔ ایک عثمان اور لُوسی کو پھانسی دے دیں۔ دو چار دنوں میں ہی ایک اور عثمان اور ایک اور لُوسی ان کی جگہ آن پہنچیں گے۔ پاکستان کی زمین دشمن کے جاسوسوں کے لئے بڑی ہی زرخیز ہے۔ صرف انڈیا ہی نہیں، امریکہ، انگلینڈ اور روس نے جتنے ایجنٹ اپنی اپنی انٹیلی جنس کے لئے پاکستان میں تیار کر رکھے ہیں اتنے شاید ہی کسی اور ملک سے ملتے ہوں۔ یہاں کی معاشرت، سیاست، صحافت، ادبی دنیا اور ہر شعبے سے ایجنٹ بڑی آسانی سے مل جاتے ہیں۔ سیاسی اور مذہبی لیڈروں میں بھی ذاتی مفادات کی خاطر ایجنٹ موجود ہیں“۔

”دیکھو لُوسی!“ —— کرنل نے کہا —— ”تم پہلے اپنا بیان مکمل کر لو اور اس کے مطابق نشاندہیاں اور پھر تمہاری اس قسم کی باتیں اور تمہارے مشاہدات بھی سنیں گے“۔

"میں کوئی اور رائے نہیں دوں گی" ـــ لُوسی نے کہا ـــ "یہ کہنے کی اجازت دیں کہ جس ملک میں امریکہ اور انگلینڈ کے اشاروں سے حکومتیں بنتی اور ٹوٹتی ہوں اس ملک میں یہ دیکھ کر حیران نہیں ہونا چاہئے کہ یہاں کے لوگ اپنے ہی ملک میں تخریب کاری کر رہے ہیں۔ یہ سوچنا آپ کا کام ہے کہ آپ کے ملک کی سیاست اور معاشرت میں جو آلودگی ہے وہ کس طرح ختم کی جائے"۔

لُوسی نے اپنے رِنگ کی نشاندہیاں کر دیں لیکن انڈیا کی انٹیلی جنس، خصوصاً "را" اتنی کچی نہیں تھیں کہ ان کے ہر ایجنٹ کو ہر ایجنٹ سے واقفیت ہوتی۔ ہر ایجنٹ کو صرف ان محدود سے افراد کا علم تھا جن کے ساتھ وہ کام کرتا تھا۔ ایک ہی رِنگ میں ہوتے ہوئے اکثر ممبروں کو دوسرے ممبروں کے متعلق ذرا سی بھی واقفیت نہیں ہوتی تھی۔

اس جیسا ہی دوسرا اہم گواہ صغیر تھا۔ لوسی کے بیان کے بعد کچھ دیر وقفہ کیا گیا اور صغیر کا بیان لیا جانے لگا۔ اس نے بھی کوئی بات پردے میں نہ رہنے دی۔ اپنی تمام وارداتیں اور جو بھی اس کی سرگرمیاں رہی تھیں، کرنل اور میجر کو تفصیل سے قلمبند کروا دیں۔

○

لُوسی اور صغیر کو ایک مجسٹریٹ کے پاس لے گئے۔ دونوں نے قانون کے مطابق اپنا اپنا بیان قلمبند کروا دیا۔ لُوسی کو باقاعدہ وعدہ معاف گواہ قرار دے دیا گیا۔ صغیر کی حیثیت ایک گواہ کی سی تھی۔ تین پاکستانی ایجنٹ بھی پکڑے گئے تھے اور تینوں نے اقبالی بیان دے دیئے تھے۔ ان میں ایک میجر عثمان کے ساتھ کام کرتا رہا تھا۔

آئی ایس آئی کے بالائی افسروں نے جب یہ بیانات پڑھے اور وہ شہادت دیکھی جو اُس وقت تک سامنے آ چکی تھی تو یہ بات سامنے آئی کہ میجر عثمان کے خلاف کیس ہر لحاظ سے مکمل ہے اور یہ کورٹ میں پیش کیا جا سکتا ہے لیکن سوچنے والی بات یہ تھی کہ میجر عثمان کو دوسرے ملزموں کے ساتھ سول کورٹ میں پیش کیا جائے یا اس کا الگ کورٹ مارشل کیا جائے۔

آئی ایس آئی کے بالائی افسروں نے اس مسئلے پر غور کیا۔ دوسرے ملزموں کی تفتیش ابھی ادھوری تھی۔ ان سے اقبالِ جرم کروانا تھا اور پورے رِنگ کی نشاندہیاں کروانی تھیں اور ان سے شہادت لینی اور اس کے مطابق مزید گرفتاریاں کرنی تھیں۔ ان

میں سوائے لُوسی کے کسی اور نے ابھی اپنا جرم تسلیم کیا ہی نہیں تھا۔ ان کے خلاف کورٹ کے لئے مقدمہ تیار کرنے کا کام محنت طلب بھی تھا اور اس کے لئے اچھا خاصا وقت بھی درکار تھا۔ آئی ایس آئی کے افسروں نے آخر یہ فیصلہ کیا کہ میجر عثمان کا کورٹ مارشل کیا جائے اور باقی سب کے کیس تیار ہونے کے بعد سول کورٹ میں پیش کئے جائیں۔

جی ایچ کیو کو لکھا گیا اور کورٹ مارشل کی تجویز پیش کی گئی۔ جی ایچ کیو نے کورٹ مارشل کی منظوری دے دی۔ یہ منظوری آتے ہی شہادت اور گواہ تیار کرنے کا کام شروع ہو گیا۔ لُوسی نے شہادت کی تکمیل میں نہایت ہی کارآمد رول ادا کیا تھا اور وہ اپنا تعاون جاری رکھے ہوئے تھی۔ صغیر کا بیان بھی میجر عثمان کے کیس کو مزید تقویت دیتا تھا۔

لوسی چونکہ ملزمہ تھی اس لئے اسے سیل (کوٹھڑی) میں رکھا گیا تھا لیکن اس کے اقبالِ جرم کے بعد اور اس کا پُرخلوص تعاون دیکھتے ہوئے اسے سیل میں بند رکھنا مناسب معلوم نہیں ہوتا تھا۔ قانون کے مطابق اسے جیل کی حوالات میں بھیج دینا چاہئے تھا لیکن مصلحت اس میں تھی کہ اسے اپنے پاس رکھا جائے۔ یہ کسی سول کورٹ کا عام کیس نہیں تھا' یہ ملک کے خلاف بڑی ہی خطرناک تخریبی اور تباہ کن سازش کا جرم تھا اور اس کے ملزموں کو انتہائی سزا دلوانا انتہائی ضروری تھا۔ اس کیس کو وکیلوں اور عدالتوں کے گھسے پٹے طور طریقوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔

لُوسی کو سیل سے نکال کر ایک رہائشی کمرے میں رکھا گیا جہاں اسے ہر سہولت میسّر تھی۔ صغیر پہلے ہی آزاد تھا لیکن اسے سیل کی بجائے ایسے ہی ایک رہائشی کمرے میں رکھا گیا تھا۔ اب صغیر کو ایک اور کمرے میں منتقل کر دیا گیا جو لُوسی کے کمرے کے بالکل ساتھ تھا۔ ان دونوں کمروں کے باہر ملٹری پولیس کا ایک سنتری کھڑا رہتا تھا۔ لُوسی اور صغیر کو برآمدے میں نکل کر گھومنے پھرنے کی اور اکٹھے بیٹھنے کی اجازت تھی۔

انہیں اپنی نگرانی میں رکھنے کی دو وجوہات تھیں۔ ایک یہ کہ انہیں آزاد چھوڑا جاتا تو ان کے گمراہ ہونے کا خدشہ تھا۔ دونوں سالہا سال سے انٹیلی جنس کے لئے کام کر رہے تھے اور شاہانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ یہ عیش و عشرت انہیں واپس اسی مجرمانہ ڈگر پر لے جا سکتی تھی۔ دوسری وجہ ان کا تحفظ تھا۔ آئی ایس آئی اس معاملے میں زندہ و بیدار تھی

کہ اس رنگ میں یہی چند ایک افراد نہیں جو پکڑے گئے ہیں۔ ان کے نہ جانے کتنے ساتھی باہر سرگرم ہوں گے اور انہیں یہ پتہ چل گیا کہ لُوسی اور ان کے ایک ایجنٹ صغیر نے پردے اٹھا دیئے ہیں تو وہ ان دونوں کو کسی نہ کسی طریقے سے قتل یا اغوا کر سکتے ہیں۔ ان کے گمراہ ہو جانے کا اتنا خدشہ نہیں تھا جتنا ان کی جانوں کو خطرہ تھا۔

صغیر نے تو آئی ایس آئی پر اپنا مکمل اعتماد جما دیا تھا۔ آئی ایس آئی میں ایسے منجھے ہوئے تجربہ کار افسر موجود تھے جو چہرے کا تاثر دیکھ کر بتا سکتے تھے کہ اس شخص کا دل صاف ہے یا یہ ابھی تک فریب کاری کی سوچ رہا ہے۔ صغیر کو انہوں نے پاک اور صاف قرار دے دیا تھا۔

صغیر کو بتا دیا گیا تھا کہ لُوسی کی بیک گراؤنڈ کیا ہے اور اس نے اقبالی بیان دے دیا ہے۔ صغیر کو یہ کام سونپا گیا کہ وہ لُوسی کے ساتھ ایسا روّیہ اختیار کئے رکھے کہ وہ یہاں غیریت اور اجنبیت محسوس نہ کرے اور وہ ایسا سوچ بھی نہ سکے کہ عثمان کے کورٹ مارشل میں جا کر اپنے بیان سے منحرف ہو جائے۔ صغیر اس بات کو نہایت اچھی طرح سمجھتا تھا کہ ایسا روّیہ کس طرح اختیار کیا جاتا ہے اور کس طرح دوسروں کے ذہن پر قبضہ کیا جا سکتا ہے۔

صغیر کی تو جیسے روح بیدار ہو گئی تھی۔ اس پر ایسی کیفیت طاری ہو جاتی تھی کہ کبھی وقت بے وقت قبلہ رخ کھڑا ہو جاتا اور دو چار نفل پڑھ کر اللہ کے حضور ہاتھ پھیلاتا گڑگڑاتا اور گناہوں کی بخشش مانگتا تھا۔ ایسی کیفیت کسی خوش قسمت کو ہی حاصل ہوتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ صغیر کے دل اور ذہن میں پاکستان کی بے پناہ محبت پیدا ہو گئی تھی لیکن جب سے وہ پاکستان میں داخل ہُوا تھا' ایسا کئی بار ہُوا کہ رات اس کا وہ بھائی خواب میں آیا جو صغیر کے کئے ہوئے دھماکے میں مارا گیا تھا۔ اگر صغیر بم رکھ کر کہیں قریب ہی کھڑا رہتا تو اسے اپنا بھائی نظر آ جاتا اور وہ دوڑ کر بھائی کو کسی بہانے وہاں سے دور لے جاتا مگر صغیر نے یہ بم بہت دور جا کر ریموٹ کنٹرول سے چلایا تھا۔

بھائی اسے خواب میں اس طرح نظر آتا تھا کہ چپ چاپ کھڑا صغیر کو دیکھتا رہتا۔ صغیر کے قریب سے اس طرح گزر جاتا جیسے جانتا پہچانتا ہی نہ ہو۔ پھر یوں ہونے لگا کہ صغیر نے خواب میں بھائی کو دیکھا اور اس کی طرف لپکا کہ اسے گلے لگا لے اور اس سے

رو رو کر معافی مانگے لیکن جونہی وہ لپکا اس کی آنکھ کھل گئی اور پھر اس کی جذباتی حالت ایسی ہوئی کہ وہ کچھ دیر روتا ہی رہا۔ اب صغیر اپنے اس بھائی کی روح کو راضی کرنے کے جتن کر رہا تھا۔ اس کے پاس گناہوں کا کفّارہ ادا کرنے کے لئے یہی ایک ذریعہ تھا کہ پاکستان کے ان دشمنوں کو گرفتار کروا دے۔

اب اسے یہ بتایا گیا کہ لُوسی نے اقبالی بیان دے دیا ہے اور وہ لُوسی کو اپنی نگرانی میں رکھے اور اسے بھٹکنے نہ دے تو صغیر کو بہت ہی خوشی ہوئی اور اس نے اللہ کا شکر ادا کیا جس کی ذاتِ باری نے اُس کی کامیابی کا ایک بڑا ہی پر اثر ذریعہ پیدا کر دیا تھا۔

○

لُوسی پہلے دن رہائشی کمرے میں آئی تو اس نے دیکھا کہ کمرے میں جہاں ضرورت کی ہر چیز موجود ہے وہاں اس کے لئے کپڑوں کا ایک نیا جوڑا بھی رکھا ہُوا ہے۔ ایک بیٹ مین (اردلی) بھی ساتھ آیا تھا۔ اس نے لُوسی کو بتایا کہ وہ یہاں سے چوتھے کمرے میں موجود رہے گا اور جب اسے ضرورت پڑے وہ سنتری کو کہہ کر اسے بلا لے۔ لُوسی آئی ایس آئی کے اس انتظام سے اور اخلاق سے بہت متاثر ہوئی۔

کچھ دیر بعد وہ ویسے ہی برآمدے میں نکلی تو ساتھ والے کمرے سے صغیر باہر آیا۔ صغیر ایک روز پہلے اس کمرے میں شفٹ ہو گیا تھا۔ لُوسی نے صغیر کو دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ صغیر اس کے قریب آ گیا۔

”میں نے تمہیں باہر مہندر آہوجا کی کوٹھی میں ایک دو مرتبہ دیکھا تھا“ —— لُوسی نے صغیر سے کہا —” اور اُس روز تمہیں بہت ہی بری حالت میں ہتھکڑیوں میں بندھا ہُوا دیکھا ہے۔ تمہاری حالت بتا رہی تھی کہ تمہیں بہت ہی ٹارچر کیا گیا ہے .... اب معلوم ہوتا ہے کہ تم نے اقبالی بیان دے دیا ہے۔ تم نارمل حالت میں دکھائی دے رہے ہو“۔

صغیر کے ہونٹوں پر تبسّم سا آ گیا۔ اس نے لُوسی کو کمرے میں چلنے کا اشارہ کیا۔ دونوں لُوسی کے کمرے میں جا کر بیٹھ گئے۔ پہلے تو لُوسی نے صغیر کے چہرے کو بڑی غور اور دلچسپی سے دیکھا اور پھر اس کی نگاہیں صغیر کے سراپا پر پھر گئیں اور اس کے چہرے پر جا رکیں۔

صغیر اور لُوسی تقریباً ہم عمر تھے اور یہ عالم شباب کی عمر تھی۔ لُوسی تو حسین تھی ہی لیکن صغیر بھی کچھ کم نہ تھا۔ خوبرو تھا اور جسم کی ساخت کے لحاظ سے تو اور زیادہ اچھا لگتا

تھا۔ قد کھلتا ہُوا اور جسم نہ فربہ نہ دبلا اور وہ آج کل کے نوجوانوں کی طرح پستہ قد نہ تھا۔ اس کی زبان میں چاشنی ایسی کہ طلسم طاری کر دیتی تھی۔

"کیا تمہیں وعدہ معاف گواہ بنا لیا گیا ہے؟" —— لُوسی نے صغیر سے پوچھا۔

"نہیں لُوسی!" —— صغیر نے بڑے پیارے سے انداز میں جواب دیا —— "وعدہ معاف گواہ صرف ایک ہوتا ہے اور وہ تم ہو۔ میں خود یہاں وعدہ معاف گواہ بن کر آیا تھا اور میری یہ حیثیت تسلیم کر لی گئی ہے لیکن وعدہ معاف گواہ تمہیں بنایا گیا ہے۔ میں اب صرف گواہ ہوں اور تم مجھے موقعہ کا گواہ جسے عینی شاہد کہتے ہیں سمجھ لو اور یہ بھی یقین کر لو کہ تم میرے ساتھ ہر بات کر سکتی ہو اور تمہیں کرنی چاہئے۔ یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ میں تمہارے رِنگ کا ممبر ہوں"۔

"تم شاید پاکستانی ہو" —— لُوسی نے کہا ——

"ہاں لُوسی!" —— صغیر نے کہا —— "میں پاکستانی ہوں اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم مسلمان نہیں ہو اور سرحد پار کی رہنے والی ہو"۔

"تمہیں اتنا ٹارچر کیوں کیا تھا؟" —— لُوسی نے پوچھا —— "تم سے تو چلا بھی نہیں جاتا تھا"۔

"وہ سب ناٹک تھا لُوسی!" —— صغیر نے کہا —— "وہ میری ایکٹنگ تھی۔ میجر عثمان کو شناخت کرنا تھا اور دوسرے ملزموں کو بھی دیکھنا تھا۔ مجھے سب سے زیادہ خوشی منی اور شریلش کمار کو دیکھ کر ہوئی۔ یہ میں بعد میں بتاؤں گا کہ انہیں دیکھ کر میں کیوں خوش ہُوا تھا.... تم نے اچھا کیا ہے کہ اپنا آپ آئی ایس آئی کے حوالے کر دیا ہے"۔

کچھ دیر ان دونوں کے درمیان رسمی سی باتیں ہوتی رہیں۔ لُوسی کے بولنے کا انداز اور بولتے چپ ہو جانے اور سوچ میں کھو جانے کا رویّہ صاف بتا رہا تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن جھجک رہی ہے کہ ایسی بات زبان پر لائے یا نہ لائے۔

"لُوسی!" —— صغیر نے کہا —— "ہم دونوں فریب کار ہیں۔ ہماری ٹریننگ ہی ایسی ہوئی ہے اور پھر کئی سالوں سے ہم فریب کاریوں کا ارتکاب کرتے چلے آئے ہیں۔ میں تمہیں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس فریب کاری کو اپنی فطرت میں شامل نہ کرو۔ آؤ ہم دونوں ایک دوسرے کو اعتماد میں لے لیں۔ ہو سکتا ہے میں تمہارے کسی کام آ جاؤں .... تم اس صورتِ حال میں اپنے کسی آدمی کی غلطی اور بے احتیاطی کی وجہ سے آن پھنسی ہو

لیکن میں نے اپنے لئے یہ صورتِ حال خود پیدا کی ہے۔ میری خواہش ہے کہ میں تم پر اپنا آپ ظاہر کر دوں اور تمہیں بتاؤں کہ میں کہاں سے چلا تھا' کہاں تک پہنچا دیا گیا اور پھر میں نے واپسی کا سفر کس کس طرح اختیار کیا۔ یہ کہانی تمہارے لئے بہت دلچسپ ہو گی۔ میرا مطلب یہ ہے کہ آؤ اب حقیقت کی باتیں کریں"۔

"میں خود چاہتی ہوں کہ اب حقیقت ہی کی باتیں کروں" —— لوسی نے کہا —— "لیکن مجھے ایک ایسی حقیقت سے سامنا ہے جو مجھے بہت ہی برے انجام کو پہنچائے گی .... تم پاکستانی ہو۔ یہ کیس ختم ہونے کے بعد تم یہیں رہ جاؤ گے اور اپنے گھر چلے جاؤ گے۔ مجھے تو یہاں کوئی نہیں رہنے دے گا۔ مجھے پہلے ہی بتا دیا گیا ہے کہ کیس کے بعد میں سرحد سے نکال دی جاؤں گی اور اگر ان لوگوں نے مجھ پر رحم کیا تو انڈیا کے سفیر کے حوالے کر دیں گے۔ میں جونہی انڈیا پہنچوں گی مجھے وہاں کی انٹیلی جنس قتل کروا دے گی۔ پاکستان میں تو مجھے کوئی پناہ دینے والا نہیں"۔

صغیر کو معلوم تھا کہ لُوسی کو پاکستان میں نہیں رہنے دیا جائے گا اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ انڈیا جاتے ہی اس کے ساتھ کیا سلوک ہو گا۔ اس کا کوئی علاج صغیر کے پاس نہیں تھا۔ پھر بھی اس نے لُوسی کو جھوٹی سچی تسلّیاں دیں اور کہا کہ ابھی وہ اس مسئلے کو ذہن پر سوار نہ رہنے دے۔

"ہم مسلمان ہیں" —— صغیر نے کہا —— "ہمیں جس مسئلے کا حل نظر نہ آئے وہ ہم اپنے اللہ پر چھوڑ دیا کرتے ہیں۔ شرط یہی ہے کہ نیت نیک ہو۔ دل میں بدنیتی اور خباثت رکھو تو پھر اللہ کوئی مدد نہیں کیا کرتا"۔

"میں مسلمان ہو جانا چاہتی ہوں" —— لُوسی نے کہا —— "کیا کوئی مسلمان مجھے قبول کر لے گا؟ .... میں پناہ ڈھونڈ رہی ہوں"۔

"ہاں لُوسی! —— صغیر نے کہا —— "تم اتنی زیادہ خوبصورت ہو کہ کوئی بھی تمہارے ساتھ شادی کرنے کے لئے تیار ہو جائے گا لیکن سوال یہ ہے کہ تمہیں پاکستان میں رہنے کی اجازت مل جائے گی یا نہیں۔ میں یہ وعدہ کر سکتا ہوں کہ پوری کوشش کروں گا کہ آئی ایس آئی کے ڈائریکٹر جنرل کے ذریعے یہ اجازت تمہیں دلوا دوں۔ ایک کام کرو لُوسی' ابھی اس مسئلے کو ذہن سے اتار دو۔ میری کہانی سنو"۔

صغیر نے اپنی جو روئیداد ڈائریکٹر جنرل کو سنائی تھی وہ لُوسی کو سنا ڈالی۔ پوری تفصیل

سے سنایا کہ اس نے انڈین انٹیلی جنس سے الگ ہو جانے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن مُنی اور سریش کمار نے اس پر نشہ طاری کر کے حقیقت کی دنیا سے نکالا اور پھر خواب و خیال اور گناہوں کی دنیا میں لے گئے۔ پھر جس طرح اسے ڈاکٹر رشید نے انبالہ کے ملٹری ہسپتال سے فرار کروایا تھا وہ تفصیل سے بتایا' خالدہ کا ذکر کیا اور پھر اپنے اس کٹھن' پُرخطر اور سنسنی خیز سفر کا ذکر تو اور ہی زیادہ تفصیل سے کیا جو اس نے انبالہ سے فرار کے بعد پاکستان کی سرحد تک کیا تھا۔ لُوسی گم صُم اس کی یہ داستان سنتی رہی۔ دلجیت کور کا ذکر تو صغیر نے اور ہی زیادہ تفصیل سے کہا اور سنایا بھی اس طرح کہ اسے پُرلطف بنا دیا اور لگتا تھا جیسے وہ خود چسکے لے رہا ہو۔

"تمہاری ہر بات مان لی ہے" ___ لُوسی نے کہا ___ "لیکن یہ نہیں مان سکتی کہ تم نے اس جوان لڑکی کے ساتھ کوئی بری حرکت نہیں کی تھی۔ دور جنگل ہو' تنہائی ہو اور دیکھنے والا کوئی نہ ہو اور لڑکی اپنا آپ پیش کر رہی ہو تو کوئی مرد اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکتا"۔

"میں نے اپنے آپ کو قابو میں رکھا تھا" ___ صغیر نے ہنستے مسکراتے ہوئے کہا۔

"پھر وہ لڑکی بدصورت ہو گی" ___ لُوسی نے کہا ___ "لیکن تم کہتے ہو کہ وہ تو بہت خوبصورت لڑکی تھی۔ پھر تم اپنی مردانگی کھو بیٹھے ہو گے جس کی وجہ صرف یہ ہے کہ تم بہت ہی خوفزدہ تھے"۔

"یہ بات بھی نہیں لُوسی!" ___ صغیر نے کہا ___ "مردانگی نہ کہو حیوانیت کہو۔ میری مردانگی قائم تھی اور یہ میری مردانگی ہی کا کرشمہ تھا کہ میں نے حیوانیت پر قابو پا لیا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو ایک بڑے ہی سخت امتحان میں ڈال دیا تھا۔ تم یہ سمجھنے کی کوشش کرو کہ میں اپنے مقصد میں کس قدر سچّا اور ثابت قدم تھا۔ مجھ پر ذرا سا بھی خوف طاری نہیں تھا!

"وہ سکھنی تھی" ___ لُوسی نے بڑے شگفتہ لہجے میں کہا ___ "میں ہوتی تو دیکھتی کہ تم کس طرح اپنی مردانگی اور حیوانیت پر قابو رکھ سکتے ہو"۔

"اب آزما کر دیکھ لو" ___ صغیر نے زندہ دلی کے لہجے میں کہا ___ "تم جیسی لڑکیوں کے جال میں وہ آتے ہیں جو اس جال میں آنا چاہتے ہیں۔ میں مانتا ہوں کہ مُنی نے مجھے لاہور میں اپنے شیشے میں اتار لیا تھا لیکن ابھی میں پوری طرح اپنے آپ میں نہیں آیا تھا۔

.... بات یہ ہے لُوسی میں اپنی نفسانی خواہشات پر قابو پاتا چلا گیا اور اللہ اس کے ساتھ ساتھ مجھے صِلہ دیتا رہا۔ مثلاً" دلجیت کور کو تحفے کے طور پر رات کے لئے میرے پاس بھیجا گیا۔ میں نے اسے تحفہ نہ سمجھا اور اپنے آپ کو پتھر بنا لیا۔ اللہ نے یہ صِلہ دیا کہ میرے فرار کا راستہ کھل گیا۔ پھر جنگل میں اس خوبصورت لڑکی نے حیوانوں کی طرح اپنے آپ کو میرے آگے رکھ دیا۔ میں نے اپنے دل کو قابو میں رکھا۔ اللہ نے مجھے یہ صلہ دیا کہ جنگل سے پکّی سڑک تک پہنچنے کا بندوبست ہو گیا ورنہ وہاں مجھے جیپ کیسے مل سکتی تھی پھر سڑک پر پہنچتے ہی مجھے ڈاکٹر رشید اور اس کی پارٹی مل گئی اور میں گاڑی میں سرحد کے قریب جالندھر آن پہنچا"۔

صغیر جب لُوسی کو یہ ساری داستان سنا رہا تھا تو لُوسی پر ایسی کیفیت طاری ہو گئی تھی جیسے وہ اب سن کم رہی ہو اور صغیر کی ذات میں دلچسپی زیادہ لے رہی ہو۔ صغیر کی زبان میں چاشنی تھی اور وہ اثر انگیز انداز سے بات کرنے کی مہارت رکھتا تھا۔ لُوسی کو احساس ہی نہیں تھا کہ کتنا وقت گزر گیا ہے اور وہ کہاں اور کس صورتِ حال میں ہے۔ وہ دل میں صغیر کے لئے اپنائیت سی محسوس کرنے لگی تھی۔

"اب میری سنو گے؟" ___ لُوسی نے کہا ___ "میں اپنی یہ ہسٹری آئی ایس آئی کے ڈائریکٹر جنرل کو سنا چکی ہوں"۔

"یہی تو میں چاہتا ہوں" ___ صغیر نے کہا ___ "تمہارے دل میں جو کچھ بھی ہے میرے آگے رکھ دو۔ مجھے اپنا راز دار بنا لو' اکیلے سوچ سوچ کر اپنے آپ کو اذیّت میں نہ ڈالے رکھنا"۔

"میں نے دل کی بات کہہ دی تو تم نہیں مانو گے" ___ لُوسی نے کہا ___ "تم مجھ پر کبھی اعتبار نہیں کرو گے کیونکہ تم جانتے ہو کہ میں کس قماش کی لڑکی ہوں"۔

"نہیں لُوسی!" ___ صغیر نے کہا ___ "میں ایسا نہیں سوچوں گا' جو بھی دل میں آتا ہے وہ زبان پر لے آؤ"۔

"تم مجھے کچھ اور ہی طرح اچھے لگنے لگے ہو" ___ لُوسی نے لہجے میں کچھ سنجیدگی اور کچھ شگفتگی پیدا کرتے ہوئے کہا ___ "لیکن یوں محسوس کرتی ہوں جیسے میں یہ بات وقت سے بہت پہلے کہہ رہی ہوں۔ تم کہہ سکتے ہو کہ یہ چالاک لڑکی استادی کھیل رہی ہے کیونکہ یہ مجبور' بے بس اور بے ٹھکانہ ہے اور اپنے لئے پناہ بنا رہی ہے .... بات یہ

ہے صغیر! میں نے کبھی کسی سے محبت نہیں کی۔ وہ جو تمہیں سنایا ہے کہ ایک بوڑھے کے ساتھ بیاہ دیا گیا تو میں نے پہلے ایک کو اور پھر دوسرے کو دوست بنایا تھا وہ دلی یا روحانی محبت نہیں تھی بلکہ جذباتی اور جسمانی تسکین والی محبت تھی۔ پھر تو میں ایسی فریب کار ہوئی کہ محبت کے نام سے مجھے چڑ ہو گئی تھی۔ بندوں کو اپنے جال میں لا کر انہیں کٹھ پتلیوں کی طرح نچانے میں مجھے عجیب سا لطف حاصل ہوتا تھا لیکن آج یوں معلوم ہوتا ہے جیسے میرے اندر ایک اور حس بیدار ہو گئی ہے اور اس کی تسکین صرف تم کر سکتے ہو اور اس تسکین کا جسم اور حسن کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ میں اتنا ضرور کہوں گی کہ میں سہارا ڈھونڈ رہی ہوں"۔

لوُسی کو ہچکی سی آئی اور اس نے سر جھکا کر چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔ اس کا سارا جسم ہلکے ہلکے جھٹکوں سے ہل رہا تھا۔ وہ سسکیاں اور ہچکیاں لے لے کر رونے لگی تھی۔ صغیر اس کے پاس جا بیٹھا اور اپنا ایک بازو اس کے کندھوں پر رکھا اور دوسرا ہاتھ اُس کی ٹھوڑی کے نیچے رکھا اور اس کا چہرہ اوپر اٹھا کر بہلانے لگا۔ لوُسی کچھ دیر آنسو بہاتی رہی اور کچھ مشکل سے ہی اپنے آپ کو قابو میں لائی۔

"میں تمہیں بے سہارا نہیں چھوڑوں گا لوُسی!" ---- صغیر نے کہا ---- "میں یہی کہہ رہا تھا کہ دل میں جو بھی ہے وہ میرے آگے رکھ دو۔ تم نے اچھا کیا جو یہ بات بھی کہہ ڈالی اور میں نے تمہیں سنبھال لیا۔ ابھی ہمیں نہ جانے کتنا عرصہ اکٹھے رہنا ہے۔ مجھے اپنا سمجھتی رہو اور باقی رہی بات محبت کی' تو اس پر بھی کبھی بات کر لیں گے۔ ابھی مجھے سمجھنے کی کوشش کرو اور یہ کوشش بھی کرو کہ اپنا آپ مجھے سمجھا سکو"۔

کچھ دیر بعد لوُسی نارمل حالت میں آ گئی۔

○

کورٹ مارشل سے پہلے ایک کارروائی ہوتی ہے جسے سمری آف ایویڈینس کہتے ہیں۔ اس میں استغاثہ کے چیدہ چیدہ گواہوں کے بیان ملزم کی موجودگی میں لئے جاتے ہیں اور ملزم کو اجازت حاصل ہوتی ہے کہ وہ ان پر جرح کرے اور وہ اپنا بیان بھی دے سکتا ہے۔ اسے یہ بھی اجازت ہوتی ہے کہ جرح نہ کرے اور بیان بھی نہ دے اور اپنا یہ حق کورٹ مارشل میں استعمال کرے۔ میجر عثمان کو سرکاری طور پر اطلاع دے دی گئی تھی کہ اس کا کورٹ مارشل ہو گا اور فلاں دن اسے سمری آف ایویڈینس میں پیش کیا جائے

گا۔

تین چار دنوں بعد یہ کارروائی شروع ہوئی اور میجر عثمان کو اس میں شامل کیا گیا۔ میجر عثمان نے نہ کسی گواہ پر جرح کی نہ بیان دیا۔ وہ اس قانون سے واقف تھا۔ اس کارروائی کی تکمیل کے بعد کاغذات جی ایچ کیو جانے تھے اور وہاں سے جنرل کورٹ مارشل کا حکم آنا تھا۔

واجدہ ابھی لاہور چھاؤنی میں اسی سرکاری بنگلے میں رہتی تھی جو میجر عثمان کو ملا ہُوا تھا۔ میجر عثمان کا باپ پہلے بھی واجدہ کے پاس یہ خبر لے کر آیا تھا کہ عثمان کو آئی ایس آئی نے گرفتار کر لیا ہے اور واجدہ نے بڑی دانشمندی سے اسے مطمئن کر کے ٹال دیا تھا۔ اب عثمان کا باپ پھر آ گیا۔ واجدہ نے فوراً محسوس کر لیا کہ اس شخص کا مزاج اکھڑا ہُوا ہے اور یہ کوئی خاص ہی بات کرنے آیا ہے۔

"واجدہ بیٹی!" ---- عثمان کے باپ نے کہا ---- "میں جو بات سن کر آیا ہوں اس پر مجھے یقین تو نہیں لیکن تمہارے ساتھ بات کرنا ضروری سمجھا اور آ گیا ہوں"۔

واجدہ نے چونک کر اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"سنو واجدہ!" ---- سسر نے واجدہ سے کہا ---- "میں نے کہا تھا کہ عثمان کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ تم نے مجھے جھٹلا دیا اور کوئی اور ہی بات بتا دی تھی لیکن اب مجھے صحیح اطلاع ملی ہے کہ عثمان کا کورٹ مارشل ہو رہا ہے۔ کیا تم جانتی ہو؟؟"

"جانتی ہوں چچا جان!" ---- واجدہ نے جواب دیا ---- "پہلے مجھے بھی اندھیرے میں رکھا گیا تھا' اب صحیح اطلاع ملی' ہے کہ عثمان کا جاسوسی کے الزام میں کورٹ مارشل ہو رہا ہے"۔

"میرا بیٹا جاسوس نہیں ہو سکتا" ---- سسُر نے پرُجوش اور تحکمانہ لہجے میں کہا ---- "میرے مجاہد بیٹے کے خلاف کسی دشمن نے پھڈا بنا دیا ہو گا.... یہ تو میں دیکھ لوں گا لیکن مجھے ایک اور خبر ملی ہے جس پر میں یقین نہیں کر سکتا۔ صرف تم میرا شک رفع کر سکتی ہو"۔

"وہ خبر کیا ہے چچا جان؟؟" ---- واجدہ نے پوچھا۔

"سنا ہے تم عثمان کے خلاف کورٹ مارشل میں گواہی دے رہی ہو" ---- سسُر نے کہا ---- "کیا کسی غیرت مند خاندان کی بیٹی اپنے خاوند کے خلاف ایسی حرکت کر سکتی

ہے؟"

"کر سکتی ہے چچا جان!" ــــ واجدہ نے کہا ــــ "اگر خاوند بے غیرت اور غدار ہو جائے تو غیرت مند بیوی اسے اپنا خاوند تسلیم کرنے سے انکار کر دے گی"۔

"میرا بیٹا بے غیرت اور غدار نہیں ہو سکتا" ــــ سُسر نے کہا ــــ "میں تم سے صرف یہ پوچھ رہا ہوں کہ یہ کہاں تک صحیح ہے کہ تم اور تمہارے دونوں بھائی عثمان کے خلاف گواہی دے رہے ہیں!"

"چچا جان!" ــــ واجدہ نے کہا ــــ "ابھی میں کچھ نہیں بتا سکتی۔ وقت آنے پر آپ کو پتہ چل جائے گا کہ میں گواہی دوں گی یا نہیں دوں گی یا کیا کروں گی"۔

"تمہارا فیصلہ ایک ہونا چاہئے" ــــ سُسر نے چوہدریوں کے لہجے میں کہا ــــ "تم عثمان کے خلاف گواہی نہیں دو گی۔ مت بھولو کہ تم میری بہو اور میرے بیٹے کی بیوی ہو۔ تم وہ کرو گی جو میں تمہیں کہوں گا"۔

"اگر میں آپ کا حکم ماننے سے انکار کر دوں تو؟" ــــ واجدہ نے پوچھا۔

"میں تمہیں زبردستی اپنی بات پر لاؤں گا" ــــ سُسر نے بڑے رعب سے کہا ــــ "میں معلوم کر رہا ہوں کہ میرے بیٹے پر جاسوسی کا الزام کس طرح لگا ہے۔ پھر دیکھنا میں اس کا کورٹ مارشل کرنے والوں کو کس انجام تک پہنچاتا ہوں .... میرے قہر سے بچو۔ ایسی حرکت نہ کر بیٹھنا کہ ایک جھوٹے مقدمے میں عثمان کے خلاف جا گواہی دو"۔

واجدہ پہلے ہی جلی بیٹھی تھی۔ اس کی تو ازدواجی زندگی تباہ و برباد ہو گئی تھی۔ عثمان نے اسے دھوکے دیئے تھے۔ وہ کسی قیمت پر عثمان کو بخشنے پر تیار نہیں تھی۔ پاکستان کی عظمت اور محبت الگ تھی جو ایک الاؤ کی طرح اس کی ذات میں روشن تھی۔

"چچا جان!" ــــ واجدہ نے بڑے تحمّل سے کہا ــــ "آپ کورٹ مارشل کرنے والوں کو جس انجام تک پہنچا سکتے ہیں ضرور پہنچائیں لیکن میں آپ کا اس سلسلے میں کوئی حکم نہیں مانوں گی۔ میں آپ کو صاف بتا دیتی ہوں کہ عثمان کے خلاف یہ الزام غلط نہیں۔ وہ ہندو لڑکی بھی پکڑی گئی ہے جس کے ساتھ عثمان مجھے اور اپنے بچوں کو دھوکے دے کر عیش و عشرت کرتا رہا ہے۔ ہندوستان سے آئی ہوئی اس لڑکی نے ہماری انٹیلی جنس کو اقبالی بیان دے دیا ہے اور عثمان سے سب پردے اٹھا دیئے ہیں۔ عثمان اس ہندو لڑکی کے ساتھ مجھے فریب دیتا رہا ہے۔ میں اسے معاف کر سکتی ہوں لیکن عثمان نے

پاکستان کے خلاف جو غداری کی ہے اور جو راز ہمارے ملک اور ہمارے مذہب کے دشمن کو دیئے ہیں وہ بھی سامنے آ گئے ہیں۔ میں پاکستان کے خلاف کوئی سازش برداشت نہیں کر سکتی"۔

"تم مجھ سے کسی بڑے چوہدری کی بیٹی نہیں کہ پاکستان کو اپنے باپ کی جاگیر سمجھ لو" ــــ سُسر نے غصیلی آواز میں کہا ــــ "میں بھی پاکستانی ہوں اور گھر بیٹھا پاکستان پر حکمرانی کر رہا ہوں۔ تم جانتی ہو یہ وزیر اور اسمبلیوں کے ممبر میرے مرید ہیں۔ میں تمہیں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ عثمان کے خلاف گواہی دینے کی جراُت نہ کرنا"۔

"میں گواہی دوں گی" ــــ واجدہ نے غصے کے جواب میں غصے سے کہا ــــ "عثمان میرا خاوند نہیں رہا۔ وہ کافروں کا دوست ہے اور کافروں کے ہاتھوں ایک اسلامی ملک کی جڑیں کاٹ رہا ہے۔ میں مسلمان کی بیٹی ہوں اور اسلام میرا مذہب ہے۔ اگر آپ کو اپنا بیٹا عزیز ہے تو اسے چھڑانے کے لئے کوئی اور حیلہ کریں، مجھ سے یہ توقع نہ رکھیں کہ میں اس کے خلاف زبان نہیں کھولوں گی"۔

میجر عثمان کا باپ انتہائی غصے کے عالم میں اٹھ کھڑا ہُوا۔ اس نے دھمکیوں کی زبان میں دو چار اور باتیں کہیں اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

واجدہ نے اُسی وقت میجر امتیاز کو فون کیا اور اسے بتایا کہ عثمان کا باپ آیا تھا اور اس نے کیا کہا اور اس کے جواب میں واجدہ نے کیا کہا ہے۔

"میجر امتیاز!" ــــ واجدہ نے پوچھا ــــ "کیا آپ یہ معلوم نہیں کر سکتے کہ عثمان کے متعلق یہ باتیں اس کے باپ تک کون پہنچاتا ہے؟"

"اب یہ معلوم کرنے کا کوئی فائدہ بھی نہیں" ــــ میجر امتیاز نے کہا ــــ "میجر عثمان کو سرکاری طور پر بتا دیا گیا ہے کہ اس کا کورٹ مارشل کیا جا رہا ہے اور وہ اپنی صفائی کا انتظام کر لے۔ اب اس کارروائی کو چھپایا نہیں جا سکتا نہ اسے چھپایا جائے گا۔ کورٹ مارشل کی ابتدائی کارروائی ہو چکی ہے اور جی ایچ کیو کے حکم کا انتظار ہے۔ آپ گواہی دینے کے لئے تیار رہیں"۔

واجدہ نے میجر سمیع اور پھر کیپٹن آصف کو بھی فون پر بتایا کہ عثمان کا باپ کیا کہہ گیا ہے۔ دونوں نے واجدہ سے کہا کہ اسے اب بہت ہی محتاط رہنا پڑے گا۔ کیونکہ عثمان کے بھائی اور باپ مجرمانہ ذہنیت کے چوہدری ہیں اور ان کا اثر و رسوخ بڑی دور تک ہے۔ یہ

کسی بھی حد تک مجرمانہ کارروائی کر سکتے ہیں۔ واجدہ نے یہ بات سنی تو ذرا سی بھی نہ ڈری نہ اپنے سُسر کی دھمکیوں کو اہمیت دی۔

پھر واجدہ نے اپنے بھائیوں کو فون کیا اور انہیں بھی عثمان کے باپ کے متعلق ساری باتیں بتائیں۔ دونوں بھائیوں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ کوارٹر چھوڑ دے اور ان کے پاس آ جائے لیکن واجدہ میں کچھ ایسی اخلاقی جرأت پیدا ہو گئی تھی کہ اس نے بھائیوں کا یہ مشورہ نہ مانا اور وہیں رہنے کا فیصلہ سنا دیا۔ اس نے کہا کہ وہ سچّی ہے اور اس کی نیّت نیک ہے اس لئے کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

واجدہ کے پاس میجر عثمان کا بیٹ مین رہتا تھا۔ میجر عثمان کے کیس کے فیصلے تک اس کا یہ بیٹ مین واجدہ کے پاس رہ سکتا تھا۔ واجدہ صرف دن کو بیٹ مین کو اپنے ساتھ رکھتی تھی اور رات اسے بیرک میں بھیج دیتی تھی۔

اگلے روز واجدہ کے دونوں بھائی اس کے ہاں گئے اور اسی سلسلے میں باتیں ہوتی رہیں۔ پھر میجر سمیع اور کیپٹن آصف بھی گئے اور خاصی دیر واجدہ کے پاس بیٹھے رہے۔ یہ سب لوگ یہ خدشہ محسوس کرتے تھے کہ عثمان کا باپ کوئی اوچھی حرکت نہ کر گزرے لیکن واجدہ اس خطرے کو قبول کرتی ہی نہیں تھی البتہ اس نے عثمان کے باپ کا چیلنج قبول کر لیا تھا۔

سات آٹھ دن گزر گئے۔ ایک روز میجر امتیاز واجدہ کے ہاں آیا اور اسے بتایا کہ کورٹ مارشل کی تاریخ مقرر ہو گئی ہے اور تمام گواہوں کو راولپنڈی پہنچنے کے لئے اطلاع کر دی گئی ہے۔ میجر امتیاز اسے سرکاری طور پر ہی اطلاع دینے آیا تھا اور اسے کورٹ مارشل کی تاریخ بتائی۔

○

صغیر اور لُوسی کو ان رہائشی کمروں میں رہتے دو ہفتے گزر گئے تھے۔ آئی ایس آئی کی ایک تفتیشی ٹیم دوسرے ملزموں کو تفتیش کی چکّی میں پیس رہی تھی۔ مہندر آہوجا تو بڑا ہی مضبوط پتھر بنا ہُوا تھا۔ اس کے رنگ کے کچھ ملزموں نے اپنی سرگرمیوں کا اعتراف کر لیا تھا لیکن وہ کسی اور کی نشاندہی نہیں کر رہے تھے۔ آخر دونوں لڑکیاں تفتیش کے مختلف طریقوں کو برداشت نہ کر سکیں اور انہوں نے اقبالی بیان دے دیئے۔ انہوں نے تفتیشی ٹیم کے افسروں کو فریب دینے کی اور ان پر اپنا طلسم طاری کرنے کی بہت کوشش

کی لیکن کامیاب نہ ہو سکیں۔ وہ آخر عورتیں تھیں۔ ان کی برداشت مردوں جیسی نہیں تھی۔ انہوں نے اپنے جرائم کا اعتراف کر لیا لیکن تفتیشی افسر جو معلومات لینا چاہتے تھے ان کے متعلق وہ کہتی تھیں کہ وہ انہیں معلوم نہیں۔ بہرحال تفتیش کامیابی کی طرف بڑھ رہی تھی۔

لُوسی تو صغیر کی ہی ہو کے رہ گئی تھی۔ صغیر نے ویسے والہانہ پن کا اظہار نہ کیا جیسا اظہار لُوسی کرتی تھی۔ لُوسی کے لئے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ وہ یہ کیس ختم ہونے کے بعد انڈیا نہیں جانا چاہتی تھی۔

"صغیر!" —— ایک روز لُوسی نے صغیر سے پوچھا —— "تمہیں کسی لڑکی سے کبھی محبت ہوئی ہے؟"

"محبت شریف آدمی کیا کرتے ہیں" —— صغیر نے جواب دیا —— "مجھ جیسے آوارہ گناہگار محبت کا کھیل کھیلا کرتے ہیں۔ یہ کھیل دو لڑکیوں کے ساتھ کھیلا تھا۔ یہ تمہارے ملک کی فلموں کے اثرات تھے اور میرا کردار ان ہی فلموں کے سانچے میں ڈھل گیا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ تم کس محبت کی بات کر رہی ہو۔ اگر میرے کردار اور میری شخصیت میں اتنی پختگی ہوتی تو میں تمہارے ملک کا ایجنٹ بنتا ہی کیوں!؟"

"تم مجھے کیوں نہیں سمجھتے صغیر!" —— لُوسی نے جھنجلا کر کہا —— "میں تمہارے ساتھ کوئی کھیل نہیں کھیل رہی۔ تم مجھ پر اعتبار کیوں نہیں کرتے!.... ہم کتنے دنوں سے اتنی قریب رہ رہے ہیں۔ ہمیں روکنے ٹوکنے والا کوئی نہیں۔ ہم کتنی کتنی دیر تنہائی میں بیٹھے رہتے ہیں۔ اگر میرے دل میں میل ہوتی تو میں کبھی کی تمہیں کہہ چکی ہوتی کہ آؤ آج جسمانی تسکین کا نشہ پورا کر لیں۔ میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ میرے دل میں وہ محبت پیدا ہو گئی ہے جس کے قصے مشہور ہیں۔ میں جانتی ہوں تم مجھے اپنے قابل نہیں سمجھتے۔ میں عصمت اور آبرو باختہ لڑکی ہوں۔ کسی کا مجھ پر اعتبار کرنا ایسے ہی ہے جیسے کسی نے ناگن پر اعتبار کر لیا۔ تم اگر میرے متعلق یہی سوچتے ہو تو بالکل ٹھیک سوچتے ہو لیکن میری سوچ اور میرے جذبات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ تمہاری سمجھ میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ میں پاکستان میں رہنا چاہتی ہوں اور صرف تم ہو جو مجھے پاکستان میں رکھ سکتے ہو اور میں اسی لئے تمہیں محبت کا جھانسہ دے رہی ہوں"۔

"میں نے تمہیں ٹھکرا تو نہیں دیا لُوسی!" —— صغیر نے کہا —— "میں نے یہ بھی

نہیں سوچا کہ تم بہت سے مردوں کے پاس جا چکی ہو۔ یہ میں اس لئے نہیں سوچتا کہ میں کہاں کا پاک صاف کردار کا آدمی ہوں۔ تم جیسا ہی ناپاک گناہگار ہوں"۔

"کیا تمہیں گھر کی کوئی پابندی ہے" ـــ لوسی نے پوچھا ـــ "کیا تم اپنی پسند کی کسی لڑکی کے ساتھ شادی کرنا چاہتے ہو؟"

"مجھ پر کوئی پابندی نہیں" ـــ صغیر نے جواب دیا ـــ "گھر والے میرے نام پر لعنت بھیج رہے ہوں گے۔ کسی بھی لڑکی کے ماں باپ اپنی لڑکی کو میرے ساتھ نہیں بیاہیں گے۔ یہ الگ بات ہے کہ میں اس کیس سے فارغ ہو کر اپنے گھر جاؤں گا اور اپنے باپ اور ماں کے قدموں میں سر رکھ کر معافی مانگوں گا اور انہیں بتاؤں گا کہ میں واپس ان کے پاس آگیا ہوں"۔

"تم بات ادھوری کرتے ہو" ـــ لوسی نے کہا ـــ "صاف کہہ کیوں نہیں دیتے کہ لوسی، میں کسی شریف لڑکی کو بیوی بناؤں گا اور تمہیں اپنے قابل نہیں سمجھتا اور نہ تم پر اعتبار کر سکتا ہوں"۔

"تمہیں محبت کا جواب محبت سے ہی دوں گا لوسی!" ـــ صغیر نے کہا ـــ "میں ابھی کچھ نہیں بتا سکتا کہ میں کیا سوچ رہا ہوں، البتہ تمہیں یہ یقین دلا سکتا ہوں کہ تمہیں تنہا نہیں چھوڑوں گا"۔

لوسی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور پھر یہ آنسو بہہ نکلے۔ صغیر نے اسے بازو سے پکڑ کر اور اٹھا کر اپنے ساتھ پلنگ پر بٹھا لیا۔ پھر لوسی اس کے مضبوط بازوؤں میں تھی اور صغیر لوسی کے نرم و نازک اور بڑے ہی دل کش بازوؤں کی گرفت میں آگیا جیسے وہ ایک دوسرے میں تحلیل ہو جانے کی کوشش میں ہوں۔

یہ پہلا موقع تھا کہ صغیر کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے اور پہلی بار محسوس کیا جیسے اس کی ذات میں ایک تشنگی ہے اور شاید وہ ایک سراب کے تعاقب میں اپنے وجود کو گھسیٹتا چلا آ رہا ہے اور اب منزل کے قریب کہیں آن گرا ہے۔

"تم مجھے اپنے ملک کا دشمن سمجھتے ہو" ـــ لوسی نے اچانک اس سے الگ ہو کر کہا ـــ "تم مجھے ہندو سمجھتے ہو .... میرا کوئی ملک نہیں صغیر اور میرا کوئی مذہب نہیں۔ مجھے وہ مذہب دے دو جو میری روح کی تسکین کر دے۔ مجھے وہ ملک دے دو جو مجھے پناہ میں لے لے۔ مجھے اپنے وجود میں گم کر دو۔ مجھے اپنے ملک اور اپنے مذہب پر قربان کر دو"۔

لوسی کے آنسو بہے جا رہے تھے۔ صغیر نے ایک ہاتھ سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے تھے لیکن وہ محسوس کر رہا تھا کہ اپنے آنسو روک نہیں سکے گا۔

وہ صغیر مر گیا تھا جو انڈیا کا جاسوس تھا۔

وہ لوسی نزع کے عالم میں آخری سانسیں لے رہی تھی جو سمجھتی تھی کہ پتھروں کو بھی موم کر سکتی ہے اور حسن و جوانی ہی اس کی سب سے بڑی دولت ہے۔

اس مرتی ہوئی لوسی کے وجود سے ایک اور لوسی جنم لے رہی تھی جس کا کوئی ملک نہیں تھا، کوئی مذہب اور کوئی نام نہیں تھا۔

لوسی کی ذات میں ایک الاؤ بھڑک اٹھا تھا اور وہ موم کی طرح پگھل پگھل کر بہہ رہی تھی۔

صغیر نے کچھ ایسا محسوس کیا جیسے وہ اسی آبرو باختہ لڑکی کی تلاش میں گناہوں کی وادی میں آن نکلا تھا اور بھٹکتا ہوا کفر کی جنت میں جا پہنچا تھا۔

"مجھے اتنا بھی بے بس نہ سمجھو صغیر!" ـــ لوسی نے کہا ـــ "مجھے کھلا چھوڑ دو، دیکھنا میں کس طرح اپنے سامنے آنے والے پہلے ہی آدمی کو اپنا خاوند بنا لیتی ہوں"۔

"اب تمہیں کھلا نہیں چھوڑوں گا لوسی!" ـــ صغیر نے ایک بار پھر لوسی کو اپنے ایک بازو کے گھیرے میں لے کر کہا ـــ "اب تمہیں وہ آزادی نہیں لینے دوں گا کہ جسے چاہو اپنا عارضی خاوند بنا لو۔ میں اپنی شخصیت اور اپنا کردار بدل سکتا ہوں تو تمہیں بھی بدل لوں گا۔ سب سے زیادہ مشکل مہم اپنے آپ کو بدلنا ہے۔ ہم ایک ہی منزل کے مسافر ہیں"۔

"میں شاید خواب دیکھ رہی ہوں" ـــ لوسی نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا ـــ "جب سے عثمان کی بیوی واجدہ کو دیکھا ہے یہ خواہش مجھے پاگل کئے جا رہی ہے کہ میں واجدہ جیسی بیوی بنوں"۔

"لیکن میں عثمان نہیں بن سکوں گا لوسی!" ـــ صغیر نے شگفتہ سے لہجے میں یہ کہہ کر وہ کھچاؤ کم کر دیا جو کمرے میں پیدا ہو گیا تھا۔

پھر وہ ایسی ہی باتیں کرتے کرتے ڈاکٹر رشید اور خالدہ کے ذکر پر آ گئے۔ صغیر نے لوسی سے کہا تھا کہ وہ اسے ان دونوں سے ملوائے گا اور پھر لوسی خالدہ کو دیکھے اور سوچے کہ محبت کیا ہوتی ہے اور ایثار کیا ہوتا ہے۔

"ایک کام کرسکتے ہو صغیر!" ـــ لُوسی نے التجا کے لہجے میں کہا ـــ "تم یہ تو جانتے ہو گے کہ کسی غیر مسلم کو مسلمان کس طرح کیا جاتا ہے؟"

"میرا خیال ہے جانتا ہوں" ـــ صغیر نے کہا ـــ "کسی غیر مسلمان کو تو مسلمان بنا لوں گا لیکن کسی مسلمان کو مسلمان بنانا میرے لئے ناممکن ہے"۔

"مذاق میں مت ٹالو صغیر!" ـــ لُوسی نے کہا ـــ "اتنا تو میں بھی جانتی ہوں کہ مسلمان ہونے کے لئے مجھے کسی جسمانی تبدیلی کی ضرورت نہیں نہ ہی میرا رنگ روغن تبدیل کیا جائے گا۔ کچھ پڑھاتے ہوں گے اور دل کی نیّت سے قبول کرنا ہو گا کہ میں اب مسلمان ہوں"۔

"اگر تم میرے ہی ہاتھوں اسلام میں داخل ہونا چاہتی ہو تو میں جو پڑھتا ہوں وہ پڑھتی چلو" ـــ صغیر نے کہا۔

صغیر کو ساری نماز آتی تھی اور ایک کلمہ بھی اسے یاد تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ بولنا شروع کیا اور لُوسی اس کے پیچھے بولتی گئی۔ صغیر کو کچھ بھی معلوم نہیں تھا کہ کسی کو مسلمان بنانے کے لئے اور کیا کچھ کیا جاتا ہے۔ اس نے لُوسی سے پوری نماز پڑھوائی پھر کلمہ پڑھوایا اور اسے کہا کہ وہ خلوص دل سے کہے کہ میں اب مسلمان ہوں۔ لوسی نے ایسے ہی کہا پھر اس سے کہلوایا کہ میں اللہ کو وحدہ لاشریک مانتی ہوں اور محمدؐ الرسول اللہ کو اللہ کا رسولؐ تسلیم کرتی ہوں۔

"لو' اب تم مسلمان ہو گئی ہو" ـــ صغیر نے کہا ـــ "اب تمہارا کردار اسلام کے سانچے میں ڈھل جانا چاہئے لیکن یہ تم خود کرو گی .... جو میں اسلام کے متعلق جانتا ہوں وہ تمہیں بتاتا رہوں گا۔ اگر اپنے آپ کو صحیح مسلمان بنانا ہے تو اسلام کے اصولوں کو جان لینا' یہاں کے مسلمانوں کی نقل اور پیروی نہ کرنا۔ اسلام کچھ اور چیز ہے اور یہاں کے مسلمان بالکل مختلف چیزیں ہیں"۔

"میں عبادت کرنا چاہتی ہوں" ـــ لُوسی نے بڑی سنجیدگی سے کہا ـــ "مجھے اپنی عبادت سمجھاؤ جسے تم نماز کہتے ہو"۔

صغیر نے اسے نماز پڑھنے کا طریقہ بتانا شروع کر دیا۔

"کیا میرا کوئی نام نہیں رکھو گے؟" ـــ لُوسی نے پوچھا۔

صغیر گہری سوچ میں کھو گیا پھر یک لخت بیدار ہو کر بولا ـــ "تمہارے اسی نام کے

حروف باقی رکھوں گا اور ذرا سی ردو بدل کے بعد تمہارا نام جو میرے ذہن میں آیا ہے وہ ہے سلمٰی"۔

"اچھا نام ہے" ـــ لُوسی نے کہا ـــ "میں اپنا نام واجدہ یا وینا رکھنا چاہتی تھی لیکن سلمٰی بھی اچھا نام ہے"۔

○

میجر عثمان کے کورٹ مارشل کی تاریخ آ گئی۔ واجدہ اور اس کے بھائیوں کو دو تین دنوں بعد راولپنڈی پہنچنا تھا اور کورٹ مارشل کے فیصلے تک وہیں رہنا تھا۔

صغیر اور لُوسی کو بھی آخری ہدایات دے دی گئی تھیں کہ وہ اپنے بیان میں کیا کہیں گے اور ان پر جرح کس قسم کی ہو سکتی ہے۔ واجدہ اپنے بھائیوں کے ساتھ راولپنڈی جانے کو تیار تھی۔ صرف ایک دن باقی تھا۔ اس کا بیٹ مین علی الصبح بیرک میں آ جایا کرتا تھا۔ راولپنڈی جانے سے ایک روز پہلے بیٹ مین آیا تو دیکھا کہ واجدہ کے دونوں بچے سوئے ہوئے ہیں اور واجدہ گھر میں نہیں ہے۔

بیٹ مین اپنے روز مرہ کے کاموں میں مصروف ہو گیا۔ اتنے میں دونوں بچے جاگ اٹھے اور ماں کو پکارنے لگے لیکن واجدہ گھر میں تھی ہی نہیں۔ بیٹ مین نے واجدہ کو گھر کے اندر اور باہر بھی جا کر دیکھا لیکن اس کا تو کچھ پتہ ہی نہیں چل رہا تھا۔ گھر سے واجدہ کا صبح سویرے ہی غائب ہو جانا بیٹ مین کے لئے حیران کن تھا۔ بچوں کے جاگنے کے وقت تو واجدہ گھر میں موجود رہتی تھی۔ ویسے بھی وہ زیادہ باہر نکلنے یا باہر زیادہ وقت صرف کرنے کی عادی تھی ہی نہیں۔

بیٹ مین نے دونوں بچوں کو دودھ دیا لیکن وہ چیخ چلّا رہے تھے اور ماں کو پکارتے تھے۔ انہوں نے قیامت بپا کر دی تھی۔

جب اور زیادہ وقت گزر گیا اور بچے مسلسل رو رو کر بے حال ہونے لگے تو یوں نظر آتا تھا جیسے یہ بے ہوش ہو جائیں گے۔ بیٹ مین نے آخر تنگ آ کر واجدہ کے بھائیوں کو فون کیا اور کہا کہ واجدہ وہاں ہے تو اسے جلدی گھر بھیجیں' بچے رو رہے ہیں۔ اسے وہاں سے جواب ملا کہ واجدہ وہاں نہیں آئی۔

وقت اتنا زیادہ گزر گیا تھا کہ وہاں بھی سب پریشان ہو گئے۔ دونوں بھائی' ان کی بیویاں' اور واجدہ کی ماں بھی گاڑی میں بیٹھے اور چھاؤنی واجدہ کے گھر پہنچے۔ واجدہ ابھی

تک واپس نہیں آئی تھی۔ بچوں کو عورتوں نے سنبھالا' بہلایا پھسلایا اور دودھ وغیرہ دیا لیکن پریشانی تو یہ تھی کہ واجدہ گئی کہاں!

واجدہ کی ماں ساتھ والے کوارٹروں میں گئی اور واجدہ کے متعلق پوچھا۔ ہر گھر سے یہی جواب ملا کہ واجدہ ان کے ہاں نہیں آئی۔

یہ سب افسروں کے کوارٹر تھے جنہیں بنگلے کہا جاتا ہے۔ ایک بنگلے کے بیٹ مین نے کہا کہ رات گیارہ بجے کے کچھ بعد وہ اپنے صاحب کے بتائے ہوئے ایک کام سے باہر گیا تھا۔ اس نے واجدہ کے بنگلے کے سامنے کار کھڑی دیکھی تھی اور دو آدمی واجدہ کو کار میں پچھلی سیٹ پر بٹھا رہے تھے۔ پھر کار چلی گئی تھی۔

"کیا واجدہ خود گاڑی میں بیٹھ رہی تھی؟" ---- واجدہ کے بڑے بھائی نے بیٹ مین سے پوچھا ---- "کیا ایسا تو نہیں تھا کہ اسے زبردستی بٹھا رہے تھے؟"

"میں نے اتنی غور سے نہیں دیکھا" ---- بیٹ مین نے جواب دیا ---- "اتنا کہہ سکتا ہوں کہ بیگم صاحبہ کو زبردستی نہیں بٹھایا جا رہا تھا۔ اگر ایسی بات ہوتی تو میں صرف دیکھ کر آنکھیں نہ پھیر لیتا بلکہ جا کر دیکھتا کہ یہ کون ہیں جو بیگم صاحبہ کو زبردستی گاڑی میں بٹھا رہے ہیں"۔

واجدہ کے بھائی نے بیٹ مین سے یہ بات کچھ سوچ کر پوچھی تھی۔ اسے جو جواب ملا اس سے اس کا شک صحیح نکلا۔ واجدہ ایسی عورت نہیں تھی کہ رات گیارہ بجے کے بعد بچوں کو سوتا چھوڑ کر دو تین آدمیوں کے ساتھ گاڑی میں کہیں نکل جاتی۔ بھائی نے پہلے ہی واجدہ سے کہا تھا کہ وہ کوارٹر کو بند کر دے اور گھر آ جائے۔ یہ اس کے سُسر کی دھمکیوں کے پیش نظر کہا تھا۔ واجدہ کے سسرال بڑے ہی گھٹیا قسم کے لوگ تھے۔ مشکل یہ پیدا ہو گئی تھی کہ واجدہ اپنے آپ کو کچھ زیادہ ہی دلیر اور نڈر سمجھنے لگی تھی۔

اب تو کوئی شک نہیں رہا تھا کہ واجدہ لاپتہ ہو گئی اور امکان یہی ہے کہ اسے اغوا کیا گیا ہے اور اغوا کرنے یا کروانے والے واجدہ کے سسرال ہیں یعنی عثمان کا باپ اور اس کے بھائی۔ واجدہ کے دونوں بھائی بریگیڈ ہیڈ کوارٹر چلے گئے اور بریگیڈ کمانڈر سے ملے۔ اسے واجدہ کی گمشدگی کی رپورٹ دی۔ بریگیڈیئر نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ سول پولیس میں رپورٹ درج کروائیں اور ادھر ملٹری پولیس کو بھی واجدہ کی تلاش میں استعمال کیا جائے گا۔

واجدہ کے دونوں بھائی اُسی وقت چھاؤنی کے تھانے میں چلے گئے اور واجدہ کے اغوا کی رپورٹ لکھوائی۔ انہوں نے عثمان کے باپ اور بھائیوں پر پختہ شک لکھوا دیا اور وجہ یہ بتائی کہ واجدہ کو اس لئے اغوا کیا گیا ہے کہ وہ عثمان کے خلاف گواہی دینے کے لئے کورٹ مارشل میں نہ جا سکے۔ انہوں نے یہ بھی تھانیدار کو بتایا کہ واجدہ کے سسرال کی خاصی زیادہ اراضی نہری علاقے میں ہے اور کہا یہی جا سکتا ہے کہ واجدہ کو وہاں لے گئے ہیں اور کہیں چھپا دیا ہے۔

تھانیدار نے یہ ساری باتیں لکھ لیں لیکن اس کا انداز بتا رہا تھا کہ اسے کوئی جلدی نہیں نہ ہی یہ کوئی ایمرجنسی ہے۔ اتنے میں تھانیدار کے فون کی گھنٹی بجی۔ تھانیدار نے ریسیور اٹھایا اور سنتا رہا پھر بولا' آپ فکر نہ کریں' سر' میں اس خاتون کو زمین کی ساتویں تہہ کے نیچے سے بھی نکال لوں گا۔

"آپ نے اس بریگیڈیئر کی سفارش خواہ مخواہ ڈال دی ہے" ---- تھانیدار نے کہا ---- "اس تھانے میں سفارش نہیں چلا کرتی۔ میرا جو فرض ہے وہ تو میں نے پورا کرنا ہی ہے"۔

"یہ تو ہم جانتے ہیں صاحب!" ---- واجدہ کے ایک بھائی نے کہا ---- "ہم جانتے ہیں تھانے میں سفارش نہیں کچھ اور چلا کرتا ہے' ہم آپ کا حق آپ کو ادا کر دیں گے لیکن آپ فوری کارروائی شروع کر دیں"۔

"یہاں جو بھی آتا ہے فوری کارروائی کا مطالبہ کرتا ہے" ---- تھانیدار نے سپاٹ سے لہجے میں کہا ---- "میں کس کس واردات کی فوری کارروائی کروں گا .... قتل کے کیس ہیں' ڈکیتی کی وارداتیں ہیں' چوری چکاری اور اغوا کے اتنے کیس ہیں کہ آپ دیکھیں تو حیران رہ جائیں۔ آپ فکر نہ کریں' یہاں ذرا سی بھی کوتاہی نہیں ہو گی۔ آپ معزز لوگ ہیں اور مجھے آپ کی عزت کا پہلے ہی بہت خیال ہے۔ کل آ کر معلوم کر لیں کہ کچھ سراغ ملا ہے یا نہیں"۔

دونوں بھائی تھانے سے یہ تاثر لے کر نکلے کہ یہ تھانیدار کچھ بھی نہیں کرے گا اور یقیناً" عثمان کا باپ اس کے ساتھ پہلے ہی مُک مُکا کر گیا ہے اور پھر ان لوگوں نے واجدہ کو اغوا کیا ہے .... بھائیوں نے واجدہ کے بنگلے میں آ کر بریگیڈیئر کو فون پر بتایا کہ تھانیدار کا روّیہ کیا ہے اور اس نے کس طرح اس واردات کی رپورٹ غیر سنجیدگی سے لی ہے۔

بھائی نے بریگیڈئیر کو یہ بھی بتایا کہ واجدہ کا سُسر کس قدر اثر و رسوخ والا آدمی ہے اور یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے اپنا اثر و رسوخ پولیس پر چلا کر یہ واردات کروائی ہے۔

بریگیڈئیر نے اسے تسلّی دی اور کہا کہ وہ اب تھانے نہ جائے بلکہ بریگیڈئیر اپنے کسی آفیسر کو تھانیدار کے پیچھے ڈال دے گا۔ بھائی نے بریگیڈئیر سے کہا کہ پولیس اگر فوراً" ان لوگوں کے چک میں جا کر چھاپہ مارے تو واجدہ کو برآمد کیا جا سکتا ہے۔

بریگیڈئیر کو بھی غالباً" اندازہ نہیں تھا کہ پولیس کی من مانی کی کوئی حد نہیں اور یہ ملک پولیس راج کی سخت گرفت میں ہے۔ اثر و رسوخ کے ساتھ ساتھ واجدہ کے سُسرال کے ہاں دولت کا بھی کوئی حساب نہیں تھا۔ واجدہ کا سُسر پولیس کو اپنے رسوخ سے دبا بھی سکتا تھا اور پیسے کے زور سے خرید بھی سکتا تھا۔ پولیس اگر چھاپہ مارتی تو یہ ایک ناکام چھاپہ ہوتا کیونکہ تھانیدار پہلے ہی اطلاع بھجوا دیتا کہ وہ چھاپہ مارنے آ رہا ہے اور واجدہ کو وہاں سے لاپتہ کر دیا جائے۔

ایک امکان یہ بھی تھا کہ انڈیا کے جاسوسوں اور تخریب کاروں نے واجدہ کو اغوا کیا ہو گا کہ وہ کورٹ مارشل میں گواہی دینے کے لئے نہ جا سکے۔ ان کے لئے واجدہ کوئی اتنی اہم گواہ نہیں تھی۔ واجدہ کے بغیر بھی عثمان کے خلاف الزام آسانی سے ثابت کیا جا سکتا تھا اور اس کے لئے صغیر اور لُوسی اور ایک پاکستانی ایجنٹ کی شہادتیں کافی تھیں۔ واجدہ نے تو صرف تصدیق کرنی تھی کہ عثمان اور لُوسی کے آپس میں تعلقات تھے اور وہ سندھ کے علاقے میں اغوا ہوئے تو لُوسی نے انہیں رہائی دلوائی تھی۔ پھر بھی واجدہ اغوا ہوئی تھی اور یہ پولیس کا فرض تھا کہ اسے برآمد کروائے اور پولیس کو جو واضح اشارے دیئے گئے تھے ان پر عمل کرے۔

بریگیڈئیر نے ٹیلی فون پر اور واجدہ کے بھائیوں نے تھانے میں زبانی تھانیدار کو بتایا تھا کہ واجدہ کے اغوا کی وجہ اور اس کا پس منظر کیا ہے۔ تھانیدار کو بتایا گیا تھا کہ ہندوستان کا بڑا ہی خطرناک گروہ پکڑا گیا ہے جس نے پاکستان میں جاسوسی اور تخریب کاری اور دہشت گردی کی متعدد وارداتیں کی ہیں۔ واجدہ اس کیس میں ایک گواہ تھی اس لئے اسے غائب کر دیا گیا ہے اور اگر واجدہ کو اغوا کرنے والے پکڑے نہ گئے تو وہ دوسرے گواہوں کو بھی غائب کر دیں گے پھر ملک کے ان خطرناک دشمنوں کو سزا دلوانا ممکن نہیں

رہے گا مگر تھانیدار کو جتنا پیار اپنی تھانیداری اور پیسے کے ساتھ تھا اتنا پاکستان کے ساتھ نہیں تھا۔ اس طرح یہ ایک ہی نہیں نہ جانے کتنے تھانیدار اگر براہ راست نہیں تو وہ ملک کے دشمن عناصر اور دشمن کے جاسوسوں اور تخریب کاروں کے لئے زمین ہموار کر رہے تھے۔



واجدہ کے دونوں بھائی راولپنڈی چلے گئے اور آئی ایس آئی کے ڈائریکٹر جنرل کو بتایا کہ واجدہ اغوا ہو گئی ہے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ میجر عثمان کا باپ واجدہ کو گواہی دینے سے روک رہا تھا اور واجدہ نے انکار کیا تو اسے دھمکیاں دے کر چلا گیا تھا۔ شک نہیں بلکہ یقین یہ ہے کہ واجدہ کو اسی نے اغوا کروایا ہے۔ میجر جنرل کو یہ بھی بتایا گیا کہ متعلقہ تھانیدار کا روّیہ کیا ہے اور کس طرح وہ غیر سنجیدگی سے بات کرتا تھا۔

"مسز عثمان کی گواہی ہمارے لئے کوئی زیادہ اہمیت نہیں رکھتی" ــــ میجر جنرل نے کہا ــــ "لیکن اسے اس وجہ سے اغوا کرنا کہ وہ گواہی نہ دے سکے، ہمارے لئے بڑا ہی سنگین معاملہ ہے۔ میں اس سلسلے میں اپنی اتھارٹی استعمال کروں گا اور آپ کی بہن کو برآمد کروالوں گا"۔

میجر جنرل نے واجدہ کے بھائیوں کو رخصت کر دیا اور وفاقی وزیر داخلہ کو فون کیا۔ اس نے اس وزیر کو یہ ساری بات اور واردات سنائی اور کہا کہ لاہور چھاؤنی کی پولیس کو حکم دیا جائے کہ وہ اس خاتون کی برآمدگی میں ایک منٹ بھی ضائع نہ کرے۔ وزیر داخلہ نے میجر جنرل کو یقین دلایا کہ وہ ابھی حکم دیتا ہے اور یہ خاتون کل تک برآمد ہو جائے گی۔ وزیر داخلہ نے بالکل اسی طرح یقین دلایا تھا جس طرح وزیر تقریریں کیا کرتے ہیں اور اخباری بیان جاری کرتے ہیں۔ اسے تو معلوم ہو گا ہی لیکن میجر جنرل کو شاید معلوم نہیں تھا کہ حکم کتنی ہی اوپر سے کیوں نہ آئے تھانے میں جا کر یہ حکم کھوکھلے الفاظ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس تھانیدار کو معلوم تھا کہ اس نے اس حکم پر کس طرح عمل درآمد کرنا ہے اور کیا تحریری رپورٹ دینی ہے۔

میجر عثمان کا کورٹ مارشل شروع ہو گیا۔ پہلے روز اسے الزامات پڑھ کر سنائے گئے اور اس نے یہ الزامات تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اصل میں ملزم کو ایک تو فوجی وکیل ملتا ہے جو فوجی افسر ہی ہوتا ہے۔ عثمان کے باپ نے اس فوجی وکیل کے ساتھ ایک تجربہ

کار سولیئن ایڈووکیٹ کی خدمات بھی حاصل کر لی تھیں۔ پہلے روز الزامات پر اس ایڈووکیٹ نے الزامات کی تردید میں اپنی قابلیت کے جوہر دکھائے جو سب کے سب مسترد کر دیئے گئے۔

اس کے بعد روز بروز کارروائی شروع ہو گئی۔ لُوسی نے بڑی خوداعتمادی اور صداقت سے اپنا بیان دیا۔ ایڈووکیٹ نے اس پر جرح کی جو اس قدر طول پکڑ گئی کہ باقی تمام دن اسی جرح میں گزر گیا۔ لوسی کو چکر آنے لگے تھے لیکن وہ ثابت قدم رہی۔ صرف لوسی کی گواہی ہی عثمان کو سزا دلوانے کے لئے کافی تھی لیکن تمام گواہوں کو پیش کرنا ضروری تھا۔

تین چار دن گزر گئے۔ صغیر کی گواہی اور صفائی وکیل کی جرح میں دو دن گزر گئے۔

ایک روز وفاقی وزیر داخلہ کی طرف سے آئی ایس آئی کے ڈائریکٹر جنرل کو بذریعہ فون اطلاع ملی کہ لاہور پولیس نے نہری علاقے میں جا کر فلاں چک میں چھاپہ مارا ہے اور گھر گھر کی تلاشی لی ہے لیکن مغویہ برآمد نہیں ہو سکی اور پولیس نے اپنے مخبروں کے ذریعے یقین کر لیا ہے کہ مغویہ کو وہاں لے جایا ہی نہیں گیا۔

آئی ایس آئی کے میجر جنرل کو بتانے والا کوئی نہ تھا کہ یہ چھاپہ کس طرح مارا گیا اور مارا بھی گیا ہے یا نہیں، بہرحال لاہور سے تحریری رپورٹ آئی تھی کہ مغویہ متعلقہ چک میں لے جائی ہی نہیں گئی اور اس کی تلاش اور تفتیش جاری ہے۔

واجدہ اسی چک کے ایک مکان میں تھی۔ کچّا سا یہ مکان چک کے باہر کی طرف تھا جہاں آگے کھیت شروع ہو جاتے تھے۔ یہ عثمان کے خاندان کے مزارعوں میں سے ایک کا گھر تھا۔ یہیں اس خاندان کے مربعے تھے۔ واجدہ اس چک سے اور اس اتنی وسیع و عریض اراضی سے اچھی طرح واقف تھی۔ بارہا یہاں آئی تھی اور یہ جگہ اسے بہت ہی اچھی لگا کرتی تھی۔

واجدہ کو رات کے وقت اغوا کیا گیا اور رات ہی رات اس چک میں پہنچا دیا گیا تھا۔ اسے گھر سے اغوا کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ یہ عثمان کا ایک بھائی تھا جو رات لاہور عثمان کے گھر گیا اور واجدہ نے اس کا استقبال کیا تھا۔ اس وقت دونوں بچے سو گئے تھے۔ واجدہ کو معلوم تھا کہ عثمان کا بھائی کیوں آیا ہے۔ اسے توقع تھی کہ یہ بھائی باپ کی طرح اسے گواہی دینے سے روکے گا اور اس کو انکار پر دھمکیاں دے کر چلا جائے گا لیکن یہ

شخص بڑے خوش گوار موڈ میں آیا اور واجدہ کو بیڈ روم سے دوسرے کمرے میں بیٹھنے کے لئے لے گیا۔

جونہی واجدہ اس کمرے میں داخل ہوئی، عثمان کے بھائی نے پیچھے ہو کر واجدہ کی ناک پر ایک رومال رکھ دیا اور اسی طرح اسے دھکیلتا ہوا باہر لے گیا جہاں اس کے دو آدمی کھڑے تھے۔ گاڑی بالکل قریب کھڑی تھی۔ ان تینوں نے بڑے آرام سے واجدہ کو چلاتے ہوئے گاڑی میں بٹھا دیا قریب سے کوئی دیکھتا بھی تو اسے شک نہ ہوتا کہ یہ اغوا کی واردات ہو رہی ہے۔ گاڑی میں بیٹھنے تک واجدہ نیم بے ہوشی کی حالت میں تھی۔



واجدہ ہوش میں آئی تو اس نے لیٹے لیٹے اوپر پھر اِدھر اُدھر دیکھا۔ پہلے تو اسے خواب کا دھوکہ ہُوا لیکن ہوش پوری طرح ٹھکانے آئے تو اس پر حقیقت کھلی کہ وہ اپنے بنگلے میں نہیں اور یہ تو کوئی دیہاتی سا مکان ہے۔ وہ اٹھ بیٹھی۔

یہ واقعی ایک دیہاتی مکان تھا اور وہ غریبانہ سی ایک چارپائی پر پڑی تھی جس پر بستر بچھا ہوا تھا۔ ایک ہی اس کمرے کا دروازہ تھا جو اندر کی طرف کھلتا تھا۔ کوئی کھڑکی نہیں تھی۔ دروازہ بند تھا۔ واجدہ اٹھی اور دروازے کی طرف چلی تو اسے چکر سا آیا۔ ذرا رکی، سنبھلی اور دروازہ کھولنے لگی تو اسے باہر سے بند پایا۔ دروازے پر زور زور سے ہاتھ مارے تو کچھ دیر بعد دروازہ کھلا۔

دروازہ کھولنے والی ایک ادھیڑ عمر دیہاتن تھی۔ واجدہ نے اسے فوراً پہچان لیا۔ یہ ان کے مزارعوں کی ایک عورت تھی۔ واجدہ کئی بار یہاں آئی تھی اور اس عورت کو اس نے نہ صرف دیکھا تھا بلکہ اس عورت نے واجدہ کی خدمت کی تھی جس طرح نوکر کیا کرتے ہیں مگر اب اس عورت کے تیور کچھ اور ہی تھے۔

واجدہ نے اس عورت کے ساتھ ذرا دبدبے سے بات کی تو عورت نے کہا کہ اب یہاں اس کا حکم نہیں چلے گا بلکہ اس کا سُسر یعنی عثمان کا باپ وہیں ہے اور جو بھی ہو گا اس کے حکم سے ہو گا۔ یہ عورت یہ کہہ کر چلی گئی کہ وہ بڑے چوہدری صاحب کو اطلاع دے آتی ہے کہ بی بی جاگ اٹھی ہے۔ وہ جاتے ہوئے دروازہ پھر باہر سے بند کر گئی۔

زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ دروازہ پھر کھلا اور میجر عثمان کا باپ کمرے میں آیا۔ واجدہ چارپائی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اپنے سُسر کی تعظیم کے لئے نہ اٹھی اور سُسر ساتھ والی

چارپائی پر بیٹھ گیا۔ واجدہ کوئی بچی تو نہیں تھی' عقل و ہوش والی تھی' سمجھ چکی تھی کہ اسے اغوا کیا گیا ہے اور اغوا کی وجہ تو وہ جانتی ہی تھی۔ اس نے ذرا سا بھی واویلا نہ کیا' سُسر سے صرف یہ پوچھا کہ اس کے بچے کہاں ہیں۔ سُسر نے گول مول سا جواب دیا۔

"دیکھو بیٹی واجدہ!" —— سُسر نے کہا۔

"مجھے پھر بیٹی نہ کہنا" —— واجدہ نے کہا —— "آپ لوگوں کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں اور میں نہیں چاہتی کہ غداروں اور ملک دشمنوں کی بیٹی کہلواؤں .... اب بات کریں"۔

"نہ سہی!" —— سُسر نے کہا —— "میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ یہاں تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہو گی سوائے اس کے کہ تمہیں اسی کمرے میں رہنا پڑے گا۔ کورٹ مارشل کا فیصلہ ہوتے ہی تمہیں باعزت طریقے سے رخصت کر دیا جائے گا"۔

"میں آپ کو ایک خوش فہمی سے نکالنا چاہتی ہوں" —— واجدہ نے بڑے تحمل سے کہا —— "اگر آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ میں گواہی کے لئے کورٹ مارشل میں پیش نہیں ہوں گی تو عثمان بری ہو جائے گا تو یہ ایک خوش فہمی ہے اور بہتر ہے کہ اس خوش فہمی سے نجات حاصل کر لیں۔ میرے بچوں کو میرے پاس چھوڑ جائیں اور باقی عمر مجھے اسی کمرے میں پڑا رہنے دیں"۔

سُسر کے پاس بچوں کے متعلق کوئی تسلّی بخش جواب نہ تھا۔ بچوں سمیت تو ماں کو اغوا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ پھر بھی عثمان کے باپ کو بچوں کا کوئی غم نہ تھا' اتنا تو وہ جانتا تھا کہ بچوں کو واجدہ کے بھائی اپنے گھر لے جائیں گے۔ اسے غالباً" یہ توقع تھی کہ واجدہ اسے اس دیہاتی کمرے میں دیکھے گی تو اس پر برس پڑے گی۔ بد تمیزی کرے گی اور آزاد ہونے کو تڑپے گی اور واویلا بپا کر دے گی لیکن واجدہ نے صبر و تحمل کا دامن نہ چھوڑا۔

واجدہ نے اپنا دماغ حاضر رکھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ چیخنے چلاّنے سے اسے آزاد نہیں کر دیا جائے گا۔ آزادی اسے خود ہی حاصل کرنی تھی لیکن فوری طور پر اس کے دماغ میں کوئی ترکیب نہیں آ رہی تھی۔

عثمان کے باپ نے دیکھا کہ یہ تو بالکل ٹھنڈی ہے تو وہ مطمئن ہو گیا۔ وہ جانے کے لئے اٹھا اور مزارعہ عورت کو بلا کر کہا کہ بی بی کے لئے کھانا لے آؤ۔ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

واجدہ کے لئے کھانا آیا تو وہ دیکھ کر کچھ حیران ہوئی۔ اسے غالباً" یہ توقع تھی کہ بالکل

عام سا کھانا ہو گا لیکن یہ امیرانہ اور بڑا ہی پُر تکلّف کھانا تھا۔ واجدہ نے ایسا نہ کیا کہ احتجاجاً" کھانا ہی نہ کھاتی۔ اس نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ اسے صرف اپنے بچوں کا غم کھا رہا تھا لیکن اپنے آپ کو اس نے یہ تسلّی دی کہ بچے آخر ان کے بھی ہیں جنہوں نے اسے اغوا کیا ہے۔ یہ ان کے بیٹے کے بچے تھے۔ اگر بچوں کو یہاں نہیں لائے تو اس کے بھائی اور ماں باپ بچوں کو لے گئے ہوں گے۔

کھانے کے دوران مزارعہ عورت فرش پر قریب ہی بیٹھ گئی اور واجدہ سے معافیاں مانگتی رہی کہ اس سے کوئی بد تمیزی یا اونچ نیچ ہو جائے تو بی بی معاف کر دے کیونکہ اس وقت وہ بڑے چوہدری کے حکم کی پابند تھی۔ واجدہ نے ہنستے ہنستے مسکراتے ہوئے اسے تسلّی دی کہ وہ ایسی کوئی بات زبان پر نہ لائے نہ ہی واجدہ کو اس کے خلاف شکایت ہے۔

واجدہ دراصل اس عورت پر اپنا اعتماد جمانا چاہتی تھی۔ اس نے اس عورت سے کہا کہ رات کو کمرے کا دروازہ کھلا رکھے۔ عورت نے ہاتھ جوڑ کر اسے کہا کہ یہ ممکن نہیں ہو گا کیونکہ بڑے چوہدری نے خاص طور پر حکم دے رکھا تھا کہ رات کو دروازہ باہر سے بند رہے گا اور دن کے وقت دروازہ کھولا جا سکے گا اور واجدہ کو صحن میں گھومنے پھرنے اور بیٹھنے کی اجازت ہو گی۔ واجدہ نے کسی قسم کے ردِ عمل کا اظہار نہ کیا۔ وہ اس غریب عورت کو یہ تاثر دے رہی تھی کہ وہ اسی حال میں خوش ہے اور اس نے یہ صورتِ حال قبول کر لی ہے یا شاید اسے معلوم تھا کہ ایسا ہی ہو گا اور یہ اس کے لئے اچھا ہُوا ہے۔

وہ دن گزر گیا اور اس کے بعد جو رات آئی وہ بھی گزر گئی پھر اگلا دن طلوع ہُوا' دروازہ کھلا' واجدہ کے لئے بڑا اچھا ناشتہ آیا اور اس کے بعد واجدہ صحن میں ٹہلتی رہی اور دن اسی طرح چلتے پھرتے بیٹھتے اٹھتے لیٹتے گزار دیا اور ایک اور رات آ گئی۔



واجدہ اس علاقے سے اچھی طرح واقف تھی۔ اسے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ جس مکان میں وہ قید ہے یہ مکان گاؤں کی کس طرف ہے۔ یہ تو وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کے سُسر نے گاؤں سے اڑھائی تین فرلانگ دور اپنے لئے عارضی رہائش کا نہایت اچھا انتظام کر رکھا تھا۔ یہ چھوٹا سا ایک خوبصورت مکان تھا جس میں اس کا سُسر اور جو کوئی بھی آنا چاہتا آ کر رہتا تھا۔ واجدہ کو یہ بھی معلوم تھا کہ برانچ لائن کا ریلوے سٹیشن اس چک سے کم و بیش دو میل دور ہے۔ پھر واجدہ نے اس مکان میں دو چار اور چیزیں

بھی دیکھ لی تھیں۔

اُس رات وہ سوئی نہیں۔ رات جب تاریک ہو گئی تھی تو مزارعہ عورت نے دروازہ بند کر کے باہر سے کُنڈی چڑھا دی تھی۔ اس کُنڈی کے ساتھ تالہ نہیں لگایا جاتا تھا۔ واجدہ نے دن کو یہ کُنڈی دیکھ لی تھی۔ یہ زنجیر نہیں تھی بلکہ اس کی تین لمبی کڑیاں تھیں اور یہ دروازے کے درمیان میں دائیں سے بائیں کو لگتی تھی۔ رات ساڑھے دس اور گیارہ بجے کے درمیان کا وقت ہو گا جب واجدہ اٹھی اور دبے پاؤں کمرے کے دروازے تک گئی۔ دیہات کے لوگ سرِ شام کھانا کھا کر سو جانے کے عادی ہوتے تھے۔ دس ساڑھے دس بجے ان کے لئے نصف شب کا وقت ہوتا تھا۔ ہر سُو موت کا سکوت اور خاموشی طاری تھی جس میں واجدہ کو مزارعہ عورت کے خراٹے سنائی دے رہے تھے۔ وہ صحن میں سوئی ہوئی تھی۔

واجدہ نے دروازے کے ایک کواڑ کو نہایت آہستہ سے باہر کی طرف دبایا اور دوسرے کواڑ کو اندر کی طرف کھینچا۔ دونوں کواڑوں میں اتنا فاصلہ ہو گیا جس میں ایک ہاتھ سیدھا کر کے باہر نکالا جا سکتا تھا۔ دیہات کے کواڑ ایسے ہی ہُوا کرتے ہیں۔ واجدہ نے ہاتھ پھیلا کر باہر کیا تو اس کی انگلیاں باہر کی کُنڈی تک پہنچ گئیں۔ اس نے نہایت آسانی سے کُنڈی الگ کر لی لیکن اسے چھوڑا نہیں کیونکہ چھوڑنے سے یہ آواز پیدا کرتی۔

کُنڈی الگ ہوتے ہی ایک طرف کا کواڑ اندر کو آ گیا۔ واجدہ نے دونوں کواڑوں کو پکڑ کر نہایت آرام سے پیچھے کیا اور باہر نکل گئی۔

دن کے وقت واجدہ نے اپنے کام کی ایک اور چیز دیکھ لی تھی۔ یہ درخت کی خشک اور ذرا موٹی ٹہنی تھی جو ڈنڈے کی شکل میں تراشی ہوئی تھی۔ اس نے جا کر یہ ڈنڈا اٹھایا اور دبے پاؤں صحن میں سوئی ہوئی عورت کی طرف گئی۔ چاند نے رات کو روشن کر رکھا تھا۔

اس پر پہرہ دینے والی یہ عورت ایک پہلو کے بل گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔ اس کے خراٹے بتا رہے تھے کہ یہ اتنی آسانی سے جاگے گی نہیں لیکن اسے سوتا چھوڑ کر فرار ہونا خطرے سے خالی نہ تھا۔ ذرا سی آہٹ پر اس کی آنکھ کھلنے کا خطرہ موجود تھا۔

واجدہ اردو اور انگریزی کے ناول پڑھتی رہتی تھی اور اس نے انگریزی فلمیں بھی دیکھی تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ کسی کو کچھ دیر کے لئے کس طرح بے ہوش کیا جا سکتا ہے۔

اس نے مزارعہ عورت کے سر کے پچھلے حصے پر پوری طاقت سے ڈنڈا مارا۔ عورت نے ذرا سا سر اٹھایا اور اس کا سر پھر تکیے پر گر پڑا۔ اس کی پوزیشن میں اتنی سی تبدیلی آئی کہ پہلے وہ ایک پہلو پر سوئی ہوئی تھی اور اب پیٹھ کے بل ہو گئی' اس کے جسم نے کوئی اور حرکت نہ کی جو ثبوت تھا کہ وہ بے ہوش ہو گئی ہے۔

واجدہ نے بڑے آرام سے باہر والا دروازہ کھولا اور باہر نکل گئی۔ اس کے لئے سہولت یہ تھی کہ یہ مکان چک کے باہر کی طرف تھا اور اس کے ساتھ سے ہی کھیت شروع ہو جاتے تھے۔ فصل خاصی اونچی ہو گئی تھی لیکن چاندنی کی وجہ سے وہ کچھ دور سے نظر آ سکتی تھی۔ اس کے کندھے اور سر دکھائی دے رہے تھے۔ وہ جھکی جھکی نہ چلی بلکہ بڑے اعتماد اور تحمّل سے چلتی گئی۔ وہ پگڈنڈیوں پر جا رہی تھی۔ اس کا رخ ریلوے سٹیشن کی طرف تھا۔

وہ بار بار پیچھے مُڑ مُڑ کر دیکھتی تھی۔ اس کے تعاقب میں کوئی نہیں آ رہا تھا۔ اس کے سامنے دو میل کا سفر تھا۔ وہ گاؤں سے اتنی دُور چلی گئی تھی کہ کم از کم گاؤں کی چھت پر کھڑے ہو کر بھی دیکھنے والوں کو نظر نہیں آ سکتی تھی۔ اس نے رفتار تیز کر لی۔

تقریباً" آدھا سفر طے ہو چکا تھا کہ اس کے راستے میں پگڈنڈی آ گئی۔ یہ عام راستہ تھا جس پر تانگے اور ریڑھے چلتے تھے۔ یہ پگڈنڈی ریلوے سٹیشن تک جاتی تھی لیکن اس پر چلنے سے خطرہ تھا کیونکہ یہ عام گزر گاہ تھی اور واجدہ کو راستے میں کوئی بھی آدمی دیکھ سکتا اور کسی نہ کسی قسم کی رکاوٹ پیدا کر سکتا تھا۔ واجدہ کو یہ تو اندازہ تھا کہ ریلوے سٹیشن کس سمت کو ہے۔

وہ پگڈنڈی پر پہنچی اور اسے کراس کر کے سامنے والے کھیتوں کی مینڈھوں پر پہنچی تو اچانک ایک طرف سے آواز آئی ——— "ٹھہر جا' کون ہے تُو!"

واجدہ نے اس طرف دیکھا تو دو آدمی بڑی تیزی سے اس کی طرف آ رہے تھے۔ واجدہ نے اس صورتِ حال میں بھی اپنا دماغ حاضر رکھا۔ بھاگنے کی بجائے وہ رک گئی۔ چاندنی میں اسے صاف نظر آ گیا کہ یہ دونوں دیہاتی اور جوان سال بھی ہیں۔

واجدہ ساتھ ہی ایک درخت کے تنے کے ساتھ پیٹھ لگا کر کھڑی ہو گئی۔ وہ چھپی نہیں تھی بلکہ ان کے سامنے کھڑی تھی۔ وہ آدمی قریب آئے تو واجدہ نے بڑی ہی خوفناک چیخ ماری اور اپنے دونوں بازو پھیلا کر انگلیاں اس طرح ٹیڑھی کر لیں جیسے ان

دونوں کو چیر پھاڑ دے گی۔

وہ دونوں رک گئے۔ واجدہ اور زیادہ چیختی ہوئی ان کی طرف دوڑی جیسے ان پر حملہ کرنا چاہتی ہو۔

وہ دونوں اسے چڑیل سمجھ کر پیچھے کو بھاگ اٹھے۔ واجدہ نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا' چیخیں مارتے ہوئے ان کے تعاقب میں رہی۔ ان میں ایک آدمی تھوڑی ہی دور جاکر گر پڑا۔ واجدہ اس کے پاس جاکر رک گئی۔ وہ خوف زدگی کو برداشت نہ کر سکا اور بے ہوش کر گر پڑا تھا۔ دوسرا تو ہوا سے باتیں کرتا چاندنی میں تحلیل ہو گیا۔

اگر واجدہ ان آدمیوں کو ڈرانے کی بجائے خود ڈر جاتی تو یہ آدمی نہ جانے اس کے ساتھ کیا سلوک کرتے اور اس کے ارادے دھرے کے دھرے رہ جاتے۔ اس کی کامیابی کا باعث صرف یہ تھا کہ اس نے خوف و ہراس کو قبول نہ کیا اور پورے اعتماد سے اپنے دماغ کو بیدار رکھا اور اپنے راستے پر چلتی گئی۔ ان آدمیوں کو دیکھ کر اسے فوراً خیال آگیا کہ دیہاتی لوگ چڑیل کے وجود کو مانتے ہیں اور یہ بھی کہ چڑیل رات کے وقت راہ جاتے کسی مسافر کو نظر آتی ہے۔ واجدہ جس طرح چیخی تھی وہ عام انسانی چیخ نہیں تھی۔ پھر اس نے جس طرح اپنے بازو پھیلائے اور اپنے پنجے بنائے اس سے تو ان آدمیوں کو یقین ہو گیا تھا کہ یہ کوئی عورت نہیں چڑیل ہے۔ آدھی رات کے وقت اس ویرانے میں کوئی عورت اکیلی نہیں جا سکتی تھی سوائے چڑیل کے۔

آخر واجدہ پگڈنڈی سے ہٹ کر کھیتوں میں چلتی ہوئی ریلوے سٹیشن تک پہنچ گئی۔ یہ چھوٹا سا اسٹیشن تھا جس کی ٹکٹوں والی کھڑکی بند تھی۔ وہ سٹیشن ماسٹر کے دفتر میں گئی تو وہاں اسے ایک آدمی بیٹھا ملا۔ اس سے واجدہ نے پوچھا کہ لاہور کو گاڑی کس وقت جائے گی' جائے گی بھی یا نہیں۔ اس آدمی نے بتایا کہ ایک گھنٹے تک ایک گاڑی گزرے گی جو صبح لاہور پہنچے گی۔

واجدہ نے اس سے پوچھا کہ وہ کون ہے۔ وہ دراصل سٹیشن ماسٹر سے ملنا چاہتی تھی۔ یہ شخص سٹیشن ماسٹر نہیں تھا۔ اس نے اسے بتایا کہ سٹیشن ماسٹر گھر سویا ہوا ہے۔ واجدہ نے اسے کہا کہ وہ سٹیشن ماسٹر سے ملنا چاہتی ہے اور یہ آدمی اسے سٹیشن ماسٹر کے گھر تک پہنچا دے لیکن یہ آدمی ٹس سے مس نہیں ہو رہا تھا واجدہ نے جب اصرار کیا تو اس آدمی نے کہا کہ وہ بتائے تو سہی کہ اس کا مسئلہ کیا ہے' ہو سکتا ہے وہ سٹیشن ماسٹر کے

بغیر ہی اس کی کچھ مدد کر سکے۔

واجدہ نے دیکھا کہ یہ کوئی ٹھیک آدمی معلوم ہوتا ہے اور اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے۔

واجدہ دراصل یہ خطرہ محسوس کر رہی تھی کہ وہ ایک گھنٹہ ریلوے سٹیشن پر رہی تو اس دوران اس کے تعاقب میں کوئی آ جائے گا۔ مزارعہ عورت کو زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ بعد ہوش میں آ جانا تھا۔ واجدہ چاہتی یہ تھی کہ اسے ریلوے سٹیشن پر چھپنے کی کوئی جگہ مل جائے اور گاڑی آئے تو وہ اس میں سوار ہو جائے۔ اس کی دوسری مشکل یہ تھی کہ اس کے پاس ٹکٹ خریدنے کے لئے ایک پیسہ بھی نہیں تھا۔

اس نے اُسی آدمی کو دفتر سے اٹھایا اور الگ اندھیرے میں لے جا کر اپنا تعارف کرایا اور پھر یہ بتایا کہ وہ اغوا ہوئی تھی اور پھر اغوا کی وجہ بتائی اور پھر یہ بتایا کہ وہ کس طرح فرار ہو کر آئی ہے۔ اس نے آخر یہ کہا کہ اگر اس آدمی نے اس کی مدد نہ کی اور وہ گواہی دینے کے لئے راولپنڈی نہ پہنچ سکی تو اس کی ذمہ داری اس آدمی پر عائد ہو گی اور اس کی اسے بڑی سخت سزا ملے گی۔

"محترمہ!" ـــــ اس شخص نے کہا ـــــ "آپ اتنی زیادہ پریشان کیوں ہوئی جا رہی ہیں۔ میں بھی پاکستانی ہوں اور پاکستان کی محبت صرف مجھ جیسے غریبوں کے دلوں میں رہ گئی ہے۔ آپ نے ہندوستانی جاسوسوں' تخریب کاروں اور دہشت گردوں کی بات کی ہے۔ میرا بس چلے تو میں اپنے ہاتھوں انہیں گولی ماروں .... آپ صرف یہ بتا دیں کہ آپ چاہتی کیا ہیں!"

"پہلی بات یہ کہ گاڑی آنے تک مجھے چھپا کر رکھیں" ـــــ واجدہ نے کہا ـــــ "یہ اس لئے کہ میرے تعاقب میں کوئی آ گیا تو میں اپنے مشن میں ناکام ہو جاؤں گی۔ دوسری ضرورت یہ ہے کہ میرے پاس پیسے نہیں۔ مجھے لاہور تک کا ٹکٹ دے دیں۔ میرے کانوں میں رِنگ دیکھ لیں' انگلیوں میں سونے کی دو انگوٹھیاں ہیں اور یہ دیکھیں دو کڑے میرے بازوؤں میں ہیں ان میں سے جو چیز آپ کو اچھی لگتی ہے لے لیں اور مجھے ٹکٹ دے دیں۔ جب گاڑی آئے تو میرے اوپر کھیس یا کمبل ڈال کر گاڑی میں سوار کرا دیں"۔

"مجھے اتنا کمینہ نہ سمجھو بہن!" ـــــ سٹیشن کے سٹاف کے اس آدمی نے کہا ـــــ "ایک عورت ایسے قومی جذبے اور جرأت کا مظاہرہ کر سکتی ہے تو میں مرد ہوں۔ میں اپنی

حیثیت سے زیادہ آپ کے ساتھ تعاون کروں گا۔ مجھے سونے کے زیورات کا لالچ نہ دیں، آپ کو لاہور کا ٹکٹ مل جائے گا اور آپ کے تعاقب میں یہاں کوئی آ بھی گیا تو آپ اسے نظر نہیں آسکیں گی۔ میرے ساتھ آئیں"۔

یہ شخص واجدہ کو ساتھ ہی ایک کمرے میں لے گیا جس میں دو کرسیاں اور ایک بنچ پڑا تھا۔ اس نے واجدہ کو وہاں بٹھادیا اور کہا کہ وہ بے فکر ہو کر یہاں بیٹھی رہے۔ واجدہ نے اسے کہا کہ وہ کاغذ پنسل لے آئے اور اس کا لاہور کا فون نمبر اور ایڈریس لکھ لے۔ وہ آدمی اس پر آمادہ نہیں ہو رہا تھا لیکن واجدہ نے اتنا اصرار کیا کہ وہ آدمی کاغذ قلم لے آیا۔ واجدہ نے ایک تو اسے اپنے والدین کے گھر کا فون نمبر دیا اور دوسرا اپنے سرکاری کوارٹر کا نمبر دے دیا۔ یہ بھلا آدمی کچھ دیر واجدہ کے پاس بیٹھا رہا اور پھر یہ کہہ کر چلا گیا کہ اسے اپنی ڈیوٹی پر حاضر رہنا چاہئے۔ پھر وہ دو تین مرتبہ واجدہ کو دیکھنے آیا اور اسے تسلّی دے کر چلا گیا۔

○

اللہ کی راہ میں قربانیاں دینے والوں کو اللہ اپنی مدد سے محروم نہیں رکھا کرتا۔ ایک گھنٹے بعد گاڑی آگئی۔ وہ آدمی ایک کمبل لے کر واجدہ کے پاس گیا اور کمبل اسے اوڑھا کر لاہور کا ٹکٹ اس کے ہاتھ میں دیا اور ساتھ ہو کر اسے زنانہ ڈبے میں سوار کرا دیا۔ واجدہ نے کمبل اسے واپس کر دیا اور گاڑی چل پڑی۔

گاڑی صبح آٹھ بجے کے لگ بھگ لاہور پہنچی۔ واجدہ ریلوے سٹیشن سے نکلی اور ٹیکسی لے کر اپنے والدین کے گھر جا پہنچی اور وہاں سے پیسے لے کر ٹیکسی والے کو دیئے۔ اس کے بچوں نے اسے دیکھا تو خوشی سے چیختے چلّاتے اس کے ساتھ چپک گئے۔ واجدہ نے جی بھر کر ان سے پیار کیا۔

پھر اپنے ماں باپ کو بتایا کہ اسے عثمان کے بھائی نے کس طرح اغوا کیا تھا، کہاں پہنچا دیا اور پھر سسر اسے وہاں ملا اور اس نے کیا کہا اور پھر واجدہ نے اپنے والدین کو بتایا کہ وہ کس طرح فرار ہو کر آئی ہے۔

اس کے دونوں بھائی عثمان کے کورٹ مارشل کے سلسلے میں راولپنڈی گئے ہوئے تھے۔ وہ عثمان کے خلاف استغاثہ کے گواہ تھے۔ باپ نے واجدہ کو بتایا کہ وہ کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں اور اس جگہ کا فون نمبر بھی بتایا۔ واجدہ نے اسی وقت راولپنڈی جانے کی

تیاری شروع کر دی۔ باپ سے کہا کہ وہ پی آئی اے کو فون کر کے آج کی کسی فلائیٹ میں سیٹ بک کروا دے۔ باپ نے فون کیا تو اسی شام کی سیٹ مل گئی۔

شام کو واجدہ جب اسلام آباد ایئرپورٹ سے باہر نکلی تو دونوں بھائی، میجر سمیع اور کیپٹن آصف اس کے استقبال کے لئے کھڑے تھے، انہیں واجدہ کے باپ نے پہلے ہی فون کر دیا تھا۔ بھائیوں نے اسے بتایا کہ اس کے اغوا کی اطلاع آئی ایس آئی کے ڈائریکٹر جنرل کو دے دی گئی تھی اور جب یہ اطلاع ملی کہ وہ لاہور گھر پہنچ گئی ہے تو انہوں نے ڈائریکٹر جنرل کو فون پر بتا دیا تھا۔ ڈائریکٹر جنرل نے کہا تھا کہ جونہی وہ راولپنڈی پہنچے اسے اس کے گھر لایا جائے۔ چنانچہ یہ سب ایئرپورٹ سے سیدھے آئی ایس آئی کے ڈائریکٹر جنرل کے گھر جا پہنچے۔

واجدہ نے ڈائریکٹر جنرل کو تفصیل سے سنایا کہ اسے عثمان کے بھائی نے اغوا کیا تھا اور اس کے ساتھ دو آدمی تھے۔ پھر اس نے بتایا کہ اسے کہاں ہوش آئی اور اپنے سسر کو وہاں پایا اور پھر واجدہ نے اپنے فرار کی ساری تفصیل سنائی۔

جنرل نے حیرت زدگی کے عالم میں واجدہ کو بے ساختہ خراجِ تحسین پیش کیا۔

کیا آپ نے کبھی ایک بات پر غور کیا ہے؟" ــــ "جنرل نے کہا ــــ "آج ہم اس دور میں سے گزر رہے ہیں کہ کسی میں اس قسم کا جذبہ دیکھتے ہیں تو حیران ہوتے ہیں کہ ایسا بھی کوئی انسان ہے جس نے ایسے قومی جذبے کو زندہ رکھا ہوا ہے۔ یہ تو ہر مومن کا جذبہ تھا اور اسی جذبے کا کرشمہ تھا کہ ایران اور روم کی اتنی بڑی جنگی طاقتیں مومنین کے آگے اس طرح کچلی مسلی گئیں جس طرح سورج کی تمازت سے شبنم بھاپ بن کر اڑ جاتی ہے۔ اگر آج ہماری ساری قوم میں یہی جذبہ پیدا ہو جائے تو اس ملک میں ہمارے دشمن کا ایک بھی جاسوس اور تخریب کار زندہ نظر نہ آئے"۔

اس کے بعد اس پاکستانی جرنیل نے کہا کہ عثمان کے بھائی اور باپ نے واجدہ کو اغوا کر کے بڑے ہی سنگین جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ یہ صرف اغوا کی واردات نہیں بلکہ یہ ملک کے دشمن کے ایجنٹوں کو سزا سے بچانے کا جرم ہے۔

"کل تک ان سب کو ہتھکڑیاں لگ جائیں گی" ــــ آئی ایس آئی کے ڈائریکٹر جنرل نے کہا ــــ "میں ان سب پر ایک الزام یہ بھی عائد کروا لوں گا کہ یہ انڈیا کے ایجنٹ ہیں"۔

میجر جنرل نے صرف کہا ہی نہیں بلکہ کر کے بھی دکھا دیا۔ آئی ایس آئی کی اہمیت اور اتھارٹی سے سب واقف تھے۔ اس ڈائریکٹر جنرل نے فوج کے کمانڈر انچیف کو فون پر یہ واردات بتائی۔ کمانڈر انچیف کو معلوم تھا کہ انڈیا کے ایک رِنگ کے بڑے اہم اور خطرناک افراد پکڑے گئے ہیں جن میں ایک پاکستانی ایجنٹ میجر عثمان بھی ہے اور اس میجر کا کورٹ مارشل ہو رہا ہے۔ کمانڈر انچیف نے اسی وقت وزیر اعظم کو فون پر بتایا اور عثمان کے باپ اور بھائیوں کے نام اور ایڈریس بتا کر کہا کہ پولیس کو حکم دیا جائے کہ انہیں فوراً گرفتار کر لیں اور ان کے خلاف باقاعدہ مقدمہ چلایا جائے۔ کمانڈر انچیف نے وزیر اعظم کو یہ بھی بتایا کہ اس واردات کا تعلق جاسوسی کے ساتھ ہے اور اسے کوئی عام سا جرم نہ سمجھا جائے۔

وزیر اعظم نے اسی وقت متعلقہ حکام کو حکم دے دیا۔ پھر ویسے ہی ہُوا جیسے آئی ایس آئی کے ڈائریکٹر جنرل نے کہا تھا۔ اگلی شام تک اس نے واجدہ اور اس کے بھائیوں کو بتایا کہ میجر عثمان کے باپ اور اس بھائی کو گرفتار لیا گیا ہے جس نے واجدہ کو اغوا کیا تھا۔

"مسز عثمان!" ــــ میجر جنرل نے واجدہ سے کہا۔

"جنرل صاحب!" ــــ واجدہ نے کہا ــــ "میں قطع کلامی کی معافی چاہتی ہوں، میرا نام واجدہ ہے مجھے مسز عثمان نہ کہیں۔ میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں اور اب پھر کہتی ہوں کہ عثمان میرا خاوند نہیں رہا کیونکہ وہ میرے وطن اور میرے دین کے دشمنوں کا آدمی ہے اور میں اسے اسلام سے خارج سمجھتی ہوں.... اب فرمایئے، آپ کچھ کہنے لگے تھے"۔

"میں آپ کے جذبے اور جذبات کی بہت ہی قدر کرتا ہوں واجدہ صاحبہ!" ــــ میجر جنرل نے کہا ــــ "میں کہنے لگا تھا کہ ابھی تو آپ اپنے خاوند کے خلاف گواہی دے رہی ہیں پھر آپ کو خاوند کے باپ اور بھائی کے خلاف بھی گواہی دینی پڑے گی"۔

"جنرل صاحب!" ــــ واجدہ نے کہا ــــ "گواہی تو میں دوں گی ہی لیکن ان لوگوں کا اثر و رسوخ اتنا زیادہ ہے کہ پولیس کے ذریعے قانون کو اپنے سانچے میں ڈھال لیتے ہیں۔ ان کے پاس روپیہ پیسہ اتنا ہے کہ عدل و انصاف کو خرید سکتے ہیں۔ کیا آپ کے پاس اس کا کوئی توڑ، کوئی علاج ہے؟"

"نہیں!" ــــ آئی ایس آئی کے اس میجر جنرل نے کہا ــــ "اس مُلک کے عدل و انصاف کا نظام ایسی ڈگر پر چل رہا ہے جو اثر و رسوخ، روپے پیسے اور مُک مکا کی بنائی ہوئی

ڈگر ہے۔ بہر حال میں ان ملزموں کو بچنے نہیں دوں گا جنہوں نے میجر عثمان کو بچانے کی کوشش میں آپ کو اغوا کیا تھا"۔



میجر عثمان کا کورٹ مارشل چل رہا تھا۔ نہایت اہم اور پُراثر گواہ پیش ہو چکے تھے۔ میجر عثمان کے وکیل نے انہیں توڑنے کے لئے اپنے تجربے کا استعمال بڑی ہی کاوش سے کیا تھا لیکن حقیقت پر پردہ نہ ڈالا جا سکا نہ حقیقت کو جھٹلایا جا سکا۔ پھر واجدہ میجر عثمان کے خلاف پیش ہوئی۔

واجدہ کا بیان اس نوعیت کا تھا کہ اس سے لُوسی کی شہادت کو تقویت ملتی تھی۔ واجدہ نے اپنے بیان میں سندھ کے علاقے میں اپنی پوری فیملی کے اغوا کی واردات سنائی اور کہا کہ اچانک وہاں لُوسی پہنچی اور اس نے پہلی دفعہ اس لڑکی کو دیکھا۔ اس طرح واجدہ نے ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی کہ عثمان کے اس لڑکی لُوسی کے ساتھ بڑے ہی گہرے اور رازدرانہ تعلقات تھے۔ ایک موقع پر واجدہ جذباتی ہو گئی اور اس کے آنسو بہہ نکلے۔ اس نے کہا کہ وہ اپنے وطن پر اپنے خاوند کو تو قربان کر ہی چکی ہے وہ اپنے بچوں کو اور اپنی جان کو بھی قربان کر دینے کے لئے تیار رہتی ہے۔

واجدہ کی گواہی نے رِقت آمیز منظر پیدا کر دیا جس سے کورٹ مارشل کا پریذیڈنٹ اور ممبر متاثر ہوتے نظر آ رہے تھے۔ صفائی کے وکیل نے واجدہ پر ایسے ایسے سوالوں کی بوچھاڑ کر دی جو شاید ہی کوئی عورت برداشت کر سکتی ہو۔ وکلاء کو اجازت ہوتی ہے کہ وہ جیسا بھی سوال پوچھنا چاہیں پوچھ سکتے ہیں خواہ وہ فحش اور عریاں ہی کیوں نہ ہوں۔ عثمان کے وکیل نے واجدہ پر ایسے سوال بھی کئے جیسے واجدہ کے کسی اور کے ساتھ ناجائز تعلقات تھے اور اس وجہ سے وہ عثمان کو پسند نہیں کرتی تھی۔

واجدہ نے بڑے تحمل اور بردباری سے ان الزامات کی تردید کی اور ایک موقع پر اس نے وکیل سے کہا کہ اگر آپ مجھے یہ دھمکی دیں کہ میں اس بیان سے باز آ جاؤں ورنہ میرے کپڑے اتار کر مجھے باہر کھڑا کر دیا جائے گا تو میں خود ہی اپنے کپڑے اتار کر باہر کھڑی ہو جاؤں گی لیکن اپنی صداقت اور وطن کی محبت سے دست بردار نہیں ہوں گی۔

صغیر کا بیان ایسا تھا جس میں اس کی انڈیا جانے، گولی سے زخمی ہونے اور انبالہ ملٹری ہسپتال میں پہنچنے اور وہاں سے فرار ہونے کا ذکر تھا اس لئے بیان کے اس حصے کی تصدیق

ضروری تھی ورنہ صفائی کا وکیل اسے حذف کروا سکتا تھا۔ اس کی تصدیق کے لئے ڈاکٹر رشید اور خالدہ موجود تھے۔

ڈاکٹر رشید اور خالدہ کی بھی پیشی ہوئی اور انہوں نے بیان دیئے اور صفائی کے وکیل کا سامنا ثابت قدمی سے کیا۔ صداقت اور حقیقت اپنا آپ خود ہی منوا لیا کرتی ہے۔ ان سب کے سروں پر اللہ تعالیٰ کا ہاتھ تھا اور اللہ ہی ان کی رہنمائی کر رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کو کورٹ میں جھٹلایا نہ جا سکا۔

مقدمے کی سماعت کے دوران تمام گواہوں کو باہر موجود رہنا پڑتا تھا وہاں صغیر نے ڈاکٹر رشید اور خالدہ کا تعارف لُوسی سے، واجدہ سے اور اس کے بھائیوں سے کروایا۔ ان سب کا جذبہ ایک تھا۔ لُوسی تو کچھ زیادہ ہی متاثر ہوئی جا رہی تھی۔

ڈاکٹر رشید کو راولپنڈی کے ایک سرکاری ہسپتال میں باقاعدہ نوکری مل گئی تھی اور خالدہ کو بھی اس ہسپتال میں نوکری مل گئی۔ وہ تجربہ کار نرس تھی۔ تجربہ کار نہ ہوتی تو بھی وہاں کے ڈاکٹر اسے ہسپتال کے سٹاف میں کھپا لیتے۔ ان ڈاکٹروں نے ڈاکٹر رشید اور خالدہ کی قدر ایسے دل و جان سے کی اور ان دونوں کو اپنے ساتھ اس طرح شیر و شکر کر لیا جیسے یہ دونوں انہی کے ساتھ پل کر جوان ہوئے ہوں۔

ڈاکٹروں نے ان دونوں کی محبت کی داستان بھی ان کی زبانی سنی تھی اور پھر انہوں نے صغیر کو جس طرح فرار کروایا تھا، وہ واقعہ بھی تفصیل سے سنا تھا جو ایک بے مثال کارنامہ تھا۔ ان سب ڈاکٹروں نے ان دونوں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اب شادی کر لیں۔ شادی تو انہیں کرنی ہی تھی لیکن ڈاکٹر رشید کو سُوجھ نہیں رہی تھی کہ کہاں اور کس طرح کی جائے۔ یہ اہتمام اس ہسپتال کے ڈاکٹروں نے کر دیا اور ایک روز ایک نکاح خواں کو لا کر باقاعدہ نکاح پڑھوا دیا گیا اور ڈاکٹروں نے باقاعدہ ولیمے کا اہتمام بھی کیا۔ انہوں نے اس جوڑے کو ایسے تحفے دیئے کہ ان کے گھر کا فرنیچر پورا ہو گیا بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ انہوں نے اس جوڑے کا گھر آباد کر دیا اور ضرورت کی ہر چیز مہیا کر دی۔

واجدہ، اس کے بھائیوں، ڈاکٹر رشید اور خالدہ کو بتایا گیا کہ لُوسی مسلمان ہو گئی ہے۔ یہ بھی بتایا گیا کہ صغیر نے اپنے ہاتھ پر اسے حلقہ بگوشِ اسلام کیا ہے۔ اور اب اس کا نام لُوسی نہیں سلمیٰ ہے۔ سب نے کہا کہ یہ ضروری نہیں تھا کہ کسی مولوی کے ہاتھ سے یہ رسم ادا ہوتی۔ یہ تو نیت کا معاملہ ہوتا ہے۔

"واجدہ باجی!" ——— ایک روز جب کورٹ مارشل چل رہا تھا اور یہ سب باہر بیٹھے تھے، لُوسی نے واجدہ سے کہا ——— "کیا آپ نے مجھے معاف کر دیا ہے؟ .... خدا کی قسم میں آپ جیسی بننا چاہتی ہوں۔ آپ کی مدد اور رہنمائی کی محتاج ہوں"۔

واجدہ نے اسے کہا کہ معاف کرنے والا صرف اللہ ہے۔ اگر نیّت صحیح ہے اور دل میں اللہ کا نام ہے تو وہ کبیرہ گناہ بھی معاف کر دیتا ہے۔ اس طرح واجدہ نے لُوسی سے کئی ایک باتیں کیں اور اسے یہ نصیحت کی کہ وہ اب اپنے آپ کو مسلمانوں جیسا بنائے۔

لُوسی نے اپنا وہی مسئلہ چھیڑ دیا کہ اسے انڈیا بھیج دیا جائے گا اور وہ وہاں نہیں جانا چاہتی۔ اس نے واجدہ سے کہا کہ وہ صغیر سے کہے کہ اس کے ساتھ شادی کر لے۔

صغیر وہیں موجود تھا۔ واجدہ نے صغیر کو پاس بلا لیا اور لوسی کی بات اس کے ساتھ کی۔ صغیر حقیقت پسند آدمی تھا۔ اس نے کہا کہ وہ انکار تو نہیں کر رہا، وہ یہ سوچ رہا ہے کہ لُوسی کو اپنے ملک میں کس طرح رکھ سکے گا اور پھر رکھے گا کہاں، اس کے گھر والے تو اسے دھتکار چکے ہیں اور ہو سکتا ہے وہ اسے اپنے گھر میں داخل ہی نہ ہونے دیں۔ باتوں باتوں میں صغیر نے کھل کر کہہ دیا کہ اُس کے دل میں لوسی کی محبت پیدا ہو چکی ہے اور اگر لُوسی چلی گئی تو وہ یہی سمجھے گا کہ اس سے لُوسی چھین لی گئی ہے۔

"اگر میرے اس کارنامے پر کوئی مجھے انعام دینا چاہے" ——— صغیر نے کہا ——— "تو میں کہوں گا کہ مجھے انعام ہی دینا ہے تو لوسی مجھے دے دو"۔

واجدہ نے کہا کہ وہ اپنے بھائیوں کے ساتھ بات کرے گی اور پھر آئی ایس آئی کے ڈائریکٹر جنرل سے بات ہو گی اور جتنا اثر و رسوخ استعمال کرنا پڑا وہ کیا جائے گا اور لُوسی کو انڈیا نہیں جانے دیا جائے گا۔

صغیر یہ بات واجدہ کے بھائیوں کے ساتھ کر چکا تھا اور پھر اس نے آئی ایس آئی کے کرنل کے ساتھ بھی بات کی تھی اور پوچھا تھا کہ لُوسی کی اس کے ساتھ شادی ہو جائے تو کیا لُوسی کو پاکستان کی شہریت مل جائے گی؟

"شاید نہیں" ——— کرنل نے کہا ——— "لُوسی کی حیثیت ایک ملزم کی ہے۔ اسے وعدہ معاف گواہ بننے کے عوض سزا سے معافی ملی ہے جس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کے خلاف کوئی جرم ثابت نہیں ہو سکا۔ اس نے اپنے جرائم خود ثابت کر دیئے ہیں۔ ایسے کسی غیر ملکی ملزم کو ملک میں نہیں رکھا جا سکتا، یہ توقع رکھی جا سکتی ہے کہ حکومت کی

بالائی سطح پر کسی کو رحم آجائے اور وہ اسے ایک خصوصی کیس سمجھ کر اجازت دے دے لیکن مشکل نظر آتا ہے"۔

واجدہ کے بھائیوں نے بھی اسے کچھ ایسا ہی جواب دیا تھا اور صغیر مایوس ہو گیا تھا۔ اس نے لُوسی کو نہیں بتایا تھا۔ امید کی ہلکی سی کرن باقی تھی جس پر صغیر تکیہ لگائے ہوئے تھا اور وہ اللہ کے خاص فضل و کرم کا طلب گار تھا۔



آخر میجر عثمان کا کورٹ مارشل ختم ہو گیا۔ عثمان کا وکیل گھنٹوں کے حساب سے بولا اور سرکاری وکیل نے اس کی بحث کا جواب دیا۔ کیس بالکل صاف تھا اس لئے میجر عثمان کو مجرم قرار دے دیا گیا۔ جرائم کے لئے قانون تو ہر ایک کے لئے ہی سخت ہوتا ہے لیکن فوجی قانون کی نگاہ میں یہ جرائم بڑے ہی سنگین اور گھناؤنے تھے اور فوجی قانون میں ایسے مجرموں کے لئے قہر اور غضب پایا جاتا تھا۔ میجر عثمان پر فوجی قانون کی ایسی دفعات کے تحت الزامات عائد کئے گئے تھے کہ اسے بعض دفعات میں سزائے قید اور ملک کے خلاف جاسوسی اور غداری کے جرم میں سزائے موت دے دی گئی۔ یہ کاغذات جی ایچ کیو کو بھیج دیئے گئے۔ سزا پر عمل درآمد کمانڈر انچیف کی منظوری کے بعد ہونا تھا۔

عثمان کو جب وہاں سے لے جانے لگے تو اس نے کہا کہ اس کی بیوی سے کہا جائے کہ وہ اپنے دونوں بچوں کو دیکھنا چاہتا ہے۔ ایک افسر نے واجدہ سے کہا کہ یہ بات کی۔ واجدہ ابھی وہیں تھی اور بچے وہاں تھے جہاں ان کی عارضی رہائش تھی۔

"نہیں!" ——— واجدہ نے کہا ——— "عثمان سے کہہ دو کہ میرا وہ خاوند نہیں اور یہ بچے میرے ہیں اور یہ بچے پاکستان کے ہیں اور میں انہیں کسی غدار کی شکل دکھانا گوارہ نہیں کروں گی۔ کوئی قانون مجھے مجبور نہیں کر سکتا کہ میں اپنے بچوں کو اپنے وطن اور اپنے دین کے ایک دشمن اور غدار کے پاس لے جاؤں"۔

عثمان کو واجدہ کا یہ جواب بتایا گیا اور اس کے آنسو نکل آئے۔

آنسو تو لُوسی اور صغیر کے دیکھنے والے تھے۔ وہ ایک دوسرے کی محبت میں دیوانگی کی حد تک پہنچ گئے تھے۔ صرف اللہ ان کی مدد کر سکتا تھا۔ لُوسی کو انڈیا کے سفارت خانے کے حوالے کرنا تھا یا خرچہ دے کر سرحد پار بھیج دینا تھا۔ صغیر کی درخواست پر غور کیا جا رہا تھا لیکن اسے امید خاصی کم تھی۔ کورٹ مارشل ختم ہو چکا تھا اور اب انہیں جدا

ہونا تھا۔ آخری فیصلہ آنے تک وہ یہیں اکٹھے رہ سکتے تھے۔

"سلمٰی!" ——— صغیر نے لُوسی سے کہا ——— "میں نے ڈاکٹر رشید سے کہا تھا کہ جس طرح اسے اور خالدہ کو کوئی جدا نہیں کر سکا تھا اور اللہ نے انہیں اکٹھا رکھا اسی طرح میں سلمٰی سے جدا نہیں ہوں گا اور اللہ ہمیں اکٹھا ہی رکھے گا۔ میں یہی بات تمہیں کہہ رہا ہوں سلمٰی، میں نے اپنے ملک کے لئے جو کرنا تھا وہ کر دیا ہے۔ یہ میری خواہش تھی اور یہ میرا ارادہ تھا اور یہی میرا جذبہ تھا جو اللہ نے میرے اندر بیدار کر دیا تھا۔ اس فرض سے فارغ ہو کر اب میں آزاد ہوں اور میں تمہیں بتا دیتا ہوں کہ تم جہاں بھی جاؤ گی میں تمہارے ساتھ ہوں گا اور کوشش کروں گا کہ تمہیں فرار کرا سکوں اور پھر کہیں نئی زندگی کا آغاز کریں گے"۔

لُوسی نے اسے یوں دیکھا جیسے خواب میں لوگ ایک دوسرے کو دیکھا کرتے ہیں۔

لُوسی کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور صغیر نے اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔

اگلے روز صغیر اور لُوسی آئی ایس آئی کے ڈائریکٹر جنرل کے دفتر میں جا پہنچے اور اس سے درخواست کی کہ وہ کسی طرح سلمٰی کو پاکستان کی شہریت دلوا دے۔ ڈائریکٹر جنرل نے وعدہ کیا کہ وہ پوری کوشش کرے گا لیکن امید کم ہی نظر آتی ہے۔ جنرل نے یہ بھی کہا کہ صغیر نے جو کارنامہ کر دکھایا ہے اس کا اسے انعام اور صلہ ملنا چاہئے لیکن قانون آخر قانون ہے جسے توڑا نہیں جا سکتا۔

"جنرل صاحب!" ——— صغیر نے کہا ——— "اگر آپ مجھے کسی انعام کا حقدار سمجھتے ہیں تو لُوسی کو پاکستان کی شہریت دے دیں اور اسے مجھ سے جدا نہ کریں۔ ہم دونوں گناہوں کی دنیا سے واپس آئے ہیں، ہمیں اسی دنیا میں واپس نہ دھکیلیں"۔

صغیر!" ——— جنرل نے کہا ——— "ملک کا قانون جذبات سے متاثر نہیں ہُوا کرتا۔ حقیقت میں آؤ پھر سوچو میں وعدہ کر رہا ہوں کہ سلمٰی کو پاکستان کی شہریت دلانے کی پوری کوشش کروں گا۔ اللہ سے دعا کرو کہ اس کی ذاتِ باری تمہیں جدا نہ ہونے دے"۔

یہ باتیں ہو چکیں تو صغیر نے میجر جنرل سے پوچھا کہ کیا اب وہ اپنے کمرے سے نکل کر ذرا باہر گھوم پھر سکتے ہیں؟ میجر جنرل نے کہا کہ دور نہ جائیں، اب ان کے لئے کوئی خطرہ نہیں، کورٹ مارشل ختم ہو چکا ہے۔

اسی دن کے پچھلے پہر کا واقعہ ہے کہ صغیر اور لُوسی اکٹھے باہر نکلے اور ایک ایسی

سڑک پر جا نکلے جس پر کوئی زیادہ ٹریفک نہیں تھی۔ اس علاقے میں ویسے بھی ٹریفک کم ہی ہوتی تھی۔ وہ کچھ اور آگے گئے تو پیچھے سے ایک موٹر سائیکل آیا جس پر دو جوان سال آدمی سوار تھے۔ پیچھے بیٹھے ہوئے آدمی نے اپنے کپڑوں کے اندر سے کلاشنکوف نکالی' صغیر اور لُوسی کی طرف نالی کر کے ٹریگر دبا دیا' اس نے بڑا لمبا برسٹ فائر کیا اور اس کے ساتھ ہی موٹر سائیکل کی رفتار اور تیز ہو گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

لوگ دوڑے آئے۔ صغیر اور لوسی کی لاشیں چھلنی کی ہوئی حالت میں سڑک پر پڑی خون بہا رہی تھیں اور دونوں کا خون اکٹھا ہو کر سڑک پر بہہ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد پولیس آ گئی۔ ملٹری پولیس بھی آ گئی اور دونوں لاشوں کو ایمبولینس میں ڈال کر اس ہسپتال پہنچا دیا جہاں ڈاکٹر عبدالرشید اور خالدہ کو پکّی ملازمت مل گئی تھی۔

ڈاکٹر رشید کو بتایا گیا کہ دو لاشیں پوسٹ مارٹم کے لئے آئی ہیں اور یہ محض رسمی کارروائی ہو گی اور وہ جا کر پوسٹ مارٹم کر دے۔ ڈاکٹر رشید فوراً" اپریشن تھیٹر میں پہنچا اور جب اس نے لاشوں کے چہرے دیکھے تو وہیں رک کر جم گیا۔ اس پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا ہو۔ اسے جیسے صغیر کی آواز سنائی دے رہی ہو — "ڈاکٹر صاحب! مجھے اور لُوسی کو کوئی قانون جدا نہیں کر سکتا۔ ہم اکٹھے رہنے کے لئے پیدا ہوئے تھے"۔

"خالدہ!" — پوسٹ مارٹم کے بعد ڈاکٹر رشید نے خالدہ کو بتایا — ہم نے جسے انبالہ کے ہسپتال سے فرار کروایا تھا وہ آج اس دنیا سے ہی فرار ہو گیا ہے۔ اللہ نے اسے اور لُوسی کو جدا نہیں ہونے دیا"۔